TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224135
UNIVERSAL
LIBRARY

Osmania University Library

Call No. Accession No.

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی رنگون میں برما کی انقلابی کونسل کے چیرمین نے ون کے ساتھ
شریمتی اندرا گاندھی ۲۷ مارچ کو برما کے سہ روزہ سرکاری دورہ پر تشریف لے گئی تھیں۔

اُردو کا مقبول عوامی مصوّر رسالہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

اسسٹنٹ ایڈیٹر
راج نرائن راز

ترتیب

ملاحظات		۲
تماشہ (نظم)	شاذ تمکنت	۳
طالب علموں کی حالیہ بے چینی	نریندر نشچل	۴
پانی کے پاس (افسانہ)	پریم ناتھ در	۱۰
غزل	باقر مہدی	
غزل	صغیر احمد صوفی	۱۵
معائب شاعری	رشید حسن خاں	۱۶
غزلیں	قیصر قلندر	۲۴
آہو خانہ	شیخ فرید	۲۵
جلتی رات، سلگتے سائے (نظم)	پریم وار برٹنی	۳۱
کشمیر تاریخ کے آئینے میں	بنسی لال گپتا	۳۲
غزلیں	مظہر امام	۳۶
پانی کے چراغ (افسانہ)	اقبال متین	۳۷
ہندوستان کے بازی گر	محمد عمر	۴۲

سرورق - عملہ: جیون اڈلجہ

جلد ۲۷ ——— شمارہ ۱۰

مئی ۱۹۶۹ء

بیساکھ جیٹھ سنک ۱۸۹۱ء

مضامین اور ترسیلِ زر کا پتہ

شہباز حسین ایڈیٹر آج کل (اردو) پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

سالانہ چندہ: ہندوستان میں: سات روپے، پاکستان میں: سات روپے (پاک)
دیگر ممالک سے ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر
قیمتِ فی پرچہ: ہندوستان میں: ۶۰ پیسے؛ پاکستان میں: ۶۰ پیسے (پاک)
دیگر ممالک سے: ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مرتبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کا حالیہ دورۂ برما، ہندو برما کی گہری دوستی اور قریبی تعلقات کا مظہر ہے۔

یہ دونوں ممالک نہ صرف جغرافیائی طور پر ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں بلکہ تاریخی لحاظ سے بھی دونوں ملکوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ جب دونوں ممالک برطانوی سامراج کے ماتحت تھے تو بہت دنوں تک دونوں کو ایک واحد اکائی سمجھا گیا اور تقریباً ایک ہی وقت میں دونوں ممالک نے آزادی حاصل کی۔ اس طرح ان دونوں ممالک نے آزادی کی جد وجہد اور آزادی کے بعد ملک کی تعمیر و ترقی کی جو کوشش کی ہیں وہ بڑی حد تک یکساں ہیں۔ اس وجہ سے اس پڑوسی ملک سے ہمارے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے ہیں۔ دونوں ممالک میں جو برادرانہ اور اچھے پڑوسیوں جیسے تعلقات قائم ہیں، وہ کسی بھی دو پڑوسی ملکوں کے لئے ایک نمونے کا کام دے سکتے ہیں۔

ہندوستان اور برما کی سرحد ۹۰۰ میل لمبی ہے۔ دوستی اور اعتماد کی فضا میں دونوں ملکوں کی سرحدوں کی نشان دہی بخیر و خوبی انجام پا رہی ہے۔ ۲۰۲ سو میل لمبی سرحد کا تعین کیا جا چکا ہے اور باقی کام کافی خوشگوار اسلوبی سے جاری ہے۔

ہندوستان اور برما میں گہرے تجارتی تعلقات قائم ہیں۔ پٹ سن اور کپاس کے علاوہ ہندوستان انجینئرنگ کا سامان بھی برما کو بھیجتا ہے۔ حال میں ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت برما کو ۸ کروڑ روپے کی مالیت کی ریلوے کی پٹریاں اور متعلقہ سامان بھیجا جائیگا۔ ہندوستان نے برما میں کپڑے بننے کی مل اور پاور اسٹیشن کے لئے مشینیں بھیجنے کی بھی پیش کش کی ہے۔

دونوں ممالک میں مفاہمت آبپی اشتراک اور خیر سگالی کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے، جس کا مظہر وہ مشترک اعلانیہ بھی ہے جو اس ملاقات کے اختتام کے بعد جاری کیا گیا ہے۔

پچھلے دنوں بھارت سرکار کی درخواست پر، تکنیکی امداد کے پروگرام کے تحت اقوام متحدہ کے ماہرین کی ایک ٹیم بھارت کی مجموعی اقتصادی و سماجی ترقی کے تعلق سے بھارت کے فیملی پلاننگ پروگرام کا جائزہ لینے آئی تھی۔ ماہرین کی مذکورہ ٹیم فیملی پلاننگ کے پروگرام کے سبھی پہلوؤں اور سبھی مسئلوں پر سوچ بچار کرنے کے بعد اس پروگرام کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کے لئے اپنی سفارشات پیش کرے گی۔

فیملی پلاننگ آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ فیملی پلاننگ پروگرام ہمارے ترقیاتی منصوبوں کا جزو خاص ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس پروگرام کی کامیابی ہی میں ہمارے ترقیاتی منصوبوں کی کامیابی مضمر ہے۔ اس سلسلے میں قابل ذکر کامیابی حاصل کی گئی ہے۔ اب تک ۲۰ لاکھ لوگ نس بندی کروا چکے ہیں۔ اور لگ بھگ سات لاکھ ٹوپ سالانہ لگائے جاتے ہیں۔ نرودھ کی سالانہ کھپت ساڑھے چار کروڑ سے بڑھ کر ۱۵ کروڑ ہو گئی ہے۔

چونکہ مضامین ہمیں وقت پر نہیں ملے اس لئے آج کل کا نظم نمبر اب جون کے بجائے اگست ۱۹۶۹ء میں شائع ہوگا۔ یہ نمبر ۹۶ صفحات پر مشتمل ہوگا اور اس میں ہندوستان کی تقریباً تمام علاقائی زبانوں کی جدید نظمیں شامل ہوں گی۔

جنوری ۱۹۶۹ء کے شمارے میں شائع شدہ مضمون "کشمیر کے میلے اور تہوار" کے صفحہ ۴۵ کی ۲۵ ویں سطر میں لفظ 'ہندوستان' کے بجائے 'ہندو' پڑھا جائے۔

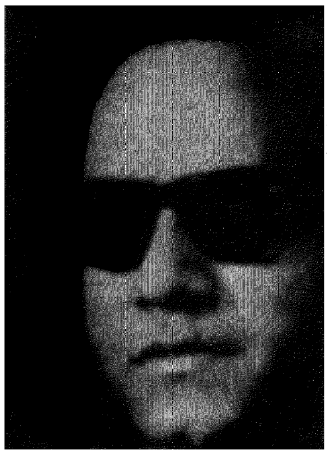

شاذ تمکنت

شیشہ

رات جگمگاتی ہے
بھیڑ، شور، ہنگامے
زرق برق پہناوے
شربتی، سیم گوں، دھانی
روشنی کے فوارے
مرد، عورتیں، بچے
آڑی ترچھی صف باندھے
ایک خطِ نوریں کے
نقطۂ عمودی کو
سر اٹھائے تکتے ہیں
اونگا جاگ اٹھتا ہے
ایک لاٹ گرتی ہے
مرد، عورتیں، بچے
تالیاں بجاتے ہیں
صرف ایک ہی عورت
چیخ روک لیتی ہے
صرف ایک ہی بچہ
بلبلا کے روتا ہے

نریندر نشیل

طالبعلموں کی حالیہ بے چینی

طالبعلموں میں بے چینی کا مسئلہ آج کے اہم مسئلوں میں سے ایک ہے۔ اور کسی حد تک یہ اس مسئلے سے ہم جہتی کا تعلق ہے۔ جسے نگار نے اپنے طور پر اس مسئلے کا تجزیہ کیا ہے اور ہمارا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

اس مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر ہم اپنے قارئین کو اس کے بارے میں اظہار خیال کی دعوت دیتے ہیں۔ (مدیر۔ ج)

بیسویں صدی کے ساتویں عشرے کی دنیا ایک عجیب ہلچل اور تغیر اور تبدل کی دنیا ہے۔ وہ حد فاصل جو ایک کو دوسرے سے جدا کرتی تھی اب غائب ہوتی نظر آتی ہے۔ اب نہ تو ہمارا شاعر نہ ادیب کلچر کا وہ مشرق مطلق نہیں رہا اور نہ ہی وہ مغرب مغرب ہی رہا ہے جسے شرقین نظر آتا تھا۔ تاہم مختلف نظریوں کے حامل رہنماؤں میں کوئی واضح تبدیلی نہیں آئی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر تبدیلی آئی ہے تو صرف ان ملک کے نوجوانوں میں۔ یہ نوجوان اپنے اپنے سماج کی قدروں کا نئی نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔ وہ اُن اصل اور نقلی کی بنائی ہوئی دیواروں کو مسمار کرکے ان حدوں میں داخل ہو گئے ہیں جو روایت پرستوں کے نزدیک ممنوعہ ہیں۔ اپنے بظاہر متضاد نظریوں کے باوجود وہ ایک اکائی بن گئے ہیں۔ ان کی آواز کا پیکا ایک پیجیدہ کی صدائے بازگشت بن گیا ہے۔ وہ ایک ہی قسم کے ردعمل کے بجائے ہمہ رنگ کا جہان بن گئے ہیں۔ جس کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک نئے جہان کی تشکیل کے لئے اپنے اپنے نظریوں میں فن پرانی قدروں کے خلاف لڑ رہے ہیں، جو پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیانی عرصے میں پیدا ہونے والے لوگوں کو (جو نہیں جنگ کے اس عفریتے سے سرکشی کی بو آتی ہے۔ اگلے وقتوں کے لوگوں کی نظر میں تعلیم و تربیت کی فن قدروں سے انحراف ایک غیر سنجیدہ اور غیر ذمہ دارانہ قدم ہے جو ایک نئی

سے سماج کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیتی آئیں۔ وہ طالب علموں کی روایت شکن سرگرمیوں پر تحکمانہ انداز سے غور کرتے ہیں۔ تاہم پچھلی نسل کے لوگوں کا طالب علموں کے اس روّیے کے بارے میں ردِّ عمل خواہ کچھ بھی ہو، یہ ایک حقیقت ہے کہ آج کے طالب علم نظم وضبط، اطاعت وانعام حکم عدولی اور سزا سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔ اُن کی کجکلاہی کا یہ عالم ہے کہ اُن کی باغیانہ روش کبھی کبھی تو دہشت پسندوں کی تخریبی سرگرمیوں کو بھی مات کر دیتی ہے۔ سر ہتھیلی پر لے کر چلنے والے اِن نوجوانوں کی نگاہ میں کوئی خطرہ بھی حوصلہ شکن نہیں ہے۔

اس صورتِ حال میں اب قابلِ فکر معاملہ یہ ہے کہ آخر وہ کون سی بات ہے جس سے امریکہ، فرانس، انگلستان، چیکوسلوواکیہ، اٹلی جاپان، بھارت اور پاکستان کی یونیورسٹیوں کے طلبا رمحارب انداز میں سوچنے لگے ہیں؟ تعلیم گاہوں کو انہوں نے اکھاڑوں میں کیوں بدل دیا ہے؟ کیا اُن کی لاقانونیت اور تشدّد پسندی بے بُنیاد ہے؟ یا اگلے وقتوں کے روشن خیال لوگوں کا بھی اس میں ہاتھ ہے؟ کیا علم کی روشنی پھیلنے کے بعد ایسا اندھیر ناگزیر تھا؟ اگر نہیں، تو پھر ایسا کیوں؟

ماہرینِ نفسیات جب آج کے طلبا رکے قانون شکنی اور احتجاج کے رُجحانات کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ اُن کی سرگرمیوں کو احساسِ کمتری سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ اسے فراریت بتاتے ہیں۔ اُن کے تجزیئے کے مُطابق یہ تشدّد آمیز کارروائیاں اُن طلبا کی کارستانیاں ہیں، جو تحصیلِ علم سے بالکل لگاؤ نہیں رکھتے۔ اپنے ہم عمر اور ہم درس نوجوانوں کی توجہ اپنی جانب مرکوز کرنے کے لئے وہ دیدہ و دانستہ ایسے اقدام کرتے ہیں۔ بعض ماہرینِ نفسیات وعمرانیات نے یونیورسٹیوں میں موجودہ گڑبڑ کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے، کہ تعلیم کی سہولتیں بڑھنے سے ہر کس وناکس نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانا شروع کر دیا ہے۔ اُن کی رائے میں نودولتیوں (Up starts) میں بالخصوص یہ خواہش بہت زیادہ ہے۔ لہٰذا جب اُن کے بچے، جن کے گھر کا ماحول باہر کے ماحول سے بالکل مختلف ہوتا ہے، یونی ورسٹی کے احاطہ میں داخل ہوتے ہیں تو وہ اپنی موجودگی کو محسوس کروانے کے لئے مختلف قسم کی حرکتیں کرتے ہیں۔ بھارت جیسے ترقی پذیر ملک میں اُستاد کا مرتبہ اِن نودولتیوں کی نگاہ میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ لہٰذا اُستاد کی سخت گیری اور طالب علم کا بے معنی احساسِ برتری مِل جُل کر ماحول کو بگاڑ دیتے ہیں۔ لیکن یہ دلیل صحیح نہیں! اسے من وعن تسلیم نہیں کیا جاسکتا یہ البتہ دُرست ہے کہ نودولتیوں کے بچے تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے نہیں، بلکہ اپنے باپ بھائی کے ساتھ کاروبار میں شامل ہونے سے پیشتر چند برس بے فکری کے عالم میں گذارنے کے لئے یونیورسٹیوں میں داخل ہوتے ہیں۔ تاہم ایسے طالب علموں کی تعداد معمولی ہوتی ہے۔ اور وہ ایسی قیادت میں دلچسپی بھی نہیں رکھتے، جس سے اُن کی اپنی ذات اور اُن کے طبقے کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ بہرحال نفسیات کے ماہرین طالب علموں کی موجودہ روش کی وجہ خواہ کچھ ہی بتائیں، وہ اس امر سے انکار نہیں کر سکتے کہ طالب علموں کے احتجاج کا معاملہ آج ایک نہایت ہی سنجیدہ مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اِس مسئلے کو سنجیدگی سے سُلجھانے کی ضرورت ہے کہ اس صورتِ حال کی ظاہرہ وجوہ کے علاوہ بُنیادی اور مرکزی وجوہ تک پہنچا جائے۔ نیز ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہئے کہ ہر وہ اقدام جو وقتی طور پر کارآمد ہو سکتا ہے، ایک مدّت کے بعد زیادہ بھیانک نتائج کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ یہ انسانی جبلّت میں ہے کہ جب کوئی مُصیبت ٹل جاتی ہے تو ہم اس کی طرف سے غافل ہو جاتے ہیں۔ ایک قسم کی غلط خود اعتمادی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور سزا۔ نیم حکیم کی معجزہ نما ادویات کا وحشت ناک نتیجہ!

مغرب ومشرق کے طلبا نے رُڈیارڈ کپلنگ کی وجدانی صلاحیت کو بلاشبہ غلط ثابت کر دیا ہے، وہ ایک ہی رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں۔ وہ ایک ہی طرح کے اشتعال اور احتجاج کا مظاہرہ کر رہے ہیں لیکن اُن کی بے چینی اُن کا سرکش انداز، اُن کی تشدّد آمیز سرگرمیوں اور محارب طریقۂ کار کے پیچھے ایک ہی وجہ کارفرما نہیں۔ مختلف ممالک میں طالب علموں کی بے چینی کی مختلف اور متضاد وجوہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ابتداً امریکہ، یورپ اور جاپان میں طلبا کی صدائے احتجاج بڑی حد تک وہاں کی حکومتوں کے بعض پالیسیوں سے عدم اتفاق کی وجہ سے تھی لیکن اب ان احتجاجوں کی نوعیت بدل گئی ہے طلبا رکے مطالبات

میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ یہ مطالبات ان ممالک کی نئی نسلوں کے پیشِ نظر آدرشوں کا آئینہ، اور اُن کے احتجاج موجودہ نظامِ تعلیم سے اُن کی بے اطمینانی کا مظہر ہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ کے طلبا کے مطالبات کا مرکز محور یہ ہے کہ تعلیمی معیار کو اور زیادہ بلند کیا جائے، نااہل اساتذہ جو طلبا میں علم کا شوق پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے بلا تاخیر برطرف کر دیے جائیں اور اساتذہ کے تقرر میں طلبا کی پسند کا لحاظ رکھا جائے۔ یہی نہیں، وہ زیادہ جنسی آزادی کا بھی مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ بہتر ہوسٹل اور لائبریریاں چاہتے ہیں۔ کسی غیر جانبدار مبصر کی رائے اِن مطالبات کے بارے میں جو کچھ بھی ہو، یہ امر یقینی ہے کہ وہ حرفِ آخر نہیں ہو سکتی۔

امریکی طلبا کی بے چینی پہلو دار سہی، فرانسیسی طلبا کا احتجاج ایسا نہیں۔ بیشتر مبصروں اور ماہرینِ تعلیم نے فرانسیسی طلبا کے مطالبات کو حق بجانب ٹھہرایا ہے۔ انھیں اُن کے مطالبات باوزن اور مدلل لگے ہیں۔ ہر پڑھا لکھا جانتا ہے کہ فرانس میں آرٹ اور ادب میں نت نئے تجربات ہوتے ہیں۔ مقرر اور اسٹائل مقبول ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس اُس ملک کا شعبۂ تعلیم ہی کچھ ایسا رہا، جو نپولین کے زمانے سے اب تک ویسا ہی چلا آرہا ہے۔ بدلتے ہوئے زمانے کے تقاضوں کے ساتھ اس ملک کے نصاب میں کوئی قابلِ قدر تبدیلی نہیں آئی۔ طلبا اپنی اس محرومی کو بُری طرح محسوس کرتے رہے۔ اور پھر مئی ۱۹۶۸ء میں انھوں نے فرانس میں ایک ایسی ہنگامی صورت پیدا کر دی کہ دوسرے ممالک کے لوگوں کو ایک نئے فرانسیسی انقلاب کا گمان ہونے لگا۔ تاہم بیشتر فرانسیسی پروفیسروں، ماہرینِ تعلیم اور مبصروں کی رائے میں فرانسیسی طلبا کی مانگیں اُن کے اُس جذبے کی علامت ہیں، جو ملک و قوم کے مفاد سے معمور ہے۔

مختصراً امریکہ، فرانس، انگلینڈ اور جاپان میں طلبا کی سرگرمیوں کی تحریک کا سرچشمہ ایک خاص مقصد ہے۔ اس میں ایک معنویت ہے۔ تاہم اس سے انکار مشکل ہوگا کہ مذکور ممالک کے طلبا کی تشدد آمیز سرگرمیوں کا جہاں تک تعلق ہے، اُن پر بائیں بازو کے انتہا پسند طالب علموں کا بھی اثر ہے جن کی تعداد محض ۲ فیصد ہے اور جو غلط یا صحیح ایک واضح آدرش کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں لیکن بھارت کے طلبا کی سرگرمیاں کسی آدرش یا آئیڈیل کی حامل نہیں معلوم ہوتیں۔ اُن کے تشدد سے روزمرہ کی عام زندگی درہم برہم ہو جاتی ہے۔ لوٹ مار، آتش زنی کی وارداتیں، قومی عمارتوں اور اداروں کو بالارادہ نقصان پہنچانے کے پلان — ہمارے ملک کے طلبا کی ہنگامہ آرائیوں کے عام مظاہر ہے ہیں۔ لیکن ان کا سبب ؟

غیر جانب دار مبصروں کی رائے میں بھارت کے طلبا کی ہنگامہ خیزیوں کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ معمولی معمولی باتوں سے اپنی گھٹن دُور کرنے، اپنے دبے ہوئے جذبات کا اظہار کرنے، اپنی پوشیدہ طاقت کا استعمال کرنے کے مواقع حاصل کرتے ہیں۔ بس، ٹرام، ریل کے کرایوں میں اضافہ ہو، تو ہنگامہ۔ سینما گھروں کے ٹکٹوں پر ٹیکس بڑھے، تو ہنگامہ۔ بس میں کنڈکٹر انہیں ٹکٹ خریدنے کو کہے، یا وہ ایک ٹولی کے سبھی لڑکوں کو بس میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے بس میں لے جانے سے انکار کرے یا وہ انہیں بس میں بدذوقی کا مظاہرہ کرنے سے روکے تو ہنگامہ۔ کوئی انہیں راہِ راست پر لانے کے لیے دخل اندازی کرے، تو ہنگامہ ..... اُن کے یہ ہنگامے اکثر تشدد آمیز ہوتے ہیں۔ وہ پتھراؤ کرتے ہیں، بسوں ٹراموں کو پھونک دیتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں ان بالغ یا نابالغ بچوں کی ان کارروائیوں کے پس پشت سیاسی جماعتیں کارفرما ہیں۔ خیر ان ہنگاموں میں طلبا سیاسی پارٹیوں کا آلۂ کار ہوں یا نہ ہوں لیکن جب وہ فرقہ وارانہ اور علاقائی دنگوں میں حصہ لیتے ہیں تو وہ طلبا کی تحریک و مقاصد سے دُور ہٹ جاتے ہیں۔ انیٹی ہندی اور انیٹی انگریزی تحریکوں میں اُن کی شمولیت بھی قابلِ غور ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ اُن کی تحریک، اُن کی سرگرمیاں اُن کی اُس زندگی میں متعلق رہیں جس کا تعلق یونیورسٹیوں اور کالجوں سے ہے۔ لیکن صورتِ حال بالکل اس کے برعکس ہے۔ غیر ممالک کے اخباری نمائندوں اور دوسرے مبصروں کی رائے میں بھارت کے طلبا میں آدرش کا فقدان ہے۔ اُن کی ہنگامہ خیزی میں فکر کی بجائے جذبات کو زیادہ دخل حاصل ہے اُن کی تحریکیں جذباتی ذہن کی غماز ہیں۔ وہ اس سائنسی دَور کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے۔ وہ مذہب و نسل، فرقہ و طبقہ کے نظریوں سے اپنے چلن کا

اپنے لائحہ عمل کا تعین کرتے ہیں۔

ان حقائق کے باوجود بعض ماہرین کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہرگز ہرگز نہیں کہ بھارتی طالب علموں کے مطالبات جائز نہیں۔ اور ان طالبعلموں میں زندگی کو خوش گوار بنانے کا ذوق و سلیقہ نہیں، وہ محض شر انگیز سرگرمیوں میں حصہ لینے کے خواہش مند رہتے ہیں۔ نہ ہی یہ سوچنا درست ہے کہ بھارتی طلبا اپنے ماحول کو پراگندہ اور کثیف بنانے میں ایک مریضانہ مسرت محسوس کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں ایسے غیر ہمدردانہ انداز میں سوچنا اس رواداری کے منافی ہے جو ہمیں نسل کے لوگوں کے اخلاق کی خاصیت رہی ہے نیز اس کا مطلب یہ بھی ہوگا کہ جلد بازی میں تمام تر ذمہ داری بیچارے طلبا پر تھوپ دی جائے اور اس مسئلے کا حل سوچنے کی بجائے ہم اپنے فرض سے کنی کترائیں۔ ضرورت ایسی جلد بازی کی نہیں، جو جلتی پر تیل کا کام کرے۔ ضرورت اس تحمل مزاجی کی ہے جو آج کے نوجوان طلبا کے مسائل کو ٹھنڈے دل سے سوچنے سمجھنے میں آج کے بڑے بوڑھوں کی مدد و معاون ثابت ہو۔

طلبا کے مطالبات کا جائزہ لینے سے پہلے ہمارے لئے یہ جان لینا ضروری ہے کہ ہمارے نوجوانوں کا ردِ عمل اُن توقعات کا نتیجہ ہے جو ملک کے آزاد ہونے کے ساتھ وابستہ تھیں۔ اُمید محفلِ حیات کی شمع فروزاں ہے لیکن اگر امید و خواہش میں خام خیالی کی جھلک نمایاں ہو جائے تو اُن کا ذکر ایسے دھوئیں کے مترادف ہو جاتا ہے جس میں دم گھٹنے لگتا ہے۔ آمدم برسرِ مطلب، ہمارے نوجوان طلبا کے والدین کا خیال تھا کہ آزادی ملتے ہی ہم جہالت، بے کاری اور بے روزگاری کا خاتمہ کر دیں گے۔ بلاشبہ اس ضمن میں پہلا قدم جو ہمارے ملک کے رہنماؤں کو اُٹھانا چاہیئے تھا، انھوں نے اُٹھایا مناسب اقدامات کئے گئے جس سے تعلیم پھیلی۔ سہولتیں ہم پہنچائی گئیں تاکہ کوئی نوجوان کسی کمی یا معذوری کے باعث علم سے محروم نہ رہنے پائے نتیجتاً لازمی ابتدائی اور سیکنڈری تعلیم کے ساتھ لوگوں کی توقعات بڑھیں۔ اُن میں اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دینے کی خواہش بھی بڑھتی گئی۔ والدین اعلیٰ تعلیم کو حصولِ مقصد کی ایک سیڑھی تصور کرنے لگے۔ نوجوان اعلیٰ تعلیم کو روزگار کا یقینی گُر سمجھنے لگے اور والدین اور نوجوانوں کی نیک خواہشیں یونی ورسٹی میں داخلے پر مرکوز ہو گئیں۔ کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں اضافہ ہونے لگا اور اب بھی ہو رہا ہے۔ لیکن نئے کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے قیام کے باوجود نوجوانوں کی تعلیمی ضرورتوں کا پورا ہونا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ پچھلے چند برسوں میں کلاسوں میں طالب علموں کی تعداد میں اضافہ کچھ اس انداز سے ہونا شروع ہوا کہ وہ کلاسیں نہ رہ کر جمگھٹوں میں تبدیل ہو گئیں اور طالب علموں کی شخصیت انفرادیت کے چمن زار میں اپنی بہار دکھانے کے بجائے جنگل کے خار زار میں مرجھانے لگی۔ لیکچرار اور طلبار میں باہمی رابطہ گھٹنے لگا اور بالآخر گھٹتے گھٹتے بالکل مفقود ہو گیا دونوں میں اجنبیت بڑھنے لگی جو رفتہ رفتہ غلط فہمیوں کا پیش خیمہ بن گئی۔ اُستاد اور طالب علم کا وہ رشتہ منقطع ہو گیا جس کو مضبوط بنانے کے لئے یونیورسٹی کے احاطوں کو مسجد و مندر کا مقام دیا جاتا رہا ہے۔ ظاہر ہے اس صورتِ حال میں اگر لیکچر کے دوران طلبا کے بیٹھنے کے لئے مناسب جگہ نہیں تو کلاس میں ایک قسم کی بے چینی کا ہونا قدرتی امر ہوگا۔ ایسے ماحول میں طالب علموں سے سنجیدہ توجہ کی توقع رکھنا ان سے زیادتی کے مترادف ہے۔ تاہم طالب علموں کی غیر ارادی غیر سنجیدگی سے کلاس کا ماحول بگڑتا ہے اور اگر اُستاد پہلے ہی کبیدہ خاطر ہو، کسی ذاتی پریشانی کا شکار ہو، تو نوجوانوں کی وہ حرکات جنہیں ہنس کر ٹالا جا سکتا ہے اُستاد کے مزاج کو برافروختہ کر دیتی ہیں۔ بات کا بتنگڑ بننے لگتا ہے اور آنِ واحد میں کلاس کے پُرسکون ماحول میں وہ تزلزل آجاتی ہے، جس سے سبھی طالب علم اور تمام کالج اُس کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ اس کے بعد جب لیکچرار اور طلبار خود ہی اور خود داری کے غلط احساس کا سہارا لیتے ہیں تو ہڑتال تک نوبت آجاتی ہے۔ فکر کے فقدان سے معاملہ بگڑ جاتا ہے۔ چند طلبار کو کالج سے نکالنے کا اعلان کیا جاتا ہے اور پھر کالج کی فضا تشدد کی ہاؤ ہو سے مکدر ہو جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کا عجیب غریب پہلو یہ ہے کہ طلبار اور اساتذہ اپنی اپنی جگہ دونوں معصوم اور بے گناہ ہوتے ہیں۔

لیکن معاملے کی پیچیدگی کو یہ کہہ کر ختم نہیں کیا جا سکتا کہ کالجوں میں گنجائش کے مطابق ہی طالب علموں کو داخلہ دیا جانا چاہیئے۔ معاملے کی

سنگینی کو کم کرنے کا یہ طریقہ کس قدر بھونڈا ثابت ہوتا ہے، اس کا اندازہ ہمیں تب ہوگا جب ہم اُن واقعات کو یاد کرنے کی کوشش کریں جو ہائر سیکنڈری کے نتیجوں کے بعد ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ کامیاب امیدوار بہت کم نمبر حاصل کرنے کے باوجود کالج میں داخلہ چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ جیسا اُوپر کہا گیا، یونی ورسٹی تعلیم کو اچھی نوکری، اچھی زندگی کا وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ اور جب یونی ورسٹی اور کالج کے حکام ایسے امیدواروں کو داخلہ دینے میں معذوری کا اظہار کرتے ہیں تو احتجاجی مظاہرے شروع ہو جاتے ہیں۔ یونی ورسٹی حکام پر دباؤ ڈالا جاتا ہے اور اُنہیں وہ سب کچھ کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے جو مقررہ قواعد وضوابط کے منافی ہوتا ہے۔ مقصد کوتاہ۔ آج طالب علم کم نمبر حاصل کرنے کے باوجود کالج میں داخلہ چاہتا ہے۔ داخلہ ملنے کے بعد کلاس میں بیٹھنے کی جگہ نہ ملنے پر وہ بلا قصد اور غیر شعوری طور پر کوئی ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے جو کلاس کے لیکچرار کو کسی نامعلوم وجہ سے ناگوار لگتی ہے اور چھوٹے پیمانے پر ایک مہابھارت کا جنم ہو جاتا ہے اور اُسے طالب علموں کی بے چینی سے موسوم کیا جاتا ہے۔

کالجوں میں طلبا کی تعداد چونکہ گنجائش سے زیادہ ہوتی ہے، اس لئے اُنہیں وہ سہولتیں نہیں مل پاتیں جن کی عدم موجودگی میں کالج کی تعلیم اَدھوری رہ جاتی ہے۔ اس ضمن میں صرف چند غیر دستیاب سہولتوں کا ذکر مناسب ہوگا۔ لائبریری میں کتابوں اور نشستوں کی ناکافی اور غیر تسلی بخش تعداد، ناکافی اسٹاف ہونے کے باعث ٹائم ٹیبل کچھ ایسا ہونا کہ طلبا کا ایک دو گھنٹے لگاتار خالی رہنا، لیبارٹریوں میں آپریٹس کا خاطر خواہ انتظام نہ ہونا، بورڈنگ ہاؤس کی سہولتوں کا غیر تسلی بخش یا ناپید ہونا تفریح طبع کے لئے مناسب اندرونِ خانہ کھیلوں کا معمولی انتظام، مناسب کینٹینوں، کافی ہاؤس، یا ٹی ہاؤس کا نہ ہونا وغیرہ مزید برآں طالب علموں کی زندگی کو محض کتابی کیڑا نہ بنانے اور اُن کی صلاحیتوں اور شخصیتوں کو فروغ پانے کے مواقع بہم پہنچانے کے لئے کالجوں میں غیر نصابی پروگرام بھی اکثر کلاس رُوم لیکچروں سے زیادہ خشک اور غیر دلچسپ ہوتے ہیں۔ یہی نہیں، کالج کے کلچرل گروپ بالعموم کسی نہ کسی لیکچرار کی نگرانی میں کام کرتے ہیں اور اکثر اوقات بعض اساتذہ اپنی موجودگی کو محسوس کروانے کے لئے تحکمانہ انداز اور مسندِ برتری کو ترک نہیں کرتے۔ وہ طلبا کو کسی قسم کے غیر رسمی اور غیر معروف طرزِ اظہار کی اجازت نہیں دیتے ہیں، وہ اُنھیں صرف وہی پروگرام پیش کرنے کی اجازت دیتے ہیں جو نوجوانوں کی نظر میں دقیانوسی اور بے رَس اور بے کیف ہوتے ہیں۔ سرپرست لیکچرار کے حدِ فاصل بنائے رکھنے سے نوجوانوں کو اپنی دبی ہوئی خواہشوں کے اظہار (Psychological Catharsis) کا موقع نہیں مل پاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ وہ تمام شکایتیں جو اُنہیں اپنی ذات، اپنے والدین، لیکچرار یا لیکچرار کی یا کالج کے منتظمین سے ہوتی ہیں، انتقامی و تخریبی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ ہنگامے ہوتے ہیں اور بعض لوگ طلبا کو اور بعض استادوں کے طبقوں کو بُرا بھلا کہہ کر معاملے کو رفع دفع کرنا چاہتے ہیں۔

یہاں ایک اور غور طلب بات کا ذکر ضروری ہے۔ بعض ماہرینِ تعلیم کا کہنا ہے کہ تعلیم و تربیت کے نئے باب وا ہونے سے اب بہت سے ایسے لوگوں نے اپنے بچّوں کو کالجوں میں بھیجنا شروع کر دیا ہے، جو کبھی تحصیلِ علم کو بے مصرف مشغلہ سمجھتے تھے۔ اور ایک حد تک بے چینی اس سے پھیلی ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ یہ نظریہ کہاں تک دُرست ہے اس کے لئے ہمیں حالات کا تفصیل نفسیاتی تجزیہ کرنا ہوگا۔ اور اس مضمون میں اس کی کم گنجائش ہے۔

ہمارے طالب علموں میں بے چینی کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ ہمارے متعدد ماہرینِ تعلیم کی رائے میں ہمارا نظامِ تعلیم ناقص ہے۔ اس کی جانب بارہا برملا اور درپردہ اشارہ کیا جا چکا ہے۔ تعلیمی کمشنوں نے اپنی رپورٹوں میں بھارت کے تعلیمی نظام میں انقلابی نوعیت کی تبدیلیوں کی سفارش کی ہے انھوں نے جیسا کہ رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے یہ شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے کہ ہمارے نصاب آج کے تقاضوں کو پُورا نہیں کرتے۔ طلبا کی بہت سی صلاحیتیں اُن باتوں کو ازبر کرنے میں صرف ہو جاتی ہیں، جو عملی زندگی میں فضول ثابت ہوتی ہیں۔ اُن سے ایسے حقائق اعداد و شمار

کی جانکاری کی توقع کی جاتی ہے جو عملی زندگی میں کسی طرح اُن کے لئے کارآمد ثابت نہیں ہوتی۔ تعلیم برائے تعلیم کے نظریئے کے حامی لوگ کہیں گے کہ یونیورسٹی کی تعلیم کا مقصد اُن نوجوانوں کے فکر و نظر کو بلوغ بنیاد بخشتا ہے، اس لئے علم کو کسی مقصد کے حصول کا وسیلہ نہیں، بلکہ بذاتِ خود ایک مقصد ہے۔ لیکن وہ معترضین جو غلط قسم کے بھاری بھرکم اور بے مصرف نصابوں کو یونیورسٹیوں اور کالجوں کو اکھاڑوں میں بدلنے کی وجہ بتاتے ہیں، یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ مقابلہ کے امتحانوں کا معیار ایسا کیوں ہے۔ جو عام طالب علموں کی سمجھ بوجھ اور دسترس سے باہر ہے اور جو ایک خاص طبقے کے نوجوانوں کے ذہنی اور فکری پس منظر اور صلاحیتوں سے تطابق رکھتا ہے؟ اُن کی مانگ ہے کہ آج کے بدلتے ہوئے نظام میں بھارت جیسے جمہوری ملک میں فعل و قول اور علم و عمل میں تضاد کی کم سے کم گنجائش ہونی چاہئے۔ علاوہ ازیں نوجوانوں میں یہ جذبہ پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ کالج اور یونی ورسٹیوں میں گذارے ہوئے برسوں کی وقعت اُن برسوں سے قطعی زیادہ نہیں جو اُن کے اسکول اور محلے کے ساتھیوں نے یونہی صرف کر دیئے، یونہی گنوا دیئے۔ اگر اُن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے تو اُن کا بے دلی، قنوطیت کا شکار ہونا اغلب ہوگا۔ تاہم جب ہمارے نوجوانوں کو اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ یونی ورسٹی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد بے روزگاری اُن کے حصے میں آئے گی تو وہ بالا سوچے سمجھے اُن سرگرمیوں میں اُلجھ جاتے ہیں، جو اُن سے زندگی کا حسن، معصومیت اور مقصدیت چھین لیتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر ہمارے بعض غیر ذمہ دار سیاست داں ذاتی مقاصد کے حصول کے لئے طلبا کی بے پایاں طاقت کا استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے سیاسی پارٹیوں کا یونیورسٹیوں کے طلبا کو، اُن کی بے بسی، جھلاہٹ اور بوکھلاہٹ کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر، ورغلانا اور پھر انھیں غیر تعمیری مقاصد کے لئے استعمال کرنا ہر ذی شعور یا ضمیر و خوشمند انسان کے نزدیک قابلِ مذمت ہے۔ بلاشبہ آج کے نوجوان کل ہمارے ملک کا سیاسی اور اقتصادی و معاشی بار اپنے کندھوں پر اُٹھائیں گے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کام جسے سمجھنے اور سنبھالنے کی ذمہ داری اُن کے کندھوں پر چند برس بعد پڑے گی، اُنہیں آج ہی سونپ دیا جائے

اس مرحلے پر آج کے بھارتی طلبا کی بہت سی ایسی مانگیں ہیں اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں جو بادی النظر میں بالکل فضول معلوم ہیں۔ مثلاً وہ مروّج اکادمی چوغے کو معمارت کی نظر سے دیکھتے ہیں[1]۔ وہ ڈگریوں کی تقسیم کی تقریب کے موقع پر کانووکیشن تقریر انگریزی کی بجائے علاقائی زبان یا ہندی میں چاہتے ہیں۔ وہ امتحانوں کے طریقے میں تبدیلی چاہتے ہیں۔ اکادمی کونسل میں اپنے نمایندوں کی شرکت ضروری خیال کرتے ہیں۔ کلاس میں حاضری کو غیر ضروری سمجھتے ہیں[2]۔

— اُن کے یہ تقاضے ایسے نہیں جنہیں جبر و تضحیک سے مسترد کر دیا جائے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ انسانی زندگی میں ترقی کی راہیں مروّج راہوں کو ترک کرنے کے بعد ہی وا ہوئی ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ روایت کی ریت سے اقدار کا حیات بخش سرچشمہ ملوث ہو جاتا ہے اور اگر خود بخود اور قدرتی طور پر ریت سرچشمہ کے منبع سے نہ ہٹے تو ناقص نتائج کا ظہور ہو سکتا ہے؟ اگر ان حقائق سے گریز ممکن نہیں تو پھر ٹھنڈے دل سے اپنے جوانوں کی مانگوں پر ہمدردی کے ساتھ غور کرنے میں کیا مضائقہ ہے؟

---

[1] راجستھان یونی ورسٹی کے طلبا کا مطالبہ

[2] کلکتہ، دہلی یونی ورسٹی کے طلبا کا مطالبہ

****

غالبیات میں اضافہ

آئینۂ غالب: ۲۲ مقالات۔ بڑا سائز۔ ٹائپ کی عمدہ چھپائی

صفحات ۲۷۸ قیمت: ۵ روپے

گنجینۂ غالب: ۱۴ مقالات۔ بڑا سائز۔ ٹائپ کی عمدہ چھپائی

صفحات ۱۸۶ قیمت ۴.۵۰ روپے

محصول ڈاک ہمارے ذمے۔ تین روپے اور اس سے زائد کی کتابیں وی پی سے منگوائی جا سکتی ہیں۔

بزنس مینجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

پریم ناتھ در

پانی پاس

مجھے حکم ملا تھا کہ میں موت اُگلتی ہوئی توپوں کے کھلے منہ تک جاؤں اور ، زلزلوں اور ہلتی ہوئی کائنات کی تصویریں لے کر زندہ لوٹ آؤں۔ دل کو ایک ہی سہارا تھا کہ مجھے ایک محفوظ موڑ پر روکا جائے گا اور مجبوری کے عالم میں طوفان کے پچھواڑے سے ہی جو ملے گا اسی کو اور اپنی پیاری زندگی کو لے کر لوٹ آؤں گا۔ لیکن ہوا یہ کہ کوئی ایسا موڑ آیا ہی نہیں، جہاں رُکنے کا حکم ملتا اور جوں جوں جیپ آگے بڑھتی گئی میرا دل اس احساس سے دھڑکنے لگا کہ ابھی ایک توپ سامنے دکھائی دیگی اور ابھی زمین آسمان پر لپک اُٹھے گی اور ایک مشت خاک نہ معلوم مجھے کہاں کہاں لے جائے گی۔

لیکن بھگوان کیا، بھگوان سے بڑے انسان کی مایا دیکھئے۔ فلک شگاف دھماکوں کی جگہ میرے کانوں کی اندرونی کیپلیاسٹ کو ایک ڈھولک کی دُھن سہلا سہلا کر یقین دلانے لگی کہ میں ہی ہوں۔

یہ تھی منزلِ مقصود جہاں جیپ رُک گئی اور ہم زمین پر کھڑے ہو گئے۔ اس جگہ کی مٹی میں تحکم تھا۔ اپنی مرضی سے ایک بھی قدم اُٹھ نہ سکتا تھا۔ دُور دُور تک سیاہ فام لوہا طاق میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور دُور دُور تک اس مٹی نے اپنے پہلوؤں سے شعلے اُٹھا اُٹھا کر کھیتوں اور فصلوں کے مناظر کو مسخ کر دیا تھا اور اسی عالم میں میرے کانوں میں ڈھولک کی آواز آرہی تھی۔ پھر مجھے انسانوں کا ایک بڑا سا دائرہ دکھائی دیا۔ ڈھولک کی اس اجنبی دُھن "دھن دھن" کے گھیرے میں ایک گرم اور گھر لو گیت ماحول کا منہ چڑا رہا تھا۔ موت کے سناٹے اور ہولناک خاموشی کی گہری گود میں یہ ڈھولک کا گیت ـــــ! لیکن سانولی سپاہی نے فوراً اطلاع دی کہ جنگ بندی کا ابھی ابھی اعلان ہو چکا ہے اور میں نے اس خبر کو اپنے ذہن میں ایسے بٹھایا جیسے کہ مجھے اس بات کا پہلے ہی پتہ تھا۔ اب میرے قدم خود بخود اُٹھنے لگے۔ اور میں نے اپنے کندھے کو ایک جھٹکا دیا، کیمرہ سیدھا کیا اور آگے بڑھا۔

مٹی اور دھوپ میں سانولائے سپاہیوں نے پیٹ بھرے فولاد کو ایک طرف رکھ چھوڑا تھا۔ نالیوں، دونالیوں کے جوڑ جوڑ میں غصہ تھا۔ لیکن گیت گاتے ہوئے چہروں پر نہ معلوم کسی مٹی کی نرمی تھی اور پھر دائرے کے دائرے پر اُترتی دھوپ کی چمک تھی۔ انہی کے بیچ میں مجھے ایک چھوٹا سا، مسکین سا لڑکا، عجب تقدیر کے ساتھ سمجھوتہ کئے ہوئے بیٹھا دکھائی دیا۔ فرض شناسی کے جذبے میں میں اس منظر کو کیمرے میں محفوظ کرنے لگا۔

ایک مشکل سا گھونٹ نگل کر میں نے ساتھی گارد کے سپاہی سے پوچھا۔

"جمعدار صاحب۔ یہ لڑکا کون ہے؟"

"پلٹن کا بیٹا" سپاہی نے کندھے پر سے رائفل اُتار کر کہا۔

"پلٹن کا بیٹا؟ کیا مطلب؟"

"مطلب یہی کہ پلٹن نے اسے گود لیا ہے۔"

"کہاں ہے؟ کس سے؟"

"یہیں سے ـــ"

ایسا لگا کہ سپاہی سے اور کچھ پوچھنا منع ہے۔ اس لئے میں خود آگے بڑھا اور موت کی سرحد سے لوٹے ہوئے انسان کی اُس دھڑکن کے پاس آگیا جو آواز بن کر ڈھولک کی تال کے ساتھ مل گئی تھی۔ گیت جنگ کا تھا نہ جنگ بندی کا، گیت رُلاتا تھا نہ ہنساتا تھا۔ گیت ایسا کہ جس کے صاف صاف بول ہیں، لیکن بول ایسے کہ محض آواز۔ آواز جس کی کہانی، جس کا درد، جس کا پیام منہ کھلی توپ پی جاتی تھی اور فضا دیسی کی ویسی رہ جاتی، گونگی کی گونگی، افتادہ، خاک میں ملی ہوئی، بے مطلب، بے معنی۔

لیکن جب میرے کیمرے نے چٹکیں شروع کیں نہ معلوم یہ گیت

عام گیتوں کی طرح کیوں کھلتا ہوا دکھائی دیا اور لوہے کو سونپی ہوئی بوٹیاں کیسے دُھیلی ہوتی دکھائی دیں اور کیوں آدمی آدمی کی آواز، نظروں کا ایک ایک اشارہ، چہرے کا ایک ایک تاثر میرے کیمرے میں گھس کر میرے ساتھ جانا چاہتا تھا؟۔ اور پھر جونہی چند تصویریں لے کر میں نے اپنا کیمرہ بند کیا ڈھولک کا یہ غیر حقیقی گیت حقیقی ماحول سے ٹھیک اُسی طرح ہٹ گیا جیسے آنکھ کھلتے ہی خواب میں بولتی ہوئی چڑیلیں غائب ہو جائیں۔ جوان کھڑے ہو گئے اور دائرہ ٹوٹ گیا۔ ایک ایک نے مجھ سے بات کرنا چاہی، مجھے چھو چھو کر کچھ کہنا چاہا، اور دائرے کے بیچ کا لڑکا بھیڑ سے الگ ہو کر نہ جانے کیوں رونے لگا۔ میرے گرد سپاہی کہاں؟ اب تو گھر بار، امن، چین، بال بچوں سے الگ کٹے ہوئے انسان تھے۔ میں نے بلا جھجک انہی سے پوچھا۔

"بھئی یہ لڑکا کون ہے؟ یہاں کیسے آیا ہے؟"

اُس ایک لمحے کے لئے وہ لڑکا ہر ایک کے دل سے نکل چکا تھا میرے سوال پر سب نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا۔

"ارے للوا کیوں رو رہا ہے؟" کسی نے آواز دی اور پانچ چھ جوان ایک ساتھ اُس کی طرف لپکے اور ایک نے اُسے گود میں اُٹھا کر ناچنا شروع کیا۔ للوا چپ ہو گیا اور آنسو پونچھتا ہوا مسکرایا بھی۔ "اس کا نام للوا ہے؟"

"نہیں جی۔ یہ نام ہم نے اس کو دیا ہے۔ گاؤں میں اس کا نام کچھ اور ہو گا۔"

"کون سے گاؤں میں؟"

میرے اس سوال کا جواب کسی نے نہیں دیا۔ لیکن تقریباً سب کی نظریں ایک ساتھ ڈوبتے سورج کی طرف مڑیں۔ جہاں مغرب سے پھوٹی ہوئی شوخ کرنیں، اُفق کے ایک میلے، مٹیالے حصّے کو نمایاں کر رہی تھیں۔

"یہ لڑکا ہماری پلٹن کا پیارا بیٹا ہے۔" ایک سپاہی جو درجے میں اُن سب میں بڑا دکھائی دے رہا تھا، یہ ظاہر کرتا ہوا آگے بڑھا کہ راز کی باتیں کہنے نہ کہنے کا حق صرف اُسی ایک کو ہے۔

"یہ لڑکا، چھوٹا سا، مُنا سا۔ للوا۔ یہ پلٹن کا بیٹا ہے۔ صاحب جی۔ یہ دیش کا بیٹا ہے۔ اس چھوٹے نے بہت بڑا کام کیا۔"

"یہ تو بتا دیجئے کہ اس نے کیا کیا۔"

"اس نے تو جی بہت بڑا کام کیا۔ منّے کو راجدھانی لے جائیں گے۔ اسے میڈل دلوائیں گے۔"

کیوں جی؟ اس کو تو بہت بڑا انعام ملنا چاہئے؟" سپاہی نے مونچھوں پر اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا جیسے یہ بھی سوچ رہا ہو کہ فوٹو گرافر سے اس سے زیادہ کہنے کا حکم نہیں ہو گا۔

"لیکن یہ بھی بتائیے تاکہ کیا کیا۔ ہم اخبار میں لکھیں گے۔"

گارد کا سپاہی پیچھے سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا پھر آ گیا۔

"چلئے صاحب لے لی تصویریں، چلئے ٹائم ہو گیا ہے۔"

"اچھا؟"

"جی ہاں۔ چلئے" سپاہی کی آنکھوں میں حکم تھا۔ کیمرے کو کندھے پر ڈال کر میں نے بچے کی طرف ایک بار پھر دیکھا۔ اُس کی آنکھیں پھر بھر آئی تھیں۔

میرے راستے میں ایک کھائی تھی اور کھائی کے پرلی طرف ہی میرے لئے گاڑی کے انتظام کی اُمید تھی۔ ڈھلتی شام کے سوکھے سایوں نے گرم ہوا کو بھی پی لیا۔ اور پسینوں سے میرے کپڑے تک بھیگنے لگے۔ گارد کے سپاہی کو اپنی رائفل کے بوجھ سے زیادہ بھاری میرے کندھے پر لٹکتا ہوا کیمرہ ہی لگا۔ بولا۔

"آج کل تو فوٹو کا کام بھی بھاری ہو گیا ہے۔"

"جی ہاں" میں نے بے رُخی سے جواب دے کر اپنا پسینہ پونچھا۔"

"ٹھہریئے! میں آپ کے لئے . . . . . " اس ادھورے جملے کے ساتھ ہی اُس نے اُونچی آواز میں کسی کو پکارا۔

مجھے خیال تھا کہ جنگ کی اس سرحد پر اور عالمگیر موت کے ایسے پیار میں ایک بچہ بھی غیر معمولی اہمیت کا مالک

سپاہی نے ایک آواز ایسی دی جیسے پلٹن کا ایک نوکر بھی ہو۔ آواز کے جواب میں ایک اور لڑکا گھنی جھاڑی کے پیچھے سے لپک کر نکل آیا یہ لڑکا کچھ بڑا تھا۔ اس ماحول میں بھی گالی کا حقدار سا اور گھر سے نکالا ہوا سا۔ کرتے پر کئی دنوں کی مٹی تھی۔ بالوں میں ریت ریت سی، آنکھوں میں بیماری سی۔ لیکن اس کے کندھے پر میرا کیمرہ لٹکایا جا سکتا تھا اور وہی پھر میرے ساتھ کھائی میں اترنے لگا۔ کھائی میں اترتے ہی لڑکے کا پاؤں پھسل گیا اور پھسلتے ہی وہ رو پڑا۔ اور اس کا بدن کانپنے لگا۔ اس اطمینان کے ساتھ کہ کیمرے کو ضرب نہیں آئی ہے میں نے لڑکے کو سہارا دے کر اٹھایا۔ لڑکا میرے نرم لہجے پر اتنا حیران ہوا کہ اس کا رونا بند ہو گیا اور اس کا بدن کانپنا بھی . . . .

"کیوں چوٹ لگی کہیں ؟" میں نے پوچھا۔ لیکن اس نے صرف سر ہلایا۔

پھر کیوں رونے لگا تھا ؟ تمہارا جسم کیوں ہلنے لگا تھا ؟

اس نے میرے ہاتھ کو یونہی پکڑ رکھا تھا اور اپنی تھکی تھکی آنکھوں کو اور تھکا رہا تھا۔ اس نے جب ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا تو میں نے پوچھا۔

"بھئی لڑکے تم یہاں کیسے آ گئے ؟ وہ . . . وہ . . . چھوٹا سا لڑکا کہاں سے آ گیا۔ تم کہاں سے آ گئے۔ یہاں اس جگہ ؟"

لڑکے کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں سے پانی کی دھاریں بہنے لگیں اور چہرے کی مٹی کو کاٹتی اترتی گئیں۔ زمین کے اس غیر فطری نقشے میں، جس کے خطوط کو ڈھولک کے گیت نے اور ابھار دیا تھا، ہمیں آنکھوں کا یہ پانی بھی اپنے ہی اوپر گرتا دکھائی دیا اور اندر ہی اندر میری جلد بازی کی گرما گرمی ٹھنڈی ہو گئی۔ میں اس کے ساتھ وہیں بیٹھ گیا اور اس یقین کے ساتھ کہ ہم دونوں ایک چھوٹے ٹیلے کی اوٹ میں آ گئے ہیں۔ میں نے لڑکے کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"کہو، بیٹا۔ وہ لڑکا کون ہے اور تم کون ہو ؟"

"میرا ب ب بھائی" کپکپاتے ہونٹوں میں سے صرف اتنا نکلا اور پانی کی دھار موٹی ہو گئی۔

"بھائی — ؟ ہاں — تمہاری شکل تو ملتی ہے۔ لیکن بیٹا یہاں کیسے آ گئے۔ ؟

لڑکے نے ایک لمحہ پیچھے کی طرف دیکھا اور اپنے میلے ہاتھوں سے پانی کی لکیروں کو مٹا کر منہ پر پونچھا سا لگایا۔ اور پھٹی پھٹی آنکھوں والا اور کیچڑ سے پٹا ہوا وہ چہرہ میری اپنی آنکھوں پر ہمیشہ کے لئے بیٹھ گیا۔

"کہو بیٹا۔ کوئی نہیں دیکھ رہا۔"

"میرا بھائی . . . . . میرا چھوٹا بھائی"

"ہاں۔ ہاں۔ تم اور تمہارا چھوٹا بھائی۔"

"ہم۔ ہم۔ ہم دونوں۔ کوٹھے پر، کوٹھے پر سو رہے تھے۔"

"ہاں۔ ہاں۔"

"بادل۔ بادل۔ بادل گرجنے لگے۔ اوپر آسمان پر۔ بادل۔ بادل نہیں تھے۔

میں نے کہا بھونچال — بھونچال آیا۔ . . . دوڑے نیچے . . . . " وہ پھر ہچکیاں لینے لگا۔

"گھر میں، گھر میں کوئی نہیں تھا — کوئی بھی نہیں۔ پھر۔ پھر مٹ۔ مٹ۔ مڑو کے گھر کوئی نہیں تھا — کوئی نہیں — پھر پھر — پھر — تائی کے گھر میں کوئی نہیں تھا۔ پھر پھر — بازار میں کوئی نہیں تھا۔ پھر پھر اسکول میں، اسکول میں کوئی نہیں تھا۔ سارے گاؤں میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ہم۔ ہم۔ بہت ڈر گئے۔ جور جور سے رونے لگے۔ بھونچال۔ بھونچال بہت آیا۔ میں نے کہا سپنا ہے۔ سڑک پر بیٹھ گئے۔ ماں کو آواز دی۔ بہت آواز دی۔ بہت آواز دی — پھر پھر ایک آدمی — سپاہی دوڑا۔ سپاہی ہمارے پاس دوڑا دوڑا آیا۔ دونوں کو پھر پھر پکڑ کر لے گیا۔ لے گیا کھڈوں میں — کھائی کے اوپر کھڈوں میں —"

"کون سے کھڈوں میں ؟"

اور سپاہی تھے وہاں، کھڈوں میں اور . . ."

"اچھا اچھا خندق میں - پھر ؟"

"پھر سپاہی نے کہا - کہا لیٹ جاؤ - لیٹ جاؤ - ٹکڑے ہو جائیں گے - اور کہا — پھر، پھر، پھر کھونچال نہیں تھا - سُنا نہیں تھا، لڑائی تھی، لڑائی ہو رہی تھی - گولے، گولے، گولے -

"ہاں ہاں پھر کیا ہوا ؟"

"پھر پھر ہم لیٹے رہے - دونوں - میں اور بھائی - دونوں"

"لیکن تم کو ماں باپ ساتھ نہیں لے گئے ؟ . . .

"پتہ نہیں - پتہ نہیں - سپاہی کہہ رہے تھے، جلدی میں چلے گئے - اماں - بھائی - تائی - شب گئے — بھاگ گئے — وہ وہ . وہ کہاں ہیں - اماں، بھائی، تائی . . . وہ، وہ گاؤں والے کہاں ہیں ؟" لڑکا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، اور میرے ذہن میں بات صاف ہو گئی کہ دو لڑکے خوفناک بھاگم دوڑ میں وہیں رہ گئے تھے - اپنے مکان کی چھت پر اور ماں، بھائی، تائی، جو بھی تھے وہ اپنی اپنی جان لے کر بھاگ گئے یہی سمجھ کر کہ لڑکے اُن سے پہلے نکل چکے ہیں - نہ جانے اور کیا بات ہو گئی تھی —

"پھر پھر - پھر کھڈ میں سپاہی کو پیاس لگ گئی، اُن کی بوتلوں میں پانی نہیں تھا - اور - اور گاؤں پاس نہیں تھا — پھر، پھر، پھر میں نے کہا - مجھے اُٹھنے دو - میں - میں، پانی لاؤں گا - پاس کھائی میں پانی ہے مجھے پتہ ہے - میں لاؤں گا، میں لاؤں گا — دوسرا دُوسرا سپاہی بولا - اس کو چُپ کراؤ - نہیں، نہیں کرتا چُپ جانے دو - مرنے دو — پھر پھر سپاہی کو پیاس بہت لگی تھی، بہت لگی تھی - اُس کے، اس کے ہاتھ میں خون تھا - اس نے کہا، کہا پانی لانے دو - دُوسرا - دوسرا بولا - باہر کوئی نہیں جائے گا - بولا، بولا، بولا خون سے مُنہ مُنہ گیلا کرو - کوئی چلاؤ، چلاؤ پھر پھر میں لیٹے لیٹے رونے لگا - میرا بھائی جور جور سے رونے لگا - پھر پھر خون والے سپاہی نے میرے ہاتھ میں، میرے ہاتھ میں بوتل دی اور میں کھڈ سے باہر بھاگنے لگا - بوتل، بوتل لے کر دُوسرا سپاہی، دُوسرا سپاہی بولا - رُک جاؤ - رُک جاؤ - مرے گا، لیٹ جاؤ، لیٹ جاؤ وہیں اور سپٹ پر چلو، پیٹ پر — یُوں یُوں - پھر پھر پھر — پھر میں . میں تھوڑی دور پیٹ کے بل چلا گیا، پھر اُٹھ کے چلا . دوڑا، کھائی کی طرف — اسی، اسی، اسی کھائی میں —"

لڑکے کے منہ پر مردنی چھا گئی -

"اسی، اسی کھائی میں - وہاں، وہاں، وہاں پانی ہے پانی کے پاس آیا اور، اور، اور —"

وہ رُک گیا -

"بول بول بول - بیٹے جلدی بول - ہاں، ہاں پھر ؟"

پھر، پھر، پھر - وہیں دیکھا، دیکھا، پاس ہی، پاس ہی، ایک اور، ایک اور سپاہی بیٹھا ہے - وہاں، وہاں، وہاں - اُس نے بُلایا، اور اور میں گیا - اُس کے پاس - اُس کی ٹانگوں میں بھی خون تھا، دونوں، دونوں ٹانگوں میں — اُس نے، اُس نے میری بوتل چھین لی اور اور سارا پانی پی لیا - پھر، پھر، پھر اُس نے اُس نے مجھے پکڑ لیا - اور - اور . . . " لڑکے کا بدن پھر کانپنے لگا -

پھر پھر پھر اُس نے - اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا گلا پکڑ لیا - خوب زور سے پکڑ لیا - بولا - بولا - دُشمن کے بچے - دشمن کے بچے - لے، لے، لے تیرا . . . میرا - میرا - میرا گلا گھٹ گیا - اور، اور، اور میں نے کہا میں - میں - مر گیا . . . مر گیا . . . مر گیا —"

لڑکے کی گھگی بندھ گئی، اور بولنے کی کوشش میں وہ توتلے سے توتلا ہوتا گیا - اُس کے آنسوؤں کے گھونٹ گلے میں پھنستے گئے اور گھونٹ گھونٹ اور ہچکیوں میں سے اس کی معصوم بولی کے ٹکڑے ہوئے ٹکڑے میرے دل میں شیشے کی طرح گھستے چلے گئے، میرا

سر چکرانے لگا اور اسی چکر میں مجھے ایسا دکھائی دیا کہ ننھی سی کلی دھواں اگل رہی ہے اور اسی دھوئیں دھوئیں میں کھائی کا وہ حصہ اپنے آپ میرے سامنے آگیا، جہاں ٹھنڈا پانی تھا اور وہیں اپنی جگہ پر لڑکے کے پاس بیٹھے بیٹھے مجھے ایسا لگا کہ ایک سپاہی بیٹھا ہوا ہے، سپاہی بالکل ویسا ہی جیسے وہ تھے جو کھائی کے اُوپر تھے، وہی رنگ، وہی لباس، وہی گیت، وہی گالی، بالکل ویسا ہی سپاہی جس کی ٹانگوں سے خون بہہ رہا ہے۔ لیکن جس کی کھنچی ہوئی آنکھوں سے لہو ٹپک رہا ہے۔ جس کے جنگ جُو ہاتھ ایک چھوٹے سے لڑکے کے گلے پر فولاد بن گئے ہیں اور لڑکے کی گردن جُھک گئی ہے اور پھر کھائی کی کانٹوں دار گھاس کے نیچے سے ایک بھاری پتھر سا بول رہا ہے ــــ "سالا، سالا، دُشمن کا بچہ، دُشمن کا بچہ۔ لے لے، لے۔ سالا دُشمن کا بچہ ــــ"

میری اپنی آنکھوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں میں مجھے ایسا دکھائی دیا کہ گلا دباتے دباتے سپاہی اپنا مُنہ بچے کے مُنہ کے قریب لایا اور مکتا تھا کہ ابھی دانتوں سے اس کی ناک کو کاٹ کھائے گا۔ پھر جیسے پانی کی خالی بوتل سپاہی کے زخمی پیر کے نیچے آگئی اور سپاہی رُک گیا ــــ

"سالا، سالا دُشمن کا بچہ ــ سالا، سالا۔ طوطا۔ سالا ناک طوطے جیسی سالا طوطا ناک۔ سالا، سالا، سالا طوطا ناک ــــ"

دھوئیں میں پھر مجھے کچھ ایسا دکھائی دیا کہ پتلے سے گلے پر فولاد کچھ ڈھیلا ہوگیا ــــ سالا طوطے کی ناک کہاں سے لایا؟" دیکھا کہ جھکی ہوئی گردن سیدھی ہونے لگی۔

"بول سالے یہ طوطے کی ناک کہاں سے لایا ــــ؟ بول ــــ اب سالا بولتا کیوں نہیں ــ کس گاؤں کا ہے سالے؟"

دیکھا کہ لڑکا خالی بوتل کو ترس رہا ہے اور سُوکھے گونٹ نگل رہا ہے۔

"کس گاؤں سے آیا؟" پھٹا ہُوا پتھر گرج سا اٹھا۔

دیکھا کہ لڑکے نے آنسو پونچھے اور کچھ کہا ــ دیکھا کہ سپاہی کی آنکھیں چوڑی ہوگئیں ــــ سالا۔ گاؤں کہاں ــ اُس کا نشان بھی نہیں اب؟ لیکن سالے یہ ناک کہاں سے لایا؟ ــــ طوطا ناک بدری طوطا ــــ"

میری آنکھوں میں دُھواں اور کالا ہوگیا اور مجھے صرف لڑکے کا رونا سُنائی دیا۔ پھر پتھر گرجا۔

"بدری طوطا ــــ؟ تیرا باپ؟ بدری طوطا تیرا باپ؟ بدری طوطا تیرا باپ کہاں سے ہوگیا۔؟"

دُھواں کچھ کم ہوگیا اور مجھے سپاہی کے آنسو دکھائی دیئے۔

"بدری طوطا میرا دوست تھا۔ میں اُسے طوطا کہتا تھا۔ سب اُسے طوطا کہتے تھے۔ اُس کی ناک ایسی ننھی جیسی تمہاری۔ بالکل ایسی۔ بالکل طوطے کی۔ تب، تب تم نہیں تھے۔ تمہاری ماں ہی نہیں تھی، بدری طوطا تھا اور ہم تھے۔ طوطا گلی ڈُور پھینکتا۔ درختوں سے اُوپر اُچھالتا ہم کہتے طوطا اُڑ گیا ــــ اور تم۔ تم۔ تم بھی طوطے ہو ــــ بدری کے بچے میرے بچے، میں تیرا چاچا ہُوں ــــ دیکھ میرا خون بہہ رہا ہے۔ میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ ٹانگ پر گانٹھ لگا دے۔ خون رُک جائے گا۔ میرے ہاتھوں میں گانٹھ لگانے کی طاقت نہیں۔ لگا دے ..... اور اور دیکھ میں یہیں بیٹھا ہوں۔ اٹھ نہیں سکتا۔ لیکن دیکھ دشمن وہاں سے چلے گا۔ وہ دیکھ راستہ صاف ہے۔ پلٹن کی پلٹن کو اُڑا دوں گا میرے سب آدمی مارے گئے۔ میں بدلہ لوں گا جانتے ہو یہ کیا ہے۔ مشین گن۔ اُٹھا لا بوتل بھر کے۔ میں اور پی لوں گا، تم بھی پیو گے۔ لاؤ بھر کے بوتل ــــ" دیکھا کہ تھر تھراتا کانپتا لڑکا کھڑا ہوگیا اور بوتل اُٹھائے بغیر بھاگنے لگا۔ پتھر پھر پھٹ گیا۔ "گولی مار دوں گا طوطے۔ مت جا۔"

دیکھا کہ لڑکا سہم کر وہیں بیٹھ گیا۔ اور اُسی پتھر کی آواز سے گھٹنوں کے بل آگے گھسٹتا گیا اور سپاہی کی ٹانگوں پر گانٹھ لگانے بیٹھ گیا۔

میرے سامنے بیٹھے ہوئے لڑکے کی آواز کچھ سنبھل گئی اُس کی ہچکیاں رُک گئیں۔ اُس کے آنسو سوکھ گئے۔ اور میری آنکھوں کا دھواں چھٹ گیا کھائی میں بس میں تھا اور وہ لڑکا۔

"پھر، پھر، پھر۔ تھوڑی دیر میں اُوپر سے گولی چلی۔ وہ۔ وہ وہیں

(بقیہ ص ۴۱ پر)

غزلیں

باقر مہدی

کہتے ہیں زندگی کی ضیا لے گئی ہوا
اور جاتے جاتے کالی گھٹا لے گئی ہوا

اک شورِ بے نوا مری آنکھوں میں رہ گیا
بیکس کے قہقہوں کا مزا لے گئی ہوا

معنی کی جستجو مجھے رنگوں میں لے گئی
لفظوں کے ٹوٹنے کی ادا لے گئی ہوا

سارے ورق کتاب میں جلتے ہی رہ گئے
خوابوں کا ایک باب لکھا لے گئی ہوا

دھڑکن بنا کے نم کو لہو میں چھپا لیا
خوشبو بنا کے کیسے چرا لے گئی ہوا؟

اک چیخ گونج کے میرے ہونٹوں پہ رہ گئی
صحرا میں کیسے میری صدا لے گئی ہوا؟

وہ کشمکش ہے، آخری لمحے عذاب ہیں
ڈھونڈوں کہاں کہ میری قضا لے گئی ہوا؟

داڑھی بڑھائی میں نے تو کہنے لگے ندا
باقر تمہارا چہرہ اڑا لے گئی ہوا

ندا فاضلی
آج کل دہلی

صغیر احمد صوفی

ہے دعوتِ تجدیدِ وفا، دیکھئے کیا ہو
ہر زخم ہوا دل کا ہرا، دیکھئے کیا ہو

اُس زلف کی مہکار لئے دشتِ جنوں میں
پھرتی ہے کئی دن سے صبا، دیکھئے کیا ہو

غیروں کے ستم اور پھر اپنے سے بغاوت
اس دور میں جینے کی سزا دیکھئے کیا ہو

ہاتھوں میں خداؤں کے بھی کشکولِ ہوس ہے
اب اس کے سوا روزِ جزا، دیکھئے کیا ہو

سورج کا جلا خنکیٔ مہتاب کا گھائل
آیا ہے کوئی آبلہ پا، دیکھئے کیا ہو

ہے جسم پہ احساس کے پیراہنِ شعلہ
ہر سانس میں جلتی ہے چتا، دیکھئے کیا ہو

تو یہ ہے مجھے یاد، مگر موسمِ گل میں
اُٹھتی ہے کئی دن سے گھٹا، دیکھئے کیا ہو

بے مہریٔ احباب کا شکوہ کریں کس سے
بجھتا ہے تعلق کا دیا، دیکھئے کیا ہو

ناکام اُمنگوں کا دھواں پھیل رہا ہے
اب شعلۂ احساس بجھا، دیکھئے کیا ہو

نکلیں گے شبِ ہجر میں دیدار کے پہلو
لگ جائے مری آنکھ ذرا، دیکھئے کیا ہو

دیکھا کہ مرے ہاتھ میں ہے ہاتھ کسی کا
اس خواب کی تعبیر بھلا، دیکھئے کیا ہو

ہم جیسے طرحداروں کے یوں دار و رسن پر
حیران ہیں اربابِ وفا، دیکھئے کیا ہو

کچھ روز سے وہ پرسشِ احوال کرے ہے
صوفی کو محبت میں عطا، دیکھئے کیا ہو

رشید حسن خاں

معائبِ شاعری

[illegible]

اس حصے میں جلیل مانک پوری کے دو اہم اقوال کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ جلیل نے پدرام پوری کے ایک استفسار کے جواب میں لکھا تھا:

"کچھ نظروں کا جو مقصود ہے وہ ظاہر ہے
یعنی کچھ سامنے، کچھ آڑ لئے بیٹھے ہیں"

اس میں یعنی کی ی بے شک تقطیع سے گرتی ہے۔ شعر اعنی الامکان فارسی عربی الفاظ کی یا نہیں گراتے لیکن اتفاقی طور سے اگر گر جائے تو اس کو غلط نہیں سمجھتے کیونکہ اساتذہ کے کلام میں اکثر اس کی نظیریں ملتی ہیں کہ مفرد الفاظ کی یا گر گئی ہے۔"

(نقوش خطوط نمبر جلد ۲ ص ۳۶۸)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک فارسی عربی الفاظ کے آخر سے یائے معروف کے سقوط کو محض بربنائے احتیاط منع کیا گیا ہے۔ ورنہ بجائے خود یہ غلط نہیں۔ اگر اس بات کو ملحوظ رکھا جائے کہ جلیل کا شاگرد اساتذہ میں تھا اور اساتذہ کے یہاں ضرورت اور چلن کے مقابلے میں احتیاط کا پہلو عموماً غالب رہا کرتا تھا تب اس قول کے مضمرات کو صحیح طور سے سمجھا جا سکتا ہے۔ بہرحال اس سے یہ ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ فارسی عربی الفاظ کے آخر سے یائے معروف کا ساقط ہو جانا ان کے نزدیک بھی مطلقاً غلط نہیں تھا۔

۱۔ حافظ سید جلیل حسن جلیل، تلمیذ و جانشین امیر مینائی، متوفی: یکم صفر ۱۳۶۹ھ، مطابق ۲۰ جنوری ۱۹۴۹ء۔ (یادِ رفتگان، مکتبہ الشرق کراچی)

جلیل نے اس خط میں یہ تو نہیں لکھا کہ حروف علت کے سقوط کے مناسب یا غیر مناسب ہونے کا تعلق محل استعمال سے ہے، کہیں ناگوار بھی ہو سکتا ہے اور کہیں بالکل بُرا نہیں معلوم ہوگا لیکن ایک دُوسرے خط میں انھوں نے ایک استفسار کے جواب میں، اُردو افعال میں حروف علت کے دبنے کو معیوب بتایا ہے اور اس سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ اُن کے نزدیک، حروف علت کا دبنا، بجائے خود نہ صحیح ہے نہ غلط۔ اور نہ اس سلسلے میں عربی فارسی اور اُردو ہندی کے الفاظ کی تفریق کی جا سکتی ہے کہ فارسی عربی کے لفظوں میں تو اس کو ناروا قرار دیا جائے، اور اُردو ہندی کے لفظوں میں روا رکھا جائے۔ اور ظاہر ہے کہ اس انداز نظر کی صحت میں مطلق گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ جلیل نے نفیس بنگلوری کے خط کے جواب میں لکھا تھا:

"کیا اور دیا اور دی وغیرہ جو افعال منصرفہ ہیں، اُن میں حرف علت کا گرنا معیوب ہے۔"

(نقوش۔ خطوط نمبر۔ جلد ۲ ص ۲۵۰)

اسی حصے میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ بہت سے لفظ ایسے ہیں جن میں حروف علت خصوصاً واؤ کا دب کر نکلنا ہی اچھا معلوم ہوتا ہے اور اگر ان کو اس کے بغیر نظم کیا جائے، تو بے حد ناگوار معلوم ہوگا۔ اس ذیل میں بھی ایک مثال کا اضافہ کرنا چاہوں گا۔

دلاور ہیں، بہادر ہیں ظفر جو رستم میداں
وہ اعدا کی سدا شمشیر دو دستی پہ ہنستے ہیں

(دیوان ظفر، موسوم بہ دیوان حضور والا ص ۲۵)

یہاں "شمشیر دو دستی" میں لفظ "دو" جس طرح نظم ہوا ہے، (واو کے اظہار کے ساتھ) اور اس سے مصرع کی روانی جس طرح مجروح ہوئی ہے، وہ اس کی بہت اچھی مثال ہے کہ بہت سے الفاظ میں حروف علت کا دبنا ہی فصیح ہے۔ فارسی میں بھی اس قبیل کے الفاظ اسی طرح (بغیر اظہار) فصیح سمجھے جاتے ہیں، جیسے تو، ہمچو وغیرہ

اعلان نون: عربی فارسی کے وہ لفظ جن کے آخر میں نون ہو،

ہند شیخ محمد ابراہیم صاحب ذوق دام برکاتہم، باہتمام بندۂ خاکسار پنڈت مولی لال پرنٹر و پبلشر، مطبع دہلی اُردو اخبار، مکان مولوی محمد باقر صاحب میں چھاپہ ہوا۔" یہ اہم اشاعت اب بہت کم یاب ہے۔ اس کا ایک ناقص الآخر نسخہ راقم الحروف کے پاس ہے اور وہی پیش نظر ہے۔

ہ دیوان میں یہ لفظ بغیر نون ہی چھپا ہوا ہے۔ پوری غزل کی یہی صورت ہے۔ ہنسنا، پھنسنا جیسے الفاظ کو بعض حضرات اُس زمانے میں بغیر نون ہی صحیح سمجھتے تھے۔ داغ نے ایک خط میں لفظ پھنسا کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ بغیر نون صحیح ہے۔ اس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ افتخار عالم مارہروی کو ایک خط میں داغ نے لکھا ہے:

"لفظ پھنسنا بغیر نون کے صحیح ہے۔ چناں چہ میں نے بھی یہی کہا ہے۔ زمد کے شعر سند میں لکھتا ہوں .... اُستاد ذوق فرماتے ہیں:

ہوں یہ لاغر جھک کے قامت ایک خس کے بوجھ سے
جوں کبادہ لچکے ہے پائے مگس کے بوجھ سے
نکلے دُنیا سے کہاں احمق اٹھا کر بارِ حرص
رہ گیا یہ تو گدھا دل دل میں پھنس کے بوجھ سے

اُستاد میر فرماتے ہیں

اب کے بھی سیر باغ کی دل میں ہوس رہی
اپنی جگہ بہار میں گنج قفس رہی:
دیوانگی کہاں کہ گریباں سے تنگ ہوں
گردن مرے ہی طوق میں گویا کہ پھنس رہی

بہادر شاہ ظفر فرماتے ہیں:

مرغ اسیر چھوٹ گئے گر قفس سے دس
صیاد تیرے دام میں اور آئے پھنس کے دس"

(زبان داغ ص ۱۰۵-۱۰۶) (سلسلہ اگلے صفحہ پر)

ہ مطبوعہ مطبع دہلی اُردو اخبار، دہلی۔ اس کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے: "یہ دیوان اول مطبع سلطانی میں چھپا تھا، مگر اکثر جگہ صحت کو نہ پہنچا تھا، سو اب مکرر تصحیح جناب افصح الفصحا ابلغ البلغا خاقانی

اور نون سے پہلے الف، واؤ، یا، میں سے کوئی حرف ساکن ہو، جیسے جان ایمان، خون، جنون، دین، تحسین وغیرہ، تو ان لفظوں کو شعر میں کس طرح نظم کیا جائے، اعلانِ نون کے ساتھ، یعنی جان بروزنِ مال، یا اخفائے نون کے ساتھ، یعنی جاں بروزنِ ہاں۔ اور اگر یہ لفظ مرکب اضافی یا مرکبِ عطفی کا آخری جزو ہوں، جیسے دشمنِ ایماں، جوشِ جنوں، حافظِ قرآں دنیا و دیں، دین و ایماں وغیرہ اس صورت میں کیا نون کا اعلان کیا جائے گا؟

اس کا سیدھا سا جواب تو یہ ہونا چاہئے کہ جہاں نون کا اعلان مناسب ہو وہاں اعلان کیا جائے اور جہاں اخفا کا محل ہو، وہاں اس کو اختیار کیا جائے اور اس کا اصل معیار ذوق ہوگا۔ مصرع کی روانی، اور اس کا صوتی آہنگ اگر اخفا کا مقتضی ہو تو وہی صحیح ہے اور اگر اعلان کا طالب ہو تو وہی درست ہے۔ لفظ خواہ مفرد ہو یا مرکب، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اساتذہ نے اس بات کو تسلیم نہیں کیا اور مفرد اور مرکب لفظوں کو الگ قاعدوں کے پھندوں میں کسا ہے۔ مرکب لفظوں سے متعلق تو یہ

لیکن صاحب فرہنگ آصفیہ نے پھنسنا اور پھانسنا اور ہنسنا ان سب الفاظ کو مع نون لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داغ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ متفقہ قول نہیں ـــــ ہاں داغ نے جو شعر سند میں پیش کئے ہیں، ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پھنسنا بغیر نون صحیح ہے، کیوں کہ از روئے قواعد، دس کا قافیہ بھی مع نون ہو سکتا ہے اور اس میں مطلق قباحت نہیں۔ ہائے مخلوط کی طرح، نون غنہ بھی ان الفاظ میں داخلِ حروفِ قافیہ نہیں جلیل مانک پوری نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے: دس اور بس میں سین حرفِ روی ہے اور اس کے ماقبل حرفِ مفتوح کی قید ہے۔ نون غنہ حرفِ قید میں شامل نہیں۔ دس، بس کے ساتھ ہنس پھنس کا قافیہ جائز ہے۔ (نقوش خطوط نمبر ص ۲۵۴)

مثالوں کے غلط ہونے کے باوصف، داغ کا قول اس لحاظ سے قابلِ توجہ ہے کہ انھوں نے اپنی ایک رائے واضح طور سے ظاہر کی ہے اور مثالوں کے غلط ہونے سے اس قول کا غلط ہونا لازم نہیں آتا۔ قیاس سے کہا جا سکتا ہے۔ ذوق کا بھی یہی خیال تھا اور دیوانِ ظفر کی یہ غزل اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے۔

قطعی فیصلہ کیا گیا ہے کہ ان میں نون کا اعلان کسی صورت میں بھی روا نہیں۔ ہر مرکب جز کو لازماً بہ اخفائے نون نظم کرنا چاہئے۔ اس لحاظ سے دشمنِ جاں صحیح ہے اور شرمندۂ احسان غلط ہے اور مفرد لفظوں کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ (کچھ لفظوں کو مستثنا کر کے) عموماً مفرد الفاظ کو اعلانِ نون کے ساتھ نظم کرنا چاہئے۔ مولانا حسرت موہانی نے لکھا ہے:

"فارسی کے جو الفاظ اردو زبان میں عام طور پر رائج ہیں، اُن کے متعلق دستور یہ ہے کہ اگر وہ بلا اضافت ہوں تو رواجِ اہلِ زباں کے خلاف اُن میں نون کا اعلان کیا جائے۔ لیکن ترکیب فارسی میں اعلانِ نون جائز نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً صرف مکاں یا جاں کہنا ہوگا تو مکاں اور جاں اعلانِ نون کے ساتھ بولیں گے جس کی کتابت کے لئے نون کے پیٹ میں نقطہ دینا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اگر آفتِ جاں یا رگِ جاں کہنا ہوگا تو آفتِ جاں اور رگِ جاں میں ترکیب فارسی کی موجودگی کے باعث اعلانِ نون جائز نہ ہوگا اور کتابت میں نون بے نقطہ لکھا جائے گا۔"

(نکاتُ السخن۔ ص ۹۱)

لہ مولانا حسرت موہانی کی یہ کتاب بہت قابلِ قدر ہے۔ یہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے: متروکاتِ سخن، معائبِ سخن، محاسنِ سخن، نوادرِ سخن، اصلاحِ سخن۔ قواعدِ شاعری اور اُن سے متعلق بہت سی بحثوں کے سلسلے میں یہ بہت مفید ہے۔ مثالیہ اشعار بہت کثرت سے جمع کر دیئے گئے ہیں اور اس سے مولانا کی دقتِ نظر اور کثرتِ مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو ان مسائل سے دلچسپی ہے، اُن کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ آخری دو باب علاحدہ سے چھپے ہیں۔ اس کتاب میں شامل نہیں۔ اس کی صراحت دیباچے کے آخر میں کی گئی ہے (ص ۸) لیکن یہ میری نظر سے نہیں گزرے۔ اس کا دوسرا باب معائبِ سخن بھی علاحدہ سے چھپا ہے اس کا دوسرا ایڈیشن میرے سامنے ہے جو رئیس المطابع کان پور سے

(سلسلہ اگلے صفحے پر)

اور بحالتِ ترکیب اعلانِ نون کے ناجائز ہونے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ:

"۔۔۔۔ جب ترکیب فارسی ہو تو اعلان، جیسا کہ ذوق دہلوی کے کلام میں جا بہ جا ہے، جائز نہیں۔ جب فارسی ترکیب ہو تو فارسیوں کا اتباع چاہیے اور وہ اس قسم کے الفاظ اعلان کے ساتھ نہیں باندھتے۔ اور ایک آدھ جگہ جو اُن کے کلام میں یہ اعلان پایا جاتا ہے تو یا تو وہاں سہو کاتب ہے یا من قبیل شاذ۔"

(ایضاح[1] ۔ ص ۱۸)

اس سلسلے میں تین اہم باتوں کو نظر انداز کر دیا گیا، جس کی وجہ سے مفرد و مرکب کی تفریق اور اعلان و اخفا کی قید غیر مناسب بن کر رہ گئی۔ پہلی بات یہ کہ روز مرّہ کی بول چال میں کچھ لفظ عموماً اعلان کے ساتھ بولے جاتے ہیں۔ جیسے خون، دین، ایمان وغیرہ اور کچھ لفظ ہمیشہ اخفائے نون کے ساتھ بولے جاتے ہیں۔ جیسے گریاں، خنداں، وغیرہ۔ ان سب لفظوں کی صورت یہ ہے کہ ان میں کچھ لفظ ایسے ہیں کہ وہ مفرد ہوں یا مرکب اور نظم میں ہوں یا نثر میں، اُن کو اگر اعلان کے ساتھ استعمال کیا جائے گا تو وہ ہمیشہ ناگوار معلوم ہوں گے، خواہ اساتذہ کے بنائے ہوئے قاعدے کے مطابق اعلان جائز ہو۔ اور کچھ لفظ ایسے ہیں کہ وہ دونوں طرح استعمال میں آسکتے ہیں، ان میں صوتی اعتبار سے ناگوار کیفیت زیادہ نمایاں نہیں ہو پاتی۔ ظاہر ہے کہ اسی اعتبار سے ان کے متعلق فیصلہ بھی کیا جانا چاہیے۔

دوسری بات یہ کہ بہت سے مرکبات ایسے ہیں جو گفتگو میں اور نثری تحریروں میں عام طور سے اعلانِ نون کے ساتھ بولے جاتے ہیں اور اُن کی صورت یہ ہے کہ اُن کو اگر قاعدے کی پابندی کے خیال سے بالجبر بہ اخفائے نون بولا جائے تو ناگوار صوتی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ مثلاً اسی "اعلانِ نون" کو لیجیے۔ اس کو اعلانِ نوں (بہ اخفائے نون) کہہ کر دیکھیے تو محسوس ہوگا کہ کیسی بھدی آواز پیدا ہوئی ہے اگرچہ بہ لحاظ قاعدہ یہی صحیح ہے۔ مشہور قول ہے: الشعر ائمۃ تلامیذ الرحمٰن۔ اس میں نون کا اعلان ہے۔ اب حالی کے اس شعر کو دیکھیے۔

دعویِ فضل و براعت اس کو زیبا ہے یہاں
جو کوئی تلمیذ رحماں تم میں ہو میرے سوا

(مجموعہ نظم حالی ص ۷۹)

اس میں "تلمیذ رحماں" زبان سے ادا تو ہو جاتا ہے جھٹا نہیں، اجنبی سا معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ قاعدے کے لحاظ سے یہ بالکل صحیح ہے۔ ایک اور مثال:

راکبِ حزم ترا ناقۂ صالح تہ راں
رائضِ عزم ترا دوشِ ملائک پہ سوار

(مومن۔ کلیات طبع لاہور ص ۴۹)

اس میں بہ لحاظِ قاعدہ "تہ راں" بہ نونِ غنہ صحیح ہے، لیکن پڑھنے میں کسی

(سلسلہ ص سے آگے)

۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا۔ نکاتِ سخن کا چھٹا ایڈیشن میرے سامنے ہے جو انتظامی پریس حیدرآباد کا چھپا ہوا ہے۔

[1] مولفہ سید ظہیر حسن شوق نیموی۔ تلمیذ شاد لکھنوی اپنے زمانے کے معروف اہلِ علم میں تھے۔ جلال کے سب سے بڑے حریف تھے، کئی رسالے اُن کی رد میں لکھے ہیں۔ متوفی ۱۷ رمضان ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۴ء) "شوقِ سخنور" مادۂ تاریخ وفات ہے (مثنوی سوز و گداز۔ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں)

اُن کا ایک مختصر سا رسالہ اصلاح اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوا تھا، اس میں متروکات اور بعض قواعد کا ذکر ہے۔ جب یہ رسالہ دوسری بار شائع ہوا تو شوق نے اُس پر نظرِ ثانی کی اور اس پر "مختصر سا حاشیہ" لکھا اور ایضاح نام رکھا۔ اس کی دو اشاعتیں میرے سامنے ہیں۔ ایک وہ جس کو مولانا حسرت موہانی نے اُردوئے معلیٰ پریس علی گڑھ سے شائع کیا تھا اور دوسری وہ، جس کو منشی نثار حسین نے قومی پریس لکھنؤ میں ۱۸۹۳ء میں چھاپا تھا۔ حوالہ آخر الذکر اشاعت کا دیا گیا ہے۔ اس کے آخر میں اُن کا ایک اور رسالہ ازاحۃ الاغلاط بھی شامل ہے، جس میں اُن عربی فارسی الفاظ کو یکجا کر دیا گیا ہے، جن کو عام طور سے غلط استعمال کیا جاتا ہے۔

قدرے جوڑ معلوم ہوتا ہے؛ اس سلسلے میں یہ بات بھی دیکھنے کی تھی کہ بہت سے مرکبات ایسے بھی ہیں جو اخفائے نون اور بہ اعلانِ نون دونوں طرح بولے جا سکتے ہیں۔ اور دونوں صورتوں میں وہ بدنما نہیں معلوم ہوتے۔ مثال کے طور پر غالب کے اس شعر میں "بلائے جاں" کی ترکیب بہ اخفائے نون نظم ہوئی ہے، اور بالکل ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

(دیوان غالب نسخۂ عرشی ص ۱۵۸)

یہی ترکیب ذیل کے شعر میں بہ اعلانِ نظم ہوئی ہے، اور اس صورت میں بھی بُری نہیں معلوم ہوتی:

ہے بلائے جان یہ افعی یہ نخلِ یاسمن
یا کہ ہے یہ دام بہر عاشقانِ خستہ تن

(تصور لکھنوی تذکرۂ مجمع الانتخاب)

گویا سارا مسئلہ محلِ استعمال اور اندازِ استعمال کا ہے۔ تیسری بات جو سب سے اہم تھی، اور جس کو بے طرح نظر انداز کیا گیا، یہ تھی کہ اساتذہ دہلی کے یہاں ذوقؔ و غالبؔ بلکہ حالیؔ کے زمانے تک اعلانِ نون کی پابندی ہرگز نہیں تھی۔ وہ مرکبات کو بے تکلف بہ اعلانِ نون نظم کیا کرتے تھے۔ داغؔ کے ابتدائی کلام میں بھی اس کی مثال ملتی ہے۔ البتہ بعد کو انھوں نے سختی سے اس کی پابندی کی اور یہ اثر تھا اُن کے قیامِ رامپور کا، جہاں لکھنوی شعراء و اساتذہ کے جمگھٹے میں وہ بہت سی پابندیاں عائد کرتے اور نافذ کرنے پر مجبور ہوئے۔ ان دہلوی شعراء کے یہاں بے شمار اشعار میں بصورتِ ترکیب نون کا اعلان ملتا ہے اور اُن میں نہ معلوم کتنے اشعار ایسے ہیں جن میں یہ اعلان کسی طرح بُرا نہیں معلوم ہوتا۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ایک طویل مدت تک نون کے اخفا یا اعلان کو کوئی مسئلہ ہی نہیں سمجھا گیا اور ضرورت اور آسانی کے لحاظ سے طرزِ عمل اختیار کیا گیا۔ تو اُس کے اثرات تو زبان اور شاعری میں تہ نشین ہوئے ہوں گے اور اُن اثرات کے باعث بہت سے مفرد و مرکب لفظ ایسے سامنے آئے ہوں گے، جن میں اخفا یا اعلان محلِ استعمال اور ضرورت و آسانی کے تابع رہا ہوگا، کسی قاعدے کا اسیر نہیں بنا ہوگا طویل مدت تک شاعری کی زبان میں بہت سے مرکبات کو بہ اعلانِ نون نظم کئے جاتے رہنے سے کیا یہ مرکبات، جن کی صورت اختیار نہیں کر گئے ہوں گے اور زبانِ شاعری سے روشناس نہیں ہو گئے ہوں گے!

ان اُمور کو نظر انداز کر دینے سے اور محض ایک جامد قاعدہ بنا دینے سے سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ جن مرکبات کو بہ اعلان نظم کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا، اُن کو بھی مجبوراً اسی طرح نظم کیا گیا اور حسنِ کلام کی بالکل پروا نہیں کی گئی اور اسی وجہ سے یہ قاعدہ آج مفروضہ معلوم ہوتا ہے۔ میں ذیل میں کچھ ایسی مثالیں پیش کرتا ہوں، جن سے یہ ثابت ہوگا کہ اگر سلیقے سے استعمال کیا جائے تو بہت سے مرکب الفاظ میں بھی اعلان اسی طرح گوارا ہوگا جس طرح وہ بہ اخفائے نون گوارا معلوم ہوتے۔ اور یہ کہ اساتذہ نے مرکب لفظوں کو بہ اعلانِ نون کثرت سے نظم کیا ہے۔ یہ چند مثالیں محض نمونۂ کلام کا حکم رکھتی ہیں:

لوٹے ہے خاک و خون میں غیروں کے ساتھ میرؔ
ایسے تو نیم کشتے کو اُن میں نہ سانیے

میرؔ (کلیات مرتبہ آسی ص ۱۹۴)

غنچہ ہی وہ دہان ہے گویا ؛ ہونٹ پر رنگِ پان ہے گویا

میرؔ (کلیات مرتبہ آسی ص ۲۲۵)

خوبرو سب کی جان ہوتے ہیں ؛ آبروئے جہان ہوتے ہیں (میرؔ)
مارا تھا کس لباس میں عریانی نے مجھے ؛ جس سے تہہ زمین بھی میں بے کفن گیا (؟)
ہم نے کون و مکان دیکھ لیا ؛ پل میں سارا جہان دیکھ لیا

(میر سوز (اُردوئے معلیٰ دہلی سوز نمبر ص ۷۷)

آرزو تھی عدم میں دُنیا کی ؛ ہے یہ وہم و گمان دیکھ لیا
شہرِ عدم کو قافلے لاکھوں گئے ولے
چل چل کے نت میں بے سر و سامان رہ گیا (منتخب سخن مرتبہ حسرت موہانی ص ۱۳)
کب کا اک عمر سے جھگڑا تھا دل و جان کے بیچ
کام دونوں کا کیا یار نے اک آن کے بیچ (ص ۳۱)
گیا ہے چھوڑ کر جس کو تو اے آبادیٔ عالم ؛ وہ مضطر کیا درونِ خانۂ ویران لوٹے ہے
جرأت (انتخاب سخن ص ۶۸)

کیا لڑکپن کا ہے عالم اس بتِ نادان کا
بھولی بھالی صورت اور تس پر وہ بالا کان کا۔ جرأت (انتخاب سخن ص ۶۸)

مل مجھ سے اے پری تجھے قرآن کی قسم
دیتا ہوں تجھ کو تختِ سلیمان کی قسم — انشا (کلامِ انشا ص ۱۴۶)
مت میں جس کی ہے تو اُسی کی قسم تجھے
اور اپنے دین و مذہب و ایمان کی قسم — " " "
قمری و بلبلِ نالاں میں پڑے جو جھگڑے
سو دلِ غمزدہ کے موجبِ تسکین ہوئے — " (ص ۲۵۱)
جی ہی اچھا نہ رہا پھر تو عیاذاً باللہ
فائدہ کیا جو شناسائے اراکین ہوئے — " "
نظر آتی ہے اشکِ انشا میں
جبرئیلِ امین کی تصویر! — " "
کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرتِ انسان پر
فعلِ بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پر — " (ص ۹۶)

کون وہ بے سر و سامان ہے یارب جز اشک
جس کی خاطر کہیں برسات نہ ہونے پائی — درد
اور بھی چاہیے سو کہیے اگر
دلِ نامہربان میں کچھ ہے — "

جھوٹ جانوں کلام اس رہزنِ ایمان کا
پہن کر جامہ بھی وہ آئے اگر قرآن کا — ذوق
نفسِ بے مقدور کو تھوڑی سی بھی فرصت ہو گر
دیکھ پھر سامان اس فرعونِ بے سامان کا — "
مصحفِ رخ پہ ترے رنگِ سنہرا تیرا

مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان
نافِ زمیں ہے نہ کہ نافِ غزال ہے — "

آج کل دہلی

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں — (غالب)
فرماں روائے کشور ہندوستان ہے
شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

جو اپنے حسرت و ارمان میں بیان کروں
نہ تاب لائے دلِ سخت زاہدِ سالوس — مومن (کلیاتِ مرتبہ کلب علیخاں فائق)
وہ شوخ بے سبب آزار و بے گنہ خوں ریز
کو جرمِ قاتلِ عثمان کا نہ ہو قائل — ص ۳۶
دو کیدل و یک زباں گویا
دو قالب و ایک جان گویا — ص ۱۹۱
چرخِ مینو مضطرب آن آن میں
خضر ڈوبے چشمۂ حیوان میں — ص ۳۴۱

جن و انساں کی حیات ہے تو — حالی (مجموعہ نظم حالی ص ۲۲)
قتلِ انساں ہمیشہ سے ہے عادت تیری — حالی — (ص ۳۳)
اب دیر کیا ہے دُور کر امن و امان کو — میر مہدی مجروح (دیوان ص ۱۸۹)
شکرِ احسان سگِ فطرتِ انسانی ہے — شبلی (کلیاتِ نظم اُردو ص ۸۴)
ہیں جھکے ہوئے سقفِ ایوان سے — اسمٰعیل میرٹھی (کلیات ص ۳)
ہر اک جنس کا ساز و سامان بھی — " (ص ۵)

میر انیس کے کلام میں بھی اعلانِ نون کی مثالیں موجود ہیں۔ مولانا احسن مارہروی نے میر انیس کے کچھ ایسے اشعار نقل کر کے لکھا ہے،

"اہلِ لکھنؤ قدیم سے اس کے پابند ہیں کہ ایسے ترکیبی نون کو بالاعلان نہیں کہتے اور ذوق و غالب تک دہلی والے ایسے نون کا اعلان بے تکلف کیا کرتے تھے اور اب بھی بعض اہلِ دہلی عموماً اور نیچرل شعراء خصوصاً اخفا کی قید کے پابند نہیں۔" (فصیح الملک۔ جنوری ۱۹۰۹ء)

اس زمانے کے بعض شعراء کی مثالیں اس سلسلے میں دلچسپی کے ساتھ دیکھی جائیں گی اور اُن سے اور زیادہ اندازہ ہوگا کہ ترکیب کی صورت میں

بھی نون کا اعلان تناسب کی حدود میں رہ سکتا ہے۔ بطور نمونہ محض دو چار مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

توقع دوستوں سے کیوں وفاداری کی ہے تجھ کو
کسی کا کون اب شرمندۂ احسان ہوتا ہے — احسان دانش

اُجالا ہے مشرق کے ایوان میں
سحر ہوگئی شام و یونان میں — سردار جعفری

شکستہ دوش پہ دیوارِ چین کو لادے
سروں پہ مصر کے اہرام کو اٹھائے ہوئے
دست و پا شل ہیں کنارے سے لگا بیٹھا ہوں
لیکن اس شورشِ طوفان سے ہارا تو نہیں — وامق

مولانا محمد علی مرحوم کے یہ دو شعر بھی دیکھیے:

عالم میں آج دھوم ہے فتح مبین کی
سُن لی خدا نے قیدیِ گوشہ نشین کی

بہر خدا یہود و نصاریٰ کو دو نکال
یہ ہے وصیت اُس کے رسولِ امین کی

ان ساری مثالوں میں نون کا اعلان گراں نہیں گزرتا۔ اُوپر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کی روشنی میں یہ مان لیا جانا چاہیے کہ ترکیب کی صورت میں نون کا اعلان لازماً غلط یا غیر مناسب یا بارِ سماعت نہیں ہو سکتا۔ وہ مناسب بھی ہو سکتا ہے اور غیر مناسب بھی اور اس کا تعلق صرف محلِ استعمال اور اندازِ استعمال سے ہوگا۔ جہاں سلیقے سے ایسے لفظ آئیں گے اور اُن الفاظ میں بجائے خود بھی اخفا یا اعلان سے کوئی خاص مناسبت ہوگی، وہاں اسی طرح کی صورت پیدا ہوگی۔ مناسب اعلان نون کی کچھ مثالیں اُوپر پیش کی گئی ہیں۔ ذیل میں چند ایسی مثالیں درج کی جاتی ہیں جن میں ترکیب کی صورت میں نون کا اعلان نہایت ناگوار معلوم ہوتا ہے:

ہوا بر جھل دیدۂ گریاں کے آگے — جرأت
کہ اک بجلی سی تہ دامان لوٹے ہے — "
دم مارے نہ دل اس دلِ نالاں کے آگے — "
میں طرفہ تماشا شبِ ہجراں میں دیکھا — مصحفی

ان سارے مقامات پر اعلان نہایت ناگوار ہے۔ بات وہی ہے کہ یہ سب لفظ وہ ہیں جو گفتگو میں بھی لازماً بہ اخفائے نون بولے جاتے ہیں۔ اس لیے ان میں اعلان ہمیشہ بُرا معلوم ہوگا۔

مختصراً یہ بات مان لینا چاہیے کہ ترکیب کی صورت میں نون کا اعلان مطلقاً غلط نہیں اور نہ اس کو کسی قاعدے کا اسیر بنایا جا سکتا ہے اس کے حسن و قبح کا تعلق محض محلِ استعمال سے ہے اور بس۔

مفرد الفاظ کے سلسلے میں اساتذہ نے یہ قاعدہ بنایا تھا کہ کچھ لفظوں کے علاوہ، جو گفتگو میں بالعموم بہ اخفائے نون بولے جاتے ہیں، باقی سب لفظ کو، اگر وہ مفرد ہیں تو بہ اعلان نون ہی نظم کیا جائے۔ کلبِ علی خاں نادر[1] نے لکھا ہے:

"جو آخر الفاظ عربی فارسی میں آتا ہے۔ اگر وہ بے کسی ترکیب کے ہو تو بہ اعلان موزوں کیا جائے جیسا کہ اس مصرع میں کپڑے اتارتے ہیں بلا کر مکان میں ..... غرض یہ ہے کہ جس طرح سے الفاظ روزمرہ گفتگو میں بولے جاتے ہیں، اسی طرح سے موزوں بھی ہوا کریں۔ مگر چند الفاظ ایسے ہیں کہ جن میں یہ قاعدہ قائم نہیں رہتا۔ مثلاً گراں اور خزاں اور رواں اور دواں اور طپاں اور عیاں اور نہاں وغیرذالک۔ ان میں اعلان نہیں چاہیے۔ اس لئے کہ روزمرہ گفتگو میں فصحا بہ اعلان نہیں بولتے ہیں اس سبب سے ان کا اعلان جائز نہیں۔"

(تلخیص معلیٰ ص ۲۹، ۳۰)

بعض حضرات نے پابندیاں عائد کرنے کے شوق میں یہ طے کر لیا کہ مفرد الفاظ کے نون کا کبھی اعلان نہیں کیا جائے گا۔ ان میں منیر شکوہ آبادی

---

[1] احتشام الدولہ مرزا کلب حسین خاں بہادر مبارز جنگ نادر تخلص تلمیذ ناسخ متوفی ۱۲۹۰ھ (تذکرۂ نادر ص ۳، ۸) ان کی کتاب تلخیص معلیٰ، قواعد زبان و قواعد شاعری کے مباحث پر مشتمل ہے۔ مفید کتاب ہے۔ سالِ تصنیف ۱۲۸۰ھ ہے۔ اسی سال مطبع منشی رام سروپ، کمپ فتح گڑھ میں چھپی تھی اب کم یاب ہے۔

اور شمشاد لکھنوی کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ محض لزوم مالایلزم والی بات تھی، اور یہ مسرت کی بات ہے کہ عام شعرا نے کبھی اس کی پابندی نہیں کی کہ ایسے سارے مفرد الفاظ کو لازماً بہ اعلانِ نون نظم کیا جائے۔ دونوں طرح نظم کیا گیا ہے۔ اور یہی صحیح صورت تھی۔ جناب اثر لکھنوی مرحوم نے منیر کے اس الزام کے سلسلے میں کہ مفرد الفاظ کو لازماً بہ اعلانِ نون نظم کیا جانا چاہئے۔ ایک دلچسپ روایت لکھی تھی:

"منیر شکوہ آبادی شاگرد ناسخ نے ایک مطلع کہا۔ ہاتھ ملتے تھے اور کہتے تھے، ہائے کیا خوب مطلع ہے، مگر دیوان میں نہیں رکھ سکتا، کیوں کہ آسمان بے عطف و اضافت نظم ہوا ہے، تاہم اعلانِ نون نہیں ہوتا۔

گنبدِ قبر دوستاں ٹوٹے ✤ اے زمیں، تجھ پہ آسماں ٹوٹے"

(رسالہ 'الحمرا' لاہور) مارچ ۱۹۵۵ء)

یہی منیر ایک جگہ نہایت مجبوری کے عالم میں کہتے ہیں،

منیر افسردہ ہوں پابندیِ عطف و اضافت سے
وگرنہ لطف دکھلاتا مضامیں گریباں کا

(کلیاتِ منیر ص ۲۲۶)

شمشاد لکھنوی کے متعلق، اُن کے شاگرد شوق نیموی نے لکھا ہے۔

"وہ لوگ جن کو اعلان پر بہت اصرار ہے۔ اُن کے دیوان میں بھی بعض جگہ نونِ غنہ مستعمل ہے۔ چنانچہ اُستاد شمشاد لکھنوی، جن کو متروکات سے نہایت ہی احتیاط ہے، اور اعلان کے باب میں بڑی کد رہتی ہے، اُن کے دیوان خزانۂ خیال میں یہ اشعار موجود ہیں۔"

(ایضاح ص ۱۸)

اور اس ذیل میں دو شعر درج کئے ہیں، جن میں عنوان، اور جنون یہ اخفائے نون نظم ہوئے ہیں اور اسی ذیل میں مزید لکھا ہے کہ: مولف بھی وجوباً اعلانِ نون کا پابند نہیں۔"

مصرع کے آخر میں خصوصاً قافیے میں کبھی کبھی اعلان زیادہ کھٹکتا ہے اور وہی لفظ اگر درمیانِ شعر میں آئے تو اتنا بُرا معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ قافیے کے بعد، ردیف کے سوا، اور کوئی لفظ نہیں ہوتا جو اعلانِ نون کی آواز کو دبا سکے اور تناسب کی حدود میں محدود رکھ سکے۔ اس کے برخلاف مصرعے کے درمیان میں ترکیب کے بعد کئی لفظ اور ہوتے ہیں، جن کی پست و بلند آوازیں، اعلان کی آواز کو سنبھال لیتی ہیں، اور وہ تناسب کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ جیسے جذبۂ دین بھی ہے جذبۂ ایمان بھی ہے۔ اس میں جذبۂ دین میں اعلانِ نون کی آواز، اُس قدر نمایاں نہیں ہوتی، جس قدر جذبۂ ایمان میں نمایاں ہوتی ہے۔ یہ پہلو بھی پیشِ نظر رہنا چاہئے۔

حضرات لکھنؤ میں سے مفرد الفاظ میں اعلانِ نون کے سلسلے میں سب سے زیادہ متوازن رائے خورشید لکھنوی کی تھی، انھوں نے لکھا ہے:

"بعض اساتذہ کُل الفاظِ فارسی کو جس میں نون بعد حرف مد واقع ہے، بہ اخفائے نون بغیر ترکیب فارسی ترک کر چکے ہیں، بہ استثنا اُن الفاظ کے جن میں اخفائے نون واجب ہے مثلاً نہاں، عیاں، زیاں وغیرہ۔ بگر میں نے اُن دونوں لفظوں کو تو بلاشک ترک کر دیا ہے کیوں کہ خاص ان دو لفظوں کو بہ اخفائے نون بے ترکیب فارسی لانا، زبان پر بہت ہی بُرا معلوم ہوتا ہے، اور چنداں اُن کی پابندی میں دقت اور خوفِ بے مزگی کلام بھی نہیں ہے، بخلاف اور جملہ الفاظ کے، کہ ان میں دونوں باتیں ہیں، یعنی زبان پر بُرا بھی نہیں معلوم ہوتا اور پابندی میں خوفِ بے مزگی کلام و دقت بھی بہت ہے، لہٰذا اور سب کو جائز رکھا ہے، ترک نہیں کیا ہے، مثل زبان، جہان، آسمان وغیرہ کے۔" (افادات ص ۴۱، ۴۲)

اصل بات یہی ہے۔ 'دقت' اور 'بے مزگیِ کلام' اصل معیار ہے۔ اور اس سلسلے میں ایسا کوئی قاعدہ نہیں بنایا جا سکتا، جس کے تحت یہ قطعی طور سے کہا جا سکے کہ نون کا اعلان بجائے خود صحیح ہے یا غلط۔

لہ سید محمد اصطفےٰ 'خورشید لکھنوی' تلمیذ آغا حجو ہندی لکھنوی، رسالہ افادات، زبان و شادی کی بہت سی مفید بحثوں پر مشتمل ہے اور قابلِ مطالعہ ہے۔ پہلی بار قومی پریس لکھنؤ میں ۱۸۹۰ء میں چھپا تھا۔ اب کم یاب ہے

قیصر قلندر

غزلیں

دھوپ کا گرم فسوں ہے شب کے لباس پر
برسوں سے جی رہا ہوں وفاؤں کی آس پر

کیسی بہار ہے کہ ترنم کے شہر میں
خاموشیوں کی دھول سی ہے آس پاس پر

رعنائیوں میں ڈوب گئی تھی تمام رات
جلوے دمک رہے ہیں ابھی سبز گھاس پر

حق بات کو دیا ہے فتورِ خرد کا نام
خوش ہیں حواریوں کی وہ بے جا سپاس پر

یادوں کے رُخ پہ دردِ جدائی کا رنگ ہے
صدمے اٹھا رہا ہوں میں فردا کی آس پر

سایے کی طرح یاد کی خوشبو ہے ساتھ ساتھ
قربت کی کیا نوازشیں ہیں دل اداس پر

روتی رہی تھی رات ہوا برف زار کی
ویرانیاں بھی نوحہ کناں تھیں ہراس پر

میں نے کہا تھا عمر گزاریں ہنسی خوشی
کیوں آپ مسکرائے ہیں اس التماس پر

قیصر سنائیں کس کو تہی دستیوں کا حال
دھوکا نظر بھی کھا ہی گئی خوش لباس پر

دلوں کے زخم سلگتے رہے جفاؤں سے
یہ وہ چراغ ہیں بجھتے نہیں ہواؤں سے

تمہارے شہر میں ملتا ہے یہ وفا کا صلہ
دکھوں کے گھاؤ لگے ہم کو آشناؤں سے

ٹھٹھر رہی ہے خزاں رنگ رات تنہائی
سلگ رہی ہے ابھی یاد کی ہواؤں سے

عروسِ شب تیری زلفوں میں چاندنی گم ہے
بہک رہے ہیں قدم پھر سیہ گھٹاؤں سے

کچھ اس طرح سے سلگتا ہے آرزو کا بدن
برس رہے ہوں شرارے خنک خلاؤں سے

رواں تھا آبِ خموشی مجھے نہ تھا معلوم
پڑیں گے درد کے پتھر حسیں فضاؤں سے

ہمارے درد نے پہنا ہے رنگ و بو کا لباس
مہک غموں کی بھی آتی ہے خوش قباؤں سے

بجا کہ نبضِ زمانہ پہ ہاتھ ہے قیصر
میں ڈر رہا ہوں مگر وقت کے خداؤں سے

آرزو نے پہنا ہے رنگ و بو کا پیراہن
موسمِ جنوں لایا پھر لہو کا پیراہن

حسرتوں کی زردی ہے زندگی کے چہرے پر
سوچ پھر پہن لیتی گفتگو کا پیراہن

دھیان کے گلستاں میں یاد کے ہیں کانٹے بھی
کس طرح بچاؤں گا جستجو کا پیراہن

چاندنی سنا کھوئی جنگلوں میں جسموں کے
میں تلاش کرتا ہوں آرزو کا پیراہن

تم نے بھی سنا ہوگا شہر کے کنارے پر
روپ نے اتارا ہے روبرو کا پیراہن

سنگ سے لہو ٹپکا، نور پھول سے برسا
وقت نے بھی پہنا ہے پھر نمو کا پیراہن

کاش تم میری باتیں کہہ سکو اسے قیصر
دے سکو جو اشکوں کو گفتگو کا پیراہن

شیخ فرید

آہوخانہ

ممتاز محل کا عارضی مدفن

ممتاز محل کا عارضی مدفن ـــ "آہوخانہ"

زین آباد ـــ برہان پور دارالسرور کے نواح میں ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ بشیر خاں فاروقی ـــ والیٔ خاندیس ـــ نے فتح قلعۂ اسیر کے بعد اسے حضرت زین الدین کے نام پر دریائے تاپتی کے دوسرے کنارے آباد کیا تھا۔ اس مبارک نام کی برکت سے اس مختصر آبادی نے جلد ترقی کرلی اور رفتہ رفتہ یہ نیل اور کپڑے کی تجارت اور کاغذسازی کا زبردست مرکز بن گئی۔

فاروقی سلاطین کے عہد میں یہاں ایک عمدہ شکارگاہ تھی، جہاں ہرن کثرت سے پائے جاتے تھے۔

۱۰۰۹ھ میں سقوطِ قلعۂ اسیر نے فاروقی جاہ وجلال کے تار و پود بکھیر دیئے اور دو سو سال سے زائد مدت کا جمع کیا ہوا بے شمار خزانہ اور قلمی نوادر کا بیش بہا ذخیرہ، اُن کے آخری مالک ـــ بہادر شاہ فاروقی کے ہمراہ مغل تصرف میں چلا گیا۔ شہنشاہ اکبر کے حکم سے برہان پور سے انھیں آگرہ بھیج دیا گیا اور آگرہ نے لاہور کا اشارہ کیا . . . . .

. . . . . اور خاندیس سے دُور ـــ بہت دُور، اس زرخیز علاقہ کے حاکم کو دریائے راوی کے حسین کنارے ایک مستحکم قلعہ میں محفوظ کردیا گیا، جہاں اُس نے نظربندی کی صعوبتوں میں زندگی کے آخری دن گذارے۔ اور اس طرح فاروقی شان و شوکت کے دفتر کا ورق ورق منتشر ہوگیا۔

خاندیس ـــ مغل دآندیس ـــ کا پہلا عامل ـــ دانیال مقرر ہوا۔ اکبر نے دانیال کے نام پر اس علاقہ کا نام داندیس رکھا تھا مگر اُسے "قبولِ عام کی سند" نہ مل سکی۔

یہ بلانوش شہزادہ، سیر شکار کا بے حد شوقین تھا۔ شکار کے لیے اُس نے ایک خاص بندوق بنوائی تھی جس پر ذیل کا شعر کندہ تھا ؎

از شوقِ شکارِ تو شود جاں تر و تازہ
بر ہر کہ خورد تیر تو، یکہ و جنازہ

اور یہی بندوق اس کی موت کا باعث بن گئی۔ محل میں شراب کے داخلہ کی پابندی پر بندوق کی نالی میں شراب لائی گئی۔ ۱۰۱۳ھ میں یہ "زہر آلود" کا فرجان لے کر اس کے مُنہ سے چھوٹی۔

اس الم انگیز اور حسرت اندوز موت نے دآندیس (نام) کو

لوحِ جہاں سے "حرفِ مکرّر" کی مانند مٹا دیا۔

برہان پور سے شاہدرہ جاتے وقت ـــ دلاور خانی ـــ کے قریب بائیں ہاتھ پر دانیال کی آخری آرام گاہ پر ایک بلند اور عظیم الشان گنبد قائم تھا۔ چند سال ہوئے گر گیا ہے۔

زمانے کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اُس کے نام کے ساتھ اُس کا آخری نشان بھی اس علاقے سے مٹ گیا ہے۔

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تُو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانہ کی خاک

فاروقی سلاطین کے دور میں 'آہو خانہ' ایک شکارگاہ تھا۔ ممکن ہے کہ یہاں فاروقی عہد کی کچھ تعمیرات ہوں، جن پر دانیال نے تعمیری اضافے کئے ہوں۔ یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں اُس وقت کون کون سی عمارتیں تھیں۔ مگر آج ایک منہدم احاطہ میں ـــ حوضِ کلاں، خاص محل، ویران باغ، بارہ دری، دو تین چھوٹے چھوٹے حوض اور پائیں باغ میں ممتاز محل کا عارضی مدفن، باقی ہیں۔ حوضِ کلاں اور خاص محل کا طرزِ تعمیر مغلیہ طرز سے مشابہ ہے۔ حوض کی وسعت، فاروقی دور کے باغات کے حوضوں کی یاد کو تازہ کرتی ہے، جن کا ذکر اب صرف تاریخی کتب میں محفوظ رہ گیا ہے۔

مغل بادشاہوں نے اپنے ذوق اور نفاست پسندی کی وجہ سے قدیم عمارات میں کچھ تعمیری اضافے کئے، اور اُن کو ایسی شکل و صورت دیدی کہ بعد میں پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ طرزِ تعمیر کے لحاظ سے باقی عمارات شاہ جہانی دور سے تعلق رکھتی ہیں۔

شیر شاہ سوری کی آگرہ برہان پور سڑک کے آخری حصہ ـــ ـــ سنگِ سخت کے ایک قدیم پل ـــ سے دریائے تاپتی کو پار کرنے کے بعد برگد کے "مسافر نواز"، سایہ دار درخت کے قریب سے ایک منہدم ـــ ریت میں پوشیدہ ـــ دیوار کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ غالباً یہ آہو خانہ کی پہلی فصیل ہو گی۔ جو سیلِ تاپتی کے مقابلہ میں ایک رکاوٹ کا کام دیتی تھی۔

یہ فرشی پل اور برگد کا مسافر دوست درخت ایک عرصہ سے پانی کی بلا خیز موجوں کا مقابلہ کر رہے ہیں اور اُس فریدالعصر شہنشاہ شیر شاہ سوری کی یاد دلاتے رہتے ہیں، جس کی حسنِ تدبیر اور رفاہِ عام کی کارگزاریوں کے غیر فانی نقوش زمانہ کے صفحات پر آج تک روشن ہیں۔

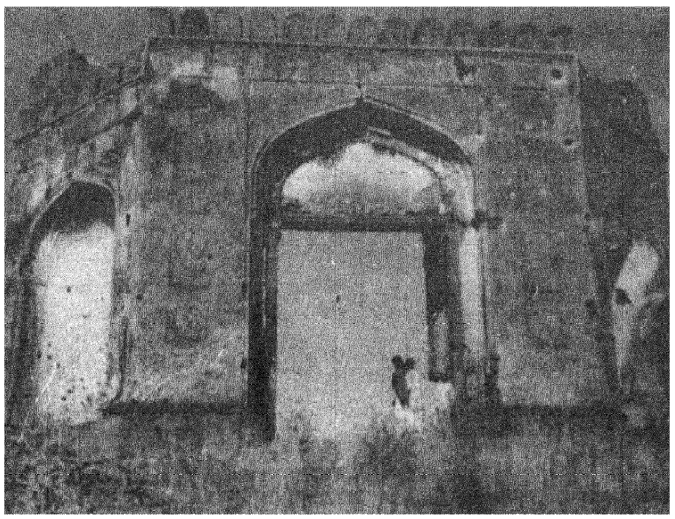

بلند دروازہ

ریت سے پوشیدہ دیوار کے آثار کو کہیں کہیں سے ندی کے پانی نے کاٹ کاٹ کر عریاں کر دیا ہے۔

آگے بڑھ کر تھوڑے ہی فاصلہ پر ایک اور فصیل کے آثار نظر آتے ہیں جس کا شاندار، بلند دروازہ، احاطہ کی شکستگی میں اب تنہا مصروفِ ماتم ہے۔

اس بلند دروازے کے دونوں طرف بلند محرابی کمرے ہیں۔ لداؤ دار چھت پر جانے کے لئے بازو سے اندرونی رُخ پر زینے بنے ہوئے ہیں۔ ایک زینہ شکستہ ہو گیا ہے۔ دوسرا باقی ہے۔

اس مقام سے باغ کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے، جس کے خمیدہ کمر درخت، سوکھے حوض، شکستہ فوّاروں کے نشانات، اور ویران روشیں

نگاہِ تصور کے سامنے مغلیہ جاہ وجلال اور شان و شوکت کے پُرشکوہ مناظر پیش کرتے ہوئے زائر کو دوسرے احاطہ تک پہنچا دیتے ہیں، جو تقریباً بارہ مربع فرلانگ قطعۂ زمین کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ احاطہ کی مضبوط اور مستحکم ۷۶ انچ اونچی اور ۳۶ انچ چوڑی — اینٹوں اور عمدہ چونے سے بنی ہوئی — دیواریں — آج تک قائم ہیں۔

بارہ فٹ عریض احاطہ میں پہنچتے ہی حوضِ کلاں، بڑا محل، بارہ دری، اور دو حوض نظر آتے ہیں۔ احاطہ کے مشرقی جانب سہ محرابی حجروں سے ایک راستہ پانی کے ذخیرہ کو جاتا ہے۔ جہاں محل گزارہ سے نہر کے ذریعہ پانی لایا گیا تھا۔

اس مقام کی سرسبزی اور شادابی، بیرونی مناظر کی زُہت اور دلکشی نے شہزادہ شاہ جہاں کے دل پر اپنا اثر کیا اور اس کے حکم سے محل گزارہ میں اتاؤلی (ندی) پر ایک بند باندھ کر سات میل لمبی، پختہ سر بند نہر آہو خانہ تک لائی گئی اور شکارگاہ میں ایران کے باغات کی طرز پر ایک "خوش سواد" باغ ترتیب دیا گیا۔ جسے تاریخ میں "باغِ عالم آرا" یا باغِ زین آباد" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ایرانی طرز پر مرتب باغ میں نہروں کے کنارے پھولوں کے پودے اور پھلوں کے درخت لگائے گئے تھے۔ عبدالرحیم خان خاناں کے دور میں کھرنی کے درخت، ایران سے لاکر لگائے گئے تھے۔ اس دور میں خربوزہ کی مختلف قسموں کی کاشت بھی ہوتی تھی۔

احاطہ کے باہر — ستاسٹھ مربع فٹ — پانی کا خزانہ ہے جس کا حجم اکیس فٹ ہے۔ چاروں گوشوں پر دو رُخی اٹھارہ سیڑھیوں والے زینے بنے ہوئے ہیں۔ یہاں نہر کا پانی جمع ہوتا تھا اور چھوٹی چھوٹی نہروں اور مٹی کے نلوں کے ذریعہ باغ کے مختلف حصوں تک پہنچتا رہتا تھا۔ اس خزانہ کے تین طرف سہ دری، محرابی دیوان شکستہ حالت میں موجود ہیں۔ شمالی رُخ پر تعمیری آثار نظر نہیں آتے۔

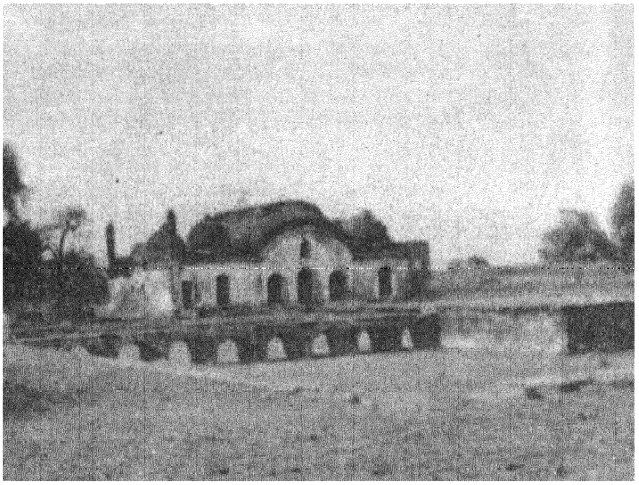

محل اور حوض کلاں

خودرو کانٹے دار جھاڑیاں، خزانہ کی خشک سطح کو توڑ کر باہر نکل آئی ہیں۔

شکستہ اور پامال نہر کے نشانات — مربع اور مدور حوض نما روشن دان — دور تک نظر آتے ہیں۔ جو سر بند نہر کے پانی کو ہوا سے صاف کرنے اور بہاؤ کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے تعمیر کئے گئے تھے۔

مذکورہ بالا ذخیرہ سے پانی مٹی کے نلوں کے ذریعے ایک سنٹر مربع گز حوض میں آتا تھا۔ جس کے مشرقی حصے کے آخری زیریں حصہ میں پتھر کے بنیں نل، ایک دوسرے سے مناسب اور موزوں فاصلے پر لگے ہوئے ہیں۔ ان کے شیر، گائے اور مچھلی کے منھ کے خوش وضع دہانوں کے کچھ حصے مرورِ زمانہ سے ٹوٹ گئے ہیں۔

حوض میں بنی ہوئی چھ فٹ بلند اور ڈھائی مربع فٹ چوکور سیڑھیوں تک پہنچنے کے لئے ایک چھ فٹ عریض اور پچیس فٹ طویل پل پر سے گذرنا پڑتا ہے جس کے پورے طول میں دونوں طرف محرابی کمانیں ہیں، جن کے جستی سنگی حصے اور ان کے سورانخ بتلاتے ہیں کہ سیڑھیوں اور اس راستہ پر شامیانے لگائے جاتے ہوں گے۔

حوض سے متصل — شمالی رُخ پر — ایک محل ہے۔

شاندار بلند دروازہ کی محراب میں سے محل کا منظر

نظر فریب منقش چھت کے گر جانے کے بعد بھی بقیہ آثار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ستونوں اور کمانوں کی دیدہ زیب گل کاری اس خوبصورتی سے کی گئی تھی کہ چمن کی سیر کا لطف آتا تھا۔

باغ کی سرسبزی اور شادابی، اور دریا کے کنارے نے مقام کی دلکشی کو بڑھا دیا تھا۔ اکثر بیگمات یہاں سیر کو آتی تھیں۔

—— سلاطین مغلیہ نے جہاں بھی باغات بنائے، ان میں مناسب مقامات پر حوض، فوارے، نہریں اور آب ریز وغیرہ بھی بنائے تھے۔ یہاں بھی بارہ دری کے سامنے ایک اڑتالیس مربع فٹ حوض ہے۔ جس کے وسط میں ایک فوارہ اور جنوبی سمت پر ایک دس فٹ بلند آب ریز ہے۔

۱۰۳۹ھ میں جب شاہ جہاں برہان پور میں مقیم تھا، اللہ وردی خان —— قراول بیگ نے جو بالا گھاٹ سے لوٹ رہا تھا، اطلاع دی کہ شکارگاہ میں چند شیر دیکھے گئے ہیں۔ اور قراول ان کو ہانکا کیے ہوئے لائے ہیں۔ شاہ جہاں نے بادر کے ذریعہ شیر کے شکار کا حکم دیدیا اور فوراً دس ہزار ذرع (شاہ جہانی) لمبا اور مضبوط جال باغ زین آباد میں لگا دیا گیا۔ اور مختلف وحشی جانوروں کو ہانکے کے ذریعہ اس میں جمع

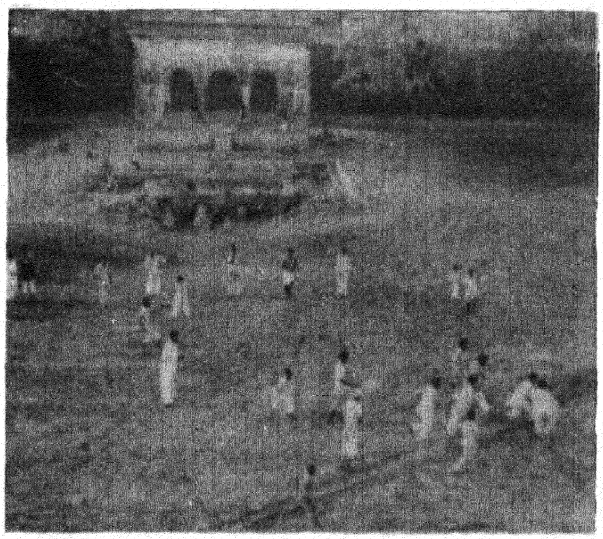

بارہ دری

جس کے وسطی نچلے حصے سے ایک سرنگ نما —— پختہ نہر —— دو حصوں میں منقسم ہوتی ہوئی گذرتی ہے اور بارہ دری کے سامنے والے حوض میں جا کر گرتی ہے۔ خشک حوض کا مشاہدہ اپنے اندر ایک طلسمی اثر رکھتا ہے۔

اسی فٹ طویل اور پچاس اور چار فٹ عریض محل کے طول میں تین وسیع ایوان، اور مشرقی اور مغربی رخ پر تین تین کمرے ہیں۔ مغلیہ انداز کی محرابوں والے دروازوں سے ایک کمرہ سے دوسرے کمرے میں جا سکتے ہیں۔

زمین سے چار فٹ بلند کرسی پر ایک اڑتیس مربع فٹ بارہ دری کی دیواروں کو جوڑی دار سنگی ستون لئے کھڑے ہیں۔

کر کے بادشاہ کو اطلاع دی گئی۔

بادشاہ ایک ہاتھی پر سوار ہو کر صیدگاہ میں پہونچا۔ ایک شیر کو بندوق کا نشانہ بنایا اور گرز برداروں نے چار شیر بچوں کو زندہ گرفتار کر لیا۔

دوشنبہ ۸ رجب ۱۰۴۱ھ کو شاہ جہاں دریائے تاپتی میں مغابیوں کے شکار میں مصروف تھا کہ معتمد خاں نے برہان پور کے سابق صوبہ دار ۔۔۔ پیر خاں خاں جہاں اور اس کے لڑکوں ۔۔۔ عزیز اور فرید ۔۔۔ کے استیصال کی خبر سنائی اور بادشاہ کے سامنے ان کے سر پیش کیے گئے۔

شاہ جہاں نے حکم دیا کہ قلعہ کے دروازے پر ان کے سر لٹکا دیئے جائیں تاکہ لوگوں کو عبرت ہو۔

باغ عالم آرا کی فصیل سے باہر ۔۔۔ بلند دروازے سے کچھ آگے ۔۔۔ تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر ۔۔۔ پائیں باغ میں ایک عبرت خیز عمارت ہے، جس کی ویرانی ہی اس کی سب سے بڑی کشش ہے۔ یہ تاج کی بیگم ۔۔۔ ملکہ ممتاز محل ۔۔۔ کا عارضی مدفن ہے، جس کے گوشہ گوشہ سے حوادث کا اثر نمایاں ہے۔

چار دیواری کے شکستہ احاطہ میں ایک بوسیدہ عمارت، ایک قناتی مسجد اور ایک حوض ہیں۔ احاطہ کے دیواروں کی شکست و ریخت ہی اس کی اندرونی تباہی اور ویرانی کا اشاریہ ہے۔ احاطہ کے جنوبی رُخ کے مسمار بلند دروازے کے چند نشانات پر سے قدم رکھتے ہوئے احاطہ میں داخل ہوتے ہی اس مقام کی ویرانی اور بے کسی کا عبرت آگیں منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

۔۔۔ خشک میدان مہندی کے مرجھائے ہوئے جھاڑ، کانٹے دار جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا گہرا کنواں، بے رونق روشیں، پامال نہریں اور بوسیدہ عمارت ۔۔۔۔ دل و دماغ کو غمگین بنا دیتے ہیں۔

۔۔۔ چار دیواری عمارت کے شکستہ صحن میں ۔۔۔ ایک تہہ خانہ میں اندر کی طرف دھنسی ہوئی ایک خالی قبر ۔۔۔۔

۔۔۔ سنگ و خشت کا ایک نشان ہے، جسے کانٹے دار جھاڑیاں آج بھی نگاہِ نامحرم سے چھپا رہی ہیں۔

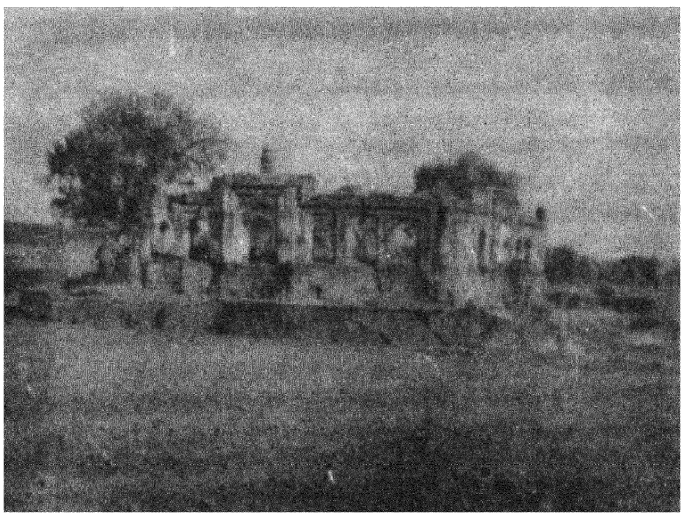

عارضی مدفن کی چار دیواری ۔۔۔ باب داخلہ کے عقب میں قناتی مسجد کی مینار

اس عارضی مدفن کی چار دیواری میں داخل ہونے کے لئے جنوبی رُخ پر ایک بلند دہلیز والا دروازہ ہے۔ ٹھیک اس کے نیچے تہہ خانہ کا راستہ ہے۔ دونوں طرف دو حجرے ہیں۔ جن کا فرش قریب قریب دھنس گیا ہے۔ گمان غالب ہے کہ ان حجروں میں ستی النسا بیگم نے قبر کے مجاور کی حیثیت سے قیام کیا ہوگا۔ ایک محراب شکل مزین پتھر کے دروازے سے داخل ہوتے ہی زائر کو پھر سنبھلنا ہوگا کیوں کہ دیوار سے متصل صحن جگہ جگہ سے دھنس گیا ہے اور حوض کے استر کار حصے نمایاں ہو گئے ہیں۔ اور جہاں زیادہ حصہ کھل گیا ہے، وہاں حوض کی سطح صاف نظر آتی ہے۔ سامنے ہی شکستہ چبوترے پر دھنسی دھنسی جھکی جھکی قبر ہے۔ یہ قبر اس تہہ خانے کے اوپر بنی ہوئی ہے۔

جس میں شہنشاہ شاہ جہاں کی رُوح ۔
تاج کی بیگم . . . . .
ملکہ ممتاز محل کو عارضی طور پر سپردِ خاک کیا گیا تھا۔

اس عارضی مدفن کی منقش دیواروں سے مغلیہ شان و شوکت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اُن پر بنے ہوئے مختلف اقلیدسی اشکال — [دائرے مستطیل، مربع اور مثلث وغیرہ] — میں بناتی نمونوں کی گُل کاریاں کی گئی تھیں۔ نظر فریب اور دیدہ زیب رنگ آمیزی نے ان نقوش کو اُبھار دیا تھا۔ اُن کی تازگی آج بھی مسحور کن ہے۔

شاہ جہاں کے عہد کی شانِ تعمیر اور کمالِ صناعی کی شاہد دیواریں آج "شکوہ سنجِ گردشِ لیل و نہار" ہیں۔

۱۰۴۱ھ میں شاہ جہاں، خان جہاں لودی کے استیصال کے لئے برہان پور آیا ہوا تھا اور اپنے مقصد میں کامیابی کے بعد یہاں مقیم تھا۔

شاہی محل میں ممتاز محل کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ سہ شنبہ ۱۶ ذی قعدہ ۱۰۴۰ھ سے چہار شنبہ ۱۷ ذی قعدہ کی نصف شب تک ملکہ عسرتِ ولادت میں گرفتار رہی۔ اور اس کی صحت حدِ اعتدال سے گرتی گئی۔ اچانک ملکہ کے مزاج میں غیر معمولی تغیر پیدا ہوگیا جب اُہل وقت کے آثار نمایاں ہونے لگے تو شہزادی والاگہر صاحبہ نے شاہ جہاں کو اطلاع دی۔ خبر ملتے ہی شہنشاہ بے قرار و بے تاب ہو کر ملکہ کے سرہانے پہونچا۔

اس رُوح فرسا منظر کا تصور کیجئے . . . . .

جب ہندوستان کا شہنشاہ ایک درد آگیں اور حسرت گزیں دل سے ان محبت بار اور تبسم ریز لبوں سے وداع اور وصیت کے آخری الفاظ سُن رہا تھا . . . .

. . . ملکہ نے شہزادوں کے حق میں عنایات اور اپنے والدین کی جانب مراعات کی درخواست کی۔ رات کا تین گھڑی وقت باقی رہ گیا تھا کہ ملکہ نے جانِ عزیز جان آفریں کے سپرد کر دی۔

ع جائے ممتاز محل جنت بانہ

اس حادثۂ جانکاہ سے محل میں کہرام مچ گیا۔

آہو خانہ کے پائیں باغ میں ایک حوض کو پاٹ کر تہہ خانہ میں شاہی تزک و احتشام کے ساتھ لاش کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

"مجملاً نعش آں عصمت قباب در باغِ زین آباد آں رُوئے آب تاپتی امانت بخاک سپردہ، آخر روز پنجشنبہ آنحضرت بر مرقد منور آں زینت افزائے صدرِ جنت تشریف بُردند" —

(شاہ جہاں نامہ ص ۴۴۸)

بادشاہ نامہ سے مدفن کا ذکر ملاحظہ کیجئے۔

"آں گنجینۂ عفت و خزینۂ عصمت را در عمارت باغِ زین آباد برہان پور کہ آں روئے آب تاپتی واقع شدہ۔ میان جوئے کہ صدر صداست اساس پذیرفتہ، برسم امانت مدفون گردانیدند"

(بادشاہ نامہ جلد اوّل ص ۳۸۶)

بعد میں حجرے، دیواریں، ملحقہ مسجد اور ایک چھوٹا حوض بنا دیئے گئے۔ ستی النساء بیگم نے مجاور کی حیثیت سے چھ ماہ وہاں گذارے۔

چھ ماہ بعد شانزدہ جمادی الاوّل ۱۰۴۱ھ روز جمعہ لاش نکالی گئی اور شاہ شجاع، وزیر خاں اور ستی النساء کی ہمراہی میں آگرہ روانہ کی گئی۔

دریائے جمنا کے کنارے، راجہ مان سنگھ کے پوتے، راجہ جے سنگھ کے محل کے باغ میں دوبارہ عارضی طور پر دفن کیا گیا۔ راجہ نے اُسے "فوزِ عظیم" جانا۔ بگرامورِ شرعی کے پیشِ نظر شہنشاہ نے اپنے خاص محلات میں سے ایک محل اُس کو عنایت کیا۔

پھر ۱۵ جمادی الثانی ۱۰۴۲ کو اُسے اس مقام پر دفن کیا گیا جہاں . . . . . مغلیہ جاہ و جلال کا ایک مرقع اور . . . . غیر فانی محبت کی مرئی شکل . . . . . پوری شان و شوکت کے ساتھ جلوہ گر ہے . . . . . .

جلتی رات

سلگتے سائے

قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے لہو
لمحہ لمحہ پگھل رہی ہے حیات
میرے زانو پہ رکھ کے سر اپنا
رو رہی ہے اُداس تنہائی
کتنا گہرا ہے درد کا رشتہ
کتنا تازہ ہے زخم رسوائی

حسرتوں کے دریدہ دامن میں
جانے کب سے چھپائے بیٹھا ہوں
دل کی محرومیوں کا سرمایہ
ٹوٹے پھوٹے شراب کے ساغر
موم بتی کے ادھ جلے ٹکڑے
کچھ ترا شے شکستہ نظموں کے
اُلجھی اُلجھی اُداس تحریریں
گرد آلود چند تصویریں
میرے کمرے میں اور کچھ بھی نہیں
میرے کمرے میں اور کچھ بھی نہیں

وقت کا جھریوں بھرا چہرہ
کانپتا ہے مری نگاہوں میں
کھو گئی ہے مراد کی منزل
غم کی ظلمت فروش راہوں میں
میرے گھر کی پرانی دیواریں
ہر گھڑی دیکھتی ہیں خواب نئے
پر مری روح کے خرابے میں
کون آئے گا اتنی رات گئے؟

زندگی مہرباں نہیں تو پھر
موت کیوں درد آشنا ہوگی
کھٹکھٹایا ہے کس نے دروازہ
دیکھنا سرپھری ہوا ہوگی

پریم وار برٹنی

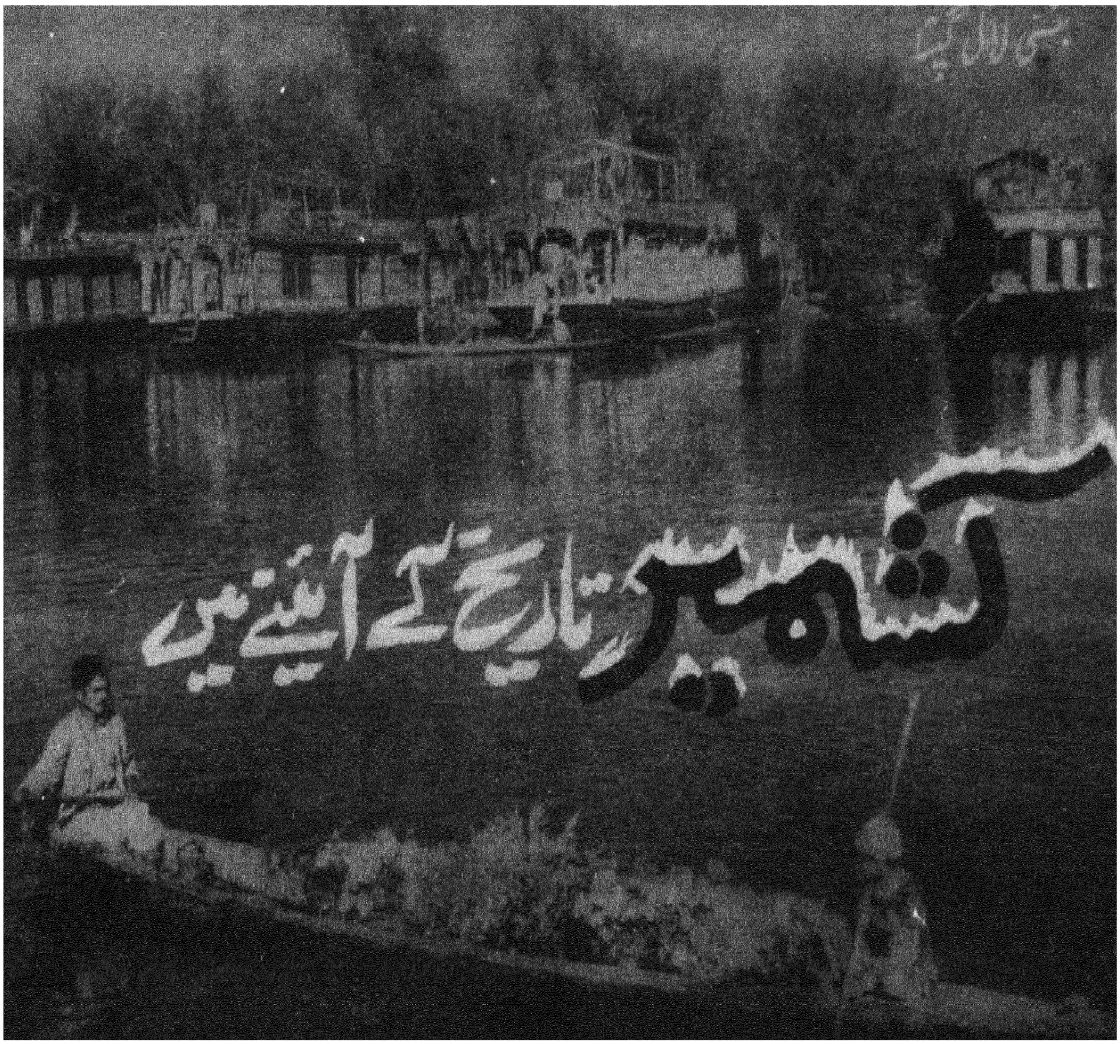

کشمیر کا نام زبان پر آتے ہی ایک نہایت دلکش منظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ بادِ نسیم، چنار کے درختوں کا نغمہ چھیڑتی ہے۔ اونچے اونچے سفیدے کے پیڑ سرمست و سرشار دکھائی دیتے ہیں۔ اور چاندی کی سی سطح والی جھیلوں کی لہریں اپنی سُبک خرامی سے ذہن میں ایک عجیب کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ چوٹیاں برف کا تاج پہنے ہیں۔ ہری ہری گھاٹیاں ہیں اور کل کل کرتے جھرنے۔ ساتھ ہی دھان کے کھیت، پھلوں کے باغ اور کیسر کی کیاریاں ـــــ لیکن کشمیر کی خوبصورتی صرف قدرت کی ہی دین نہیں۔ کہتے ہیں کہ سرزمینِ کشمیر کی تشکیل کا سہرا کیشپ رشی کے سر ہے۔ جنہوں نے ستی سر کے پانی کو نکال کر وادی کو آبادی کے قابل بنایا تھا۔ بہت سے باغات ہیں، پھولوں کی وادیاں ہیں۔ نہریں ہیں اور چشمے ہیں جو اس کی زینت بڑھاتے ہیں۔

قدرتی مناظر کے مطابق ہی وہاں انسان نے اپنی انگلیوں کا جادو بھی دکھایا۔ قالین بافی، شال کاڑھنے، لکڑی پر کھدائی کرنے پیپر ماشی کا کام کرنے اور متعدد دوسری دستکاریوں میں کشمیر کے لوگوں نے وہ کمال حاصل کیا کہ کاریگری اور کشمیر ہم معنی سے الفاظ بن گئے۔ مصوری سے تو ریاست کے لوگوں کو خاص لگاؤ رہا ہے۔

آج کل دہلی

مئی ۱۹۶۹

ریاست کشمیر میں بسوہلی نام کے مقام سے پہاڑی مصوری کی ابتدا ہوئی، جسے اب مغل اور راجپوت قلم کا پیش رو مانا جا رہا ہے۔

کشمیر کو قدرت اور انسان کی دلفریب تخلیقات کا عطا کہتے ہیں اس میں کوئی قباحت تو نہیں۔ لیکن شاید یہ اس سرزمین کی انفرادی خصوصیت کے ساتھ بے انصافی ہو۔ سوال یہ ہے: کیا ہیون سانگ البیرونی، شنکر آچاریہ، رامانج، ابوالفضل اور اسٹین جیسے عالم اور دانشور قدرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے لئے کشمیر آئے تھے؟ یا کیا وہ صحت افزا مقام کی تلاش میں تھے؟

قدرت کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ وہاں علم و دانش کی مشعل روشن تھی، جو صدیوں تک عالموں کی توجہ کا مرکز رہی۔ کہا جاتا ہے کہ رامانج، کانچی ورم، مدراس سے چل کر برہم سوتر کی شرح حاصل کرنے

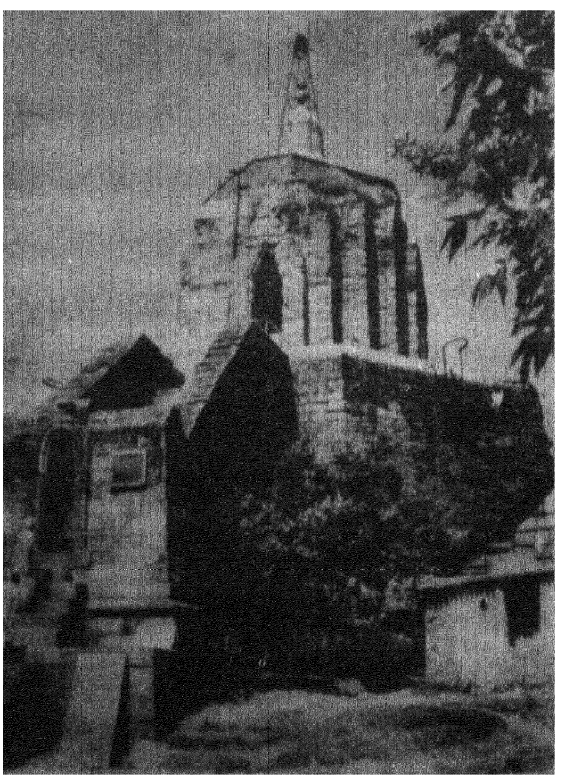

مشنکر اچاریہ کا مندر

گیارھویں صدی میں کشمیر آئے تھے اور گاندھی جی نے بھی تو تاریک برصغیر میں شعاع امید کشمیر میں ہی دیکھی تھی۔ یہ کشمیر کی لمبی اور دلچسپ تاریخ کا نہایت اہم پہلو ہے، جس نے ریاست کو ملک کی تاریخ میں ایک بہت اونچا مقام دیا ہے۔

تاریخ کشمیر کا موجودہ دور ۱۸۱۹ء سے شروع ہوتا ہے جب کشمیر پر افغان حکمرانوں کا راج ختم ہوا اور سکھ حکومت کے ۲۵ برس کے بعد ڈوگروں کی حکومت قائم ہوئی تھی۔ یہ حکومت ۱۰۰ سال تک رہی ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ ہی ریاست میں ڈوگرہ شاہی خاندان کی حکومت ختم ہوئی اور جمہوری نظام قائم ہوا۔ اب تک ڈیڑھ سو برس کا یہ عہد کشمیر کو دور وسطیٰ سے دور جدید میں لایا۔ سارے علاقے میں آمد و رفت کے ذرائع عام ہوئے۔ تعلیم کے مواقع حاصل ہوئے، عوامی زبانوں میں ادبی سرگرمیاں تیز ہوئیں، جمہوری ادارے قائم ہوئے اور انھوں نے فروغ پایا۔ نہریں بنیں، پیداوار میں اضافہ ہوا۔ صنعت و حرفت کی ترقی ہوئی۔ لداخ جیسے دور افتادہ اور پسماندہ علاقے میں ترقی کی ہوائیں پہنچیں۔

ریاست پر تین حملوں کو چھوڑ کر یہ دور امن اور ترقی کا رہا۔ ان حملوں کے نتیجے کے طور پر ریاست کا ایک حصہ اب بھی حملہ آوروں کے غیر قانونی قبضہ میں ہے۔ اسی دور میں جموں اور پونچھ کے علاقے میں رہنے والے ڈوگروں کے ساتھ ساتھ وادی کے لوگوں نے بھی میدان جنگ میں اپنے خون سے شجاعت اور بہادری کی ایک نئی کہانی لکھی۔ لداخ کے لوگ سماجی زندگی کے عام دھارے میں مل گئے ہیں اور آج وہ ترقیاتی کاموں میں برابر کے حصے دار ہیں۔

سکھ اور ڈوگروں سے پہلے تقریباً ۵۰۰ سال تک کشمیر پر ترکوں، مغلوں اور پٹھانوں کی حکومت رہی۔ کشمیر میں مسلمانوں کی آمد کی ایک خاص بات یہ رہی کہ وہ حملہ آور ہو کر ریاست میں نہیں آئے۔ وہ شروع میں وسط ایشیا سے اور تبت سے داخل ہوتے رہے کبھی فقیروں اور مبلغوں کی صورت میں اور کبھی روزگار اور ترقی کے مواقع کی تلاش میں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایک مقامی راجہ ہرشیش

(۱۰۲۸-۸۹ء) کے وقت مسلمان کشمیر میں آباد ہو چکے تھے اور فوج میں عہدوں پر فائز تھے۔ اس طرح وہاں سیاسی اقتدار کے تسلط سے پہلے ہی اسلام اثر پذیر ہو چکا تھا۔

یہ زمانہ اسلام کے عروج اور ہندو سماج کے سیاسی زوال کا تھا۔ سماج کئی بُری رسوم کا شکار تھا۔ راج دربار سازشوں کا گڑھ بنا تھا۔ باہمی پھوٹ اور اقتصادی بحران نے حکومت کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ اس میں کوئی حیرانی نہیں کہ جب کوٹا رانی کو تخت سے ہٹا کر شاہ میر نے سلطان شمس الدین کے لقب سے ۱۳۳۹ء میں حکومت پر قبضہ کر لیا تو لوگوں نے راحت محسوس کی تھی۔

ریاست میں یہ انقلاب تھا۔ حملہ نہیں۔ کیوں کہ شاہ میر کوٹا رانی کا ملازم ہی تھا۔

صدیوں کی اسلامی حکومت کے دوران کشمیر میں کئی خاندان اور کئی بادشاہ ہوئے۔ جن میں سبھی طرح کے حکمران تھے۔ اچھے بھی بہت اچھے بھی۔ بہت برے اور جابر بھی۔

عرب اور ایران کے کلچر کے میل سے کشمیر کے رسم و رواج، خورد و نوش، لباس، ہنر و فن اور ادب پر گہرا اثر پڑا۔ انھیں دنوں وہاں صوفی شاعر ہوئے۔ جنھوں نے فارسی اور کشمیری میں ادب تخلیق کیا۔ بلبل شاہ، ملا شاہ، عزیز درویش نے محبت اور بندگیٔ خدا کی ایک نئی لہر سے کشمیر کی عوامی زندگی کو سرشار کیا۔ فارسی ادب میں کشمیر کے صرفی، غنی۔ دائری حبی اور فانی چمکتے ستارے ہیں انھوں نے اس خوبصورت سرزمین کی زینت بڑھائی اس میں چار چاند لگا دیئے۔ مغل باغ اس کا زندہ ثبوت ہیں، انہی دنوں کشمیر میں امن اور خوشحالی کا دور آیا اور کشمیر کی علیحدگی پسندی ختم ہوئی۔

کہا جاتا ہے کہ علم، اونچے اونچے مکان، کیسر، انگور اور ٹھنڈا میٹھا پانی اور دیگر چیزیں جو شاید جنت میں بھی نہ ہوں، کشمیر میں بافراط ہیں۔

اس علاقے کی مقامی زبان میں بھی ادبی روایات اونچے پائے کی ہیں۔ کشمیری کی صوفی شاعرہ لل دید یا للیشوری نے اپنی

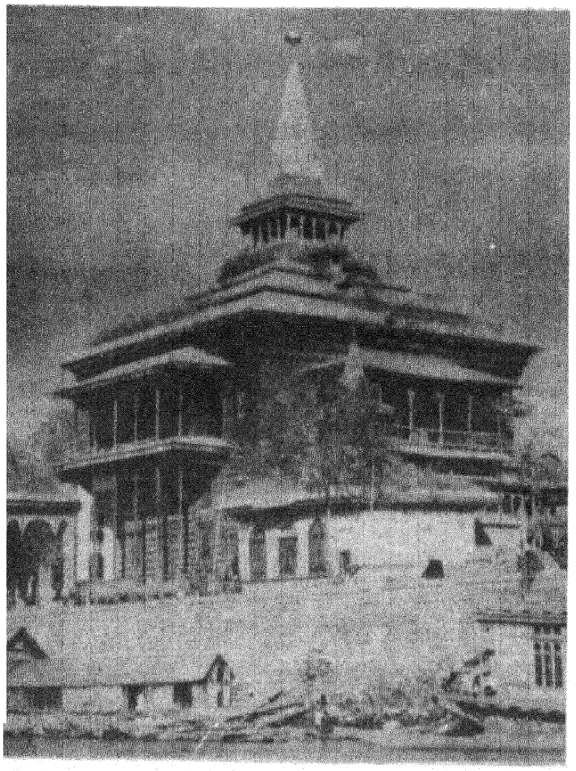

مسجد شاہ ہمدان

'باکھ' میں روحانیت بھگتی اور پریم کا پیغام دیا۔ ایک غریب کسان لڑکی حیہ خاتون محلوں کی زینت بنی۔ لیکن اپنے دل کا سوز بیان کرتے ہوئے اس نے جو کچھ کہا وہ کشمیری شاعری کا انمول خزانہ ہے۔ اگر شمس فقیر اور پرمانند کشمیری کے سنت شاعر تھے تو مہجور اور آزاد ترقی اور دورِ جدید کے پیامبر۔

تقریباً ایسی ہی ترقی ریاست کی دوسری زبانوں ڈوگری اور لداخی میں ہوئی۔ مغل اور افغان حکومت کے آخری دور میں کشمیر میں قحط پڑے طوائف الملوکی کا دور شروع ہوا۔ حکومت سخت پر اثر آئی تھی۔ لوگ عذاب میں تھے۔ انہوں نے سکھ گرو تیغ بہادر اور بعد میں مہاراجہ رنجیت سنگھ سے مدد مانگی اور پناہ چاہی۔

جب جب کشمیر پر مصیبت کے کالے بادل منڈلائے تو مقامی لوگوں نے ملک کے دوسرے حصوں سے جن کے ساتھ ان کی ہم آہنگی

ہمیشہ رہی، مدد کی استدعا کی۔ یہ بھی اس سرزمین کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔

مسلمانوں سے قبل کشمیر کی طویل تاریخ میں عوام نے عظیم کارنامے انجام دیئے۔ مارتنڈ اور اونتی پور کے کھنڈر اُس سنہری دور کی کہانی سُنا رہے ہیں۔

ہندو دور میں کئی مہاراجہ ہوئے۔ کئی حکمراں آئے اور تاریخ کے اوراق میں کھو گئے۔ لیکن سنسکرت ادب، فلسفہ، علم صرف، شاعری اور تواریخ میں کشمیر کی دین بے مثال ہے۔ صدیوں تک کشمیر نے سنسکرت کے عالم پیدا کئے۔ آج ہندوستان کا ادب کشمیر کے شاعروں اور عالموں کے عطیوں سے مالا مال ہے۔ ان ادیبوں میں رتناکر، کھشمندر، بلہن کلہن، پروسین، وامن، ابھی نو گپت بھی ہیں۔ شاید ہی کوئی موضوع اور ادب کا کوئی پہلو ہو جو اُن کی توجہ کا مرکز نہ بنا ہو۔ کھشمندر عوامی شاعر تھے اور کلہن اور بلہن راج کوی۔

کشمیر میں سنسکرت کے عروج کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ مہایان فرقے کے بودھوں نے اپنے دھرم گرنتھوں کی زبان پالی کے بجائے سنسکرت ہی بنائے رکھی۔ ان گرنتھوں کی تلاش میں دُور دراز سے عالم کشمیر آتے رہے۔ ہندوستان کی ادبی روایات کے اس زرّیں دَور میں مندر اور وہار کتابوں اور قلمی نسخوں سے بھرے تھے۔ کشمیر کے عالم کو ریاتک گئے جہاں انھوں نے بھارتی علم اور ثقافت کا پیغام دیا۔

کنشک کے عہد میں جب چوتھی بدھ مجلس کشمیر میں ہوئی تو یہ علاقہ بدھ مت اور ثقافت کے مرکز کی حیثیت سے مشہور ہو چکا تھا۔

کشمیر میں زندگی سدا سہانی رہی ہو، یہ بات نہیں تھی اس علاقے نے کئی اُتار چڑھاؤ دیکھے۔ سیلاب اور قحط سے اکثر سامنا رہا۔ غریبی رہی لیکن علم و فن کی مشعل ہمیشہ روشن رہی۔

اگر کبھی مقامی حکمرانوں یا حملہ آوروں نے تاریک دَور میں لوگوں پر ظلم توڑا، تو کشمیر کے لوگوں نے آپس میں ایک دوسرے کی مدد کی، پناہ دی اور اُن کے دکھ درد میں شریک ہونے کی کوشش کی۔

بنسی لال گپتا

یہاں پر ہر فرقے کے متبرک مقامات ہیں۔ ہندوؤں کے امرناتھ، شنکر آچاریہ، ویشنو دیوی، مسلمانوں کے حضرت بل شاہ ہمدان اور سکھوں کی چھٹی بادشاہی، لداخ تو شروع سے بدھ مت کا مرکز رہا ہے۔

کشمیر کی خصوصیت اس میں ہے کہ یہاں زبان، نسل اور ثقافت کے فرق کے باوجود لوگوں میں یکجہتی اور ایکتا کی کڑیاں اس قدر مضبوط اور پائیدار ہیں کہ انھیں کوئی بھی زک نہ پہنچا سکا۔ لوگ فاتح یا مبلغ بن کر آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ چاہے وہ بدھ تھے، کشن، ہن، پٹھان، مغل، یا سکھ۔ کشمیر کشمیر ہی رہا۔ مختلف ثقافتی تحریکوں سے ایک مضبوط سماج بنا۔ بلند ثقافتی روایات اور ایک مستحکم ریاست وجود میں آئی، جو آج سارے ملک کے ساتھ تعمیر و ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے۔

غزل

اُکتا گئے ہیں لوگ، فسانہ کہا نہ جائے
کس سمت جا رہا ہے، زمانہ کہا نہ جائے

اپنا مکاں اُجاڑ کے، انجان راہ پر
کیوں کارواں ہوا ہے روانہ کہا نہ جائے

ہم نے تو خیر اُڑتے ہی دیکھا ہے وقت کو
اک پل بنا ہے کیسے زمانہ کہا نہ جائے

اِک موت کی خلش ہی، ابھی تک حیات کا
کیوں کر بنی ہوئی ہے بہانہ کہا نہ جائے

شعلے بنے ہیں لفظ تو کانٹا ہوئی زباں
اب کیا کریں اگر یہ فسانہ کہا نہ جائے

آنکھیں اُفق پہ سنگ کی صورت اٹک گئیں
شب ہو گی کب سحر کا نشانہ کہا نہ جائے

کہنے کو تو غزل ہے، مگر کیا غزل جسے
نوحہ کہا نہ جائے، ترانہ کہا نہ جائے

آئینہ وقت کا کھویا ہوا چہرہ مانگے
زندگی مجھ سے مری عمرِ گذشتہ مانگے

کوئی تو زینتِ آغوش ہو جب چاند کھلے
دل کا ہیتاب سمندر بھی جزیرہ مانگے

بکھرے شیشوں کو نہ چُنے، ٹوٹے دلوں کو جوڑے
دل وہ کافر ہے کہ پھر ایک شوالہ مانگے

منجمد منہ میں زباں جم سی گئی برف کی طرح
حرفِ ناگفتہ اب ابلاغ کا شعلہ مانگے

ہم تو اُس بُت کی پرستش پہ بھی راضی نہ ہوئے
اور ہر سنگ اب اپنے لئے سجدہ مانگے

منظہر امام

اقبال متین

پانی کے چراغ

چم چم کرتی انور جہاں کو دیکھ آئے تو جیسے نیندوں کے خزانے کی گھڑی بنا کر چپکے سے اس کی نذر کر دیا، اس طرح کہ خود اسے بھی خبر نہ ہوئی کہ کس نے اپنا سب کچھ تج دیا ہے۔ لیکن طرحدار علی خاں کے لئے پھر کوئی شب ایسی نہ ہوئی جس کی سحر کرنے میں آنکھوں نے موتی نہ لٹائے ہوں — سب نے دیکھا کہ بوجھل پپوٹوں کے نیچے کچھ سرخیاں اس طرح چھپ کر طرحدار علی خاں کی آنکھوں میں رہ بس گئی ہیں کہ جیسے دنیا بھر میں انھیں کوئی اور جگہ ہی نہ ملی تھی۔

اتنی پڑی جھڑی تو تھیں نہیں کہ چم چم کرتی دیکھا اور بڑھ کر گود میں اٹھا لیا اور چپکے سے خلوت کدے کی زینت بنالی — شہر کے راجے آنکھیں بچھا رہے تھے۔ نواب زادوں کی ٹولیاں ہاتھوں ہاتھ لے رہی تھیں۔ جے پور سے تین بہنیں حیدر آباد پہنچیں اور جیسے سارے شہر میں غل غپاڑہ مچ گیا۔ غدر ہو گیا۔

نواب بھکو میاں کی نواب کلی میاں سے بڑی بہن کے لئے ایسی ان بن ہوئی کہ بھری انجمن میں تلواریں کھنچ گئیں۔ یہ اور بات ہے کہ تلواریں چلیں نہیں۔ اس لئے کہ دونوں صرف تلواریں کھینچنا ہی جانتے تھے، چلانے کے لئے پہرے داروں کی کمی نہ تھی جو یہ معمولی کام بھی وہی کر لیتے۔ بھلا اچھا ہی ہوا۔ ورنہ کیا خون خرابے ہوتے۔ بچپن چپکے سے جوانی کی سرحد میں داخل ہوا تو نینوں کے بان اور ابروؤں کے کٹار نے اس بری طرح گھائل کیا کہ سب کی تلواریں اپنی اپنی نیام میں ہی دھری دھری زنگ خوردہ ہو گئیں لیکن طرحدار علی خاں نے پہلی بار ہی بھری انجمن میں پلکیں جھپکائیں تو اتنی چکا چوند تھی کہ انجمن سے اٹھنے والے اٹھنے تک انھیں ساری دنیا تاریک تاریک سی ویران ویران سی دکھائی دینے لگی۔ دل کی بستی میں جیسے جراحتوں نے پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ نشتروں نے طنابیں کھینچ لی تھیں چپکے چپکے سلگتے رہنا اور اف نہ کرنا۔ دھیمی دھیمی آنچ نہ شعلہ بن کر لپکی، نہ راکھ کا ڈھیر بن کر ٹھنڈی ہوئی۔

کوئی محفل ہو کوئی انجمن ہو، دو آنکھیں چم چم کرتی انور جہاں کو تکے جاتیں۔ محفل برخاست ہوتی تو گزرنے والے کے دل پر سب کچھ گزر جاتی۔ لیکن انور جہاں کو خبر تک بھی نہ ہوتی کہ کوئی اس بھری

پوری دُنیا میں اُن کی بدولت تنہا تنہا ہو کر رہ گیا ہے۔

پھر طرحدار علی خاں کی آنکھوں میں اُن کے اپنے آنسو رات رات بھر ٹکر بن کر کھٹکتے رہے۔ اور ہر تار بستر خار مستر ہو کر رہ گیا۔

ہوس کی طرح کسی پایاب دریا کے کنارے کنارے چلنا تو انھیں تھا نہیں وہ تو سر تا بہ قدم محبت ہی محبت بن کر ڈوب جانا چاہتے تھے۔ ہوس اور محبت کی نگاہ میں کتنا چھوٹا سا فرق ہوتے ہوئے بھی کتنا بڑا فرق ہے۔ کوئی فاصلہ نہ ہوتے ہوئے بھی کس قدر فاصلہ ہے۔ یہ بات تو طرحدار علی خاں کی نظروں سے صاف ظاہر ہو جاتی۔ دُوسری بے شمار نظریں تو انور جہاں کو مکڑی کے جال کی طرح اپنے تانے بانے میں محصور کر لیتیں لیکن طرحدار علی خاں کی نظر کچھ اس طرح پہچانی جاتی تھی جیسے اس نظر سے انور جہاں کو دیکھنا کسی مرد کے بس میں ہی نہ ہو۔ جیسے لوہے کے زنگ خوردہ تاروں کے گچھے میں چاندی کا شفاف تار بھی اُلجھ کر رہ گیا ہو۔

ایک بار ایک محفل سے انور جہاں مُجرا دے کر لوٹ رہی تھیں۔ سازندے طبلہ، ستار، اور سارنگی بگھی میں رکھ کر انور جہاں کے منتظر تھے۔ وہ محفل سے اُٹھ کر بگھی تک پہنچنے کے لئے پھاٹک کی طرف بڑھیں تو دالان اور پیش دالان سے ہو کر انھیں صحن سے گزرنا پڑا صحن سے ہو کر جب وہ ایک اور دالان میں داخل ہوئیں تو نوبت نوازوں کے حجرے سے ہو کر کیوں کہ پورنیکو کی مرمت ہو رہی تھی اور اس طرح باہر نکلنے کا اصلی راستہ بند تھا۔

جب وہ حجرے میں پہنچیں تو وہاں جیسے ڈیوڑھی بھر کے اُجالے سسک سسک کر دم توڑ رہے تھے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا اب یہی حجرہ ساری ڈیوڑھی کا مستقبل ہے جہاں نوبت نوازوں کی نشست کے لئے چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔

انور جہاں نے اِدھر حجرے میں قدم رکھا اور اُدھر کوئی چپکے سے بڑھ کر اُن کے مقابل آگیا۔ وہ سمجھیں کہ ہے کوئی عاشق مزاج جو اس طرح چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے۔ لیکن یہاں تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ایک اچھا خاصا مرد انور جہاں کے آگے دوزانو ہو گیا۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے اُس کے قدم پکڑ لئے اور سر جھکا کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ انور جہاں ہر حملے کے لئے تیار تھیں۔ انہیں مرد کی بانہوں سے تڑپ کر نکل جانا تو آتا تھا۔ وہ یہ تو جانتی تھیں کہ طاقت ور سے طاقت ور ہاتھ ناشائستگی کا مظاہرہ کریں تو اس بے دردی سے جھٹک دیئے جا سکتے ہیں کہ پھر کسی حرکت کی جرأت ہی نہ ہو ـــــ لیکن اس حملہ سے کس طرح بچ نکلنا چاہئے، انور جہاں نے کبھی نہ سوچا تھا نہ کسی نے سکھایا ہی تھا۔

طرحدار علی خاں کے آنسو تھے کہ بس قدموں کو بھگو رہے تھے۔ انور جہاں پر جیسے سکتے کا عالم طاری تھا۔ وہ نہ کچھ پوچھ سکتی تھیں نہ جھک کر طرحدار علی خاں کو اپنے قدموں سے اُٹھا سکتی تھیں بوکھلاہٹ میں آخر کار انھوں نے جھک کر اُٹھانا چاہا تو ہاتھوں کا سہارا پا کر طرحدار علی خاں نے انور جہاں کے ہاتھ تھام لئے اور اُن کو آنکھوں سے مل کر آنسوؤں سے تر کر دیا۔

بدقت تمام انور جہاں نے پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ اس قدر دلگیر کیوں ہیں۔ طرحدار علی خاں جو ابا اتنا کہہ سکے کہ مجھے میری زندگی دے دو جو پہلی نظر ہی میں، میں نے تمہارے قدموں میں ڈال دی ہے ورنہ میں مر جاؤں گا ـــــ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

انور جہاں کے ذہن میں مرنے والوں کی بڑی لمبی چوڑی سی فہرست محفوظ تھی لیکن پتہ نہیں انھوں نے طرحدار علی خاں کا نام اس فہرست میں کیوں شامل نہیں کیا۔ کہنے لگیں، آپ میرے گھر تشریف لائیں۔ مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوگی، اور ایک جھپاکے سے حجرے کو پار کر کے وہ باہر نکل گئیں۔

اندھیرے میں اُنھوں نے ٹھیک سے دیکھا بھی نہ تھا کہ یہ کون نوجوان ہے جو اس طرح گڑگڑا رہا ہے۔ بگھی تک پہنچ کر انھوں نے پلٹ کر دیکھا تو طرحدار علی خاں انھیں اس طرح تک رہے تھے، جیسے بچہ کھلونے کو تکتا ہے اور واقعی طرحدار علی خاں تھے بھی طرحدار۔

انور جہاں کو کوئی مایوسی نہیں ہوئی اور بگھی تڑتڑ کرتی آگے بڑھ گئی۔

طرحدار علی خاں ایک نہیں ہزار بار انور جہاں کے گھر گئے۔ پالو سے نہیں سر سے چل کر۔ اور پھر ایک بار ایسے گئے کہ بس اُدھر ہی کے

ہو رہے۔ وہ چلتی پھرتی تو آپ آنکھیں بچھاتے۔ وہ بیٹھی گلوریاں بناتی رہتیں تو آپ سو سو طرح نثار ہوتے رہتے۔ وہ سو جائیں تو بس بیٹھے چپ چاپ تکا کرتے۔ پھر یکایک پیروں پر آنکھیں ملنے لگتے۔ وہ پیر سمیٹ لیتیں تو خوش ہو کر آغوش میں لے لیتے۔

پھر چپکے چپکے نکاح کے دو بول کے بدلے میں انور جہاں بالکلیہ طرحدار علی خاں کی حیاتم بن گئیں۔ وہ اب انھیں جانم کہہ کر پکارتے۔

انور جہاں کچھ اس طرح طرحدار علی خاں سے وابستہ ہوئیں کہ دیکھنے والے بلا کسی لاؤ لپیٹ کے کہہ اٹھتے کہ انور جہاں بنی ہی اس واسطے تھیں کہ کسی ایک کی ہو کر رہیں۔ کسی ایک دل میں سکون اور اطمینان سے بس اس طرح براجیں کہ انھیں دنیا کی کچھ خبر بھی نہ ہو۔ اور ہوا بھی یہی — وہ خود طرحدار علی خاں میں کھو گئیں اور طرحدار علی خاں ان میں کھو گئے۔

لیکن ہم سے پہلے ہی بہت سے لوگ کہہ گئے ہیں کہ محبت اس دنیا میں پروان نہیں چڑھ سکتی۔ چناں چہ انور جہاں کے چھوٹے سے کنبے میں وہ اودھم مچی، وہ ہنگامے ہوئے وہ وہ فتنے کھڑے ہوئے کہ الحفیظ والامان

بات اتنی کچھ غیر اہم بھی تو نہ تھی جو بالکل ہی نظر انداز کر دی جاتی۔ اپنا وطن چھوڑ کر گھر بار پھونک کر، گھر بار پھونک کر جمے پورے حیدر آباد کو اس کنبے نے ہجرت کی تھی۔ کیا کیا سوچا تھا کہ زندگی کی بہاریں اپنی ہی چہار دیواری میں مقید ہو کر رہ جائیں گی۔ ایک نہیں دو نہیں تین بہنیں تھیں۔ پھر تینوں بھی ایسی کہ ایک پر دوسری کو ترجیح دینا بجائے خود باریک بینی کے فن کا کمال تھا۔ اب گھر والے اگر اس طرح سوچیں کہ جمے پورے حسن کی ساری دولت سمیٹ کر ان کا قافلہ سوداگری کرنے حیدر آباد جیسے متمول شہر میں آن بسا تھا کہ ایک دولت کا دوسری دولت سے تبادلہ ہی تو ہوگا لیکن یہاں آ کر اپنی پونجی جیسے کنگالوں کے ہاتھوں لٹ گئی۔ کچھ باقی رہ گئی تھی سو ائس کا بھی کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ پتہ نہیں کب کون کس کے گھر بیٹھ جائے۔ یوں گھر بیٹھنا ہی زندگی کا مقصد تھا تو کون اپنا پیٹ کاٹ کر تان سرکے فن پر سب کچھ نچھاور کرتا۔ بھئی آس تو یہی تھی نا کہ تینوں کی تینوں ہندوستان بھر میں نام پیدا کریں گی۔ اللہ میاں نے صورت دی تھی، گلا دیا تھا۔ بائی جی نے اپنا سارا اثاثہ پھونک کر کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی سارے کا سارا فن جیسے گھول کر تینوں بہنوں کو اپنے ہاتھ سے بائی جی نے اس طرح پلایا تھا کہ ایک قطرہ بھی ضائع نہ ہو۔ اور حیدر آباد پہنچ کر ابھی پر پرزے نکالے بھی نہ تھے کہ انور جہاں طرحدار علی خاں کی ہو کر رہ گئیں۔ بائی جی کو زمانے نے پرکھا تھا، برتا تھا، بالکل اس طرح جس طرح بائی جی نے خود زمانے کو پرکھا تھا اور برتا تھا۔ طرحدار علی خاں کے عشق کا ناٹک ظاہر ہے انہیں ایک آنکھ نہ بھایا۔ صاحبزادے لٹو ہو گئے تھے تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ گھر پھونک کر دنیا میں نام کرتے اور اس طرح تو بائی جی کی بن آتی لیکن یہاں تو لیل و نہار ہی دوسرے تھے یشام و سحر ہی بے ڈھب تھے۔ نہ ہینگ لگی تھی نہ پھٹکری اور طرحدار علی خاں کے عشق کا جادو تھا کہ انور جہاں کے سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔

کدھر منہ مری مٹی کی گڑیا جیسی لڑکی اب گز گز بھر کی زبان نکال کر دو ٹوک باتیں کرتی۔ دنیا بھر کی مسجدوں کے ملانے مرگئے تھے اور سبھوں نے ویران مسجدوں کی جانماز یں سمیٹ کر انور جہاں کے حوالے کی تھیں۔ جو وہ بات بے بات کے مصلے بچھا کر بیٹھ جاتیں۔ دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھا کر چھت کو تکتیں۔ پھر ٹپ ٹپ دو چار آنسو گرتے ہوئے ٹوٹتے تاروں کی مانند سارے جگ کی آنکھوں کو دکھائی دیتے۔ رہ گئیں دعائیں۔ ان کے قبول ہونے نہ ہونے کی بات سانچا بادشاہ ہی جانے۔

بائی جی نے سو سو طرح سے فتنے اٹھائے، ہنگامے کھڑے کئے۔ کوئی تدبیر نہ چھوڑی کہ انور جہاں طرحدار علی خاں کے چنگل سے نکل سکے لیکن خدا معلوم ان تھوڑے سے دنوں کی یکجائی میں طرحدار علی خاں نے کیا کیا سبق پڑھایا تھا کہ انور جہاں صاف صاف کہہ اٹھیں کہ میں باز آئی اس زندگی سے جس کا راستہ سیدھا جہنم کو جاتا ہے۔

اور بائی جی انور جہاں کو سیدھے جہنم میں لے جانے پر تلی بیٹھی تھیں۔ وہ بڑی گراوٹ پر اتر آئی تھیں۔ کہنے لگیں کہ پہلی بار جس خصم کی آغوش گرمائی تھی، وہ تو نہ ہوا سب کچھ تیرا کیا دھرا تھا میں کسی پنجرے کا پنچھی نہیں ہوں، جو اپنے پنکھ کاٹ کر بیٹھ رہوں۔ میری کلا، میرا فن

کیا سب کچھ اُن کے ساتھ ہی بیٹھ رہے گا اور اب اس بارے لونڈے کے پیچھے اس طرح دیوانی ہوئی ہے کہ بات شروع ہو تو سانچے بادشاہ کی دُہائی سے اور بات ختم ہو تو سانچے بادشاہ کی دُہائی پر — اور وہ بھی مت مارا مجنوں کی اولاد دروازہ بند کر لیتے ہیں تو رات رات بھر چوکھٹ پر بیٹھا گزار دیتا ہے۔

یکایک انور جہاں شیرنی بن کر بپھر گئی۔ سب کے سب حیران حیران سے ٹکر ٹکر دیکھتے رہ گئے۔ قدم پکڑ کر سسکنے والی لونڈیا آن کی آن میں زخمی شیرنی کی طرح دھاڑ رہی تھی۔

کہہ رہی تھی بوٹیاں نچوا دو ہماری — مروا کر کسی کھڈ میں پھنکوا دو — وہ تو اس کی شرافت ہے جو دروازہ بند کر لینے پر بھی رات رات بھر چپ چاپ چوکھٹ پکڑ کر گزار دیتا ہے۔ سن رکھو وہ کوئی میرا ہوتا سوتا نہیں ہے — وہ میرا شوہر ہے۔ میں نے عقد کیا ہے اس سے۔ وہ جس وقت چاہے میرا ہاتھ تھام کر اس چار دیواری سے مجھے نکال سکتا ہے، جہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔

طرحدار علی خاں کو جانم کا اس ماحول میں سانس لینا ایک لمحہ نہ بھاتا تھا۔ وہ تو صرف اپنی جانم کی خاطر کبھی وہ بائی جی کو راضی کر لیں گی تو ہنسی خوشی وداع ہوں گے، اس نیک ساعت کے منتظر تھے وہ جب جانم اُن کے چھوٹے سے گھر میں منتقل ہو جائیں گی جو انھوں نے اپنے ماں باپ کی چوری چھپے کرائے پر رکھا تھا۔

لیکن یہ سب کچھ نہ ہو سکا۔ بائی جی گھاٹ کا پتھر تھیں طوفانوں نے اپنا سر پھوڑ لیا لیکن وہ نہ ہلیں۔

طوفانوں نے خود ہی اپنا رُخ بدل لیا اور اس طرح رات کے اندھیرے میں انور جہاں جنم جنم کے لئے طرحدار علی خاں کی ہو گئی تھیں۔ اپنی دولت جب اس شہر میں برسرِ عام لٹنے لگی تو بائی جی کے لئے اپنے بچے ہوئے اُثاثے کے لالے پڑ گئے۔

یہاں کے نوابزادوں کے بھن بائی جی کو دُنیا بھر سے کچھ مختلف ہی نظر آئے۔ جن کے پاس دولت ہوتی وہ بے دریغ لٹاتے بھی تھے لیکن ایسے تھے ہی کتنے۔ یہی جنہیں انگلیوں پر گن لیا جا سکے۔

دوسرے تھے تو عشق جیسے انہیں ورثے میں ملا تھا۔ کیوپڈ دیوتا جیسے اُن کے خانۂ دل کا پاسباں تھا۔ ایسا شدید عشق کرتے کہ مجنوں بے چارہ اس وقت زندہ ہوتا تو شاید اُس کا کیا کرایا مٹی میں مل جاتا۔ اتنے دن کی شہرت، عزت و ناموس دیکھتے دیکھتے جہنم واصل ہو جاتی۔

انور جہاں جب اتنی آسانی سے طرحدار علی خاں کی ہو رہیں تو دُنیا کی ساری محبتوں پر سے بائی جی کا ایمان اُٹھ گیا۔ وہ جس کو سینے سے لگا کر سُلایا، وہ جس کو چھاتیاں نچوڑ کر دودھ پلایا، وہ جس کے لئے زندگی کا سکھ چین لگا دیا، وہ جس کی آنکھ نہ جھپکی تو اپنی راتیں تصدق کر دیں — وہ جس کو — وہ جس کو — وہ جس کو — اور یادوں کا ایک سلسلہ ان کے ذہن سے نکل کر اُن کی آنکھوں کے آگے مجسم ہوتا ہوا بس آنسو بن کر آنکھوں سے ڈھل گیا۔

یہ آنسو بائی جی تمہارا مقدر بن سکتے ہیں۔ یہ آنسو بائی جی تمہارا مقدر بن سکتے ہیں۔ کوئی تھا جو مسلسل بائی جی کے کانوں پر اپنے ہونٹ رکھ کر چلا رہا تھا — یہ آنسو بائی جی تمہارا — تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔

اپنی بچی کھچی دولت لے کر لوٹ جانا چاہئے۔ اپنی دونوں بیٹیوں کو لے کر واپس ہو جانا چاہئے۔ کوئی ہتھوڑے سے ذہن پر چلا رہا تھا اور بائی جی نے طے کر لیا کہ کئی دن سے یہ جو آرے سے دل پر چل رہے ہیں انہیں اپنی گرفت میں مضبوطی سے تھام کر بیچ سڑک پر اس طرح پھینکے گی کہ اس شہر کی ہرماں کا دل گھائل ہو جائے۔

چھوٹی بٹیا کو راجہ صاحب نے آج پھر مجرے کے لئے بلا لیا تھا۔ بائی جی سن چکی تھیں کہ چھوٹی بٹیا کے بغیر پل بھر چین سے نہیں گذار سکتے تھے۔ مجرے کا بیعانہ لوٹاتے ہوئے بائی جی نے کہا — داروغہ جی راجہ صاحب سے کہہ دینا — وہ جو بیچتے تھے دوائے درد دل، وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔

لیکن چھوٹی بٹیا نے بڑھ کر داروغہ جی کو آواز دی کہہ دینا میں آ رہی ہوں۔

بائی جی نے چھوٹی بٹیا کو اس انداز سے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہوں — بیٹا تمہارے دل کے کسی کونے میں کہیں تمہاری ماں بھی تو رہتی ہوگی۔ اُسے ڈھونڈھ نکالو — اسے ڈھونڈھ نکالو۔

لیکن چھوٹی بٹیا نے بائی جی کو نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں۔

چھوٹی بٹیا جانے کی تیاری کرنے لگی تو — بائی جی نے سوچا دھڑا دھڑا اپنا گھر جلتا رہے تو قہقہہ لگانے میں کتنا مزا آتا ہوگا۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ قہقہہ مار کر ہنس سکتیں کسی نے ان کے قدم پکڑ لئے۔

بائی جی جلتے ہوئے گھر کا سماں آنکھوں میں لئے خیالوں ہی خیالوں میں کہیں دُور جا چکی تھیں۔ پتہ تک نہ چلا کہ کون در آیا اور کس نے قدم تھام لئے۔

انور جہاں کی سرکشی کے خلاف بائی جی نے اپنے ترکش کا کوئی تیر اُٹھا نہ رکھا تھا جو سر نہ کر سکے۔

لیکن جب ہار ہوئی ہے تو بائی جی اس طرح لٹ لگا گئیں کہ غصہ کرنے کی جرأت بھی اُن سے کسی نے چھین لی — اور اب بٹیا پر پُرزے نکالنے لگی تھی تو بائی جی میں ہمت ہی نہ تھی کہ قینچی لے کر بال و پر کتر دیتیں۔

اب تو کوئی اُنھیں کی غم خواری کرے تو کرے۔ کوئی اُنھیں پر ترس کھائے تو کھائے۔

بائی جی نے تڑپ کر جو گردن جھکائی تو انور جہاں قدموں میں سسک رہی تھی۔

"ماں۔ میں آگئی ہوں۔"

"ماں۔ میں آگئی ہوں"

بائی جی دیوانوں کی طرح انور جہاں کو تکتی رہ گئیں۔ بدقت اُنھوں نے پوچھا "طرحدار میاں کہاں ہیں انور؟"

میں کچھ نہیں جانتی ماں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں اُن کا انتظار کرتی رہی۔ میں ان کا انتظار زندگی بھر کر سکتی ہوں۔ مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ وہ لئے جاگیردار ہیں۔ وہ چاہے کچھ ہوں ماں... میرے پیٹ میں میرے پیٹ میں — اور انھیں اس سے بھی تو محبت نہ ہو سکی جو اُن کا بھی — جو اُن کا بھی خون ہے۔

بائی جی نے انور کو اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

میں کہیں نہیں جاؤں گی بیٹی — میں اب کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں اس شہر سے چلی جانا چاہتی تھی۔ لیکن میری جیت ہو گئی ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ اس دُنیا میں کوئی چیز سچی نہیں ہے۔ صرف آنسو سچے ہیں۔ وہ چراغ نہیں سمجھتے جو بھیگی ہوئی آنکھوں میں جلتے ہیں۔ اور طرحدار میاں کے انھیں چراغوں نے تیری زندگی میں روشنی بھری تھی۔ ایسی روشنی جس کے آگے میرے گناہ کانپ جاتے تھے۔ لیکن وہ سارے چراغ بجھ گئے ہیں"

انور نے نظر اُٹھائی تو اُسے کھونٹی پر اپنی جانماز اور تسبیح نظر آئی جن کا طرحدار میاں کی ہو رہنے کے بعد اُس نے سہارا لیا تھا۔

اُس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا

"ماں جھاڑ پونچھ کر انھیں کسی مسجد میں بھجوا دو۔"

اور بڑے انداز سے بڑھ کر اُس نے فرش پر پڑی ہوئی پائل اُٹھا لی۔

بقیہ پانی کے پاس

پیچھے کی طرف گر پڑا اور کھڈ کے دو سپاہی نیچے آگئے۔ مجھے بھی پکڑ کر لے گئے۔ اسی کھڈ میں۔۔۔"

شام کی اُترتی تہوں میں کھو کر اب نہ مجھے واپس جانے کی جلدی تھی، نہ کھائی پار کر گاڑی کا فکر۔ لڑکے نے اُبھری ہوئی مٹی کے ساتھ ٹیک لگائی اور آسمان کو چپ چاپ گھورنے لگا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"سپاہیوں کے ساتھ میرا بھائی تھا — چھوٹا۔ وہی اُن کو لے آیا۔ میرے پاس، پانی کے پاس — جہاں وہ۔ وہ۔ وہ۔ مر گیا گولی سے مر گیا — پانی کے پاس — وہ چاچا —"

محمد عمر

ہندوستان کی بازی گر

(۲)

بازی گروں کی بولیاں

دو خاص بولیاں اُن میں مروج تھیں ایک تو تھی جو شہر مند مرد اور عورتیں بولتی تھیں، اور دوسری عموماً دیگر مرد اور بچے۔ مگر ان دونوں بولیوں کا ماخذ ہندوستانی زبان تھی۔ اوّل الذکر میں صرف لفظوں کو توڑ مروڑ لیا گیا تھا اور دوسری بولی کی تشکیل بظاہر کچھ لفظوں کو باقاعدہ بدل کر کی گئی تھی۔ ذیل کی مثالوں سے اِن دونوں بولیوں کی وضاحت ہو جائے گی۔

ہندوستانی	پہلی بولی	دوسری بولی
آگ	گا	کاگ
چلم	چلپی	نیلم
بانس	سوبان	نس
دم	مدا	نم
یاد	دائ	کیاد
فقیر	ریقی فو	نقیر
گھر	رگو	رُہر
ہندوستان	دوسنیاٹوہ	کندوستان
اِدھر	دلہوری	بُدھر
جب	بوجو	نب
کون	اوٹک	اون
لمبا	بلوم	کمبا
ماس	سامو	ناس
نٹ	ٹونو	کٹ
عمر	مورو	کمر
پیر	ریچو	پچھیر
قلعہ	لنکا	رُلا
رُوبرُو	بُرُوبُرُو	کوبورو
سونا	ناسو	فونا
تلاش	لشٹو	تلاش
آبناؤ	بنیہ	کنباؤ
وارث	رثوا	قوارس

مسلمان ہونے کے باوجود ان خانہ بدوشوں کا باقاعدہ کوئی مذہبی عقیدہ نہیں تھا اور وہ عام طور پر اسی گاؤں کے مذہبی عقائد پر عمل کرتے تھے، جس کے قریب خیمہ زن ہوتے تھے کسی بلائے ناگہانی کے خوف سے عموماً کالی کی پرستش کرتے تھے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ بنگال میں کالی کی پوجا ہوتی ہے اور ہندو مسلمان دونوں اُس کی پوجا کرتے تھے اور اسی طرح بہت سی اسلامی رسوم تھیں جن پر ہندو بھی عمل کرتے تھے۔

پنج پیڑھی فرقہ

اُن کے علاوہ پنج پیڑھی (پانچ پشتیں) نام کا بازی گروں کا ایک اور فرقہ تھا جو خانہ بدوش بازی گروں کی طرح منڈلیاں بنا کر گھوما کرتا تھا اور اسی طرح کی جھونپڑیوں میں رہتا تھا جن کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں یہ فرقہ بھی بازی گروں کے قبیلے کی ایک شاخ تھا مگر پنج پیڑھی اور نٹوں (بازی گروں) میں کچھ ضمنی تفاوت بھی پایا جاتا تھا۔ پنج پیڑھی فرقے کے لوگ غیر معمولی کسرتی، چست اور چالاک اور ہاتھ کے ہر طرح کے ہنر میں تیز دست ہوتے تھے اور بازی گری کی کلا کی ہر شاخ میں کُلی دسترس رکھتے تھے۔ قلا باز کی حیثیت

سے وہ نہ صرف پھرتی اور چستی کے کرتب دکھاتے تھے بلکہ مستعدی کی بہت سی مثالیں بھی پیش کرتے تھے ۱۸۰۸ء میں کلکتہ میں تقریباً اُن کے ستّو خاندان تھے اور وہ پانچ شاخوں میں منقسم تھے اور اُن کی ہر ایک شاخ کا الگ ایک سردار ہوتا تھا اور ان سرداروں میں سے ایک جیسا کہ بازی گروں میں رواج تھا، اِن تمام سرداروں کا سردارِ اعلیٰ مانا جاتا تھا بظاہر اُس کی آمدنی کا ذریعہ صرف وہ تیز شراب تھی جو اس کے مطیع اس کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ اس کا بھی اُسی طرح محدود علاقہ تھا جیسا کہ بازی گروں کے ضمن میں ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اس فرقے کے مختلف گروہ، صوبہ بنگال کے مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے پھیلے ہوئے تھے مثلاً چڑی مار، بندر نچیا، سپیرا، ڈکیت اور قبندر وغیرہ۔ ان میں سے بہتوں نے مذہب اسلام قبول کر لیا تھا، اور دیہاتوں میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ دیہاتوں میں بندر اور دیگر سدھا کر یا بچوں کے کھلونے بیچ کر وہ تحصیلِ معاش کرتے تھے۔ اُن میں سے کچھ لوگ ایک مذہبی فرقے کی صورت میں گھومتے پھرتے تھے اور اپنے کو فقیر کہتے تھے اور صرف مسلمانوں سے جو بھیک مل جاتی تھی، اسی پر گذر کرتے تھے۔ چار پشتوں تک اُن کے پاس اپنا نسب نامہ تھا اور بنگال کے بازی گروں کی طرح وہ اپنے آپ کو پردیسی نہیں سمجھتے تھے۔ بازی گروں کے اس مخصوص فرقے کو اس علاقے میں مشتبہ نظروں سے دیکھا جاتا تھا اور لوگ انھیں چور اور اُچکا خیال کرتے تھے۔ اُن میں سے کسی نہ کسی کو چوری کے جُرم میں سزا ملتی رہتی تھی۔ اور ڈکیتی کے جُرم میں مجرموں کو پھانسی کی سزا بھی دی جاتی تھی۔ بازی گروں کے اصولوں پر انھوں نے بھی اپنی ایک مخصوص بولی گھڑ لی تھی۔ یہ لوگ اپنے مُردوں کو دفن کرتے تھے اور اس موقع پر صرف یہی رسم برتی جاتی تھی کہ متوفی کے دفن کرنے کے فوراً بعد خوب شراب پی کر غم غلط کرتے تھے۔

اس فرقے کی دُوسری شاخوں کے لوگ صفائی یا کھانے کے معاملے میں نہ کے برابر توجہ کرتے تھے۔ مُردہ گیدڑ، بیل، گھوڑے کا گوشت اور کسی اور قسم کا کھانا جو بھی مل جاتا تھا، بلا تکلف کھا لیتے تھے۔ اپنے خاندانی پیشہ کے علاوہ جڑی بوٹیاں بھی جمع کرتے تھے ظہریاں اور بالخصوص درختونامی پرند پکڑتے تھے۔ اُن پرندوں کو سکھا کر دوا کے کام میں استعمال کیا جاتا تھا جب یہ لوگ کھیل تماشا دکھانے جاتے تو اُن کی عورتیں اُن کے ہمراہ نہیں جاتی تھیں اور اس اثنا میں وہ دُوسرا کام کرتی تھیں۔ مثلاً دانتوں کی خرابیوں کا علاج کرنا، ہاتھ دیکھنا، ہندو عورتوں کے ہاتھ گودنا، شراب بیچنا اور دُوسری جسمانی بیماریوں کی دوائیں فروخت کرنا۔ عموماً صبح سویرے جڑی بوٹیاں اور سوکھے پرندلے کر وہ گھر سے نکل جاتی تھیں۔ دروازے دروازے بھیک مانگتیں اور عورتوں کے امراض کا اجن کے بارے میں وہ اپنے آپ کو ماہر ظاہر کرتی تھیں، علاج کرتی تھیں۔ غروبِ آفتاب کے بعد اگر وہ واپس گھر نہ پہنچتیں، اور گیدڑوں کی آوازیں سُنائی دینے لگتیں تو اُن کی وفاداری اور چال چلن کو شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور شوہروں کی ناراضگی کی ان کو سزا بھگتنی پڑتی تھی اور اُن کو سزا دی جاتی تھی۔ اپنی ذات کے علاوہ کسی دُوسرے شخص سے جنسی تعلقات ناقابلِ معافی تھے۔

شادی کی رسمیں

جب طرفین کسی لڑکے لڑکی کے رشتہ کے سلسلے میں راضی ہو جاتے تو شادی کی رسموں کی ادائیگی کے لئے ایک دن مقرر کر لیا جاتا تھا لڑکے والے رات کو نو دس بجے طرف ثانی کے دروازے پر پہونچ جاتے تھے۔ دروازے کے سامنے چار کیلوں کے درختوں کا ایک اتنا بڑا منڈپ بنایا جاتا تھا کہ اس میں پوری برات سما سکے۔ وہاں پہنچکر دُولہا بلند آواز سے کہتا تھا "مجھے میری دُلہن دیدو" دولہن کے بھائی یا قریبی رشتہ دار دروازہ روک کر کھڑے ہو جاتے تھے اور دولہا کو اندر داخل ہونے سے بزور بازو روکتے تھے اور اگر وہ کوشش کرتا تھا تو اسے بزور پیچھے ڈھکیل دیتے تھے اور غریب دولہا کی اس کسمپرسی پر سب لوگ قہقہہ مار کر ہنستے تھے اور طرح طرح سے اُس کا مذاق اُڑایا جاتا تھا۔ بہرحال وہ اس ناکامیابی سے مایوس نہیں ہوتا تھا اور دوبارہ پھر کوشش کرتا تھا اور پھر بآواز بلند کہتا تھا "مجھے میری دولہن دیدو" جب اُس کا بھی کچھ اثر نہ ہوتا

تو وہ مایوسی کی حالت میں مجبوراً جاکر مسند پر بیٹھ جاتا اور کبیدہ خاطر ہو کر اپنی قسمت کا ماتم کرنے لگتا جب طرفین کو یقین ہو جاتا کہ دُولہا کے صبر کی کافی آزمائش ہو چکی ہے تو وہ لوگ دروازے کے محافظوں سے اُس کی طرف سے وکالت کرتے اور وہ لوگ دولہن کو لے آتے اور دُولہا کے ہاتھ میں دولہن کا ہاتھ یہ کہتے ہوئے "یہ ہے تمہاری دولہن۔ اس کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کرنا" دیدیتے اور دولہن کو بھی نصیحت کی جاتی کہ وہ ایک وفاشعار اور فرمانبردار بیوی بن کر رہے۔ بعدازیں تھوڑا سا سیندور لے کر دولہا دولہن کی پیشانی پر یہ کہتے ہوئے "یہ عورت میری قانونی بیوی" تلک لگاتا۔ دولہن بھی دولہا کے ماتھے پر سیندور لگاتی اور یہ کہتی "یہ آدمی میرا شوہر ہے"۔ مابعد وہ دونوں بیٹھ جاتے اور بقیہ حاضرین ان کے اردگرد ایک حلقہ سا بنا کر بیٹھ جاتے۔ اس کے بعد یہ رسم ادا ہوتی تھی کہ دولہا کے بائیں ہاتھ کی چھنگلی دولہن کے دائیں ہاتھ کی چھنگلی سے جوڑی جاتی۔ وہ ایک دوسرے کے قریب اس طرح بیٹھتے تھے کہ اُن کے گھٹنے ایک دوسرے پر آجائیں۔ اس رسم کے ادا ہونے کے بعد شام کے تفریحی مشاغل اور رنگ رلیاں شروع ہوتی تھیں دولہن کے علاوہ باقی تمام لوگ، رقص کرتے، گانا گاتے شراب اور حقہ پیتے تھے۔ تمام زندگی میں صرف اسی دن دولہن کو پینے کی ممانعت ہوتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دولہا اور دولہن اُٹھتے۔ دولہا مجمع کی عورتوں کے ہمراہ دولہن کو اس گھر میں لے جاتا جہاں اُن کی مائیں یکجا ہوتی تھیں۔ کیوں کہ اس رات نہ تو دولہا کی ماں اور نہ اس کی خوش دامن کو دولہا کے سامنے آنے کی اجازت ہوتی تھی۔ اس وجہ سے بوڑھی عورتوں کی خوشی کچھ بجھ سی جاتی تھی مگر ان کے لئے بھی کافی مقدار میں شراب مہیا کی جاتی تھی اور وہ بھی دل کھول کر شراب نوشی کرتی تھیں۔

اس کے بعد دولہن واپس آکر مجمع میں شامل ہو جاتی تھی اور مجمع کے لوگ شراب پینے میں منہمک ہو جاتے تھے اور آپس میں اس بات کا مقابلہ ہوتا تھا کہ اُن میں سے کون کتنی اور سب سے زیادہ شراب پی سکتا تھا۔ طلوعِ آفتاب کے بعد برات واپسی کی تیاری کرتی تھی۔ اس وقت دولہن کے والدین جہیز کا سامان داماد کے سپرد کرتے، اور اس موقع پر پھر دونوں کی چھنگلیاں آپس میں اس طرح جوڑی جاتیں جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ برات مع جہیز کے سامان کے واپس آتی۔ اس موقع پر دولہا کے گھر کے سامنے پانی سے بھرا ہوا ایک گھڑا رکھا جاتا اور اس میں آم کے درخت کی ایک تازہ شاخ ڈالی جاتی جس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ یہ جوڑا خوب پھلے پھولے۔ بعدازیں دُولہا کی ماں ایک چھلنی لے کر باہر آتی تھی۔ اس چھلنی میں ایک روپے کے علاوہ دُوب (ہری گھاس) دھان اور سیندور رکھا ہوتا تھا۔ وہ تین مرتبہ ان دونوں کے سروں پر وارتی تھی اور اُن کی پیشانی سے چھلنی چھُواتی تھی۔ یہ عمل بطور شگون کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد دولہا، دُولہن کو گھر کے اندر لے جاتا تھا۔ وہاں تین بوڑھی عورتیں بڑی گرمجوشی سے اس کا خیر مقدم کرتی تھیں۔ اس موقع پر دولہن کو یہ وعدہ کرنا پڑتا تھا کہ وہ ایک شریف عورت بن کر رہے گی۔ اور جب اس کی ساس کا انتقال ہوگا تو اُس کے جہیز کا سب سامان اُسے مِل جائے گا۔ اس کے بعد تمام مرد مکان کے سامنے جمع ہوتے اور عورتیں زنان خانے ہی میں رہتی تھیں مہمانوں کی تواضع کا بڑا اہتمام ہوتا تھا اور چھک کر شراب پی جاتی تھی جب سورج غروب ہو جاتا تو دولہن کو اس جھونپڑی میں پہنچا دیا جاتا جو اس کے لئے مقرر ہوتی تھی۔ دولہن کو رات بھر وہاں تنہا رہنا پڑتا تھا۔

جب اُن کے بچے پانچ چھ ماہ کے ہوتے اُسی وقت سے اُن کو شراب پینے کی عادت ہو جاتی تھی۔ کیوں کہ ماں کے دُودھ میں شراب کے اثرات ملے ہوتے تھے۔ یہ لوگ بڑے بے فکرے ہوتے تھے وہ کل سے بالکل بے نیاز ہوتے تھے اور آج کی تفریحات میں اپنے ذہن کو مرکوز رکھتے تھے۔ شراب نوشی اور جنسی تلذذات ہی اُن کے مرغوب تفریحی مشاغل تھے۔

قبیلے کے باہر وہ اپنا جھگڑا کسی دُوسرے کے پاس تصفیہ کے لئے نہیں لے جاتے تھے اور اگر کوئی تنازعہ اتنا سخت ہوتا تھا کہ چھوٹی پنچایت اس کو طے کرنے میں قاصر رہتی تھی تو بڑا سردار بڑی

پنچایت بلا کر اس جھگڑے کو طے کراتا تھا۔ وہ پنچایت اس وقت تک معاملہ پر غور کرنا شروع نہیں کرتی تھی جب تک دونوں مدعی اور مدعا علیہ معاملہ کی نوعیت کے لحاظ سے شراب مہیا نہیں کر دیتے تھے اور جو شخص ہری ہو جاتا تھا اسی کو یہ تمام خرچہ برداشت کرنا پڑتا تھا۔ شراب پی کر پنچایت کے پنچ دھیرے دھیرے رخصت ہونے لگتے تھے اور جب مدعی اور مدعا علیہ کا نشہ اترتا تھا، اور ان کو ہوش آتا تھا تو دونوں اپنے کیے پر نادم ہوتے تھے۔

اب ہم بازی گروں کے کچھ حیرت انگیز شعبدوں اور کھیل تماشوں کا ذکر کریں گے۔ اس فرقے کو بادشاہوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ اپنی اور مہمانوں کی تفریحات کے لئے ہر ایک بادشاہ کے دربار سے کچھ بازی گر منسلک ہوتے تھے۔ بالعموم نیچے درجے کے بازی گر بازاروں میں اپنے مینڈوں یا بندروں کو طرح طرح سے نچا کر کسبِ معاش کرتے تھے۔ میلہ ٹھیلوں اور دوسرے مجمعوں کے موقعوں پر رسی پر چلنے والے، کٹھ پتلی کا ناچ دکھانے والے عام طور پر پائے جاتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ بنگال میں ایک بازی گر اپنے ساتھ ایک شیر لے کر سڑکوں پر پھرا کرتا تھا اور جب وہ اپنی بازی دکھاتا تو وہ شیر کو کھول دیتا۔ اس کو اس قدر دھکے لگاتا، مارتا پیٹتا کہ وہ شیر بپھر پڑتا تھا اور اس پر حملہ آور ہو جاتا تھا۔ پھر شیر اور مداری آپس میں گتھ جاتے اور کچھ دیر زمین پر پکڑ میں کرتے رہتے۔ بعد ازیں بازی گر اپنا ہتھیار اس کے گلے میں ڈال دیتا۔ مگر وہ اس کو کاٹنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ یہ تماشا دکھانے کے بعد وہ مجمع کے لوگوں سے انعام کی صورت میں پیسے وصول کرتا تھا اور اسی آمدنی سے وہ اپنی اور شیر کی بسر اوقات کرتا تھا۔

مشہور ترین بازی گروں اور نٹوں میں مورچھال نامی ایک فرقہ تھا جو مورچھال کی مدد سے بازی کرتا تھا۔ بابر بادشاہ نے اس فرقے کے ایک شخص کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ اپنے جسم پر سات چھلے ترتیب دیتا تھا۔ پہلا ماتھے پر، دو ٹخنوں پر باقی چار میں سے دو اپنی انگلیوں میں اور بچے ہوئے دو اپنے انگوٹھوں پر۔ اپنی اپنی جگہوں پر وہ چھلے بڑی تیزی سے گھومتے تھے۔

کبھی کبھی دو بازی گر تین چار مرتبہ قلا بازیاں کھاتے تھے۔ ایک بازی گر ایک سیدھی بلی اپنے ٹخنوں پر یا اپنی رانوں پر کھڑا کر لیتا اور دوسرا اس پر چڑھ جاتا اور اس کے اوپر اپنا کھیل دکھاتا۔ علاوہ ازیں ایک بونا ایک بڑے بازی گر کے سر پر چڑھ جاتا اور اس کے سر پر الٹا کھڑا ہو جاتا۔ وہ بازی گر بڑی تیز رفتاری سے ادھر ادھر پھرتا اور اپنے کرتب دکھاتا رہتا۔ مگر بونے پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا اور وہ سر پر اپنے کرتب دکھاتا ہی رہتا۔

عام طور پر "رسی کا کرتب" بہت مشہور تھا۔ اس کو دیکھ کر نہ صرف اس زمانے میں بلکہ موجودہ زمانے میں بھی لوگ حیرت میں پڑ جاتے ہیں اور ششدر رہ جاتے ہیں۔ مثلاً ایک بازی گر ایک عورت کو ساتھ لے کر مجمع میں حاضر ہوتا تھا اور اس عورت کو اپنی بیوی بتاتا تھا۔ وہ بڑے ہی مذاقیہ انداز سے کہتا کہ اُسے آسمان کا سفر کرنا چاہئے اور وہاں جا کر تماشہ بینوں کے اچھے اور برے اعمالوں کا رجسٹر دیکھنا چاہئے۔ حاضرین میں سے کوئی بھی اس کی اس تجویز سے اختلاف نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنی جیب سے ایک رسی نکالتا اور ایک سرا اپنے ہاتھ میں پکڑ کر دوسرا آسمان کی طرف پھینکتا جو نیچے کی طرف گرتا مگر حاضرین کو ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے کہ اوپر معلق ہو گیا۔ وہ اس رسی پر اس طرح سے چڑھتا تھا جیسے کہ کوئی سیڑھی پر چڑھتا ہو اور فوراً ہی نظروں سے غائب ہو جاتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے جسم کے اعضاء یکے بعد دیگرے زمین پر گرنے لگتے تھے۔ بیوی ان سب کو جمع کرتی جاتی تھی اور ہندوؤں کی رسم کے مطابق ان کو جلا دیتی۔ اور ایک ستی کی طرح خود بھی بھسم ہو جاتی۔ اس کے تھوڑی دیر کے بعد بازی گر ظاہر ہوتا تھا اور اپنی بیوی مانگتا تھا۔ تماشہ بین پوری کہانی اس کے سامنے دہراتے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کو ان کی باتوں پر یقین نہیں ہے۔ وہ اپنے مہمان نواز یا اس شخص پر، جس کے کہنے سے اس نے تماشا دکھانا قبول کیا تھا، یہ

الزام لگاتا ہے کہ اس نے غیر قانونی طور پر اُس کی بیوی کو اپنے گھر میں چھپا رکھا ہے۔ وہ اس کے زنان خانے کے قریب جاکر اپنی بیوی کو آواز دیتا اور وہ بڑے انداز سے وہاں سے مسکراتے ہوئے نمودار ہوتی تھی۔[1]

بعض بازی گر تماشا بینوں کے سامنے کسی شخص کو قتل کر دیتے اور اس کے جسم کے چار ٹکڑے کر ڈالتے۔ ان ٹکڑوں کو ایک کپڑے کے نیچے ڈھک دیتے۔ اُن کے اشاروں پر وہ مقتول زندہ باہر نکل آتا۔ دوسری بازیوں میں آم کے پھل کا کرتب قابلِ ذکر ہے۔ آم کی گٹھلی ایک برتن میں بچوڑا اور دوسری چیزوں کے ساتھ رکھ دی جاتی تھی۔ کچھ ہی گھنٹوں میں کلّے نکلنے، بور آنے اور پھل نکلنے کے مراحل طے ہو جاتے تھے اور اس کے آم ہونے کی شہادت حاضرین چکھ کر دیتے تھے۔[2]

جہانگیر بادشاہ کو بازی گری کے تماشے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ایک مرتبہ بنگال کا ایک بازی گر ایک لنگور لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بازی گر نے اپنی انگلی سے ایک انگوٹھی اُتار کر ایک لڑکے کو دیدی کہ وہ اُسے چھپالے۔ بعد ازیں اُس نے لنگور کو چھوڑ دیا۔ لنگور بار بار اس لڑکے کے قریب جاتا جس نے انگوٹھی چھپا رکھی تھی اور آخر میں وہ انگوٹھی اس لڑکے سے برآمد ہوئی۔ اس طرح دوسرے امتحانات بھی بادشاہ نے لئے اور ہر مرتبہ وہ لنگور امتحان میں کامیاب ہوا۔ آخر کار بادشاہ کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اس دُنیا میں آنے والے پیغمبروں کے سلسلے میں بہت تنازع پایا جاتا ہے۔ ہمارا اعتقاد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے اور فارس والوں کا زرتشت پر مگر وہ مسلمان نہیں۔ ہندوؤں میں بہت سے اوتار ہوئے ہیں۔ کوئی برہما کہتا ہے ـــــ کوئی رام اور کوئی پرمیشور۔ اسرائیلی موسیٰ پر اور عیسائی عیسیٰ مسیح پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں بادشاہ نے اور تین نام لئے جن کے پیرو اس دُنیا میں پائے جاتے ہیں۔ اس طرح اس نے کل بارہ نام لئے۔ اس طرح یہ بارہ نام بارہ ٹکڑوں پر لکھ کر آپس میں خلط ملط کر دیئے گئے۔ اور پھر اس نے یہ دیکھنا چاہا کہ آیا وہ لنگور سچے پیغمبر کا نام ان کاغذوں سے نکال سکتا ہے یا نہیں۔ مالعدا اس لنگور نے ان کاغذوں پر اپنا پنجہ رکھا اور عیسیٰ کا نام نکال دیا۔ بادشاہ نے دوسری مرتبہ پھر کاغذ کے بارہ ٹکڑوں پر نام لکھ کر رکھوائے۔ پھر بھی لنگور نے عیسیٰ مسیح کا نام نکالا۔ اس کے مہابت خاں نے جو جہانگیری عہد کا ایک جلیل القدر امیر تھا اور بادشاہ کی نظروں میں بڑی اہمیت رکھتا تھا، کہا کہ وہ عیسائیوں کا نمایندہ معلوم ہوتا ہے اور اس نے کہا کہ تیسری مرتبہ پھر دیکھا جائے۔ اس مرتبہ گیارہ کاغذ رکھے گئے اور عیسیٰ مسیح کے نام کا کاغذ اپنے ہاتھ میں ہی رہنے دیا۔ لنگور نے پہلے کی طرح تلاش شروع کی اور خالی پنجہ کاغذوں سے باہر نکال لیا اور آخر میں وہ مہابت خاں کے پاس گیا اور اس کا وہ ہاتھ پکڑ لیا جس میں اُس نے وہ کاغذ چھپا رکھا تھا۔ اس بات سے بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس نے بازی گر کی بڑی تنخواہ مقرر کر دی اور اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔

جہانگیر بادشاہ کے دربار میں بازی گروں کا مجمع رہتا تھا اور مختلف شعبدہ بازیاں دکھائی جاتی تھیں جس کی تفصیل خلاصۃ التواریخ[1] میں درج ہے۔

آج کل شہروں سے بازی گری کا رواج اُٹھ چکا ہے کیوں کہ یہاں کی زندگی تگ و دو کی شکار ہے اور شہریوں کو اتنا وقت نہیں ملتا کہ وہ اطمینان کے ساتھ تماشہ دیکھ سکیں۔ اگر تھوڑا بہت وقت ملتا ہے تو سینما اور دیگر ایسے مشاغل میں دلچسپی لی جاتی ہے جن میں وقت کم صرف ہوتا ہے اور وقت زیادہ صرف نہیں ہوتا۔

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو آئین اکبری (اردو) جلد دوم صفحہ ۵۷

[2] ایضاً صفحہ ۵۸

[1] ملاحظہ ہو سبحان رائے بھنڈاری خلاصۃ التواریخ ص ۴۵۸-۴۶۴

قابلِ مطالعہ

کتابیں

ہمارا ترنگا جھنڈا	ایک روپیہ	ہندوستان کی تاریخ (بچوں کے لئے)	۳ روپے ۷۵ پیسے
بھارت آج اور کل (جواہر لال نہرو)	۷۵ پیسے	ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ اول)	۲ روپے ۲۵ پیسے
دو شہروں کی کہانی (چارلس ڈکنس)	۵ روپے	ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ دوم)	۲ روپے ۵۰ پیسے
جوالا مکھی (ناول) (انند گوپال شیوڈے)	۲ روپے ۵۰ پیسے	ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ سوم)	۲ روپے ۵۰ پیسے
ہندوستان کا دستور	۲ روپے	سوامی وویکانند (بچوں کے لئے)	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
آئینہ غالب	۵ روپے	جواہر لال نہرو (خراج عقیدت)	۲ روپے ۵۰ پیسے
آجکل کی کہانیاں	۲ روپے ۵۰ پیسے	ہندوستان میں تعلیم کی از سرنو تنظیم (ڈاکٹر ذاکر حسین)	ایک روپیہ ۲۵ پیسے
وطن کے نغمے	ایک روپیہ ۷۵ پیسے		
امرجوت	۲ روپے		
سائنس کے چند پہلو	ایک روپیہ ۲۵ پیسے		

اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی اور [illegible]

(فہرست کتب طلب کیجئے)

ملنے کا پتہ

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن

پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

(محصول ڈاک ہمارے ذمہ ہوگا)

اَن چاہے بچّوں کے ماں باپ بننے کا اندیشہ
دِل میں لائے بغیر اِزدواجی زندگی کا سُکھ پائیے۔
.... اَب سبھی مرد برتھ کنٹرول کے محفُوظ
اور تسلّی بخش طریقے....
نِرودھ ـــــــ سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

صرف ۲۸ برسوں میں بھارت کی آبادی ۵۰ کروڑ سے بڑھ کر ایک سو کروڑ ہو جائے گی۔ لیکن ذرا سوچیے تو اُس وقت مکان، تعلیم، دوا دارُو، خوراک، کپڑے وغیرہ کی بنیادی ضرورتیں اِتنے سارے لوگوں کو کیسے مہیّا کی جا سکیں گی۔ یقیناً بچّوں ـــ آپ کے بچّوں ـــ کو تنگی ترشی کا سامنا کرنا پڑے گا۔
ابھی عمل کیجیے۔ اپنے گلے کو چھوٹا رکھیے۔

بچّے کا جنم روکنا آپ کے اختیار میں ہے
اختیار کا استعمال کیجیے
نِرودھ استعمال کیجیے

نِرودھ

فیملی پلاننگ کے لئے
۳ کے لئے ۱۵ پیسے - ۱ کے لئے ۵ پیسے
(سرکار کی طرف سے رعایتی قیمت)
فی الحال کچھ ضلعوں میں ہی مل رہے ہیں

سال میں خاندانی منصوبہ بندی کی
وزارت کی طرف سے نئی دہلی
میں ایک کوی سمیلن اور ایک
مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا جس میں
ہندی اور اردو کے مشہور شعراء
نے شرکت کی تھی۔

اوپر:
شاہجہاں بانو آدم صاحبہ اپنا
کلام سُنا رہی ہیں۔

نیچے:
کوی سمیلن کا ایک منظر

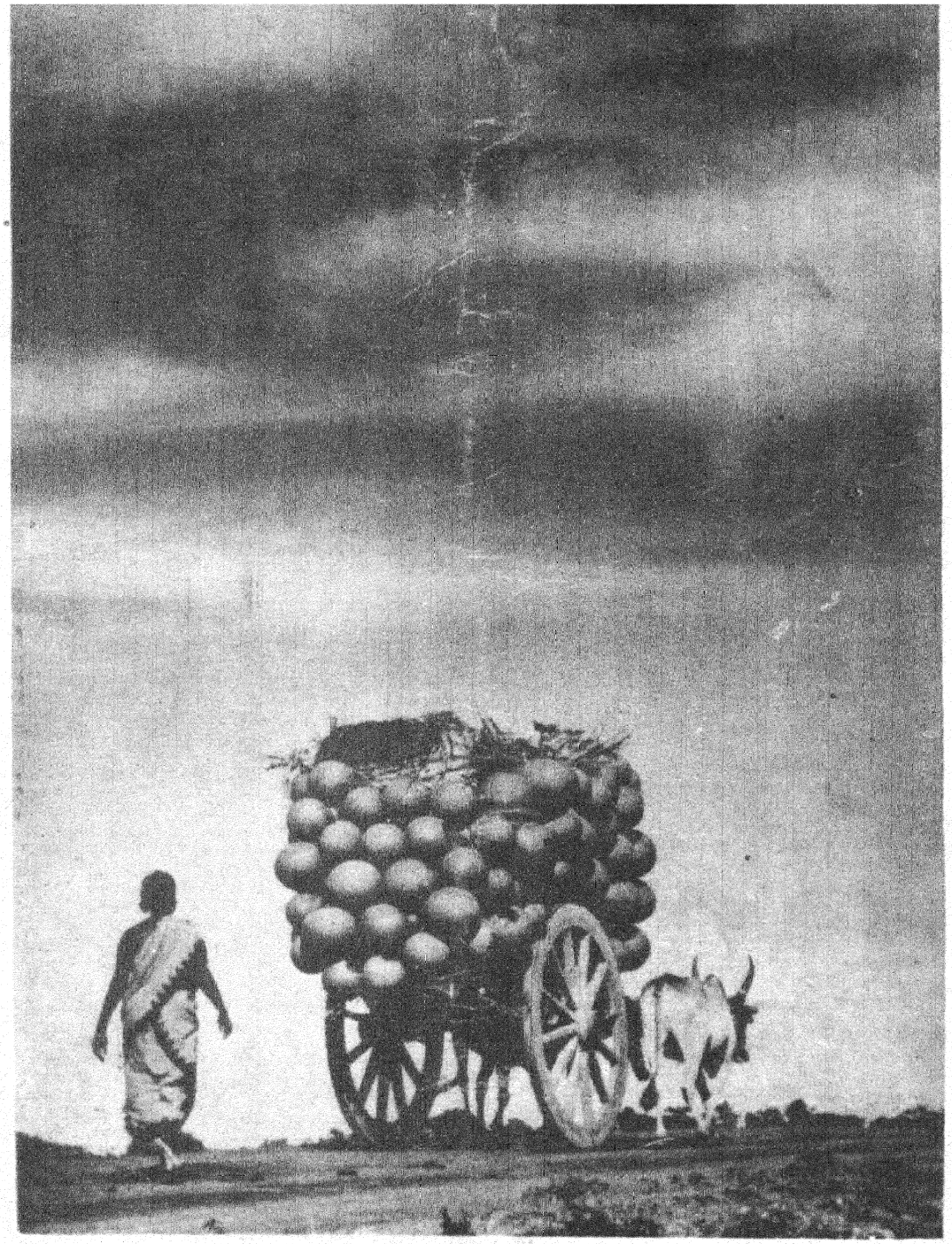

Vol. 27 No. 10 AJKAL (Monthly) May 1969

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, N. Delhi-;
Printed by The Asian Art Printers Private Ltd., D. B. Gupta Road, New Delhi.
Regd. No. D. 509

آج کل

جون ۱۹۶۹ء

قیمت: ۶۰ پیسے

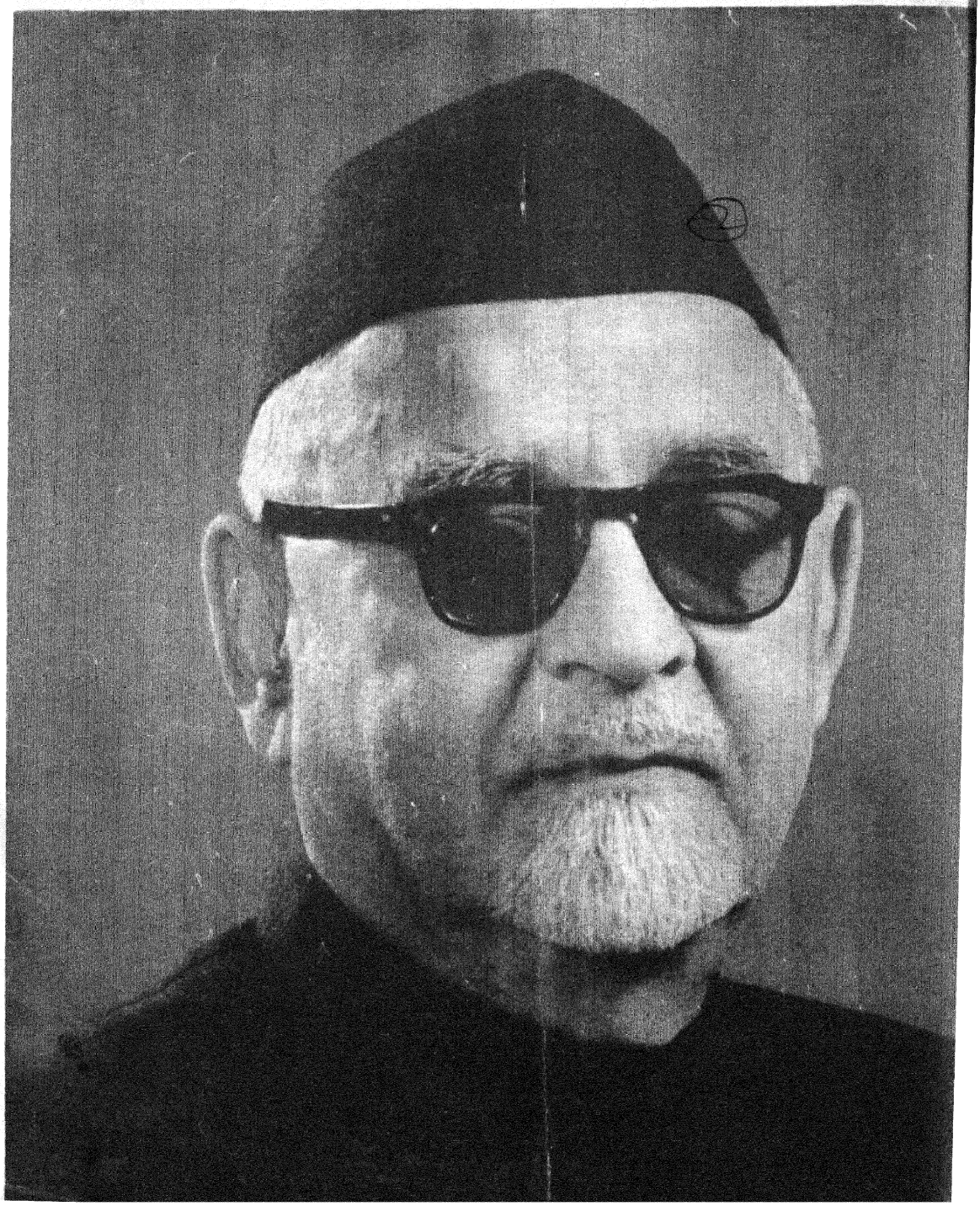

ذاکر صاحب مشاہیر کے ساتھ

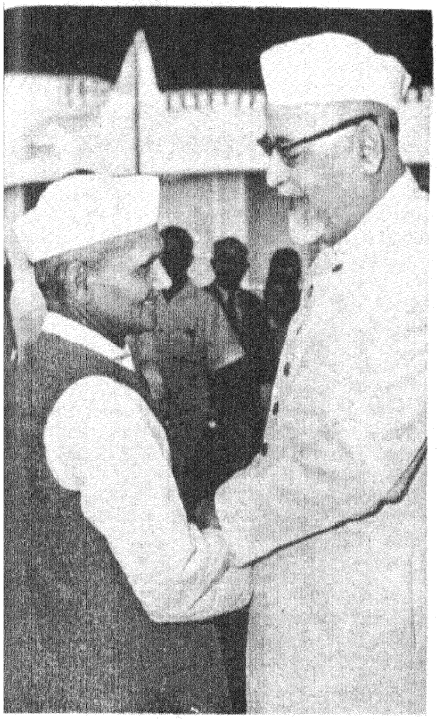

اوپر: شری لال بہادر شاستری

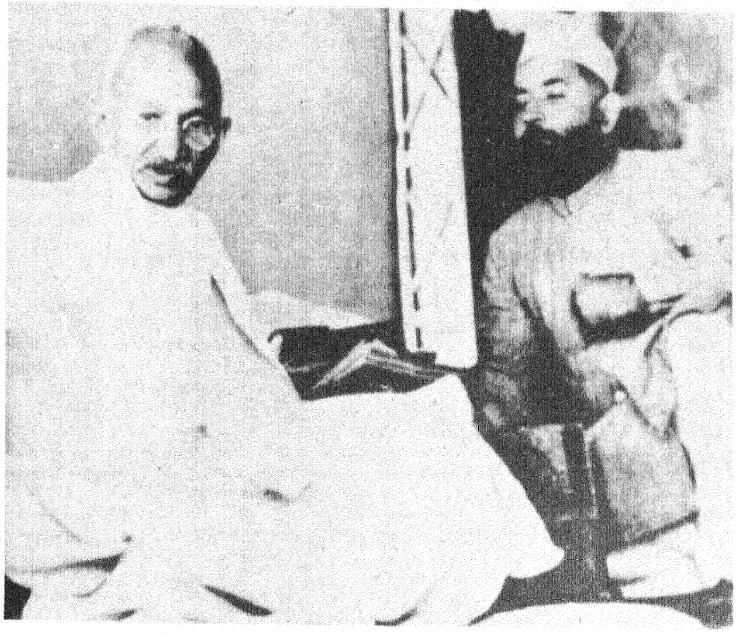

دائیں: مہاتما گاندھی کے ساتھ

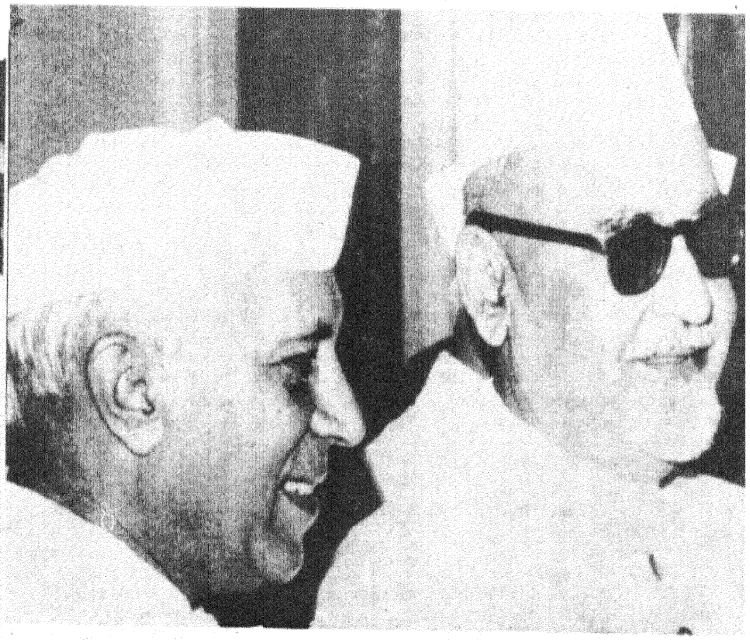

اوپر: شری جواہر لال نہرو کے ساتھ

بائیں: شریمتی اندرا گاندھی کے ساتھ

اُردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر

شہباز حسین

اسسٹنٹ ایڈیٹر

راج نرائن راز

جلد ۲۷ شمارہ ۱۱

جون ۱۹۶۹ء

جیٹھ۔اساڑھ سمت ۱۹۷۱

ترتیب

ملاحظات

ہمرو اخلاص کی بو.... بشیشور پرشاد منور لکھنوی ۲

ڈاکٹر ذاکر حسین۔ایک افسانہ خواجہ غلام السیدین ۶

ڈاکٹر ذاکر حسین (نظم) } جگن ناتھ آزاد

تیشہ گر (نظم) } ششیم کرہانی ۷

ذاکر صاحب محمد اکرم ۱۱

وداعیہ منیب الرحمٰن ۱۲

بیادِ ذاکر } سلام مچھلی شہری

} گیانی گورمکھ سنگھ مسافر ۱۵

} آل احمد سرور

} صالحہ عابد حسین ۱۶

نذرِ عقیدت (نعتیہ) } غلام ربانی تاباں

} بشیر بدر ۱۹

غمِ جاودانِ ذاکر عرش ملسیانی

قطعہ تاریخ رحلت عطا کاکوی ۲۰

ذاکر صاحب کی یاد میں (نظم) مسعود علی ذوقی ۲۲

دیدہ ور ذاکر علی جواد زیدی ۲۳

لختِ ذاکر ۲۴

از: بجھا ایک چراغ دینا ناتھ مست

قطعہ تاریخ نازش پرتاب گڈھی ۲۷

دیوانِ غالب کا ایک نیا مخطوطہ ثمر لکھنوی

کشمیر اور اردو شاعری نثار احمد فاروقی ۲۹

دارالعلوم دیوبند ذکیہ انجم ۲۸

ابراہیم فکری ۳۵

۴۰

سالانہ چندہ ہندوستان میں: سات روپے؛ پاکستان میں: سات روپے (پاک)

دیگر ممالک میں: ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ ہندوستان میں: ۶۰ پیسے؛ پاکستان میں: ۶۰ پیسے (پاک)

دیگر ممالک سے: ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

شہباز حسین ایڈیٹر آجکل پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مرتبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ملاحظات

۳ مئی ۱۹۶۹ء کا سورج جب طلوع ہوا تو کون کہہ سکتا تھا کہ آج میں دوپہر میں علم و فضل، شرافت و انسانیت، نیک دلی اور پاکبازی کا ایک ایسا آفتاب غروب ہوگا جس سے پوری قوم کی منزل تاریک ہوجائے گی۔ آج وہ دل دھڑکنا بند کردے گا جس نے ہر طرح کی سختیاں جھیلی تھیں اور غدہ پیشانی کے ساتھ بڑے سے بڑا دکھ سہا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ اب صدرِ جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین بہت تھک گئے تھے اور آرام کرنا چاہتے تھے۔ مکمل آرام۔ ۱۹۶۰ء سے سعیِ پیہم اور عملِ مسلسل کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، وہ ۳ مئی کو گیارہ بجکر ۲۰ منٹ پر تمام ہوا۔

۳ مئی ۱۹۶۹ء ـــــ معمول کی طرح صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین سویرے اُٹھے۔ اُس وقت وہ ایوانِ صدر میں واقع مغل باغ میں اپنے پسندیدہ گلابوں کے باغیچہ میں چہل قدمی کیا کرتے تھے۔ مگر ایک ہفتے سے اُن کا یہ معمول بند تھا۔ ۲۶ اپریل کو وہ آسام، نیفا اور ناگالینڈ کے دورے سے واپس آئے تھے۔ ملک کا یہ مشرقی خطہ جتنا حسین ہے اتنا ہی دشوار گزار بھی ہے۔ اس دورے کے عرصے میں انہوں نے کچھ تھکاوٹ محسوس کی اور سنیچر کو جب وہ دہلی لوٹے تو ڈاکٹروں نے اُنہیں آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ اسی وجہ سے اُن کا کام کاج اور لوگوں سے ملنا جلنا بند تھا۔ صدر جلد از جلد اپنا کارِ منصبی شروع کر دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹروں سے کہا کہ مجھے ۴ مئی کو "بھارت کیسری" دنگل کے جیتنے والے کو انعام دینے کے لیے ضرور جانا ہے۔ ان کی طبیعت پہلے سے بہتر تھی۔ اور امید تھی کہ اتوار سے وہ حسبِ معمول اپنا کام شروع کر دیں گے۔

صدرِ جمہوریہ کو کتب بینی کا جتنا شوق تھا اُتنا ہی گلاب اور کیکٹس کے پودے لگانے اور طرح طرح کے پتھروں اور چٹانوں کے نمونے اکٹھا کرنے کا بھی تھا۔ جمعہ کو آدھی رات تک اُن کے کمرے کی بتی جلتی رہی تھی اور وہ مطالعہ میں مصروف رہے تھے۔ سنیچر کو صبح آٹھنے کے بعد ایک گلاس دودھ پیا۔ ساڑھے دس بجے کے قریب کچھ کاغذات دیکھے اور بستر پر لیٹ کر ہندوستان کے دفاع پر ایک نئی کتاب پڑھنے میں محو ہوگئے۔

گیارہ بجے کے قریب ڈاکٹر اُن کا معائنہ کرنے کے لئے آنے والے تھے کیوں کہ گزشتہ دو دن سے اُنہیں کچھ کھانسی کی شکایت تھی اور ڈاکٹر اُن کا معائنہ، دل کا ایکس رے اور پیشاب کی جانچ کرنا چاہتے تھے۔ سوا گیارہ بجے صدر اُٹھے اور غسلخانے میں گئے۔ ان کو

باہر آئے میں کچھ دیر تک وہاں کے پرانے خادم اسحاق نے انہیں آواز دی۔ مگر جب کوئی جواب نہ ملا تو اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا اس پر بھی جب کوئی جواب نہ ملا تو اسحاق کو کچھ تشویش ہوئی اور اُس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی جو اندر سے بند تھا۔ غسلخانے کا ایک دوسرا دروازہ پچھلی طرف کھلتا تھا۔ اسحاق نے فوراً چابی نکالی اور اُسے کھول کر اندر گھسا اور یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ صدر فرش پر بے ہوش پڑے ہیں۔ اُس نے فوراً ڈاکٹروں کو آواز دی بغل

کے کمرے میں ڈاکٹر اور ایکسرے لینے والے انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے بے ہوش صدر جمہوریہ کو اُٹھایا۔ اور دیوان پر لٹا دیا۔ انہیں ہوش میں لانے کے لیے ساری ترکیبیں کام میں لائی گئیں آکسیجن دی گئی۔ سانس پھونکی گئی۔ دل کی مالش کی گئی مگر سب تدبیریں بیکار گئیں۔ آخر گیارہ بج کر ۵۰ منٹ پر ڈاکٹروں نے اعلان کر دیا کہ صدر جمہوریہ ہند نہیں رہے۔ ایوانِ صدر کا وہ جھنڈا جو گزشتہ ۲۲ برس میں کبھی نہیں جھکا تھا، سرنگوں کر دیا گیا۔

بارہ ایک بجے تک یہ المناک خبر ساری دُنیا نے سُن لی۔ یہ سانحہ اتنا اچانک تھا کہ پہلے پہل کانوں کو اعتبار نہ ہوتا تھا۔ مگر جلد ہی آل انڈیا ریڈیو کے اعلانات اور ماتمی دھنوں نے اس خبر کی تصدیق کر دی۔ ساری دکانیں بند ہو گئیں۔ کوچہ و بازار پر ویرانی چھا گئی اور دہلی کی پر رونق بستی واقعی ایک ماتم کدہ بن گئی۔

لوگوں کا ایک سیل بے پناہ راشٹرپتی بھون کی طرف چل پڑا۔ سات بجے شام کو ڈاکٹر ذاکر حسین کا جسدِ خاکی عوام کے آخری دیدار کے لئے دربار ہال میں رکھ دیا گیا اور ۴ مئی کی شام سے ۵ مئی کی دوپہر تک عوام کا ایک تانتا بندھا رہا جو اپنے محبوب رہنما کی ایک جھلک دیکھنا چاہتے تھے۔

ذاکر صاحب ایک سیاسی رہنما نہ تھے ان کا دائرہ عمل تعلیم کا میدان تھا جو سیاست کے مقابلے میں بہت محدود تھا۔ مگر اس کے باوجود عوام کا جوش و خروش اور ان کی بے پناہ کثرت اس بات کی مظہر تھی کہ یہ لوگ ہندوستان کے پہلے شہری اور صدر جمہوریۂ ہند کو ہی خراجِ عقیدت پیش کرنے نہیں آئے تھے، بلکہ ایک ایسے انسان کی جھلک دیکھنے آئے تھے جس نے تیاگ اور قربانی، فقر و فاقہ اور آلام و مصائب کی زندگی کو چنا تھا۔ جس نے دولت و شہرت کے سبزہ زار سے منہ موڑ کر ایک ایسا راستہ اپنایا تھا جس میں ستائش تو کُجا صلے کی بھی امید نہ تھی۔ اُن پر بڑے کٹھن وقت آئے مگر انہوں نے تقلید سے اپنی خودی کو آلودہ نہ کیا اور پندار کے صنم کدے کو ویران نہ ہونے دیا۔

پانچ لاکھ انسانوں کا بے مثال خراجِ عقیدت اس بات کا ثبوت تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی ذاتِ گرامی ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا ایک حسین سنگم تھی جو سبھوں کو عزیز ہے۔ وہ ان قدروں کے وارث اور امین تھے جو ہمارے ملک کے لئے ہمیشہ باعثِ افتخار رہی ہیں۔ انہوں نے کبھی نام و نمود کی خواہش نہیں کی۔ کبھی عہدوں کے پیچھے نہیں بھاگے۔ ان کی امیدیں ہمیشہ قلیل رہیں مگر مقاصد ہمیشہ جلیل رہے۔ انھوں نے صرف زبانی ہی مشورے نہیں دیئے تھے بلکہ اپنے خونِ جگر سے ایک ایسے ادارے کی تعمیر کی تھی جو اُس وقت محض ایک خواب سے زیادہ نہ تھا۔ انھوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دکھایا کہ بیک وقت ایک اچھا مسلمان اور اچھا ہندوستانی ہونا نہ صرف ممکن ہے بلکہ یہ دونوں چیزیں دراصل ایک دوسرے کے ساتھ

وابستہ ہیں یہی وجہ تھی کہ مختلف مذاہب اور عقیدوں کے ماننے والے سارا وقت مرحوم کی مغفرت اور روح کی شانتی کے لئے اپنی اپنی مقدس کتابوں کی تلاوت کرتے رہے۔ جنازے میں شرکت کرنے کے لئے جو مختلف غیر ملکی سربراہ دہلی آئے، ان میں لنکا کے گورنر جنرل، افغانستان کے وزیر اعظم نیپال کے پردھان منتری، یوگوسلاویہ کے وزیر اعظم سکم کے مہاراج شامل تھے۔ حکومت برطانیہ کی نمایندگی ڈیوک آف کینٹ نے کی۔ امریکی وفد کے سربراہ شری جارج ڈبلیو رومنے تھے۔ پاکستان کی نمایندگی ایئر مارشل نور خاں، برما کی نمایندگی، برما کے وزیر خارجہ، آسٹریلیا و جاپان کی نمایندگی ان ملکوں کے دو

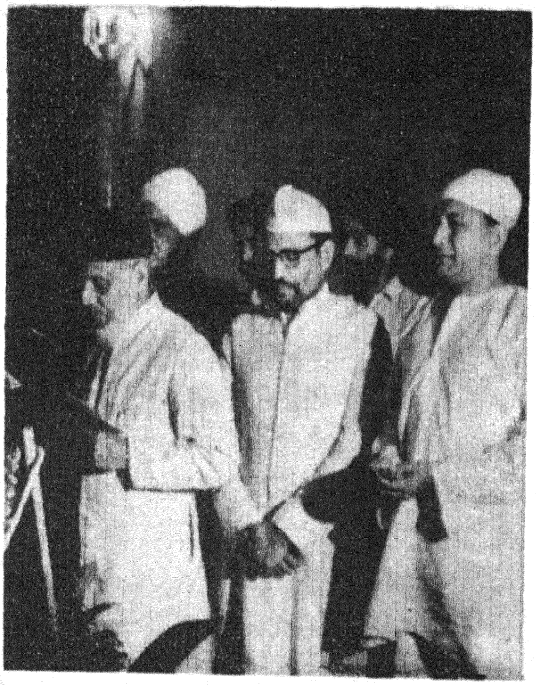

وزیروں نے کی۔ جنازے میں شرکت کے لئے ملیشیا پارلیمنٹ کے اسپیکر اور روس سے وزیر آب کوسی گن تشریف لائے۔

ذاکر صاحب نے اپنی ابدی آرام گاہ کے لئے جامعہ ملیہ کی سرزمین کو ہی پسند کیا تھا۔ اور اپنی اس خواہش سے اپنے دیرینہ رفیق کار پروفیسر محمد مجیب کو آگاہ بھی کر دیا تھا۔ ذاکر صاحب کو آسودۂ خاک کرنے کے لئے جو جگہ پسند کی گئی تھی، اس کے ایک طرف مشہور رہنما ڈاکٹر انصاری اور دوسری طرف کشمیر کی لڑائی کے شہید بریگیڈیر عثمان محو خواب ہیں۔

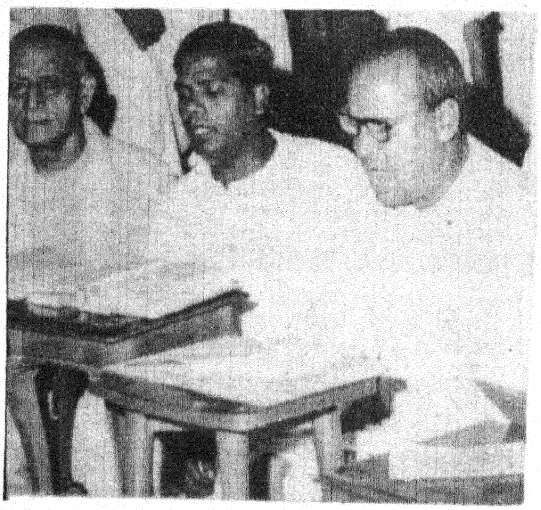

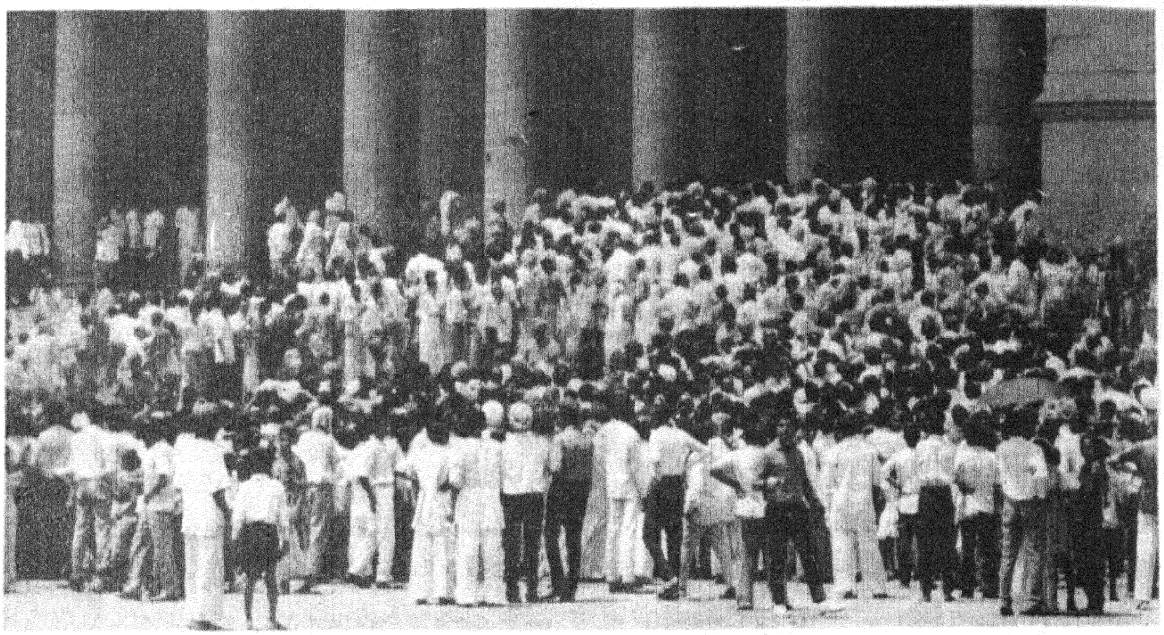

اس قطعۂ اراضی کو جامعہ ملیہ کئی سال سے حاصل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ مگر اس کے مالک کسی دام پر فروخت کرنے کو راضی نہ ہوتے تھے اور جب انھیں معلوم ہوا کہ اس جگہ پر ان کے محبوب رہنما ڈاکٹر ذاکر حسین کو دفن کرنے کی تجویز ہے تو اس زمین کے چار ہندو مالکوں نے یہ زمین نذرانۂ عقیدت کے طور پر پیش کر دی۔

سوموار کو چار بجے شام راشٹرپتی بھون کے دروازے آخری بار ڈاکٹر ذاکر حسین کے لئے کھلے۔ نماز جنازہ ۵ کے بعد میت توپ خانہ پر رکھی گئی۔ ۳۱ توپوں کی سلامی کے ساتھ ڈاکٹر ذاکر حسین کا آخری سفر شروع ہوا اور اسی راستے سے ہوتا ہوا گزرا جس سے مرحوم صدر ۲۶ جنوری کو یوم جمہوریہ کے موقعوں پر سلامی لینے کے لئے جاتے تھے۔

راشٹرپتی بھون سے جامعہ نگر کے ۸ میل لمبے راستے پر دونوں طرف لوگوں کی بے پناہ بھیڑ تھی۔ راجدھانی کے مختلف راستوں سے

(بقیہ ص ۱۶ پر)

مہر و اخلاص کی بُو ....

شاق گزری ہے دلِ اہلِ جہاں پر کیا کیا
صدرِ جمہوریتِ ہند کی رحلت اے وائے

صفحۂ خاک پہ افتادہ ہے منارۂ نور
تیرہ و تار ہے ایوانِ حکومت اے وائے

اُف رے یہ مصلحتِ ایزدِ مطلق، کیا خوب
ہو گیا حد سے ہر دل جبرِ مشیت اے وائے

اُٹھ گیا ایک متاعِ دل و جاں کا گاہک
چل دیا ایک پرستارِ محبت، اے وائے

مہر و اخلاص کی بُو جامۂ انساں سے گئی
اب ہے بے رنگ وہ تصویرِ مروت اے وائے

کوئی چرکا بھی تھا کاری تو بصد شوق سہا
جسکو ہر طرح گوارا تھی اذیت اے وائے

ہو گئی قافلہ سالار کی عظمت رخصت
اب کہاں وہ سر و سامانِ قیادت اے وائے

صدرِ جمہوریتِ ہند کے اُٹھ جانے سے
گئی لقمان و ارسطو کی وہ حکمت اے وائے

اب کہاں ذاکرِ بے لوث کا اخلاقِ کریم
اب کہاں سیرت و کردار کی عظمت اے وائے

ہر طرف حشر کے آثار نظر آتے ہیں
سر پہ نازل ہوئی کیسی یہ قیامت اے وائے

کوئی اندیشہ کوئی اس کا گماں بھی تو نہ تھا
کیا یہ تقدیر نے ڈھائی ہے مصیبت اے وائے

کس کے قدموں پہ نجابت کو تصدق دیکھا
کس کے ہمراہ گیا جشنِ شرافت اے وائے

کشورِ قوم کا وہ قیصرِ بے تاج نہیں
ذاکرِ نازِ محبانِ وطن آج نہیں

موت کے ایک اشارے نے کیا کام تمام
ہو گیا خاک بسر یہ دُرِ کلثوم دریغ

اقربا مہر بلب رنج کی کثرت سے ہیں
چُپ احبا ہیں بصد خاطرِ مغموم دریغ

کس کی خدمت کے شرف سے کسے محرومی ہے
اوجھل آنکھوں سے ہے اسحاق کا مخدوم دریغ

نیستی لے ہی اڑی جسم سے ہستی کا لباس
کل جو موجود تھا ہے آج وہ معدوم دریغ

جسے کہتا تھا زمانہ ابھی ذاکر صاحب
اب نظر میں نہیں وہ ہستیِ معصوم دریغ

نظر آتا نہیں اب محتشم ایسا کوئی
نامِ ذاکر سے کریں اب کسے موسوم دریغ

کس کے منہ میں ہے زباں کسکو ہے یارائے سخن
کیا بتائے کوئی اب عظمتِ مرحوم دریغ

مرگِ ذاکر پہ ہزاروں نے بہائے آنسو
آئی سننے میں جہاں یہ خبرِ شوم دریغ

کیا سمجھ لیں کہ نہیں راس مقدر اپنا
پھر گئی کیا نظر قادرِ قیوم، دریغ

ایسے معصوم فرشتے پہ بھی برپا ہے ستم
چرخِ ظالم نے بنایا کسے مظلوم، دریغ

نثر میں خاکِ قلم کوئی سوانح پہ اُٹھائے
تذکرہ ان کا لکھے کیا کوئی منظوم، دریغ

دل کو پہونچا ہے جو صدمہ نہ کبھی کم ہوگا
تا ابد ذاکرِ مرحوم کا ماتم ہوگا

چشمِ نہرو نے کسے خاص فضیلت دی تھی
کس نے گاندھی کی نگاہوں میں شرف پایا تھا

عمر بھر فضلِ خدا سے جسے مامن اپنا
مادرِ ہند کے پہلو میں نظر آیا تھا

شامل ایک ایک نفس میں رہی تفسیر اسکی
روئے قرآں سے پیمبرؐ نے جو فرمایا تھا

مرتے مرتے بھی نہ منہ بھول کے اس سے موڑا
حسنِ کردار کا مرکز جسے ٹھہرایا تھا

یہ جو ہے گلشنِ تہذیب و تمدن پہ نکھار
دو نگڑا دانش و ادراک کا برسایا تھا

جامعہ تا بہ ابد ناز کرے گا اس پر
ہر طرف سلسلۂ فیض جو پھیلایا تھا

آنچ تھی شعلۂ جذبات کی ہر چند خموش
جوشِ تقریر سے کس دل کو نہ گرمایا تھا

ملک و ملت کی محبت میں فنا ہونے کو
خود تڑپ کر دلِ جمہور کو تڑپایا تھا

اوجِ اخلاق پہ خورشیدِ منور بن کر
مادرِ ہند کی تقدیر کو چمکایا تھا

جس کی املاک تھی ہر فرد و بشر کی املاک
اس کا سرمایہ جو تھا قوم کا سرمایا تھا

سرپرستی کا جو طالب ہوا بن کر محتاج
اپنی اولاد سمجھ کر اسے اپنایا تھا

دین میں جو تھا روا جس کا تھا ایماں میں جواز
دستِ بے لوث سے پرچم وہی لہرایا تھا

کہیں ممکن نہیں ایسا کوئی دیندار کہاں
کفر ان کے لئے اسلام کا ہمسایا تھا

داغِ ذاکر دلِ رنجور سے جانے کا نہیں
صبر آنے کی طرح اب کبھی آنے کا نہیں

بشیشور پرشاد منور لکھنوی

خواجہ غلام السیدین

ڈاکٹر ذاکر حسین : ایک افسانہ

جب مہاتما گاندھی نے شہادت پائی تو پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ کچھ عرصے کے بعد لوگوں کو یقین نہیں آئے گا کہ ان جیسا انسان دراصل اس زمانے میں ہماری دھرتی پر پیدا ہوا تھا اور ہماری آنکھوں کے سامنے اُس نے اپنی شاندار زندگی بسر کی تھی۔ جس روز سے ڈاکٹر ذاکر حسین خدا کو پیارے ہوئے، کچھ اسی قسم کا خیال برابر میرے دل میں گھوم رہا ہے۔ ان کو قریب سے جاننے والوں کے لئے تو ان کی بھرپور زندگی پہلے ہی ایک افسانہ Legend بن چکی ہے اور اگر کوئی واقعتاً قابل اور باخبر آدمی ان کی ایک مکمل سوانح حیات تصنیف کر سکے تو دوسرے لوگوں کے لئے بھی ایک افسانہ بن جائے گی

ان کی دل کش شخصیت کے بے شمار حسین پہلو تھے۔ اُن کی شرافت اور پاک باطنی، ان کا علم و فضل، ان کی تقریر و تحریر، ان کی متنوع دلچسپیاں ان کی انسانیت، ان کا عجز و انکسار جو دکھاوے کے لئے نہ تھا بلکہ ان کی فطرت کا جزو تھا، ان کی سیاسی سوجھ بوجھ، ان کی جرأت و صداقت، دم گفتگو ان کی نرمی، دم جستجو اُن کی گرمی، غرض کس کس پہلو کا کوئی ذکر کرے اور اس دولتِ فراواں میں سے کیا کیا لے؟ ایک مختصر مضمون میں ان کے کارناموں کا احاطہ کرنا تو ممکن ہی نہیں ہے البتہ ان کی شاداب و درگداز شخصیت چند جھلکیاں دکھانا چاہتا ہوں ان میں بعض خصوصیتیں ایسی تھیں کہ وہ لوگ بھی جو اُن سے سرسری طور سے واقف تھے اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اسی وجہ سے مجھے تعجب نہ ہوا جب میں نے دیکھا کہ دوسرے ملکوں سے جو مشاہیر ان کو اپنے آخری سفر پر رخصت کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے یا جنہوں نے اُن کی وفات پر باہر سے پیغامات بھیجے تھے۔ انہوں نے بھی ان صفات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جن لوگوں کو عظمت کو چھونے کا اور اُس کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملے ان کا فرض ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس خوش نصیبی میں شریک کریں کیا عجب ہے کہ ان کے فیض سے ان کی نکھی سے ہماری سپاٹ زندگیاں بھی فیضیاب اور رنگین ہو سکیں۔ یہ شخصیتیں زندگی کی اُن مول قدروں کی حامل ہوتی ہیں جو لعل و جواہر سے کہیں زیادہ قیمتی ہیں۔ . . .

ذاکر صاحب کی شخصیت اعمال و اقدار کا، جلال و جمال کا ایک نادر اور حسین امتزاج تھی۔ اُن کی ذات میں مجھے اپنے ملک کے بعض چوٹی کے رہنماؤں کی سیرت اور صفات کا جلوہ نظر آتا ہے۔ (بزرگانِ قدیم کا اس وقت میں ذکر نہیں کروں گا) ان میں ٹیگور کا شدید احساس جمال تھا اور کمال یہ ہے کہ ان کے ابتدائی ماحول میں کہیں بھی فنون لطیفہ کی جگہ نہ تھی اُمادہ کا نامور اسکول نہ صرف آرٹ کی تعلیم نہ دیتا تھا۔ بلکہ اس کی راہبانہ فضا میں آرٹ کو اچھا نہ سمجھا جاتا تھا۔ علی گڑھ آرٹ کے خلاف نہ تھا لیکن وہاں بھی اس کے لئے کوئی خاص مقام نہ تھا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے ان کے خاندان میں بھی جہاں سات پشت سے پیشہ سپہ گری تھا، اس کی روایات نہ تھیں۔ لیکن قدرت جو دیتی ہے اس کو بعض دفعہ ناسازگار ماحول بھی نہیں دبا سکتا غالباً جرمنی میں اس ودیعت فطرت کی آبیاری ہوئی اور اس کے بعد وہ ان کی پوری زندگی میں جاری و ساری رہا۔ ابھی حال ہی روز ہوئے شانتی نکیتن کی شریمتی ساوتری دیوی کو ریڈیو پر انٹرویو

ں تھا۔ وہ ٹیگور سے بہت اچھی طرح واقف تھیں اور ذاکر صاحب سے صرف ایک دفعہ ملی تھیں لیکن کتنا گہرا اثر تھا اس ایک ملاقات کا۔ انہوں نے کہا مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے گرودیو دوبارہ مر گئے ہوں۔ میں نے ان میں انہی کی غیر معمولی صفات کا جلوہ دیکھا جس وقت میں اُن کے پاس تھی تو میرے دل میں بے اختیار یہ جذبہ پیدا ہوا کہ ٹیگور کا ایک گیت انہیں سناؤں جیسے ٹیگور کی روح مجھ سے تقاضا کر رہی ہو کہ ایسا کرو۔ لیکن میں نے اس وقت ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ پھر انہوں نے ریڈیو پر وہ گیت سُنا یا جس میں ٹیگور نے ایک مردِ عظیم کی سیرت کشی کی تھی اور تمہید اس طرح اٹھائی تھی کہ اے دوست مجھے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہم آج پہلی مرتبہ مل رہے ہیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ازل سے ایک دوسرے سے واقف ہیں!... ذاکر صاحب نے ٹیگور کی طرح شاعری نہیں کی لیکن اپنی ساری زندگی کو ایک حسین شعر میں ڈھال کر دکھا دیا جس سے دل گرم بھی ہوتا تھا اور نرم بھی، جس میں فولاد کی کاٹ بھی تھی اور شبنم کی ٹھنڈک بھی۔ اور یہ الفاظ محض زیبِ داستان نہیں ایک حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ہر خوبصورت چیز، ہر خوبصورت خیال، ہر خوبصورت جذبہ ان کو اپیل کرتا تھا۔ پھول اور پتھر شعر اور ادب، موسیقی اور مصوری، فلسفہ اور سیاست، معاشیات اور سائنس، مذہب اور تصوف، علوم قدیم اور علوم جدید سب ان کی ذہنی اقلیم تھے۔ یہ نہیں کہ وہ ان سب میں ایک ماہر خصوصی کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ تو اس تیز رفتار زمانہ میں، جب کہا جاتا ہے کہ دس سال کے اندر اندر دنیائے علم کی حدیں دوچند ہو جاتی ہیں۔ کسی انسان کے لئے ناممکن ہے نہ ضروری۔ ان کی علمیت کی خاص شان یہ تھی کہ وہ تقریباً ہر علم میں کچھ نہ کچھ نظر رکھتے تھے۔ ان کے باہمی رشتوں کو سمجھتے اور ان مقامات کو پہچانتے تھے جہاں ان کی حدیں ملتی ہیں۔ مجھ سے ڈاکٹر وگ نے جو آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہیں بیان کیا کہ ذاکر صاحب نے ایک دفعہ ذاکر صاحب کو ایک سیمینار کا افتتاح کرنے کی دعوت دی جو ایک بہت ہی اصطلاحی اور غیر معروف لیکن اہم موضوع کے متعلق تھا۔ اور خود انہیں اس چھوٹے سے سیمینار میں صدر جمہوریہ کو بلانے میں تامل تھا لیکن انہوں نے اس کو اس خوش دلی کے ساتھ منظور کیا کہ ان کا تامل شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے ڈاکٹر وگ سے کہا کہ مجھے اس کے بارے میں ایک مختصر سا نوٹ لکھ کر بھیج دیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ جب اس مسودہ کی بنا پر انہوں نے تقریر کی تو وہ نہ صرف مسودہ سے کہیں زیادہ اچھی تھی بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ بولنے والا موضوع سے بخوبی واقف ہے۔ یہی شان میں نے ان کی اور بہت سی تقریروں میں دیکھی ہے جو اُن کے خاص موضوعوں سے ہٹی ہوئی ہوتی تھیں۔ ان کا علم علمِ حاضر تھا جس کو وہ بہت سلیقہ اور کرامت سے استعمال کرتے تھے کہ وہ نہ کسی پر بار ہوتا۔ نہ وہ کسی کو اس سے مرعوب کرتے۔ بلکہ صبح کی روشنی کی طرح دھیرے دھیرے دبے پاؤں ان کی بزم میں پھیل جاتا تھا۔ وہ چھوٹے بڑے عالم جاہل، صاحبانِ ذوق اور مردانِ بے ذوق سب کے ساتھ اس طرح گفتگو کر سکتے تھے کہ وہ اس سے لطف اور فائدہ اٹھاتے اور کسی کو یہ محسوس نہ ہوتا کہ وہ ان پر بار خاطر ہے۔ جو لوگ دراصل بور ہوتے اور دُنیا میں کتنی بڑی تعداد ہے اس برادری کی وہ خود ان سے بھی اپنے ذوقِ ظرافت کے طفیل لطف اٹھاتے لیکن کبھی اُن کی دل آزاری نہ کرتے۔ اس طرح گاندھی جی اور ذاکر صاحب میں بعض بنیادی قدریں اور شرافتیں مشترک تھیں۔ دونوں میں ایک سا عجز و انکسار تھا۔ وہ عجز و انکسار نہیں جو دوٹ حاصل کرنے یا کوئی دوسرا مطلب نکالنے کے لئے بطور ایک آلۂ کار کے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ وہ سچا انکسار جو ہر ایک حقیقی بڑے آدمی کی فطرت کا جزو ہوتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ہر انسان محض اس وجہ سے کہ وہ انسان ہے احترام کا مستحق ہے۔ اس کی ذات میں کہیں نہ کہیں نورِ الٰہی کی چنگاری چھپی ہوئی ہے۔ جو ظاہر میں نظریں نہیں دیکھ پاتیں لیکن جس کی کھوج ہر صاحبِ نظر کا فرض ہے۔ وہ اس حقیقت سے بھی آشنا ہوتا ہے کہ دولت، منصب، دنیاوی وجاہت، قوت اور رسوخ کی بنا پر دوسروں کو ذلیل سمجھنا اور ان کو اپنے سے کمتر جاننا خود سب سے بڑی ذلت ہے۔ یہ تو جلتی ہوئی چھاؤں ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں۔ اصل چیز انسان کی سیرت ہے اور انسانیت ہے۔ جب ہر چیز جاتی رہتی ہے تو یہ باقی رہتی ہے۔ ان کو جو بے شمار خراجِ عقیدت پیش کئے گئے، ان میں بار بار اس صفت کا ذکر آتا ہے۔ ابھی حال میں ریڈیو کے ایک بڑے افسر کا خط میرے پاس آیا جس کے چند جملے دہرانے کے قابل معلوم ہوتے ہیں دراصل خط انگریزی میں ہے، ترجمہ میرا ہے) "کسی نیک اور شریف اور دلنواز شخصیت کے بارے میں گفتگو یا تقریر کرنا مشکل نہیں... کسی معیار سے ناپو، ڈاکٹر ذاکر حسین دُنیا کے بہترین انسانوں میں سے تھے۔ اس سے بھی زیادہ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وہ اپنی غیر معمولی صفات کے بارے میں ہمیشہ انکسار اور عجز سے کام لیتے تھے۔ میں نے ریڈیو پر تقریباً تیس سال کام کیا ہے۔ اور ہندوستان اور بیرونِ ہند کے بہت سے بڑے آدمیوں

سے میرا سابقہ پڑا ہے۔ لیکن ان میں بہت کم ایسے تھے جن کو قدرت نے اس انکسار کی صفت سے متصف کیا ہو۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کو یہ دولت ملی تھی اور اس نے دراصل اُن کو ایک عظیم شخصیت بنایا۔ آدمی بڑا آدمی بن جائے دنیاوی اعتبار سے اعلیٰ ترین کامیابی حاصل کرے اور باوجود اس کے اپنی نیکی اور انکسار کو ہاتھ سے نہ دے، یہ چیز بہت کم لوگ کر سکے ہیں۔ ان میں یہ کمال تھا اور اس کے لئے انہیں کوشش بھی نہیں کرنی پڑی۔ کیوں کہ کسی کی دل آزاری کرنا اُن کی فطرت میں تھا نہ ان کی تربیت میں۔ کوئی زریں عہد اُن کی اس زریں صفت کو نہیں مٹا سکا۔ یہی چیز میرے ذہن میں تھی جب میں نے کہا تھا کہ قبر بھی ان کی روح کی عظمت کو قید نہیں کر سکتی۔" اور گاندھی جی ہی کی طرح ان میں سچ کی لگن تھی اور ہر قسم کے تشدد سے نفرت۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ انسان کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ وہ سلوک کر سکتے ہیں جو کرتے آئے ہیں۔ انہوں نے تاریخ کے سیاہ ورقوں کو پڑھا تھا لیکن ان کے دل میں یہ خیال گھومتا رہتا تھا کہ "بعبت خاک ساختن می سزد خدائے را"۔ وہ انصاف کے پُرجوش دردمند حامی تھے اور افراد یا گروہوں کا باہمی تصرف ان کے مذہب انسانیت میں سب سے بڑا گناہ تھا۔ گاندھی جی کی طرح ان کو کام سے لگن تھی اور ساری عمر اس طرح کام کرتے رہے گویا جو کچھ کرنا ہے آج ہی کرنا ہے۔ کیا معلوم کل آئے یا نہ آئے۔ اپنے بعض تعلیمی خطاب میں انہوں نے زندگی اور تعلیم میں کام کا مقام اس خوبصورتی اور فصاحت سے بیان کیا ہے جس کی نظیر مجھے کہیں اور نہیں ملی۔ ذاکر صاحب کا عقیدہ تھا کہ اچھی تعلیم کے بغیر نہ قومی سیرت کی تشکیل ممکن ہے، نہ آزادی کا حصول۔ نہ ایک بہتر فرد اور سماج کا ارتقاء۔ انہوں نے تعلیم ختم کرنے کے بعد عمر کا نصف سے زیادہ حصہ اچھی تعلیم کی خدمت میں صرف کیا۔ اس شان کے ساتھ کہ جب فقر و فاقہ کی نوبت ہوتی تھی، اس وقت بھی ان کے فقر میں "فقر شبیری" کی شان پائی جاتی تھی۔ اور یہ تو دراصل ایک معجزہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس زندگی کو نہ صرف خود پر رضا و رغبت اختیار کیا بلکہ اپنے بہت سے ساتھیوں کو بھی اس جنون میں شامل کر لیا۔ یہی آزمائش عزیز گاندھی جی کے بہت سے ساتھیوں کے حصے میں بھی آئی تھی اور انہوں نے اس کو بہت خوش دلی کے ساتھ جھیلا۔ لیکن اُن کے بعد اُن میں سے بیشتر نے (سب نے نہیں) اس کو اٹھا کر طاقِ نسیاں میں سجا دیا!

ذاکر صاحب اور جواہر لال نہرو میں بھی بہت سی قدریں مشترک تھیں۔ اور اسی وجہ سے دونوں ایک دوسرے کی بہت عزت اور ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ دونوں میں دل کشی اور انجمن آرائی کا ایک غیر معمولی ملکہ تھا۔ پنڈت جی نے سیاست کی دنیا میں رہنے کی وجہ سے اس کو ایک شعوری آرٹ بنا دیا تھا۔ ذاکر صاحب زیادہ تر ایک مختلف ماحول میں رہے، اس لئے ان میں اس کی شان ایک اندرونی روشنی کی تھی جو اُن کی ذات اور گرد و پیش کو منور رکھتی تھی۔ ان میں جواہر لال کی طرح صداقت، جرات اور بے باکی تھی اور وہ باطل کے ساتھ معاملہ کرنے پر راضی نہ ہو سکتے تھے۔ جواہر لال کو غصہ آتا تھا لیکن جب وہ اس کا اظہار کر لیتے تو وہ موسم بہار کے بادلوں کی طرح چھٹ جاتا اور اُن کا دل کہ مومن کا دل تھا صاف ہو جاتا۔ ذاکر صاحب کو شاید عام معنوں میں غصہ آتا ہی نہ تھا لیکن ان میں طیش برحق Righteous Indignation کی بہت صلاحیت تھی جس کو حتی الامکان افراد پر صرف نہ کرتے بلکہ اس کا شکار بے اصولی، بد دیانتی خود غرضی اور بے انصافی ہوتی۔ جواہر لال کی طرح اُن میں انتہائی مروت تھی جو بعض دفعہ اعتدال کی حد سے نکل جاتی۔ اس کی تہ میں بھی وہی جذبۂ وضعداری تھا کہ حتی الامکان کسی کی دل آزاری نہ کی جائے۔ بعض دفعہ اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوتا تھا لیکن اگر مجھے بھی مروت اور بے مروتی میں سے ایک کو اختیار کرنا پڑے تو میرے لئے بے مروتی کا انتخاب کرنا مشکل ہوگا۔ یہی حال بھروسے اور سنبہ کا تھا۔ دونوں انسانوں کے بارے میں بھروسے کی پالیسی کو شبہ کی پالیسی پر ترجیح دیتے تھے۔ لیکن ذاکر صاحب میں مردم شناسی کی صلاحیت جواہر لال سے زیادہ تھی۔ کوئی آدمی اُن کو بے وقوف نہ بنا سکتا تھا جب وہ خطاکار کی خطا پوشی کرتے تھے تو یہ جانتے ہوئے کہ ایسا کر رہے ہیں اور بعض دفعہ ایسا بھی دیکھا گیا کہ اس طریقۂ کار سے خطاکار کے قلب ماہیت ہو گئی۔

ایک دفعہ جواہر لال اور رفیع احمد قدوائی میں ایک سیاسی معاملہ پر اصولی اختلاف ہوا اور وہ پارٹی سے علیحدہ ہو گئے۔ اُن کو منانے کی ساری کوششیں بے کار گئیں۔ اس وقت ذاکر صاحب کو اس نازک مہم پر بھیجا گیا۔ رفیع صاحب چاہتے تھے کہ جواہر لال اُن کی بعض شرطیں مان لیں۔ ذاکر صاحب نے دورانِ گفتگو میں ان سے کہا کہ آپ کا اور جواہر لال کا معاملہ علم کا نہیں عشق کا ہے اور عشق میں شرط اور دلیل کی گنجائش نہیں۔ اس میں تو خلوص اور محبت پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ غرض انہوں نے ایسی بحث کی کہ رفیع صاحب قائل ہو گئے اور محبت کا یہ تنازعہ ختم ہو گیا۔ ذاکر صاحب ایسے

نازک اور اہم موقعوں پر عقل محض کے بجائے عشق پر، یعنی عقل پر جو ادب خوردہ دل ہمیشہ بھروسہ کرتے تھے اکثر ایسا ہوتا کہ صاحبانِ دانش سمندر کے کنارے گھڑے موافق اور مخالف تجویز کرتے رہتے اور وہ سمندر میں کود پڑتے یعنی ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل تھی محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

مولانا ابوالکلام آزاد اور ذاکر صاحب بھی ایک ہی خاکِ پاک کے بنے ہوئے تھے۔ دونوں میں بہت اچھی سیاسی اور عملی سوجھ بوجھ تھی دونوں بہت جلد اور آسانی سے معاملہ کی تہ کو پہنچ جاتے تھے۔ دونوں بہت خوش گفتار تھے، ذاکر صاحب ہر حال میں، ہر شخص کے ساتھ، ہر موقع پر۔ مولانا کم آمیز تھے، اور ان کی خوش بیانی کے جوہر اس وقت کھلتے جب ان کا موڈ حاضر ہوتا اور چند بے تکلف احباب کا مجمع ان کے سامنے ہوتا دونوں میں تحریر و تقریر کا کمال تھا، اپنے اپنے انداز میں۔ مولانا کے بولنے اور لکھنے میں لفظوں کا طوفان آجاتا تھا لیکن کیا مجال کہ کوئی لفظ جملے میں اس طرح نہ بیٹھے جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ ذاکر صاحب کی تقریر و تحریر میں بھی ایک خطیبانہ شان تھی لیکن اس میں ایک خاص ضبط اور اعتدال تھا۔ الفاظ اور معنی و مطلب میں ایسا حسین توازن ہوتا وہ ان کے خلوص کی قندیل سے اس طرح روشن ہوتے کہ ایسی بہت کم مثالیں ملتی ہیں چھوٹے چھوٹے فقروں میں ایسے پتے کی بات، ایسی چبھتی ہوئی بات، ایسی گہری بات کہہ جاتے کہ جوہر تیوں کا ماہر جوہاری نہ ہوتا اسے بات کی قیمت کا پورا اندازہ بھی نہ ہوتا، دونوں کو مذہب کے ساتھ بہت گہری عقیدت تھی۔ مولانا کی مذہبی خدمات تو دنیا کو معلوم ہیں ان کے ترجمان القرآن ہی نے ان کو اسلام کی تاریخ میں امر بنا دیا ہے۔ ذاکر صاحب نے بھی قرآن شریف اور دوسری مذہبی تصانیف اور خاص کر تصوف کا بہت سنجیدہ مطالعہ کیا تھا اور ان کی بلند ترین قدروں کو اپنی زندگی اور لکھنے بولنے میں سمو لیا تھا۔ زندگی کے آخری حصے میں وہ رمضان کے مہینے میں پندرہ قرآن ختم کر لیتے تھے۔ یہ تو شاید ہمیشہ و قرآں خواں بھی نہ کر سکے ہوں لیکن وہ اس طرح نہ پڑھتے تھے جیسے ایک فرض ادا کر رہے ہوں بلکہ جیسے قرآن خود ان پر نازل ہو رہا ہو۔ اکثر قرآن پڑھتے وقت ان کی آنکھوں سے آنسو جاری رہتے۔ ایک دفعہ انہوں نے کاشی دیوا پیٹھ کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر خطبۂ صدارت دیا تھا کس سیدھی سیدھی سلیس خالص ہندوستانی زبان میں تھا یہ خطبہ! جس نے سنا اس کے دل میں ان کی بات سیدھی اتری میں نے اس خطبہ کو پڑھا تو دیکھا کہ اس کے آخر میں چند جملے تھے جو مجھے بہت ہی آشنا معلوم ہوئے اور میں چند منٹ تک سوچتا رہا کہ یہ کہاں سے آئے ہیں۔ دفعتہً ایک بجلی سی میرے دماغ میں کوند گئی اور مجھے یاد آیا کہ یہ تو سورہ فاتحہ کا لفظی ترجمہ ہے جس کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ انہوں نے اپنی تحریر میں ایک موتی کی طرح پرو دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان کے دل میں دوسرے مذہبوں کا پرخلوص احترام تھا اور ہر مذہب کے ماننے والوں کے لئے محبت اور گنجائش۔ یہ کیفیت صرف ایک سچے مذہبی آدمی ہی میں پیدا ہو سکتی ہے جو جانتا ہے کہ سب راستے دراصل ایک ہی منزل کی طرف جا رہے ہیں، اور اس کے راہرو ایک ہی حقیقتِ اعلیٰ کے متلاشی ہیں۔۔۔ یہ سب بڑے بڑے آدمی اپنے اپنے خاص میدان میں شاید ان سے بڑھے ہوئے تھے لیکن میرا خیال ہے کہ اقدارِ اعلیٰ اور آدابِ مجلسی کا جو حسین امتزاج ان میں تھا۔ وہ ان ہی کا حصہ تھا۔

وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

ان کی زندگی کا مرکزی نقطہ تلاشِ کمال کا ایک شدید جذبہ تھا جو صرف ان کے کاموں ہی میں نہیں بلکہ ان کی ذات کے ہر گوشہ میں ایک قندیل کی طرح روشن تھا۔ وہ جامعہ میں ہوں یا علی گڑھ میں یا بہار یا دہلی کے محلوں میں، ہر جگہ اپنے مکان کو تکمیل کے فیض اور انگلیوں کی برکت سے ایک گلستان بنا دیتے تھے۔ اور اگر وہ پہلے سے گلستان سمجھے جاتے تو لفظوں کی وساطت کے بغیر دکھا دیتے کہ گلستان اس کو کہتے ہیں۔ ان کی تقریر میں کبھی جھول نہ ہوتا ان کی تحریر میں کبھی الفاظ کی یورش خیال کی جگہ نہ لیتی بلکہ لفظ ان کے شریفانہ خیالات اور جذبات کا جامہ بن کر نازل ہوتے ——— اردو اور فارسی نظمیں اس انداز سے پڑھتے، اس میں اس قدر جوش اور خلوص اور موسیقی ہوتی کہ سماں بندھ جاتا تھا۔ تصویروں کا ستھرا ذوق جس میں قدیم اور جدید دونوں کے لئے جگہ تھی، اس انقلاب سے ظاہر ہوتا ہے جو انہوں نے تھوڑے سے عرصے میں راشٹرپتی بھون کی گھٹی ہوا فضا میں پیدا کر دیا۔ نہ صرف ان کے ذاتی استعمال کے کمروں میں بلکہ پبلک کمروں اور برآمدوں میں بھی خطاطی کے بہترین نمونے جن میں سے بعض افغانستان اور ایران کے بہترین خوشنویسوں کے ہاتھ کے ہیں دیواروں پر آویزاں ہیں اور ان کے حسنِ ذوق کے شاہد۔۔۔

مگر باوجود ان سب باتوں کے جن سے دل کو تسلی ہونی چاہئے، انہیں ہوتی۔ مکان کو دیکھ کر کہیں یاد آتا ہے اور کس شدت کے ساتھ:

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد ؎ مجنوں جو مر گیا ہے تو صحرا اداس

جگن ناتھ آزاد

ڈاکٹر ذاکر حسین

دہلی سے ہائے کیا خبر آئی یہ ناگہاں ۔ پھر گلشنِ وطن پہ مسلط ہوئی خزاں
پھر محفلِ طرب ہے تظلم کی داستاں ۔ پھر نغمۂ نشاط ہے فریادِ خونچکاں
پھر اک وطن کا فخر وطن سے چلا گیا
پھر ایک پھول اپنے چمن سے چلا گیا

ذاکر وہ علم و حلم و مروّت کی داستاں ۔ افسانۂ خلوص، محبت کی داستاں
مہر و وفا کا ذکر، مودّت کی داستاں ۔ اس دورِ نو میں کہنہ شرافت کی داستاں
صد حیف داستان یہ دُر پوش ہو گئی
سب سُن رہے تھے اور یہ خاموش ہو گئی

وہ جامعہ ہو یا ہو علی گڑھ کہ ہو بہار ۔ بن کر رہا ہر ایک جگہ طرّۂ وقار
ایوانِ خاص ہو کہ صدارت کا اعتبار ۔ ہو گلشنِ ادب کہ سیاست کا خارزار
تو جس زمین پر بھی رہا آسماں رہا
ہر عہدۂ جلیل کی رُوحِ رواں رہا

تعلیم کے جہاں کا خیالِ فلک نشیں ۔ خاکِ وطن سے جس کا تھا پیمانِ اوّلیں
اس شوق میں کہ غیرتِ جنت ہو یہ زمیں ۔ اک لمحہ بھی نہ راہِ عمل میں رُکا کہیں
عزم و عمل میں محو، زباں سے سدا خموش
"مانندِ برقِ تیز، مثالِ صبا خموش"

شفّاف دل تھا اور تھی شفّاف گفتگو ۔ باتیں وہ اُس کی بادۂ اخلاص کے سبو
جو کچھ تھا دل میں تھا وہ زباں پر بھی ہو بہو ۔ اُس کی یہی نماز تھی اُس کا یہی وضو
اُس کا عجب تھا ڈھنگ، عجب اس کا طور تھا
اے عصرِ نو! وہ فرد نہ تھا ایک دور تھا

شمیم کرہانی

تیشہ گر

(بیادِ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم)

دُھوپ کی آنچ، دہکتا ہوا تیشہ کیا ہے
کس لئے خاک پہ گرتا ہے جبینوں سے عرق
یہ زمیں جب عرقِ عزم سے تر ہوتی ہے
تو بیاباں میں بہاروں کی سحر ہوتی ہے
کس لئے وادیٔ خارا میں کوئی آبلہ پا
رنج سہتا ہے مگر محوِ سفر رہتا ہے
دُکھ میں آرام کی منزل نظر آتی ہوگی
قیس کو لیلیٰ محمل نظر آتی ہوگی
عیش سے فقر کے دامن کو بچاتے رہنا
کہنہ پوشاک میں پیوند لگاتے رہنا
یہ فقیرانہ روش، دیدہ وری ہوتی ہے
یوں بھی اے زیست تری سنجیدہ گری ہوتی ہے
شیوۂ ذاکرِ دانا کوئی مجھ سے پوچھے:
سادگی زیورِ عظمت ہے، سجائے رکھنا
ظلمتِ غم میں بھی، تابندہ ضمیری نہ گئی
راج محلوں میں رہا پھر بھی فقیری نہ گئی
آہ وہ تیشہ، تہِ خاک جو خوابیدہ ہے
صبح آئے دو گلابوں میں بدل جائے گا
رُوحِ ذاکر دلِ ملت کو پکار آئے گی
جاگ اُٹھے گا چمن، صبح بہار آئے گی

محمد اکرم

ذاکر صاحب

سنیچر کا دن تھا۔ صبح گیارہ بجے کا عمل تھا۔ میں ضروری کاغذات لئے باتھ روم کے باہر کھڑا تھا۔ مجھے بس ایک لمحے کے لئے ذاکر صاحب سے بات کرنا تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگر چوک گیا اور ڈاکٹروں کی ٹیم نے جو ذاکر صاحب کے معائنے کے لئے آئی ہوئی ہے معائنہ شروع کر دیا تو وقت مشکل ہی سے مل پائے گا۔ مجھے ذاکر صاحب کے ذاتی ملازم اسحاق نے طنزاً ٹوکا بھی۔ کہا: میں دفتر اور گھر میں کوئی فرق ہی روا نہیں رکھتا۔ میں سوچنے لگا۔ اسحاق ٹھیک ہی تو کہتا ہے لیکن کام مقدم اور ضروری ہے اور پھر وہ بھی ایک ایسے شخص کا جو کام کو سب سے بڑی عبادت سمجھتا ہے اور جس نے زندگی بھر اس اصول کو اپنے فکر و عمل کا جزو خاص بنائے رکھا۔

میں بدستور باتھ رُوم کے باہر کھڑا رہا۔ اور کاغذات میرے ہاتھ ہی میں رہے۔

ذاکر صاحب باتھ رُوم میں تھے۔ پل پل بھاری ہو رہا تھا۔ باتھ روم کے باہر اسحاق عجیب اضطراب کے عالم میں کھڑا تھا۔ ذاکر صاحب نے اتنی دیر کیسے لگا دی دیر کیوں لگی؟ اُنہیں باتھ رُوم ہی میں دل کا دورہ پڑا تھا۔ بے ہوش ذاکر صاحب جب کمرے میں لائے گئے تو ڈاکٹروں نے انھیں گھیر لیا۔ دیکھا بھالا۔ پھر بھی جتن کر ڈالے لیکن بے سود۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ ہاں اندھیری ہوا تھا۔ اپنے افکار اور اعمال سے روشنی دینے والی ایک شمع خاموش ہو گئی تھی۔ ذاکر صاحب دل کے شدید دورے کی تاب نہ لا سکے تھے۔ وہ زندہ نہیں تھے۔

توجہ طلب کاغذات اب بھی توجہ کے طالب تھے۔

گزشتہ کچھ عرصے سے جو احساس ذاکر صاحب کو اور جو خفیف سا اندیشہ اُن کے عزیزوں، رشتہ داروں اور رفیقوں کو پیدا ہو گیا تھا، وہ بے جا نہ تھا۔ ادھر دو مہینے سے وہ کچھ سست اور اُداس اُداس سے رہنے لگے تھے۔ ملاقاتیوں کا سلسلہ ڈاکٹروں نے منسوخ کر دیا تھا۔ نیز مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔ کام کاج اور کاغذات کی تکمیل کے سلسلے میں جب جب حاضر ہوا، دیکھا، لیٹے ہوئے ہیں۔ معذرت کی، کہا پھر حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ آرام فرمائیں۔ بولے اب کام کہاں، آرام ہی تو کرتا ہوں۔ اور پھر اس کے بعد کاغذات اور فائلوں کو نپٹانے لگے اور میں آج سوچتا ہوں جس شخص نے کام کو زندگی کی سب سے بڑی عبادت سمجھا اور جانا تھا اُن لمحوں کا کس قدر تعلق ہو گا جو اس عبادت میں صرف نہیں ہوئے۔

ذاکر صاحب کردار کے غازی تھے۔ اُن کی زندگی اول تا آخر عمل سے عبارت تھی۔ محنت اور سچی لگن سے کام کرتے تھے اور اپنے ساتھیوں رفیقوں سے ایسی ہی محنت اور سچی لگن کے مقتضی ہوتے تھے۔ وہ کام لینا جانتے تھے۔ چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے کام کی نوعیت اور اہمیت پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اچھا کام کرنے والے کی قدر کرتے اور اس پر بڑا اعتماد کرتے تھے۔ کام کو عبادت اور کام ہی کو اس عبادت کا انعام سمجھتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اپنے رفیق اور ساتھی سوائے اس انعام کے کسی دوسرے انعام سے سرفراز نہ ہوئے۔

چھوٹے بڑے سب سے ایک سا برتاؤ کرتے تھے۔ رویئے اور روش میں برتری کا شائبہ تک نہ تھا۔ صبر و برداشت کا مادّہ بے پایاں تھا۔ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ کس بات سے خوش ہوئے اور کس بات سے ناخوش ہوئے۔ ناراض کبھی ہوئے بھی تو ایسے کہ دوسرے کو

ناراضی کا احساس تک نہ ہوا۔ مجھے گزشتہ سات سال سے ڈاکٹر صاحب کی خدمت کرنے کا شرف حاصل رہا ہے لیکن میں نے کبھی انھیں غصے میں نہیں دیکھا جب بھی سامنا ہوا، بہت پرسکون، مطمئن اور دل جمعی کے عالم میں پایا۔ لیکن سوچتا ہوں: بظاہر پرسکون جھیل کی سطح کے نیچے شدید قسم کے طوفان کروٹیں لیتے ہوں گے۔ ان کی زندگی سرتاپا عمل سے عبارت تھی۔ طوفان کی انہیں کروٹوں کو موجوں کے اسی اضطراب کو انھوں نے عمل کی راہ دکھائی ہوگی۔ اُن سے بڑا کام لیا ہوگا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا انہیں میں نے کبھی غصے کے عالم میں نہیں دیکھا۔ ان کا غصہ۔ میرا خیال ہے کہ لفظ غصہ ڈاکٹر صاحب کے عمل سے استعمال ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی ناگواری کا احساس اس جملے سے ہوتا تھا "ہاں غلطی میری ہے" یا "معتوب" سے معذرت کرنے سے بھی نہ ہچکچاتے تھے۔ لیکن اکثر ایسا ہوا کہ معذرت پر مخاطب ایک بار حیرت میں پڑ گیا۔ سوچنے لگا ڈاکٹر صاحب نے کب کچھ کہا تھا۔ کس بات کی یہ معذرت فرما رہے ہیں۔ اس ذیل میں استثنات سے کام نہ لیتے تھے بڑے سے بڑے اور معمولی سے معمولی ساتھی، رفیق اور کارکن کے جذبات اور احساسات کا بڑا خیال رکھتے تھے۔

بڑے منکسر المزاج تھے۔ انسانی ہمدردی کا جذبہ ان کے دامن کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا۔ کون سا وصف تھا جو اُن کی ذات میں نہ تھا۔ وہ مجمع صفات تھے۔ ان صفات کا اکتساب انہوں نے مذہب کیا تھا وہ جوہر اسلام کے رمز آشنا تھے۔ اُن کی زندگی خاموش عبادت ہوتی تھی۔ رمضان شریف میں دو دن میں پورا قرآن شریف ختم کیا کرتے تھے۔ پابندی سے نماز ادا کرتے تھے۔ وہ قول و فعل اور کردار کے اعتبار سے سچے مسلمان اور سچے ہندوستانی تھے۔ غیر معمولی تحمل اور ضبط اُن کے مزاج کا خاصہ حصہ تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب حیدرآباد سے امتیاز صاحب کے انتقال کی خبر موصول ہوئی تھی تو ہم لوگوں کی حالت کیسی غیر ہوئی تھی۔ اپنے بھتیجے امتیاز کو ڈاکٹر صاحب اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے اور اسے بے حد عزیز رکھتے تھے۔ انہیں یہ خبر دیں تو کیسے! جیسے تیسے بن پڑا بیگم صاحبہ کو بتایا گیا پھر میں اور پھڈکے صاحب، ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سر جھکائے چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔ اس طرح خاموش دیکھ کر ڈاکٹر صاحب بولے۔

"کیا ہوا؟"

ہم کچھ نہ بولے۔ ہم خاموش اداس کھڑے رہے۔

"اے بھئی چپ کیوں ہو۔ بولتے کیوں نہیں، کیا کسی کا انتقال ہو گیا ہے۔"

"جی۔ جی ۔ ۔ ۔ ۔ امتیاز صاحب ۔ ۔ ۔ ۔"

امتیاز کا انتقال ہو گیا ہے؟"

خبر اُن تک منتقل ہو چکی تھی۔ سانحہ تھا، جو گزر گیا تھا لیکن اُن کے ظاہر پرسکون میں کوئی خلل واقع نہ ہوا تھا۔ چہرے پر انتشار کا کوئی نشانیہ نہ تھا۔ گویا اس جھیل کی کوئی موج مضطرب نہ تھی۔

اُن کے معمولات کا عالم بھی جداگانہ تھا۔ کوئی حد فاصل نہ تھی، جو اُن کی سرکاری مصروفیات کو ذاتی مصروفیات سے جدا کرتی ہو۔ ان کا سارا معمول سرکاری تھا اور ذاتی بھی۔ اگر سرکاری امور پر متوجہ نہیں۔ اور اگر کوئی ملاقاتی نہیں تو مطالعہ میں مصروف ہیں اور اگر اس بیچ میں کوئی سرکاری کام آ گیا تو کتاب اٹھا کر ایک طرف رکھ دی۔ کام ختم ہوا تو پھر مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔ سوتے عام طور پر دیر سے تھے۔ آٹھ سویرے ہی جاتے تھے۔ پھولوں پودوں سے جو انھیں فطری مناسبت تھی، وہ انہیں کشاں کشاں باغ کی طرف لے جاتی تھی۔ ٹہل کر لوٹتے تو لیٹ رہتے۔ اور پھر دس بجے کے قریب اٹھتے تھے صبح ناشتہ بالعموم دیر سے کرتے تھے۔ اور پھر سرکاری کاروبار کا سلسلہ شروع ہوتا۔ کھانے کے شوقین تھے لیکن خود کھا نہ پاتے تھے۔ ڈاکٹروں نے پرہیزی خوراک کی ہدایات دے رکھی تھیں لیکن مہمانوں کے لئے کھانے کا خاص اہتمام کرواتے تھے۔ بالعموم ایسا ہوتا کہ ایک بار دعوت میں جو کھانے پکائے جاتے انھیں دوبارہ نہ پکوایا جاتا۔ مختلف جگہ سے نامور باورچی بلوائے جاتے اور اکثر انھیں خود ہدائتیں دیتے۔ اکثر مختلف جگہوں کی مشہور چیزوں کے کھانے کی فرمائش کرتے۔ اولاً تو اب ان چیزوں کا محض نام ہی رہ گیا تھا۔ دوئم یہ ہے کہ ان چیزوں کا کھانا ان کے لئے مناسب نہ تھا۔

یہ بات جب کی ہے۔ جب آپ نائب صدر جمہوریہ تھے۔ میں ایک کام سے کمرے میں گیا تو دیکھا تشریف نہیں رکھتے۔ اُن کے ذاتی کمرے میں جھانک کر دیکھا وہاں بھی موجود نہ تھے کام کچھ فوری نوعیت کا تھا۔ تلاش کرتا ہوا لائبریری پہنچا تو وہاں بھی نہ ملے۔ ان کی تلاش میں گھومتا بہت ڈھونڈا تو ایسی جگہ یعنی پینٹری میں ملے، جہاں ان کے ہونے کا بظاہر کوئی امکان نہ تھا۔ دیکھا تو کڑکی روٹیاں کھا رہے ہیں۔ دیکھتے ہی پوچھنے لگے یہ بہت لذیذ ہیں۔ کہاں سے آئی ہیں۔ بتایا گیا کہ غازیآباد

سے نواب اسحاق نے بھجوائی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ جس طرح وہ اپنے پسندیدہ کھانے نہ کھا سکتے تھے، ویسے ہی وہ بے تکلف دوستوں سے بھی نہ مل پاتے تھے۔ احباب کے شکایتی خطوں کا جواب جب خود لکھتے یا لکھواتے تھے تو وقت نہ نکال سکتے۔ اور سیر ہو کر گفتگو نہ کر سکنے کو بدقسمتی گردانتے۔ وہ دوستوں کو بہت چاہتے تھے۔ ہر طرح سے ان کا خیال رکھتے تھے۔ دوست دار دست گیر بے مثل تھے۔ دوستوں پر، بزرگوں پر بے طلب توجہ کرتے تھے ان کے احباب، اعزا اور عقیدتمندوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ وہ بڑی دلچسپ باتیں کرتے تھے اور اکثر ایسے جملے اور فقرے کہتے جن سے بے ساختہ ہنسی آجاتی تھی۔

ذاکر صاحب کا مزاج بڑا لطیف تھا۔ ایک مرتبہ اُردو کے ایک ادیب نے انھیں لکھا کہ وہ اُردو ادیبوں کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں اشاعت کے لئے جمع کر رہا ہے۔ اس پر ذاکر صاحب نے لکھوایا کہ محترم مجھے معلوم نہیں کہ میری تاریخ پیدائش کیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں ۸ فروری ۱۸۹۷ء ہے۔ اور ہاں اگر آپ تاریخ وفات جاننا چاہتے تھے تو فی الحال آپ کو اپنی کتاب کی اشاعت ملتوی کرنا ہوگی ——

دفتر میں کام کر رہے ہیں۔ اسحاق سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک بجنے کو ہے۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ کہتے تم چلو میں آتا ہوں۔ کچھ وقت اور نکل گیا تو بیگم سامنے آکھڑی ہوئیں۔ دیکھا تو مسکرا دیئے۔ کہنے لگے۔ اٹھو بھئی۔ پہلے تو سمن آیا تھا اب وارنٹ آگیا ہے۔ ایک بار اٹنشورنس کے کاغذات پر بیگم صاحبہ سے دستخط کروانے کے لئے گیا تو بولیں یہ کیا مہلت ہیں۔ تو ہنس کر بولے بیگم عورتوں کی عمر مردوں کی نسبت لمبی ہوتی ہے۔

ادھر دو ہفتوں سے اُن کی کیفیت کچھ اور ہی تھی اور اب میں محسوس کرتا ہوں کہ انھیں احساس ہو گیا تھا کہ اُن کا وقت پورا ہونے والا ہے — ابھی کچھ ہی عرصہ پیشتر انھوں نے پروفیسر مجیب سے کہا تھا کہ جامعہ میں اُن کے لئے کوئی جگہ مخصوص کر دی جائے۔ کچھ ہی دن پہلے کی بات ہے کہنے لگے اگر خدانخواستہ یہاں میں مر گیا، تو نہلانے کا انتظام کہاں ہوگا۔

اُنھیں آخری غسل دینے کے لئے، مناسب جگہ کی تلاش میں خاصی دقت پیش آئی۔

بیگم صاحبہ سے ذاکر صاحب کی آخری ملاقات سنیچر کے دن صبح کو دس بجے ہوئی۔ جب وہ کمرے میں تشریف لائیں تو ذاکر صاحب مصروف مطالعہ تھے۔ کہنے لگے بیٹھو۔ بیگم صاحبہ نے کہا کیا بیٹھوں جب آتی ہوں آپ کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ کوئی کاغذ دیکھتے رہتے ہیں۔ یہی کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔ اس بات کا انھیں آج تک قلق ہے۔

جب وہ راشٹرپتی بھون آئے تو سارے اسٹاف سے ملے معمولی سے معمولی اہل کار سے گلے ملے۔ ہاتھ ملایا اور خیریت پوچھی۔ وہ صحیح معنوں میں اس بڑے کنبے کے سرپرست اور مددگار تھے۔ اور راشٹرپتی بھون کے لوگ انھیں ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

بقیہ ملاحظات

ہوتا ہوا سوگواروں کا جلوس ۷ بج کر ۵۰ منٹ پر تدفین کی جگہ پہنچا جنازے کو گاڑی سے اُتار کر چبوترے پر رکھا گیا اور پھر نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔ اور جسدِ خاکی کو قبر میں اتارا گیا۔

جامعہ نگر کا یہ حصہ راج گھاٹ اور شانتی ون کی طرح سارے ملک کے لئے ایک مقدس جگہ بن گیا ہے۔ اور دہلی آنے والے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی عظیم الشان عمارتوں کے ساتھ ساتھ اس مردِ درویش کی تربت کی زیارت بھی کریں گے جس نے اپنی اَن تھک محنت سے اس ادارے کی داغ بیل ڈالی اور اسے پروان چڑھایا اور جس سے مرنے کے بعد بھی اس نے جدا ہونا گوارہ نہ کیا ذاکر صاحب کی ذات اور اُن کے کام ایسے روشن مینار ہیں جو آنے والی نسلوں کو ملک کی سچی خدمت کا راستہ دکھاتے رہیں گے۔

ضروری اعلان

جولائی ۱۹۶۹ء کے شمارے میں ہم غالب کے نو دریافت دیوان کے بخط غالب ہونے سے متعلق امتیاز علی عرشی کا ایک مضمون شائع کر رہے ہیں۔ غالب کی تحریر کی شناخت کے سلسلے میں عرشی صاحب سند کا درجہ رکھتے ہیں۔

منیب الرحمٰن

سلام مچھلی شہری

وداعیہ

دُور، افلاک کی بلندی سے
تک رہے ہو تم آج سُوئے زمیں
کس کی آمد کے منتظر ہو تم
آہ! اے ساکنانِ عرشِ بریں،
کون ہے جس کی جستجو ہے تمہیں
ایک ساتھی جو تم سے چھوٹ گیا
ایک تارا جو شب میں ٹوٹ گیا

کھول دو، آج پھر درِ رحمت!
دیکھو، ہر سمت اک اُجالا ہے
ایک انساں، جو خاک بن کے جیا
اے ملائک وہ آنے والا ہے
تم زمیں پر اگر قدم رکھو!
دھوپ میں پرَ تمہارے جل جائیں
اور یہ جسم آبگینے سے
درد کی آگ میں پگھل جائیں

لوگ کہتے ہیں وہ فرشتہ تھا
مل گیا جا کے پھر فرشتوں میں
سچ ہے، لیکن اُسے نصیب ہوا
ابنِ آدم کا جو ہر خاکی،
صرف انساں کو یہ میسّر ہے
کہ بنے اُس کی گرد افلاکی

گلابوں کی خوشبو سمیٹے ہوئے وہ
"ترنگے" کی چھاؤں میں رخصت ہوئے ہیں
قرآن اور گیتا کی برکت سموئے
مقدّس فضاؤں میں رخصت ہوئے ہیں

وہی 'جامعہ' جو تھا محبوب اُن کو
اُسی سمت اُن کا گیا ہے جنازہ
فرشتوں کی آواز یہ آ رہی تھی
کہ خود زندگی کی دُعا ہے جنازہ

مساجد، منادر، مقابر سبھی نے
سرِ راہ تسلیم اُن کو کیا ہے
کئی بار اہلِ نظر نے یہ دیکھا
ملائک نے میّت کا بوسہ لیا ہے

وہ اُس راستے سے گئے ہیں، جہاں پر
نظام اور خسرو کی ہیں خانقاہیں
شریکِ جنازہ رہیں شام ہی سے
مقدّس بزرگوں کی یہ جلوہ گاہیں

شگفتہ گلابوں میں ڈوبی ہوئی سی
فسردہ، فسردہ ہوا آ رہی ہے
دعائیں، جو ہر اک کو دیتا رہا ہے
اُسے آسماں سے دعا آ رہی ہے

بیادِ رفتگاں

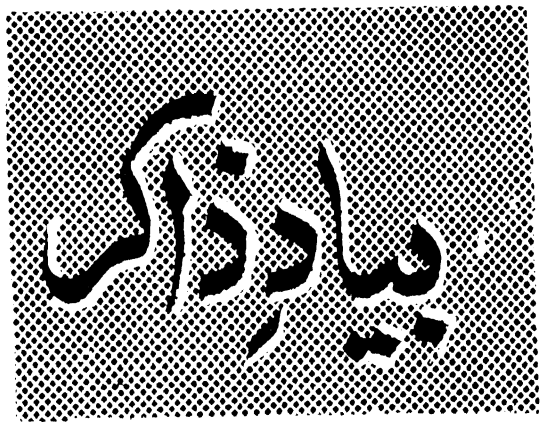

گیانی گورمکھ سنگھ مسافر

عجب دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

'ملک کے ہر دلعزیز اور عالم با عمل، رہنما راشٹرپتی ڈاکٹر ذاکر حسین کی اچانک جدائی نے عوام پر جو اثر کیا ہے' فارسی کا یہ شعر اس کا سچا ترجمان ہے۔ دل تسلیم نہیں کرنا چاہتا۔ کانوں کو سننا گوارا نہیں مگر زباں اس تلخ حقیقت کے اظہار کے لیے مجبور ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

چھپ گئے وہ ساز ہستی چھوڑ کر
اب فقط آواز ہی آواز ہے

دیش کے راشٹرپتی تو وہ صرف دو سال رہے۔ راشٹرپتی ہونے کے ناطے وہ بے شک ہمارے دیش کے پہلے شہری تھے۔ مگر بطور انسان اُن کا رتبہ بہت بلند تھا۔ انسانیت میں بھی ان کا نمبر پہلا تھا۔ راشٹرپتی کے عہدے پر ان کی ان صفات کو اور زیادہ چمک اس واسطے دی کہ انہوں نے کسی کو محسوس نہیں ہونے دیا کہ اب وہ اونچی جگہ پر کھڑے ہیں۔ عوام کے ساتھ ان کے رویے سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس لئے اونچی جگہ کھڑے ہیں کہ چاروں طرف نظر دوڑا کر سب کو دیکھ سکیں

ہمارا وشال دیش اختلافات کا مجموعہ ہے مختلف مذہب عقیدوں ذاتوں اور زبانوں وغیرہ کے لوگ ہمارے دیش میں بستے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا وجود دیش میں یک جہتی کی ایک کڑی تھا وہ کڑی آج ٹوٹ گئی۔

ایک دفعہ گرو گوبند سنگھ کی یوم ولادت پر پٹنہ گیا۔ اس وقت وہ بہار کے گورنر تھے۔ پٹنہ میں گرو گوبند سنگھ کے نام پر کالج کھولنے کی تجویز تھی۔ مقامی وفد کے لوگوں کے ساتھ مجھے بھی ڈاکٹر صاحب کے پاس جانے کے لئے کہا گیا۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے جو الفاظ کہے وہ اب تک میرے کانوں میں محفوظ ہیں۔ "تم کب آئے اور اپنے گھر میں کیوں نہ آئے" ذاکر صاحب کی نظر عنایت سے جسے میں نظر عقیدت کہوں گا، اس وقت وہاں کالج کھل گیا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین اپنی ذاتی شہرت سے ہمیشہ گریز کرتے۔ خاموش خدمت ان کا شیوہ رہا۔ رہبر جی (ایڈیٹر چراغ) نے ایک جگہ ذکر کیا ہے۔ کہ حیدرآباد کے کچھ لوگ ڈاکٹر صاحب کی جائے پیدائش پر ان کے نام سے مناسب یادگار قائم کرنا چاہتے تھے۔ رہبر جی نے جب اس کا ذکر کیا تو ذاکر صاحب نے سخت ناپسند کیا اور فرمایا کہ کسی بھی زندہ آدمی کی کوئی یادگار قائم کرنا زیب نہیں دیتا اور میں اپنی زندگی میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میرے چلے جانے کے بعد کچھ ہوتا رہے تو میری ذمہ داری نہیں ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی ایک نمونے کی زندگی تھی۔ کس طرح ایک شخص دھرم ایمان پر بیکارہ کر خلق خدا کی خدمت کر سکتا ہے، ذاکر صاحب کی ذات ان کی عملی زندگی اس بات کی شہادت ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کے چلے جانے سے ہمارا دیش ایک ایسی شخصیت سے محروم ہوگیا ہے جس کی اس زمانے میں ملک کو خاص طور پر ضرورت تھی۔

آل احمد سرور

تین مئی کو ذاکر صاحب کے قلب کی حرکت اچانک بند ہوگئی۔ پانچ مئی کو اُن کا خاکی جسم مٹی میں دبا دیا گیا لاکھوں آدمی اُن کی موت پر اشکبار تھے۔ کروڑوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ روشنی کی ایک کرن، خوشبو کے ایک لطیف جھونکے، ابر کرم کے جان بخش سائے سے محروم ہو گئے۔ وہ ہماری جمہوریت کے صدر تھے اور انھوں نے اس مسند کو وزن و وقار عطا کیا تھا۔ مگر وہ صرف ہماری جمہوریت کے صدر اور ہندوستان کے پہلے شہری ہی نہیں تھے۔ وہ ہماری جمہوریت کے سب سے ممتاز اور سب سے بلند مرتبت شہری بھی تھے۔ ایسے لوگ مرتے نہیں، ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ اُن کی انسانیت، اُن کی دردمندی،

اُن کا کردار، اُن کا اخلاق، اُن کے ذہن کی تابناکی، اُن کی شخصیت کی دل نوازی، وقت کے ہاتھوں ماند نہیں ہو سکتیں۔ ذاکر صاحب صحیح معنی میں "معنی لفظ آدمیت" تھے۔ ان کی ذات میں اتنی خوبیاں جمع ہو گئی تھیں کہ اب ان جیسے جامع حیثیات آدمی کا تصور بھی مشکل ہے، وہ غیر معمولی ذہنی صلاحیت کے آدمی تھے۔ ان کا علم وسیع تھا۔ ان کی نظر وسیع تھی اُن کا دل بڑا تھا اور ان کا ظرف بھی بڑا تھا۔ اُن کی موت سے ہماری مشترک تہذیب کا ایک سینا گر گیا۔ مشرقی مزاج اور عالمی ذہن کا ایک نادر گلدستہ بکھر گیا۔ قدیم سے آشنا، جدید کا محرم رخصت ہو گیا۔ مجاہد اور معمار کا سنگم نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ بجھی ہوئی بجلیوں کو نقطوں میں سمونے والا صنف جاتا رہا۔ مرتب اور دلوں کو پگھلا دینے والی تقریریں کرنے والا چلا گیا۔ ایک ایسا سردار گزر گیا جو اپنے ساتھیوں کا احترام کرتا تھا۔ ایک ایسا دوست جدا ہو گیا جو دوستوں کی محفل کی جان تھا۔ ایک ایسا دیوانہ منہ موڑ گیا جس نے فرزانوں کو آداب زندگی سکھائے۔ ایک ایسا دیوانہ منہ موڑ گیا جس نے فرزانوں کو آداب زندگی سکھائے۔ ایک ایسا عاشق چلا گیا، جس نے عقل کو اقبال کے الفاظ میں ادب خودہ دل بنایا۔ ایک ایسا عارف گم ہو گیا۔ جس نے زندگی کو راہ سلوک بنایا۔ ایک ایسا دیدہ ور خاموش ہو گیا جس کے لئے ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے۔ ایک انسان اٹھ گیا، جس کے لئے برسوں فلک پھرتا ہے۔

ذاکر صاحب کی یاد کے ساتھ ذہن میں کتنی ہی تصویریں پھر جاتی ہیں۔ طالب علم کی حیثیت سے انھوں نے اپنے استادوں کی نگاہوں میں جگہ پیدا کی، اپنے ساتھیوں اور دوستوں کی بھی انتہاہ محبت حاصل کی۔ قومیت خدمت، دل دہی، دلداری، رہ نمائی، ذہنی صلاحیت تحریر و تقریر میں امتیاز سبھی کا نتیجہ تھی۔ اُن کے سامنے علم، شہرت، دولت کے کتنے ہی راستے تھے، مگر انھوں نے گاندھی جی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور مولانا محمد علی کی دعوت پر بھری بستی چھوڑ کر قانون باغبانی صحرا کا ایک نیا باب کھولا۔ جو لوگ صرف ایک جذباتی طوفان کا شکار ہوئے تھے۔ وہ کچھ عرصہ کے بعد خود سلامتی اور عافیت کے کوچے میں واپس آ گئے۔ ذاکر صاحب نے علی گڑھ چھوڑنے اور جامعہ ملیہ کے اس تجربے میں شریک ہونے کا فیصلہ صرف جذبے کے تحت نہیں کیا تھا اس کے پیچھے ان کا ذہن بھی تھا۔ اس لئے مشکلات کے باوجود اُن کے قدم ڈگمگائے۔ جامعہ میں وہ معلم، کلرک، چپراسی، معمار سبھی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ قوول باغ کی کرائے کی عمارتوں سے جامعہ کو اوکھلے کی کھلی فضا میں لے آئے اور اسے قومی تعلیم کا ایک قابل فخر ادارہ بنا دیا

دوسروں کی نہیں اپنی کہتا ہوں۔ ذاکر صاحب نے میری زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ ایم اے کرنے کے بعد میں جب دستور رسول کی تیاریاں کر رہا تھا۔ ذاکر صاحب نے باتوں باتوں میں میرے ذہن کی رو بدل دی۔ اور میں نے معلمی کو پیشہ ہی نہیں عشق بھی بنا لیا۔ جب میں لکھنؤ میں تھا تو مولوی عبدالحق کی سفارش پر بغیر میرے علم کے میرا تقرر کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدے پر ہو گیا تھا میں کچھ تذبذب میں تھا۔ ذاکر صاحب سے رائے لی تو انھوں نے صرف اتنا کہا کہ اگر آپ کا واقعی جی چاہتا ہے تو ضرور جائیے مگر میں جانتا ہوں کہ آپ وہاں خوش نہ رہیں گے۔ آپ کی اصل جگہ یہیں ہے۔ میری آنکھوں سے پردا سا چھٹ گیا اور میں اور استقلال سے اپنے گھر میں جم گیا۔ میری طرح ہزاروں ایسے ہوں گے جنہیں ذاکر صاحب نے اقدار و افکار سے مالا مال کیا۔

ان میں افلاطون کی سی معلمانہ شان تھی۔ گاندھی جی کی سی اخلاقی حرارت تھی۔ سرسید کی سی تعمیری صلاحیت تھی۔ جن لوگوں نے انھیں برا کہا۔ ان کے ساتھ بھی بھلائی کرتے رہے۔ وہ اشخاص کی نکتہ چینی کے بجائے قدروں کی تنقید کرتے رہے۔ وہ قوم کا ضمیر تھے اور احباب کی کوتاہی اور کجی اور خامی دیکھتے تھے تو اس کی طرف اپنے مخصوص انداز میں ضرور اشارہ کر دیتے تھے ان کا تذکرہ کافی نہیں ہے ان کی تقلید ضروری ہے ان کا کارنامہ تاب لکھنوی کے الفاظ میں ہم سے کہہ رہا ہے۔

دعائیں دیں میرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے میرے ہمراہ منزل سے

صالحہ عابد حسین

ہند کے مایۂ ناز سپوت ماہر تعلیم، مدبر، عالم، ادیب و ادب شناس، قومی خادم اور ملک کے سربرآوردہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے کارناموں پر روشنی ڈالنا میرا مقصد ہے اور نہ اس کی اہلیت۔ ہاں ۳۶ برس سے ان کی دوستی اور قربت کا شرف حاصل رہا ہے۔ تقریباً ۱۵، ۱۶ سال تک روزانہ رنج میں راحت میں تنگ دستی اور کشائش میں ان کو قریب سے دیکھا ہے اور اس میں حصہ بٹایا ہے

جب ذاکر صاحب صرف ہمارے تھے، جامعہ والوں کے۔ اس زمانے کی چند بکھری بکھری سی یادیں ذہن میں ابھر رہی ہیں۔ یہ جامعہ کی زندگی کا وہ زمانہ ہے جب مالی پریشانیاں انتہا کو پہنچی ہوئی تھیں۔ چھ چھ مہینے جامعہ والوں کو وہ قلیل تنخواہ بھی نہیں ملتی تھی جو جسم و جان کے رشتے کو جوڑے رکھنے میں کسی نہ کسی طرح کامیاب ہوتی تھی۔ مگر جامعہ والوں کو میں نے بددل، بے زار ناراض، یا پریشان نہیں پاتی۔ ذاکر صاحب کی حیثیت جامعہ کے روح رواں کی سی تھی۔ وہ ہم عمر رفیقوں کے بڑے بھائی اور دوست تھے۔ نوعمر ساتھیوں اور جامعہ کے بچوں کے باپ تھے۔ ایسے باپ جن کی شفقت میں اکثر ماں کی ممتا کا رس اور مٹھاس بھی نظر آتی تھی۔

مجھے یاد آرہا ہے وہ واقعہ جب ذاکر صاحب جامعہ کے ایک بڑے جلسے کی صدارت کر رہے تھے۔ سامنے بچے بیٹھے ہیں اور پہلو میں ساتھی ہیں۔ خوشی و مسرت کی فضا چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے کہ ذاکر صاحب کے ہاتھ میں کوئی پرچہ دے دیتا ہے۔ ذاکر صاحب پرچے پر نظر ڈالتے ہیں اور خاموش بیٹھے رہتے ہیں جب جلسہ حسب پروگرام ختم ہوتا ہے۔ تب لوگوں کو ایک دل دوز خبر معلوم ہوتی ہے کہ اس پرچے میں ذاکر صاحب کی چار سالہ اور بے حد لاڈلی بچی ریحانہ کی موت کی خبر تھی۔ ذاکر صاحب نے چہرے تک سے اس کے اثرات کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ یہ وہ بچی تھی جسے ذاکر صاحب زندگی بھر نہ بھلا سکے۔ بچوں کے لیے جتنی کہانیاں لکھیں وہ سلمیٰ اور ریحانہ کے نام سے اور جب پہلی نواسی پیدا ہوئی تو اسے بھی یہی محبوب نام دیا۔ ذاکر صاحب کو اپنے ساتھیوں کی مالی پریشانیوں اور کٹھنائیوں کا بڑا احساس رہتا تھا اور سب کے ساتھ وہ خود بھی سادگی کی ہی نہیں تنگ دستی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اگرچہ اس میں نفاست حسن اور دل فریبی کی شان تھی۔ کسی کے گھر میں سلیقہ اور خوش ذوقی دیکھتے تو بے حد خوش ہوتے، اور دل کھول کر سراہتے۔ کہیں سے کچھ روپیہ ملتا تو سب سے پہلے چپراسیوں، منشیوں اور چھوٹے ماسٹروں میں تقسیم ہوتا۔ پھر ان کے ساتھی پروفیسروں کو مل جاتا جو ان کی طرح آسودہ حال نہ تھے۔ سب سے اخیر میں کبھی کبھار شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر صاحب کو ان کی تنخواہ کی خطیر رقم پچھتر روپے مل جاتے۔ مگر یہ تنگ دستی مجبوری کی نہ تھی۔ ایک اعلیٰ مقصد کی خاطر ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں نے اسے انگیز کیا تھا۔

مجھے یاد آرہا ہے جامعہ کی ۲۵ سالہ جوبلی کا وہ زمانہ جب ذاکر صاحب کے ساتھ جامعہ کا ہر رکن اور ہر طالب علم اور جامعہ کی عمارتیں اس جشن کو کامیاب بنانے کے لیے دن رات ایک کر رہے تھے۔ اس زمانے میں ٹریننگ کالج اور ذاکر صاحب کے گھر سے جو سڑک جامعہ کی مرکزی عمارتوں کو جاتی ہے وہ کچی اور اونچی نیچی تھی۔ ذاکر صاحب نے طے کیا کہ یہ سڑک خود جامعہ والے بنائیں گے۔ ایک صبح میں نے گھر کی کھڑکی سے دیکھا کہ سامنے جامعہ کے بچے اور استاد ہاتھوں میں پھاوڑے لیے میرے گھر کے سامنے اس سڑک کی مرمت کے مقدس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اور نکلتے سورج کی کرنیں ان کے چہروں کی سچی مسرت کے نور سے مقابلہ نہیں کر پا رہی ہیں۔ ذاکر صاحب، ان سب کے وسط میں کھڑے تھے۔ ان کے برابر ان کے رفیق ڈاکٹر عابد حسین تھے۔ اتنے میں شہر کے ایک معزز اور مہذب رئیس آتے نظر آئے۔ اور ان صاحبان علم و فضل کو پھاوڑا چلاتے دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ پھر اخلاقاً جھک کر عابد حسین صاحب سے بولے۔ "ذاکر صاحب یہ کیا غضب کر رہے ہیں آپ۔ یہ آپ کا نہیں ہمارا کام ہے۔ عابد حسین نے ان کو اپنی ظرافت کا نشانہ بناتے ہوئے پھاوڑہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بسم اللہ"۔ ذاکر صاحب کو ہنسی ضبط کرنا محال ہو گیا۔ اور ان حضرت کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

چند دنوں میں یہ سڑک بن کر تیار ہو گئی۔ جوبلی میں چند دن رہ گئے تھے۔ کاموں میں تیزی آگئی تھی۔ ذاکر صاحب اپنا خطبہ لکھنے کی کوشش میں تھے۔ وہ لکھتے سے ہمیشہ الجھتے، گھبراتے، بگڑتے اور آخری وقت تک نا لکھتے رہتے تھے اور مزے کی بات ہے کہ جب ان کی تحریر مکمل ہوتی تو ادب کا ایک جواہر پارہ ہوتی۔ یہی وہ تقریر تھی جس کو سن کر دیس کے وہ بڑے بڑے رہنما، لیڈر، رئیس، امیر زار و قطار روئے تھے۔ ہاں تو ذاکر صاحب تقریر لکھنے میں مصروف تھے۔ ذاکر صاحب کے ایک بزرگ ساتھی جو چندہ جمع کرنے کے کٹھن کام میں گئے ہوئے تھے وہ ان کے پاس کوئی شکایت لے کر آئے کہ ذاکر صاحب نے کہا کیا نہیں جانتی۔ میں نے تو اپنے گھر سے یہ دیکھا کہ آگے آگے مرحوم روتے ہوئے پیچھے پیچھے ذاکر صاحب کرتا پاجامہ پہنے اپنے بھاری جسم کے ساتھ بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ میرے گھر تک نہ آئے سے پہلے ذاکر صاحب نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور کھینچ کر اپنے گھر لے جانے لگے اور وہ روتے روتے ہنس پڑے۔ ہم اپنے گھر سے یہ دلکش اور پُر اثر ادائیں دیکھ کر رہتے رہے۔

جامعہ والوں کی بیویاں ذاکر صاحب کو اپنا جیٹھ مانتیں ان کا آداب و احترام کرتیں، کچھ ڈرتیں اور کبھی کبھی شکایت بھی کیا کرتی تھیں۔ اس لیے بھی

(بقیہ صفحہ ۲۶ پر)

غلام ربانی تاباں

بشیر بدر

نذرِ عقیدت

نسیم بن کے وہ آیا شمیم بن کے گیا
چمن کو جس پہ بڑا افتخار تھا نہ رہا

کسے خبر ہے گل و یاسمن پہ کیا گذری
کہ ایک رمز شناسِ بہار تھا نہ رہا

ہے یوں کہ قطرۂ شبنم کی طرح پاکیزہ
ابھی یہیں وہ درخشاں ہوا رتھا نہ رہا

نہ راس آیا جسے کچھ بھی تشنگی کے سوا
عجیب شان کا اک بادہ خوار تھا نہ رہا

ہر ایک درد کا درماں سہی زمانے میں
مگر یہ درد کہ اک غم گسار تھا نہ رہا

وہ مرگیا ہے کہ اک دور مرگیا تاباں
زمانِ شوق کی اک یادگار تھا نہ رہا

ہر طرف آنسوؤں کا وہی سلسلہ، نسیمی پتیاں تھرتھراتی رہیں
ایک پیغام تھا، جس کو دیتے ہوئے صبح کی دیویاں کپکپاتی رہیں

ننگے پاؤں فرشتوں کا اک طائفہ، آسماں سے زمیں پہ اترنے لگا
سر برہنہ فلک زادیاں عرش سے آنسوؤں کے ستارے گراتی رہیں

گیت کی گنگناتی ہوئی چوڑیاں ٹوٹ کر رقص کے پاؤں میں چبھ گئیں
ریڈیو پر اُداسی کی رو تی دھنیں آنسوؤں کی طرح آتی جاتی رہیں

ایک کالج میں ویران سی دوپہر بھولی بسری کہانی کا گھر بن گئی
بوڑھی دیواریں اپنے نئے پھولوں کو اس کے بچپن کے قصے سناتی رہیں

ایک دریچے میں دو آنسوؤں کا سفر [illegible] کی طرح ہو گیا
نرم مٹی پہ گرتی ہوئی پتیاں [illegible]

عرش ملسیانی

غم جاوداں ذاکرؒ

جمال و جلال، فکر و فراست، علم و عبودیت، سادگی و سادہ دلی ایسے اوصاف ہیں جو شاذ ہی ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم ان تمام صفات سے متصف تھے۔ ان کا سانحۂ ارتحال ایک عہد کی موت ہے۔ وہ عام انسانوں سے بہت بلند تھے۔ انھوں نے قوم و ملک، تہذیب اور تمدن کی خدمت میں اپنی زندگی کا ہر لمحہ صرف کیا۔

قائم گنج وطن تھا، حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ اور یورپ میں تعلیم پائی اور بالآخر دلی مستقر ٹھہرا۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں مرحوم ایم اے او کالج علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے ان کی جودت طبع، علمی صلاحیتیں، ذہانت و فطانت سب پر آشکار تھی۔ وہ کالج کے طلبا کی روح رواں تھے۔ ادھر ملک ایک سیاسی بیداری سے ہم کنار ہو رہا تھا۔ ایسے دو جنوں اکابر پیدا ہوئے جو ملک کو غیروں کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے کوششیں کرنے لگے۔ لیکن مہاتما گاندھی کی قیادت میں جب رہنمایانِ ملک نے عدم تعاون کی تحریک کی ہم نوائی کی تو انگریزی تعلیم کے بائیکاٹ کا پروگرام بھی بنا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جو ابھی ڈاکٹر نہیں تھے میدانِ عمل میں آئے انھوں نے علی گڑھ یونی ورسٹی کو چھوڑا اور جامعہ ملیہ کا قیام عمل میں آیا۔ وہ اس کے ساتھ منسلک رہے۔ ملک نے ان کی آخری زندگی میں انھیں مختلف خدمتوں کے لئے چنا لیکن ان کا دل ہمیشہ جامعہ ملیہ کی بہبود کے لئے تڑپتا رہا۔ جامعہ کی خدمت کے زمانے میں انھیں بڑی دشواریوں کا سامنا ہوا۔ کئی ساتھی ساتھ چھوڑ گئے۔ مصارف کے لئے روپیہ مشکل سے ملتا تھا۔ دامن پھیلائے یہ اور ان کے چند ساتھی ملک بھر میں پھرے۔ خود انھوں نے اپنی تنخواہ تین سو روپے سے گھٹا کر پچیس روپے کر دی۔ عزم و استقلال کا یہ دیوانہ اپنے مقصد کے لئے جان لڑاتا رہا۔

وہ مسلم کل مشرب کے آدمی تھے ملک کے مختلف مذہبی گروہوں کے باہمی مناقشات انھیں پسند نہ تھے۔ ۱۹۴۶ء میں جب جامعہ کی جوبلی منائی گئی تو اس میں پنڈت جواہر لال نہرو، محمد علی جناح اور ان دونوں کے ساتھی موجود تھے۔ انترم گورنمنٹ میں جب دونوں گروہوں، کانگرس اور مسلم لیگ کے اکابر نے انھیں وزیر تعلیم بننے کے لئے کہا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ وہ اہل ملک کی تنگ دلی اور فرقہ دارانہ مناقشات سے اس قدر آزردہ خاطر تھے کہ انھوں نے یہی مناسب سمجھا۔ جاہ و منال کی خاطر لڑنے والے جن کی آج کل ملک میں افراط ہے اس سے سبق حاصل کر سکے۔ ہیں۔

وہ ایک لائحۂ عمل اختیار کر چکے تھے اور اسی کو انھوں نے عزیز رکھا۔ وردھا اسکیم اور دوسری تعلیمی کمیٹیوں میں کام کر کے انھوں نے اپنی بصیرت اور تجربے کا فیض ملک کو پہنچایا۔ تقسیم ملک کے بعد بڑا پُر آشوب زمانہ تھا، انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کے اصرار پر علی گڑھ جانا قبول کیا اور وہ وہاں وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد راجیہ سبھا کے ممبر، بہار کے گورنر، نائب صدر جمہوریہ اور صدر جمہوریہ رہے۔

جب صدر جمہوریہ کا انتخاب ہوا تو ملک بھر میں ایک انتشار تھا۔ ۱۹۶۷ء کے انتخابات نے ملک کی سیاسی فضا بڑی حد تک بدل ڈالی تھی۔ لیکن مسز اندرا گاندھی اور ان کے ساتھیوں نے بڑی ہمت اور سوجھ بوجھ کا ثبوت دے کر انھیں صدارت کے لئے نامزد کیا۔ ملک نے ان کا ساتھ دیا اور ایک ایسے مرنجان مرنج، ماہر تعلیم اور صاحب بصیرت کو چنا جو بد قسمتی سے آج ہم میں نہیں۔

---

* یہ بے مثال تاریخ ڈاکٹر منور سہائے انور کے فکر کا نتیجہ ہے اُن کے شکریہ کے ساتھ اسی کو مضمون کا عنوان بنایا ہوں۔ عرش

وہ عالم دوست تھے۔ ان کا کوئی دشمن نہ تھا۔ وہ سب سے محبت سے پیش آتے تھے اُن کی بزرگی میں وقار بھی تھا اور فروتنی بھی۔ نائب صدر جمہوریہ کا زمانہ ختم ہوا تو راجیہ سبھا کے آخری اجلاس میں سب نے ان کی بصیرت کو خراجِ عقیدت پیش کیا

وہ چلے گئے۔ اچانک اور ناگہاں۔ مردِ درویش نے زندگی قلندرانہ انداز سے گزاری۔ وہ قومی یک جہتی کی مثال تھے۔ وہ مسلمان تھے۔ ایک سچے مسلمان لیکن اُن کو ہر مذہب سے محبت تھی وہ ملک و ملت کے پاسبان رہے۔ ملک و ملت اب ایسا پاسبان مشکل سے پائے گی۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ عزم صادق کے سامنے کوئی سنگ گراں حائل نہیں ہو سکتا۔ خلق، مروت، علم اور علم ایسے اوصاف ہیں جن کے سامنے سب کو جھکنا پڑتا ہے۔ ہر چند آفتاب غروب ہو گیا۔ لیکن اس کی روشنی ہمیں ہمیشہ راستہ دکھاتی رہے گی۔ نیکی، بردباری، ایثار، اور محبت کا راستہ۔

ادب، فلسفہ، معاشیات، علم التعلیم پر ان کی نظر گہری تھی۔ انھوں نے ملک کے ادیبوں اور شاعروں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔

میں قول اقبال اُن سے اس زمانے میں ملا جب وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ میں 'آج کل' کی توسیع اشاعت کے سلسلے میں حاضر ہوا اور اُن سے درخواست کی کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں جتنے ریڈنگ روم ہیں اُن میں آج کل آنا چاہیے۔ فرمانے لگے یہ تو خیر ہو ہی جائے گا۔ کیوں نہ ابتداء اپنے آپ سے کروں۔ بات تو چھوٹی نظر آتی ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو بڑی بات ہے۔

وہ پریس میں تھے۔ میں نے انھیں 'آج کل' کے لیے ایک مضمون لکھنے کے لیے خط لکھا۔ جواب میں معذوری ظاہر کی اور عدیم الفرصتی کا اظہار کیا۔ مرحومہ بیگم قدسیہ زیدی سے ذکر آیا تو انھوں نے میری مدد کی۔ اُن کے پاس مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ مضمون تھا وہ مجھے عطا کیا۔ مجھے فخر ہے کہ ان کا مضمون 'آج کل' میں شائع ہوا۔ وہ بہار کے گورنر تھے۔ میں رانچی میں آل انڈیا ریڈیو کے مشاعرے کے لیے گیا تھا۔ وہ بھی رانچی میں مقیم تھے۔ دوسرے دن شعراء کو کھانے پر بلایا۔ غلام ربانی تاباں، ساغر نظامی اور میں ان کے ساتھ ایک ہی میز پر تھے۔ علم و ادب پر دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ اور ہم نے دیکھا کہ اُن کے مزاج میں اپنے عہدے یا بزرگی نے کوئی تمکنت اور تفاخر پیدا نہیں کیا تھا۔

شہادت حسین پر ان کا خطبہ جن لوگوں نے سنا تھا انھیں آج تک ان کی خطابت کا خلوص یاد ہوگا۔ جامعہ ملیہ کی جوبلی پر ان کا خطبہ ملک کے لئے ایک مشعلِ ہدایت تھا۔

میرے اکثر خطوط کا جواب وہ بالالتزام دیتے تھے۔ خواہ وہ تہنیت کے خطوط ہوں خواہ ذاتی۔ ادیبوں کی کتابوں پر مختصر ہی سہی حوصلہ افزا پیش لفظ لکھ دیتے تھے۔ کتاب کو غور سے پڑھتے اور اپنی رائے دیتے۔ میں نے شہریار سنگ کا نسخہ بھیجا۔ اس کے جواب میں ایک خاصا لمبا خط مجھے لکھا۔ آخر کے فقرے یہ ہیں۔

"میں نے آپ کا مجموعہ از اول تا آخر پڑھا۔ اور آپ سے اقرار کرتا ہوں کہ آپ کی بات دل کو کبھی بار بار لگی۔ اور جگہ جگہ نظر بھی ٹھہری اور بسا اوقات دیر تک ٹھہری رہی۔"

من آنم کہ من دانم۔ میں کس لائق تھا لیکن یہ ان کی ادب نوازی کی ایک مثال ہے ادیب اپنے ایک محسن سے، ملک ایک مخلص خادم اور ہادی سے اور قوم ایک مصلح سے محروم ہو گئی۔ جامعہ ملیہ کے وہ بانیوں میں سے تھے۔ اس کی اینٹ اینٹ میں ان کا خون صرف ہوا۔ اس کا غم عظیم ہے اور ہم سب کا غم ہے۔ آخر میں ایک منظوم خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔

دل کو بہلائیں کس ترانے سے
اُڑ گیا طائرِ آشیانے سے
مردِ حق ہیں کو لے گئی ہم سے
موت آرام کے بہانے سے
تھے جو اس آسماں سے وابستہ
لَو لگائیں کس آستانے سے
ملکِ ہستی میں کیا بلا ہم کو
محفلِ آرزو سجانے سے
نامِ خلق و مروت و اخلاص
نہیں مٹتا کبھی مٹانے سے
موت کیوں اس کی بن گئی دشمن
جس کو تھی دوستی زمانے سے
دوستو! لاکھ دو اُسے آواز
اب نہ آئے گا وہ بلانے سے
ہم دمو کیا ملے گا اب تم کو
غم فزا مرثیے سنانے سے

زندگی یوں تو سب کی فانی ہے
نام ذاکر کا جاودانی ہے

اُس نے سینچا تھا جس کو دے کے لہو
اُس چمن میں ہے ہر طرف خوشبو
پھول ہی پھول اب کھلیں گے یہاں
اس کو محبوب تھی کلوں کی نمو
کیوں نہ مقبول ہو نماز اُس کی
خون دل سے کیا تھا اُس نے وضو
وحشتِ ملک کا علاج تھا وہ
چاک لاکھوں کیے ہیں اس نے رفو
تشنہ کامانِ آرزو کے لیے
رکھ دیئے بھر کے اس نے جام و سبو
قدرداں شاعروں ادیبوں کا
ماہرِ نثرِ ہندی و اُردو
اس کے لفظوں میں سینکڑوں انداز
اس کے فقروں میں سینکڑوں پہلو
سادگی سحر کار تھی اُس کی
سب پہ چلتا تھا حلم کا جادو
فلکِ ہند کا ستارہ تھا
روشنی کا وہ اک منارہ تھا

بزم میں اک چراغ تھا، نہ رہا!
ایک روشن دماغ تھا، نہ رہا
تشنہ کامانِ بزمِ الفت کا
ایک زریں ایاغ تھا، نہ رہا
دلِ مجروح ہند کے غم میں
سینہ اک داغ داغ تھا نہ رہا
آہ مرجھا گئے خلوص کے پھول
خوش مزاجی کا باغ تھا، نہ رہا
گل صحرائی و گلِ گلزار!!
زینتِ باغ و راغ تھا، نہ رہا
نورِ بخشِ حیاتِ اہلِ عمل

ایک روشن چراغ تھا، نہ رہا
سوگیا مشکلوں کا عقدہ کشا
منزلوں کا سراغ تھا، نہ رہا
تُند موجوں میں ناخدا تھا وہ
رہنماؤں کا رہنما تھا وہ
ہم نواؤ کرو نہ آج فغاں
ہوگیا ہے وہ گو نظر سے نہاں
اُس کے اعمال نیک تھے ایسے
وہ ہے عرش آشیاں و خلد مکاں
دے رہی ہے ہمیں پیام عمل
بند گو ہوگئی ہے اُس کی زباں
صدرِ جمہوریہ بھی عامی بھی
یہ تقابل کسی میں آج کہاں
اُس کی نیکی یقین محکم ہے
اُس کی نیکی میں کچھ نہیں ہے گماں
اس کے دل میں تھی گرمیٔ اخلاص
حُبِ قومی سے اس کا دل تھا تپاں
مردِ درویش اور مستِ الست
فقر کے میکدے کا پیرِ مغاں
سادگی کا مطیع اک عالم
اُس رعایت سے تاجدارِ جہاں
علم و تعلیم کا دوانہ گیا
مردِ حق گو قلندرانہ گیا

عطا کاکوی، قطعۂ تاریخِ رحلت

ہوا ہائے تاریک ہندوستاں — الم کی گھٹا میں چھپا بدرِ ہند
وہ روشن دماغ اور روشن خیال — بڑھی جس سے سنسار میں قدرِ ہند
جھکا غم سے دہلی کا سر اے عطا
ہے تاریخِ رحلت "غمِ صدرِ ہند"
۱۳۸۹ھ ، ۱۹۶۹ء

ذاکر صاحب کی یاد میں

دفعتاً ٹوٹ لیا، موت نے بازارِ حیات
مِل گیا خاک میں اک واقفِ اسرارِ حیات
یک بیک خشک ہوا چشمۂ گلزارِ حیات
ایک لمحے میں چھنی دولتِ بیدارِ حیات
اہلِ دل آج وہ اٹھا ہے بھری محفل سے
ہاتھ آتا ہے جو صدیوں میں بڑی مشکل سے

عاشقِ گُل بھی تھا، دلدادۂ گلزار بھی تھا
صاحبِ فکر بھی تھا، غازیٔ کردار بھی تھا
نرم گفتار و طرحدار و فسوں کار بھی تھا
حق و انصاف کا خاموش علم دار بھی تھا
عاقبت قوم کے بچوں کی سنواری اُس نے
ہر طرف علم کے دریا کئے جاری اس نے

گفتگو اُس کی وہ جاں بخش کہ شبنم کی پھوار
سادگی ایسی دلاویز کہ شرمائے بہار
موہ لیتا تھا جو دل کو، لب و لہجے میں وہ پیار
انکسار ایسا کہ صد جاہ و حشم اُس پہ نثار
موجزن علم تھا سینے میں، سمندر کی طرح
زندگی اُس نے گزاری تھی قلندر کی طرح

اُس کو معلوم تھا، مذہب کی حقیقت کیا ہے
حسنِ اعمال کی بے لاگ عبادت کیا ہے
دردمندی کسے کہتے ہیں، محبت کیا ہے
سوز و سازِ غمِ انساں کی حلاوت کیا ہے
عمر مخلوق کی خدمت میں گزاری اُس نے
اس لئے عین عبادت میں گزاری اس نے

کم نظر لوگوں نے اُس شخص کو سمجھا ہی نہیں
دل کو جانچا ہی نہیں، رُوح میں جھانکا ہی نہیں
اس کے باطن کا جو سونا تھا، وہ پرکھا ہی نہیں
سوز ہی سوز ہے سینے میں، یہ دیکھا ہی نہیں
اُس کا کردار صداقت کے سوا کچھ بھی نہ تھا
اُس کا پیغام محبت کے سوا کچھ بھی نہ تھا

کام جو اُس نے چلایا تھا، وہ چلتا ہی رہے
جو چراغ اُس نے جلایا تھا، وہ جلتا ہی رہے
لڑکھڑاتا ہوا انسان سنبھلتا ہی رہے
اور ہر دَور میں، ہر لحظہ بدلتا ہی رہے
دہر میں زندۂ جاوید رہے نام اُس کا
لوگ کرتے رہیں چرچا سحر و شام اُس کا

مسعود علی ذوقی

علی جواد زیدی

دیدہ ور ذاکر

ہمارے ملک میں دیدہ ور جنس نایاب نہیں تھے۔ ہماری یادیں کتنی ہی عظیم ہستیاں رونقِ محفل بنیں اور ہم سے چھن گئیں ان کا بھی ہماری حیاتِ قومی میں مقام تھا اور ان کی جدائی پر بھی ہم مضطرب ہوئے تھے لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی جدائی عجب ایک سانحہ سا ہو گئی ہے "یہ سانحہ جتنا قومی ہے اتنا ہی ذاتی۔ اور وہ بھی ایک بہت بڑے حلقے کے لیے۔

میں اقبال کا شعر یاد کر کے بار بار اپنے دل سے کہتا ہوں کہ نہ جانے حیات و علم کے چمن میں نرگس اپنی بے نوری پر کتنے برس روئی ہو گی تب جا کے کہیں ڈاکٹر ذاکر حسین جیسا ایک دیدہ ور پیدا ہوا ہو گا۔ دیدہ ور تو بہت سے اور ہیں۔ ع لیکن تو چیزے دیگری دیدہ وروں میں بھی مدارج اور دیدہ وری کی بھی حد بندیاں ہیں۔ بعضوں کی دیدہ وری کسی ایک خاص علم یا فن تک محدود ہوتی ہے بعضوں کی حقائقِ زندگی کے چند پہلوؤں تک۔ میں یہ مدحت گسترانہ دعویٰ نہیں کروں گا کہ ذاکر صاحب تمام علوم و فنون پر حاوی تھے اور حقائقِ حیات کا کوئی گوشہ اُن کی دیدہ ورانہ جستجو سے بچ نہیں پایا تھا۔ ہاں اُن میں ایک دیدہ ورانہ جامعیت ضرور تھی۔ سماجی علوم اور علم سائنس کے علاوہ موجودہ دور کی جدید ترین ایجادوں اور فکری اڑانوں سے آگاہ تھے۔ ماہرانہ عبور نہ سہی مگر ان کی عمومی معلومات میں بھی گہرائی و گیرائی تھی۔ انسانی اقدار کی پیروی میں ایسی ترقی پسندانہ لچک تھی جو بنیادی قومی اور سماجی مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ تھی ان کی روایت پسندی میں اعتدال ان کے اخلاق و عادات میں حسن و لطافت کا امتزاج اور اُن کے فکری اور ادبی میلانات میں جذب و ترک، قبول و انکار کا توازن تھا۔ وہ بہت سی باتوں میں روایات کے دلدادہ مگر شدت اور تنگ نظری سے دور تھے۔ بہت سی باتوں میں وہ لبرل اور افراط و تفریط سے متنفر تھے لیکن اصول و معتقدات کے معاملوں وہ چٹان کی طرح اٹل اور مستقل مزاج تھے۔ ان کی مستقل مزاجی، ہٹ دھرمی اور کٹ حجتی نہیں بلکہ عقل و تجربے کی ترازو پر تُلی ذہنی اور عملی دیانت تھی۔ ان کے اختلاف میں جتنا استقلال تھا، اس کے اظہار میں اتنی ہی نرمی۔ ان کی ناقابلِ تسخیر مسکراہٹ پھول کی طرح شگفتہ بھی تھی اور اس کی گرمی سے مخالفوں کے دل بھی پگھل جایا کرتے تھے۔

ذاکر صاحب ماہر تعلیم تھے، ادیب تھے، فن کار تھے، خود جمیل اور جمالیات کے قدر شناس تھے ایسے فقیر منش تھے جس نے شاہوں کا دل پایا تھا ایسے بزرگ تھے، جو بچوں میں بچہ اور جوانوں میں جوان۔ وہ اچھے نثر نگار اور اچھے خطیب تھے۔ وہ بے حد ذکی و ذہین، زود حس، دُور بیں اور تہ رس تھے۔ وہ مجمعوں میں مرکزِ وقار مگر سراپا انکسار تھے۔ اُن میں ایک طرح کی فن کارانہ اور مجتہدانہ انا بھی تھی جو دوسروں کو کم محسوس ہو پاتی تھی اس لیے کہ انھیں اپنے نفس پر بے پناہ قابو تھا۔ اُن کی شخصیت میں ان تمام باتوں نے مل جل کر غضب کی کشش پیدا کر دی تھی۔

اُن کی پرکاری پر اُن کی سادگی اس طرح حاوی تھی کہ اُن کی عظمت کا حجاب بن گئی تھی۔ پھر بھی اچھے گلاب کی خوشبو کی طرح ان کی عظمت چھپائے نہ چھپتی۔ ان کی روح کا نور ہر حجاب سے پھوٹ نکلتا۔

وہ اس وقت بھی اپنے جوہر قیادت کے مظاہرے کر چکے تھے جب طالب علمی کا زمانہ ختم نہیں ہوا تھا لائن کی ہر دلعزیزی ضرب المثل تھی۔ پھر انہوں نے نو آبادیاتی تعلیمی نظام کے خلاف بغاوت کی اور گاندھی جی کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ترک موالات کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ جب انہوں نے برطانوی تعلیمی نظام کو ٹھکرایا تو وہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے طالب علم تھے۔ یونیورسٹیاں بظاہر اس لئے قائم ہوئی تھیں کہ آنے والی نسلیں علوم جدید سے محروم نہ رہ جائیں لیکن یہ مقصد ثانوی بن چکا تھا۔ اب یونیورسٹیاں سرکاری کلرک اور افسر بنانے کے کارخانے بن چکی تھیں۔ اس پس منظر میں دیکھئے تو تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ سیاسی بائیکاٹ ہی نہیں تھا بلکہ تعلیمی اصلاحات کا پیش خیمہ بھی تھا۔ یہ مقصد ناکمل رہ جاتا اگر اس بائیکاٹ کے ساتھ ساتھ قومی تعلیمی اداروں کا قیام عمل میں لایا جاتا۔ گجرات ودیا پیٹھ، کاشی ودیا پیٹھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام اسی خواہش کا عملی رخ تھا۔ ذاکر صاحب نے ایک مسلم تعلیمی ادارے کو خیرباد کہا تو ایک نیا ادارہ قائم کیا۔ اس میں اسلامی تعلیمات کا بھی انتظام تھا، کیوں کہ گاندھی جی ہی کی طرح اس کے بانی بھی مذہب کو اخلاق انسانی کا ایک اہم روپ مانتے تھے۔ اور قوم و وطن کی سچی خدمت کو ایک اعتقادی فریضے کی طرح اہم سمجھتے تھے مولانا محمود الحسن، مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں جیسی عظیم شخصیتوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ تعلیم دینی ہو یا دنیاوی اس کا سماجی اور قومی کردار ارفع و اعلیٰ ہونا چاہئے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی، دوسری تمام یونیورسٹیوں کی طرح، اس آزاد سماجی کردار سے عاری ہوتی جا رہی تھی۔ اس پس منظر میں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان قومی درس گاہوں نے کس تعلیمی انقلاب کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس انقلاب کے راہبروں میں ڈاکٹر ذاکر حسین بھی تھے۔

بعض لوگوں نے قربانی ناپنے کا یہ ذریعہ بنایا ہے کہ کم از کم چھ مہینے جیل میں گزرا ہو اگرچہ میں اس پیمانے پر پورا اترتا ہوں لیکن میں اسے قربانی کے ناپنے کا واحد ذریعہ نہیں مانتا۔ ذاکر صاحب کبھی جیل نہیں گئے۔ لیکن ان کی تہتر برس کی بھرپور زندگی ایک مسلسل قربانی تھی۔ سال چھ مہینے کی جیل کی سختی جھیل لینا اور بات ہے اور ساری زندگی سمجھ بوجھ سے قربانیاں دیتے رہنا دوسری بات۔ یہ سچ ہے کہ ذاکر صاحب جیل نہیں گئے اور تعلیمی ادارے کے مقاطع کے علاوہ انہوں نے سول نافرمانی کے دوسرے طریقے اختیار نہیں کئے۔ لیکن کیا ان کی یہ قربانی بھلائی جا سکتی ہے کہ انھوں نے زندگی کا سارا آرام تج دیا اور حیات مستعار کا ایک ایک لمحہ جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسے ادارے کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک قومی ادارہ تھا۔ اس کے بانی معلم اور طالب علم سبھی قوم پرور تھے۔ ان دنوں قوم پروری جرم تھی۔ قوم پروروں پر سرکار کی نگاہ گرم تو رہتی ہی تھی، ہندوستانی امیر اور رئیس بھی قوم پروروں سے گھبراتے تھے کہ کہیں ان قانون شکنوں کی دوستی کے جرم میں مورد عتاب نہ بنیں۔ مستثنیات خال خال تھے۔ اس لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ ہمیشہ مالی کشمکش میں مبتلا رہی۔ ایسے بھی لمحے گذرے ہیں جب ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر عابد حسین، حبیب صاحب اور دوسرے اساتذہ کو تنخواہ سے بھی محروم رہنا پڑا۔ اور تنخواہیں بھی کیا تھیں۔ ایک ایسا بھی وقت آیا کہ شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) کو کل پچیس روپے ماہوار کی گرانقدر رقم ملا کرتی تھی اور یہ بھی کبھی ملتی کبھی نہ ملتی۔ لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے ساتھیوں کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی۔

جامعہ کی خدمت یا ملازمت، مجبوری کی بات نہیں تھی۔ ذاکر صاحب گھر کے کھاتے پیتے لوگوں میں تھے۔ ان کے کئی بھائیوں نے یوروپین یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی تھی۔ مالی فراغت کے بغیر بچوں کا ولایت بھیجنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن خوش حال گھرانے کا فرد ہونے کے باوجود ذاکر صاحب جامعہ کی معمولی ملازمت کو ترجیح دی تھی۔ تعلیمی اعتبار سے بھی ڈاکٹر صاحب کا پایہ بہت بلند تھا۔ وہ ہمیشہ جماعت کی صف اول میں رہے اور اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے۔ پھر برلن یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ پائی۔ اس زمانے میں برلن یونی ورسٹی کی علمی ساکھ تمام یونی ورسٹیوں سے زیادہ تھی۔ یہاں کی ڈاکٹریٹ سب سے اعلیٰ مانی جاتی تھی۔ آئنسٹائن اور میکس بورن جیسی عہد آفریں ہستیاں اس کے اساتذہ کی صف میں شامل تھیں۔ وہاں سے اعزاز تعلیمی حاصل کر کے جب ذاکر صاحب وطن لوٹے تو انھیں کئی یونی ورسٹیوں سے پیشکش ملی۔ اکبر علی خاں صاحب (ایم۔پی) کے بیان کے مطابق عثمانیہ یونیورسٹی کی وائس چانسلری بھی پیش کی گئی۔ لیکن انھوں نے جامعہ کی خدمت کو سب پر ترجیح دی۔ وہ اقبال کے اس شعر کا مصداق بن گئے۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دئے ہیں انداز خسروانہ

یہ قربانی ایک دو دن کی قربانی نہیں تھی۔ چھ مہینے کی قید کی قربانی

نہیں تھی بلکہ پورے بائیس سال کی قربانی تھی۔ اس قربانی کی مثال ان قومی درسگاہوں کے صحن کے باہر بہت مشکل سے ملے گی۔

آج جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ایک شاندار عمارت ہے۔ پورے علاقے کو جامعہ نگر کا نیک نام مل گیا ہے اور یہ ادارہ قومی اہمیت کا ادارہ تسلیم کر لیا گیا ہے اب نہ صرف یہ کہ تنخواہیں وقت پر مل جاتی ہیں بلکہ ایک معنی میں معقول بھی ہیں۔ دوسری یونی ورسٹیوں کے مقابلے میں یہاں کے اساتذہ اب بھی مالی قربانی دے رہے ہیں۔ لیکن وہ استاد جن کے بال

اب سفید ہو چلے ہیں اور جنہوں نے قرول باغ والی جامعہ ملیہ اسلامیہ کو دیکھا ہے، وہی اس داستان قربانی کے کرب و کیف کو پوری طرح محسوس کر سکتے ہیں۔ اس کے راستے میں کتنے ہی خارزار آئے اور کتنی ہی رکاوٹیں پیدا کی گئیں اس کے خلاف کتنے ہی طوفان اٹھے۔ پہلے تو برطانوی اقتدار کی نگاہ عتاب قرقی رہی۔ پھر فرقہ پرستی کے دور عروج میں اس پر فرقہ پرستوں نے یلغار کی۔ نقصان مایہ اور شماتت ہمسایہ، سب کو یہ سخت جاں قومی درس گاہ جھیل گئی۔ اس سے کون انکار کرے گا کہ اگر ذاکر صاحب جیسا صابر، قلندر منش اور باہمت ناخدا نہ ہوتا تو یہ کشتی مخالف ہواؤں میں پاش پاش ہو گئی ہوتی۔

ذاکر صاحب کی زندگی تعلیم و تدریس کے لئے وقف رہی جائز طور پر وہ دنیا کے عظیم ماہرین تعلیم میں گنے جاتے تھے۔ اور تعلیمی معاملات میں ان کی رائے کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ غلامی کے دور میں تعلیم چند افراد میں محدود ہو کر رہ گئی تھی اور ملک کے کروڑوں افراد تعلیم سے ناواقف تھے۔ گاندھی جی نے ان کے لئے بنیادی قومی تعلیم کا ایک خاکہ بنایا۔ اس کو ذاکر صاحب نے وردھا کمیٹی رپورٹ میں ایک جامع تعلیمی نظام کا روپ دیا۔ بنیادی تعلیم کانگرس وزارتوں کے قیام کے بعد کئی صوبوں میں اپنائی گئی۔ لیکن ذاکر صاحب کے بقول لال فیتے کے چکر میں پھنس کر اپنے اصلی کردار کو کھو بیٹھی۔ تعلیم بالغان پر بھی انہوں نے خاص توجہ دی۔ بچوں اور بالغوں کے لئے ادب کی تخلیق پر متوجہ ہوئے اور خود بھی کتابیں لکھیں۔ پھر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے اور انہوں ایک بحرانی دور میں اس کی دانشمندانہ رہبری کر کے نہ صرف اس ادارے کی بلکہ یونی ورسٹی تعلیم اور قومی یکجہتی کی بہت بڑی خدمت کی۔

قومی یکجہتی انہیں تعلیم ہی کی طرح عزیز تھی۔ بڑے سے بڑا طوفان بھی انہیں متزلزل نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی ساری زندگی اس پر گواہ ہے۔ جامعہ ملیہ کے اساتذہ کی صف میں ہمیں پروفیسر تنکھل کا نام ملتا ہے۔ جو اقتصادیات اور گیتا کی تعلیم دیتے تھے۔ پروفیسر گپتا اور پروفیسر برو سائنس پڑھاتے تھے۔ اور پروفیسر سوریہ کانت شاستری سنسکرت کا درس دیا کرتے تھے۔ یہی ہم آہنگی اور رنگا رنگی طلبا کی صفوں میں بھی نظر آتی تھی۔ استاد اور طالب علم بھی تقریباً ملک کی ہر ریاست سے آتے تھے۔ انہوں نے صدر ہونے کے بعد یہ بالکل سچ کہا تھا کہ سارا ہندوستان میرا خاندان ہے اور ہر ہندوستانی اس خاندان کا رکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ متاع عزیز ۳ مئی کو ہم سے یکایک چھن گئی تو سارا خاندان تڑپ اٹھا۔ اس عظیم ہندوستانی خاندان کے چار ہندو ارکان نے قبر کے لئے اپنی زمین پیش کی اور سوگواروں میں ہندو مسلم سکھ عیسائی سب آگے آگے تھے۔

بقیہ بنیاد ذاکر

کہ ان کا خیال تھا کہ ذاکر صاحب کی محبت ہی ہے کہ جوان کے شوہر اتنی قلیل تنخواہوں پر پڑے ہوئے ہیں۔ اور اسی لئے چھڑانے کے لئے ذاکر صاحب کبھی کبھار کوئی ایسی بات کہہ دیتے جس سے یہ بے چاریاں گھبرا جاتیں۔ جامعہ نگر آنے کے بعد جگہ کی قلت تھی۔ ایک بار ذاکر صاحب نے مکانوں کے مطالبے پر کہہ دیا کہ میں سب کے بیوی بچوں کو ان کے گھر بھیجوں گا۔ اور مکان جامعہ کے بچوں کے لئے خالی کرا لوں گا۔ جامعہ کی عورتوں میں سنسنی پھیل گئی۔ جانتی تھیں کہ ان کے شوہر اپنے سردار کے حکم سے سرتابی نہیں کریں گے۔ مجھ سے آکر فریاد کی۔ ان کے اصرار پر ڈرتے ڈرتے میں نے پردے میں بات پھیلا کر ذاکر صاحب سے کہی۔ ذرا سے تیوری پر بل ابھرے۔ ہاں میں تو آپ سب کو اپنے اپنے گھر بھیجوں گا۔ اپنی بیوی کو بھی۔ مجھے مکانوں کی ضرورت ہے۔ بیگم ذاکر بولیں۔ اے ہے سنا کرد ان کی باتیں۔ میں نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے گھر کہاں۔ ہمارا گھر تو یہی ہے یہ جامعہ۔ ہنس پڑے اور کھلے شفاف دل کی بے ریا ہستی نے سب کے اندیشے دور کر دیئے۔

جامعہ کی عورتیں ان کی بھائی تھیں، بہنیں تھیں۔ جہاں انہیں کوئی بیمار ہوتی تو علاج دوا کی فکر ہوتی۔ کسی کے بچہ ہوتا تو مبارکباد کو جاتے۔ کسی کی شادی ہوتی تو تحفے دیئے جاتے۔ چھوٹی لڑکیوں کو ابتدائی میں داخل کرانے کی ہمت افزائی انھوں نے کی تھی۔

(نشری تقریروں سے اقتباسات: بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

دینا ناتھ مست

نوحۂ ذاکر

خونِ دل سے نہ کیوں لکھوں عنواں — یہی سُرخی ہے نوحہ کے شایاں
روزِ روشن میں چھائی تاریکی — ڈوبا پہلے ہی مہرِ ضو افشاں
راجدھانی نہ سوگوار ہو کیوں؟ — اُٹھ گئے آج صدرِ ہندستاں
چارہ گر کچھ نہ کر سکے چارہ — موت نے دی نہ فرصتِ درماں
خون روتی ہیں شہ جہاں بیگم — اقربا رکے ہوئے ہیں دلِ بریاں
دُخترانِ عزیز دلِ خستہ — سینہ کوباں کوئی کوئی گریاں
خاندان تک ہی غم نہیں محدود — اُن کا کنبہ تھا سارا ہندستاں
جس سے ملیے ہے سوگوار وہی — ہوش گم ہیں تو ہیں خطا اوساں
اہلِ علم و ادب کی مت پوچھو — دل ہیں اُجڑے ہوئے نظر ویراں
کرنے آئے ہیں آخری درشن — جوق در جوق لوگ ہیں گریاں
علم و دانش کا وہ چراغ بجھا — گوشہ گوشہ تھا جس سے نور افشاں
دلِ پیمبر کا خوُ فرشتوں کی — مظہرِ شانِ رفعتِ انساں
رُوحِ روشن ضمیر تابندہ — دلِ آگاہ و صاحبِ عرفاں
خدمتِ خلق و محنت و ایثار — زندگی کا رہا یہی عنواں
ایک ظلمت سی چھائی ہے ہر سُو — بام و در جامعہ کے ہیں سنساں
خشت و گِل میں مِلا کے خونِ دل — جامعہ کے بنائے تھے ایواں
جسم بھی اب اُسی کی نذر ہوا — زیست جس جامعہ پہ کی قرباں
لال دھرتی کالے گئے دھرتی — اب نہ پائیں گے پیکرِ تاباں
زندگی میں عروج و اوج مِلا — آیا انجام۔ نوعِ عظیم انشاں
یہی رکھا اُصول جینے کا — زندگی بھر یہی رہا ایماں

"آں چناں زی کہ وقتِ رحلت تُو
ہمہ گریاں بُودند و تو خنداں"

نازش پرتاب گڈھی

اور بجھا ایک چراغ

روشنی اور گھٹی، اور بجھا ایک چراغ
افقِ ہند پہ کچھ اور بڑھی تاریکی
زندگی چیخ اٹھی
کھو گئی گہرے اندھیرے میں نظر
رُک گیا قافلۂ زیست سرِ راہ گذر
تھم گئی نبضِ دوراں
اُٹھ گیا اور بھی اک روشن و بیدار دماغ
اور بجھا ایک چراغ
وہ چراغِ نظر و فکرِ بلند
وہ نشانِ عمل و عزمِ جواں
وہ سراغِ رہِ حسن دل و جاں
جس کی ذات ایک جہانِ ادراک
جس کی گفتار رہی ہے بے باک
جس کا کردار رہا ہے بے داغ
عرصۂ ہند میں معروف رہے جس کے خلوص اور تپاک
سینۂ زیست پہ ظاہر ہوا اک اور بھی داغ
اور بجھا ایک چراغ
آدمیت کے پرستار ہوئے اور بھی کم
علم و حکمت کے طلب گار ہوئے اور بھی کم
قوم و ملت کے وفادار ہوئے اور بھی کم
کم ہوا میکدۂ ذہن سے ایک اور چراغ
اور بجھا ایک چراغ
روشنی اور گھٹی
اور حاصل ہوا ظلمت کو فراغ
بے سہارا ہوئے کچھ اور بھی ہم
ایک "پاکیزہ تر انسان" ہوا اور بھی کم
کم ہوا اور بھی دانش کدۂ ہند سے اک اعلیٰ و ارفع پرچم

دیوانِ غالب
کا ایک نادر مخطوطہ

نثار احمد فاروقی

خود غالب کے قلم سے

۸ اپریل ۱۹۶۹ء کو امروہہ کے ایک تاجر کتب جناب توفیق احمد قادری چشتی (مالک نیشنل بک ڈپو) نے دیوانِ غالب کا ایک اہم مخطوط دریافت کیا ہے، جسے غالبیات کے سلسلے میں تاریخی حیثیت حاصل رہے گی اور غالب کی شاعری کا تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کی نظر میں اُس دیوان کو وہی اہمیت دی جائے گی جو نسخہ حمیدیہ، نسخہ شیرانی، اور گل رعنا (انتخاب دیوانِ غالب) کا حصہ ہے۔ اس دیوان کی چند ممتاز خصوصیات یہ ہیں۔

(الف) یہ نسخہ تمام تر غالب کے قلم سے لکھا ہوا ہے، صرف بعض اوراق کے حاشیے پر بعد میں کسی دوسرے قلم نے چند غزلوں کا اضافہ کیا ہے۔

(ب) یہ نسخہ (جسے آئندہ نسخہ رامپور کہا جائے گا) اُس دور کا کلام پیش کرتا ہے جب غالب صرف اسدؔ تخلص کرتے تھے۔ بعض غزلوں میں انھوں نے مقطع تبدیل کیا ہے اور اسدؔ کی جگہ غالبؔ وزن میں بٹھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ زمانہ مابعد کی تبدیلی معلوم ہوتی ہے۔

(ج) اس میں وہ کلام ہے جو ۲۰-۲۱ سال کی عمر میں غالب نے لکھا تھا اور اسے دیکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ نسخہ حمیدیہ اس کا نقش ثانی ہے۔ یعنی اس نسخہ امروہہ میں اشعار کی روایت حمیدیہ سے مختلف ہے اور اس میں جن مصرعوں یا اشعار کو غالب نے تبدیل کیا ہے۔ وہ نسخہ حمیدیہ میں موجود ہیں۔ مگر جن اشعار کو قلم زد کر دیا ہے وہ کسی نسخے میں نہیں ہیں۔

(د) اس طرح نسخہ امروہہ میں تقریباً پندرہ غزلیں قطعاً غیر مطبوعہ ہیں جو نہ نسخہ حمیدیہ میں ہیں اور نہ نسخہ شیرانی میں، نہ اس کے بعد مرتب ہونے والے اور چھپنے والے کسی ایڈیشن میں شامل ہیں۔

(ہ) اس نسخہ پر ترقیمہ کی عبارت موجود ہے جو آئندہ نقل کی جائے گی۔ لیکن سنہ نہیں لکھا، شاید سہواً رہ گیا ہے، یا جس طرح ابتدائی اوراق کے متعدد مقطعوں میں لفظ اسدؔ کی جگہ تنگرفی روشنائی سے لکھنے کے لیے چھوڑ دی گئی ہے، اسی طرح ممکن ہے سنہ کے اعداد بھی تنگرفی روشنائی سے لکھنے کا ارادہ ہو۔ اس لئے ترک کر دیا گیا ہو۔

(و) بظاہر نسخہ حمیدیہ کا مبیضہ اسی نسخے سے تیار ہوا ہے، اس پر دو باتیں شاہد ہیں، ایک تو جن اشعار میں ترمیم و اصلاح کی گئی ہے وہ اصلاحی شکل میں نسخہ حمیدیہ میں موجود ہیں، دوسرے جن غزلوں پر خط تنسیخ کھینچ دیا گیا ہے وہ حمیدیہ سے غیر حاضر ہیں۔ ورق ۲۸- الف پر ایک جگہ وسط صفحہ پر اشعار کے نیچے لکھا ہے کہ "تا اینجا نوشتہ ام" اور دوسری سطر میں لکھا ہے "از اینجا شروع" جلال الدین صاحب (آرکالوزسالہ آباد) جنہوں نے اس نسخہ کو ملاحظہ فرما کر پریس ٹرسٹ آف انڈیا کو خبر دی تھی، غالباً ان الفاظ سے مغالطے میں مبتلا ہو گئے اور انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ اس مقام تک غالب کا قلم ہے بعد میں کسی دوسرے شخص نے دیوان لکھا ہے حالانکہ یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ (حاشیے کی غزلوں کو چھوڑ کر) متن کتاب میں اول سے آخر تک ایک ہی قلم ہے۔ میں نے مندرجہ بالا مختصر جملوں سے یہ نتیجہ برآمد

کیا ہے کہ نسخہ امروہہ میں ترمیم و تنسیخ کرنے کے بعد غالب نے نسخہ حمیدیہ کا متن تیار کرنا شروع کیا، اور جہاں "تا اینجا نوشتہ ام" لکھا ہے وہاں تک نسخہ حمیدیہ کو اپنے قلم سے نقل کیا، بعد میں انھیں کوئی کاتب مل گیا تو اُسے یادداشت کے طور پر "ازین جا شروع" لکھ کر نسخہ امروہہ حوالے کر دیا۔ ورنہ یہ نسخہ دو کاتبوں کا لکھا ہوا نہیں ہے۔

(ذ) اس سے ایک بات اور ظاہر ہو گئی۔ نسخہ حمیدیہ جس قلمی نسخے پر مبنی ہے وہ فوجدار محمد خاں (بھوپال) کے کتب خانے سے برآمد ہوا تھا اور اب مفقود ہو چکا ہے۔ اس میں یہ ابتدائی غزلیں غالب کے قلم سے نہیں تھیں بلکہ جن اصلاحوں کے بارے میں مرتب نسخہ حمیدیہ نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ غالب کے اپنے ہاتھ سے کی ہوئی ہیں، اُن کا پایہ اسناد بھی مشتبہ ہے۔ نسخہ امروہہ سے یہ ثابت ہے کہ نسخہ حمیدیہ کی پہلی نقل کا کچھ حصہ غالب نے خود نقل کیا تھا لہٰذا یہ نسخہ بھی کہیں موجود ہوگا اور ممکن ہے کبھی نہ کبھی سامنے آجائے۔

(ہ) نسخہ حمیدیہ کا اصل مخطوطہ نوضائع ہو ہی چکا، اب اس کے اشعار کے سلسلے میں ہمیں مفتی انوار الحق صاحب کے بیان پر مکمل بھروسہ کرنا پڑتا ہے، اور کوئی ذریعہ ان اشعار کی تصحیح کا نہیں تھا لیکن نسخہ امروہہ کے برآمد ہونے سے غالب کے بہت سے اشعار بھی بامعنی ہو گئے ہیں اور ان کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا ہے یعنی اب نسخہ حمیدیہ کی غزلوں اور اشعار کی تصحیح نسخہ امروہہ کی روشنی میں کی جائے گی۔ چند مثالیں لکھتا ہوں۔ اس شعر کا مطلب لاکھ سر مارنے پر بھی میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

گداز سعی بنیش شست و شوے نقش خود کامی[1]
سراپا شبنم آئیں اک نگاہ پاک باقی ہے

نسخہ امروہہ میں یہ اس طرح ہے۔

گداز سعی بنیش شست و شوی نقش خود کامی

اس شعر صاف ہو گیا اور اہمال کا احتمال جاتا رہا۔ اسی طرح دوسرا شعر ہے۔

بعجز آباد وہم مدعا تسلیم، شوخی ہے[2]
تغافل کو نہ کر معزول تمکیں آزمائی کا

[1] نسخہ عرشی / ۱۰۷ [2] نسخہ عرشی / ۱۶

نسخہ امروہہ میں معزول کی جگہ مغرور ہے اور اس سے شعر میں مطلب پیدا واضح ہو جاتا ہے۔ یا ان اشعار کو دیکھئے نسخہ حمیدیہ میں یوں ہیں۔

نزاکت ہے فسونِ دعویٔ طاقت شکستن ہا[1]
شرار رنگ، انداز چراغ از جسم [خستن] ہا (جستن)
سیہ مستی چشم شوخ سے ہیں جوہر مژگاں
شرار آسا ز سنگ سرمہ یکسر [بار جستن] ہا (تاز جستن)
ہوائے ابر سے کی موسم گل میں سند باقی
کہ تھا آئینہ خور بے نقاب [رنگ] بستن ہا (ز رنگ)

عیادت ہائے طعن آلود یاراں زہر قاتل ہے[2]
رفوئے زخم [کرتی ہے] بنوک نیش عقرب ہا (کرتے ہیں)

داغ مہر ضبط بیجا مستی سعی [پسند][3]
دود مجمر لالہ ساں در دتہ بمانہ تھا (سپند)

محو سفیہ خانہ زاد چشم بے پروا نگاہاں ہے[4]
نیاز سرمہ یاں گرد سواد [برگستان] ہے (برگستان)

دیوانگاں ہیں حامل راز نہان عشق[5]
اے بے تمیز گنج [کو پروانہ] چاہیے (بوریانہ)

حسن درعنائی میں [وہم] صد سرو گردن میں فرق[6] (باہم)
سرو کے قامت پہ گل یک دامن کوتاہ ہے

---

[1] نسخہ عرشی / ۲۲ [2] نسخہ عرشی / ۲۳
[3] نسخہ عرشی / ۲۵ اسی طرح ص ۱۲ سطر ۲ میں سعی پسند نہیں سعی پسند ہے
[4] نسخہ عرشی / ۸۱ [5] نسخہ عرشی / ۸۲
[6] نسخہ عرشی / ۹۲

یہ سرسری نظر میں دیکھ کر چند اشعار بطور مثال لکھے گئے ہیں اور ان کی جو شکل نسخہ امروہہ میں ہے وہ قوسین میں ظاہر کر دی گئی ہے اس سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے کہ اس نسخے کی روشنی میں نسخہ حمیدیہ کا مکمل متن نظر ثانی کا محتاج ہے اور بہت سے اشعار کے مہمل ہونے کا الزام غالب کے سر سے اٹھ جاتا ہے۔

(ق) ایک اور اہمیت نسخہ امروہہ کی یہ ہے کہ اس سے نسخہ حمیدیہ کی اوّلیت کا نظریہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس نسخے میں جو کلام ہے وہ فارسی آمیزی اغلاق اور مشکل پسندی کے اعتبار سے نسخہ حمیدیہ پر بھی فوقیت رکھتا ہے نسخہ امروہہ کا غائر مطالعہ ثابت کرے گا کہ غالب فارسیت سے کس طرح اپنا دامن بچاتے گئے ہیں متداول دیوان میں جو چند اشعار انھوں نے بطور نمونہ چھوڑ دیئے تھے وہ بھی ابتدائی دور کے کلام کی اصلاح یافتہ شکل تھے۔ یہاں کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ نسخہ حمیدیہ کی ترتیب سے پہلے غالب نے کس طرح کے شعر کہے ہیں اور پھر انھیں کیا اصلاح کرنے کے بعد نسخہ حمیدیہ میں شامل کیا۔ اشعار نسخہ امروہہ سے لئے گئے ہیں۔ اور ان کے سامنے قوسین میں وہ شکل لکھی ہے جو نسخہ حمیدیہ یا نسخہ شیرانی میں ملتی ہے۔

۱۔ [باستقبال نثال زماہ اختہ فشاں شوخی]
تماشا کشور آئینہ میں آمینہ بند آیا
(مہ اختر فشاں کی، بہر استقبال، آنکھوں سے)

۲۔ تغافل بدگمانی [ہا نظر] برسخت جانی [ہا][1]
نگاہ بے حجاب ناز کو بیم گزند آیا
(تغافل، بدگمانی، بلکہ میری سخت جانی سے)

۳۔ [سواد چشم] بسمل [انتخاب نقطہ آرائی][2]
[خرام ناز بے پروائی] قاتل پسند آیا
(روانی ہائے موج خون بسمل سے ٹپکتا ہے
کہ لطف بے تماشا رفتن قاتل پسند آیا)

۴ اگر آسودگی ہے مدعائے رنج [کوشش ہا]
(بے تابی)

۵۔ [نہیں در پردہ حسن از کوشش مشاطگی غافل[3]]
(کرے ہے حسن خوباں پردے میں مشاطگی اپنی)

۶۔ [شب کہ باندھا یار نے پیمان در خواب آمدن[4]]
(شب کہ باندھا خواب میں آنے کا غافل نے جناح

۷۔ [گو شیا[5]] صحرا غبار دامن دیوانہ تھا (تو کہے)

۸ جوش بے کیفیتی ہے۔ اضطراب [اندیشہ اسد[6]] (اضطراب آرا)
ورنہ بسمل کا [طپیدن] نغزش مستانہ تھا (تڑپنا)

غالباً ان مثالوں کی روشنی میں واضح ہو جائے گا کہ نسخہ حمیدیہ کتنی حک و اصلاح اور ترمیم و تنسیخ کے بعد مکمل ہوا ہے۔

(ر) ایک اور غلط فہمی نسخہ امروہہ کی دریافت کے بعد دور ہو جانی چاہیئے۔ یہ جو سمجھا جاتا ہے کہ غالب کا متداول دیوان مولانا فضل حق خیرآبادی اور مرزا جانی کی قوال کی فرمائش بلکہ فہمائش سے تیار ہوا، اسے ذرا احتیاط کے ساتھ قبول کیا جائے۔ ان حضرات کے مشورے یا غالب کے دوسرے احباب کی صلاح ممکن ہے کسی حد تک معاون ثابت ہوئی ہو، لیکن یہ بالکل عمر کی پختگی کے زمانے میں ہوا، اور نسخہ امروہہ کی ترتیب یقیناً ۱۸۱۶ء اور ۱۸۱۸ء کے درمیان ہو چکی تھی، اس وقت غالب آگرہ سے نو وارد تھے اور ان حضرات سے ملاقات کئی برس کے بعد ہوئی ہے۔ نسخہ امروہہ میں جو کانٹ چھانٹ ہے اسے دیکھئے۔ پھر نسخہ حمیدیہ اور اس سے آگے بڑھ کر نسخہ شیرانی اور گلِ رعنا کو دیکھئے — بلکہ نسخہ امروہہ سے لے کر نظامی پریس کانپور میں طبع ہونے والے ایڈیشن تک، جو غالب کی زندگی میں شائع ہونے والا آخری ایڈیشن ہے حک و اصلاح اور ترمیم و تبدیل کا عمل برابر جاری رہا ہے ایسا محض احباب کے مشورے سے نہیں،

---

[1] نسخہ عرشی / ۱۱ [2] نسخہ عرشی / ۱۲
[3] نسخہ عرشی / ۲۳ [4] نسخہ عرشی / ۲۵
[5] نسخہ عرشی / ۲۵ [6] نسخہ عرشی / ۲۵

خود اپنے بالغ تنقیدی شعور اور جمالیاتی احساس کی وجہ سے ہی ممکن ہے اور اس ارتقاء کا کریڈٹ خود غالب کو ملنا چاہئے۔

(ح) ایک نمایاں خصوصیت اس نسخے کی اور بھی ہے جس میں دوسرا کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخہ دیوان اس کا شریک یا حریف نہیں ہے۔ یعنی اس میں غالب نے کچھ غزلیں بالکل حذف کر دی ہیں اور ان پر خط تنسیخ کھینچ دیا ہے یا غزلوں کے بعض اشعار ساقط کر دیئے ہیں۔ ایسے اشعار کی تعداد دو سو کے لگ بھگ ہوگی۔ یہ سب غیر مطبوعہ ہیں اور اس نسخہ کی اشاعت کے ساتھ پہلی بار منظر عام پر آئیں گے۔

اب نسخے کی کیفیت عرض کرتا ہوں۔

یہ نسخہ بہت اچھی حالت میں ہے، اس میں ۵×۷ کے ۱۶۳ اوراق ہیں۔ ہر صفحے پر اوسطاً تین کالم بنائے ہیں۔ اور ہر کالم میں تقریباً 9 سطریں ہیں۔ ورق ۱۔ ب شنگرفی روشنائی سے لکھا ہے:

یا علی المرتضیٰ علیہ وعلی اولادہ الصلاۃ والسلام

یا حسن بسم اللہ الرحمن الرحیم یا حسین

ابو المعالی میرزا عبدالقادر بیدل رضی اللہ عنہ

اس کے بعد پہلا شعر ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

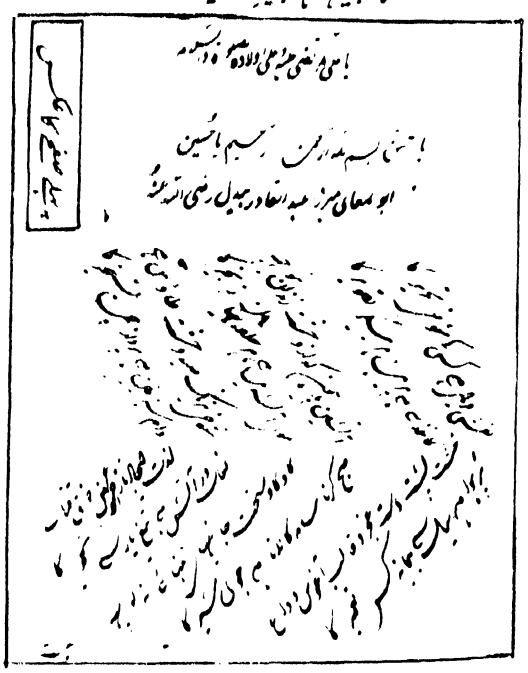

غزلوں کی کل تعداد (۲۶۰) ہے۔ اس میں ایک زمین کا صرف ایک شعر اور دوسری زمین کا صرف ایک مصرع ملتا ہے میں نے اُسے بھی پوری غزل شمار کیا ہے، اگر اُسے ساقط کر دیا جائے تو تعداد غزلیات ۲۵۸ ہو جائے گی۔

ردیف وار تمام اشعار کا خاکہ یہ ہے (پہلا ہندسہ تعداد غزلیات اور دوسرا تعداد اشعار ظاہر کرتا ہے۔)

الف ۱۴/۵۳، ب ۱۲/۲، پ ۱۱/۲، ت ۱۳/۲، ج ۱۴/۲
چ ۱۴/۲، ح ۵/۱، د ۲۸/۴، ر ۴۴/۷، ز ۱۶/۳
ش ۱۴/۲، ع ۱۱/۲، غ ۱۱/۲، ف ۱۱/۲، ک ۵/۱، گ ۹/۱،
ل ۳۳/۵، م ۳۵/۵، ن ۱۷۵/۲۶، و ۵۰/۷، ہ ۴۹/۸
ی ۷۰۳/۱۱۳

غزلیات کے خاتمے پر لکھا ہے "تمت تمام شد غزلیات بعونہ اللہ تعالیٰ فقط" اس کے بعد دوسرے کالم پر "عنوان صحیفہ رباعیات" لکھ کر پہلے فارسی کی ۱۳ رباعیاں درج کی ہیں جن میں سے صرف ایک رباعی مطبوعہ کلیات فارسی میں ملتی ہے۔ باقی ایک درجن غیر مطبوعہ ہیں۔ اور کلیات فارسی سبد چین، سبد باغ دودر، کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔

رباعیات فارسی کے بعد ۱۱ رباعیاں اُردو کی ہیں۔ ان میں سے دس تو مطبوعہ ہیں اور ایک رُباعی غیر مطبوعہ ہے۔ جو نسخہ عرشی میں نہیں ہے اگر رباعی کے اشعار کی تعداد بھی شامل کر لی جائے تو غزلیات و رباعیات کے اشعار کی مجموعی تعداد ۱۷۱۲ ہو جاتی ہے۔

زیر بحث نسخہ امروہہ کا خط شکستہ نستعلیق آمیز بہت روشن اور پاکیزہ ہے اور غلطیوں سے پاک ہے جتنا حصہ اس نسخہ کا میں پڑھ سکا ہوں اس میں صرف دو جگہ ایسا محسوس ہوا کہ سہو کتابت سے کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے۔ املا کی غلطی عموماً نہیں ہے ایک جگہ سہواً کثافت ہا کو "کثا فتہا" لکھا ہے۔ اس نسخے کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ بچپن میں غالب نے خوش نویسی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے خط کی یک رنگی اور پاکیزگی اس پر گواہ ہے۔

اس نسخے کا املا وہی ہے جو تمام عمر غالب کا معمول رہا۔ چند

مثالیں لکھتا ہوں۔ غالب الف کے بعد آنے والے حرف د کو الف سے ملا دیا کرتے تھے مثلاً 'زیادہ' 'فریادی' وغیرہ وہ حالت اس میں موجود ہے۔ دو کو وہ مخصوص انداز میں ملا کر لکھتے ہیں، ت ب وغیرہ اس طرح بناتے ہیں کہ وہ پچھلے حرف کے مقام وصل پر توڑی معلوم ہوتی ہے بعد میں خنجر کی شکل بنتی چلی جاتی ہے۔ اور اس کا شوشہ تو بہت ہی باریک ہو جاتا ہے یہی حالت اس میں ملے گی۔ بعض الفاظ وہ عموماً ملا کر لکھیں گے۔ جیسے "خدمتیں" "تقصیریں" وغیرہ۔ تنہا آنے والی یائے معروف کو سامنے کی طرف پھیلی ہوئی لکھتے تھے یا کسی حرف کے ساتھ مل کر آنے والی یائے مجہول کو خاص انداز سے موڑتے ہیں جس سے مقام اتصال پر نیم بیضوی شکل بن جاتی ہے۔ غرض یہ کہ غالب کے املا کی جو ممتاز خصوصیات ہیں وہ سب اس نسخے کی تحریر میں موجود ہیں۔ مگر اسے غالب کا تحریر کردہ نسخہ متعین کرنے اور ان کے املا کی جانچ کرنے سے پہلے ایک بات خاص طور سے ملحوظ رکھنا ہوگی، وہ یہ کہ ہمارے سامنے ان کی جو تحریریں ہیں اور جن سے عموماً ہماری نگاہیں مانوس ہیں وہ ادھیڑ عمر کی یا بڑھاپے کی ہیں اور یہ نسخہ بھرپور جوانی کے زمانے میں لکھا گیا ہے۔ جب غالب کی عمر ۲۰-۲۲ سال سے زائد نہ ہوگی۔ عمر کے ساتھ ساتھ انسان کے خط میں بھی خاصا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ جوانی کی عمر میں کتابت کے وقت ہاتھ خوب جم کر لکھتا ہے اور ہر حرف کی نوک پلک صاف اور روشن ہوتی ہے، نوشی میں انحلال کے ساتھ ساتھ ہاتھ کی گرفت کمزور ہو جاتی ہے اور حروف کی نشست میں وہ جماؤ نہیں رہتا جو عالم شباب میں تھا۔ اس لئے ایک عام انسان بھی جسے خط شناسی کی کوئی خاص تربیت یا مشق حاصل نہ ہو ایک بوڑھے اور ایک جوان کے خطوں میں واضح فرق محسوس کرے گا۔ اگر ان امور کو مدنظر رکھا جائے تو یہ فیصلہ کرنے میں تاخیر نہیں ہوگی کہ یہ نسخہ غالب ہی کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ نسخہ امروہہ کے بخط غالب ہونے کا دوسرا ثبوت اس کا ترقیمہ ہے۔

"تمت تمام شد۔ بتاریخ چاردہم رجب المرجب یوم سہ شنبہ سنہ ہجری وقت دوپہر روز باقیماندہ فقیر بیدل اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ متخلص بہ اسد عفی اللہ عنہ از تحریر دیوان حسرت عنوان خود فراغت یافتہ بفکر کاوش مضامین دیگر رجوع بہ جناب روح مرزا علیہ الرحمۃ آورد۔ فقط۔"

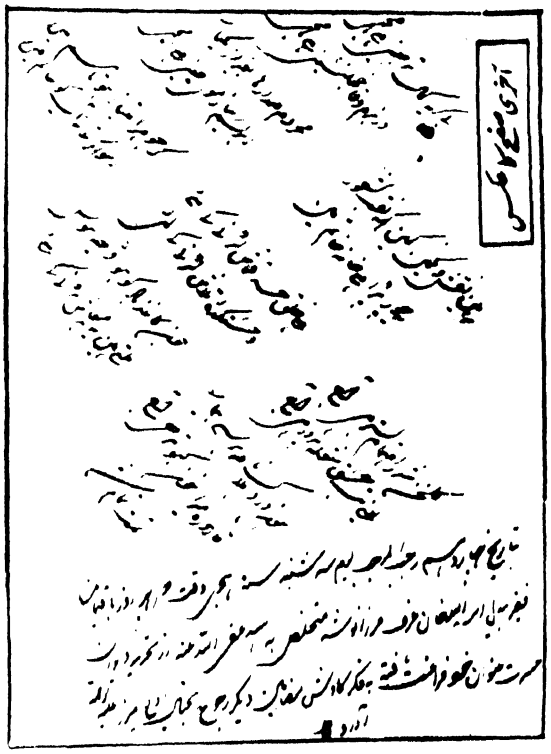

اس دیوان کے آغاز میں "یا علی، یا حسن، یا حسین" کے الفاظ اور اس ترقیمے میں "فقیر بیدل" "یا اسد اللہ عنہ" کا اندراج بعض حضرات کے ذہن میں شک پیدا کر سکتا ہے، لیکن مجھے یہ الفاظ اتنے اہم معلوم نہیں ہوتے کہ ان کی وجہ سے کسی تحریر کو مرزا کی تحریر ہی نہ سمجھا جائے۔ انسان کا ذہن و افکار بہت سے نفسیات سے گذرتے ہیں۔ غالب عقیدے کے اعتبار سے اثنا عشری تھے اور ابتدا میں مرزا عبدالقادر بیدل کے انداز سے غیر معمولی طور پر متاثر تھے۔ یہ دونوں باتیں ان الفاظ سے ثابت ہوتی ہیں۔ رہا یہ کہ انھوں نے بعد میں کبھی اس طرح کے الفاظ اپنی تحریروں میں نہیں لکھے۔ تو بیدل کا تاثر بعد میں کم ہو چکا تھا اور اس کی تقلید کا خیال مرزا نے آہستہ آہستہ ترک کر دیا تھا مگر عبارت کے خاتمے پر بارہ

کا ہندسہ وہ آخر تک لکھتے رہے۔ یہ بحساب ابجدی "حد" کے اعداد بھی ہیں، اور ائمہ کرام کی تعداد بھی۔ غالب نے خود ایک خط میں لکھا ہے، "صاحب بندہ اثنا عشری ہوں، ہر مطلب کے خاتمے پر بارہ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ خدا کرے میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو ۱۲" [1] اس طرح کے اور بھی حوالے غالب کی تحریروں میں جا بجا ملیں گے جن سے ان کی عقیدت اور محبت اہل بیت اطہار کا اندازہ ہوتا ہے، صرف لکھنے کا انداز بعد میں تبدیل ہو گیا کہ سرنامہ پر "یا حسن یا حسین" نہ لکھا عبارت کے خاتمے پر ۱۲ کا ہندسہ کر دیا۔

ترقیمہ کا ہندسہ یہ بتاتا ہے کہ غالب نے تقلید بیدل میں اپنا پہلا دیوان یہی مرتب کیا تھا۔ اور اس کی حد سے بڑھی ہوئی فارسی نے بعد میں خود انھیں مجبور کیا کہ اسے ہلکا کریں چناں چہ فارسی کے مصدر تک وہ بے تکلف استعمال کرتے ہیں اور تڑپنا کی جگہ "بسمل کا طپیدن" لکھتے ہیں ــ خود انھوں نے حک و اصلاح کے بعد نسخہ حمیدیہ تیار کیا، اور جب وہ یا ان کے احباب اس سے بھی مطمئن نہیں ہوئے تو متداول دیوان کی ترتیب وجود میں آئی۔

اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ نسخہ امروہہ کی ترتیب اور کتابت کا سنہ کیا ہے؟ ترقیمہ کی عبارت میں تاریخ تو درج ہے مگر بدقسمتی سے سنہ کے اعداد لکھنے سے رہ گئے ہیں۔ ویسے تقویم ہجری و عیسوی سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴ رجب کو سہ شنبہ کا دن ۱۲۳۳ھ میں پڑا تھا جو ۲۰ مئی ۱۸۱۸ء کے برابر ہے، اسی تاریخ کو منگل کا دن ۱۸۲۱ء میں بھی تھا لیکن اسے ہم نے اس وجہ سے تسلیم نہیں کیا [2] کہ اس سے پہلے ۱۸۲۰ء میں نسخہ حمیدیہ وجود میں آچکا تھا، اسی نسخے کا سنہ لازماً نسخہ حمیدیہ سے پہلے کا ہونا چاہیے۔ عرشی صاحب نے مقدمہ دیوان غالب میں لکھا ہے:

"میرزا صاحب کی سخن سرائی کا آغاز ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء) ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء) اور ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۲ء) میں سے کسی ایک سال ہوا تھا، ان میں سے راجح قول یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ تقریباً دس برس کی عمر سے شعر گو

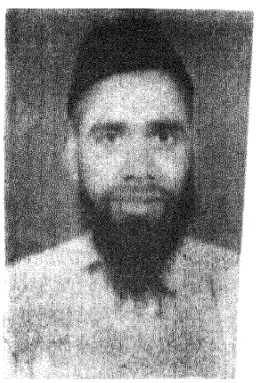

جناب توفیق احمد
جن کی مساعی سے
غالب کا خود نوشت دیوان
دستیاب ہوا

دیوانِ غالب کے نسخۂ امروہہ کا ایک صفحہ جس کے حاشیہ پر یکم صفر ۱۲۲۵ھ کی ایک یادداشت درج ہے۔

[1] مہر خطوط غالب / ۲۲۱

[2] ایک اندرونی شہادت سے اتنا طے ہے کہ یہ نسخہ یکم صفر ۱۲۲۵ھ

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

تھے کیوں کہ کلیات فارسی کا اظہار، جو سب سے قدیم ہے یہی ثابت کرتا ہے۔" [1]

ہم اگر یہ بھی تسلیم کرلیں کہ میرزا نے پندرہ سال کی عمر سے ۱۸۱۲ء میں شعر گوئی کا آغاز کیا اور انھیں دیوان فراہم کرنے کا خیال آیا تو چھ سال کی مدت میں ۱۸۱۸ء تک ان کا پہلا دیوان مرتب ہوجانا بالکل خدا لگتی بات ہے۔ اس کے تعین میں ان کے تخلص سے بھی مدد مل سکتی ہے۔ مرزا غالب نے لکھا ہے۔

"میں نے تو کوئی دو چار برس ابتدا اسد تخلص رکھا ہے ورنہ غالب ہی لکھتا رہا ہوں" [2]

"دو چار برس" تو غالب نے یونہی لکھ دیا ہے۔ نسخہ امروہہ میں ہر جگہ اسد تخلص آیا ہے۔ اور جہاں کہیں غالب ہے۔ وہ مصرع بعد میں کاٹ کر تبدیل کیا گیا ہے۔

دیوانِ غالب کی تدوین سے بحث کرتے ہوئے مولانا عرشی تحریر فرماتے ہیں۔

"مرزا صاحب نے ردیف وار اردو دیوان صفر ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء) میں صاف کرایا تھا، اس کی اصل کوئی مرتب دیوان تھا یا وہ بیاض تھی جس میں بترتیب نظم اشعار لکھے گئے تھے، اس سوال کا جواب دینے کے لئے ابھی تک کوئی مسالا نہیں مل سکا لیکن یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ میرزا صاحب نے ۱۲۳۷ھ سے قبل کے کہے ہوئے متعدد شعر اس میں شامل نہیں کئے تھے۔ چناں چہ "یادگار نالہ" کے وہ شعر جو عمدہ منتخبہ، عیار الشعراء اور دوسرے قدیم ماخذوں سے نقل کئے گئے ہیں، اس دعوے کا بین ثبوت ہیں" [3]

نسخہ امروہہ وہی اصل دیوان ہے جس سے ۱۲۳۷ھ والا نسخہ صاف ہوا تھا اور یہی وہ گم شدہ کڑی ہے جس کے منظر عام پر آنے سے مندرجہ بالا سوالوں کا جواب خود بخود مل جائے گا۔ اور یہ عقدہ بھی حل ہو جائے گا کہ قدیم تذکروں میں جو اشعار ایسے ملے ہیں۔ جن سے نسخہ حمیدیہ خالی ہے وہ کہاں سے نقل ہوئے تھے۔

تادم تحریر یہ دُرِ بیش بہا جناب توفیق احمد صاحب قادری امروہوی کی ملکیت ہے اور ابھی یہ کہنا مشکل ہے کہ کس خوش نصیب فرد یا ادارے کے پاس یہ محفوظ ہوگا۔

---

[1] (مطابق ۱۹ نومبر ۱۸۱۹ء) سے پہلے وجود میں آچکا تھا۔ اس لئے کہ ورق ۱۴ الف کے حاشیے پر ایک مختصر سی یادداشت ملتی ہے جس میں صاف ہندسوں میں لکھا ہے: "لعل خاں بتاریخ اول صفر ۱۲۳۵ھ درماہہ عیقہ" اس سے ظاہر ہے کہ مذکورہ تاریخ کو غالب نے لعل خاں نامی کسی شخص کو ڈھائی روپے ماہوار تن خواہ پر ملازم رکھا تھا اور بطور یادداشت اپنے دیوان کے حاشیے پر اس کے تقرر کی تاریخ درج کرلی تھی یہ اسی وقت ممکن ہے۔ جب ہم یہ فرض کرلیں کہ یکم صفر ۱۲۳۵ھ سے پہلے دیوان کا مسودہ لکھا جاچکا تھا۔ اور ایسا تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ غرض ۱۸۱۸ء ہماری نظر میں زیادہ قرین قیاس تاریخ ہے۔

[2] مقدمہ دیوانِ غالب نسخہ عرشی / ۱۳

[3] اُردوئے معلیٰ / ۳۷۱ (طبع لاہور)

مقدمہ دیوانِ غالب نسخہ عرشی / ۱۹

غالبیات میں اضافہ

غالب کے فکر و فن اور زندگی سے متعلق دو اہم کتابیں

آئینہ غالب: ۲۲ مقالات۔ بڑا سائز

ٹائپ کی عمدہ چھپائی۔ صفحات ۲۷۸۔ قیمت ۵ روپے

گنجینۂ غالب: ۱۴ مقالات۔ بڑا سائز۔ ٹائپ کی عمدہ چھپائی، صفحات: ۱۸۶ قیمت ۴ روپے

محصول ڈاک ہمارے ذمے۔ تین روپے اور اس سے زائد کی کتابیں وی پی سے منگوائی جاسکتی ہیں۔

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ذکیہ انجم

کشمیر اور اردو شاعری

انسان کا دعویٰ یہ ہے کہ اگر اس کے ذوقِ تعمیر کی رنگینیاں اپنا کام نہ کریں تو یہ دُنیا نقش ہائے بے رنگ کا مجموعہ ہوتی۔ اقبال کے الفاظ میں فطرت کی تخلیق تو بیاباں اور کوہسار تھے، انسان نے گلستاں بنائے ہیں اور اندھیری راتوں میں چراغ جلائے ہیں۔ لیکن اس زمین پر کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں، جن کا حسنِ ذاتی ہمیشہ تکلف سے بَری رہا ہے۔ اُنھوں نے انسان کو رعنائی خیال بخشی ہے۔ اُس کی نگاہوں کے سامنے حسین منظر پیش کئے ہیں اور اس کے وجدان کو جمالیاتی کیف سے آشنا کیا ہے۔ لیکن انسانی ہاتھوں کی گُل کاریوں سے اُن کا دامن زیادہ گراں بار نہیں، ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر چیز، کشمیر کی حسین اور جنت نظیر وادی ہے جس کی تعریف میں کسی فارسی شاعر نے یہ بے مثال بات کہی ہے کہ "اگر جنت اس زمین پر ہے تو وہ یقیناً یہی ہے، یہی ہے، یہی ہے۔"

کشمیر کے بے مثال حسن نے صرف انسانی نگاہوں کو رنگ و بو کے نظارے ہی نہیں کئے ہیں بلکہ ادبیات، خاص طور سے شاعری کو حُسنِ بیان کے بہت سے دلفریب موضوع بخشے ہیں جن میں بے حد تازگی اور تنوع ہے۔ فارسی اور اُردو شاعری میں کشمیر سے متعلق نظموں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے، جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمینی جنت کے سدا بہار نظاروں نے، شاعری کو کس قدر مالا مال کیا ہے۔ ان نظموں میں تشبیہوں اور استعاروں کا سرمایہ خاص طور سے ذکر کے قابل ہے۔ ایسی ایسی نادر حسین اور مترنم تشبیہیں ملتی ہیں، جن سے خیال اور فکر کی بے کرانیوں کا اندازہ ہوتا ہے اور ایسے ایسے پہلو دار استعارے نظر آتے ہیں جن کو گنجینۂ معنی کا طلسم کہنا چاہئے اور ان دونوں سے شاعری کے خزانے میں گراں قدر اضافے ہوئے ہیں۔ ان نظموں میں سرمستی و رعنائی کا طوفان کروٹیں لیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ نظمیں، کشمیر کے بے مثال حُسن، وہاں کے حسین ترین مناظر اور ان کے تاثرات کے مرقع ہیں۔ ان سے صرف کشمیر کے حُسن کی تصویر سامنے نہیں آتی ہے، ان سے شاعری میں ایک ایسے موضوع کا اضافہ ہوتا ہے، جس کی سدا بہار وسعت، اس کے دامن کو رنگینیٔ بیان سے ہمیشہ سجاتی رہے گی۔

فارسی میں سب سے پُرشور نظم، عرفی کا ایک بے نظیر قصیدہ ہے۔ جس میں شاعر نے اس فردوسِ زمین کے بے مثال حُسن کا، بے مثال انداز سے اعتراف کیا ہے۔ زورِ بیان عرفی کی شاعری کی عام خصوصیت ہے۔ لیکن اس قصیدے میں موضوع کے حسن نے طرزِ بیان میں اور زیادہ سرشاری پیدا کر دی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر، عقیدت و محبت اور پسندیدگی و پرستش کے جذبات میں ڈوب کر خراجِ تحسین پیش کر رہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ "وہاں کی آب و ہوا میں وہ تاثیر ہے کہ ہر سوختہ جاں وہاں آکر، زندگی نو پا لیتا ہے۔ پھول اس طرح نمایاں ہوتے ہیں، جیسے فانوس میں سے چراغ باہر آجائے۔ سبزہ، چشمے اور لالہ و گل کی وہ کثرت ہے کہ زبان سے کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا۔ (صرف خاموش نظارہ، اُن کی تعریف کا کچھ حق ادا کر سکتا ہے) کشمیر اس طاؤس کی

طرح ہے جو ہر لمحہ ایک نئے انداز سے جلوہ گر ہو۔ یا اُس دولھن کی طرح ہے جس کا حسن و جمال ہر دم خوب سے خوب تر اور شاداب سے شاداب تر معلوم ہوتا ہے۔"

ہر سوختہ جانیکہ بہ کشمیر در آید
گر مرغ کبابست کہ با بال و پر آید
وقتست کہ گل بر فگند پردہ ز رخسار
ز انسانکہ زفانوس چراغ بدر آید
این سبزہ و این چشمہ و این لالہ و این گل
آن شرح ندارد کہ بگفتار در آید
طاؤس مثالے کہ نیفشاندہ پر و بال
ہر لحظہ برنگ دگر اندر نظر آید
زینندہ عروسیکہ بفیروزہ جمالش
ہر دم بنظر خوشتر و شاداب تر آید

میں نے ابھی کہا تھا کہ کشمیر ایک ایسا موضوع ہے جس نے اُردو شاعری کو حسین ترین تشبیہوں اور استعاروں کا سرمایہ بخشا ہے، جن میں تازگی، تنوع اور دلکشی کی دُنیا سموئی ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں عمر انصاری لکھنوی کی نظم "جنت کشمیر" کو مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس نظم میں ساری خوبی، اس کی نہایت درجہ حسین و جمیل تشبیہوں کی پیدا کی ہوئی ہے اور کئی تشبیہیں، اُردو شاعری میں واقعی اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کشمیر کے چمن کو، "پالکی میں سر بزانو چوتھی کی دولھن" کہنا، یا پیچدار پتلے پہاڑی راستوں کو، "جواں ہاتھوں میں قسمت کی لکیر" سے تعبیر کرنا، حسن خیال کے اعلا نمونے ہیں۔

دامن کہسار میں یہ پھولتا پھلتا چمن
پالکی میں سر بہ زانو جیسے چوتھی کی دلہن
گل بدست و گل بدوش و گلبدن گل پیرہن
سیم رُخ، سیما جبیں، سیمیں نگاہ، وسیم تن
حسن فطرت کے لب معصوم کا پہلا سخن
سبزہ جیسے اطلس و کمخواب و دیبا و حریر

بھینی راستے جیسے جواں ہاتھوں میں قسمت کی لکیر
بھینی بھینی سی ہوائیں باغ جنت کی سفیر
لہلہاتے کھیت جیسے بے گناہوں کے ضمیر
آنی و بہزاد کے الہم نہیں جن کی نظیر

اُردو شاعری میں کشمیر کے کئی مرقعے ملتے ہیں، اور اس کے الگ الگ رُوپ نظر آتے ہیں، اس کے حسن و جمال کی آئینہ داری بھی کی گئی ہے اور آزادی سے پہلے، اس کے افلاس کی دل دوز تصویریں بھی پیش کی گئی ہیں۔ جن سے اس جنت ارضی کا دوسرا رُخ بھی سامنے آتا ہے۔ آزادی کے بعد حکومت ہند کی مدد سے جو بے مثال ترقیاں وہاں ہوئی ہیں، ان کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اور کشمیر پر بیرونی حملہ آوروں نے جس طرح یورشیں کی تھی، اس کی داستانیں بھی سنائی گئی ہیں۔ غرض اُردو شاعری میں کشمیر کے قدرتی حسن و جمال سے لے کر آزادی سے قبل کی غربت اور آزادی کے بعد کی ترقی تک کی ساری کہانیاں محفوظ ہیں۔

چکبست کے اجداد کا وطن کشمیر ہی تھا۔ اور اس نسبت پر اُن کو ہمیشہ ناز رہا۔ انھوں نے نہایت دل کش انداز میں، اپنے قدیم وطن کا ذکر کیا ہے، طرز بیان ایسا والہانہ ہے کہ شاعر کے بے پناہ جذباتی تعلق کو ظاہر کرتا ہے، یہ نظم انھوں نے بالکل میر انیس کے رنگ میں اور اسی انداز سے کہی ہے۔ اس میں وہی فرحت، شگفتگی اور تازگی محسوس ہوتی ہے، جو کشمیر کا خاصا ہے۔ انھوں نے کشمیر کے حسین مناظر و مظاہر کا ایسی خوبصورتی اور وارفتہ بیانی کے ساتھ ذکر کیا ہے، کہ الفاظ میں جان پڑ گئی ہے اور حسین لفظوں کے پھول سے کھل اٹھے ہیں۔ نظم کو پڑھتے پڑھتے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے یہ مناظر سامنے کھنچے چلے آ رہے ہوں، ملاحظہ ہوں۔

پانی میں ہے چشموں کے، اثر آب بقا کا
ہر نخل پہ عالم خضر سبز قبا کا
جو پھول ہے گلشن میں وہ ہے نور خدا کا
سائے میں شجر کے ہے اثر ظل ہما کا

مبداءِ کرمِ عام کی ہر جوئے رواں ہے
ہر چشمہ رفیضِ چمن آرائے جہاں ہے

وہ موجِ ہوا کا حرکتِ ابر کو دینا
چشموں سے پہاڑوں کے وہ اڑتا ہوا پھینا
گاتے ہوئے ملاحوں کا وہ کشتیاں کھینا
ڈل کا وہ سرِ شام اُدھر کروٹیں لینا
وہ عکس ہواؤں کا جھلکتا نظر آنا
پانی کا ستارہ بھی چمکتا نظر آنا

ایسا ہی ایک حسین مرقع جوشش ملیح آبادی نے سجایا ہے۔ جوشش کو الفاظ کے نگینے جڑنے اور مرقعے سجانے پر جو بے پناہ قدرت حاصل ہے اور جوش و سرمستی کی جو فراوانی ان کے کلام میں موج زن رہتی ہے، یہ عناصر اس نظم میں بھی پوری طرح موجود ہیں۔ کشمیر کی ایسی شوخ رنگ تصویریں بہت کم ملیں گی۔ رنگین الفاظ اور شگفتہ اندازِ بیان نے فضائے کشمیر کے حسن کو، اس نظم میں منتقل کر دیا ہے۔ ترکیبوں کے آہنگ میں کشمیر کے جھرنوں کی روانی کا سا شور سنائی دیتا ہے اور مناسب لفظوں کی چست بندش میں نغموں کی جھنکار سی محسوس ہوتی ہے۔ حسین منظر کی حسین تر تعریف شاید اسی کو کہا جائے گا:

زہے فضائے کشمیر، بہشتِ حسن جاوداں
ترانہ ریزِ مے چکاں، شگوفہ بارِ گل فشاں
ہر ایک سنگ اک صنم، ہر ایک خار اک جناں
ہر ایک پیچ و خم دھنک، ہر ایک جادہ کہکشاں
زمیں پہ سرخ بادلے، فلک پہ موجِ پرنیاں
فورِ آب و رنگ میں، ہجومِ برگ و بار میں
فضائے لالہ کار میں، ہوائے کوہ سار میں
تموجِ سرور میں، تلاطمِ بہار میں
بہشتِ شاخسار میں، چنار و دیودار میں

ملیو مست و پرفشاں، کبھی یہاں کبھی وہاں

اسی انداز و آہنگ کی ایک نظم شاذ تمکنت کی بھی ہے۔ اس نظم میں بھی کشمیر کے حسنِ بے پناہ کی بڑے والہانہ انداز میں عکاسی کی گئی ہے۔ مرصع لیکن پرتاثیر اندازِ بیان، شاذ کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ اور اس نظم میں ان کی مرصع کاری شباب پر نظر آتی ہے۔ نظم کا عنوان ہے "شہرِ لالہ و گل"۔ یہ واقعہ ہے کہ کشمیر کے ہمہ جہت حسن کو شاذ نے بے حد سلیقے کے ساتھ الفاظ کے چھوٹے چھوٹے آئینوں میں سجا دیا ہے اور پوری نظم، ایک ایسا آئینہ خانہ نظر آتی ہے جس پر حسنِ کشمیر کو بے شمار رنگوں کی چھوٹ پڑ رہی ہو۔ ملاحظہ ہو!

ارضِ کشمیر مہکتے ہوئے نغموں کی زمیں
تیری مہکی ہوئی بدمست ہواؤں کو سلام
نکہت آبادِ جواں، گلشنِ عطر و عنبر
تیرے آکاش کی مدماتی گھٹاؤں کو سلام
گنجِ پیغامِ طرب، گوشۂ جنت آثار
تیری گاتی ہوئی پرکیف فضاؤں کو سلام
ارضِ کشمیر! تری خاکِ خنک تاب و حسیں
سجدہ گاہِ دلِ صاحب نظراں ہے کہ جو تھی
تیرے معمورۂ خوش بوئے جہاں گیری میں
دولتِ چشمِ مسیحا نفساں ہے کہ جو تھی
ہائے وہ کشتِ شفق حاشیہ آرائے فلک
صورتِ پیرہنِ گل بدناں ہے کہ جو تھی

مخمور سعیدی کی نظم "اے وادیٔ کشمیر" اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ کشمیر کے حسن کے ساتھ ساتھ اس میں اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ یہ سرزمین بے مثال مذہبی رواداری کا گہوارہ بھی ہے۔ شاعر کے الفاظ میں اس "دخترِ گل بدنِ ارضِ ہمالہ" کا تبسم اگر مسجد ہے تو شوالہ اس کا جھومر ہے۔ اور ناقوس کی آواز اور تکبیر کے نعرے دونوں ہی سے اس کے حسن کا آہنگ دوبالا ہو جاتا ہے۔

"چھیڑا انھا غنی نے تری عظمت کا فسانہ

مہجور نے گایا تری اُلفت کا ترانہ
چکبست کا دل تیری محبت کا ٹھکانہ
اقبال ترے ناوکِ جاں بخش کا نخچیر
اے وادیٔ کشمیر!

اُے دخترِ گل بدنِ ارضِ ہمالا
ٹیکا تیرا مسجد ہے تو جھومر ہے شوالا
دونوں سے ترے حسن کا آہنگ دوبالا
ناقوس کی آواز ہو یا نعرۂ تکبیر
اے وادیٔ کشمیر!

پل بھر کو ہوا دامنِ رنگیں کی جو کھالی
انفاس میں بوئے نفسِ خضر بسالی
اک زندگیٔ نو دلِ بیمار نے پالی
ہے تیری ہوا میں دمِ عیسیٰ کی سی تاثیر
اے وادیٔ کشمیر!

کشمیر حسنِ خداداد کا شاہکار ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ اس کے قدرتی مناظر، انسانی ہاتھوں کے صناعی کے احسان مند نہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ایک طویل مدت تک، اس جنت کے بہت سے باشندے غربت و افلاس کے شکار رہے ہیں، آزادی کے بعد کشمیر نے قابلِ قدر ترقی کی _____ اور آج جو خوش حالی نظر آتی ہے، اُس نے کشمیر کے حسنِ ذاتی کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اور شاعری میں اُس دورِ مرحوم کی دلدوز تصویریں بھی محفوظ ہیں۔ فانی کی یہ دو رباعیاں دیکھئے۔ لہجے میں کیسا کرب ہے، کیسی حسرت ہے اور کیسی اذیت ناکی ہے۔ شاعر اس جنتِ دنیا کے حسن سے بے طرح متاثر ہے، لیکن اس کا دردمند دل تو اس کو سراپا مسرت دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ حسین و جمیل مناظر کو دیکھ کر، جب وہاں کے غریب محنت کش طبقے کو دیکھتا ہے تو بے اختیار چیخ اٹھتا ہے۔

اس باغ میں جو کلی نظر آتی ہے
تصویرِ فسردگی نظر آتی ہے
کشمیر میں ہر حسین صورت فانی
مٹی میں ملی ہوئی نظر آتی ہے

پھولوں کی نظر نواز رنگت دیکھی
مخلوق کی دل گداز حالت دیکھی
عبرت کا مرقع نظر آیا کشمیر
دوزخ میں سموئی ہوئی جنت دیکھی

فانی اگر آج زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ وہ عبرت کا مرقع، اب مسرت کا گہوارہ بن گیا ہے اور اس باغ میں اب ویسی افسردہ کلیاں نظر نہیں آتیں۔

اب آزادی کے بعد کے کشمیر کی تصویر دیکھئے۔ جس میں خوشحالی کا سورج طلوع ہو چکا ہے اور جس کی کرنیں ہر آنگن تک پہنچ رہی ہیں۔ عوامی سطح پر منصوبہ بندی نے افلاس کے اندھیرے کو کافور کر دیا ہے اور ایک نئی زندگی کے تصور کا نقش درست ہو رہا ہے۔ ایسی زندگی جس میں امنگ ہے، کام کرنے کی لگن ہے۔ اپنی سرزمین سے محبت ہے، اور خوش آیند مستقبل کا نقشہ ہے۔ جو سرمستی کشمیر کی فضا میں ہے، جو روانی وہاں کے چشموں میں ہے، اور جو وسعت وہاں کی جھیلوں میں ہے وہی کیفیت آج دلوں میں پیدا ہو رہی ہے۔ حسنِ بیان نے اس نظم میں دل کشی کی بجلیاں بھر دی ہیں۔ نظم رام کرشن مضطر کی ہے، عنوان ہے "نیا کشمیر"۔ اس کے بعض اجزا دیکھئے:

رُوح افزا ہے یہ تعمیر و ترقی کا جمال
جلوہ افروز ہے آئینۂ مستقبل و حال
قابلِ قدر ہے یہ صنعت و حرفت کا کمال
کامیابی کی نئی روح سے رخشاں ہے خیال
اہلِ کشمیر کا یہ دورِ عروجِ تازہ
زندگی کے رُخِ رنگیں کا ہے زرّیں غازہ

دورِ بیداریٔ احساس، یہ تعلیم کا دور

درس گاہوں کا فروغ اور یہ تنظیم کا دور
یہ ہر اک شعبہ، ہر اک راہ میں تقدیم کا دور
دورِ کشمیر ہے یہ عزت و تکریم کا دور
دورِ جمہور ہے کشمیر کا دورِ تاباں
جگمگا اٹھے ہیں سب جادۂ منزل کے نشاں

تعمیرِ نو کی اس تصویر کا ایک اور خوش آیند رُخ طرفہ قریشی کی اس نظم میں نظر آتا ہے جس میں تجدیدِ نو کے اثرات کو نہایت خوب صورت شاعرانہ انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

اس کو کہیئے حُسن کی تجدیدِ نو کا شاہ کار
"خاندانِ چک کے اک فرماں روا کی یادگار"
نرشنا جھیلیں، حسین میداں، نشاط افروز باغ
سبزہ در دامن چراگاہیں، نظر کش کوہ سار
برف کے گالوں پہ اسکیٹنگ کی وہ مشقِ لطیف
دلِ کشا تفریح گاہیں، روح افزا ہر دیار
صبح سے تا شام سیاحوں کا شوق آگیں ورود
ہر نظر حیرت بدیدہ، ہر بشر مدحت گزار

کشمیر ہندوستان کا حصّہ ہے۔ ایسا حصّہ جس پر ہم فخر بھی کر سکتے ہیں اور جس کی حفاظت کا عہد بھی کرتے ہیں۔ سرحدی علاقے کا یہ رنگین ٹکڑا، ہمیشہ سے نگاہوں کا مرکز رہا ہے، کبھی پرستش کی نگاہوں کا آستانہ اور کبھی بوالہوسی کی نظروں کا ہدف بنا ہے۔ اس جنت نظیر خطے کی تعمیر و ترقی کی نیرنگیاں جس طرح آج بھی نگاہوں سے اور زبانوں سے خراجِ عقیدت وصول کرتی ہیں، اُسی طرح نگاہیں اور زبانیں اس کی حفاظت کا عہد بھی کرتی ہیں اور اسے مقدس فرض سمجھتی ہیں۔ اردو شاعری کی فضائیں اس عہدِ حفاظت کے نغموں سے گونج رہی ہیں۔ ان آوازوں میں سچائی کی طاقت اور اعتماد کی قوت سموئی ہوئی ہے!

ہند تابندہ ہے کشمیر بھی تابندہ ہے
حوصلے زندہ ہیں احساسِ خودی زندہ ہے
چہرہ قوم درخشندہ و رخشندہ ہے
ہند قائم ہے تو کشمیر بھی پائندہ ہے
سربکف رہتے ہیں ہم اس کی حفاظت کے لئے
زندگی وقف ہے کشمیر کی خدمت کے لئے

(رام کرشن مضطر)

تجھے خزاں کے ہر اک وار سے بچالیں گے
ترے قدم پہ ہم اپنا لہو اچھالیں گے
بُری نگاہ جو اغیار تجھ پہ ڈالیں گے
ہم اہلِ ہند دلوں میں تجھے بٹھالیں گے
دراز عمر ہو مے خانۂ جمال ترا
یہ میری نظم ہے نذرانۂ جمال ترا

(نازش پرتاپ گڑھی)

اُردو شاعری کے مرقعے میں کشمیر کی ہمہ جہت اور ہمہ رنگ تصویریں سجی ہوئی ہیں جس میں اس خطۂ رنگ و نور کا ہر رُخ نمایاں ہو گیا ہے۔ کشمیر جس قدر شاہراہ ترقی پر بڑھتا جائے گا اسی نسبت سے اس کی تعمیر و ترقی کے عکس شاعری کے آئینہ خانے میں بڑھتے رہیں گے۔

قطعۂ تاریخ

ثمر ٹکاروی

انتقال پر ملال عزت مآب عالیجناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب

اُٹھ گئی اک عظیم ہستی آہ ؛ چل بسے حیف ذاکرِ ذی جاہ
صدرِ ہندوستان خلد نشاں ؛ حق شناس حق پژوہ حق آگاہ
ناگہاں زندگی تمام ہوئی ؛ دل کا دورہ اے خدا کی پناہ
غم میں کس کی نہیں ہیں آنکھیں نم ؛ کس زباں پر نہیں ہے نعرۂ آہ
کہہ دو تاریخ فوت تم اے ثمر
اُٹھ گئی اک عظیم ہستی آہ

۱۹۶۹ء

دارالعلوم دیوبند

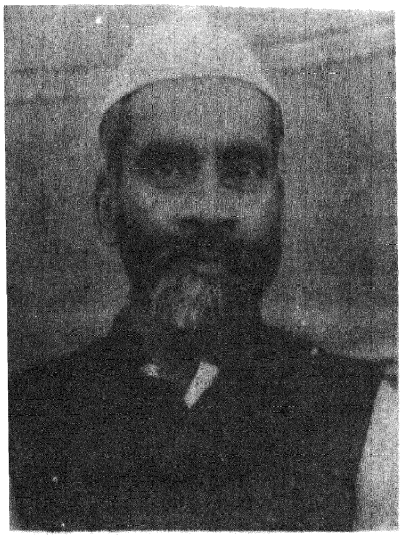

ابراہیم فکری

سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہوئے دس برس گذر گئے تھے، ہندوؤں اور مسلمانوں کی استخلاص وطن کی کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ دلی کے لال قلعہ پر یونین جیک لہرا رہا تھا اور ایک ایک کرکے ہر اس شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا یا جلاوطن کر دیا گیا تھا جس نے ملک کی آزادی کی کوششوں میں کسی طرح سے بھی حصہ لیا تھا جن میں علمائے وقت بھی شامل تھے۔ ان حالات میں ایک ایسی آزاد تعلیمی درسگاہ کی سخت ضرورت تھی جہاں علوم دین کی تعلیم کا انتظام ہو اور مسلمانوں کی صحیح مذہبی رہنمائی کی جائے۔ اس طرح ایک تعلیمی درسگاہ کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی اور چند نفوس قدسیہ نے جن کے سربراہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح تھے، یوم پنجشنبہ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء میں نہایت بے سروسامانی کے عالم میں صرف ایک استاد مولانا محمود اور ایک طالب علم کہ ان کا نام بھی محمود تھا۔ (جو بعد میں شیخ الہند کے نام سے مشہور ہوئے) چھتہ کی مسجد کے کھلے صحن میں ایک انار کے درخت کے سایہ میں بیٹھ کر اس مشہور عالم درسگاہ دارالعلوم دیوبند کا افتتاح کیا۔ اس موقعہ پر چار سو ایک روپیہ آٹھ آنے چندہ جمع کیا اور سولہ طالب علموں کے قیام وطعام کا انتظام کیا گیا۔

ابتدائی دنوں میں مدرسہ قاضی مسجد اور کرایہ کے مکانوں میں رہا۔ پھر اس شہر کی جامع مسجد میں منتقل کیا گیا۔ مگر مدرسے کی ضرورت کے لئے ایسی جگہ کی ضرورت تھی جو کشادہ ہو اور ضرورت کے مطابق اس کی توسیع بھی عمل میں آسکے۔ چنانچہ شہر کے کنارے محلہ دیوان کے سامنے کا وسیع میدان خرید لیا گیا۔

۲ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ میں دارالعلوم کے دسویں سالانہ تقسیم انعام کے جلسے کے موقع پر نماز جمعہ کے بعد مدرسے کی تعمیر کی بنیاد رکھی گئی۔

دارالعلوم کی یہ پہلی عمارت "دورہ" کے نام سے پانچ سال میں تیار ہوئی۔ خدا نے مدرسہ میں ایسی خیر و برکت فرمائی کہ دارالعلوم میں یکے بعد دیگرے دسیوں عمارات تعمیر ہوگئیں۔ جس میں دارالحدیث، دارالتفسیر، مسجد دارالعلوم باب اظاہر، اور طلبا کی اقامت گاہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ آج سے سو سال قبل یہاں سولہ طلبا زیر تعلیم تھے اور اس وقت اس کے دامن تربیت و تعلیم میں ڈیڑھ ہزار طالبان علم ملک اطراف و اکناف کے ہیں۔ جن کے لئے ۳۷ درسگاہیں ہیں۔ اور پچاس سے اوپر اساتذہ طلبا کے قیام کے لئے تین سو بڑے بڑے کمرے ہیں اور تعلیم و انتظام تعلیم سے متعلق ۱۸ شعبہ جات ہیں۔

اس کے نصاب میں درجات عربیہ کے ۲۲ علوم و فنون داخل ہیں۔ جن میں قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ، علم الکلام، تصوف، فرائض و

یراث کے علاوہ صرف نحو، معانی و بیان، منطق، فلسفہ، عروض و قوافی ہیئت و ہندسہ، تجوید، طب شامل ہیں۔ بتقاضائے وقت حال ہی میں ریخ، جغرافیہ، سائنس، معلومات عامہ اور اسی کے ساتھ ساتھ انگریزی کے مضامین کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔

کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طرح یہاں درجہ بندی نہیں ہے بلکہ کتاب وار" نظام تعلیم ہے طلبہ کی علمی استعداد کا علم اُن کی درسی کتابوں پر موقوف ہے کہ وہ فلاں فلاں کتاب پڑھ چکا ہے۔ یا پڑھ رہا ہے اسی بُنیاد پر اگر کوئی طالب علم کسی کتاب میں ناکام ہوتا ہے تو اُس کو اس کتاب کا اعادہ کرنا ہوتا ہے اور پاس شدہ کتابوں میں ترقی دیدی جاتی ہے۔ جس کا ایک طرف یہ فائدہ ہوتا ہے کہ طالب علم کے دل و دماغ پر خراب اثر نہیں پڑتا اور تعلیم سے بددلی نہیں ہوتی اور دُوسری طرف یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ تعلیم میں وقت کم صرف ہونے کے ساتھ ساتھ تعلیمی اخراجات میں بھی کفایت ہوتی ہے۔

دارالعلوم میں لیکچروں کا طریقہ نہیں ہے۔ یہاں اُستاد اور شاگرد دونوں کے سامنے کتاب ہوتی ہے۔ طالب علم سبق پڑھتا ہے، اُستاد اس پر فنی حیثیت سے ایک جامع تبصرہ کرتا ہے۔ طلبہ کو اس بات کی پوری آزادی ہوتی ہے کہ جب تک پوری طرح سبق نہ سمجھ لیں اُستاد کو آگے بڑھنے نہ دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف طالب علم مطالعہ اور تیاری کے ساتھ درس میں شامل ہوتے ہیں تو دوسری طرف اُستاد بھی پوری محنت و تیاری کے ساتھ پڑھانے کا پابند ہوتا ہے۔

دارالعلوم کے اخراجات عوامی چندے سے پورے کئے جاتے ہیں۔ حکومت کی امداد یا کبھی ایسے گرانقدر عطیئے سے جس سے دارالعلوم کے مقاصد پر کوئی اثر پڑے، احتراز کیا جاتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ "آئین چندہ دارالعلوم دیوبند" کی سب سے پہلی دفعہ جو دارالعلوم کے یوم تاسیس ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۷ء سے آج تک بالالتزام روداد ہائے دارالعلوم میں لکھی جاتی رہی ہے وہ یہ ہے کہ:

"چندہ کی کوئی مقدار مقرر نہیں ہے اور نہ اُس میں مذہب و ملت کی خصوصیت ہے۔"

چنانچہ دارالعلوم کی سو سالہ زندگی میں انگریزی دور حکومت میں امداد کے بارہا ایسے مواقع پیش آئے۔ مگر دارالعلوم اپنی روایات پر سختی کے ساتھ قائم رہا۔

۱۹۵۶ء میں ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریۂ ہند دارالعلوم کے معائنہ کے لئے تشریف لائے تو آپ نے فرمایا:

"آپ کے دارالعلوم نے نہ صرف اس ملک کے بسنے والوں ہی کی خدمت کی ہے بلکہ آپ نے اپنی خدمات سے اتنی شہرت حاصل کرلی ہے کہ غیر ممالک کے طلبہ بھی آپ کے یہاں آتے ہیں اور یہاں سے تعلیم پاکر جو کچھ انھوں نے یہاں سیکھا ہے، اپنے ممالک میں اس کی اشاعت کرتے ہیں۔ یہ بات اس ملک کے سبھی باشندوں کے لئے

قابلِ فخر ہے ۔ میں دارالعلوم میں آکر بہت زیادہ مسرور ہوا اور یہاں سے بہت کچھ لے کر جا رہا ہوں "

ان تاثرات کے اظہار کے بعد آپ نے اس خیال کا اظہار کیا کہ وہ حکومت کی جانب سے دارالعلوم دیوبند کو ایک گرانقدر امداد دینا چاہتے ہیں۔ مگر دارالعلوم کی جانب سے اس کی روایات کے پیشِ نظر شکریہ کے ساتھ معذرت کر دی گئی ۔

مگر جب صدر محترم نے اپنی ذاتِ خاص سے ایک ہزار روپیہ بطور چندہ دینا چاہا تو اُس کو قبول و منظور کر لیا گیا ۔

بحمد للہ اب سارا ہندوستان دارالعلوم کی امداد و اعانت میں شریک ہے ۔ ہندوستان کے علاوہ متعدد غیر ملکوں سے بھی عطیات وصول ہوتے ہیں۔

دارالعلوم کے بانیوں نے مدرسہ دیوبند قائم کر کے جہاں مسلمانوں کے علوم و فنون، دین و مذہب کے لئے دارالعلوم جیسی مضبوط و مستحکم درسگاہ قائم کی، وہاں مسلمانوں کے سیاسی اور قومی تحفظ کے لئے بھی وہ برابر کوشاں رہے ۔ انہوں نے اس سلسلے میں پیش آنے والی دشواریوں دقتوں اور تکالیف و مصائب کو بھی خوش آمدید کہا۔

۱۸۰۳ء سے ۱۹۴۷ء تک کے زمانہ میں علمائے دیوبند اور ابنائے دارالعلوم دیوبند نے ملک کی سیاسی تحریکات میں قائدانہ حیثیت سے شرکت کی ۔ اور اس سلسلہ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ استخلاصِ وطن کی جدوجہد کا ایک ایسا اہم حصہ ہیں جو کہ ناقابلِ فراموش ہے ۔

سن ۱۸۵۷ء میں حاجی امداد اللہ صاحب کی قیادت میں مولانا محمد قاسم نانوتوی ، مولانا عبدالغنی ، مولانا محمد یعقوب اور مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہم اللہ نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا۔ موضع شاملی ضلع مظفر نگر میں انگریز سپاہ سے نبرد آزما ہوئے ۔

جب سن ستاون کی آگ ٹھنڈی ہوئی تو حاجی امداد اللہ صاحب اور اُن کے ساتھیوں کی سرگرمی سے تلاش شروع ہوئی۔ حاجی امداد اللہ صاحب، مولانا محمد یعقوب صاحب اور مولانا عبدالغنی صاحب نے مکہ معظمہ ہجرت کی۔ مولانا محمد قاسم گرفتار نہیں کئے جا سکے لیکن مولانا رشید احمد گنگوہی گرفتار کر لئے گئے ۔ ۹ ماہ تک فرنگیوں کے اسیر رہے عام معافی کا اعلان ہوا تو رہائی عمل میں آئی ۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی ، ۱۸۶۷ء سے ۱۸۷۹ء تک یعنی تقریباً ۱۲ برس تک دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی کے فرائض انجام دیئے ۔ اس وقت ملک و قوم کے حق میں سب سے اہم اور بڑا فرض

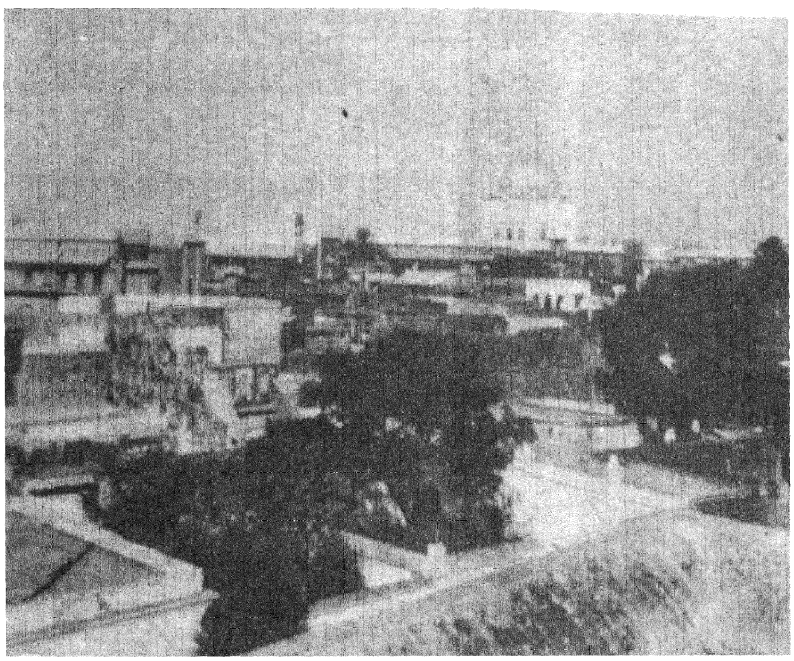

تھا بھی یہی۔ اور سن ستاون کے بعد تحریک دارالعلوم اور مدرسہ عربیہ کے قیام کے نام سے مسلمانوں میں انگریزی حکومت کے خلاف ایک تنظیم بنائے رکھنے کا اس سے اچھا اور کوئی راستہ ممکن بھی نہ تھا۔

آپ کی سرپرستی کے زمانے میں ہزارہا انسانوں نے آپ سے فیض حاصل کیا۔ علماء کی دینی تربیت فرمائی اور انھیں دین کے بارے میں اتنا راسخ اور مستحکم بنا دیا کہ ان افراد پر کوئی بھی فتنہ اثر انداز نہ ہو سکا۔

موصوف کی یہ بھی خواہش تھی کہ ہندوستان کے مسلمان انگریزوں کی چالبازیوں سے بچے رہیں اور ہندوستان کی آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ آپ کو ایسے لوگوں سے بڑی چڑھتی جو انگریزی حکومت کی وفاداری کا دم بھرتے تھے۔

اسی لئے جب مولانا سعدالدین کشمیری اور مولانا امان صاحب نے مولانا گنگوہی سے ہندوستان کے دارالحرب ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ مانگا تو مولانا رشید احمد گنگوہی نے نہایت جرأت اور بہادری کے ساتھ یہ فتویٰ دیدیا کہ "ہندوستان دارالحرب ہے"

جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ انگریزی حکومت کے خلاف جنگ جاری رہے اور ہر ایک مسلمان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اس لڑائی میں مکمل طور پر حصہ لے۔

اسی بنا پر انہوں نے سرسید کی "انجمن اسلامیہ" کے مقابلے میں کانگرس کی حمایت کو ضروری سمجھا۔

ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ اور شرکت کانگرس کا فتویٰ دارالعلوم کے سرپرست ثانی کا وہ اہم کام ہے جس نے مسلمانوں میں سیاسی استحکام پیدا کیا اور جنگِ آزادی کے سرفروش مجاہد جنم دیئے۔

مولانا گنگوہی کا ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء بروز جمعہ انتقال ہو گیا۔

آپ کے بعد دارالعلوم کی سرپرستی کا بارِ گراں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کو اٹھانا پڑا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان میں ایک نئی سیاسی لہر پیدا ہو چکی تھی، جس کے اثر میں آکر بہت سے نوجوانوں نے ہتھیاروں کا استعمال بھی شروع کر دیا تھا اور کچھ اس کی پاداش میں تختہ دار پر بھی چڑھ چکے

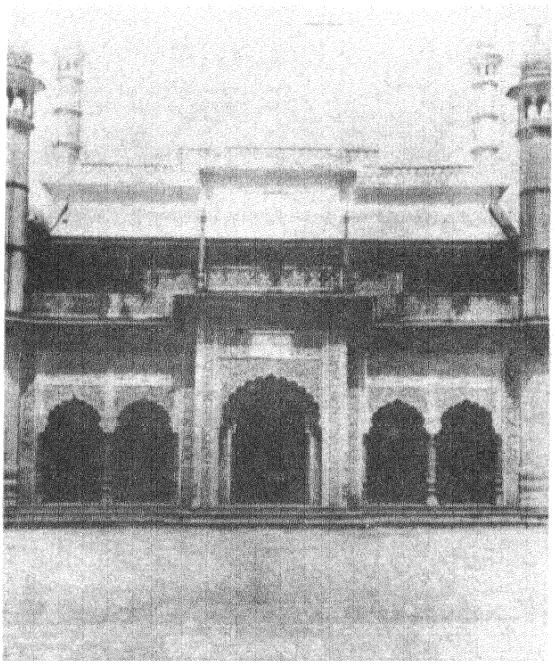

مسجد دارالعلوم

تھے۔ انگریزوں کے خلاف اشتعال انگیز اور باغیانہ مضامین شائع ہونے شروع ہو گئے تھے۔ ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر تحریک آزادی سے متعلق خفیہ انجمنیں قائم ہو چکی تھیں جن کے ذریعے تلقین ہوتی تھی کہ:

"بہادرو جلدی کرو۔ غدر برپا کر کے ٹیکس دینا بند کر دو جو ہم سے وصول کئے جاتے ہیں۔ ضرورت ایسے سپاہیوں کی ہے جو ہندوستان میں غدر پھیلائیں۔ موت تنخواہ ہے، شہادت انعام ہے، آزادی پنشن ہے، میدانِ جنگ ہندوستان ہے۔ اٹھو آنکھیں کھولو۔ غدر کے لئے روپوں کی تھیلیاں بھرو۔"

(رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۲۱۴)

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رح کا خیال تھا کہ چوں کہ ہندوستانیوں سے ہتھیار چھین لئے گئے ہیں، اس لئے جنگِ آزادی شروع کرنے کے لئے ازبس ضروری ہے کہ غیر ملکی امداد و اعانت حاصل کی جائے۔

اس سلسلے میں حضرت شیخ الہند کی نظر سب سے پہلے افغانستان

پڑگئی۔ ہندوستان اور افغانستان کی سرحدیں ملی ہوئی ہونے کی وجہ سے وہیں سے مدد ملنا سب سے زیادہ آسان تھا۔ اسی کے ساتھ ہندوستان کی سرحد پر بسے ہوئے آزاد قبائل سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔

حضرت شیخ الہند نے دارالعلوم دیوبند کے ان طالب علموں کے سہارے اور مدد سے جو آزاد قبائل سے تعلیم کے لئے آتے تھے اپنا رابطہ قائم کیا اور اس میں انھیں کامیابی بھی ہوئی آزاد قبائل کے افراد و نمائندے شیخ الہند رح کے پاس آنے جانے لگے۔ اور آپ کے مکان کے تہہ خانے میں خفیہ میٹنگیں ہونے لگیں۔

شیخ الہند کا پروگرام یہ تھا کہ کابل سے لے کر ہندوستان کے دوسرے کونے تک انگریزوں کے خلاف ایک جال بچھا دیا جائے اور کسی مناسب موقع پر افغانستان اور آزاد قبائل کی فوج ہندوستان پر حملہ آور ہو اور دوسری طرف ملک کے اندر جنگ آزادی کا آغاز کر دیا جائے۔ آپ کا خیال تھا کہ یہ ایک ایسی صورت ہے جس کے ذریعے انگریزوں کو "ہندوستان باہر" کیا جا سکتا ہے۔ آپ کی اس تحریک و تجویز میں دو چیزیں سب سے اہم اور بنیادی ہیں۔ (۱) غالب نامہ (۲) ریشمی رومال تحریک۔

غالب نامہ کا خاص مقصد انقلابی جدوجہد کے لئے سلطنت عثمانیہ سے ہمدردی و تعلقات قائم کرنا تھا اور ریشمی رومال تحریک کی غرض یہ تھی کہ ایک طرف شمال مغربی سرحد سے حملہ ہو اور دوسری طرف ہندوستان میں بغاوت کھڑی کر کے سلطنت برطانیہ کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ انہی دنوں میں پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ جنگ کے دوران مولوی عبدالحق حقانی نے یہ فتویٰ دیا کہ:

"ترکی کے خلاف انگریزوں کی مدد کرنا جائز ہے"

اس فتویٰ پر کئی اور علمائے کرام کے بھی دستخط تھے۔

شیخ الہند کے سامنے یہ فتویٰ دو مرتبہ پیش کیا گیا حضرت موصوف نے اس فتویٰ کو سختی سے رد کر دیا اور جن لوگوں نے اس کی تصدیق کی تھی ان کے متعلق بھی سخت کلمات کہے اور مجمع عام میں اسے پھینک دیا۔ آپ کے اس عمل سے آپ کے ساتھیوں میں ایک سنسنی سی پھیل گئی اور یہ لوگ امید کرنے لگے تھے کہ مولانا فوراً گرفتار کر لئے جائیں گے لیکن اس وقت حکومت کی ہمت ان پر ہاتھ ڈالنے کی نہ ہوئی۔

ادھر حضرت شیخ الہند نے بھی یہ فیصلہ کر لیا کہ انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا یہ موقع سب سے اچھا ہے۔

آپ نے مولانا سندھی کو کابل جانے کا حکم دیا۔ سفر کے اخراجات کا بندوبست شیخ عبدالرحیم صاحب نے اپنی بیوی کا زیور بیچ کر کیا اور ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو مولانا سندھی کابل میں داخل ہو گئے۔

آپ کی تحریک کا براہ راست تعلق امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان سے قائم ہو چکا تھا لیکن انقلابی جدوجہد کے لئے سلطنت عثمانیہ (ترکی) سے ہمدردی، تعاون اور رابطہ قائم کرنا بھی ضروری تھا۔

چناں چہ اسی مشن کے پیش نظر آپ مولانا سندھی کی روانگی کے ایک مہینے بعد یعنی ۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو اپنے مخصوص شاگردوں کے ساتھ جن میں مولانا محمد میاں منصور انصاری، مولانا محمد شمیل بھاگلپوری، حکیم نصرت حسین، مولانا مرتضیٰ حسین چاندپوری، حاجی خان محمد، مولوی مطلوب الرحمان، حاجی محبوب خاں، حاجی عبدالکریم۔ مولانا عزیز گل اور مولانا وحید احمد مدنی وغیرہم شامل تھے۔ مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔ حکومت کو اپنے جاسوسوں کے ذریعے سب باتوں کا علم تو تھا ہی مگر جب مولانا کو ہندوستان سے باہر جاتے دیکھا تو حکومت کو بڑی تشویش لاحق ہوئی۔ بمبئی کے حکام کو تار کے ذریعے مولانا کی گرفتاری کا حکم دیدیا گیا مگر کسی وجہ سے اس حکم کی تعمیل نہ ہو سکی اور مولانا مکہ معظمہ پہنچ گئے۔

سرزمین حجاز میں آپ کے ورود سے بہت پہلے آپ کے شاگرد سید المولائی مولانا حسین احمد مدنی رح وہاں موجود ہی تھے جو کہ آپ کے مشن میں خاص معاون ثابت ہوئے۔

غالب نامہ: ۔ آپ حجاز کے گورنر غالب پاشا سے بھی ملے اور ان سے آزاد قبائل کے لئے ایک خط حاصل کیا۔ رولٹ ایکٹ کمیٹی میں اس خط کا ذکر "غالب نامہ" کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس خط میں تحریر تھا

"تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ مولوی محمود حسن جو پہلے ہندوستان کے مدرسہ دیوبند میں تھے۔ ہمارے پاس تشریف لائے۔ ہم نے اس خیال میں ان کی تائید کی اور انھیں ضروری ہدایات دیدی ہیں۔ اگر وہ تمہارے پاس آئیں تو تم ان پر اعتماد کرو اور آدمیوں، روپئے اور ہر چیز

سے جو وہ طلب کریں۔ اُن کی امداد کرو۔"

(رولٹ ایکٹ کمیٹی رپورٹ)

اس کے علاوہ ترکی کے وزیر جنگ انور پاشا اور جنوب مغرب محاذ کے کمانڈر جمال پاشا سے ملاقات کی۔

انور پاشا کی رائے تھی کہ شیخ بنفس نفیس آزاد قبائل پہنچیں لیکن اپنے پہنچنے سے پہلے "غالب نامہ" اور دیگر لکھے ہوئے وثیقے آزاد قبائل میں پہنچا دیں۔ رائے مشورہ کے بعد مولانا منصور انصاری کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ غالب نامہ کی کاپیاں آزاد قبائل تک پہنچا کر کابل مولانا سندھی کے پاس پہنچیں۔ اور سارے کام کی اطلاع دیں۔

آپ غالب نامہ کے ساتھ ہندوستان آئے۔ انگریزوں نے اُنھیں گرفتار کرنا چاہا۔ مگر مولانا کی دانائی اور ہوشیاری سے گرفتاری عمل میں نہ آسکی۔ آپ سارے راستے "غالب نامہ" کی کاپیاں تقسیم کرتے گئے۔ اس سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے اس طرح کی بھی ایک کوشش جاری ہے اور جب موقع آئے تو وہ اس کے لئے تیار رہیں۔ اور پورا پورا تعاون دیں۔

ہندوستان پار کر کے آپ آزاد قبائل میں حاجی ترنگ زئی کے پاس پہنچے۔ حاجی صاحب ۱۹۰۹ء سے ہی دارالعلوم دیوبند اور حضرت شیخ الہند سے اپنا تعلق قائم کر چکے تھے۔ غالب نامہ ملنے پر حاجی صاحب موصوف نے انگریزوں کے خلاف زور شور سے جہاد کی تیاری شروع کر دی۔

یہاں سے مولانا محمد میاں کابل پہنچے۔ مولانا سندھی سے ملاقات کی اور امیر حبیب اللہ کے خطوط ان تک پہنچا دیئے۔

مولانا محمد میاں کے کابل پہنچنے سے پہلے مولانا سندھی نے یہاں اپنا اثر و رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ کابل میں ایک عارضی ہندوستان سرکار قائم کی۔ جس کے صدر راجا مہندر پرتاپ تھے۔ اور مولانا سندھی اس کے وزیر داخلہ اس کے علاوہ آپ نے ہندوستان کی آزادی کے لئے لڑنے والوں کی ایک فوج بھی تیار کی تھی جس کا نام "جنود ربانیہ" خدائی فوج تھا۔ رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ میں اس مذکورہ اسکیم کا ذکر درج ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"اگست ۱۹۱۵ء مطابق ۱۳۳۳ھ میں مولانا محمود الحسن (شیخ الہند) کے ایک شاگرد مولوی عبید اللہ کابل چلے گئے۔ اور وہاں پہنچ کر انہوں نے جرمنی اور ترکی مشن سے جو افغانستان آیا ہوا تھا مل کر امیر کابل پر برطانیہ کے خلاف زور ڈالا۔ اسی سال ستمبر میں مولوی محمود حسن مکہ مکرمہ چلے گئے اور وہاں سے انہوں نے غالب پاشا کا دستخطی اعلان مولوی محمد میاں کے ہاتھ مولوی عبید اللہ کے پاس کابل بھیجا۔ جس میں برطانیہ کے خلاف جہاد کی ترغیب دی گئی تھی۔ ان لوگوں نے یہ طے کیا تھا کہ برطانیہ کو شکست دینے کے بعد ہندوستان میں عارضی حکومت قائم کی جائے جس کے پریزیڈنٹ راجہ مہندر پرتاپ سنگھ ہوں گے۔ جو ضلع متھرا کے ایک رئیس تھے اور ۱۹۱۴ء مطابق ۱۳۳۲ھ میں یورپ چلے گئے تھے۔ اور برطانیہ کی مخالف سلطنتوں سے تعلق رکھتے تھے۔"

رولٹ ایکٹ کمیٹی رپورٹ ۲۵۳/۵۴

اس اسکیم کے تحت حکومت کی صدارت کا منصب راجہ مہندر پرتاپ کے لئے تجویز کیا گیا تھا، جو اس تحریک کے سیکولر طریقہ کار کا مظہر ہے۔

رولٹ ایکٹ کمیٹی میں "ریشمی رومال تحریک" کا ذکر بھی ہے۔

"ریشمی رومال تحریک" اصل میں تین خطوط پر مشتمل ہے۔ جو پیلے ریشمی رومال پر صاف دخوشخط لکھے ہوئے تھے۔

دو خط مولانا عبید اللہ سندھی کے ہیں اور ایک خط مولانا محمد میاں منصور انصاری کا ہے۔

مولانا سندھی کے دو خطوط میں سے ایک خط شیخ عبدالرحیم کے نام ہے۔ جسے ہم کور نگ لیٹر COVERING LETTER کہہ سکتے ہیں۔ اس خط میں شیخ صاحب موصوف کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ کسی معتبر حاجی کے ہاتھ حجاز شیخ الہند کے پاس پہنچا دیں

اس خط کی لمبائی چوڑائی ——— ۵ × ۶ ہے۔

دوسرا خط شیخ الہند کے نام ہے یہ خط ۱۰ × ۵ پر ہے۔

اس خط میں مولانا سندھی نے ان تمام باتوں کا ذکر کیا ہے۔

جو انہوں نے کابل کے قیام کے زمانے میں انجام دی ہیں۔ اس کے علاوہ "جنود الربانیہ" یعنی خدائی فوج کی تنظیم کی پوری تفصیل درج ہے مثلاً یہ کہ اس فوج کے سربراہ یا سرپرست شیخ الہند، نادر شاہ اور غالب پاشا ہوں گے۔ گیارہ فیلڈ مارشل ہوں گے۔ یہاں ان گیارہ اشخاص کے نام دیئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اُن کی تنخواہوں کے اسکیل بھی تحریر ہیں۔ مثلاً میجر جنرلوں میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اسمائے گرامی بھی موجود ہیں۔

تیسرا خط مولانا محمد میاں منصور انصاری کا ہے یہ خط ۸×۱۰" کا ہے۔ اس خط میں مولانا نے اپنی جدہ سے روانگی سے لے کر کابل پہنچنے تک کے حالات سفر کا تذکرہ کیا ہے مثلاً ہندوستان پہنچنے میں انہیں کیا کیا دشواریاں پیش آئیں۔ ہندوستان میں غالب نامہ کی کاپیوں کی تقسیم، گرفتاری سے خود کو بچا لینا، جرمن اور ترک وفود کا آزاد قبائل میں پہنچنا، جرمنوں کی ناکامیابیوں کی وجوہ وغیرہ کا ذکر ہے۔

یہ تینوں خطوط انڈیا آفس لائبریری لندن کے پولیٹیکل اور سیکریٹ شعبہ میں من وعن محفوظ ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے ایک معتمد عبدالحق کے حوالے یہ خطوط کئے اور ان سے تاکید کر دی کہ وہ یہ خطوط شیخ عبدالرحیم صاحب تک پہنچا دیں جو اس وقت حیدرآباد سندھ میں مقیم ہیں۔ وہ یہ خطوط کسی معتمد شخص کے ذریعے شیخ الہند تک پہنچا دیں گے۔

عبدالحق صاحب ان خطوط کو لے کر حیدرآباد سندھ پہنچے اور خان بہادر حق نواز خاں کے یہاں قیام کیا جن کے بچوں کے یہ اُستاد بھی تھے۔ خان بہادر سے ملاقات اور شاگردوں کی مزاج پرسی کے لئے انھوں نے بھی اس سفر کو غنیمت سمجھا۔ عبدالحق صاحب نے اپنی سادہ لوحی میں اپنے سفر کا مقصد اور ریشمی خطوط کا تذکرہ بھی کر دیا۔ خان بہادر موصوف کو انگریزوں سے ہمدردی اور وفاداری نیز انگریز کمشنر کی خوشنودی حاصل کرنے کا ایک اچھا موقع ہاتھ آگیا۔ بہلا پھسلا کر یہ خطوط عبدالحق صاحب سے حاصل کر لئے اور ۱۴ اگست ۱۹۱۶ء کو یہ خطوط ملتان کے کمشنر کو سونپ دیئے۔ وہاں سے یہ خطوط پنجاب سیکریٹریٹ بھیجے گئے۔ پنجاب سی آئی ڈی کے سربراہ مسٹر ٹوم کنس نے ان خطوط کی جانچ کی۔ اس کے بعد عبدالحق صاحب سے پوچھ تاچھ ہوئی۔ موصوف نے جو کچھ معلوم تھا، وہ سب بتلا دیا۔ ان کا سارا بیان ۳۵ صفحات میں قلم بند کیا گیا۔ خفیہ محکمے جہاں ریشمی خطوط کے صاف ستھری اور سلیس زبان میں ہونے کو سراہا ہے وہاں عبدالحق صاحب کے ذہن وحافظہ کی بھی بڑی تعریف کی ہے۔ یہاں تک تو غنیمت تھا۔ مگر آگے چل کر غضب یہ ہوا کہ عبدالحق صاحب پولیس اور خان بہادر صاحب کے دباؤ اور اثر میں آگئے، اور سرکاری گواہ بن گئے۔ غالب نامہ اور ریشمی رومال تحریک کے جب سب راز انگریزوں کو معلوم ہو گئے تو گرفتاریوں کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ حضرت شیخ الہند اور ان کے سب ساتھی مولانا حسین مدنی، مولانا عزیر گل، مولانا وحید احمد مدنی، اور حکیم نصرت حسین مکہ مکرمہ میں گرفتار کر لئے گئے۔ قاہرہ کے سیاسی قید خانہ میں رکھ کر جانچ اور تفتیش کی گئی۔ ان حضرات کو یقین تھا کہ پھانسی سے کم سزا نہیں ہوگی۔ مگر انہیں ۱۵ فروری ۱۹۱۷ء کو چار سال کے لئے مالٹا روانہ کر دیا گیا جو سیاسی اور جنگی قیدیوں کا سیاسی مرکز تھا، صرف ایسے فوجی افسروں یا اسیروں کو ہی وہاں رکھا جاتا تھا جو بہت خطرناک، اپنے خیالات میں پختہ و سخت ہوتے تھے۔ اور کسی قسم کا لالچ ان پر کوئی اثر نہ کر سکتا تھا۔

شیخ عبدالرحیم کے نام جب وارنٹ گرفتاری نکلا تو وہ فرار ہو گئے۔ انگریزوں نے امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان پر زور ڈالا کہ وہ مولانا سندھی اور مولانا محمد میاں کو پکڑ کر انگریزوں کے حوالے کر دے۔ امیر حبیب اللہ خاں کے چھوٹے بھائی نصراللہ خاں اور شہزادہ امان اللہ خاں نے مولانا کو گرفتاری سے باز رکھنے کی امکانی کوشش کی مگر انہیں کامیابی نہیں ہوئی وہ گرفتار کر کے کابل جیل میں ڈال دیئے گئے۔

مولانا محمد میاں منصور انصاری کو نصراللہ خاں نے بڑی خاموشی کے ساتھ افغانستان کی اُتری پہاڑیوں میں پہنچا دیا۔ ۲۳ دن کا پیدل سفر کر کے وہ بخارا پہنچے اور وہاں پناہ حاصل کی۔

پانچ اسیران مالٹا میں سے حکیم نصرت حسین صاحب کا تو مالٹا

ہی میں انتقال ہوگیا۔ ۱۲ مارچ ۱۹۲۰ء کو شیخ الہند اپنے تین ساتھیوں سمیت چار سال بعد رہا کر دیئے گئے۔ ان دنوں خلافت تحریک بڑے زوروں پر تھی۔ حکومت نہیں چاہتی تھی کہ مولانا خلافت تحریک میں شریک ہوں۔ جہاز پر خفیہ پولیس کے کچھ افسران اور علماء نے آپ سے ملاقات کی۔ انھیں سمجھایا کہ خلافت کمیٹی کے استقبالیہ میں شریک نہ ہوں۔ اور نہ اس تحریک سے اپنے کو وابستہ کریں۔ مولانا نے ان لوگوں کو کوئی جواب نہیں دیا۔ خلافت کمیٹی بمبئی کی طرف سے شاندار استقبال ہوا۔ اس کے بعد دیوبند تک ہر اسٹیشن پر شاہی استقبال ہوا۔

مولانا سندھی اور مولانا محمد میاں دونوں کا قیام کابل ہی میں تھا۔ مولانا سندھی کو ہندوستان آنے کی اجازت دینے کے لئے ۱۹۳۶ء میں کانگرس نے آواز اٹھائی۔ کچھ دنوں بعد ۱۰ نومبر ۱۹۳۷ء کو برٹش حکومت نے مولانا کو یہ اطلاع دی کہ وہ ہندوستان آ سکتے ہیں۔ ۲۲ سال بعد وہ اپنی جنم بھومی کو واپس لوٹے۔ دلی میں شاہ ولی اللہی تحریک کا اسکول قائم کیا۔ ۲۱ اگست ۱۹۴۴ء کو موضع دین پور (مقام بہاولپور) میں اس دنیا سے رحلت کر گئے۔

مولانا منصور انصاری کو بھی ہندوستان آنے کی اجازت مل گئی تھی مگر آپ نے غلام ہندوستان میں قدم رکھنا پسند نہ کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا تھا کہ ہندوستان کے آزاد ہوتے ہی وہ مولانا محمد میاں منصور انصاری کو ہندوستان لائیں گے لیکن ہندوستان کی آزادی سے کچھ عرصہ قبل یعنی ۱۳ جنوری ۱۹۴۶ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔

شیخ الہند کی اسارت مالٹا اور جماعت کے افراد کے تتر بتر ہو جانے کی وجہ سے یہ تحریک ناکام ہوگئی۔ علمائے دیوبند کے لئے اس وقت صرف دو ہی راستے تھے۔ ایک یہ کہ وہ مسلط حکومت کے وفادار اور ہی خواہ ہو جائیں یا پھر گوشہ نشینی اختیار کریں۔

۱۹۱۹-۲۰ء میں مسلمانوں کی سیاست نے پھر پلٹا کھایا۔ خلافت تحریک نے ان میں ایک نئی روح پھونکی۔ علمائے دیوبند جو ہمیشہ انقلابی جدوجہد میں پیش پیش اور اپنے نصب العین میں انتہا پسند تھے، نے ایک بار پھر سیاسی میدان میں قدم رکھا۔

جمعیۃ العلماء ہند کے نام سے ایک جماعت قائم کی گئی اور غیر دیوبندی علماء کو بھی شریک کیا گیا۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی صدارت میں اس کا اجلاس امرتسر میں ہوا۔

حضرت شیخ الہند کی صحت اسارت مالٹا کے دنوں میں خراب ہوگئی تھی۔ ڈاکٹروں نے آرام کا مشورہ دیا تھا مولانا نے ان سب باتوں کا خیال نہ کیا اور سے جمعیۃ العلماء ہند کے دوسرے اجلاس منعقدہ ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء کی صدارت قبول فرمائی۔

۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو یہ مجاہد جلیل اس دار فانی سے عالم جاودانی کو کوچ کر گیا۔

دارالعلوم کے بانیوں میں سے سب ہی صاحب تصنیف گذرے ہیں، لیکن ان کا رنگ اور مسلک شروع شروع میں متکلمانہ۔ محدثانہ صوفیانہ فقیہانہ، مفسرانہ اور مناظرانہ رہا۔ شیخ الہند کے بعد تصانیف کے رنگ میں نمایاں تبدیلی آئی۔ تاریخ و تحقیق اور ادب و سیاست پر تالیفات و تصانیف کا سلسلہ جاری رہا۔ ہمیشہ برمحل اور بروقت تصانیف خود دارالعلوم کے احاطہ سے نکلتی رہیں۔

دارالعلوم نے اپنے سو سال کے عرصہ میں ۱۱۶۴ مصنفین پیدا کئے۔ جن میں ۲۷۶ اعلیٰ درجہ کے مصنفین اور ۱۰۸ اعلیٰ درجہ کے صحافی ہیں۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کی بذل المجہود شرح ابوداؤد۔
مولانا انور شاہ کشمیری کی فتح الباری شرح بخاری
مولانا شبیر احمد عثمانی کی فتح الملہم شرح مسلم

اپنے مسلک و مخصوص رنگ کی وہ تصانیف ہیں، جن کو ہندوستان سے باہر مصر و حجاز، عراق و یمن اور شام میں شہرت حاصل ہے۔

حضرت شیخ الہند کا ترجمہ قرآن مجید جس پر کہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے حواشی تحریر کئے ہیں، ہندو پاک میں اسی ترجمہ کو حکومت افغانستان نے فارسی زبان میں ترجمہ کرا کر اپنے انتظام و انصرام سے شائع کیا۔ ندوۃ المصنفین دہلی ایک معیاری ادارہ ہے جس نے اسلامی علوم و فنون تاریخ و تحقیق ادب و سیاست پر بہت سی تصنیفات ملک کے سامنے پیش کی ہیں۔ اسے ابنائے دارالعلوم ہی نے قائم کیا ہے یہ ادارہ مفید کام کر رہا ہے

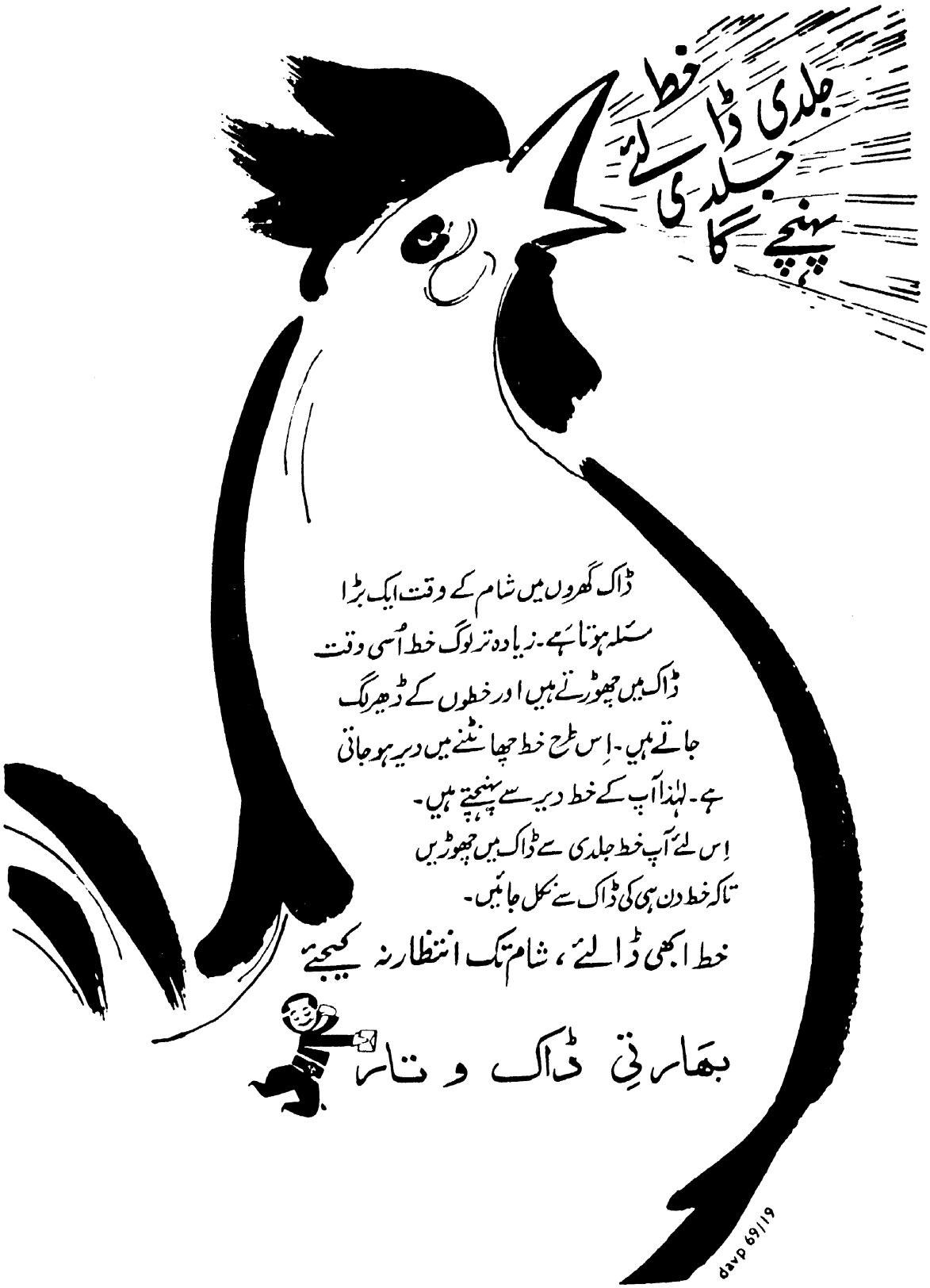
جلدی ڈالئے خط
جلدی پہنچے گا
ڈاک گھروں میں شام کے وقت ایک بڑا
مسئلہ ہوتا ہے۔ زیادہ تر لوگ خط اُسی وقت
ڈاک میں چھوڑتے ہیں اور خطوں کے ڈھیر لگ
جاتے ہیں۔ اِس طرح خط چھانٹنے میں دیر ہو جاتی
ہے۔ لہٰذا آپ کے خط دیر سے پہنچتے ہیں۔
اِس لئے آپ خط جلدی سے ڈاک میں چھوڑیں
تاکہ خط دن ہی کی ڈاک سے نکل جائیں۔
خط ابھی ڈالئے، شام تک انتظار نہ کیجئے
بھارتی ڈاک و تار
davp 69/19

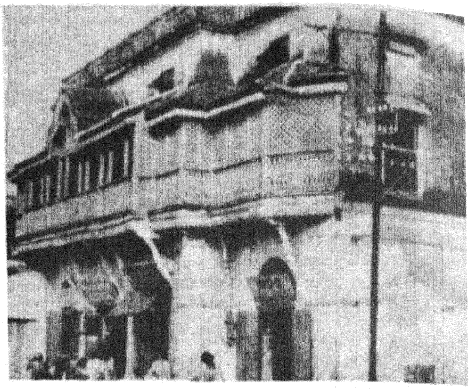

(۱) حیدرآباد کا مکان

تصاویر ۱، ۲، ۳، ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے شکریے کے ساتھ شائع کی جا رہی ہیں۔

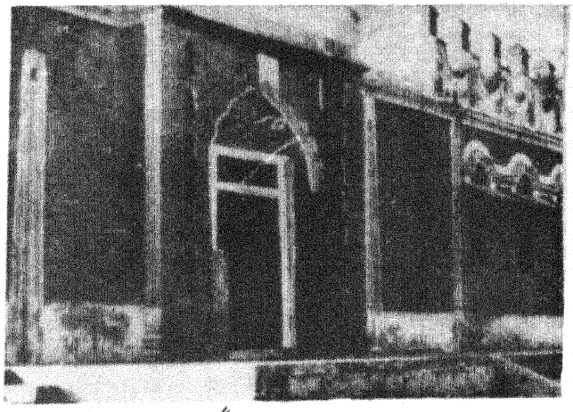

(۲) پتورہ قائم گنج کا مکان

ذاکر صاحب

کچھ جھلکیاں

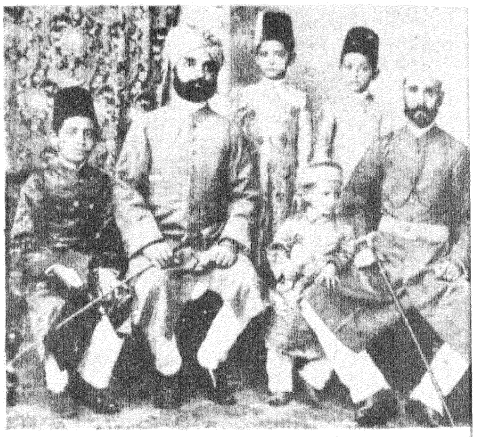

ایک فیملی گروپ : زاہد حسین خاں ، ذاکر حسین خاں
عابد حسین خاں ، فدا حسین خاں، عطا حسین خاں، مظفر حسین خاں
یوسف حسین خاں

شیخ الجامعہ کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکلنک کے ساتھ

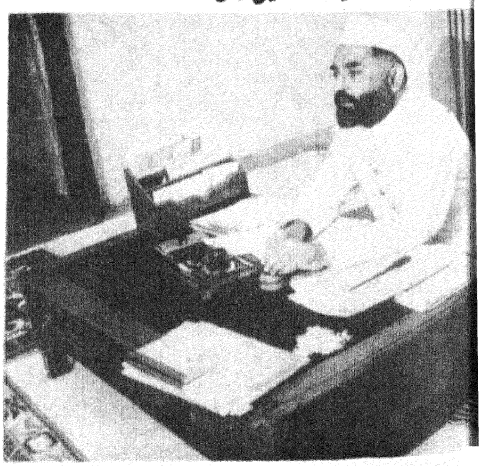

شیخ الجامعہ ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

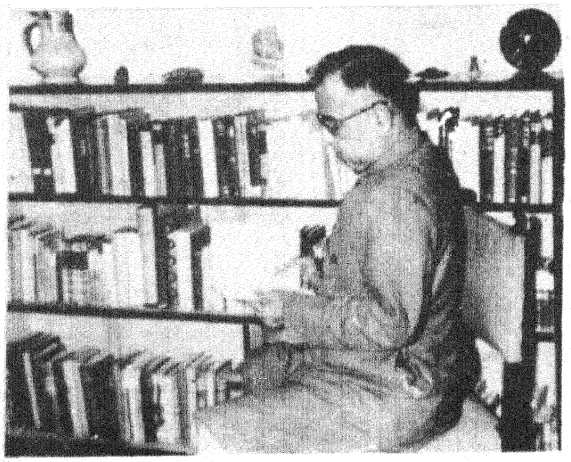

وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

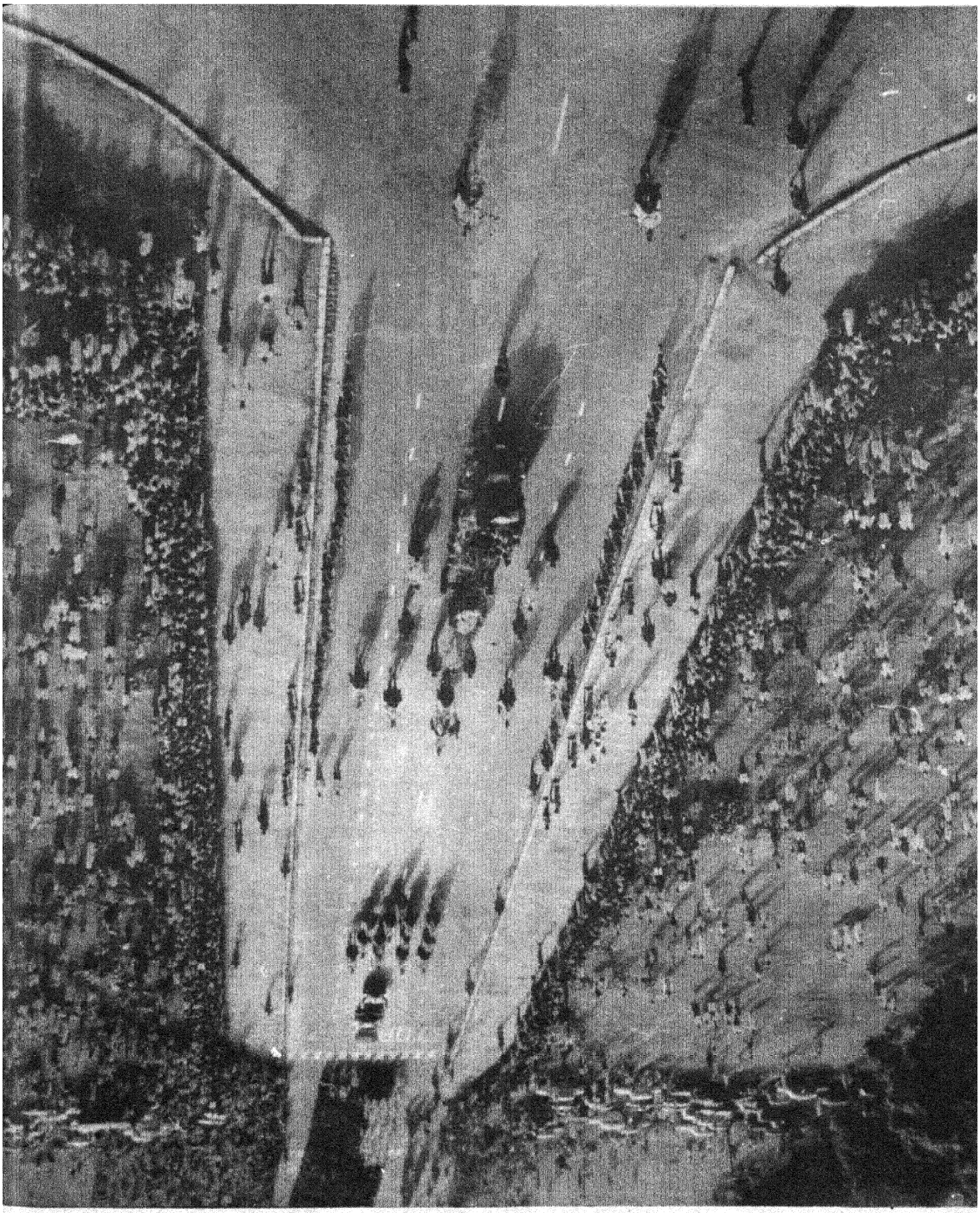

Vol. 27 No. 11 June 1969 AJKAL (Monthly)

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by the Asian Art Printers Private Ltd., D. B. Gupta Road, New Delhi.
Regd. No. D-509

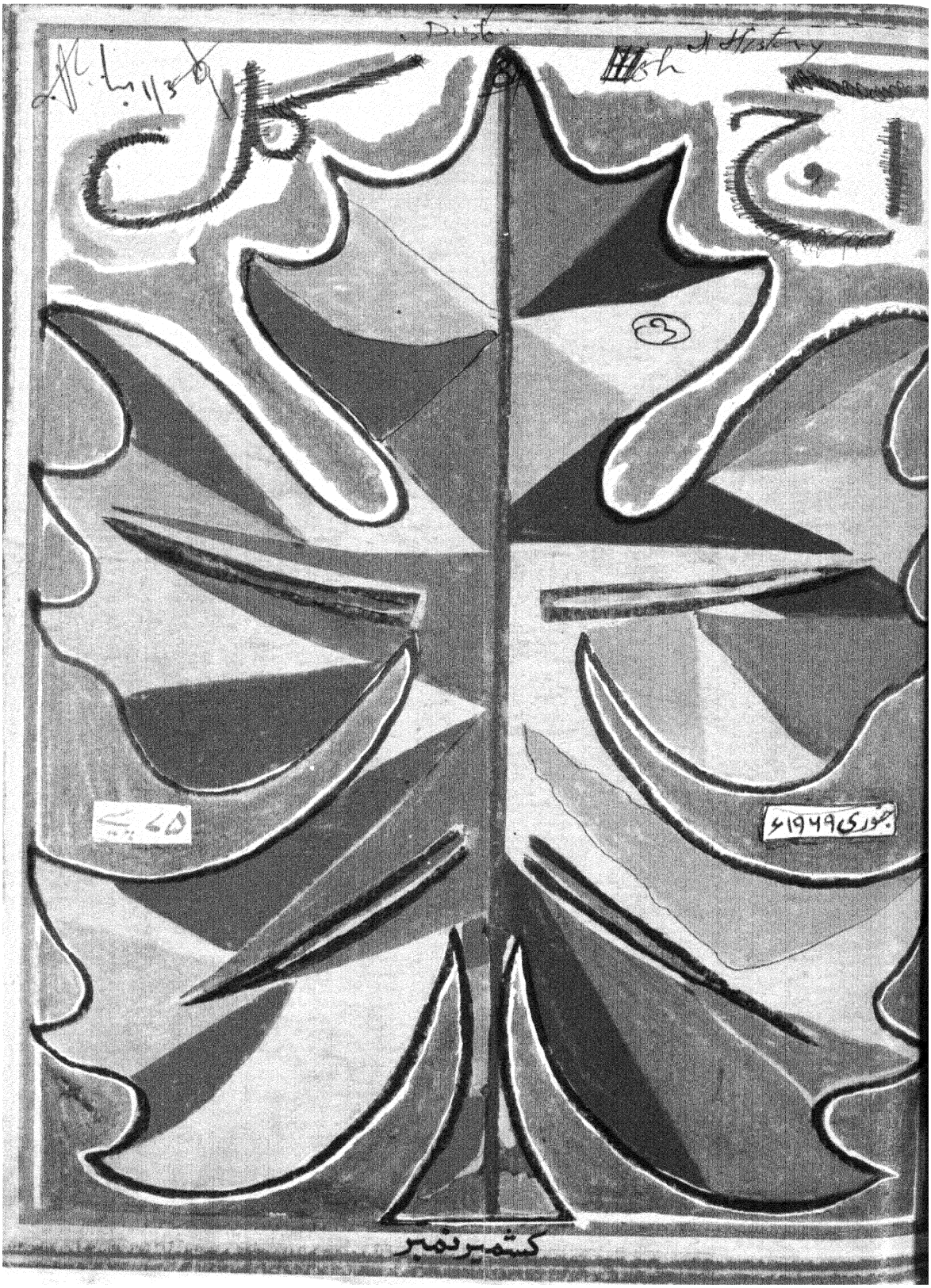
جنوری ۱۹۶۹ء
کشمیر نمبر

جموں و کشمیر کے شاعر اور ادیب

کیئر سنگھ مدھوکر

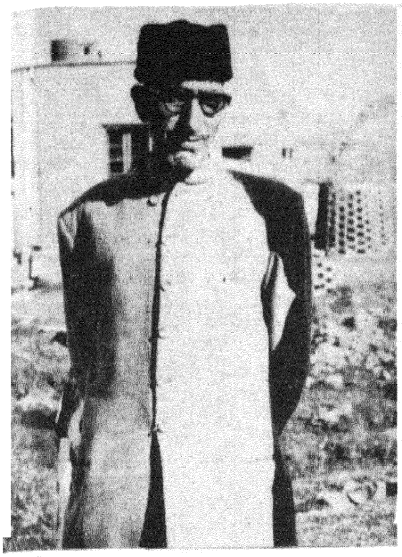

غلام رسول

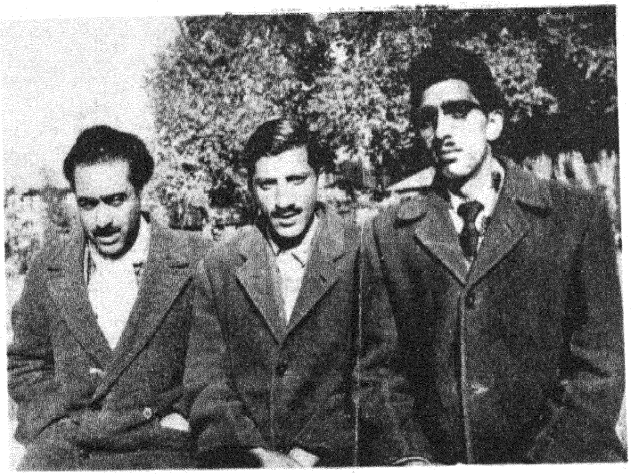

جتندر شرما

اُمیش کول

اُوپر دائیں سے بائیں:
رحمان راہی۔ بنسی نردوش۔ سنتوش

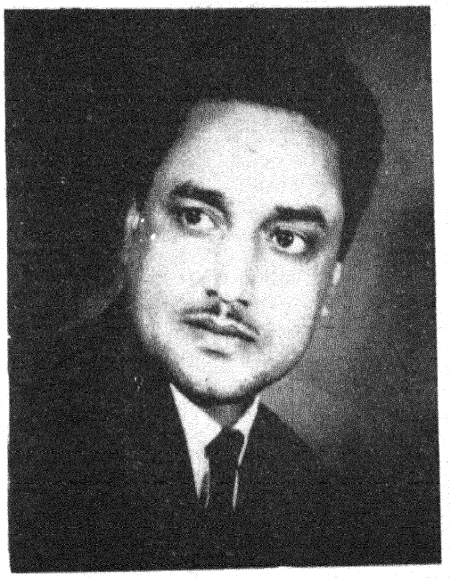

ترتیب

اُردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر

شہباز حسین

ملاحظات	ادارہ	۲
سازِ جمہور نظم	حفیظ بنارسی	۳
کشمیر کل اور آج	دینا ناتھ مست	۴
آئینہ (کشمیری افسانہ)	امین کامل	۱۲
اُردو شعر و ادب میں کشمیر کا حصہ	حامدی کاشمیری	۱۶
کشمیر کی ادبی سرگرمیاں اور مشاعرے	علی محمد لون	۱۹
کشمیر میں سیکولرازم کی روایت	جے۔ این گنہار	۲۲
کشمیر میں جدید آرٹ کی تحریک	موتی لال جیل خانی	۲۳
کشمیری لباس اور زیورات	محمد یٰسین	۲۸
کالا تیتر (ڈوگری افسانہ)	نریندر کھجوریہ	۳۵
کشمیری خواتین کی بیداری	محمودہ احمد علی شاہ	۴۰
کشمیر کے میلے اور تہوار	اختر محی الدین	
کشمیر کی دستکاریاں	فدا محمد حسنین	
میری گتاب تیری کتاب (ڈوگری نظم)	رام ناتھ شاستری	۵۰
کشمیری کھانے	پریم ناتھ در	۵۱

سرورق۔ عل: غلام رسول سنتوش

شمارہ ۶ جلد ۲۷

جنوری ۱۹۶۹ء

پوس ماگھ شک سمت ۱۸۹۰

شرح چندہ

سالانہ چندہ	ہندوستان میں	سات روپے
	پاکستان میں	سات روپے (پاک)
	دیگر ممالک سے	۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر
قیمت فی پرچہ	ہندوستان میں	۶۰ پیسے
	پاکستان میں	۶۰ پیسے (پاک)
	دیگر ممالک سے	۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

کشمیری شاعروں اور ادیبوں کی تصویریں جناب غلام رسول سنتوش کے شکریے کے ساتھ شائع کی جا رہی ہیں ــــــ

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر "آجکل" (اردو) پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مرتبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ملاحظات

۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو مہاتما گاندھی نے ہندوستان کے لئے "پورن سوراج" (مکمل آزادی) کا مطالبہ کیا تھا۔ سترہ سال بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو اُن کی یہ مانگ پوری ہوئی اور مُلک آزاد ہوا۔ آزادی سے پہلے ہم ۲۶ جنوری کو ہی "یوم آزادی" مناتے تھے مگر نئے دستور کے نفاذ کے بعد ہم اس تاریخ کو "یوم جمہوریہ" مناتے ہیں اور جمہوری طریق کار اور نظامِ زندگی میں اپنے یقین و اعتماد کا اظہار کرتے ہیں۔

ہمارے ملک کو دُنیا کے سب سے بڑے جمہوری ملک ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے طریق کار اور طرزِ عمل سے دُنیا کے سامنے ایک مثالی نمونہ پیش کریں تاکہ جن مُمالک میں جمہوری اداروں اور قدروں کو رواج نہیں دیا گیا ہے، وہاں جمہوریت کا اعتبار پیدا ہو اور عوام ہی صحیح معنوں میں اقتدارِ اعلیٰ کا سرچشمہ بنیں کیوں کہ امنِ عالم کی ضمانت صرف اسی طریقے سے ممکن ہے۔

سالِ نو کو خوش آمدید کہنے کے ساتھ ساتھ ہمیں شہنشاہ ایران اعلیٰحضرت رضا شاہ پہلوی اور شہبانو فرح کو بھی خوش آمدید کہنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ شہنشاہ اور شہبانو ۲۰ جنوری کو ہندوستان کے بارہ روزہ دورے پر تشریف لائے تھے۔

ہندوستان اور ایران کے تعلقات ڈھائی ہزار سال سے بھی پرانے ہیں اور دونوں مُمالک میں زمانہ قدیم سے نسلی، لسانی، مذہبی اور تہذیبی رشتے قائم ہیں۔ ایرانی آرٹ، ادب اور فنِ تعمیر نے ہندوستان پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ فارسی صدیوں تک ہندوستان کی سرکاری زبان رہی اور اب بھی ہندوستان میں لاکھوں افراد ایسے ہیں جو فارسی میں اچھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں میں ایم اے تک فارسی کی تعلیم دی جاتی ہے اور حکومتِ ہند مختلف طریقوں سے فارسی کی تحصیل میں امداد و اعانت کرتی ہے۔

شہنشاہ اور شہبانو کے حالیہ دَورے سے دونوں مُلکوں کے قدیم تعلقات نہ صرف استوار ہوئے ہیں بلکہ اُن کی دوستی اور خیر سگالی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا ہے۔ دونوں مُمالک تعلیم کے فروغ، مساوات سماجی بھلائی اور زرعی اصلاحات کے ذریعے ایک خوش حال فلاحی ریاست کے قیام کے لئے کوشاں ہیں اب تجارتی اور معاشی میدان میں ساتھ ساتھ کام کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے نئی نئی راہیں تلاش کی جارہی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس میدان میں آپسی تعاون کے ایسے خوشگوار نتائج برآمد ہوں گے جن سے ہند و ایران کی دوستی مزید استوار ہوگی اور دونوں ممالک قریب سے قریب تر آئیں گے۔

انسانی تاریخ میں ۱۹۶۸ء کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ۲۱ دسمبر کو تین امریکن خلابازوں نے چاند کے گرد چکر لگانے اور زمین پر واپس آنے کی جو مہم شروع کی تھی وہ ۲۷ دسمبر کو کامیابی کے ساتھ ختم ہوئی۔ اُن کی اس کامیابی نے چاند پر اُترنے کی انسانی کوششوں کو ممکن بنا دیا ہے اور اب وہ دن دور نہیں ہے جب ہم یہ سُن لیں گے کہ انسان چاند پر پہنچ گیا ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کا یہ کارنامہ نہ صرف حیرت انگیز ہے بلکہ بڑے دُور رس نتائج کا حامل ہے۔ دیگر باتوں کے علاوہ اس کامیابی سے انسانی ذہن کو اوہام سے آزاد ہونے اور سائنسی انداز نظر اپنانے میں بڑی مدد ملے گی۔

ادارہ آج کل، اپنے تمام قارئین اور علمی معاونین کو سالِ نو کی مبارکباد پیش کرتا ہے اور امید رکھتا ہے کہ وہ حسبِ سابق آج کل کی سرپرستی فرماتے رہیں گے۔

حفیظ بنارسی

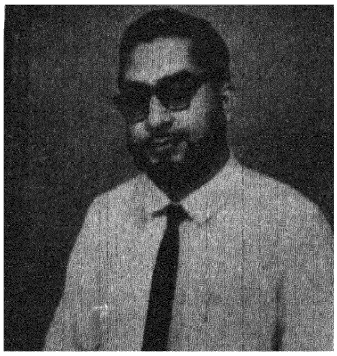

سازِ جمہور

سازِ جمہور پر رقص کرتے رہو
مثلِ پائے صنم گل کترتے رہو
روئے گیتی پہ ہنس کر بکھرتے رہو
اور زلفوں کی صورت سنورتے رہو
شمعِ ہستی کی لو تیز کرتے رہو

بے نقاب آئے گی لیلیٰ زندگی
رقص فرمائے گی ہر طرف چاندنی
چاک ہونے کو ہے پردۂ تیرگی
نور بن کر دلوں میں اترتے رہو
شمعِ ہستی کی لو تیز کرتے رہو

منتظر ہے زمانہ سحر کے لئے
روشنی چاہئے ہر نظر کے لئے
ڈوبتے جاؤ لعل و گہر کے لئے
اور موجوں کی مانند ابھرتے رہو
شمعِ ہستی کی لو تیز کرتے رہو

مسکراتے رہو غم کے دھاروں میں بھی
گل کھلاتے رہو خار زاروں میں بھی
جگمگاتے رہو چاند تاروں میں بھی
اور دھرتی کی بھی مانگ بھرتے رہو
شمعِ ہستی کی لو تیز کرتے رہو

دور کرنا ہے تم کو زمانے کا غم
ہونے پائے نہ رفتارِ تعمیر کم
کوئے بت خانہ ہو یا سوادِ حرم
بے نیازانہ سب سے گزرتے رہو
شمعِ ہستی کی لو تیز کرتے رہو

سب کے ہاتھوں میں ہوگا ایاغِ حیات
مل ہی جائے گا سب کو سراغِ حیات
باغِ جنت بنے گا یہ باغِ حیات
خار زاروں سے ہنس کر گزرتے رہو
شمعِ ہستی کی لو تیز کرتے رہو

آخرش رنگ لایا شہیدوں کا خوں
وہ کرن پھوٹی ٹوٹا وہ شب کا فسوں
وہ درخشاں ہوا آفتابِ سکوں
روشنی دامنِ دل میں بھرتے رہو
شمعِ ہستی کی لو تیز کرتے رہو

دینا ناتھ مست

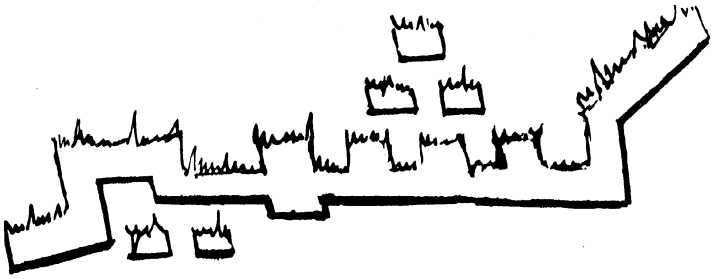

کل اور آج

جموں پہونچتے ہی محسوس ہوا کہ ریاست میں ایک نئے دَور کا آغاز ہو چکا ہے۔ پریڈ گراؤنڈ جہاں ہم کبھی فٹ بال، ہاکی، کرکٹ اور کبڈی کھیلا کرتے تھے اب بسوں کا اڈہ بن چکا ہے۔ کچھ بسوں سے مسافر اُتر رہے تھے اور کچھ بس میں چڑھ رہے تھے۔ ٹرکوں سے ایک طرف سے مال اتر رہا ہے تو دوسری طرف لد رہا ہے۔ مسافر، مزدور، لوگ، مرد عورتیں پھل اور کھانے پینے کی چیزیں بیچنے والوں کی لگاتار آوازیں، شور و غل، ہل چل کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔ ماضی کا وہ پُرسکون جموں کہاں گیا؟

یا تو یہاں کی ہر شئے ہر صورت جانی پہچانی تھی اور یا اب سب مکان بھی نئے اور مکیں بھی نئے۔ وہ صورتیں وہ گلی کوچے وہ آدھے کچے آدھے پکے کوٹھے اور مکان نئے بن گئے ہیں۔ عورتوں کا وہ ڈوگرہ کرتہ اور ستھن (تنگ پاجامہ) وہ کمانی دار کوٹ اور چوڑی دار پاجامے، رنگ برنگی دستاریں اور ڈوگری لباس سبھی تو بدل گئے ہیں۔

پرانی منڈی (جہاں راج گدّی پر بیٹھنے کا تاریخی لیکن چھوٹا سا محل ہے) اب بازار میں بدل گئی ہے اور ساتھ ہی وہ ہاتھی تھان، مندروں کا شہر جموں (فیل خانہ) سبزی منڈی بن گیا ہے۔ جہاں کوہ پیکر ہاتھی جنہیں دیکھنے کے لئے روز چھوٹے بڑے لوگوں کا میلہ لگا رہتا تھا، راجوں مہاراجوں کے ساتھ ہی رخصت ہو گئے ہیں۔

ویرانوں اور جنگلوں میں بھی بستیاں او محلے کھڑے ہو گئے ہیں ریشم

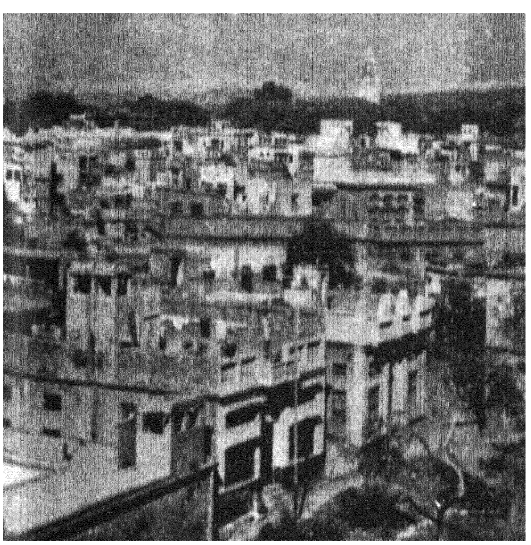

کا کارخانہ تو پہلے سے قائم تھا لیکن اب کئی اور کارخانے اور صنعتیں بھی وجود میں آگئی ہیں۔ سرینگر جاتے ہوئے راستے میں اودھم پور، جنی ٹاپ، کد، پٹنی ٹاپ، بٹوت، رام بن اور بانہال میں بھی نیا رنگ و روپ نظر آیا۔ ہر جگہ چہل پہل، مسافروں اور مقامی لوگوں کے ہجوم، گاہکوں سے بھری دوکانیں دیکھیں۔ جدید ڈھنگ کے ریسٹ ہاؤس ہر جگہ موجود ہیں۔

سارے سفر میں دائیں بائیں فلک بوس پہاڑ گھنے سرسبز پُرشکوہ جنگل عجیب بہار دکھا رہے تھے۔ بس ایک یہی نہ بدلے تھے۔ چناب (چندر بھاگا) کا سبز ہرا پانی، کہساروں کے درمیان پیچ و خم کھاتا بہہ رہا تھا۔ اس میں ہزاروں شہتیر بہہ رہے تھے جو ریاستی جنگلاتی دولت کے مظہر تھے۔ یہی شہتیر دہلی اور دوسرے شہروں میں عمارتی لکڑی اور ریلوں کی پٹریوں کے کام آتے ہیں۔

خوشگوار موسم، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ دہلی کی جھلستی ہوئی لو کے بعد کتنی فرحت بخش معلوم ہوتی ہے۔ جان میں جان سی آجاتی ہے۔ طویل سفر کے بعد آخر بانہال پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوئی تو چند میلوں کے بعد دورِ جدید کے فرہادوں اور انجینیروں کا وہ معجزہ بھی دیکھا جسے "جواہر ٹنل" کہتے ہیں۔

سرینگر کا ایک بازار

کہتے ہیں ہند سرکار نے کئی کروڑ روپے کی لاگت سے یہ دوہری سرنگ تعمیر کی ہے۔ کئی کروڑ میں بھی یہ سستی ہے اس سے تیس بتیس میل کا پہاڑی فاصلہ کم ہوگیا ہے اور اب برفباری اور جھاڑوں میں بھی کشمیر کا راستہ بند نہیں ہوتا، جس سے کاروبار اور آمد و رفت کا سلسلہ سردی و گرمی میں برابر جاری رہتا ہے۔ ریاست کی معیشت اور تجارت و صناعت کے لئے یہ ایک بے بہا برکت ثابت ہو رہی ہے ــــ

سرنگ سے پار ہوتے ہی سب سے پہلے ویری ناگ پر نظر پڑی۔

ویری ناگ: اسے دیکھتے ہی ماضی کی باتیں ایک فلم کی طرح آنکھوں میں گھوم گئیں میری ننھیال ویری ناگ! جس سے میرا روحانی اور جسمانی رشتہ ہے۔ . . . . .

مسافروں نے ملے کیا کو لگے ہاتھوں ویری ناگ کی ایک جھلک بھی دیکھنے چلیں۔ جب ویری ناگ کے قدیمی مقدس اور تاریخی چشمے پر پہنچے تو یہ دیکھ کر حیرت کی حد نہ رہی کہ اس کے اردگرد جہانگیر کی بنائی ہوئی خستہ بارہ دری اور دیواریں دوبارہ بالکل مغل دور کی جیسی اینٹوں اور چونے سرخی سے بنائی گئی ہیں۔ اوپر کی منزلیں تو سو دو سو سال پہلے جل چکی تھیں لیکن باقی حصہ خستہ ہو چکا تھا۔ باغ فوارے اور آبجو دیکھ کر وہاں سے نکلنے کو دل نہ چاہا۔ کچھ تو ماضی کی یاد، کچھ اس باغ اور چشمے پر گذارے ہوئے لڑکپن کے دن یاد آرہے تھے۔ غم و انبساط کا عجیب ملا جلا احساس ہو رہا تھا۔

بازار میں پہونچے تو کچھ پرانے واقف کاروں نے بتایا کہ اب لوگ اچھے حالوں میں ہیں۔ اب یہاں کے کسان سردیوں میں محنت مزدوری کے لئے پہلے کی طرح کشمیر سے باہر نہیں جاتے۔ جب گھر ہی میں آمدنی کے وسیلے مل گئے ہیں تو باہر کیوں جائیں؟ وقت تنگ تھا۔ سرینگر پہنچنے کی بے تابی تھی۔

سرینگر میں داخل ہوئے تو ہماری گاڑیاں سیدھی امیرا کدل جانے کے بجائے پولو گراؤنڈ کے پاس نئی عمارتوں کے ایک چوک میں رکیں۔ یہ "ٹورسٹ سنٹر" تھا۔ بڑے سلیقے کی جگہ۔ دو منزلہ عمارت، لوگوں کے ٹھہرنے اور کھانے پینے کے لئے ریسٹوران بھی موجود تھا۔ میرے لئے یہ ایک نئی چیز تھی۔ کیوں کہ پہلے ایسے مرکز کا انتظام نہیں تھا۔

سنٹر سے باہر نکلے تو تانگوں اور ٹیکسیوں کی لمبی قطاریں دیکھیں۔ یہ تانگے تو سرینگر میں ہمارے ہوش سنبھالنے کے وقت ہی سے چل رہے ہیں۔ لیکن اتنی بڑی تعداد میں ٹیکسیاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔

آخر کار ایک تانگہ لیا اور امیرا کدل پہنچے تو یہاں کا نقشہ بھی بدلا ہوا نظر آیا۔ اونچی اونچی نئی عمارتیں کسی میں ہوٹل کسی میں بینک، کسی میں دفتر کسی میں سیاح۔ مائسیمہ میں پرانے ایک بازار کے بدلے تین چار بازار بن چکے ہیں۔ دکانیں ہی دکانیں۔ ہر دکان مال سے بھری ہوئی، گاہکوں کی کثرت۔ آگے بڑھے تو زوماں اور تاریخی امیرا کدل سے (کدل کشمیری میں پل کو کہتے ہیں) سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ایک سائیل نظر آیا۔ تانگے والے نے بتایا اسے کشمیر کے ایک منصف

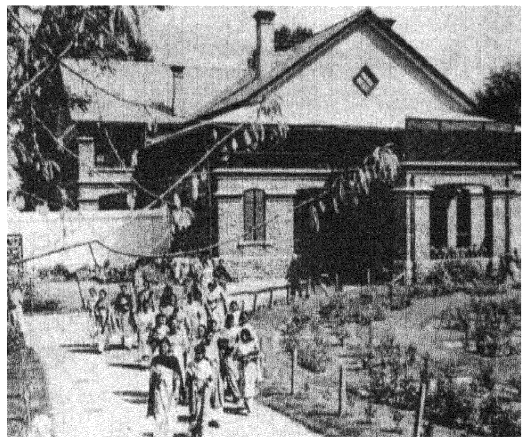

گرلس ہائر سکنڈری اسکول سرینگر

مزاج مسلمان سلطان بڈشاہ کے نام پر "بڈشاہ کدل" کہا جاتا ہے لیکن اس نئے پل کے باوجود امیرا کدل پر بھیڑ کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ ایسا محسوس ہوا کہ امیرا کدل کے آس پاس بھی ایک پل بننا چاہئے۔ سرینگر کو کسی زمانے میں سات پلوں والا شہر کہا جاتا تھا اب وہ تاریخی سات پل تو پل بن چکے ہیں ایک اور پل فورسٹ سنٹر سے دُور کلب کے پاس بھی بن چکا ہے قیام گاہ تک پہونچتے پہونچتے جدھر بھی نظر گئی بہت کچھ بدلا ہوا دیکھا۔

اپنے قیام کے دوران میں شہر کے اکناف و اطراف کا رُخ کیا تو نئی کیفیت نظر آئی۔ نئی کالونیاں بن رہی ہیں۔ جہاں بے کار کھائیاں اور خندقیں تھیں وہاں اب خوبصورت مکان کھڑے ہیں۔ کئی نئی سڑکیں بن چکی ہیں آنے جانے والوں بھیڑ کو گلیوں میں بھی موٹر کاریں چل رہی ہیں۔ دکانوں، بازاروں میں ہر طرح کا مال بھرا ہوا ہے۔ جدھر سے بھی گذر ہوتا ریڈیو کی سُریلی آوازیں اور گانے سنائی دیتے۔ کئی لوگوں کو کندھوں پر ٹرانسسٹر ریڈیو اور کیمرے تک لٹکائے ہوئے دیکھا۔ مردوں اور عورتوں کے لباس اور دوسرے پہناوے بھی بدلے ہوئے پائے۔ ٹیڈی لڑکے اور لڑکیاں بھی نظر آئیں۔ صاف ظاہر تھا کہ لوگ خوش حال اور آسودہ ہو گئے ہیں اور کاروبار، کھیتی باڑی اور صنعت و حرفت میں بھاری ترقی ہوئی ہے۔

شہر کے بعض حصے اگرچہ اب بھی گندے اور ناصاف ہیں لیکن لوگوں میں صحت و صفائی کا احساس بڑھا ہوا پایا۔

.... شاید یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ ریاست کا بیشتر حصہ پہاڑی جنگلی اور غیر آباد ہے۔ زیادہ تر لوگوں کا پیشہ کھیتی باڑی ہے کوئی ستر پچھتر فی صد لوگ یہی دھندا کرتے ہیں۔ باقی لوگ سرکاری اور نجی ملازمتیں کرتے ہیں تجارت اور دکانداری، محنت مزدوری، ریشم اور قالین بافی گبہ دوزی، چوب کاری اور دستکاریاں بھی لوگوں کی روزی کا سامان مہیا کرتی ہیں ——— دستکاریاں تو کشمیریوں کا خاص فن ہیں۔

اخروٹ کی لکڑی اور کاغذی سامانِ آرائش جسے پیپر ماشی کہتے ہیں، ایسی چیزیں ہیں کہ جن سے بے جان ماحول میں جان پڑ جاتی ہے لکڑی پر وہ مہین کندہ کاری کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ پیپر ماشی کی چیزوں پر وہ گلکاری اور نقش و نگار کہ جیسے دُنیا کے سب پھول اور سب طرح کے رنگ انہی کی نقالی ہیں۔ اور قالین بافی کیا کہنا ——— انگلیوں کی کرامات ہے۔ قالین ہے کہ کھلا ہوا گلشن۔ جیسے نشاط اور شالامار کے تختہ چمن، حیرت انگیز فنکاری ہے یہی وجہ ہے کہ دُنیا بھر کے لوگ کشمیری قالینوں کے عاشق ہیں اور کشمیری مصنوعات کے دلدادہ ہیں۔

مختلف علاقوں و شہر کے اکناف و اطراف اور صحت افزا مقامات اور دیہی علاقوں وغیرہ میں گھومنے پھرنے اور سیر و سیاحت سے اس نتیجے پر پہنچا کہ لوگ زمانے کی رفتار سے باخبر ہیں اور اپنے پرانے جمود و بے عملی کہالت و جہالت کو خیرباد کہہ رہے ہیں۔ ایک عام بیداری پیدا ہو گئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔

کشمیر پھلوں کا دیس

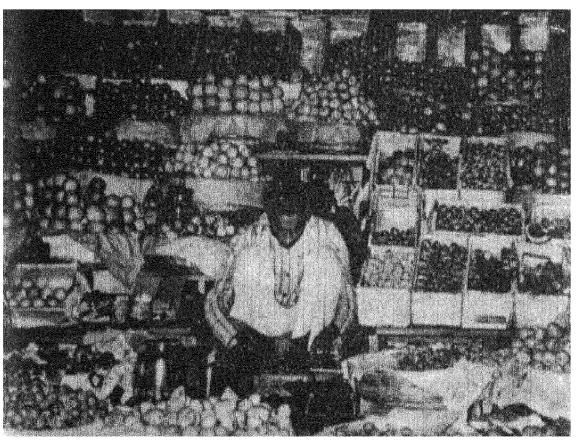

شاید یہی وجہ ہے کہ جدھر بھی جانے کا اتفاق ہوا لوگوں کو نئے کاموں اور نئی سرگرمیوں میں مصروف پایا۔ قدرت نے ویسے ہی ریاست کو ہر لحاظ سے مالا مال بنایا ہے۔ زندگی کی ہر ضرورت دستیاب ہے لیکن اس کی کھوج اور تلاش اور استفادے کے ذرائع کے علم اور استعمال کے طریقوں کا جاننا ضروری ہے۔ نیلم۔ یاقوت، جست، تانبا کوئلہ۔ پیٹرول۔ بوریکس اور دوسری کتنی ہی بیش قیمت معدنیات یہاں موجود ہیں۔ صحت بخش آب وہوا، زرخیز زمینیں، چراگاہیں، میٹھے صاف شفاف ٹھنڈے چشمے، دریا، نہریں، ندیاں جھیلیں کہ بقول برج نرائن چکبست ؎

ذرّہ ذرّہ ہے میرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

قدرتی وسائل کی اس قدر فراوانی کے باوجود اناج باہر سے منگانا ہی پڑتا ہے۔ ایک تو آبادی بھی برابر بڑھ رہی ہے اور پھر سیاحوں کی آمد و رفت بھی بہت رہتی ہے۔ اُن کی ضروریات بھی تو پوری ہونی چاہئیں۔

شاید اناج کی قلت کے احساس ہی نے عام کسانوں کو یہ تحریک دی ہے کہ کھیتی باڑی اور اناج کی پیداوار بڑھانے کے لئے جدید طریقے اختیار کریں۔ اب ان میں ایک نیا جوش و خروش پایا جانے لگا ہے۔ اب کسان کشاورزی کے نئے آلات، نئی کیمیادی کھادوں اور نئے قسم کے بہتر بیجوں اور آبپاشی کے لئے نل کنوؤں (جہاں نہریں یا پانی کی قلت ہے) سے کام لے رہے ہیں۔

خوش حال کسان — لہلہاتی فصلیں

کشمیر کی دریافت نو کے درمیان میں نے متعدد مقامات پر دیکھا کہ سرکاری حکام کسانوں میں کیمیادی کھاد، کیڑے مار دوائیاں بانٹ رہے ہیں۔ دیہاتیوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ پتہ چلا کہ دس گیارہ لاکھ ٹن کیمیادی کھاد ریاستی کسانوں کو مہیا کی گئی ہے۔

کسانوں سے بات چیت ہوئی تو معلوم ہوا کہ زرعی پیداوار بڑھانے کے لئے حکومت اور عوام نے ایک نیا ہنگامی پروگرام شروع کیا ہے جو ۱۹۶۱ء سے چالو ہے۔ چنانچہ اب تک چودہ پندرہ لاکھ ٹن نئے بیج بانٹے گئے ہیں۔ بے کار اور بنجر زمینوں میں بھی کاشت کی جا رہی ہے۔

ایک دو انجینیروں سے گفتگو اور استفسار کے دوران میں بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ معلوم ہوا ریاست میں آبپاشی کا ایک ہمہ گیر پروگرام عمل میں آرہا ہے اور سیلابوں سے فصلوں اور جائیدادوں کو جو نقصان پہنچتا ہے، اس کا سدباب بھی ہو رہا ہے۔ چناں چہ پرانی نہروں، ندیوں وغیرہ کی مرمت اور انھیں قابلِ استعمال بنانے کے لئے کافی روپے خرچ کئے گئے ہیں۔ اور نئے کنوؤں، پانی کے پمپوں۔ نل کنوؤں، رہٹوں۔ تالابوں پانی کے ذخیروں اور چھوٹے موٹے بندوں سے آبپاشی کا بندوبست کیا گیا ہے۔ ریاست میں اب انجینیروں اور ماہروں، مستریوں اور دوسرے متعلقہ لوگوں کی کوئی کمی نہیں۔ اب تو انجینیری کی تعلیم کا بھی ریاست ہی میں انتظام ہے۔ بلکہ ہندوستان سے بھی طلبا، یہاں کے انجینیری کالج میں تعلیم پانے آتے ہیں۔

انجینیر دوستوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سیلابوں پر قابو پانے کے لئے لاکھوں روپے کے خرچ سے متبادل نہریں کھودی گئی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بارہ مولہ میں ۳۶ یا ۳۷ لاکھ روپے کی لاگت سے ایک ڈرینجنگ بوٹ کے ذریعے دستاد (جہلم) کی کھدائی ہو رہی ہے تاکہ دریا کو گہرا بنایا جائے تاکہ سیلابی پانی بندوں پر سے نہ گزرنے پائے۔ خطرے کی ہر جگہ پر دریا اور ندی نالوں کے کنارے پشتوں اور بندوں سے اونچے کئے گئے ہیں۔ یہ کام ابھی جاری ہے۔ ایسے ہی اقدامات کا نتیجہ ہے کہ اب ان علاقوں میں بھی فصلیں بوئی جانے لگی ہیں جہاں اُن کی کوئی آس نہیں تھی۔

ساری ریاست میں آج جو یہ خوشحالی نظر آتی ہے کہ وہ صرف زرعی ترقی کی وجہ سے نہیں ہے۔ صنعتوں اور فیکٹریوں اور دوسرے دھندوں میں بھی قرضوں سے امداد دی جاتی ہے اور کوآپریٹو بینک ہی نہیں دوسرے بینک بھی قرضے دیتے ہیں۔ ان بینکوں کی تعداد اب بیس

بائیس سے اُوپر ہے یہ سب بڑے بڑے بینک ہیں ایک اندازے کے مطابق اب تک لوگوں کو چھ سات کروڑ روپیہ قرض پر دیا گیا ہے ——— سب حلقوں میں خواہ وہ سرکاری ہیں یا غیر سرکاری یہ بھی طرح سمجھا جا رہا ہے کہ کسان اور صنعت کار، کاریگر اور صنّاع کی امداد اور لوگوں کے لئے روزگار کے نئے نئے وسیلے دریافت کرنے اور کارخانوں کے قیام کے بغیر حالات سُدھر نہیں سکتے۔ ریاست کی آمدنی میں زراعت کا حصہ ۳۰ فی صد سے بھی کم ہے اس لئے اس میں اضافے کا مطلب ریاست کی آمدنی میں اضافے کے ساتھ ساتھ کسانوں اور دیہی لوگوں کی خوش حالی بھی ہے

. . . کچھ فاصلے پر سیبوں کا ایک باغ نظر آیا۔ ہر پیڑ سرخ و سفید سیبوں سے لدا ہوا تھا۔ قدرت نے انسان کے لئے کیا کیا نعمتیں مہیا کر رکھی ہیں۔ سیب واقعی جنت کا پھل ہے اور کشمیر بھی تو جنت ہی ہے۔ تازہ تر اور سُرخ تر، شیریں تر اور فرحت بخش۔ ایک سیب ہی پر کیا منحصر ہے: جموں و کشمیر سے بہتر اور لذیذ تر پھل تو ہندوستان بھر میں اور کہیں نہیں ملتے۔

سیب خریدنے کے خیال سے باغ میں گئے۔ ایک طرف تو ایک خیمہ لگا ہوا تھا۔ کچھ لوگ پیٹیوں میں سیب بھر رہے تھے، پوچھنے پر پتہ چلا کہ

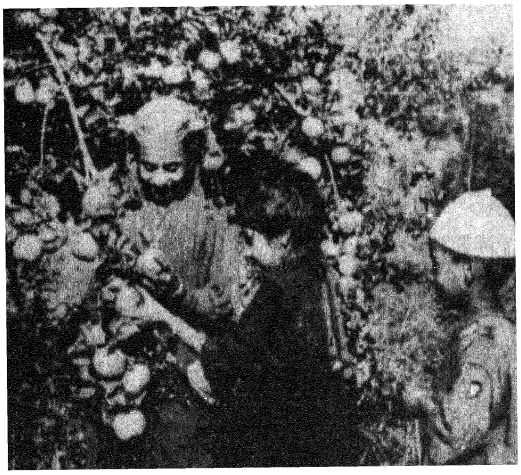

سیبوں سے لدا ایک باغ

کہ یہ سب مال ملک کی دوسری پھل منڈیوں کو بھیجا جائے گا۔ اتنے میں دو تین اصحاب ایک جیپ میں سوار آ پہنچے۔ اُن میں سے ایک صاحب واقف نکل آئے کبھی ہم مکتب ہوا کرتے تھے۔ کافی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں ضمناً کشمیر میں زراعت اور باغات کا بھی ذکر آ گیا۔ انھوں نے فروٹ انڈسٹری" کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ کہنے لگے کہ ابھی چند برس پہلے تک پھلوں کے باغات کا کل رقبہ صرف اکتیس بتیس ہزار ایکڑ تھا اور اب تو دوڈھائی لاکھ ایکڑ سے بھی زیادہ ہے۔ باغوں کے مالکوں کو اس صنعت یا تجارت کو فروغ دینے کے لئے حکومت نے اب تک تقریباً چودہ پندرہ لاکھ روپیہ قرضے کے طور پر دیا ہے۔ پھلوں اور پیڑوں کو کیڑے لگ جاتے تھے۔ اب کیڑے مار دوائیاں استعمال ہوتی ہیں اور ہمارے باغ اور پھل "بیمار" نہیں ہونے پاتے۔ ابھی تو مزید ۲ لاکھ ایکڑ میں نئے باغ لگانے کا پروگرام ہے جو آئندہ ایک دو برسوں میں پورا ہو جائے گا۔ پھلوں کی تجارت بڑھ گئی ہے۔ پچھلے سال بھر میں کوئی ڈیڑھ لاکھ ٹن پھل برآمد کیا گیا۔ سیب، بادام، اخروٹ، ناشپاتی، خوبانی، گلاس (چیری) آڑو۔ آلو بخارا، مربّے وغیرہ باہر بھیجے جاتے ہیں۔ یہ باغات صرف کشمیر کی وادی ہی میں نہیں بلکہ جموں، بھدرواہ، لداخ اور دوسرے مقامات پر لگائے

ماہر دستکار — اعلیٰ کاریگری

جارہے ہیں اور پرانے باغ محفوظ کئے گئے ہیں اگر سب کچھ ٹھیک رہا تو چند برسوں میں پھلوں کی پیداوار نصف کروڑ ٹن تک پہنچ جائے گی

ریاست کا سبز سونا، ریاست کے جنگل، ریاست کی شان ہی نہیں بلکہ ریاست کا خزانہ ہیں۔ کچھ برس پہلے جہاں صرف نو دس لاکھ روپے کی لکڑی برآمد ہوتی تھی وہاں اب پچھلے سال میں ۹ کروڑ روپے سے بھی زیادہ کی لکڑی باہر بھیجی گئی۔ پھر یہ کئی صنعتوں کا سبب بھی تو بنے ہیں۔ یہاں کھیل کا سامان عدیا سلائیاں، فرنیچر اور میسوں چیزیں بن رہی ہیں۔

خیال آیا کہ اپنے قصبے کو بھی دیکھتے چلیں۔ راستے ہی میں پڑتا ہے۔ وہاں پہنچے تو جگہ پہچانی نہ جاسکی۔ نقشہ بدلا ہوا تھا۔ ابھی ہم سواری سے اترے ہی تھے کہ لڑکوں کا ایک لشکر سا راستے میں حائل ہوگیا۔ کتابیں اور بستے اٹھائے ہنسی مذاق اور اچھل کود کرتے ہوئے پاس کی عمارت میں داخل ہو رہے تھے۔ اتنے طلبا رے ہمارے لڑکپن میں تو اس اسکول میں ساٹھ، ستر لڑکے ہی تھے۔ تعلیم بہت پھیل گئی ہے۔ چند لمحوں کے بعد لڑکیوں کا ایک ریلا بھی بستے لٹکائے نظر آیا۔ اپنے لڑکپن کی تصویر سامنے آگئی۔ مٹی کا دیا جلا کر راتوں کو پڑھا کرتے تھے۔ سوچتے تھے کہ سرنگر میں تو بجلی ہے کیا کبھی ہمارے گھروں میں بھی بجلی آئے گی۔ مٹی کا دیا بھی کیا عجیب چیز تھا۔ ایک عجیب چیز۔ پروانے پتنگے جان نچھاور کرتے تھے۔ اس سے دھواں تو

بجلی گھر۔ ترقی اور خوشحالی کا ضامن

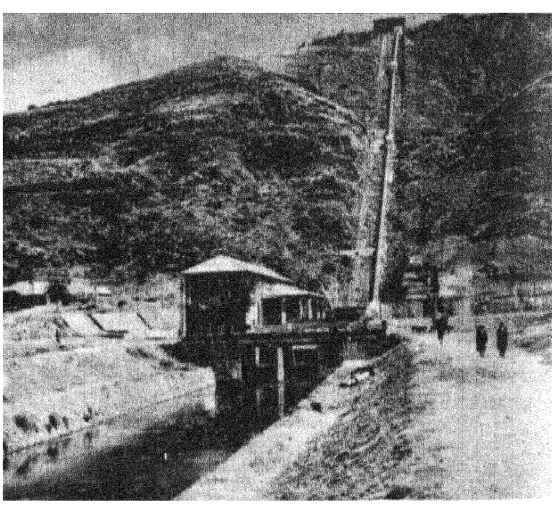

ہوتا تھا۔ روشنی بھی مدھم ہوتی تھی اور ذرا سے جھونکے سے بجھ بھی جاتا تھا لیکن اب تو یہاں بجلی کے لیمپ ہیں۔ ہوا کے جھونکوں یا پھونکوں سے یہ چراغ بجھ نہیں سکتے۔ بجلی کے چراغ تلے اندھیرا بھی نہیں ہوتا۔ "چراغ تلے اندھیرا" والی ضرب المثل اب بے وقت ہو چکی ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ بجلی آنے سے اب یہاں سینما ہال بھی کھل چکا ہے اور کتنے ہی اسکول اور دوسرے تربیتی ادارے قائم ہیں۔ ہسپتال بھی اب وہ پرانا ہسپتال نہیں۔ ہم نے پوچھا یہاں پہلے گئے اور لکڑی کا سامان بہت بنا کرتا تھا اب کیا حال ہے؟ تو جواب ملا اب تو باقاعدہ کارخانے چل رہے ہیں۔ قصبہ اب شہر بن گیا تھا۔ بہت جی چاہا کہ اپنے لڑکپن کے اسکول کے اندر جائیں ہمارے وقت میں تو یہ ایک مڈل اسکول تھا۔ اب کالج بن گیا ہے۔ وقت تنگ تھا تاہم کوئی نامعلوم کشش اندر لے گئی۔ پرنسپل صاحب سے تعارف ہوا۔ تو وہ نام سے جان گئے۔ بڑی مہربانی سے پیش آئے۔ سارا کالج دیکھا۔ وہ کمرے بھی دیکھے جن میں کبھی ہم پڑھا کرتے تھے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ابھی کل ہی کی تو بات ہے۔ وقت کتنی جلدی گذر جاتا ہے۔ دل اداس سا ہوگیا۔ نہ جانے اب وہ پرانے سنگی ساتھی کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں؟ پرنسپل صاحب سے ہم نے ریاست میں تعلیم کی ترقی کے بارے میں پوچھا۔ تو کہنے لگے "یہ تو آپ جانتے ہی ہیں اب ہماری اپنی یونیورسٹی ہے۔ اپنے کالج ہیں۔ نہ صرف آرٹس کے بلکہ انجینئری اور ڈاکٹری اور زراعت کے کالج بھی ہیں۔ ریاست اب ہر طرح کی تعلیم کے فروغ پر بھی بڑی توجہ دے رہی ہے۔ جہاں دس پندرہ برس پہلے تعلیم پر صرف ۳۷ یا ۳۸ لاکھ روپے سالانہ خرچ ہوتے تھے۔ اب تو یہ رقم پانچ سے چھ کروڑ روپے تک پہنچ گئی ہے۔ اور پھر ایم اے تک تعلیم بھی تو مفت دی جاتی ہے۔

وہ دن گئے جب ریاست میں صرف ۱۲ سو پرائمری اسکول تھے اب تو ۵ ہزار کے لگ بھگ ہیں۔ مڈل اسکول (جیسا کہ یہ اسکول بھی آپ کی طالب علمی کے زمانے میں تھا) پندرہ برس پہلے صرف ۱۵۲ کے قریب تھے اب تو ۱۲ سو سے اوپر ہیں۔ اسی طرح پہلے کے ۵۲ ہائی اسکول اب ۴ سو سے زیادہ ہوگئے ہیں۔ پہلے سرکاری اور پرائیوٹ کالج مل ملا کر جہاں تک یاد پڑتا ہے پانچ چھ سے زیادہ نہ تھے اب تو ۱۶ یا ۱۷ ہیں

... نئے نئے اسکول اور کالج ہر سال کھلتے جا رہے ہیں۔ ٹیچروں کے ٹریننگ کالج انجینئرنگ کالج، زراعتی کالج، پالی ٹیکنک میڈیکل کالج، آیورویدک اور طبی اسکول ان کے علاوہ ہیں۔ دورِ افتادہ لداخ میں بھی اب متعدد تعلیمی ادارے کھل چکے ہیں پہلے بھی کچھ تھے لیکن اتنے نہیں"۔ پرنسپل صاحب کا ہم بہت وقت لے چکے تھے۔ آخر ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت ہوئے۔ بازار کا رُخ کیا۔ نئے ڈیزائن کے گئے دیکھے جو بالکل قالین معلوم ہوتے تھے۔ گلی، کوچے سڑکیں پختہ دیکھیں یہ بات پہلے کہاں تھی۔ قصبہ کیا اب تو اسے شہر کہنا چاہیے۔ صاف ستھرا نظر آیا۔ لوگ بھی اجلے اور صاف لباس پہنے ہوئے تھے۔ دکانیں اچھی سجی ہوئی تھیں۔ قصبے کا پرانا افلاس جا چکا ہے۔ مکانوں پر ٹین کی چھتیں دیکھیں اور بہت سے نئے مکان اور دوکانیں دیکھیں۔۔ لوگ خوش و خرم اور آسودہ نظر آئے۔

ریاست کے مختلف علاقوں اور وادی میں سیر و سیاحت کے دوران میں ایک بات یہ بھی مشاہدے میں آئی کہ لوگ پہلے کی نسبت زیادہ چاق و چوبند اور تندرست و ہشاش بشاش نظر آئے۔ چہروں پر رونق اور چال ڈھال میں پھرتی دیکھی اس کی دو وجہیں ذہن میں آئیں ایک تو لوگوں کی عام خوشحالی اور اچھی غذاؤں کی دستیابی اور دوئم علاج معالجے اور حفظانِ صحت کی مناسب سہولتیں۔

اسے حسنِ اتفاق کہیئے یا سوءِ اتفاق کہ سفر کتنا ہی خوشگوار کیوں نہ ہو لیکن صعوبت اور تھکاوٹ تو لازمی چیز ہے طبیعت کچھ خراب ہو گئی تو اپنے قدیمی مشفق ڈاکٹر سے رجوع کیا جن کا اب ایک بہت بڑا اسپتال چل رہا ہے۔ جو لوگوں کی بے لوث خدمت انجام دے رہا ہے۔ ان سے دوا لینے کیا گئے کہ انہی کے ہو کر رہ گئے۔ برسوں کے بعد ملاقات ہوئی۔ وہ کام کاج اپنے معاونوں کو سونپ کر ہم سے باتوں میں مصروف ہو گئے۔ وہ اب انگلستان بھی ہو آئے تھے اور ایف آر سی ایس وغیرہ بن کر لوٹے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ریاست کے اور بھی بہت سے ڈاکٹر اب انگلستان وغیرہ سے تربیت پا کر آ گئے ہیں۔ ڈاکٹروں کی تعداد اب بہت بڑھ گئی ہے۔ لوگوں کو بہتر اور زیادہ طبی سہولیات اب میسر ہیں اور لوگ بھی بیدار اور باخبر ہو گئے ہیں۔ ذرا سی بھی تکلیف ہو تو فوراً کسی ڈاکٹر کے پاس یا ہسپتال میں پہنچ جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بیماریاں ابتدا ہی میں روک دی جاتی ہیں اور لوگوں کو پہلے زمانے کی طرح لمبی اور مہلک بیماریوں سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔

انھوں نے بتایا کہ مجھے سرکاری اعداد و شمار کا تو کوئی خاص علم نہیں لیکن ایک جائزے اور طبی تحقیق کے دوران میں معلوم ہوا کہ پہلے جہاں تیس پینتیس ہزار نفوس کے لئے ایک ڈاکٹر کی اوسط تھی، اب چار یا پانچ ہزار اشخاص کے لئے اوسطاً ایک ڈاکٹر ہے۔ سرکاری ہسپتالوں میں کوئی آٹھ نو سو ڈاکٹر کام کرتے ہیں۔ پرائیوٹ ڈاکٹر ان کے علاوہ ہیں۔ میڈیکل کالج کے ڈاکٹر بھی شمار کے سوائیں تو تعداد اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ایک رپورٹ کے متعلق ہسپتالوں کے لئے دس بارہ برس پہلے جہاں میڈیکل بجٹ صرف ۴۸ سے ۵۰ لاکھ روپے سالانہ تک تھا اب چار کروڑ روپے کے لگ بھگ ہے۔ ایلوپیتھ ڈاکٹروں کے علاوہ ویدموجود ہیں یونانی حکیموں کی تعداد بھی بڑھ گئی ہے۔ ان کی تربیت کے لئے بھی کالج کھولے گئے ہیں۔ کچھ ہومیوپیتھ ڈاکٹر بھی، وادی میں سرکاری ہسپتال۔ ڈسپنسریاں اور کلینک اب مل ملا کر کئی سو ہیں۔ ان میں ۲۰ بڑے ہسپتال شامل سمجھئے۔ اور اب تو ہر ہسپتال کے ساتھ ایک ایک ڈینٹل سرجن بھی ہے — ایسی سہولتوں اور انتظامات اور عوام میں صحتِ عامہ کا شعور پیدا ہونے سے ریاست میں اوسطِ عمر جہاں پہلے صرف تیس یا بتیس برس سمجھی جاتی تھی اب یہ ۵۰ سے ۵۵ برس تک بڑھ گئی ہے۔

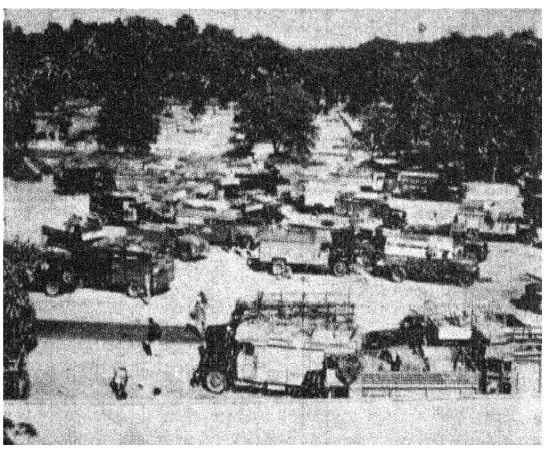

وسیع و رسائل اور نقل و حمل کی بہتر سہولتیں

سڑکیں، شاہراہیں اور پل کسی ملک کی شہ رگیں ہیں، ان کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا —

ہمارے مشاہدے اور تجربے کے مطابق ٹرانسپورٹ کا انتظام خاصا تھا مگر بہتری و گرمی کی گنجائش اب بھی تھی۔ لیکن کہیں دقت یا تکلیف ہمیں نہ ہوئی

جگہ جگہ ریسٹ ہاؤس بنے ہوئے ہیں جن میں قیام و طعام کے دام واجبی ہیں۔ جموں کے ٹورسٹ سنٹر کو بہت وسعت دی گئی ہے۔ تیس پینتیس کے قریب نئے کمرے بنے ہیں۔ کولر، پنکھے اور دوسری سہولتیں مہیا ہیں شاید اس لئے کہ یہاں ویشنو دیوی جانے والے یاتریوں کا بہت رش رہتا ہے۔

سیاحوں کے لئے پہلگام، کنگرناگ، گلمرگ، اور دوسری جگہوں میں بہت کچھ انتظام ہے۔ جموں میں ویشنو دیوی کے یاتریوں کے لئے جو ہزاروں کی تعداد میں آتے ہیں، کٹڑے میں بھی اور جموں شہر میں بھی بہتر انتظامات کئے گئے ہیں۔

سرینگر میں سیاحوں کے لئے ہاؤس بوٹ تو قدیمی دور سے میسر ہیں لیکن اب نئے ہوٹلوں، ریسٹورانوں کی بھی کثرت ہے۔ پتہ چلا کہ پچھلے دو برسوں میں ۳ سے ۴ لاکھ تک سیاح کشمیر کی سیاحت کر چکے ہیں۔ سیاح نہ صرف گرمیوں بلکہ سردیوں میں گلمرگ میں برفانی کھیلوں اور اسکینگ (برف پر پھسلنے) کے مقابلوں کے لئے بھی آتے ہیں۔ گلمرگ میں پوسٹ ماسٹر سے پرانی واقفیت نکل آئی کسی زمانے میں انھیں بھی شعر کہنے سننے کا شوق چرایا تھا لیکن اب اُن کے قول کے مطابق اس "گناہ" سے توبہ کر چکے ہیں۔ انھوں نے شام کی چائے پر بلایا، بات چیت کے دوران معلوم ہوا کہ جب وہ ملازم ہوئے تھے تو ریاست میں ایک سو سے بھی کم تار ڈاک گھر تھے اب تو ۸ اور ۹ سو کے درمیان ہیں۔ ہماری حالیہ رپورٹ کے مطابق ریاستی ڈاک خانوں میں روزانہ تقریباً ۱۱ لاکھ سے بھی لاکھ تک پارسل اور دوسری چیزیں ارسال اور وصول کی جاتی ہیں۔ پچھلے سال سات لاکھ سے زیادہ منی آرڈر تقسیم ہوئے تھے۔ بیس برس پہلے سرینگر میں صرف ۴۲۱ ٹیلی فون تھے اب خودکار ایکسچینج ہے اور ۵۰۰ لائنیں کام کر رہی ہیں۔ جموں جیسے چھوٹے شہر میں بھی ۲ ہزار لائنیں ہیں اور مانگ روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اب ریاست کے تمام بڑے بڑے قصبوں کا ملک کے دوسرے بڑے بڑے شہروں سے ٹیلیفون سے رابطہ براہ راست قائم ہونے ہی والا ہے۔ دہلی سرینگر تک کا تو مکمل ہو چکا ہے۔ اور چاؤ بھی ہے۔ ڈاک کی آمد و رفت کے لئے بسیں اور ہوائی جہاز استعمال ہوتے ہیں۔

کشمیر سے دہلی کو واپسی کے دن قریب آ رہے تھے۔ اس لئے سری نگر لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن گلمرگ سے نکلنے کو جی نہیں چاہا۔ ایک دو دن کے مزید قیام کے بعد سرینگر پہنچے۔ اتفاق سے دوسرے دن اتوار تھا۔ بس میں بیٹھ کر نشاط و شالامار جا پہنچے۔ پہلے تو شالامار یا نشاط جانے کے لئے بسوں کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ تانگوں یا ٹیکسیوں میں جایا کرتے تھے۔ یہ دیکھ کر کچھ تعجب ہوا کہ بسوں کی وجہ سے تانگوں کی سواری سستی ہونی چاہئے تھی، لیکن الٹی مہنگی ہو گئی ہے۔ پہلے نشاط تک ڈیڑھ دو روپے لگتے تھے اب صرف جانے ہی کے سات روپے مانگ رہے ہیں۔ اتنے زیادہ کرایہ کے باوجود جن کو بسوں میں جگہ نہیں ملی دھڑا دھڑ تانگے لے رہے تھے۔ نشاط پہنچے تو یہ دیکھ کر حیرت سی ہوئی کہ بیرونی سیاحوں کی تعداد نہایت قلیل تھی۔ لیکن مقامی لوگوں نے جیسے دھاوا سا بول دیا تھا۔ ہر دو چار فٹ کے بعد ایک ایک کنبہ بیٹھا تھا۔ چائے کے سماوار اور سٹوو سلگ رہے تھے۔ سلم خواتین کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ ــــ واپسی سے پہلے کشمیری ادیبوں کے اجتماع میں بھی شرکت کا موقع ملا۔ تعلیم کے فروغ کے باعث ادب اور ثقافت کو بڑا فروغ مل رہا ہے ادیبوں شاعروں، افسانہ نویسوں کی نئی پود سے مل کر جی بہت خوش ہوا۔ نہ صرف اردو بلکہ کشمیری اور ڈوگری میں بھی کافی چیزیں لکھی جا رہی ہیں ۱۹۴۷ء اور ۱۹۶۷ء کے کشمیر میں کتنا فرق ہے۔ یوں تو ہندوستان میں ہر جگہ ترقی اور خوش حالی آئی ہے مگر کشمیر میں جو کچھ ہوا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ اس تبدیلی کو صحیح طور پر وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جنہوں نے آزادی سے پہلے کے کشمیر کو دیکھا ہے۔

اب ایک بار پھر دہلی کی گہما گہمی میں کھو گیا ہوں۔ لیکن جب اپنے سیر و سفر کے بارے میں سوچتا ہوں تو ماضی اور حال کے کشمیر کے عجیب سے نقوش مختلف، متضاد لیکن مربوط۔ سطح ذہن پر ابھرتے ہیں۔ اور انھیں نقوش میں سے ایک نیا نقش ابھرتا ہے۔ مستقبل کے کشمیر کا۔ زیادہ خوشحال، زیادہ ترقی یافتہ کشمیر کا۔ جو اپنے کل کے ایک جز کی حیثیت سے جمہوریت اور معاشی ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

بقیہ: کالا نیتر

ہو چکا تھا۔ سانس آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ لیکن ہر سانس کے ساتھ کوڈو ــــ کوڈو کی مدھم سی آواز آ رہی تھی۔

اسی حالت زار میں رات کا آخری پہر بیت گیا۔ اچانک کاستو کے کانوں میں کوئی جانی پہچانی آواز آئی ــــ وہ گہری بے ہوشی کی سمادھی سے نکل آئی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ صبح کی ہلکی ہلکی روشنی گپھا کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ کاستو کو یوں محسوس ہوا کہ کوئی اسے بلا رہا ہے۔

اسے ایسا لگا، باہر آڑو کے درخت پر بیٹھے کسی پرندے شاید کوڈو کے گلے میں پڑا گھنگھرو بج رہا ہے۔ چھن ٹن۔ چھن ٹن ۔۔۔۔۔

کاستو کی آنکھوں سے ممتا بھرے دو آنسو ٹپک پڑے اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

کوڈو بیٹے ۔۔۔۔۔"

امین کامل
ترجمہ: فاروق مسعودی

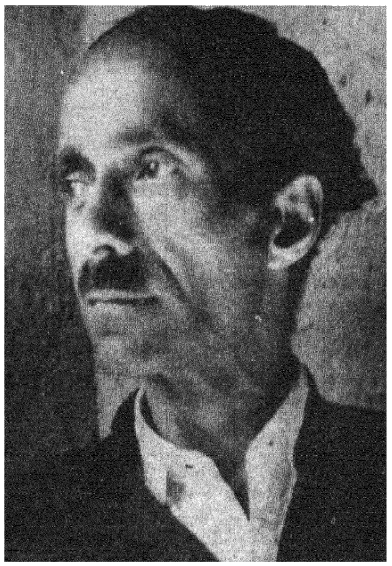

آئینہ

"اُستاد سے آئینہ ہے۔" غلام سر جھکائے ہی استاد غفورے کو توجہ دلاتا۔

"ہونا ہی چاہیئے۔" استاد غفورا بھی جیسے اپنے آپ ہی سے کہتا اور آئینے کی طرف نگاہ اٹھاتا۔ یہ آئینہ دیوار پر کچھ ایسے ٹنگا تھا کہ اس میں بالکل سامنے والے مکان کا عکس پڑتا۔ مکان کے برآمدے میں گلاز نگساز کی چرونبل آتی تھی اور اُستاد غفورا اُس سے آئینے میں سے ہی عشق فرماتے۔

اُستاد غفورے کی عمر یہی کوئی ساٹھ سال کی تھی۔ بڑوں کا کہنا ہے کہ ساٹھ کا آدمی سٹھیا جاتا ہے۔ پر اُستاد غفورا سٹھیایا نہیں تھا۔ زمانے نے اس پر بڑے بڑے ستم ڈھائے تھے۔ اس لئے اس کے چہرے پر جب دیکھو ایک اُداسی سی چھائی رہتی۔ اسے اپنا آپ، اپنا ماحول، اپنا کام کاج، ہر ایک چیز کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ وہ ہر شے سے بیزار ہو گیا تھا، ایسا بیزار کہ جب وہ اخروٹ کی لکڑی پر نقاشی کا کام کرنے بیٹھ جاتا، تو ایسے بھدے اور بھونڈے نقش تراش لیتا کہ صنعتی کا اپنا فطری حسن بھی مسخ ہو جاتا۔ شاید اسی لئے لوگ اسے دوڈ ہیڈ Weed Head کے نام سے پکارتے تھے حالاں کہ ایک وقت وہ تھا جب کہ سارے شہر میں وہ اس کام کا واحد اُستاد شمار کیا جاتا تھا۔ اس کے ڈیزائن اتنے مقبول ہوئے تھے کہ انھیں آج بھی "غفورا ڈیزائن" کہا جاتا ہے۔ اُس کی ہنرمندی کا اتنا چرچا تھا کہ آج بھی اگر کوئی انگریز کسی بھی دکان پر کوئی چیز خریدنے جائے تو دوکاندار اُسے چکمہ دینے کے لئے کہتا ہے "جناب یہ باکس غفورا میڈ۔ یو سی ہاؤ ونڈر فل میڈ" انگریز غفورے کے نام پر آنکھ میچ کر بغیر ہی چیز اٹھا لیتا ہے کیوں کہ اس کی بنائی ہوئی چیز کو دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ پر اب یہی اُستاد غفورا تھا کہ دوڈ ہیڈ بن گیا تھا۔ کبھی کبھار تو وہ خود حیران رہ جاتا کہ آج بھی اس کے پاس وہی اوزار تھے اور وہی اخروٹ کی لکڑی۔ پر نہ جانے وہ پہلے سے نقش اور حسین بیل بوٹے کیوں نہیں بنا پاتا۔ اس کے کارخانے سے جو لڑکے کام سیکھ کر گئے تھے وہ اب خود بھی اُستاد بن گئے تھے۔ غفورا جب کبھی اُنکا کام دیکھتا تو حیران ہو کے کہتا ہے "جوانی کے دن ہیں۔ میری طرح تھوڑے ہی بڑھاپے کے شکنجے میں کسے ہوئے ہیں۔"

بڑھاپے کا یہ تلخ احساس غفورے کے اعصاب پر بری طرح سوار ہو گیا تھا۔ وہ اکثر اپنے کارخانے کے دو لونڈوں، غلام اور وہاب کو اپنے ماضی کے واقعات سناتا۔ انسان کے ہاتھوں سے جب آہ نکل جائے اور کل "گہری دھند میں کھو جائے تو وہ ماضی کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ اس کی ریزہ کاری کتنی باریک اور نزاکت سے پُر ہوتی تھی۔ کتنے ہی انگریز لوگ اس کی تصویر اتارنے کے لئے

اس کے کارخانے میں آتے۔ اُس کی بنائی ہوئی چیزیں کس طرح ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھیں ایک دفعہ اس کی بنائی ہوئی لکڑی کی ایک چیز کسی طرح ٹوٹ گئی تھی لیکن اس نے اس ٹوٹی ہوئی چیز کو اس فنکاری سے جوڑا تھا کہ خواجہ سبحان بھی اس جوڑ کو پکڑ نہ سکا۔ حالاں کہ خواجہ سبحان لکڑی کا کام پہچاننے میں مشہور کوٹھے دار مانا جاتا ہے۔ لیکن جب خواجہ سبحان کو اس کا پتہ چلا تو اس نے غفورے کو بیس روپے انعام دیئے تھے اور کہا تھا۔

"غفورے، آج میں نے ہار مان لی ـــ بے شک تم ایک فنکار ہو۔"

اس وقت اگر غلام یا وہاب بول اٹھتا کہ اُستاد اب آپ ایسا کام کیوں نہیں کرتے تو غفورے کے چہرے پر ان گنت جھریاں اُبھر آتیں اور ایک گہرے غم کا سایہ اُس پر منڈلانے لگتا۔ وہ اخروٹ کی لکڑی آنکھوں کے قریب لے آتا، جیسے اُسے دکھائی بھی نہ دیتا ہو کہ کون سا نقش تراشنا ہے اور کیسے؛

مگر جب سے غفورے نے زیبہ کو دیکھا اور اس سے آئینے میں سے ہی عشق لڑانے لگا تھا۔ . . . . . .

یہ دُنیا جیسے پھر ایکبار اس کی گرفت میں آگئی تھی جیسے اس کی طویل عمر کے تیس سال یکبارگی کم ہو گئے۔ وہ اب معمولی ٹوپی کے بجائے فرکی اصلی ٹوپی اور دس روپے کا ایک خوبصورت نیلامی کوٹ پہننے لگا تھا۔ کام کرتے وقت جو تھکن اور موچ اس کی انگلیوں میں آتی تھی، اس کے بجائے اب ان میں زندگی سے بھرپور حرارت دوڑ رہی تھی۔ ایک نئی زندگی کا اُبلتا ہوا خون گردش کر رہا تھا۔ وہ ایکبار پھر بھدے بھونڈے کام کی بجائے نئے نئے ڈیزائن تراشنے لگا۔ نرم و نازک اور باریک بیل بوٹے بنانے لگا۔ وہ پھر ایک بار اپنے کھوئے ہوئے فن کے عرفان تک پہنچ گیا۔ جسے دیکھ کے وہاب اور غلام بھونچکا رہ گئے۔ وہ اپنے اُستاد کی اس فنکاری اور ہنرمندی پر اِترانے لگے، کیوں کہ ویسے ڈیزائن ویسی نقاشی اور ویسی نزاکت انھیں کہیں اور نظر نہ آتی۔ ایک دن غلام نے پوچھا بھی ـــ "اُستاد ـــ آپ بیل بوٹوں میں اتنی نزاکت کیوں برتنے لگے۔؟"

"کیوں؛ میں جانتا نہیں کیا ـــ؛" اُستاد غفورے نے جواب دیا۔

حالانکہ وہ خود حیران تھا کہ وہ اس کھوئے ہوئے عرفان کو کس طرح پھر سے پا گیا ہے۔ "نہیں اُستاد ـــ میں نے ویسی بات نہیں کی"، غلام نے قدرے شرمندگی سے کہا۔ "اب وہ انگریز کہاں کہ ایسا کام خریدیں۔ اب تو ویسی لوگوں کے لئے بھدی بھونڈی چیزیں ہی چلتی ہیں۔"

"مجھے پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا"، استاد غفورے نے جواب دیا۔ "تو دیکھے جا۔ اُستاد غفورا ابھی زندہ ہے۔" اور سچ بھی یہی تھا کہ اُستاد غفورا آئینہ کے ذریعے عشق کرنے کے بعد پھر سے زندہ ہو گیا تھا۔ اس کے فن نے ایک نئی اور شوخ انگڑائی لی تھی۔ وہ دکان پر بیٹھے بڑے انہماک سے خوبصورت اور دلنشین بیل بوٹے بناتا جیسے یہ سب کچھ گلاب رنگ ساز کی بیوی زیبہ کے لئے کر رہا ہو۔

گلاب رنگ ساز اس مکان میں کرایہ پر رہتا تھا جب وہ اپنے کام پر نکلتا تو زیبہ گھر میں اکیلی رہ جاتی۔ وہ آئے دن نئے رنگ کی اوڑھنی بدلتی۔ غفورا زیبہ کے اس رنگین ذوقِ انتخاب پر نہیں مرمٹا تھا۔ کیوں کہ زیبہ محض "رنگ" نہ تھی بلکہ وہ قبول صورت بھی تھی۔ اور پھر وہ اپنی بائیں آنکھ کو، جو کانی تھی، چھپانے کی غرض سے اس پر بالوں کی ایک لٹ کچھ ایسے ڈال دیتی جیسے وہ لٹ خود ہی آگری ہو۔ اس سے اس کی خوبصورتی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔ بے خبر تو خیر اس انداز پر مرمٹتا ہی تھا پر اُستاد غفورا یہ اصل راز جانتے ہوئے بھی اسی ایک بات پر مرمٹا تھا۔

پہلے پہل زیبہ اُستاد غفورے کے اس عشق سے بالکل بے خبر تھی وہ کسی خاص سوچ یا جذبے کے بغیر برآمدے میں بازار کا تماشہ دیکھنے نکلتی۔ ایک دن اس کی نظر اُستاد غفورے پر پڑی جو دیوار کی طرف دیکھ دیکھ کے عجیب و غریب حرکتیں کر رہا تھا۔ وہ حیران رہ گئی کہ وہ دیوار کی طرف دیکھ کے یہ کیا احمقانہ پن کر رہا ہے۔ بڑے غور سے دیکھنے کے بعد وہ اصل راز تک پہنچ گئی۔ اور دیوار پر آئینے کو آویزاں دیکھ کر وہ بہت برہم ہوئی کہ آخر اس بڈھے کھوسٹ نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؛ پر ساتھ ہی سوچا کہ جانے مجھے ہی دیکھ رہا ہے۔ اس کے بعد اس نے غفورے کو کئی بار آزما لیا اور اُسے آئینے میں اپنے ساتھ عشق کرتے ہوئے پکڑ لیا۔ اس دن کے بعد زیبہ فرصت کے اوقات میں محض دل بہلاوے کے لئے برآمدے پر آنے اور اُستاد غفورے سے عشق لڑانے لگی۔ اُستاد غفورا اُسے آئینے میں سے جانے کیا کیا اشارے کیا کرتا اور زیبہ سو میں سے ایک اشارے کا جواب دیتی۔ اس کا یہ جواب غفورا، زیبہ کی طرف براہِ راست دیکھے بغیر ہی آئینے میں دیکھ لیتا۔ اس کے لئے یہ آئینہ

باکمال صوفیوں کی طرح حقیقت سے واصل ہونے کے لئے ایک مجازی سیڑھی تھا زندگی کا ایک الہام، ایک کشش، اور ایک ترغیب تھا۔

زیبہ کے برآمدے میں نکلنے کا پتہ سب سے پہلے غلام کو چل جاتا جب وہ نکلتی تو غلام سر جھکائے ہوئے ہی اُستاد غفورے کو توجہ دلاتا۔

"اُستاد آئینہ ہے۔"

"ہونا ہی چاہیئے۔" اُستاد غفورا اپنے آپ سے ہی کہتا اور ادھر اُدھر دیکھے بغیر ہی آئینے کی طرف نگاہ اٹھاتا۔ آئینے میں زیبہ کا عکس جھیل میں چاندنی کی طرح منعکس ہوتا تھا۔ غفورا سب سے پہلے ایک نوخیز عاشق کے انداز میں مسکراتا۔ پھر ماتھے کی طرف ہاتھ لیجا کر زیبہ کو سلام کرتا اور اس کے بعد ہی ماحول سے بے نیاز ہو کر ایسی عجیب و غریب حرکتیں کیا کرتا کہ دیکھنے والے کے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ جاتے۔ مگر وہ حرکتیں غلام اور وہاب بھی دیکھتے اور وہ بھی کنکھیوں سے۔

اُستاد غفورا اس عشق کے بعد صبح سویرے ہی دوکان کھولتا اور اندر داخل ہوتے ہی آئینے کو صاف کرتا۔ اس کے بعد بہت دیر تک اس میں اپنا جائزہ لیتا کبھی بھنوؤں پر انگلیاں پھیرتا اور کبھی مسکراتا۔ اس مسکراہٹ سے اس کے ہونٹوں کے کنارے کان کی لوؤں تک کھنچ جاتے۔ شاید اس لئے کہ وہ بڑی فراخدلی سے عشق کر رہا تھا۔ اس عشق نے اس کے سارے زخموں کو مندمل کر دیا تھا۔ اس کے سارے دُکھ درد بھلا دیئے تھے ماتھے کی جھریاں، شادو تھیں اس نے اب کسی دوکاندار سے دانتوں کا منجن بھی خرید لیا تھا جس سے وہ منہ دھونے وقت دانتوں کو صاف کیا کرتا حالاں کہ وہ انتہائی حد تک پیلے پڑ چکے تھے اور پھر خلال کرنے سے اُن میں بڑی بڑی دراڑیں پڑ گئی تھیں۔

اسی دوران وہاب اور غلام بھی آجاتے وہ ان کے سامنے دن بھر کا کام رکھ دیتا وہ دونوں بکھرے ہوئے اوزار سمیٹتے اور کام میں لگ جاتے۔ اُستاد غفورے کے اس عشق کو غلام کنکھیوں سے ہی دیکھتا تھا اُستاد غفورا زیبہ کو اشارے سے سمجھاتا کہ تمہارے بالوں کی اس لٹ نے مار ڈالا ہے۔ زیبہ اس وقت مسکرا کر، جان بوجھ کر اپنی انگلیوں سے اس لٹ کو بڑے کافرانہ انداز سے ہلا دیتی۔ اُستاد غفورا یہ دیکھ کر تھنے پھلاتا جیسے زیبہ کے بالوں کی خوشبو سونگھ رہا ہو اور پھر اپنی ٹوپی کو ذرا ترچھا کر کے ریڈیمیڈ کا پیکٹ اٹھاتا اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگا لیتا۔ یہ سب کچھ وہ آئینے پر نگاہیں جمائے ہوئے ہی کیا کرتا تھا۔

غلام یہ سب کچھ دیکھتا رہتا جب اُستاد غفورا ہونٹوں کو ایک دائرے کی شکل دے کر آئینے میں سے زیبہ کی طرف ایک بوسہ پھینکتا اور جب زیبہ اس کے لئے اپنا رخسار پیش کر دیتی تو غلام سر جھکائے ہی کہتا۔

"اُستاد ۔۔۔ کچھ پیسے چاہئیں ۔۔۔ چائے بناتے ۔۔۔"

"دھت تیرے کی ۔۔۔ اُستاد آئینے سے نگاہیں ہٹائے بغیر ہی بول اُٹھتا "اُسے اس وقت غلام کی یہ بات بڑی گراں گذرتی تھی۔" جا خود نکال لے جیب سے ۔۔۔" یہ کہتے کہتے وہ زیبہ کے اس طرح رخسار پیش کرنے سے وجد میں آجاتا۔

غلام وہاب کو اشارہ کرتا اور حکم کے مطابق اُستاد کے کوٹ سے پیسے نکالتا، جو دیوار پر ٹنگا رہتا تھا۔ غلام نے اُستاد کی یہ کمزوری پکڑ لی تھی۔ وہ اس کی گردن پر اُس وقت پاؤں رکھتا جب وہ آہ بھی نہ کر سکتا تھا اور پھر اس وقت وہ بڑے موڈ میں بھی تو ہوتا تھا۔

اُستاد غفورے کے اس وجد میں آجانے پر زیبہ کو ہنسی آجاتی جسے ضبط نہ کرنے کی وجہ سے وہ اندر چلی جاتی۔ اس کے چلے جانے کے بعد اُستاد غفورا انگڑائیاں لیتے ہوئے پھر کام میں لگ جاتا۔ اس وقت اس کے ہاتھ لکڑی کی سطح پر بجلی کی سرعت سے چلنے لگتے۔ اور وہاب اور غلام یہ دیکھ کر ششدر رہ جاتے۔

ایک دن اُستاد غفورا اور اس کے دونوں شاگرد معمول کے مطابق کام کر رہے تھے۔ غلام زیبہ کے نکلنے کا منتظر تھا۔ اور اُستاد غفورا غلام کی توجہ دلانے کے انتظار میں تھا، مگر جب زیبہ کے نکلنے کا وقت بھی گذر گیا اور غلام بھی خاموش ہی رہا تو اُستاد غفورے کا دل جیسے ڈوبنے لگا۔ وہ اس وقت ایک نئے کار دان پر کام کر رہا تھا اور اس پر ایسے نقوش بنا رہا تھا کہ کوئی دیکھے تو چکرا جائے۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا اور ڈراؤنے اور مہیب

دوسرے دماغ میں آنے لگے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں وہ خدانخواستہ بیمار تو نہیں ہو گئی لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں ایک موہوم سا شک ابھر آتا کہ کہیں گلزار نگار کو اس معاشقے کا پتہ نہ چلا ہو اور اس نے زیبہ کو برآمدے میں نکلنے سے منع کر دیا ہو۔ ان خیالات نے اس کی حالت بڑی عجیب سی بنا دی۔ اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑنے لگے۔ انگلیوں پر رعشہ سا طاری ہونے لگا۔ سنگار دان پر بنتے ہوئے پتے خود بخود گرنے لگے۔ اور انگور کی بیل جا بجا کٹنے لگی۔

غلام کو بھی محسوس ہو رہا تھا جیسے آج اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے۔ کوئی ان دیکھا سا خلا لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا ہے۔ حقہ پی پی کے بھی اسے تمباکو کی اور طلب محسوس ہو رہی تھی۔ ایک بار شاید اس نے برآمدے میں سے کسی اڑتے ہوئے پرندے کا سایہ دیکھا اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"اُستاد۔۔۔۔۔آ۔۔۔۔۔"

"ہونا۔۔۔۔؟" اُستاد غفورا آئینے کی طرف نظر اٹھا کے جواب دینے ہی لگا تھا۔ پر وہاں زیبہ کا چہرہ نہ دیکھ کر اس کے ہاتھوں سے اوزار گر پڑے۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ جیسے اُسے غش آ رہا ہو۔ غلام بھی خفیف سا ہوا۔ پر بات تو اس کے منہ سے نکل گئی تھی۔

دوسرے دن جب غلام اور وہاب ہنستے کھیلتے کارخانے میں پہنچے تو جیسے انھیں کسی زہریلے سانپ نے ڈس لیا۔ اُستاد غفورے کو دیکھ کے وہ دروازے ہی پر ٹھٹک کے رہ گئے۔ انھوں نے غفورے کو پھٹی پرانی ٹوپی اور ڈھیلے ڈھالے پھرن میں ملبوس بھوندے نقوش بناتے ہوئے دیکھا اس کے چہرے سے اُداسی برس رہی تھی۔ چہرے کی جھُریاں پھر سے اُبھر آئی تھیں۔ غلام اور وہاب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا مگر کوئی بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ کچھ نہ سمجھ سکا۔ وہ خاموش کمرے میں داخل ہوئے اور اُستاد کو سلام کر کے اپنے کام میں لگ گئے۔ غلام اور وہاب اپنی اپنی جگہ یہی سوچ رہے تھے کہ آج اُستاد کا چہرہ کیوں اُترا ہوا ہے۔ انھیں اُستاد کے ساتھ ساتھ اپنی حالت بھی کچھ بدلی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اُستاد کے چہرے اور اس کے کام کرتے ہوئے ہاتھوں سے اصل راز کے متلاشی تھے۔

اتنے میں غلام کی نظر گلا رنگ ساز کے مکان پر پڑی جس کی ساری کھڑکیاں بند تھیں۔ وہ سمجھ گیا کہ گلا رنگساز یہ مکان چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا ہے۔ اس نے نظر اٹھا کے دیوار کی طرف دیکھا وہاں خالی اور اُداس دیوار کو دیکھ کر وہ بے اختیار بول اٹھا۔

"اُستاد۔ آئینہ۔؟"

"ٹوٹ گیا۔۔۔" غفورے کی آواز میں درد اور کسک تھی!

بقیہ: کشمیر کی دستکاریاں (صفحہ ۴۹ سے آگے)

ہیں جن پر عمدہ قسم کے پھول پتے، بیل، بوٹے کندہ کئے جاتے ہیں۔ تانبے کے ظروف میں سماوار، طشتریاں اور تھالیاں محنت سے تیار کی جاتی ہیں اور ان پر مختلف قسم کے نقش و نگار کندہ کئے جاتے ہیں۔ زیورات میں الکہ ہوز، ڈوجہ ہوز، حلقہ بند، جھمکے مشہور ہیں۔ اور سیاح لوگ ان زیورات کو بدرجہا تم خریدتے ہیں۔ کشمیری دستکاروں نے اب مٹی کے برتن، پھولدان، اور ٹی سیٹ بنانا بھی شروع کئے ہیں۔ یہ کشمیر کی جدید دستکاری ہے۔

جنگلی جانوروں کی کھال سے کوٹ، دستانے اور بیگ بنائے جاتے ہیں۔ ہاتھ سے بنے ہوئے فر بوٹ بہت مقبول ہیں۔ اسی طرح موسم سرما کے لئے فر کی ٹوپیاں نہایت خوبصورت ہوتی ہیں۔ دست کاریوں کو فروغ دینے کے لئے اب حکومت نے سارے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں آرٹس ایمپوریم قائم کئے ہیں، جہاں کشمیر کی دستکاریوں کو فروخت کرنے کے بہتر موقعے میسر ہیں۔ سرینگر میں ایک اسکول آف ڈیزائن قائم کیا گیا ہے۔ جہاں کشیدہ کاری، پیپر ماشی نقاشی، وڈ کارونگ، شال بافی اور قالین بافی کے نئے نئے ڈیزائن تیار کئے جاتے ہیں۔

حیرانی کی بات ہے کہ کشمیر کے دستکار، سب کے سب مرد ہیں۔ ان دست کاریوں میں صنف نازک کا حصہ بہت کم ہے۔ ممکن ہے کہ پیپر ماشی، قالین بافی، شال بافی، کشیدہ کاری اور گبہ دوزی کا کام خواتین، بہتر اور احسن طریقے پر کر سکیں تاکہ مرد، دوسرے کاموں میں جُٹ جائیں۔ ضروری ہے کہ ان دستکاریوں کو صنف نازک کی تحویل میں دیا جائے، دوسرے ان دستکاریوں کی فروخت کے سلسلے میں مناسب انتظام نہیں۔ خام مواد کی فراہمی کا مناسب انتظام کرنا حکومت کا فرض ہے تاکہ کاریگر، دستکار اور فن کار ان اشیاء کو مناسب قیمتوں میں حاصل کر سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مقامی طور پر خام مواد، مثلاً رنگ وغیرہ حاصل کرنے کے سلسلے میں نئی اسکیموں کو عمل میں لانا چاہئے۔

حامدی کاشمیری

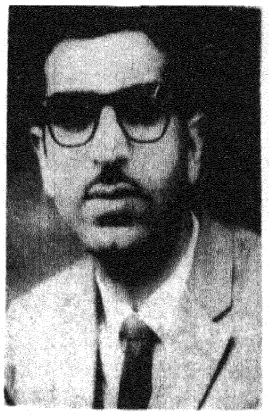

اُردو شعر و ادب میں کشمیر کا حصّہ ایک جائزہ

اہلِ کشمیر کی مادری زبان کشمیری ہے۔ اور جموں کے باشندوں میں ڈوگری زبان رائج ہے۔ ان دونوں زبانوں میں ادب کا اچھا خاصا سرمایہ جمع ہو چکا ہے۔ تقسیمِ وطن سے پہلے، ماضی کے مختلف ادوار میں کشمیری زبان میں شعری ادب کے کئی خوبصورت اور لازوال نمونے نظر آتے ہیں اور تقسیم کے بعد کشمیری ادیبوں نے ایک نئے اجتماعی شعور اور فنی آگاہی کے ساتھ نظم و نثر میں کئی ایسی نگارشات پیش کیں جو آسانی کے ساتھ ملک کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی اہم تخلیقات کے ہم پلّہ قرار دی جا سکتی ہیں۔ اور اُن کا تخلیقی سفر اعتماد اور یقین کے ساتھ جاری ہے۔ مادری زبان میں اپنے تخلیقی شعور کے موثر اظہار کے ساتھ ساتھ یہاں کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے سنسکرت اور فارسی زبانوں کے بعد، جس دوسری زبان میں اپنے تجربات اور احساسات کا اظہار کیا ہے۔ وہ اُردو زبان ہے اور جس مشاقی اور شوق سے کیا اس سے اہلِ کشمیر کی تخلیقی لگن اور غیر معمولی ذہانت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے اور ساتھ ہی اُردو زبان سے اُن کے جذباتی اور ثقافتی رشتوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ کشمیر کی تہذیبی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطّہ فردوسِ نظر صدیوں سے تہذیب و تمدن فکر و فلسفہ اور علوم و فنون کا مرکز رہا ہے۔ شعر و ادب کے جو چراغ یہاں جلتے رہے ہیں، ہندوستان کے گوشے گوشے نے اُن سے روشنی لی ہے۔ ہندو دور میں سنسکرت علم و ادب کو غیر معمولی فروغ ملا۔ مسلمانوں کے دورِ اقتدار میں فارسی زبان و ادب کا گھر گھر چرچا ہوا اور درجنوں شعراء پیدا ہوئے۔ جن میں سے کئی اہلِ ایران سے بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں۔ اور پھر پندرھویں صدی کے بعد، یعنی زین العابدین بڈشاہ کی حکومت کے خاتمے پر، جب یہاں کے ملکی نظام کا شیرازہ بکھرنے لگا اور بہت سے لوگ پنجاب، اودھ، دہلی اور آگرے وغیرہ میں جا بسے تو اُردو زبان کو انھوں نے گلے لگایا۔ اور اس زبان میں بھی اُن کے جوہر کھلنے لگے۔

اُردو زبان سے ریاست کے لوگوں کی وابستگی کی چند اور وجوہات بھی ہیں۔ ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ نئی صدی میں تعلیم کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ یہاں کے لوگ ایک ایسی کل ہند مقبولِ عام زبان سے رابطہ پیدا کرنے کے لئے مجبور تھے، جو اُن کی علمی، مذہبی اور ادبی تشنگی کو بجھا سکے۔ اُردو زبان فکر و فلسفہ، مذہبی علوم، اور ادب و ثقافت کا ایک خزانہ تھی۔ اس لئے یہاں کے لوگوں کو، ریاست میں مغلوں کے عمل دخل کے زمانے ہی سے اس زبان سے جو لگاؤ پیدا ہو گیا تھا استوار ہونے لگا۔ اور وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ اُردو یہاں کے لوگوں کے لئے کوئی اجنبی زبان نہ رہی۔ اور قلم کاروں نے بغیر کسی دشواری کے اس زبان کو اپنی شخصیت کے اظہار کا وسیلہ بنایا، مادری زبان کے بجائے اس زبان کو ذریعۂ اظہار بنانے کے بڑھتے ہوئے رجحان کے اسباب کا سراغ نفسیاتی حقائق میں بھی لگایا جا سکتا ہے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ فنکار جو کچھ لکھتا ہے وہ دوسروں تک اس کی ترسیل و ابلاغ کے لئے بے چین رہتا ہے۔ چوں کہ پرانے زمانے میں مادری زبانوں میں اشاعت و تشہیر کے وسیلے کالعدم تھے اور اس کے مقابلے میں اُردو زبان خاصی ترقی یافتہ تھی، اس لئے شعراء نے اسی زبان کو اپنایا۔

بہرکیف، اہلِ کشمیر کی اُردو زبان سے وابستگی کے جو بھی اسباب ہوں، یہ امر واقعہ ہے کہ یہاں کے لوگوں نے اس زبان کو اپنی زبان سمجھ کر برتا ہے اور اس کی ترقی میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈوگرہ عہد میں ریاستی سرکار نے اسے سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا اور سرکاری دفاتر میں اس کا چلن ہوا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں اُردو زبان نے ترقی کے ایک اور زینے پر قدم رکھا یعنی اسے سرکاری اسکولوں میں تعلیم و تفہیم کا وسیلہ قرار دیا گیا اور اس کی تعلیمی حیثیت مسلّم ہو گئی۔ تعلیم یافتہ طبقہ اس میں گفتگو کرنے لگا خط و کتابت میں اس کا سہارا لیا گیا سیاسی، سماجی اور مذہبی خیالات کی نشر و اشاعت کے لئے کتابچے اور رسالے اسی زبان میں لکھے جانے لگے۔ مقامی ضروریات کے لئے اخبارات نکلے تو اسی زبان میں نکلے نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو آہستہ آہستہ مقبول ہونے لگی اور تعلیم یافتہ طبقہ کے علاوہ اس سے غیر تعلیم یافتہ لوگ بھی مانوس ہونے لگے۔ وہ اُردو (ٹوٹی پھوٹی سی) بولنے اور سمجھنے لگے۔

اُردو شعر و ادب کی تاریخ میں کشمیری ادیبوں اور شاعروں کی خدمات اپنی اہمیت رکھتی ہیں، حق تو یہ ہے کہ کشمیر کی خدمات کا ذکر کئے بغیر اُردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں کہلا سکتی، یہاں پر ہم اُن مشاہیر ادب مثلاً دیا شنکر نسیم، سرشار، آغا حشر کاشمیری، منٹو، ڈاکٹر اقبال، علامہ کیفی، اور کرشن چندر وغیرہ کا ذکر نہیں کر رہے ہیں جن کے دم سے اُردو کو توانائی اور وسعت ملی ہے۔ اور جن کا آبائی تعلق اسی خطّے سے رہا ہے لیکن جو مستقلاً باہر رہے۔ اس مختصر سی بات چیت میں خاص طور پر اُن ادیبوں اور شاعروں کا ذکر مقصود ہے، جو ریاست جموں و کشمیر میں پیدا ہوئے، یہیں پلے بڑھے اور یہیں رہ کر لکھتے رہے۔ گھر کے اندر باہر کشمیری اور ڈوگری زبان بولتے رہے، لیکن جنہوں نے اُردو کو اپنے افکار و تجربات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔

آیئے، پہلے شعراء کا ذکر کریں۔ شعراء کی فہرست کافی طویل ہے جو لگ بھگ انیسویں صدی کے آواخر سے دورِ حاضر تک مرتب کی جا سکتی ہے۔ آسانی اور تفہیم کے لئے ان شعراء کو میں نے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دور میں ان شعراء کا نام لیا جا سکتا ہے، جن میں بہت سے بیسویں صدی کے آغاز تک شاعری کرتے رہے۔ ان میں اکثر و بیشتر کا ذکر بہارِ گلشنِ کشمیر کے تذکرے میں درج ہے۔ یہ شعراء عام طور پر پرانے رنگ میں لکھتے رہے۔ غزل ان کی محبوب صنف رہی ہے اور عموماً روایتی انداز میں حسن و عشق کی دنیا کی بے ثباتی غمِ زمانہ، موت اور تصوف کی باتیں کی گئی ہیں۔ ان میں پنڈت ہرگوپال کول خستہ صادق علی خاں، مرزا مبارک بیگ، مرزا سعد الدین سعد، راجہ شیر علی خاں تارا چند ترسل سالک، کاشی ناتھ ترسل خوشتر، خانصاحب منشی سراج الدین، چودھری موتی محمد ناظر، قمر قمرازی، ڈاکٹر عماد الدین سوز، صبیب کیفوی، قیس شروانی، وشوا ناتھ درما، اللہ رکھا ساغر، نرنجن سہائے شوق اور دوسرے ہیں۔ ان میں کئی شعراء نے غزل کے علاوہ موضوعاتی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ یہ نظمیں زیادہ تر نظیر اکبر آبادی، آزاد اور حالی کی نظم جدید کی تحریک کے زیر اثر، موسموں، مناظرِ فطرت وطنیت اور دوسرے سماجی موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔

دوسرے دور میں جو شعراء سامنے آتے ہیں اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں اثر صہبائی، طالب کشمیری، شہ زور کاشمیری، مرزا کمال الدین شیدا، میر غلام رسول نازکی، دینا ناتھ مست، منوہر لال دل، رسا جاودانی، فطرت کاشمیری، کشن سیل پوری، ع۔م طاؤس، عبدالغنی فاضلی، عبدالحق ترقی، عشرت کشتواڑی، آذر عسکری، محمد امین شمیم اور دوسرے۔ اثر صہبائی اور محمد امین شمیم کو چھوڑ کر باقی سبھی شعراء ابھی بقیدِ حیات ہیں اور بیسویں صدی کی دوسری یا تیسری دہائی سے لکھ رہے ہیں۔ ان میں سے کئی شعراء کے مجموعے چھپ کر اہلِ نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان میں سے اکثر حضرات کی نگارشات ہندوستان کے موقر جرائد میں اہتمام کے ساتھ چھپتی رہتی ہیں۔ اس دور کے شعراء میں دورِ اوّل کے شعراء کی نسبت فنی شعور میں زیادہ پختگی اور رچاؤ ہے، عام طور پر اس دور کے شعراء میں حیات و کائنات کے مسائل کو سمجھنے کا رجحان واضح نظر آتا ہے، اس کے علاوہ سیاسی و معاشرتی شعور، قومیت اور انسان دوستی کے جذبات کا اظہار بھی ملتا ہے۔ طالب، مست، کشن سیلپوری اور دوسرے شعراء نے خاص طور پر قومی اور سماجی مسائل پر بعض اچھی نظمیں لکھی ہیں۔ شہ زور کاشمیری، میر غلام رسول نازکی اور اثر صہبائی کے یہاں فکر و فن میں تنوع، رچاؤ، اور پھیلاؤ ملتا ہے۔ اور اُردو کے ادبی حلقوں میں ان کی اہمیت مسلّم ہے۔ تیسرے دور میں جدید نسل کے شعراء نظر آتے ہیں۔ ان میں تنہا انصاری، قیصر قلندر، مہندر ریہنہ، میکش، عرش صہبائی قاضی غلام محمد، اندرجیت لطف، سیفی سوپوری اور شوریدہ کاشمیری قابلِ ذکر ہیں۔ آپ اجازت دیں تو اس گروپ میں میں اپنا نام بھی شامل کر دوں ان میں سے اکثر کا کلام معیاری رسالوں میں شائع ہوتا ہے۔ چند شعراء کے شعری مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔ اس دور کی شاعری میں رومانوی رجحانات زیادہ تابناک ہیں۔ یہ رومانیت زندگی کے حسن اور خارجی حقیقتوں کی پیچیدگیوں کے گہرے شعور سے تشکیل پاتی ہے۔ قیصر قلندر اس گروپ میں پیش پیش ہیں اور جدید تر رجحانات اور رویوں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ قاضی غلام محمد مزاحیہ

شاعر ہیں۔ اُن کے کلام میں سماجی شعور اور فنی چابک دستی نمایاں ہے۔ ادھر چند برسوں سے کچھ اور نوعمر شعراء سامنے آئے ہیں، ان میں فرحت گیلانی، فاروق نازکی صادق علی اسیر، عابد مناوری قابلِ ذکر ہیں۔

نثر کے میدان میں بھی کچھ کم کام نہیں ہوا ہے، مذہبیات اور سیاسیات پر کتابچے اور رسالے چھپوائے گئے۔ تاریخیں چھپوائی گئیں بے شمار درسی کتابیں شائع ہوئیں۔ انشائیے اور تنقیدی مضامین لکھے گئے، ڈاکٹر شمس الدین احمد، امین کامل، صاحبزادہ حسن شاہ، رحمان راہی، علی محمد لون، شمیم احمد شمیم، یوسف ٹینگ نے بعض اچھے مضامین لکھے ہیں، ڈرامہ نویسی میں محمد عمر نور الٰہی کی کتاب "ناٹک ساگر" ڈرامائی ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک طویل خاموشی کے بعد، ۱۹۴۷ء کے بعد چند اچھے ریڈیائی اور اسٹیج ڈرامے لکھے گئے اور ان کے لکھنے والوں میں پریم ناتھ پردیسی، علی محمد لون، اور سومناتھ زتشی قابلِ ذکر ہیں پچھلے پندرہ بیس برسوں میں فکشن یعنی ناول اور افسانے میں بھی اہم اور قابلِ قدر کام ہوا ہے۔ اس سلسلے میں رامانند ساگر، پریم ناتھ در، پریم ناتھ پردیسی اور ٹھاکر پونچھی کے بعد موہن یاور، علی محمد لون، ویدراہی، تیج بہادر، امیش کول، پشکر ناتھ، نور شاہ، غلام رسول سنتوش اور راقم کے نام لئے جا سکتے۔ ان میں کم و بیش سبھوں کے ناول اور افسانوی مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں، اور جدید اُردو ادب میں اپنی اہمیت تسلیم کروا چکے ہیں۔ ان سبھوں کی تخلیقات اردو کے مشہور رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان ادیبوں نے تجربے کی گہرائی، فنی بصیرت اور شخصیت کے سوز و گداز کے ساتھ کشمیر کی فکری، تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے بعض رنگین اور سنگین پہلوؤں کی مصوری کی ہے۔ رامانند ساگر، پریم ناتھ در اور پردیسی اُردو کے صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں شامل ہیں، دوسرے ادیبوں کی بعض تخلیقات اُردو کے بہترین ادب میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ کشمیری زبان کے اہم ادیب اختر محی الدین، بنسی نردوش، اور صوفی غلام محمد کی بعض کہانیاں اردو کے قالب میں امتیازی حیثیت حاصل کر چکی ہیں۔

کشمیر میں اُردو زبان و ادب کی نشو و نما میں صحافت کا بھی اہم رول رہا ہے۔ آج برسوں سے ریاست میں اردو اخبارات و جرائد جس تعداد میں شائع ہوتے رہے ہیں ان کی فہرست اور کارگزاریاں ہندوستان میں اُردو کے کسی اور مرکز کی صحافت کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ رسالوں میں یہ نام قابلِ ذکر ہیں: رتن، پریم، سویرا، جنت، کنول، گلریز، کنگ پوش رہنمائے تعلیم، وکیل، دیہات سدھار، تعمیر، سنگم، لالہ رخ، پرتاپ جھرنا، شیرازہ وغیرہ، روزناموں اور ہفتہ وار اخباروں میں یہ نام معروف ہیں۔ رنبیر، وتستا، صداقت، حقیقت، ہمدرد، خالد، جہانگیر، ابرق، ہدایت کشمیر، دیش، نور، امر، پاسبان، جمہور، نیا سنسار، خورشید، نوجوان، مارتنڈ روشنی، خدمت، نوائے قوم، رنجیت، آفتاب، پیام انقلاب، مزدور، استاد سندیش، مسلسل، چنار، آئینہ، نیا دور، الفقران وغیرہ۔

اس مقام پر ریاست کی ادبی انجمنوں اور اداروں کا ذکر بے محل نہ ہوگا جو یہاں کی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کی ترویج میں اور نتیجے کے طور پر ادبی شعور کی تعمیر میں معاون رہے ہیں۔ ان میں مختلف وقتوں میں حلقۂ احباب ذوق، انجمن ترقی پسند مصنفین۔ کلچرل کانگرس۔ انجمن سیمابیہ، انجمن ترقی اردو بزم ادب، کلچرل اکیڈیمی۔ اور ریڈیو کشمیر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ ادارے اور انجمنیں عام طور پر ادبی مباحثوں، تقریروں اور مشاعروں کا اہتمام کرتی رہتی ہیں

اُردو زبان کی تعمیر و تشکیل میں کسی ایک فرد، فرقے صوبے یا ایک لسانی گروپ کا ہاتھ نہیں۔ یہ تمام ہندوستانیوں کی مشترکہ کوششوں سے صورت پذیر ہوتی ہے۔ یہ عوام کی زبان ہے۔ اور عوام جہاں کے بھی ہوں، خواہ یو پی کے ہوں، پنجاب کے، دلی کے، حیدرآباد یا بہار اور کشمیر کے، مادری زبان کے بعد اس زبان پر اپنا حق رکھتے ہیں۔ یہ مفروضہ اب ختم ہو چکا ہے کہ اردو ہندستان کے کسی خاص خطے کی زبان ہے۔

یہ زبان ملک کے دوسرے حصوں میں بھی تہذیبی زندگی کی گہرائیوں میں اپنی جڑیں پھیلا چکی ہے اور مادری زبان کے بعد مروج اور مقبول ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں مادری زبان کے ساتھ ساتھ اُردو زبان مقامی خصوصیات اور اثرات کے تحت، اظہار کا وسیلہ بن چکی ہے۔ اور ان علاقوں میں اُردو ادب کے ذخیرے میں برابر اضافہ ہو رہا ہے کشمیر میں اس دور میں کئی ادیب اور شاعر ہیں۔ جو پورے اعتماد و انہماک سے اس زبان میں لکھ رہے ہیں۔ اور ان کی تحریروں میں جو رچاؤ پختگی اور روانی ہے وہ اُردو سے ان کے مزاج کی مناسبت اور تخلیقی فکر سے ہم آہنگی کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں کہ کشمیر کے اردو ادیبوں اور شاعروں نے اُردو شعر و ادب کے ارتقاء میں اپنا رول ادا کیا ہے اور خاص طور پر اپنے علاقے کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے کئی پہلوؤں کو فنی شعور کے ساتھ اجاگر کیا ہے اور اس کا اعتراف اُردو کے اچھے نقاد بھی کر رہے ہیں

علی محمد لون

کشمیر کی ادبی سرگرمیاں اور مشاعرے

کشمیر ایک لینڈ اسکیپ ہے، جسے قدرت نے بڑی فرصت اور فیاضی کے ساتھ اپنے موقلم سے تیار کیا ہے۔ اس کے رنگوں کی بوقلمونی، خطوں اور زاویوں کا حسن اس کا مجموعی تاثر ذہن کے پردوں پر ایک ایسے شاہکار کو ترتیب دیتا ہے جسے ضبطِ تحریر میں لانے یا زبان سے ادا کرنے کے لئے خود بھی ایک بہت ہی عظیم اور جینئس فنکار ہونا ضروری ہے۔ ہم اس مقالے میں اس لینڈ اسکیپ کی چلتی پھرتی زندگی یا دوسرے معنوں میں کشمیر وادی کے لوگوں کی ثقافتی زندگی کے ایک خاص پہلو سے بحث کریں گے۔ کشمیر ایک بہت ہی قدیم اور مہذب علاقہ ہے اس کی تہذیب اور تمدن کے چرچے قدیم زمانے سے اب تک ہوتے آرہے ہیں۔ کشمیریوں کی مادری زبان بھارت کی قدیم ترین زبانوں میں شمار ہوتی ہے اور اس کا رشتہ ویدوں کے زمانے میں رائج زبانوں سے قائم رہا ہے۔ کشمیری زبان کی قدامت کے باوجود کشمیر وادی میں وقت وقت پر سنسکرت، فارسی اور اردو زبانوں نے بھی اپنا اثر و رسوخ قائم کیا ہے خصوصاً سنسکرت زبان کی ترقی اور ترویج میں کشمیری ودوانوں کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ اجنوگپت، کشیندر، بلہن، سوم دیو اور دوسرے ودوان قدیم سنسکرت کے ایسے تابدار ستارے ہیں جو اب بھی شاعری، عروض، علمِ بیان، علمِ حیات اور افسانہ نگاری کی قدیم روایات میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کلہن کی راجہ ترنگنی سنسکرت کی تاریخی دستاویزوں میں سب سے قدیم اور مستند دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ چودھویں صدی کے بعد فارسی کشمیر کے سلاطین کی درباری زبان کا درجہ حاصل کرتی ہے اور کشمیریوں کی طباعی اس غیر ملکی زبان میں نئی سمتوں اور نئے آفاق کی تلاش میں مصروفِ کار نظر آتی ہے۔ ملا محمد طاہر غنی کشمیری، ملا محسن فانی اور فارسی کے دوسرے جید عالم اور فن کار خود ایرانیوں سے اپنے علم و فن کا لوہا منواتے ہیں اور کشمیر ایرانیوں کی نظر میں "ایرانِ صغیر" کا باعثِ فخر مقام حاصل کرتا ہے۔ اس کے بعد پھر اردو کا دور آتا ہے اور یہ زبان کشمیریوں کی دوسری زبان بن جاتی ہے۔ آج بھی ہر پڑھے لکھے گھرانے اور عام لوگوں کی دوسری زبان کا امتیاز اسی زبان کو حاصل ہے۔ گو اردو ادب کے میدان میں کشمیریوں کو وہ امتیاز اور وہ مقام حاصل نہ ہو سکا، جو انھیں سنسکرت اور فارسی زبانوں میں حاصل ہے۔ تاہم اب بھی بہت سے ادیب اور شاعر اس زبان میں لکھتے ہیں اور ملک کے اس خطے میں اُن کے دم قدم سے اردو ادب بھی آباد ہے۔ اب رہا کشمیر وادی کے لوگوں کی مادری زبان کشمیری کا سوال تو اس بارے میں ایک مختصر پس منظر بیان کر کے میں اپنے اصل مقصد کی طرف آؤں گا۔ کشمیری زبان ملک کی ایک بہت ہی قدیم زبان ہے اس کا لوک ادب بہت جاندار اور شاندار ہے۔ اس کی شعری روایات قریب چھ صدیوں سے چلی آرہی ہیں۔ خوش نصیبی کی بات یہ ہے کہ شاعری کا بیشتر حصہ یا تو چھپ چکا ہے یا قدیم

بیاضوں، دستاویزوں اور مسوّدوں کی صورت میں موجود ہے چودھوی عیسوی کی مشہور و معروف شاعرہ لل ایشوری کا کلام اب بھی زبان زد خاص و عام ہے لل ایشوری کے ہمعصر شیخ نورالدین نورانی المعروف نندہ رشی کے واکھ کئی رشی ناموں میں درج ہونے کے علاوہ لوگوں کے دل و دماغ میں بھی محفوظ ہیں۔

مُغل عہد کی شاعرہ حبّہ خاتون کے رومانوی گیت یہاں کی عورتوں کو آج بھی ازبر ہیں کشمیری شاعری اتنی مقبول اور ہر دل عزیز ہے کہ ہر عوامی محفل، تیوہار، شادی بیاہ اور خوشی و مسرّت کے دُوسرے موقعوں پر عورتیں اور مرد اسے گاتے ہیں۔ ملک کی دوسری زبانوں کی شاعری کے مقابلہ میں غالباً یہ فخر اور امتیاز صرف کشمیری شاعری کو ہی حاصل ہے کہ یہ لوگوں کی زندگی کا ایک جُزو لاینفک بن چکی ہے۔ لوک گیتوں کے مقابلے میں لوک تیوہاروں میں کشمیر کے معلوم و مشہور شاعروں کے گیت گائے جاتے ہیں۔ کشمیری نثر کی شروعات اس صدی کی تیسری دھائی سے ہوتی ہے۔ اور اس وقت نثر کے میدان میں کشمیری ادیب افسانہ نگاری، ناول نگاری، ڈرامہ نگاری، نقد و نظر اور مضمون نویسی کے شعبوں میں قابلِ قدر کام کر رہے ہیں اور کشمیر وادی کی ادبی سرگرمیوں اور مشاعروں کا سہرا انہی ادیبوں اور اُن کے ہمعصر شاعروں کے سر ہے۔

جہاں تک یہاں کی ادبی سرگرمیوں کا تعلق ہے وہ دوسری زبانوں کی ادبی سرگرمیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ لیکن مقامی آب و ہوا اور یہاں کے موسموں میں تغیر و تبدّل کے ساتھ ساتھ یہ ادبی سرگرمیاں کبھی پورے عروج پر آتی ہیں اور کبھی مایوس کن حد تک ماند پڑ جاتی ہیں دراصل ان سرگرمیوں کا آغاز موسم بہار کی آمد کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ جب یہ وادیٔ گل پوش واقعی ایک جنت ارضی کا نقشہ پیش کرتی ہے یہ سال کی پہلی اہم ادبی سرگرمی ایک موسمی تیوہار کے ساتھ تعلق رکھتی ہے جسے جشنِ بادام واری کہتے ہیں۔ بادام واری سرینگر شہر کے شمال مشرق میں قلعہ ہری پربت کی پہاڑی کے اردگرد واقع ہے۔ اور اس میں موسم بہار میں بادام کے ہزاروں پیڑوں پر سفید اور گلابی شگوفوں کی بہار آتی ہے ہر طرف پھول ہی پھول نظر آتے ہیں۔ بھینی بھینی مہک اور شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ، بچوں کا شور و غل، سماواروں میں سے نکلتی ہوئی بھاپ، سنگھاڑوں کے ڈھیر، اور ذرا دوری پر گانے والوں کی محفلیں۔ کیا ہندو کیا مسلمان سبھی اس تیوہار میں حصہ لیتے ہیں۔ یہ حال ہو تو شاعر ادیب اور دُوسرے فنکار بھی چپ کہاں رہ سکتے ہیں۔ کسی اتوار یا نوروز کے دن بادام واری میں محفلِ مشاعرہ منعقد ہوتی ہے اور مقامی شعراء ہزاروں لوگوں کے سامنے اپنا کلام پیش کرتے ہیں۔ جھوم جھوم کر ترنم سے باتحت اللفظ میں کلام اچھا ہو تو داد مل جاتی ہے اور بُرا ہو تو بے داد بھی ہو جاتی ہے۔ کشمیر کے سامعین بڑے تحمل، صبر، اور شوق کے ساتھ شاعروں کو سنتے ہیں اور اچھی چیز پر دل کھول کر داد دیتے ہیں۔ اگر کسی شاعر کی کوئی چیز گوارا حد تک بھی اچھی نہ ہو تو اُسے ہوٹ کرنے سے کبھی باز نہیں رہتے۔ مشاہدہ میں آیا ہے کہ یہ سامعین سب سے زیادہ فوقیت سماجی، سیاسی، اور مجلسی طنز کو دیتے ہیں اور ہر اچھے طنز اور ہر خوبصورت مزاح پر سر دُھنتے ہیں اس کے بعد خالص رومانوی شاعری کا نمبر آتا ہے۔ اگر بات سلیقے سے کہی گئی ہو تو بڑی سنجیدگی کے ساتھ سنی جاتی ہے۔ مہارت کے ساتھ کہی گئی ہو تو سنجیدگی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے اور اگر پوری چابک دستی اور فنکاری کے ساتھ کہی گئی ہو تو شاعر کو آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے اور تحسین و مرحبا کے شور سے آسمان سر پر اٹھایا جاتا ہے۔ شاعری میں خلوص و فنکاری تو پسند کی جاتی ہے۔ شاعر محض مہارت اور کاری گری کے برتے پر سامعین کو مرعوب کرنے کی کوشش کرے تو برسرِ عام رُسوا ہو جاتا ہے۔ یہ بات اُردو زبان کے مشاعروں پر بھی صادق آتی ہے لیکن کشمیری سامعین بعض اوقات بڑے انتہا پسند بن جاتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک کشمیری مشاعرے میں ایک نوآموز اور نوجوان شاعر نے اپنی نظم میں بڑی بے تمیزی اور بدتہذیبی کا مظاہرہ کیا تو بعض سامعین نے کھڑے ہو کر اس کے خلاف احتجاج کیا لیکن شاعر حضرت جب پڑھتے ہی گئے تو انھیں مائیکروفون سے ہٹا کر ہال سے ہی نکال باہر کیا گیا۔ اس کے بعد بہت عرصے تک ان شاعر حضرت کو کسی مشاعرے میں آنے کی ہمت نہ ہو سکی۔

کشمیر میں مشاعرے بعض خاص قومی تیوہاروں کے علاوہ عام دنوں میں بھی ہوتے ہیں۔ یوم آزادی کے موقع پر ایک کل ہند اُردو مشاعرہ ہوتا ہے جس کا انتظام، تمدن، زبانوں اور فنون سے متعلق ریاست کی اکادمی کراتی ہے بعض اوقات ریڈیو کشمیر کا سرینگر اسٹیشن اس مشاعرے کا اہتمام کراتا ہے۔ اس مشاعرے میں کشمیر کے مقامی شعراء کے علاوہ بیرونِ ریاست کے بعض نامور اور معروف شعراء بھی شریک ہوتے ہیں۔ اس دن کی اہمیت اور بیرونی شعراء کی شرکت کے پیشِ نظر بہت سے لوگ اس مشاعرے میں آتے ہیں اور اپنے جانے پہچانے شاعروں سے بار بار ان کا کلام پڑھواتے ہیں۔ اس مشاعرے پر چونکہ کسی حد تک سرکاری چھاپ بھی ہوتی ہے اور بعض سرکردہ سیاسی رہنما بھی اس میں شامل ہوتے ہیں، اس لئے پوری کارروائی بڑے نظم و ضبط اور احتیاط کے ساتھ انجام دی جاتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوگ زبان بند کر کے کارروائی میں حصہ لیتے ہیں۔ وہ ہر چیز پر داد دینے اور ہر بُری چیز پر اپنی بے زاری اور اپنی ناپسندیدگی کا کھلم کھلا مظاہرہ کرنے سے باز نہیں رہتے۔ ایک اور چیز جو ہمارے مشاعروں میں خصوصیت رکھتی ہے یہ ہے کہ ہمارے یہاں بعض پیشہ ور داد دینے یا "بیداد" کرنے والے ہیں۔ یہ لوگ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے

ہی اپنی اپنی جگہیں سنبھالتے ہیں۔ ان کی اپنی اپنی ٹولیاں بن جاتی ہیں اور یہ ٹولیاں اپنے اپنے سرغنوں کی رہنمائی میں اپنا پروگرام پوری پابندی کے ساتھ چلاتی ہیں۔ یہ ٹولیاں نہ صرف شاعروں کو ہی آڑے ہاتھوں لیتی ہیں بلکہ آپس میں بھی حملے بازیاں کرتی رہتی ہیں اور اس طرح مشاعرے کو اور بھی زیادہ دلچسپ اور خوبصورت بناتی ہیں۔ داد دینے کے ساتھ ساتھ تالیاں بجانے کا رواج ریڈیو مشاعروں کی وجہ سے چل پڑا ہے اور شاعر کے خراج یا آمد پر تالیاں بجائی جاتی ہیں لیکن جب کوئی بور قسم کا شاعر ہوٹ ہونے کے بعد بھی مائیکروفون کو تھامے رکھے تو اُسے مسلسل تالیوں کے شور سے بھگا دیا جاتا ہے۔

سرکاری اور نیم سرکاری مشاعروں کی نسبت رضاکارانہ ادبی انجمنوں کی طرف سے کئے گئے مشاعروں میں لوگ زیادہ شریک ہوتے ہیں۔ یہ بات خصوصاً کشمیری مشاعروں میں دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ انجمنیں زیادہ تر مشاعروں کا انتظام اپنے کسی مشہور شاعر کی سالگرہ یا برسی پر کراتی ہیں۔ مزارِ شاعر پر باقاعدہ فاتحہ خوانی کی رسم انجام دی جاتی ہے۔ لنگر سے لوگوں کو کھانا دیا جاتا ہے۔ دن بھر گانے والوں کی محفل جمی رہتی ہے اور شام کو مشاعرہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات اسی مرحوم شاعر کی کسی مشہور غزل کا مصرع لیا جاتا ہے اور اس طرح طرحی مشاعرہ ہوتا ہے۔ کشمیری زبان کے معروف شعراء رسول میر، مہجور، آزاد، عبدالاحد نادم، رحیم صاحب سوپوری، محمود گامی، حبہ خاتون یا دوسرے شعراء کی سالگرہوں یا برسیوں پر اکثر مشاعروں کا انتظام کرایا جاتا ہے۔

حالیہ برسوں میں ملے جلے مشاعروں کا رواج بھی چل پڑا ہے کشمیر وادی میں جتنی بھی چھوٹی بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں، اُن کے شاعر ایک ہی پلیٹ فارم پر آکر اپنا کلام سناتے ہیں اور ہر اچھی بُری چیز پر لوگوں کے اچھے یا بُرے ردِعمل کا سامنا کرتے ہیں۔ یہ مشاعرے روز بروز مقبول ہوتے جا رہے ہیں اور اس طرح کشمیریوں کی وسیع القلبی اور لسانی عصبیت سے بالاتر اُن کے ذہن کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس قسم کا ملا جلا مشاعرہ بلاناغہ ہر سال یوم جمہوریہ کی تقریب پر سرینگر میں ہوتا ہے اور اس کا اہتمام تمدن، زبانوں اور فنون سے متعلق ریاست کی اکادمی کراتی ہے۔

دوسری ادبی سرگرمیوں میں بحث و مباحثہ، سمینار اور سمپوزیم، محفلِ افسانہ اور دوسری چیزیں آتی ہیں۔ کلچرل اکادمی کبھی کبھار رائٹرس کیمپ کا انعقاد بھی کراتی ہے جو زبان اور ادب کے مسائل سے متعلق مقالے پڑھے جاتے ہیں اور اُن پر بحث کی جاتی ہے۔ علمی مضامین اور تعلیمی مسائل پر بھی مقالوں میں غور و خوض کیا جاتا ہے۔ افسانوں کی محفلیں خصوصیت کے ساتھ موسم سرما میں منعقد ہوتی ہیں اور ان میں نہ صرف افسانے پڑھے جاتے ہیں بلکہ اُن تمام رجحانات اور تحریکات سے بھی بحث کی جاتی ہے جو افسانہ نویسی اور فکشن کے شعبوں میں ملک یا بیرونِ ملک میں پائی جاتی ہیں۔ کشمیری ادیب پڑھا لکھا ہے اور کم سے کم تین زبانوں کے ادب سے واقف۔ انگریزی، اردو یا ہندی اور کشمیری، انگریزی ادب کی مطالعے کی وجہ سے دُنیا بھر کی تحریکات پر اس کی نظر رہتی ہے۔ اردو یا ہندی کے مطالعے سے ملک کے اندر نئے پرانے ادبی رجحانات اور تحریکوں سے اُس کی واقفیت رہتی ہے اور اس طرح کشمیری ادیب دورافتادہ وادی میں رہ کر بھی رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے اور اسی وجہ سے ہماری ادبی محفلوں میں جدید شاعری کی ملکی بحث سے لے کر یورپ اور امریکہ کی ادبی سرگرمیوں تک کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ اور غالباً اسی وجہ سے ہمارے یہاں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے اس میں مقامی رنگ کی موجودگی کے باوجود ایک قسم کا آفاقی اور عالمی شعور پایا جاتا ہے۔ اس میں تنگ نظری، تعصب اور تنگ دلی کا کہیں شائبہ تک نظر نہیں آتا۔

اس مقالے کو ختم کرنے سے پہلے میں اُن ادبی انجمنوں کا مختصر سا ذکر کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔ جن کی وجہ سے کشمیر میں ادبی سرگرمیاں جاری ہیں۔ سرینگر میں کشمیری ادیبوں کی مرکزی انجمن "کوشر مرکز" کا نام سرِفہرست آتا ہے یہ مرکز کشمیری زبان کی بہبودی، اس کی ترویج و اشاعت کے لئے کام کر رہا ہے۔ مرکز کی طرف سے پہلی بار سائنسی بنیادوں پر کشمیری زبان کا ایک پرائمر شائع کیا گیا ہے جو معلم اور متعلم دونوں کے لئے مفید مانا گیا ہے۔ سرینگر سے باہر سوناواری میں "حلقۂ ادب"، شوپیان میں "کلچرل فورم"، بانڈی پورہ میں "بزمِ ادب"، سوپور کی ادبی انجمن اور دوسری جگہوں کی بہت سی انجمنیں محسوس کام کر رہی ہیں۔ دیہاتی انجمنوں کی اور بھی زیادہ اہمیت ہے کیوں کہ یہ انجمنیں اکثر دور دراز دیہاتوں میں مشاعروں کا انتظام کراتی ہیں اور دوسری ادبی سرگرمیوں کے ذریعے لوگوں میں ادب اور فن سے متعلق دلچسپی اور شعور پیدا کر رہی ہیں۔ تعلیم کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ عام لوگوں میں ادب اور فن کی اہمیت کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ اور اگر ادبی انجمنیں اسی سرگرمی اور تندہی کے ساتھ کام کرتی رہیں تو وہ دن دور نہیں جب وادی کا چپہ چپہ ادب نواز اور فن شناس بن جائے گا

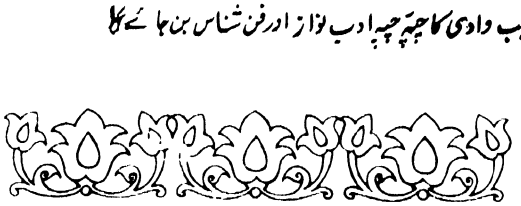

جے۔ این۔ گھنہار

کشمیر میں سیکولرازم کی روایت

پچھلے بیس برسوں میں جموں وکشمیر کو تین بار جارحیت کا سامنا کرنا پڑا لیکن تینوں بار اس دھرتی کے سپوتوں، مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں اور بودھوں نے ایک فرد واحد کی طرح جارحیت کا مقابلہ کیا۔ وہ اپنی دھرتی اور اپنے سانجھے ورثے کی حفاظت کے لئے ایک دیوار آہن بن گئے تھے۔

اُن کے اتفاق، اتحاد، اور قوت سے دشمنوں کو مایوسی ہوئی تھی۔ دوستوں نے مرحبا کہا تھا اُن کا ردیہ کچھ بیانہ تھا، یہ ایک تاریخی پس منظر رکھتا ہے کشمیر کے لوگ اپنے اپنے عقائد میں گہرا یقین رکھتے ہیں۔ لیکن وہ مذہب کو تفریق یا تقسیم کا ذریعہ نہیں بننے دیتے۔ اس کے برعکس وہ خود کو ایک ہی کنبے کا فرد سمجھتے ہیں۔ بھائی چارے اور سانجھے حسب نسب میں یقین رکھتے ہیں۔

کشمیر کی سیکولرازم کی روایت صدیوں پرانی ہے اس کی داغ بیل سمراٹ اشوک نے ڈالی تھی۔ کشمیر کے دو عظیم حکمرانوں للت ادیتہ اور سلطان زین العابدین بڈشاہ نے رواداری، بھائی چارے اور میل ملاپ کی اس روایت کو جس جس طرح تقویت دی، وہ تاریخ کشمیر کا ایک سنہری باب ہے۔ ایک دوسرے کے عقائد کا احترام اور باہمی رواداری بادشاہ اور درباریوں تک محدود نہ تھی یہ روز مرہ کی زندگی کی ایک عام خصوصیت تھی۔ ایک عام کشمیری ہندو، مسلمان اور سکھ کی مربوط سماجی اور ثقافتی زندگی کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔ مسجدوں اور مندروں کے پہلو بہ پہلو ہونے کا راز بھی ان کے اسی انداز نظر سے کھلتا ہے۔ یہ حقیقت کچھ عجیب ہے۔ لیکن حقیقت ہے کہ ہندو بچوں نے مسلمان عورتوں کا دودھ پیا ہے۔ مسلمانوں کی قبروں، کتبے سنسکرت میں ہیں۔ یہ امر اپنی جگہ بڑا خوشگوار اور حوصلہ افزا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے سنتوں، صوفیوں کا احترام کرتے اور نذر عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان، صوفی فلسفی للہ لوگیشوری کو للہ موج (للہ ماں) کہتے ہیں اور ہندو شیخ نورالدین کو "نندرشی" کہہ کر پکارتے ہیں۔ رشی مول کی برسی پر وادی کے بعض حصوں میں مسلمان گوشت تک سے پرہیز کرتے ہیں۔

کشمیر میں بھائی چارے اور رواداری کی روایت کو کشمیر کے صوفیوں، سنتوں نے فروغ دیا۔ انھوں نے اپنے عقیدت مندوں کے ذہنوں پر یہ بات نقش کرنے کی کوشش کی کہ تمام مذاہب کی بنیاد ایک ہی ہے۔ اور یہ کہ آدمی کو تنگ دلی اور تنگ نظری سے بالاتر ہو کر اچھی اخلاقی زندگی بسر کرنی چاہئے۔

اسی روایت کو بعد کے شاعروں اور مفکروں نے بڑھاوا دیا۔ اور آج کے ادیب، شاعر اور مفکر بھی یہ خوشگوار فرض ادا کر رہے ہیں کشمیر نے حالیہ برسوں میں سیکولرازم کے باب میں ایک قابل قدر رول ادا کیا ہے اہل کشمیر نے اپنے سیکولر ورثے اور ثقافت کو برقرار ہی نہیں رکھا بلکہ بھارت بھر میں سیکولرازم کی روایت کو سنائے رکھنے میں اہم خدمت انجام دی ہے۔

موتی لال جیل خانی

کشمیر میں جدید تحریک کی ابتدا

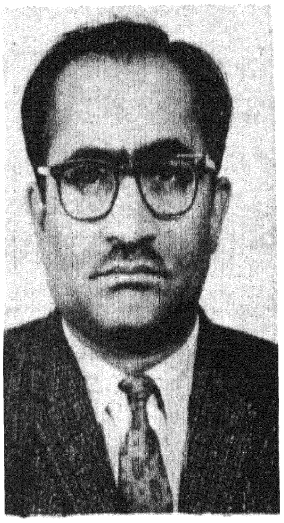

۱۹۴۷ء کے بعد سے کشمیر میں علم و ادب، فن اور ہنر کے نشاۃ ثانیہ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ شاعر، مصنف، فن کار، دستکار اور مصور غرض ہر شخص اپنی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق کشمیر کی عظمت دیرینہ کو واپس لانے میں لگ گیا جس کے لئے تواریخ کے اوراق میں کشمیر کو ہندوستانی تہذیب و تمدن کے تاج کا درجہ دیا گیا ہے۔

۱۹۴۷ء سے پہلے آرٹ اور فن مصوری کی جدید معنوں میں کوئی تحریک کشمیر میں موجود نہ تھی۔ اس کے بھی کئی تواریخی، سیاسی اور سماجی وجوہ ہیں۔ کشمیر کی قدیم تاریخی کتاب پنڈت کلہن کی راج ترنگنی سے ایسی کئی شہادتیں ملتی ہیں کہ قدیم زمانے میں کشمیر میں فن مصوری کا ایک منفرد اسکول رہا ہے اور ایسے کئی کشمیری فنکار ہوئے ہیں جنہیں اس فن میں کمال حاصل تھا۔ مگر زمانے کے حوادث سے ان فنی نمونوں کا اب نشان تک بھی کہیں باقی نہیں رہا ہے۔ اس بات کی پکی شہادت مل سکتی ہے کہ کشمیر میں مصوری کا فن کسی زمانے میں کمال عروج پر رہا ہے اور یہاں کے عوام کو اس فن سے گہری دلچسپی رہی ہے جس کا ایک ثبوت کشمیری پنڈتوں میں مروج ایک تہوار ہے۔ موسم بہار میں جب برفانی پہاڑوں کی برف سورج کی تپش سے پگھل کر کالی کالی مٹی میں جذب ہو کر بادام کے درختوں سے شگوفوں کی شکل میں پھوٹ نکلتی ہے تو چاروں طرف مسرت اور امید کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ انہی دنوں چیت مہینے کی چاند کی تیج کو کشمیری پنڈت اپنے گھروں میں ایک اُتسو منانے ہیں، جسے "گورہ ترے" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس روز کشمیری پنڈتوں کے محل پروہت اپنے ہر عقیدت مند کو ایک قلمی تصویر پیش کرتے ہیں۔ اس تصویر کو بھی گورہ ترے" کہتے ہیں۔ اس تصویر کو حاصل کرنا لوگ اپنے لئے نیک فال سمجھتے ہیں۔

"گورہ ترے" نام اس تصویر میں عوامی انداز سے آبی رنگوں سے چترکاری کی جاتی ہے اور بیچ بیچ میں خوش نویسی بھی کی گئی ہوتی ہے۔ اسی اعتبار سے یہ گمنام فنکار آج Caligraphic کردار اور خارجی ماحول سے اخذ شدہ مختلف صورتوں کو ایک ساتھ پیش کر کے کچھ ایسے انداز سامنے لاتے ہیں کہ ان میں سے جدیدیت کی جھلک ابھرنے لگتی ہے۔ "گورہ ترے" کے سوا قدیمی کشمیری مصوری کا کوئی بھی نام و نشان باقی نہیں ہے مگر اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے مصوری نام کی کوئی چیز وادی میں نہیں تھی۔

مُو قلم اور رنگوں سے اپنی داخلی اور خارجی کیفیتیں اور محسوسات کا اظہار پیپر ماشی، شالبافی، قالین سازی اور سوزن کاری جیسی دستکاریوں سے ہوتی رہی ہے مگر ۱۹۴۷ء سے پہلے کے کشمیری فنکاروں کی تصویر کشی کی

ہمارے سامنے کوئی ٹھوس مثال نہیں ہے۔ پھر بھی ماضی قریب یعنی آزادی سے پہلے کے دور میں کشمیر میں دینا ناتھ المسٹ لینڈ سکیپ پینٹنگ یعنی قدرتی مناظر کشی میں چونکہ اچھا نام پیدا کر گئے تھے اور اُن کے تیار کئے ہوئے قدرتی مناظر پسند کئے گئے تھے چونکہ یہ دَور رقوم پرستی کا ایک دور تھا اس لئے المست مصوری کے شانتی نکیتن اسکول سے متاثر نظر آتے ہیں۔ المست کے علاوہ دوست محمد رالی بھی شوقیہ آبی رنگوں سے Landscape تصویریں بناتے ہیں اُن کے علاوہ بہت ایسے قابل ڈرائینگ ماسٹر تھے جو از راہ شغل کبھی کبھی آبی اور روغنی رنگوں سے تصویریں بناتے تھے۔ ان میں سے شونا تھ رینہ، کاشی ناتھ بھان دینا ناتھ رینہ، محی الدین، ستہ لال کھروا اور رام چند وانٹو قابل ذکر ہیں رام چند وانٹو ڈرائنگ ماسٹر نہ تھے بلکہ انھوں نے تصویریں بنانا آخری دنوں میں بطور پیشہ اپنایا تھا

۱۹۴۷ء کے انقلاب سے تقریباً دو سال پہلے سوم ناتھ بٹ اور سوم ناتھ کھوسہ پہلے کشمیری نوجوان مصور تھے جنہوں نے مستقل طور سے مصوری کو ایک پیشے کے طور اپنایا۔ کھوسہ روایتی قسم کی تصویریں بنانے لگے تھے۔ مگر بٹ کے ہاں کچھ ایسی خصوصیتیں تھیں کہ وہ ابتدائی ایام سے ہی ممتاز رہے۔ مگر اس دور میں مصوری کے پیشے میں زبردست رکاوٹ تھی، جو سرپرستوں کی کمی کی وجہ سے تھی۔ (اس بات کا اندازہ لگانا قدرے مشکل ہے کہ ایک وسیع ریاست ہونے کے باوجود کشمیری مصوروں کو سرپرستوں کی کمی کیوں رہی؟ —)

۱۹۴۷ء کے آواخر میں بمبئی کا ایک نامور ہندوستانی مصور رضا کشمیر آیا ہوا تھا۔ رضا کو یہاں کے فن کاروں میں فنی صلاحیتوں کی کوئی کمی نظر نہیں آئی۔ ہاں ایک کمی کا احساس ضرور ہوا۔ یہ کمی تنظیم اور پہل کی تھی اس کا ازالہ رضا نے خود کیا۔ رضا کی ایما پر سومناتھ بٹ۔ ترلوکی کول، اور پرتھوی ناتھ کاچرو نے مصوروں کی ترقی پسند انجمن کی داغ بیل ڈالی۔

مصوروں کی انجمن کے وجود میں آتے ہی نئے ڈھنگ سے فنی تخلیقات کی شروعات ہوئی۔ روز نئی نئی تصویریں بنائی جانے لگیں۔ تصویروں پر تنقید کا رواج شروع ہوگیا۔ دوران تنقید نئی نئی باتیں سامنے آنے لگیں۔ تنقید کے نئے زاویے اور معیار قائم ہونے لگے نئے سٹائل، تکنیک اور طرز اظہار اور تاثر کے چرچے ہونے لگے۔ پکاسو، پال کلی، کنڈسکی، روبن منز، میکائل انجلو، اور لیناردو کے نام گنائے جانے لگے حتیٰ کہ مونا لزا جدید کشمیری شاعری میں علامت کے طور پر آنے لگی۔ انگریزی پڑھے لکھے نوجوان یورپ میں مختلف طرز مصوری کا مطالعہ کرنے لگے اور مصوری کے اُوپر زیادہ سے زیادہ نوجوان فن کار اپنی توجہ صرف کرنے لگے۔ ایک معمولی سی ابتدا ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔ اور مضبوط جڑیں پکڑنے لگی۔ کچھ لوگ تو سنجیدگی سے مصوری کو اپنا پیشہ بنانے کی بات سوچنے لگے۔ ترلوک کول اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ جب اپنے ابتدائی ایام میں پینٹنگ کی مشق کرتا تھا تو مجھے اپنے گھر والوں کی نظریں بچا کر ایسا کرنا پڑتا تھا وجہ یہ تھی کہ ان دنوں مصوری کو کوئی معزز پیشہ نہیں سمجھا جاتا ہے۔

آہستہ آہستہ اس انجمن نے کافی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا، غلام رسول سنتوش، شارعزیز، بنسی پارمو اور دیگر کئی نوجوان مصوروں نے انجمن کی میٹنگوں میں شرکت کی۔ فن کاروں نے فن کی پختگی کے لئے ریاض شروع کیا انجمن کے ہفتہ وار اجلاس ان کو آرٹ کی تصوری کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرانے میں ممد ثابت ہوئے۔ فنکاروں نے سماجی حقیقت پسندی، فطرت پسندی، تاثر، اظہاریت اور تجریدیت کو اپنانا شروع کیا نئے تجربات کا جذبہ اُجاگر ہوا۔ وادی کے فنکار یورپ کے اصلی فنی نمونوں کی چھپی تصویروں سے اور اجنتا، ایلورا، کھاجوراہو، کونارک، مغل، راجپوت، بسوہلی، کانگڑہ اور دیگر پہاڑی اسکولوں کی روایات اور رواج سے واقف ہونے لگے۔

وادی کشمیر کے بارے میں شاعر نے کہا ہے کہ یہاں کی ہر شاخ شاخ گل ہے۔ اور ہر شاخ گل شاخ ثمر ہے۔ قدرت نے اس وادی کو ایسے حسین و جمیل مناظر سے نوازا ہے کہ اس کے مکمل اظہار بیان میں کبھی کبھی تخیل بھی عاجز رہتا ہے۔ یہاں کے عظیم باغات، جنگل، گلپوش وادیاں ہرے بھرے سبزہ زار، زرق برق کرتی ہوئی برف پوش پہاڑی چوٹیاں بلور کے مانند شفاف میٹھے پانی کی جھیلیں، سیمابی ندی نالے، یہ سب ہی مل کر اس گل اندام وادی کو بہشت بریں کا درجہ دلواتے ہیں۔ اسی لئے یہاں کے فن کاروں میں فن کا خمیر جبلی طور پر موجود ہے جو ان کو اپنی مٹی سے ہی حاصل ہوا ہے۔ کشمیر میں کوئی بھی ایسی نئے موسم یا دوسری کوئی چیز نہیں ہے جس سے شاعر و فن کار یا مصور کو فیضان اور وجدان حاصل نہ ہو۔ اور تخلیقی عمل کے لئے تحریک حاصل نہ ہوتی ہو

میں اوپر بتا چکا ہوں کہ سوم ناتھ بٹ رضا کے آنے سے پہلے بھی آبی رنگوں سے منظر کشی کیا کرتے تھے۔ رضا کے آنے سے ہی بٹ کے فن کو جلا ملی۔ رنگوں کے مزاج، ان کے امتزاج اور ان کے قوت تاثر پر بٹ کو کمال حاصل ہونے لگا۔ اور وہ رنگوں کے استعمال میں جدت سے کام

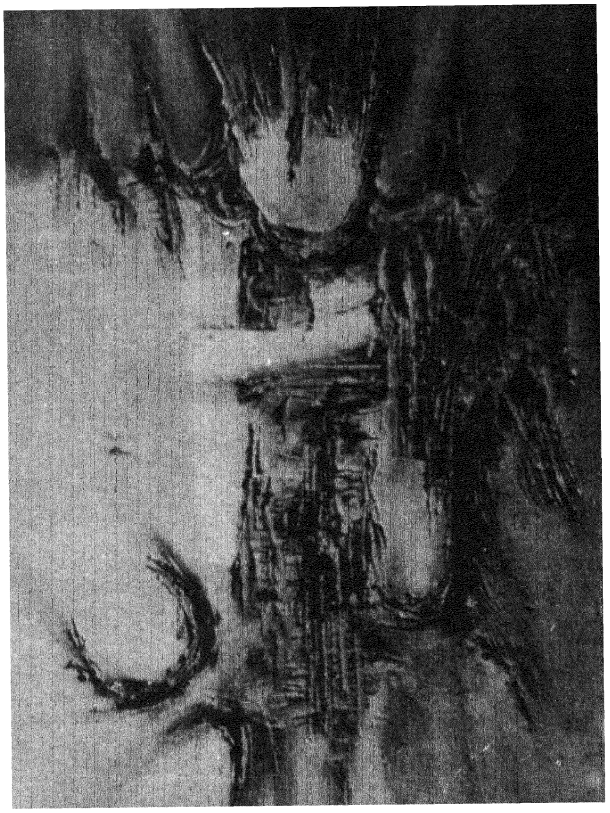

روغنی
تصویر
عمل:
پی۔ این۔ کاچرو

ترلوک کول نے فنِ مصوری میں باضابطہ تربیت حاصل کی ہے اور اس فن میں سند یافتہ ہیں۔

کول اپنے متعلق لکھتے ہیں: "جب میں نے یہ تصویر بنانی شروع کی تو اُس وقت میرا ذہن بالکل کورا تھا صرف ایک موڈ تھا۔ ایک اندرونی خلش تھی کہ مجھے آج پینٹ ضرور کرنا ہے۔ کنویس میرے سامنے ایزل پر چڑھا ہوا تھا۔ برش میرے ہاتھ میں تھا۔ مختلف روغنی رنگ میرے سامنے تیار تھے۔ ذہن ایک کشمکش میں مبتلا تھا کہ شروع کروں تو کہاں سے کروں۔ اچانک ہی میرا برش سرخ عنابی رنگ سے جا لگا۔ بس کیا تھا ایک مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ عنابی رنگ نے ایک مسئلہ تو حل کر ہی دیا تھا کہ اس رنگ کو شروع کروں۔ مگر یہ رنگ کنویس پر کس انداز سے رکھا جائے۔ یہ کوئی کم پیچیدہ مسئلہ نہیں تھا۔ یہ سوالیہ نشان بار بار ذہن میں اُبھرتا تھا۔ مگر۔۔۔ میری متلاشی نظریں چاروں اور کنویس پر گھوم رہی تھیں کہ اچانک میری نظر کنویس کے اس حصے پر جا ٹکی جہاں پر ایک مستطیل لکڑی کا ٹکڑا کنویس کے پیچھے اسٹریچر کے سہارے کے لئے رکھا گیا تھا۔ میرا مسئلہ حل ہو گیا عنابی رنگ سے بھرا برش

پی۔ این۔
کاچرو

لینے لگا۔ مگر رفتہ رفتہ مصوری سے ان کی دلچسپی کم ہونے لگی۔ اب بٹ کشمیر سے اسکول آف ڈیزائن میں ایک افسر ہیں۔

پرتھوی ناتھ کاچرو بھی اسکول آف ڈیزائن میں ملازم ہیں۔ کاچرو کا اسلوب اور طرزِ اظہار کئی ارتقائی منزلوں سے گذر چکا ہے۔ وہ بھی زمانہ تھا جب وہ فن برائے زندگی، سماجی حقیقت پسندی اور دیگر خیالات کو طرزِ اظہار کے لئے مقدّم سمجھتے تھے۔ لیکن اب اظہاریت اور تجریدیت کو اپنانے کے لئے پورے طور سے کوشاں ہیں۔ بقول ان کے وہ اپنے آپ کو سیزان سے متاثر سمجھتے ہیں ذاتی طور سے مجھے کاچرو کے رنگوں نے کبھی متاثر نہیں کیا۔

ترلوک کول بھی کشمیر کے ممتاز مصوروں میں ہیں۔ کول نے نہ صرف کشمیر و ہندوستان بلکہ ملک سے باہر بھی مصوری کے میدان میں کافی نام پایا ہے۔ مصوری میں کول نے قومی اعزاز یعنی للت کلا اکاڈمی ایوارڈ کا بھی حاصل کیا ہے۔ تصویروں کی نمائشوں میں کول کی تصاویر زیبِ نمائش رہ چکی ہیں۔ وہ روغنی رنگوں کو بڑی چابکدستی سے استعمال کرتے ہیں۔

میں نے اس کے ساتھ ساتھ کنویس کے اس سرے تک پھیر دیا۔ ایک متوازی برش اسٹروک نمایاں کنویس پر میرے سامنے دو رنگ تھے۔ عنابی جو میں نے لگایا تھا اور دوسرا کنویس کا سفید رنگ۔ اب مجھے دو رنگوں میں توازن پیدا کرنا تھا۔ میں نے عموداً ذرا اور ہلکے سرخ رنگ کا ایک برشی اسٹروک کنویس پر دیا۔ بس اب کیا تھا میرا برش کنویس پر رقصاں ہوا۔ جہاں تہاں برش سے مختلف رنگوں سے آڑے ترچھے اسٹروک پڑنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے تصویر مکمل ہونے لگی۔ کہیں تصویر سے لینڈ سکیپ کا اور کہیں مکانوں کی ان ڈھلواں چھتوں کا گمان ہونے لگا جو عام طور پر سرینگر میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پھر میں جانتا ہوں کہ یہ وہ گھر نہیں تھے یہ تو میرے لاشعور سے چھن چھن کے کنویس پر منعکس ہوئے تھے۔ کول کا کہنا ہے کہ یہی ان کی پینٹنگ ہے اور کہتے ہیں کہ Henry Matisse بھی ایسے ہی کیا کرتے ہیں۔

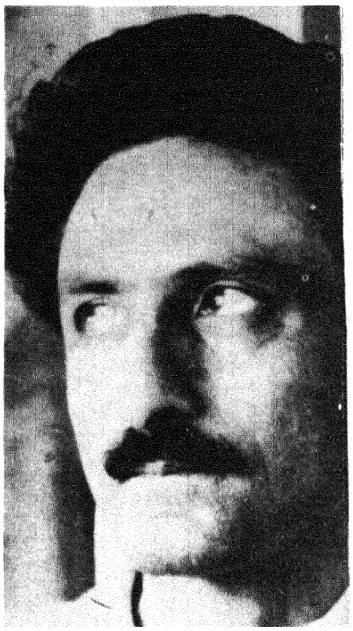

تروکھ کول

کول فن میں ہیئت کو مواد پر ترجیح دیتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ ایک قسم کے فارملزم کے شکار نظر آتے ہیں۔ یہی ایک بڑی وجہ ہے کہ ان کی تصویروں میں جذباتی کیفیت کا فقدان نظر آتا ہے اور اسلوب ہر شے پر غالب نظر آتا ہے۔

غلام رسول سنتوش نہ صرف کشمیر کے بلکہ ہندوستان بھر کے چند چوٹی کے مصوروں میں سے ایک ہے۔ ہندوستان میں ماڈرن پینٹنگ کے درخشندہ فنکاروں میں سنتوش کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ مصوری کے میدان میں سنتوش نے اپنی قابلیت اور ریاضت سے اپنے لئے ایک مخصوص مقام حاصل کیا ہے۔

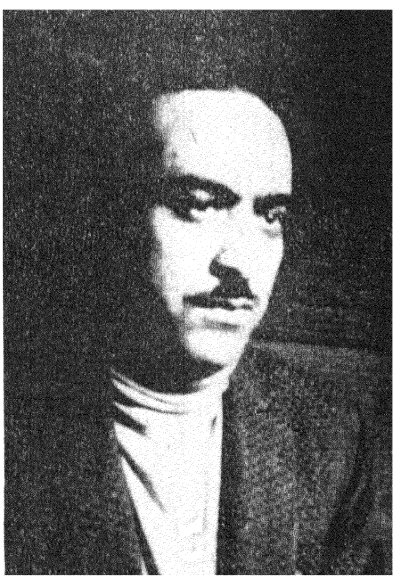

غلام رسول سنتوش

مصوری کے بنیادی جزویات Space ہیئت اور رنگوں کے استعمال پر سنتوش کو مکمل عبور حاصل ہے۔ سنتوش کے آج کل کے مسائل اس کے روحانی مسائل ہیں۔ ان مسائل کو وہ اپنی صلاحیت، اپنے مزاج، اپنی انفرادیت اور اپنی تخلیقی اپج کے مطابق پیش کرتا ہے۔ سنتوش کو موجودہ مشینی دور نے فرار پر آمادہ کیا ہے وہ مابعد الطبیعاتی تصورات کی تہہ میں جا کر پیچیدہ قسم کی سجاوٹ، ٹیکسچر اور اس کے پیٹرن، رنگوں کا نفیس نازک اور متوازن امتزاج تمثیلات، لے آمیز لائنیں، رنگوں کی ہم آہنگی، سمبلز اور موٹو کے ذریعے سے اپنی اندر کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ سنتوش زماں و مکاں کی قید سے نجات چاہتا ہے وہ اپنی شخصیت کی تکمیل چاہتا ہے لیکن اس کی اپنی آنکھوں کے سامنے انسانی عظمت کا ایک کربناک المیہ ہے۔ اور خود وہ اس کا ہیرو بنتا جا رہا ہے۔ سنتوش کی تمام تر کوشش یہی ہے کہ وہ اس المیہ کو ابدیت عطا کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

فنی معاملات میں سنتوش کسی خاص طرز کا مقلد نہیں ہے۔

جنوری ۱۹۶۹ء

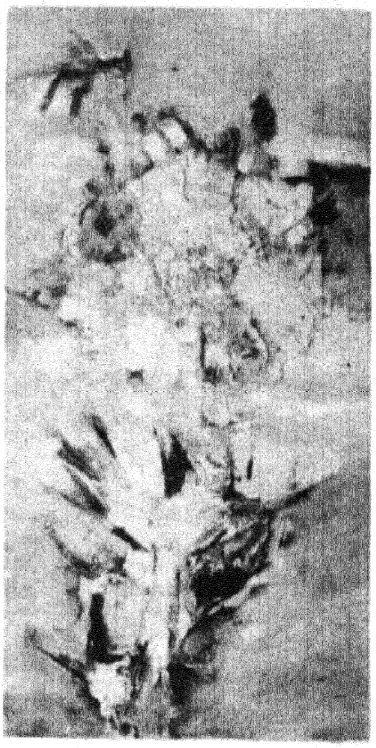

دوغلی تصویر
عمل:
بھوشن کول

بھوشن
کول

آرٹس کے شعبے میں لیکچرار ہیں۔ اُن کے علاوہ بھوشن کول اور کشوری کول بھی بڑودہ سے تربیت یافتہ اور سند یافتہ ہیں جموں کے پنڈت سُنسار چند بسوہلی اسکول کی مصوّری کے استاد مانے جاتے ہیں اور وہ جدید پینٹنگ کے طرزِ اظہار سے کافی متاثر ہیں۔ ودیا رتن بھی بڑودہ میں بت تراشی کی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔

کشوری کول کشمیر کی موجودہ دور کی واحد خاتون مصور ہیں Still life پینٹ کرنے میں کشوری کول کو کافی ملکہ حاصل ہے۔ کشوری نے مصوری کو اپنا پیشہ بنایا ہے۔ ان کے علاوہ پران کشور، محمد صادق، مہاراج کشن، موہن رینہ غیور، گوکل ناتھ۔ گیتا اور رشین کاؤنئی پود کے مصور ہیں اور ایک نئی اور روشن صبح کے ضامن ہیں۔

وہ اثریت، اظہاریت اور تجریدیت کے دور سے گذر چکا ہے آج وہ کشمیر کے شیو فلسفے سے بہت زیادہ متاثر نظر آتا ہے تانترک فلسفے کے مسائل اس کے اپنے مسائل نظر آتے ہیں۔

سنتوش جس حُسن اسلوب سے سفید، زرد، سبز، سُرخ اور کالے رنگ کا استعمال کرتا ہے اس کی مثال وہ خود آپ ہی ہے۔ ہیئت کو اس کی تصویروں میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ مگر ہیئت اس کی تصویروں پر غالب نہیں ہے بشبیہہ کی تشکیل میں اسے کمالِ قدرت حاصل ہے۔

اُس کی "شکل ابوسار کھا اور شکتل" نام کی تصویریں بہت مقبول ہوئیں۔ دو بار سنتوش کو للت کلا اکادمی کا قومی اعزاز بھی ملا۔ دنیا کی بڑی بڑی عالمی مصوری کی نمائشوں میں اس کی تصویریں شامل کی گئی ہیں۔

سنتوش کے علاوہ نثار عزیز، بنسی پارمو، اور رتن پارمو کشمیر کے جدید مصوروں میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ رتن پارمو نے بڑودہ یونی ورسٹی سے فائن آرٹس میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔ رتن پارمو نے لندن میں میوزولاجی

نسوری کول

محمد یٰسین

کشمیری لباس اور زیورات

کشمیر ہر دور میں مختلف تہذیبوں کا سنگم رہا ہے۔ اس جنت بے نظیر کے کتنے ہی شیدائی چہار اطراف سے کوہ و بیابانوں کو عبور کرتے ہوئے وطن سے دور غریب الوطنی کے مصائب اٹھاتے ہوئے آئے اور پھر اسی دیار کی خاک کے پیوند ہو کر رہ گئے۔ یہاں کے گل پوش مناظر میں ہر نو وارد کے انداز فکر و عمل کی از سر نو تشکیل ہوئی۔ کچھ جو انتہائی جنگجویانہ عزائم کے ساتھ اس وادیٔ شاداب میں وارد ہوئے تھے خلاف توقع کسی قسم کی مزاحمت نہ پا کر یہیں بس گئے۔ کچھ جو راہبانہ لبادے اوڑھے مقدس صحیفوں اور الہامی کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے آئے تھے خانقاہوں اور معبدوں کی پناہوں میں بیٹھ گئے۔

اہل کشمیر نے ہر آنے والے کا استقبال خندہ پیشانی سے کیا اور اپنے انداز زیست کے ساتھ نو وارد کے تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی اقدار کو ہم آہنگ کرنے کی سعی میں مصروف ہو گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آریائی، بودھی، ایرانی، ترکستانی اور نہ جانے کن کن قدیم و جدید تہذیبوں کا عکس کشمیر کی تہذیبی زندگی کے آئینے میں ملتا ہے تاہم یہ عکس گردش وقت کے ساتھ ساتھ اس قدر مبہم ہو چکا ہے کہ کشمیریوں کی تہذیبی انفرادیت کے وجود کی محض ایک پرچھائیں ہی سی بن کر رہ گیا ہے۔

تاریخی تحقیق کے جدید اصولوں کے مطابق کسی بھی قوم کی ثقافتی زندگی کا جائزہ لیتے وقت صرف فنون لطیفہ، ادب، اور سائنس کو ہی ملحوظ نظر نہیں رکھا جاتا کیوں کہ یہ عمل اس وقت تک نامکمل سمجھا جاتا ہے جب تک کہ داخلی کیفیات کے باب میں ان کے رسوم و رواج، خوراک، ملبوسات و آرائش، مشغلوں اور روزمرہ کے بیشتر اہم پہلوؤں کا غائر تجزیہ نہ کیا جائے۔

کشمیر کی قدیم تہذیبی زندگی پہ تحقیق کرنے والے محققین کے ہاتھ صرف چند کرم خوردہ مستند و غیر مستند دستاویزوں کے سوا کچھ نہیں آیا۔ آج کا مورخ انھیں کی روشنی میں ماضی کے اندھیرے غار میں اتر کر حقائق کی جستجو کرتا ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ تحریری مآخذوں کے فقدان کے باعث کشمیر کی تہذیبی اقدار کے مکمل ارتقاء کے لئے موثر و مدلل ثبوت فراہم کرنا مشکل ہی نہیں کسی حد تک ناممکن بھی ہے۔

بہر حال اہل کشمیر کے فطری احساسات، طبعی میلانات اور دستیاب تاریخی شواہد کی مدد سے یقین کی حد تک تصور کیا جا سکتا ہے کہ ہر دور میں ان کی مجلسی زندگی انقلابات و تغیرات سے دوچار رہی ہوگی اور ہر نو وارد قوم کے آنے پر انہیں کچھ پرانی قدروں کو ترک اور کچھ کو اپنانا پڑا ہوگا۔

مذکورہ باہمی ارتباط یا تہذیبی اختلاط کا سب سے قدیم تحریری بیان نیل مت پران (عہد تصنیف چھٹی یا ساتویں صدی عیسوی) ملتا ہے۔ یہ کتاب وصف الخاص عہد کشمیر کے قدیم دیومالائی تخیل اور فطرت کے رموز و اسرار کے بارے میں ان کے مذہبی نکتہ نگاہ کی نشاندہی کرتی ہے لیکن ساتھ ہی اس میں عہد قدیم کے سماج و اقتصادیات اور فنون لطیفہ وغیرہ کا ایک مبہم سا خاکہ بھی ملتا ہے۔

نیل مت میں ملبوسات کے لئے مختلف الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ان

ؔ وستر۔ امبر۔ واسس۔ واسیس۔ چینا شوک (چین سے لایا گیا ریشم) (سلسلہ اگلے صفحہ پر)

تمام الفاظ کا لسانی تجزیہ کرنے یا انھیں بعد کے ادوار میں تخلیق ہوئے سنسکرت ادب کے شہ پاروں میں مستعمل الفاظ سے مطابقت دینے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اہلِ کشمیر کا لباس بلا تمیز مرد و زن زمانہ قدیم میں بھی دو ہی ملبوسات پر مشتمل ہوتا تھا ایک جسم کے اوپری[1] حصے کو ڈھانکنے کے لئے اور دوسرا نچلے[2] دھڑ کو اور یہ ملبوسات رنگین یا سفید ہر طرح کے ہوتے تھے۔ اس بیان کی اضافت میں کچھ آثارِ قدیمہ کی شہادت سے سر پر ایک قسم کی پگڑی کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے۔

اگر نیل مت کا عہدِ تصنیف چھٹی یا ساتویں صدی بعد از مسیح گردانا جائے تو تقریباً اسی عہد کا ایک اور تحریری ثبوت ہمیں چینی سیاح ہیون سانگ کے سفرنامے سے ملتا ہے جس میں اس نے بلاکم و کاست ۶۳۲ء سے ۶۳۵ء تک کشمیر میں اپنی اقامت کے باب میں یہاں کے موسم سرما کی شدت اور اہلِ کشمیر کے ملبوسات کا ذکر کیا ہے جو بیشتر چمڑے یا پھر سفید دھاگے کے بنے ہوئے ہوتے تھے۔

دوسری مستند روایات کے مطابق کشمیری عورتیں ساڑھی بھی پہنتی تھیں۔ کئی جگہوں پر چھوٹی چھوٹی صدریاں جن پر کہ بیل بوٹے کشیدہ کئے ہوتے تھے پہنی جاتی تھیں۔ بعض اوقات چہرے کو ڈھانپنے کے لئے ایک مہین سا نقاب بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ ہارون[3] میں پائے جانے والے آثارِ قدیمہ میں سے ایک ٹائل پر پھولوں کا گلدان اٹھائے ہوئے ایک عورت کی شبیہہ ہے جس نے بہت ہی مہین لباس کے ساتھ سر پر ایک تکونی سی پگڑی باندھی ہوئی ہے۔ ایسی ہی ایک اور دوسری ٹائل پر ایک رقاصہ کی شبیہہ ہے جو مذکورہ طرز کی شلوار پہنے ہوئے ہے۔

ہارون میں دستیاب ہوئے ان آثارِ قدیمہ میں مردوں کی شبیہیں ظاہر کرتی ہیں کہ وہ ڈھیلے ڈھالے پائجامے اور سر پر ترکمانی قسم کی ٹوپی پہننے کے عادی تھے۔ اگرچہ ماہرینِ علوم آثارِ قدیمہ ہارون میں ملنے والے آثار کے بارے میں کسی وثوق امر کا انکشاف نہیں کر سکے تاہم عام خیال کے مطابق اہلِ کشمیر مسیح کی پیدائش کے بعد ہی ان وسط ایشیائی ملبوسات سے متاثر ہوئے ہوں گے۔

سلاطین کے عہد میں کشمیریوں کی سماجی زندگی پر زیادہ تر ایرانیوں اور ترکستانیوں کے طرزِ زندگی کا اثر رہا۔ جہاں کشمیریوں نے مختلف فنون کے باب میں ایرانیوں اور ترکستانیوں سے بہت کچھ سیکھا وہاں اُن کے لباس عادات و خصائل، خوراک اور مذہبی عقائد کو بھی مصلحتاً اپنا لیا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کشمیریوں نے اس بارے میں اپنی انفرادیت کو بہر طور برقرار رکھنے کی سعی کی۔

کشمیری لباس ۔ ایک جائزہ

کشمیری انتہائی مصالحانہ فطرت اور ہر چیز کو اپنانے کا جذبہ رکھتے ہیں اور لباس کے مسئلے پر ان کے خیالات قطعی متعصب یا اُن کا نکتہ نظر محدود نہیں ہے۔ ہندوستان میں پہنے جانے والے تقریباً تمام ہی ملبوسات کشمیر میں پہنے جاتے ہیں۔ پھر بھی کشمیر میں پہنے جانے والے کچھ لباس باقی ہندوستان میں مستعمل ملبوسات سے بالکل مختلف ہیں۔ نیچے ان کا ایک مختصر سا جائزہ لیا گیا ہے۔

پھرن

پھرن ایک طرح کا ڈھیلا ڈھالا چوغہ ہوتا ہے جس کی لمبائی تقریباً گھٹنوں ٹخنوں یا پھر ایڑیوں سے تھوڑی اوپر ہوتی ہے۔ بازو کف کے بغیر لمبے اور کھلے ہوتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ کشمیریوں کا قومی لباس بھی ہے۔ کیوں کہ بلا تمیز مذہب و نسل سب ہی اسے پہنتے ہیں۔ اگرچہ بدلتی ہوئی اقدار سے متاثر لوگ اب عام طور پر اسے پہننے سے احتراز کرتے ہیں تاہم گھروں میں اب بھی پھرن ہی پہنا جاتا ہے۔ پھرن تقریباً ہر کپڑے کا بنایا جاتا ہے اور مختلف موسموں کے مطابق کپڑے کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ مرد خاص طور سے پٹو یا پھر کسی دوسرے اُونی کپڑے کا پھرن پہنتے ہیں۔ فیشن ایبل لوگ پھرن کے کالر بھی رکھتے ہیں اور گلے کو بند کرنے کے لئے مختلف اقسام کے طلائی بٹن یا کوئی زنجیر وغیرہ استعمال کرتے ہیں عورتوں کے لئے بنے ہوئے پھرن زیادہ سبک اور دلکش ہوتے ہیں۔ کپڑے کے سادہ ہونے کی صورت میں رنگین دھاگوں یا طلے سے پھرن کے اُوپری حصے، گھیرے اور بازوؤں کے کھلے ہوئے کناروں کو کشیدہ کیا جاتا ہے کشمیری بہترین کشیدہ کار ہیں اور اس فن کو بڑی مہارت کے ساتھ برتتے ہوئے پھرن کو زیادہ سے زیادہ دلکش بنا دیتے ہیں طلے سے کشیدہ کئے ہوئے پھرن اکثر و بیشتر شادی بیاہوں کے موقعوں پر دُلہن کو جہیز وغیرہ میں دیئے جاتے ہیں۔

پھرن چاہے اُونی ہو یا سوتی ہر صورت میں اس کے اندر کسی کم قیمت والے سفید سوتی کپڑے کا ایک اور پھرن سا پہنا جاتا ہے۔ جسے کشمیری میں پوز کہتے

(بسلسلہ پچھلا صفحہ) کمبل (ایک اونی چادر) پرورنا (ایک قسم کا کمبل جس کا ذکر نئے سال کی برفباری کے ساتھ آتا ہے) سیور (بھکشو کا لباس) وغیرہ وغیرہ

[1] انگ رکشک (جسم کی حفاظت کرنیوالا) جو شاید بگڑتے بگڑتے اب انگرکھا ہو گیا ہے۔

[2] ادھارانشوک Lower Garment

[3] سرینگر شہر کے شمال و مشرق میں گیارہ بارہ میل دور ایک مقام تلفظ (ہارون)

کشمیر یوں کا عام لباس ۔ پھرن

ہیں۔ عام کشمیریوں کے کہنے کے مطابق وہ صرف اصلی پھرن کو میلا ہونے سے بچانے کے لئے اندر پہنا جاتا ہے اور کپڑوں کو بھاری اور قیمتی کپڑے کو بار بار نہیں دھویا جا سکتا اس لئے 'پوز' کا پہننا اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

پھرن کے اندر کی طرف اصل کپڑے کے ساتھ کسی قسم کی تہہ نہیں لگائی جاتی اور صرف کپڑے کو ہی مختلف پیمائشوں پر کاٹ کر جوڑ لیا جاتا ہے اگرچہ عام طور سے پھرن کو درزی لوگ ہی سیتے ہیں۔ تاہم کچھ لوگ اسے بہ آسانی گھر ہی پر تیار کر لیتے ہیں۔

'پھرن' اگرچہ کشمیر میں بلا لحاظ مذہب وملت پہنا جاتا ہے، تاہم مختلف طبقوں یا فرقوں کے لحاظ سے اس میں کچھ نہ کچھ خصوصیت ممتاز رکھی جاتی ہے جس سے عام لوگوں کو لباس کے پہننے والے کے خاندان یا طبقے کا پہلی ہی نظر میں اندازہ

لہ پھرن کے اندر پہنے ہوئے اس سوتی چوغے کا ایک اور مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ کانگڑی میں پڑی ہوئی آگ کی تپش پھرن کے اصلی کپڑے پر اثر انداز نہ ہو کیوں کہ ایسا ہونے کی صورت میں کپڑے کے جل جانے یا اسکے ریشوں کے کمزور پڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

ہو جاتا ہے مثلاً ممتاز کشمیری مسلمان گھرانوں میں پھرن کی ایک خاص قسم پہنی جاتی ہے جسے کشمیری میں 'کراپ دار' کہتے ہیں۔ اس کی لمبائی گھٹنوں تک ہی ہوتی ہے لیکن بازوؤں کو کہنیوں پر سے چاک کر کے آدھے بازو کو باہر نکال لیا جاتا ہے اور چاک کے نچلے حصے کو بڑے اہتمام کے ساتھ کاندھے سے ذرا تھوڑا نیچے اٹھا کر ایک خوبصورت سی پن کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔ کشمیری پنڈت ایڑیوں سے ذرا اوپر ٹخنے کا پھرن پہنتے ہیں۔ جس کے بازو کھلے اور لمبے ہوتے ہیں۔ عورتوں کے پھرن میں کمر پر ایک پٹکا سا بھی ہوتا ہے۔

کشمیر میں پھرن کا تذکرہ اس وقت تک ادھورا سمجھا جاتا ہے جب تک کہ اس کے ساتھ کانگڑی کا نام نہ لیا جائے، جو کہ سردیوں کے موسم میں پھرن کے ساتھ لازم وملزم سی ہو جاتی ہے یہ ایک طرح کا مٹی کا پیالہ ہوتا ہے جسے چاروں طرف بید کی پتلی پتلی تیلیوں سے مڑھ دیا جاتا ہے مٹی کے پیالے میں آگ ڈال کر اسے پھرن کے اندر رکھ لینے سے جسم اچھا خاصا گرم ہو جاتا۔

یزار

یہ لفظ کشمیری زبان میں شلوار اور پائجامہ دونوں کے لئے مستعمل ہے۔ عورتیں عام طور پر شلوار اور مرد پائجامہ پہنتے ہیں لیکن وادی کے گردونواح میں خانہ بدوش، گوجر لوگ مرد وزن دونوں شلوار ہی پہنتے ہیں۔ عورتیں عام طور پر کھلے پائنچوں والی شلواریں پہنتی ہیں جو کہ پنجاب اور یوپی میں مستعمل قسم سے مشابہ ہوتی ہیں۔ مرد کھلے پائنچوں والے پائجامے پہنتے ہیں اور یہ ہندستان کے دوسرے علاقوں میں مروجہ قسم کے بالکل برعکس ہوتے ہیں۔ دونوں ہی صورتوں میں کپڑا اونی یا سوتی ہو سکتا ہے۔ کشمیر میں شدید سردی کے باعث مرد ٹوپ کے پائجامے بھی پہنتے ہیں۔ لیکن یہ بھی کھلے ہی پائنچوں کے ہوتے ہیں اور سردی سے بچنے کے لئے ان کے اندر کوئی چست قسم کا اونی یا سوتی انڈرویئر سا پہنا جاتا ہے۔ پائنچوں کو مختلف انداز میں بنایا جاتا ہے اور کریز کو بنائے رکھنے کے لئے ان میں اچھی قسم کا بکرم استعمال کیا جاتا ہے۔ عورتوں میں شلوار کے پائنچوں کو

رنگین دھاگوں یا پھر طلے سے کشیدہ کرنے کا رواج بھی ہے۔

کُرتن

یہ ایک ڈھیلی ڈھالی سی قمیص ہوتی ہے اور اکثر پائجامہ یا شلوار کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوئے کپڑے سے تیار کی جاتی ہے۔ کپڑا اونی یا سوتی دونوں ہی طرح کا ہو سکتا ہے۔ مردوں میں کالر کا رواج بھی ہے لیکن کچھ لوگ کالر کے بغیر ہی پہنتے ہیں۔ عورتیں اُسے مختلف انداز میں تیار کرتی ہیں اور زیادہ دلکشی و پرکاری کے لئے گلے، نچلے گھیرے اور بازوؤں کے کھلے کناروں کو دھاگوں یا پھر طلے سے کشیدہ کر لیتی ہیں۔ یہ کشمیر کا عام لباس ہے اور باقی ہندستان میں پہنے جانے والے کرتوں کی ہی ایک قسم سمجھا جا سکتا ہے۔

کوٹ

کشمیریوں کے یہاں کوٹ کا تصور مستعار لگتا ہے۔ پہلے یہاں زیادہ تر پھرن کو ہی کوٹ کی جگہ استعمال کیا جاتا تھا۔ آج کل کوٹ تقریباً ہر طبقے کے لوگوں کا لباس ہے اور کھلے یا بند گلے دونوں ہی طرح کا پہنا جاتا ہے۔ اکثر ٹیوٹ کے کوٹ بنائے جاتے ہیں، جن کے بنانے میں وہ ٹیوٹ استعمال کئے جاتے ہیں جنہیں بطور چادر کچھ عرصے تک استعمال کیا گیا ہو۔ یہ کوٹ مختلف رنگوں کے ہوتے ہیں۔ لیکن سب سے دلکش بھورے رنگ کی اُون سے بنا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اب مشینوں سے تیار شدہ اونی کپڑے کے بھی کوٹ بنتے ہیں۔

لمبے کوٹ بھی پہنے جاتے ہیں۔ کوٹ کے اندر ایک طرح کی صدری بھی عام طور سے پہنی جاتی ہے جو آگے کی طرف کوٹ سے مناسبت رکھتے ہوئے یا پھر خود کوٹ

کشمیری پنڈتوں کا عام لباس

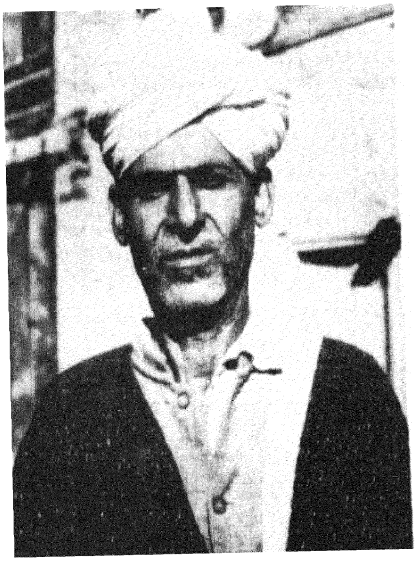

کشمیری دیہاتی اپنے مخصوص لباس میں

کے کپڑے کی ہی بنی ہوئی ہوتی ہے۔ پچھلی طرف کسی ریشمی کپڑے کو جوڑا جاتا ہے۔

ٹوپی

کشمیر میں پہنی جانے والی ٹوپی بالکل سر کے ساتھ چپکی ہوئی ہوتی ہے کیوں کہ سر کو شدید برفانی ہواؤں سے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ اس لئے اس ٹوپی کو بلا کسی دقت کے اس مقصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ ٹوپی عام طور پر کسی موٹے کپڑے کی بنی ہوئی ہوتی ہے اور تقریباً پٹھانوں کے کلّے کی سی شکل کی ہوتی ہے۔ بعض لوگ مختلف انداز سے کشیدہ کی ہوئی ٹوپیاں بھی پہنتے ہیں۔ کچھ لوگ سردیوں میں فر کے کنٹوپ استعمال کرتے ہیں جو کہ مقامی طور پر ہی بنائے جاتے ہیں۔

دستار

کشمیر میں پگڑی کا رواج بھی ہے یہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں پہنی جانے والی پگڑی سے کسی حد تک مختلف ہوتی ہے۔ کشمیر میں اُسے مقامی طور پر دستار کہا جاتا ہے۔ یہ پگڑی طرّے یا ٹیکے کے بغیر ہوتی ہے۔ ٹیکے کو گردن پہ لٹکا دینے کی بجائے اوپر کی طرف موڑ کر پچھلی تہوں میں پھنسا دیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ سر پر ایک نکونی سی ٹوپی رکھ کر بھی پگڑی باندھتے ہیں۔

اوپر مذکورہ ملبوسات کشمیر میں عام طور پر پہنے جاتے ہیں۔ اور یہ سب ایک طرح سے کشمیریوں کے تہذیبی اور سماجی معمولات کی ترجمانی بھی کرتے ہیں اگرچہ کشمیری ان ملبوسات سے جذباتی وابستگی رکھتے ہیں تاہم زمانے کی بدلتی ہوئی اقدار اور مغربی تہذیب کی تقلید نے ان ملبوسات کی اہمیت پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا ہے اور

اب کسی حد تک انہیں پہننے سے گریز کیا جاتا ہے۔ اور ان کی جگہ مغربی ملبوسات کو زیادہ مقبول و محترم سمجھا جاتا ہے۔

دیہات میں ان ملبوسات کو اب بھی ہر خاص و عام پہنتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایسے بھی پہناوے ہیں جنہیں متبرک سمجھا جاتا ہے ان میں سے قابلِ ذکر "کسایہ" ہے یہ ایک طرح کے کپڑے کی ٹوپی ہوتی تھی جسے عورتیں مختلف انداز میں سر پر باندھ لیتی تھیں۔ اگرچہ اب بھی کشمیری عورتیں اپنے بالوں کو دھول اور میل وغیرہ سے محفوظ رکھنے کے لئے سر پر "ڈنج اور پوٹز" وغیرہ باندھتی ہیں تاہم یہ کسایہ کی طرح سے نہیں باندھے جاتے۔

بچہ ڈوپیاز پہنے ہوئے اور لڑکیاں کسایہ پہنے ہوئے

کشمیری مسلمان عورتیں برقعہ بھی پہنتی ہیں جو کہ کسی سفید یا رنگین کپڑے کا ترکی، عربی یا ایرانی انداز میں بنا ہوا ہوتا ہے مسلمان عورتوں میں کم و بیش شلوار اور کرتے کا ہی رواج ہے لیکن اب ان دونوں کے بنائے جانے میں کشمیر کے روایتی انداز کے بجائے فیشن کو زیادہ دخل ہوتا ہے کشمیری پنڈت عورتیں شادی سے پہلے بالخصوص شلوار قمیص ہی پہنتی ہیں۔ لیکن شادی کے بعد اکثر ساڑھی پہننے کا رواج ہے۔

مختلف مغربی ملبوسات کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں پہنے جانے والے لباس بھی کشمیر میں پہنے جاتے ہیں۔ اگرچہ ان کے پہننے میں ضرورت، افتادِ طبع اور شوق کو زیادہ دخل ہوتا ہے ان میں سے قابلِ ذکر دھوتی، شروانی وغیرہ ہیں۔

وادی کے علاوہ ریاست کے دوسرے علاقوں میں ذرا مختلف اقسام کے ملبوسات پہنے جاتے ہیں جیسے کہ لداخ میں سر پر ایک نکوٹی سی ٹوپی جسم پر ایک لمبا سا چوغہ اور نچلے دھڑ کو سردی سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک قسم کا پائجامہ پہنا جاتا ہے۔ یہ سب ہی چیزیں تقریباً ایک ہی قسم کے اونی کپڑے سے بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور اس کے پہننے میں آرائش و سنگھار کے بجائے جسم کو شدید سردی سے محفوظ رکھنے کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ صوبہ جموں کے علاقوں میں ڈوگرہ پہاڑی قسم کا لباس، یعنی سر پر ایک بڑی سی پگڑی جسم پر ایک لمبا بند گلے کا کوٹ، اندر ایک بغیر کالر کا کرتا اور ایک تنگ موری والا چوڑی دار پائجامہ پہنا جاتا ہے۔ دوسرے علاقوں میں گوجر یا بکروال مرد کھلے پائنچوں والی شلواریں اور ڈھیلی ڈھالی قمیص پہنتے ہیں جسم کو سردی سے بچانے کے لئے ایک قسم کی واسکٹ بھی پہنی جاتی ہے جس پر جا بجا مختلف اقسام کے بٹن ٹانک کر اسے زیادہ دیدہ زیب بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان کی عورتیں تقریباً ایک ہی قسم کے ہاتھ سے بنے ہوئے دھاری دار کپڑے کی تنگ موری والے پائجامہ اور کرتے پہنتی ہیں۔

زیورات - ایک جائزہ

کلہن کی راج ترنگنی[1] میں، جو کہ ہندو راجاؤں کے درباروں کا ایک مؤثر مرقع ہے، کئی ایک جگہوں پر طرح طرح کے زیورات کا ذکر آتا ہے۔ وہ عورتوں کے زیورات میں سے ہار، کلائی کی چوڑیوں، کنگنوں، بازو بندوں اور کانوں کے کنڈلوں کا ذکر کرتا ہے۔ دامودر گپت نے بھی تقریباً ایسے ہی زیورات کے بارے میں لکھا ہے اس نے چنتا منی کے بیٹے کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے پہنے ہوئے بہت سے زیورات کا حال لکھا ہے[2] جن میں سے قابلِ ذکر مختلف اقسام کی انگشتریاں، سونے کے جڑاؤ گلوبند اور کانوں میں سونے کے کنڈل ہیں۔ ہندوستان کے دیگر حصوں

---

[1] دھجی کے لئے کشمیری لفظ (کپڑے کا ایک ٹکڑا)

[2] ایک طرح کا کپڑے کا ٹکڑا۔ جو کشمیری عورتیں اپنے سروں پر باندھتی ہیں۔

[1] عہد تصنیف، بارہویں صدی عیسوی۔ سنسکرت زبان میں لکھی ہوئی۔

کی طرح کشمیری عورتیں بھی زیوروں کی شوقین ہیں۔ اور مختلف اقسام کے زیورات استعمال کرتی ہیں۔

سنگ تراشی کے نادر نمونوں میں بھی گلوبند، کنگن اور انگشتریاں وغیرہ ملتی ہیں۔

یہاں قیاس کے مطابق جیولری سے مزین زیورات کے طور پر ایک نمونے میں جھومریوں والا ایک جڑاؤ، تاج، ایک بے حد جڑاؤ کنگن اور دھوتی کے ساتھ لگی ہوئی ایک جڑاؤ پیٹی دکھائی گئی ہے۔ ان تمام زیورات کا منقش و مزین ہونا اور ان کے مختلف ڈیزائن اس امر کی دلیل ہیں کہ ان زیورات کو اہل کشمیر کافی عرصے سے اپنائے ہوئے تھے۔

کشمیر کے مخصوص زیورات

کانوں کے زیور

ہندوستان کے ہر علاقے کی عورتوں کی طرح کشمیری عورتیں بھی کانوں کو مختلف اقسام کے زیورات سے آراستہ کرتی ہیں۔ ان میں سے کچھ اقسام مستعار لی گئی ہیں۔ لیکن کچھ مخصوص کشمیری وضع کی ہیں اور ہندوستان بھر میں کہیں دوسری جگہ نہیں پہنی جاتیں۔

کشمیری عورتیں مختلف اقسام کی بالیاں اور آویزے پہنتی ہیں۔ کشمیری زبان میں بالیوں کے لئے ایک مخصوص لفظ "کنہ واجہ" ہے۔ جس کے لفظی معنی کانوں میں پہنی جانے والی انگوٹھی کے ہیں۔ دراصل اس زیور کی وضع تقریباً انگلی میں پہنی جانے والی انگوٹھی کی سی ہوتی ہے۔ یعنی سونے یا چاندی کا ایک چوڑا سا کمانداز پترا جس کے دونوں نکیلے سروں کو ملا دیا گیا ہو لیکن "کنہ واجہ" کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے دونوں نوکیلے سروں کو ملایا نہیں جاتا، بلکہ مختلف اطراف میں موڑ کر یا چھید کر کانوں کی لوؤں میں کئے ہوئے سوراخوں میں سے گذاری ہوئی ایک پتلی سی سلاخ میں پرو دیا جاتا ہے۔ "کنہ واجہ" عموماً آنکھ کی شکل کا بنایا جاتا ہے اور اس پر طرح طرح کی مینا کاری کی جاتی ہے۔ اس کی لمبائی تقریباً اڑھائی انچ اور چوڑائی ڈیڑھ انچ تک ہوتی ہے۔

آویزوں کے لئے مخصوص کشمیری الفاظ دُور، آلقہ ہور، آمت ہور، اور دیجی ہور وغیرہ ہیں۔ کشمیر میں پہنے جانے والے آویزوں کی اقسام تقریباً پنجاب اور یوپی میں پہنے جانے والے زیوروں جیسی ہی ہیں۔ یہ سونے اور چاندی دونوں ہی کے بن سکتے ہیں اور انھیں ایک پتلی سی تار کو موڑ کر کانوں کی لوؤں میں کئے ہوئے سوراخوں میں لٹکا دیا جاتا ہے۔ کئی بار اس تار کے نچلے حصے میں نصف بیضوی شکل کا ایک خول سا ہوتا ہے جس کے نچلے کناروں سے موتیوں کی جھالریں لٹک رہی ہوتی ہیں۔

کانوں کا ایک اور زیور جو کہ بالخصوص کشمیری پنڈت عورتیں سہاگ کی نشانی کے طور پر پہنتی ہیں "دیجی ہور" ہے۔ اس کی شکل ایک ستارے سے مشابہ ہوتی ہے جو ایک لمبی ڈور سے کانوں میں لٹکا رہتا ہے۔

ناک کے زیور

ہندوستان کے اور علاقوں کی طرح کشمیر میں بھی لڑکیوں کے ناک کے بائیں طرف ایک سوراخ کر دیا جاتا ہے۔ اور اسے کھلا رکھنے کے لئے سونے چاندی کے پتلے یا کسی جنگلی پرندے کے پر کے پچھلے حصے کو توڑ کر پہنایا جاتا ہے۔ کشمیری زبان میں ناک کے زیورات کے لئے مخصوص الفاظ جیسے "نسہ واجہ" اور "نتھ"

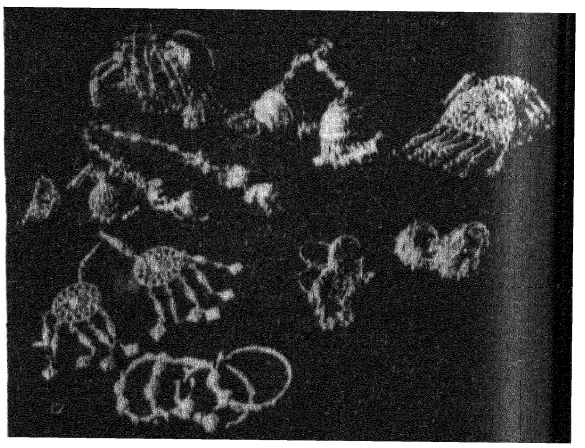

کانوں اور سر کے زیور

وغیرہ مستعمل ہیں۔ "نسہ واجہ" ایک طرح کا ابھرا ہوا نصف بیضوی صورت کا خول ہوتا ہے جس کے نیچے ملحقہ تیلی کو ناک میں کئے گئے سوراخ میں پہن لیا جاتا ہے۔ اس خول کے اوپر طرح طرح کے نقش بنائے جاتے ہیں جن پر رنگین موتی جڑے ہوتے ہیں۔ ناک ہی میں پہنی جانے والی ایک دوسری چھوٹی سی تیلی کو "رنگ" کہتے ہیں۔ کشمیریوں میں بڑی سی طلائی یا نقرئی نتھ کا رواج نہیں ہے جو کہ شمالی ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں پہنی جاتی ہے۔

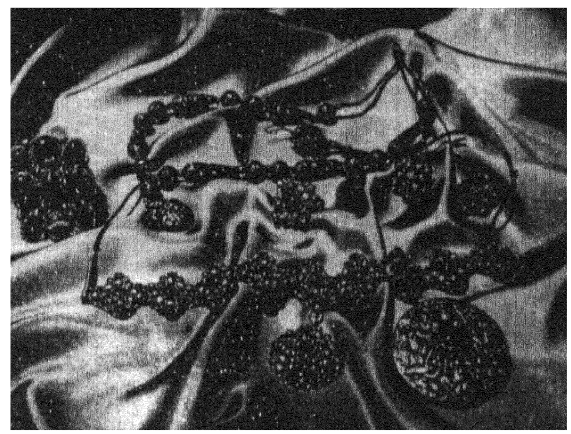

جڑاؤ زیور

گلے کے زیور

یہاں گلے میں پہنے جانے والے زیورات کے مخصوص کشمیری نام ہیں جیسے حلقہ بند، تروٹ، پونڈمال اور مال" ہیں۔ یہ سب ہی زیورات سونے اور چاندی دونوں کے ہوتے ہیں۔ حلقہ بند کو عام طور پر دوسرے علاقوں میں "گلوبند" کہا جاتا ہے۔ کشمیری میں اس کے لفظی معنی ایک ایسے زیور کے ہیں، جسے حلق کو بند کرنے کو حلق کے گرد پہنا جاتا ہے۔ اسے بالعموم تقریباً چھ انچ لمبی تین یا تین سے زیادہ جڑاؤ نقرئی یا طلائی دانے دار پٹیوں یا مالاؤں کو ایک دوسرے سے فاصلے پر رکھ کر بنایا جاتا ہے۔ ان پٹیوں یا مالاؤں کو منسلک کرنے کے لئے درمیان میں ایک پھول سا ہوتا ہے۔

تروٹ سونے یا چاندی کی ایک لمبی سی مالا ہوتی ہے جسے گلے میں لٹکا دیا جاتا ہے۔ یہ مختلف علاقوں میں پہنے جانے والے عام نوعیت کے ہاروں جیسی ہی ہوتی ہے۔ کئی بار بادام یا مٹر کے دانوں جیسے چھوٹے چھوٹے دانے بنا کر انھیں ایک طلائی یا نقرئی زنجیر میں پرو لیا جاتا ہے۔

"پونڈمال" کے لفظی معنی، سونے کے پونڈوں جیسے گول سکوں کی مالا کے ہیں۔ ان سکوں کو عام طور پر پیتل کے ایک دلکش سانچے میں جڑ کر گلے میں لٹکا لیا جاتا ہے۔

کشمیری ہاروں کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ مرغی کے انڈے کی برابر سونے کا ایک ٹکا سا بنا کر اس کے نیچے موتیوں کی جھالریں اور اوپر دو کنڈے لگا لئے جاتے ہیں پھر اس ٹکے کو ایک سنہری دھاگے میں پرو کر گردن کے پچھلی طرف گرہ لگا لی جاتی ہے۔ ایک اور قسم میں دھاگے کے ساتھ گلے کے دائیں اور بائیں طرف تین تین بادام یا کھجور جیسے بڑے بڑے دانے بنا کر پرو لیتے ہیں۔ اسے کشمیری میں "خرز ڈولنا مال" یعنی لٹکتی ہوئی کھجوروں کی مالا کہتے ہیں۔

کلائی اور ہاتھ کے زیور

ہندوستان کے دیگر علاقوں کی طرح کشمیر میں بھی ہاتھ کی انگلیوں کے زیور پہننے کا رواج مرد و زن دونوں میں ہے۔ ان میں مختلف اقسام کی انگشتریاں قابلِ ذکر ہیں۔ کشمیری زبان میں ان کے لئے مخصوص الفاظ "واجہ" اور "دائر" وغیرہ ہیں۔ "واجہ" انگشتری سونے یا چاندی کے ایک منقش پترے کو سروں پر سے جوڑ کر بنائی جاتی ہے۔ نقش پہننے والے کے طبعی میلانات اور ضروریات کو ملحوظ نظر رکھ کر بنائے جاتے ہیں کئی بار اسے مختلف اقسام کے نقلی نگینوں سے مزین کیا جاتا ہے۔ بعض امرا اصلی قیمتی پتھر بھی استعمال کرتے ہیں۔

عورتوں کے لئے بنائی ہوئی انگشتریاں زیادہ سبک اور دلکش ہوتی ہیں اور ان پر جڑے ہوئے نگینے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مردوں کے لئے بنی ہوئی انگشتریاں زیادہ گراں اور ٹھوس ہوتی ہیں۔ اور ان پر چھوٹے چھوٹے نگینوں کے بجائے بڑے بڑے نگ ہوتے ہیں۔ اب کچھ لوگ ان انگشتریوں پر اپنے نام بھی کندہ کرانے لگے ہیں۔

انگشتریوں کے علاوہ کشمیر میں ایک قسم کا چھلا بھی پہنا جاتا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۵۲ پر)

نریندر کھجوریہ

کالا تیتر

کاستو ایک ایک اُپلا اُلٹتی پلٹتی جا رہی ہے۔

"کر۔ کر۔ کر۔ . . . ." یہ آواز سُن کر کوڈو تیتر اپنی چونچ اُٹھا کر اوپر دیکھتا اور اپنی گردن ہلانے لگتا۔ اُس کے گلے میں پڑا ہوا چھوٹا سا گھنگھرو بج اُٹھتا اور کوڈو کاستو کی طرف بھاگتا۔

گھنگھرو کی مدھم سی آواز سُن کر کاستو کو اپنے سامنے دو نازک ننھے ننھے ہاتھ دکھائی دینے لگتے۔ جن میں کبھی چاندی کا ایک ایک کنگن پڑا ہوا تھا۔ کوڈو کے گلے میں اِن ہی کنگنوں کی ایک گھنگھری (چھوٹا گھنگھرو) پڑی ہوئی تھی۔

کاستو کی دُنیا گول نہیں، لمبی ہے، جس پر موڑ ہی موڑ دکھائی دیتے ہیں۔ اور ہر موڑ پر کاستو نے نئی زندگی دیکھی ہے۔

گہری گھاٹی پار کر کے جب کاستو چھپڑ والی رج پر پہنچی تو سامنے اُسے بانسوں پر لہراتی رنگ برنگی جھنڈیاں دکھائی دینے لگیں۔ اسی طرف وہ چل پڑی اور جب وہ جگتو بَروالے کے تھان پر پہونچی تو وہ جھنڈیاں اسے سیاہ سی دکھائی دیں۔

'تھان' کے اندر جگتو بَروالا دیوتا کے سامنے دھوپ جلا رہا تھا۔ گوگل دھوپ کی خوشبو تھان کے اندر اور باہر چبوترے تک پھیل رہی تھی۔ دھوپ والی کڑچھی ہاتھ میں لئے بَروالا باہر آیا۔

"جے جے سرگل دیوتا۔ تیری سام جے۔ جے"

—"یہ کون ڈولی ہے؟"

—"بروالا جی! میں حاضر ہوں۔"

بروالا دھوپ والی کڑچھی چاروں طرف گھمانے لگا۔

"چمے دشا میں ہمری رکھیا کرو . . . . . سرگل مہاراج۔"

سنکھ پھونکنے کے بعد بروالا لمبی چلم لے کر ایک ستون کے سہارے برآمدے کے کوٹ پر بیٹھ گیا۔ "پک پک پک"

پہلے ہلکے ہلکے کش لینے کے بعد اُس نے زور سے 'دم' کھینچا۔ چلم پر ایک 'لاٹ' ناچ اُٹھی۔ 'لاٹ' کی روشنی میں اسے کاستو کی ایک جھلک سی دکھائی دی۔

—"کون ذات ہے تیری؟"

—"مہاشی۔"

—"اِس پھلے (بستی) میں کس سے رشتہ، ناطہ ہے؟"

"بروالا جی! سر کے سائیں (خاوند) کے چلے جانے کے بعد سب رشتے ناطے ٹوٹ گئے ہیں۔ میرے مہاشے کو پھانسی لگے ایک سال بیت چکا ہے"

"وہ کیوں؟"

"اس کی طبیعت ذرا تیز تھی۔ اُس نے اپنے دو شریکوں (بھائی بندوں) کو ایک ساتھ مار ڈالا تھا۔" ایک آہ بھرتے ہوئے کاستو نے کہا —"ماتھا پھوٹے اس تقدیر کا۔ اس نے ایک پھلتی پھولتی گرہستی اُجاڑ دی — گھر بار کب

گیا۔ میں نے ڈیڑھ ڈیڑھ من پرولا (سفید مٹی) سر پر ڈھو کر قصبے میں فروخت کیا۔ بڑے بڑے نامی لڑاکے وکیل کئے۔ بڑی سے بڑی عدالت میں اپیل کی لیکن میرے مہاشے کی قسمت میں صرف پھانسی لگنا ہی لکھا تھا!"

"اچھا تو تو پھامی کی عورت ہے؟ ایک دن وہ اس تھان پر 'سوالی' بن کر آیا تھا.... اولاد کے لئے —

لیکن —— تو۔ اب — ؟"

"سنیئے بروالا جی! پردیس جا کر بھیک مانگنے میں بھی کوئی شرم کی بات نہیں — لیکن اپنے شریکوں میں —— اور پھر شریک بھی وہ، جنہوں نے ہمارے خلاف بڑھ چڑھ کر گواہیاں دی ہوں — مہاشے کے پھانسی چڑھنے پر ان لوگوں نے خوشیاں منائی تھیں۔ اب میں وہاں کیوں کر دن کاٹ سکتی ہوں؟"

"گھبرا نہیں مہاشی! تیری قسمت کا ستارہ ابھی غروب نہیں ہوا ہے۔ سُرگل یوتا نے تجھے اپنی شرن میں بلا لیا ہے۔"

کاستو نے ایک اور اُپلا پلٹ کر دیکھا۔

دیمک کلبلا پڑی۔ "کُر۔ کُر۔ کُر....."

کوڈو "ٹک ٹک" کرتا چُن چُن کر دیمک کھانے لگا۔

کاستو کے جسم پر بھی وقت نے کئی اُپلے تھاپ رکھے ہیں۔

چھوٹی چھوٹی پاتھیاں، - بڑے بڑے ٹہو کلے' — اُن میں سے کچھ خشک ہو کر بھُر بھُرا چکے ہیں۔ اور کچھ باہر سے خشک لیکن اندر سے ابھی گیلے ہیں اور اُن کے اندر کیڑوں، مکوڑوں کی کلبلاہٹ سے کاستو کے بدن میں اینٹھن سی ہونے لگتی ہے اور اُس کی زبان بے ذائقہ — پھیکی سی ہو جاتی ہے۔

اُس رات کو جب جگتو کو 'جاتر' پڑی تو کاستو نے بھی 'کالکا' کا روپ دھارن کر لیا۔ ایک ہاتھ سے اُس نے جگتو کا بازو مروڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی لٹکتی لٹیں (زلفیں) نوچتی ہوئی وہ پوچھ رہی تھی — "ارے بروالے! کیا سمجھ کر تو نے مجھ پر ہاتھ ڈالا ہے؟ میرے مہاشے نے ایک ساتھ دو خون کئے تھے تو ایک خون کرنے کی طاقت تو میرے اندر بھی ہے۔ بول پاپی — پاکھنڈی؟"

جگتو نے کاستو کو "ماں" کہہ کر پکارا اور منت خوشامد کر کے اس سے اپنی جان بخشوائی تھی۔

کاستو اُسی رات کو وہاں سے چلی گئی — بروالے کو اُس نے معاف کر دیا لیکن غصے سے اس کا بدن کانپ رہا تھا الغوزوں پر کوئی چُن[1] کی دھن بجا رہا تھا — ساون مہینے کی سیاہ کالی رات تھی — کاستو کا مہیب روپ دیکھ کر بستی کے کتے بھونکنے لگے۔

"اندھیرے میں کسے دیکھ کر یہ کتے بھونک رہے ہیں؟" شونکو چوکیدار کی آواز سنائی پڑی۔

"جی پتہ نہیں بستی کے یہ پلّے میرے پیچھے پڑ گئے ہیں؟

"تو ہے کون؟"

"میں پردیسن ہوں۔"

شونکو چوکیدار نے پاس آ کر دیا سلائی جلائی۔ "بستی میں کس کے ہاں جانا ہے تجھے؟"

"جس کے ہاں ٹھکانہ مل سکے۔ محنت، مزدوری کر کے جہاں روٹی کا ٹکڑا مل سکے"

شونکو نے جیب سے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی اور پھر دیا سلائی جلا کر کاستو کی طرف دیکھا۔

"کیا ذات ہے تیری؟"

مہاشی — "لیکن یہاں الغوزے کون بجا رہا تھا؟"

"کیوں؟"

کچھ نہیں —— مجھے تسکین ہوئی تھی کہ چلو کوئی نہ کوئی تو جاگ رہا ہے..."

شونکو نے ایک لمبا کش کھینچا۔ کاستو کو شونکو کے گلے میں پڑی ہوئی الغوزوں کی جوڑی دکھائی دے رہی تھی۔

وہ سوچنے لگی — میرا مہاشہ بھی اسی طرح الغوزے بجایا کرتا تھا۔

کاستو شونکو کے گھر آ بسی۔ چوکیدار کے گھر پر اس کی بوڑھی ماں ہی تھی۔ کاستو نے اپنے کام کاج سے ماں بیٹے کو موہ لیا۔

بستی میں چہ مے گوئیاں ہونے لگیں ——

"شونکو چوکیدار کوئی پہاڑی رکھیل لے آیا ہے۔"

جگتو بروالے کو بھی "چھنڈ" پڑی —— "بستی پر بھاری مصیبت نازل ہونے والی ہے۔ گوڈ بنگالے کی ایک جادوگرنی نے بستی پر اپنا خونی پنجہ جما لیا ہے...."

جتنے منہ اتنی باتیں —— کوئی کہتا "وہ مسان (بھوت) سے اپنا کام دھندہ کرواتی ہے"

"مسان، راتو رات شونکو کے کھیتوں میں نلائی گوڈائی کر دیتا ہے"

وہ ایک گٹھے میں اتنی گھاس اُٹھا لائی ہے جس کو مویشی تین دن کھا کر بھی ختم نہیں کر سکتے...."

یہ سب سُن کر شونکو کی ماں کہتی۔ "بیٹا لوگ سچ کہہ رہے ہیں۔ بروالا کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ سچ ہی یہ عورت کوئی چھلاوہ ہے۔ بھاڑ میں جائے اس کا کام۔

---

[1] مقبول عام پہاڑی گیت

بیٹا تم اسے گھر سے نکال دو۔"

شونکو یہ سب سن کر مسکرا دیتا یا اکیلے میں الغوزے بجانے لگتا۔

بڑھیا باداسر گل کے تھان پر جاتی اور اپنے سر پر دو تھپڑ مار کر کہتی "بروالا جی! میرے بیٹے کو بچا لو۔ اُس ڈائن نے اُسے بھیڑ دُبنا رکھا ہے۔"

جگتو زمین پر دو تھپڑ مار کر کہتا "ہماری آفت نازل ہونے والی ہے۔ دیوتا ناراض ہو گیا ہے۔ ہر رات کو وہ مجھے جھنجھوڑتا ہے۔ مگر میں کیسے جگاؤں۔ ساری کی ساری بستی سو رہی ہے۔ یہ لوگ جائیں گے۔ لیکن اُس وقت جب یہ گوڑ بنگالے کی جادوگرنی سب کو نگل جائے گی۔"

کاستو، اُپلے اُلٹتی پلٹتی چلی جا رہی ہے۔ کڑ۔ کڑ۔ کڑ۔ ۔ ۔ ۔"

یادوں کی برفانی پرتیں آج پھر پگھل رہی ہیں۔ اور گذری بیتی باتیں لاشوں کی طرح اُس برف میں گویا دبی پڑی ہیں — برف میں دبی لاشیں — گویا ابھی ابھی ان کا دم نکلا ہو۔ ایک ایک لاش کاستو کے سامنے کھڑی ہو رہی تھی۔

بستی کی وہ پنچایت —

شونکو چوکیدار کی بوڑھی ماں کی چیخ و پکار — وہ پنچوں کے سامنے چھاتی پیٹ پیٹ کر کہہ رہی تھی —

"پنچو: یہ گوڑ بنگالن میرے بیٹے کا کلیجہ چاٹ گئی ہے۔

میرے لختِ جگر کا لہو اب بھی اس کے ہونٹوں پر چمک رہا ہے۔ پنچ پرمیشر دو! میرا انصاف کرو۔"

جگتو بروالا ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر کہہ رہا تھا —

"پنچو! یہ عورت نہیں ہے، جادوگرنی ہے — کرکسا ہے — ڈاکنی ہے۔ جس نے اپنے دو خصموں کے کلیجے کھا لئے ہیں —"

اور دوسری طرف چھوٹا سا بچہ گود میں لے کاستو بیٹھی تھی۔ وہ نہ بیہوش تھی — نہ باہوش — اُس کی آنکھوں سے آنسو بہتے بہتے خشک ہو گئے تھے اور اب آنسوؤں کے سرخ چشموں میں کچھ ہی کیچ باقی رہ گئی تھی۔ لیکن کاستو اُس دلدل میں بھی چلی جا رہی تھی۔ گویا چلنا ہی اس کا ایمان ہے۔

پنچوں کا فیصلہ سر ماتھے پر — کاستو بستی سے باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے مردوں نے سرسوں پھینکی۔ عورتوں نے مٹھیاں بھر بھر کر راکھ اُڑائی کہ یہ جادوگرنی بستی میں پھر واپس نہ آ جائے۔

کاستو نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا وہ اپنی پُرخار مسافت کا ایک اور موڑ کاٹ چکی تھی۔

اُس کے آگے ہموار راستہ تھا۔ بچلی طرف ایک نالہ بہتا تھا اور اُس کے پار ایک گپھا سی بنی تھی جہاں سردیوں میں چرواہے قیام کیا کرتے تھے۔ اُسی گپھا میں کاستو اپنے بچے کو لے کر جا بسی۔

تیتر دھول، مٹی میں لوٹ رہا تھا۔ کاستو غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ دل میں کہنے لگی — "بیٹا میں بھی تو پرندہ ہی تھی۔ نہ معلوم کس غلطی سے بدھاتا نے مجھے انسانی قالب میں ڈال دیا ہے؟ لیکن قسمت کا پھیر دیکھو کہ انسان نے مجھے اپنی برادری سے ہی خارج کر دیا ہے۔ نہ مجھے چلنے ہی دیا نہ اُڑنے ہی دیا۔"

اُسی وقت چرواہے لڑکے مویشیوں کو واپس گھر لاتے ہوئے دوسری طرف سے چلا اٹھے — "کاسنو — کاسنو — کان سو۔ و۔ و۔ ۔ ۔"

کاستو بھی گویا اُن کی انتظار میں ہی بیٹھی تھی۔ وہ اُن لڑکوں سے بھی زیادہ بلند آواز میں چلا اٹھی۔

"ہاں — یہ کوڈو تیتر نہیں بلکہ کاسنو ہی ہے۔ کاسنو — تمہاری ماں کا خصم —"

یہ سن کر بچے خوشی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

بستی کے پیر و جواں آج بھی سرگل دیوتا کی قسم کھا کر کہتے تھے "کاسنو کا کلیجہ بھی کاستو نے ہی نکالا تھا۔"

اور جگتو بروالا بھی ڈھول اور تھالی کے تال پر گردن ہلا کر کن چھاتنے نما جادو کے دھونگ پر چاولوں کے دانے گن کر ماضی اور مستقبل کا حال بتاتے ہوئے کہتا تھا۔ کاسنو کی روح کاستو کے کاتے تیتر کے اندر ہی قید ہے۔ یہ کوئی معمولی عورت نہیں۔ گوڑ بنگالے کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ باتیں کرتا ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر کاستو کے کانوں تک بھی پہنچتی تھیں۔ وہ جگتو بروالے کا نام لے کر زمین پر تھوکتی اور اپنے بال اس طرح نوچتی تھی جیسے آج بھی جگتو کی لٹیں نوچ رہی ہو — "اے بروالے! گوگل دھوپ کی خوشبو میں چھپا ہوا تیرا اصلی روپ میں پہچانتی ہوں تیرا مستعفن نفس اُپلوں کے نیچے چلنے، پلنے والے گندے کیڑوں سے بھی زیادہ غلیظ ہے۔ اے پاپی! تیرا گناہوں سے آلودہ جسم لوہے کی بھندوں کی مار سے اور زیادہ گنہگار اور بے شرم ہو گیا ہے —"

کاستو اپنے خاوند کو اپنا مالک ہی نہیں، بلکہ گھر کا چراغ بھی سمجھتی تھی۔ گھر تو اب اُجڑ چکا تھا لیکن چراغ کی اُس گپھا میں بھی ضرورت تھی اور کاستو کا یہ آخری چراغ تھا کاسنو — جس کا نہ گھر تھا نہ گھاٹ ۔ ۔ ۔ وہ قصبے کی کچہریوں

میں جھوٹی گواہی دیتا اور بستی سے ناجائز شراب لے جا کر قصبہ میں فروخت کیا کرتا تھا۔ وہ خود بھی پکا شرابی تھا۔

ایک روز شام کو وہ زیادہ پی کر نالے کے پار گر پڑا۔ گرنا اس کے لئے کوئی اَن ہونی بات نہیں تھی کیوں کہ اپنی زندگی میں وہ چھلاکم اور گرا زیادہ تھا۔

اگلی صبح کاستو نے وہاں جا کر دیکھا کہ وہ اسی طرح بے ہوش پڑا ہے۔ کاستو گھبرا گئی۔ "ماتھا پھوٹے اس قسمت کا۔ اب ایک اور کلیجہ اس کے ذمے چڑھنے لگا تھا" وہ اس کے قریب گئی۔ کالنو کی سانس ابھی چل رہی تھی۔ وہ اُسے اٹھا کر لے آئی۔ اور دس دن اسی خا[illegible] میں لگی رہی۔

بچے کو چھٹی پر لا دے وہ قصبہ میں جا کر پردلا (پنڈول) جھاڑو اور چھکڑیاں بیچتی اور ان پیسوں سے کالنو کے لئے دوائی خرید لاتی۔

کالنو اچھا ہوا تو ایک دن اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کہنے لگا۔ "کاستو موئی! اس بار تو تو نے مجھے بچا لیا ہے لیکن آخر ایک دن مجھے کہیں راستے میں ہی گر کر مرنا ہے۔"

کاستو جواب دیتی ہے "اگر میں بچانے والی ہوتی تو اپنے دُو خصموں کو نہ بچا لیتی؟ نہیں میں بچانے والی نہیں۔ کھانے والی ہوں بستی کا بچہ بچہ مجھے گوڑ بنگالن کہتا ہے۔ . . . ."

کالنو نے جواب دیا۔ "پہلے تو تو نہیں تھی لیکن اب اس اُجاڑ بیابان میں رہ کر ضرور ہی گوڑ بنگالن ہو جائے گی۔ اری موئی! آدمی کو آدمی کا سہارا ہوتا ہے۔"

کاستو ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہتی ہے "کالنو! بدھاتا نے میری مانگ میں سندور نہیں، اوپلوں کی راکھ بھرنی لکھی ہے اس لئے میں جدھر بھی جاتی ہوں مجھ پر راکھ ہی پڑتی ہے!"

کالنو اپنی چھاتی ٹھونک کر کہتا ہے "کاستو موئے! اگر یہ بات ہے تو کالنو بدھاتا کے لکھے کو مٹا کر تیری مانگ میں سندور ہی بھرے گا۔"

مہاشوں کی بستی میں ایک بار پھر بھونچال سا آ گیا۔

عورتوں میں چرچا ہو رہا تھا ہے "یہ مرد نگوڑے بھی . . . ان کا سینہ جلے۔ کیسے گئے گذرے ہوتے ہیں۔ دیکھو نا۔ وہ گوڑ بنگالے کی رانڈ مس مس کر کے اُن کے کلیجے کھائے جا رہی ہے۔ اور یہ مرد پھر بھی اسی کی طرف گھنٹے چلے جا رہے ہیں۔ گویا وہی رانڈ اس دُنیا میں حسن پری رہ گئی ہے!"۔

اور مردوں کی ٹولی کہہ رہی تھی "یہ سالی مہاشنی ڈائن ہی نہیں۔ اس کے پاس کوئی "وشی کرن منتر" بھی ہے۔ ایک کے بعد دوسرا پروانہ اس پر جان دینے کو آ جاتا ہے . . . .

اُدھر جگتو پر والا اپنے جسم کو تھر تھرا کر اور چھاتی بجا بجا کر چیخیں گوئی کر رہا تھا "یہ کرکسا۔ ڈاکنی ایک دن کالنو کا کلیجہ بھی نکال کر کھا جائے گی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو سرگل دیوتا کا یہ چیلا بھیڑیں مونڈنے والی قینچی سے اپنی یہ لیٹیں (ہانویاں) کٹوا دے گا ـــــ جے سرگل دیوتا ـــــ تیری سام . . . ."

کالنو یہ سب باتیں سُن کر آنکھیں بند کر لیتا اور زور کا قہقہہ لگا کر کہتا۔ "کاستو تو بالکل فکر نہ کر میرے کلیجے کو شراب پہلے ہی چاٹ چکی ہے"

سورج کی سنہری کرنیں غوطہ لگانے کی تیاری میں تھیں۔ کاستو کے جسم کا ہر عضو آج ٹوٹ رہا تھا۔

سُوکھے ہوئے اُپلے اُس نے ایک طرف کر دیئے تو کوڈو نے اس جگہ سے دیمک کا شکار کیا اور پھر سیر ہو کر آرڈو کی ایک شاخ پر بیٹھ کر چونچ سے اپنے پَر کھجلانے لگا۔ اس کے گلے میں پڑا ہوا وہ چھوٹا سا گھنگھرو بجنے لگا یہ آواز سن کر کاستو کے سامنے اس کے بچے کے دو چھوٹے چھوٹے نازک ہاتھ آ گئے جن میں کنگن پڑے ہوئے تھے۔ یہ کنگن آخری بار تب چھنکے تھے جب کاستو نے بچے کے بخار سے تپتے ہوئے ہاتھوں سے انھیں اتارا تھا۔ کتنی دیر تک وہ اُن چھوٹے چھوٹے کنگنوں کو گھور گھور کر دیکھتی رہی اور پھر اُن میں سے ایک گھنگھری اتار کر وہ کنگن اس نے کالنو کو دیئے اور ایک آہ بھر کر بولی تھی ـــ "یہ کنگن میرے چوکیدار نے بڑے چاؤ سے بنوا دیئے تھے"

چوکیدار کا نام سن کر کالنو تنک کر بولا ـــ "اگر تیرا بچہ بچ گیا تو میں اُسے سونے کے کنگن بنوا دوں گا۔ اری میں بھی عدالتوں کا سورما ہوں۔ جس کے خلاف گواہی دے دوں . . . . . ."

کالنو ڈاکٹر کو بلانے کے لئے شہر چلا گیا۔ کاستو اپنے کمزور، لاغر بچے کو گود میں لے کر اسی کی طرف ممتا بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ بچے کو معیادی بخار ہو گیا تھا۔ اور وہ بچارا اس طرح کراہ رہا تھا گویا کوئی جنگلی بلی بول رہی ہو۔

دن چڑھ آیا۔ کالنو ڈاکٹر کو لے کر نہ پہنچا اور کاستو کا اکلوتا بیٹا ہمیشہ کے لئے سو گیا۔ کاستو کی راہ دیکھتے دیکھتے آخر بعد دوپہر کاستو نے نالے کے پار جا کر ایک گڑھا کھودا اور بچے کو اچھی طرح نہلا دھلا کر اُس گڑھے میں لٹا دیا۔

وہ بین کر رہی تھی ـــ بچو! میں بستی والوں کے ڈر سے زور زور سے رو بھی نہیں سکتی۔ کیوں کہ سُن کر وہ کہیں گے کہ میں نے اپنے بیٹے کا کلیجہ بھی کھا لیا ہے ـــ بیٹے! میں تیرا علاج بھی نہ کروا سکی۔ لیکن میں نے تیرے کنگن چھین لئے، میرے بیٹے . . . . . ؛ "

رات بھر کاستو اپنے بچے کی قبر پر بیٹھی روتی رہی۔ لیکن کاستو واپس نہ آیا دوسرے دن سویرے "ریزن" ڈھولے والے نے بستی میں اطلاع دی کہ کاستو ڈھکی پر مرا پڑا ہے۔

بستی کے جھونپڑوں کے دروازے اور کھڑکیاں کڑک اٹھیں۔ رات کو سرگل دیوتا کے تھان پر ڈھولک اور تھالی چھنچھنا اٹھی۔ جگتو اپنی لٹیں نچا نچا کر جاگر دے رہا تھا۔ جے سچی شکتی والے۔ اپنے چیلے کے بول سچے کرنے والے دیوتا! تیری سام!! جے جے سرگل مہاراج!

گرمیوں میں کاستو ہر روز اپنے بچے کی قبر پر برہنیکڑ کے سبز پتے بچھا آتی تاکہ اس کے تپتے جگر کو دھوپ نہ لگے۔

ایک دن وہ برہنیکڑ کے پتے توڑ ہی رہی تھی کہ جھاڑی میں سے کالے تیتر کا ایک پنجہ "کرکر" کرتا ہوا نکل بھاگا۔ کاستو نے بھاگ کر اسے پکڑ لیا۔ اسے یوں معلوم ہوا کہ اس کا اپنا بیٹا ہی تیتر بن کر دوبارہ آگیا ہے۔

وہ اپنے بچے کو کوڈو کہہ کر بلاتی تھی۔ اس لئے تیتر کو بھی وہ اسی نام سے بلانے لگی۔ اپنے بچے کے کنگنوں سے اتارا ہوا گھنگھرو اس نے کوڈو کے گلے میں ڈال دیا

ادھر جگتو نے بستی میں افواہ اڑائی کہ کاستو نے تیتر کے اندر کاستو کی روح قید کر رکھی ہے۔

کاستو نے یہ شرارت بھری افواہ سنی تو تڑپ اٹھی۔

ماتھا پھوٹے اس پاپی بروالے کا۔ کوڈو تو میرا لختِ جگر ہے۔ وہ لختِ جگر جو بلا علاج معالجے کے ہی نالے کے پار آج بھی چپ چاپ لیٹا پڑا ہے جس کی قبر پر میں برہنیکڑ کے پتے بچھاتی ہوں۔"

کاتک مہینے کے سوئے سوئے آسمان پر لالی چھائی ہوئی تھی۔ کاستو اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی تھی۔ کوڈو ابھی تک اپنے پر کرید رہا تھا کاستو نے اس کے پاس آکر کہا "آؤ بیٹا کوڈو گھر چلیں۔"

اس نے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ کوڈو کچھ بدکا اور پھر رُر۔۔۔ کرکے اڑ گیا۔ کاستو کو یوں لگا کہ اس کے اپنے پران پکھیرو ہی اڑے جا رہے ہیں۔

"کوڈو۔ کوڈو۔ اُو۔ُو۔۔۔"

گرتی، لڑکھڑاتی کاستو اسی طرف بھاگی جدھر کوڈو اڑا تھا۔ چوتر ے والے بوہڑ کے درخت تک وہ اڑتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے بعد کاستو کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔

"کوڈو بیٹا! تو نے اپنا دھرم نہیں نبھایا۔ تو بھی مجھے چھوڑ کر چلا گیا"

اور وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ بستی کے باہر کوڈو، کوڈو پکارتی رہی۔ لیکن۔۔۔ کاستو کی گپھا آج بڑی ویران و سنسان تھی۔ کوڈو کا بانس کی تیلیوں کا خالی پنجرہ یوں دکھائی دے رہا تھا گویا کاستو کی لاش پڑی ہو۔

کاستو! آج پھر لہولہان ہو گئی۔ اس کے سارے زخم آج پھر رسنے لگے۔ وہ کہہ رہی تھی کوڈو بیٹے! بستی والوں کی جھوٹی باتوں کو، جگتو بروالے کی پاپ بھری افواہوں کو مجھے باری باری سے چھوڑ جانے والے تم لوگوں نے سچا کر دیا ہے۔"

گپھا کے باہر زور کی آندھی چلنے لگی۔ کاستو کو کوڈو کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھرو کی ڈوری کا خیال آگیا۔

"کہیں وہ ڈور کسی درخت کی ٹہنی سے الجھ گئی تو۔۔۔؟"

پھر اس کی آنکھوں کے سامنے درخت کی ٹہنی سے لٹکتا ہوا کوڈو آجاتا اور وہ گھبراہٹ میں باہر نکل کر چلانے لگی۔۔۔

"کرو۔۔۔ کرو۔۔۔ کرو۔۔۔۔۔"

دو سال پہلے ایک بار کاستو بیمار پڑی تو پانی پلانے والا بھی کوئی نہ تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اب آخری وقت آپہنچا ہے۔ اسے جینے رہنے کی چاہ نہیں تھی۔۔۔

لیکن یہ فکر اس کی جان کو کر رہی تھی کہ اس کے بعد کوڈو کا کیا بنے گا؟ اس کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ کون اسے کھلائے پلائے گا؟ پھر جیسے کسی نے اس کے اندر سے پکار کر کہا کہ وہ نہیں مرے گی۔ وہ کوڈو کو بے سہارا چھوڑ کر نہیں جائے گی۔۔۔ اور سچ مچ وہ صحت یاب ہو گئی۔

مگر آج کوڈو ہی اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ کاستو کو یوں معلوم ہونے لگا کہ آج اس کی آخری رات ہے۔ اب اس کی زندگی کا آخری موڑ آگیا ہے۔

وہ زمین پر لیٹ گئی۔ اس کے آنسوؤں کے باندھ آج پھر ٹوٹ گئے۔

کاستو ایک دردبھری آہ بھر کر سوچ رہی تھی۔۔۔ ہاں میں نے کیا سوچا تھا۔ ایک مہینے پہلے اسے پتہ چلا تھا کہ گھور ڑی گاؤں میں کسی آدمی نے مادہ تیتر پال رکھے ہیں۔ کوڈو کے لئے مادہ تیتر حاصل کرنے کے لئے اس نے کسی سے سفارش بھی کروائی تھی اور پھر اسے خیال آیا کہ اب کوڈو کے لئے ایک بڑے پنجرے کی ضرورت پڑ جائے گی۔ تصور بد دور اب کوڈو اپنی گرہستی بسائے گا۔۔۔" اور کاستو اس طرح خوش ہونے لگی گویا سچ مچ ہی وہ کسی کی ساس کسی کی دادی بننے والی ہو۔"

کاستو نے آہستہ سے کروٹ بدلی۔ اس کا جسم نڈھال اور بے سدھ

(باقی ص۱ پر)

کشمیر میں خواتین کی بیداری

محمودہ احمد علی شاہ

مقالہ نگار (×) وزیر اعظم کے ساتھ کھڑی ہیں

پُرانے زمانے سے جو لوگ کشمیر آتے رہے، وہ اس خوبصورت وادی کے لازوال حُسن، اُس کے سربفلک پہاڑوں، زرخیز زمین اور مناظرِ فطرت کے لاثانی جمال سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکے۔ یہاں کے خوشنما کوہسار اور مرغزار وادیاں اور چشمے اور اُن کے ساتھ ساتھ لہکتے اور مہکتے پھول خاص کر کشمیری گلاب قدرت کی فراوانی کے مظہر ہیں۔ قدرت کی اس سخاوت نے یہاں کے ذہنوں کو ہمیشہ سینچا ہے اور اسی لئے اس وادی کی کوکھ نے دانشوروں رشیوں اور امن کی متلاشی ہستیوں کو جنم دیا ہے۔

مگر بدقسمتی سے اس جنتِ بے نظیر کی ایک دل خراش خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ یہاں کا انسان بے بسی اور افلاس کا شکار رہا۔ صدیوں کے شخصی نظام نے اس کا حلیہ مسخ کرنے کی کوشش کی۔ ہر طرف بے چارگی اور بے بسی کا عالم تھا۔ یہاں کے لوگ کیا مرد کیا عورتیں، بنیادی انسانی حقوق بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ ہر حق سے محروم تھے۔ وہ گراں بار ٹیکسوں، مالیہ کے بھاری بوجھ اور کئی قسم کی جائز و ناجائز وصولیوں کے تلے دب گئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سارا ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، اقتصادی ترقی اور مالی بہبود کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے کوئی آدمی کاروبار اور معاشی ترقی کی طرف قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ غرض یہ کہ انسان نام کا انسان تھا مگر انسانیت کے تمام حقوق سے محروم تھا۔ ان حالات میں عورتوں کی ایک جداگانہ تحریک کا پنپنا قدرتی طور پر محال تھا۔ مگر اس بے چارگی کے عالم میں میں بھی لوگوں میں آگے بڑھنے کی آرزوئیں تھیں اور اس فرسودہ نظام نے جو راہیں مسدود کی تھیں، اُن کو صاف کرنے کا جذبہ اندر ہی اندر پروان چڑھ رہا تھا۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد جدیدیت کی جو نئی قدریں پیدا ہو چکی تھیں، کشمیر کے لوگ باقی ملک کی طرح اِن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے چناں چہ ۱۹۲۹ء کے بعد جب تمام ملک میں آزادی اور ترقی کے لئے جدوجہد شروع ہوئی تو دیسی ریاستیں بھی اس کی لپیٹ میں آگئیں اور ۱۹۳۱ء میں یہ چنگاری بھڑک کر انگارہ بن گئی۔ وادیٔ کشمیر کے مرد عورتیں اور بچے فرسودگی کی زنجیریں توڑنے اور نئی منزلوں کی طرف بڑھنے کے لئے میدان میں کود پڑے۔ بغاوت کا پرچم بلند ہوا اور ایک باوقار زندگی کے حصول کے لئے کشمیر کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ اس جنت کی روایتی امن پسندی اور بھائی چارہ کو قائم رکھتے ہوئے اس بغاوت کا کردار بھی مثالی تھا۔ اس میں حسبِ روایت عورتیں پیش پیش رہیں۔ انھوں نے لاٹھی چارج کا مقابلہ کیا، ان کو جیلوں میں بند کر دیا گیا اور ان پر قسم قسم کے مظالم توڑے گئے مگر اُن کے قدم نہ ڈگمگائے اور اپنی سماجی پسماندگی کے باوجود مردوں کے ہم قدم رہ کر انھوں نے جان دینے کی بھی پروا نہ کی۔ چناں چہ محنتی گولی کھا کر شہید ہو گئی۔ اور زونی نے تحریک میں ہی اپنی جان دے دی اور عورتوں کی یہ ثابت قدمی اور جرات لئے کشمیر کی تاریخ کا ایک امتیازی باب ہے۔

۱۹۴۷ء میں جب ملک آزاد ہوا اور ایک متحد ملک کے ٹکڑے کر دیئے گئے تو اُس وقت بھی کشمیری مرد اور عورتوں نے اپنی شاندار روایت کو قائم رکھا

اور سیکولر اور جمہوری آدرشوں پر آنچ نہ آنے دی۔ یہاں تک کہ مہاتما گاندھی کو بھی جن کے لئے ۱۹۴۷ء کے واقعات نہایت دل خراش تھے، کشمیریوں کے ایثار اور بلند ہمتی اور عالی ذہن کو دیکھ کر پکا یقین ہو گیا کہ کشمیری واقعی ترقی کی راہ پر گامزن ہیں اور فرسودگی کو چھوڑ کر جدید قدروں سے آشنا ہو چکے ہیں۔ کشمیریوں کی جدوجہد کے اس موڑ کا تعلق اس دور سے ہے جب انسانی قدروں کو کسوٹی پر پرکھا جا رہا تھا۔ اس وقت کشمیر کی عورتوں نے جس جانبازی سے اُن قدروں کی حفاظت کی اور انسانیت کے دامن کو آلودہ ہونے سے بچایا وہ ہمارے ملک کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گی۔ اور جب آئین میں یہ ساندگی کا نقطہ نگاہ بدل کر ملک کو ایک نئے افق سے شناسا کر دیا گیا اور جنسی برابری پہلی بار ملک بھر میں آئینی طور پر رائج ہو گئی تو کشمیری عورتوں کے وہ خواب پورے ہوئے جن کے لئے انھوں نے مل کر جدوجہد کی تھی۔ ہندوستان کے دستور کی دفعہ ۱۵ اور دفعہ ۱۶ کے تحت عورتوں پر سرکاری ملازمت کے دروازے کھل گئے اور وہ برابر کے حقوق کی حق دار تسلیم کر لی گئیں۔ اور دفعہ ۱۹ کے تحت انھیں حسب منشا کسی بھی شعبے میں کام کرنے کی ضمانت مل گئی تو کشمیر کی عورتوں نے پرانی ڈگر سے ہٹ کر جدید دنیا میں قائم رکھا۔ آئین ہند کی اس ضمانت سے نئے رجحانات کو وسعت ملی اور نئے خیالات کے لئے دروازے کھل گئے۔ پرانے قسم کے رجحانات سے یہ قدریں اتنی نئی اور بہتر تھیں کہ عورتوں کی زندگی کے ہر شعبے پر ان کی گہری چھاپ پڑی۔ آئینی اور شہری زندگی کو پارلیمانی جمہوریت اور آزادانہ اظہار خیال

بیگم زینب ۱۹۶۵ء میں پاکستانی حملے کے دوران کشمیری خواتین سے خطاب کر رہی ہیں۔

کی بنیاد پر تعمیر کرنا مقصود ہوا۔ بالغ حق رائے دہندگی کے ذریعے مردوں اور عورتوں کو حکومت بنانے کا حق ملا۔ شہری حقوق کی حفاظت کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔ اس کے نتیجے کے طور پر سماجی پستی اور اقتصادی نابرابری کی جو بہن لوگوں کو عموماً اور عورتوں کو خصوصاً محسوس ہونے لگی۔ اس لئے انھوں نے ملک کی معاشی ترقی اور سماجی بہبود میں زیادہ حصہ ادا کرنا اپنا نصب العین بنالیا انھوں نے حکومت کے شانہ بہ شانہ مصوبہ بند اقتصادی ترقی کو یقینی بنانا اپنے لئے لازمی سمجھا۔ کیوں کہ اب انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ ترقی کی راہ میں جو بڑی رکاوٹیں ہیں اور وہ اقتصادی ترقی و توسیع سے ہی دور ہو سکتی ہیں یہ رکاوٹیں اس نااہلیت، نابرابری اور کوتاہ اندیشی کی وجہ سے تھیں جو کہ ترقیاتی اداروں کو فرسودہ نظام سے ورثہ میں ملی تھیں۔ اس لئے اُن کی نشان دہی کر کے اُن کو دور کرنا ضروری تھا۔ عورتوں نے اچھی طرح جان لیا کہ اقتصادی اور سماجی ترقی کے ساتھ ساتھ جو طاقت اور تعمیر کے رشتے ہیں ان کو صحیح ڈھنگ سے چلانے کا کام انھیں بھی سنبھالنا ہے تاکہ اُن کی پسماندگی کلیتاً دور ہو سکے۔ وہ جان گئیں کہ انھیں قدیم دُنیا کے اس فرسودہ تصور سے کنارہ کشی کرنی ہے جو ایک عورت کو صرف گھر کی چار دیواری، بچوں کی نگہداشت اور اقتصادی محتاجی تک محدود رکھتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس انھیں اُن دروازوں پر دستک دینا ہے، جو ملک کی عورتوں کے لئے بھرپور زندگی، خوف و ہراس سے آزادی اور مساوی حقوق کے ضامن ہیں۔

اسی لئے آزادی کے ان بیس اکیس سال کے اندر عورتوں نے سب سے پہلے اپنی جنس کے لئے تعلیم سے پورا استفادہ کرنے کی کوشش کی اپنے قصبوں، گاؤں اور شہروں کی بہنوں کو اس جانب راغب کیا کہ وہ ایک اچھی شہری اور بامعنی زندگی اپنائیں۔ اسکولوں، کالجوں، میڈیکل اداروں و انجینئرنگ کالج اور دیگر ٹیکنیکل اداروں میں عورتوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں داخل ہونے پر راغب کیا گیا۔ جس کے نتیجے کے طور پر ہر شعبے میں وادی کی لڑکیاں پیش پیش رہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسانوں کی ہر نئی پود اور ہر نئی نسل اپنی ایسی نئی خصوصیات لے کر آتی ہے جو پرانی نسل سے مختلف ہونے کے باعث ان کو ایک نئی منزل پر لا کھڑا کرتی ہیں۔ جہاں لازمی طور پر پرانی قدروں کو پس پشت ڈالنا پڑتا ہے۔ آج کشمیر کی عورت اُس سنگِ میل کے قریب آگئی ہے جہاں اُسے جدید تقاضوں کو پورا کر کے آگے بڑھنا ہے نسلی امتیازات، سماجی نابرابری بارسوخ طبقوں کی طرف قانونی تحفظ کا جھکاؤ اور اس قسم کے رجحانات تسلیم شدہ قدروں کے ملمع اور غلاف میں اب بھی جدید قدروں کے سامنے چیلنج کی صورت میں کھڑے ہیں ہم عورتوں کو اس چیلنج کو قبول کر کے ان رجحانات کا مقابلہ کرنا ہے اور ان کو انکی اصلی صورت میں پیش کرنا ہے۔ کشمیر کی عورت جدید زندگی کو اپنانے کو ان مسئلوں سے نبرد آزما ہونے کو تیار ہے اور اُسے یقین ہے کہ وہ اپنی ممتازی روایت اور شان سے اس مہم میں بھی کامیاب ہوگی۔ کیوں کہ وہ جانتی ہے کہ آج عورتوں کے پاس طاقت ہی نہیں بلکہ ان کی خدمات کی بھی اشد ضرورت ہے ان کے تعاون کے بغیر سماجی نظام نہیں بدلا جا سکتا۔ ہمیں بلند مقاصد اور ان کے حصول کے مابین خلیج کو کم کرنا ہے

آج کشمیری عورتیں زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے دوش بدوش کام کر رہی ہیں اور سماجی زندگی کے مختلف شعبوں میں انھوں نے امتیاز و افتخار حاصل کیا ہے۔ ان مایہ ناز ہستیوں میں جنہوں نے کشمیری عوام کو جدیدیت کے راستے پر گامزن کرانے میں اہم اور تاریخی رول ادا کیا ہے زینب بیگم کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے زینب بیگم زندگی کے ابتدائی مراحل ہی سے بیدار شعور اور اعلیٰ ذہانت کی مالک رہی ہیں اور انھیں یہاں کے لوگوں کی صدیوں کی بے بسی اور پسماندگی کا گہرا احساس رہا ہے۔ چنانچہ قومی تحریک کے ہر اہم موڑ پر انھوں نے مردوں کے شانہ بشانہ کام کر کے اپنی بے باکی، جرات مندی، اور بہادری کا ثبوت دیا ہے ۱۹۴۷ء میں جب پہلی بار یہاں کے لوگوں نے اپنی انفرادی اور قومی زندگی کے تحفظ کے لئے بندوقیں اُٹھائیں اور حملہ آوروں کے خلاف صف آرا ہوئے تو زینب بیگم نے عورتوں میں نیا جوش اور ولولہ پیدا کر کے رجعت پسند قوتوں کا سامنا کرنے کا انھیں حوصلہ عطا کیا۔ ۱۹۶۵ء میں بھی انھوں نے بہادری اور جرأت کے ساتھ عورتوں کی رہنمائی کی اور اُن میں اپنے صحت مند اور ترقی پسند خیالات کی روشنی پھیلائی۔ زینب بیگم یہاں کی عورتوں کے مسائل سے بخوبی واقف ہیں۔ اور اُن کی یہ دلی خواہش ہے کہ یہاں کی عورتیں قدامت اور پسماندگی سے نکل کر جدیدیت، سماجی ترقی اور اقتصادی خوشحالی کی روشن منزلوں کی طرف قدم بڑھائیں۔

عورتوں کے مستقبل کو روشن بنانے کی ذمہ داری آج کی عورت پر ہے۔

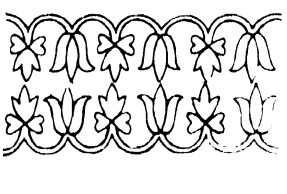

اختر محی الدین

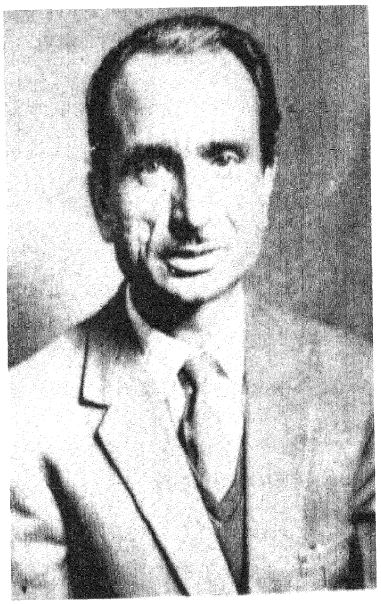

کشمیر کے میلے اور تہوار

فروری کے آخر میں جب جاڑے کے تمام "چلّے" ختم ہو چکتے ہیں اور تھرمامیٹر کا پارہ نقطۂ انجماد سے بڑھ کر اُوپر کی طرف رُخ کرتا ہے تو دلدل میں سے ٹیکہ بٹی کا پھول اپنا نقاب اُلٹ کر سورج کی طرف دیکھتا ہے اور اس طرح بہار کی آمد کی خوشخبری سناتا ہے۔

کشمیر کے لوگوں کو اس پھول سے پیار ہے اس لئے کہ یہ نوید بہار دیتا ہے کشمیر کے لوگوں کو تمام پھولوں کے ساتھ پیار ہے اور یہی وجہ ہے کہ بہار کے اوائل دنوں میں جب بادام پر شگوفے آتے ہیں تو پہلا جشن اُنہیں کی آمد کے سلسلے میں منایا جاتا ہے۔

قلعہ ہاری پربت کے قریب ایک بہت بڑا قطعہ اراضی ہے جس میں بادام کے درخت لگے ہیں۔ مارچ کے مہینے میں ان درختوں پر شگوفے لگتے ہیں۔ ہلکے گلابی رنگ کے شگوفے اس قدر دلآویز ہوتے ہیں کہ سرینگر کیا آس پاس کے دیہات کے لوگ مرد، عورتیں، بچے، ہندو، مسلمان سبھی بادام وآر (اس قطعہ اراضی کا معروف نام) میں جمع ہو جاتے ہیں اور شگوفوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں نوبیاہی عورتیں اور الھڑ دوشیزائیں شگوفوں کے گچھے کانوں میں ڈالکر اپنے حسن کو چار چاند لگاتی ہیں۔ نوجوان لڑکے اپنی محبوباؤں کو رسّول میر کے گانے سناتے ہیں اور عمر رسیدہ مرد عورتیں سماوار میں چائے بنا کر پیالیوں کی پیالیاں خالی کر رہی ہیں چھوٹے چھوٹے بچے سنگھاڑے بیچنے والوں کے گرد بیٹھ کر بھنے ہوئے سنگھاڑے گرم گرم کھاتے ہیں۔ اور اس طرح سبھی لوگ بادام کے شگوفوں کا جشن مناتے ہیں۔

بادام وآر کا میلہ ادھر کئی برسوں سے زیادہ مقبول ہوتا جا رہا ہے سنگیت کاروں کی محفلیں جمتی ہیں۔ یہاں چھکری کا پروگرام ہو رہا ہے اور وہاں صوفیانہ کلام کی محفل۔ یہاں کبڈی کھیلی جاتی ہے اور وہاں پٹاخے چھوٹتے ہیں۔ کم و بیش پندرہ دن تک یہ میلہ لگا رہتا ہے اور سرینگر اور آس پاس کے دیہات کے لوگ خواہ وہ مزدور ہوں یا ٹھیکے دار، منسٹر ہوں یا لیڈر، طالب علم ہوں یا ہنرمند، دانشور ہوں یا ٹیڈی سبھی اس میلے میں شریک ہوتے ہیں۔ اور اپنی اپنی دلچسپی کا سامان پاتے ہیں۔

بادام کے شگوفوں کے میلے کے بعد ہندی مہینے بیساکھ کے پہلے دن سے سرینگر کے نشاط باغ اور شالیمار باغ میں میلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں باغ مغلوں نے اپنے عروج کے دنوں میں لگوائے ہیں۔ یہ باغ ڈل کے کنارے اور پہاڑیوں کے دامن میں سرینگر سے سات میل دُور واقع ہیں۔ ان میں طرح طرح کے پھول کھلتے ہیں ان پھولوں میں سے اکثر وبیشتر یورپی ملکوں سے منگوائے گئے ہیں۔ باغوں کے بیچوں بیچ بڑی خوشنما ندیاں بہتی ہیں جن میں فوارے لگے ہیں۔ ان باغوں میں یکم بیساکھ سے میلہ شروع ہو جاتا ہے اور خزاں کے آخر تک ہر اتوار کو لوگ جوق در جوق یہاں جمع ہوتے

ہیں۔ یہاں کے میلے صرف کشمیریوں کے لئے مخصوص نہیں بلکہ دُنیا بھر سے آئے ہوئے سیاح بھی اِن میں شریک ہو کر محظوظ ہوتے ہیں۔ اِن باغوں کی سیر کے لئے کبھی بس یا ٹیکسی کا سہارا نہ لیجئے۔ حالاں کہ اِن کی اب سرینگر میں کوئی کمی نہیں بلکہ آپ لگری بل پہونچ کر ایک شکارا لیجئے اور جھیل ڈل کی نرم و نازک موجوں کے کندھوں پر سوار ہو کر کنول اور کنول کے پتوں کا نظارہ کرتے ہوئے یہاں پہنچ جائیے۔ لُطف دوبالا ہو جائے گا اور ہاں، نشاط اور شالیمار کو دیکھنے کے بعد آپ قریب ہی چشمہ شاہی دیکھنے بھی جایئے گا۔ وہاں کا پانی میٹھا اور صحت کے لئے اچھا ہے۔ مغلوں کے بارے میں روایت ہے کہ وہ دارالخلافہ دہلی میں بیٹھ کر یہاں سے پینے کا پانی منگواتے تھے۔ اس چشمہ کے گرد بھی باغ لگا ہے اور یہاں بھی ہر اتوار کو میلہ لگتا ہے۔

اگر آپ میلوں ٹھیلوں سے دُور تنہائی میں بیٹھنا چاہتے ہیں تو اتوار چھوڑ کسی دوسرے دن اِن باغوں کی سیر کو جایئے۔ جنت کا جو تصور آپ کے ذہنوں میں ہے، اگر آپ ہو بہو وہ وہاں نہ پائیں تو ہمیں جھوٹا ٹھہرایئے۔ کہاں سے وہ قلم لائیں جو اس عظیم خوبصورتی کا نقشہ پیش کر سکے جو آپ کو یہاں دیکھنے میں آئے گی۔ شالیمار میں ایک شام ضرور گذاریئے۔

سرینگر سے چار پانچ میل دور برزلہ سے جاتے ہوئے ایک گاؤں حیدرپور آتا ہے۔ بہار کے دنوں میں یہاں بھی ایک میلہ لگتا ہے۔ ایک چھوٹا سا باغ ہے جس میں یاسمن کے پودے لگے ہیں۔ جب اِن میں پھول لگتے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ چاندنی زمین پر اُتر آتی ہے۔ وہی پُرکیف ماحول، وہی سہانا منظر۔ وہاں سینکڑوں دیہاتی لوگ اپنے بہترین کپڑوں میں ملبوس جگہ جگہ نظر آئیں گے۔ آپ گھبرایئے نہیں، کیوں کہ یاسمن کا پھول ہر ایک ذی حس کو شور شرابے میں بھی تنہائی کی سی کیفیت عطا کرتا ہے اور اس کی بھینی بھینی خوشبو انسانی ذہن کو آسمانوں کی بلندیوں میں پہنچاتی ہے۔

اگرچہ آپ کو یہاں کبڈی اور کشتی کے کھلاڑی نہیں ملیں گے لیکن صوفیانہ کلام گانے والی منڈلیاں ضرور ملیں گی۔ جو سنطور کی مدھم مدھم آواز اور اپنی لمبی تانوں سے آپ کو اُوپر اور اُوپر اُٹھنے میں مدد دیں گی۔ اور پھر دیہاتی عورتوں کی رنگ برنگی پوشاک اور روپہلے زیور آپ کو یوں محسوس کرنے پر مجبور کریں گے۔ کہ اب دُنیا میں خوشحالی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اب جنگ نہیں ہوگی۔ مار دھاڑ نہیں ہوگی اور انسان بالآخر اشرف المخلوقات ہے۔

پھولوں کے میلوں کی بات چلی ہے۔ تو سُن لیجئے۔ ہمارے ہاں کھیتوں میں بھی میلے لگتے ہیں۔ سرسوں کے پودوں میں جب زرد زرد پھول لگتے ہیں تو سارے کشمیر میں ایک اَن سُنا سا شور سُنائی دیتا ہے۔ کہ "سندہ پھُلے" (سرسوں کے شگوفے) شروع ہو گئے ہیں۔ —— یہ میلے ہر کھیت میں اور ہر گاؤں میں لگتے ہیں۔ شہر کے باسی بھی اِن سے لُطف اندوز ہونے کے لئے شہر کے چاروں طرف نزدیکی کھیتوں میں جاتے ہیں۔

کشمیری چائے ایک خاص ترکیب سے بنائی جاتی ہے۔ اس کا رنگ گلابی ہوتا ہے اور اس میں کھانڈ کے بجائے نمک ڈالا جاتا ہے۔ آپ اس کو پسند نہ کریں گے تو نہ کیجئے۔ لیکن ہر ایک کشمیری کے لئے یہ چائے شراب کا متبادل ہے۔ آپ ہماری مثنویوں کا مطالعہ کیجئے تو پتہ چلے کہ ہم نے ساقی سے شراب نہیں بلکہ چائے مانگی ہے اور آجکل بھی (جب کہتے ہیں کہ زمانے نے کافی ترقی کی ہے اور اقدار بدل گئے ہیں) ہمارے لئے چائے کی گلابی رنگ کی نمکین چائے، وہی کیفیت رکھتی ہے۔

بادام دار ہو یا نشاط باغ، چشمہ شاہی ہو یا یاسمن باغ ہم سماوار لے کر وہاں جائیں گے اور چائے بنا کر پئیں گے۔ پھولوں کا میلہ ہو اور ہم چائے نہ پئیں۔ صاحب یہ بات ہمارے ذہن میں کبھی نہ سما سکے گی۔

ہاں خزاں کے موسم میں جب سب پھول مرجھا چکتے ہیں۔ درختوں کے پتے زرد ہو ہو کر گرنا شروع ہو جاتے ہیں، چناروں میں آگ کے شعلے دکھائی پڑتے ہیں تو اس وقت ہمارے ہاں پانپور میں ایک اور پھول کھلتا ہے۔ یہ ہے پھولوں کا بادشاہ —— زعفران کا پھول۔ اور زعفران صرف پانپور میں اگتا ہے۔ آپ دن کے وقت اس پھول کا جشن منانے نہ جایئے، وہاں کوئی بھی نہیں ہوگا۔ پھول بھی بہت خوبصورت نظر نہیں آئیں گے۔ آپ کو اس پھول کا جشن منانے والوں کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اور پھر جب چودھویں کا چاند منہ سے پورا نقاب اُلٹ کر اپنے حُسن کا بھرپور مظاہرہ کرے تو اس رات آپ پانپور میں زعفران کا میلہ دیکھنے جایئے۔ بہت سے لوگ ہوں گے۔ دُور گاؤں میں چھوٹی چھوٹی بچیوں کے رؤف (لوک گانے) کی آواز آتی ہوگی۔ اور لوگ اپنے یار دوستوں، بچوں، بچیوں سمیت الگ الگ ٹولیوں میں چائے پیتے نظر آئیں گے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ کشمیر کی عظیم شاعرہ زون یہیں کی تھیں۔ اور یہیں پر اس کو شہزادہ یوسف شاہ نے زعفران چنتے دیکھا تھا اور اس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ زون اب حبہ خاتون کے نام سے مشہور ہے۔ کیا آپ نے حبہ خاتون کے گیت سُنے ہیں؟ نہیں؟ تو پھر آپ میرا یہ مضمون پڑھ کر کیا کیجئے گا۔ حبہ خاتون کی شاعری کو جانے بغیر آپ زعفران کے پھول کا حسن کیسے دیکھ سکیں گے؟

حبہ خاتون سے پہلے، بہت پہلے کشمیر میں ایک اور عظیم الشان شخصیت نے

جزیا تھا جن کا نام نامی فارسی تواریخوں میں حضرت شیخ العالم شیخ نورالدین ولی رح درج ہے لیکن سنسکرت تواریخوں میں انھیں سہزانند کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

آپ نے چودھویں صدی عیسوی میں جنم لیا تھا۔ روایت ہے کہ جب آپ اس دُنیا میں وارد ہوئے تو آپ نے اپنی ماں کا دودھ پینے سے انکار کیا۔ ماں بہت پریشان ہوئی۔ نہیں جانتی تھی کہ بچہ کیسے جیے گا۔ انہی دنوں لل دید (جسن کو فارسی تواریخ دان لله عارفہ اور سنسکرت تواریخ دان لل ایشوری کے نام سے پکارتے ہیں۔) ادھر سے گزری۔ پریشان ماں اپنے بچے کو گود میں لے کر لل دید کے پاس پہنچی اور اُسے یہ ماجرا سُنایا۔ لل دید مسکرائی۔ اپنی چھاتی بچے کے قریب لے گئی اور کہا "پی لے میرے بیٹے جو تو اس دُنیا میں جنم لینے سے شرمایا نہیں تو دودھ پینے سے کیوں شرماتا ہے۔" بچے نے چھاتی مُنہ میں لے لی اور چوسنا شروع کیا۔

کیا مجھے یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ نندہ رشی (شیخ نورالدین ولی کا معروف نام) مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا تھا لیکن دُودھ اُس نے لل دید کی چھاتی سے پیا جو ہندو عورت تھی؟ صاحب، روایت درست نہ بھی ہو لیکن یہ ایک بہت بڑا اسمبل ہے۔ اس دور میں نندہ رشی کے رُوپ میں کشمیر میں اسلام جنم لے رہا تھا لیکن اسلام کو دودھ پلانے والی لل دید شوتر کے فلسفے کی آخری اور عظیم مبلغ تھی۔

یاد رکھئے کہ لل دید اور نندہ رشی کشمیری ادب کی تاریخ کے ابتدائی عنوان ہیں اور انہی کا فلسفہ آج بھی کشمیریوں کا رہبر ہے یہی وجہ ہے کہ ہم آج بھی ہر سال ہزاروں کی تعداد میں شیخ العالم رح کے مزار اقدس واقع چرار شریف میں جمع ہوتے ہیں اور وہاں اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ اس مزار پر عقیدت مند ہر جمعرات کو جمع ہوتے ہیں اور رات بھر عبادات میں مصروف رہتے ہیں۔

ہماری روایات بہت سے معاملوں میں کچھ لوگوں کے لئے معمہ ہیں۔ جو لوگ ہندو اور مسلمانوں کو دو الگ الگ قومیں تصور کرتے ہیں وہ ان روایات کو کبھی سمجھ نہیں پائینگے اور جو لوگ صرف ہندستان کو اس خطے کا جائز وارث تصور کرتے ہیں۔ اُن کو بھی یہاں بڑی مایوسی ہوگی، کیونکہ کشمیر میں نہ ہی تہوار یا مقدس مقامات کبھی بھی صرف ایک ہی مذہب کے ماننے والوں کے لئے مخصوص نہیں سمجھے گئے ہیں۔

کشمیر میں دو عظیم الشان زیارتیں ہیں۔ ایک جھیل ڈل کے کنارے حضرت بل جہاں حضرت نبی اکرم ص کا ہوئے مبارک رکھا ہوا ہے۔ جہاں ہر جمعے کو میلہ لگتا ہے اور لاکھوں فرزندانِ توحید دیدار موئے مقدس سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں کسی ناعاقبت اندیش نے موئے مقدس کو اپنی جگہ سے اٹھایا تھا تو کشمیر میں صف ماتم بچھ گئی۔ ہر طرف سے جلسے جلوس ہوئے اور ہر شخص اس مقدس امانت کی بازیابی کے لئے دعائیں کرتا تھا ان جلسوں اور جلوسوں میں نہ صرف مسلمانانِ کشمیر لاکھوں کی تعداد میں جمع تھے بلکہ کشمیر میں رہنے والے ہندو سکھ اور عیسائی بھی اس ماتم میں برابر کے شریک تھے اور پھر جب موئے مقدس آنحضرت کی بازیابی کا اعلان ہوا تو شادیانے بجائے گئے میں کشمیر کا ایک ایک فرزند، چاہے وہ مسلمان تھا، ہندو یا سکھ، شامل تھا۔

دوسری مقدس جگہ امرناتھ گپھا ہے، جہاں ہر سال ہزاروں کی تعداد میں زائرین مختلف علاقوں سے آکر جمع ہوجاتے ہیں اور شیو لنگ کے درشن سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ یہاں جو نیاز نذرانے جمع ہوتے ہیں اُن کا ایک حصہ ایک مسلمان کنبے کو بھی ملتا ہے معلوم ہے کیوں؟ اس لئے کہ یہ گپھا سب سے پہلے ایک مسلمان نے ہی دریافت کی تھی۔

کشمیر میں میلوں ٹھیلوں کی بات کریں تو کرتے ہی جائیں گے۔ یہاں تو ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ آج نوہ مولہ میں کھیر بھوانی کا میلہ ہے تو کل اس سے چند میل آگے قمر صاحبؒ کا عرس ہے۔ ادھر ہری پربت قلعہ کے قریب حضرت محبوب العالم مخدوم صاحب کا عرس مبارک ہے اور اسی کے ساتھ شنکر اچاریہ کے عقیدتمندوں کا بھی جم غفیر ہے۔ یہاں آپ بابا ریشی کے عُرس میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں کو شریک محفل دیکھیں گے۔ اور وہاں الک شری کی سمادھی پر آپ کو ہندوؤں کے دوش بدوش مسلمان بھی نظر آئیں گے۔

اور پھر آخر کار جب جاڑا شروع ہوتا ہے اور موسم کی پہلی برفباری ہوتی ہے تو کشمیر میں نئے برف کا جشن منایا جاتا ہے۔ اس جشن میں کہیں میلہ نہیں لگتا۔ کہیں لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع نہیں ہوجاتے بلکہ بڑی خاموشی سے ایک دوسرے کو یہ رقعہ بھیجنے کی پہل کی جاتی ہے ؎

برف نو افتاد صد مبارکباد
آنچہ شرط است زود باید داد
کوچہ ہا گل شد دیدنِ بار مشکل شد

اور پھر اس مبارک تقریب پر "ہری سا" کی دیگچیاں ایک گھر سے دوسرے گھر آجاتی ہیں۔

کشمیر کی دستکاریاں

فدا محمد حسنین

آسمانوں کو چھوتی ہوئی برفانی چوٹیوں کے درمیان وادیٔ کشمیر دُنیا کی حسین ترین وادی ہے جہاں حدِ نظر تک، پھولوں کے مرغزار، سرسبز اشجار، پھلوں اور پھولوں سے لدے ہوئے پودے، آبشاریں، چشمے، جھیلیں اور ندیاں دکھائی دیتی ہیں۔ قدرت نے اس سرزمین کو ایک لازوال حسن سے مالا مال کیا ہے۔ ایک فنکار ایک مصور اور ایک کاریگر کے لئے کشمیر کی دھرتی سجائے خود ایک ماڈل ہے، جہاں قدرت نے فن کے اعلیٰ ترین نمونے بہم پہنچائے ہیں۔ ایسے گرد و پیش میں رہتے ہوئے ایک کاشمیری کا مزاج مصورانہ بن گیا ہے اور اپنے مزاج کو اپنے فن میں سمو دینا ہے۔ نتیجہ کے طور پر پیپر ماشی، وڈ کارونگ، قالین بافی، اور دیگر دست کاریوں میں وہ وادی کے نظارے پیش کرتا ہے۔

آج کل کی مادی دُنیا میں صنعت و حرفت کا ایک اہم مقام ہے۔ مگر یہ سب کام مشینوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ایک فن کار، مصور اور دست کار اپنی شخصیت کو سمو دیتا ہے۔ اس لحاظ سے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں جاذبِ نظر ہونے کے ساتھ ساتھ قلبی سکون بہم پہنچاتی ہیں۔ اسی لئے کشمیر کی دستکاریاں دُنیا میں مقبول ہیں اور اُن کے عاشق ہر جگہ ملیں گے۔

کشمیر کی دستکاریوں میں قالین بافی، سمندہ سازی، پیپر ماشی، وڈ کارونگ نمایاں حیثیت رکھتی ہیں کشمیر اور شال بافی لازم و ملزوم ہیں۔ ان چیزوں کے بنانے والے اگلے وقتوں میں بھی تھے۔ اور آج بھی موجود ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مشینی تہذیب نے آج کے دستکار پر اپنا اثر ڈال دیا ہے۔ نتیجہ کے طور پر آج کی دستکاریوں کے نمونے، اُن کے رنگ، اور اُن کی تخلیق میں بناوٹ کا عنصر زیادہ ہے۔ وہ جاذبِ نظر تو ہیں لیکن اُن کا حسن مصنوعی ہے جن پر ماڈرن غازہ بہت چابکدستی سے لگایا گیا ہے۔ آج کل وہ شال کہاں جو وسط ایشیا اور لداخ کی جنگلی بھیڑوں کے خالص پشم سے بنائے جاتے تھے۔

اعلیٰ قسم کی پشم طوس کہلاتی ہے۔ اس سے بُنا ہوا شال ایک انگوٹھی کے قطر سے نکل سکتا تھا۔ یہ شال بیش قیمت ہوتا ہے۔ کشمیری شال، دو قسم کے ہوتے ہیں۔ (ا) کانی شال (ب) عملی شال۔

کانی شال کھڈی پر بنائے جاتے ہیں۔ اور عملی شال ہاتھ سے بنے جاتے ہیں۔ بیل بوٹوں کے ڈیزائن، کاغذ پر بنے جاتے ہیں جن کو تعلیم کہا جاتا ہے۔ تمام طور پر شال پر پشم، یا ریشم سے بیل بوٹے کاڑھے جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی سونے یا چاندی کے تار کشیدہ کئے جاتے ہیں۔ آج کل رفل اور ایسی ہی سستی اونی چادروں پر ریشم سے کشیدہ کاری کی جاتی ہے۔ اور یہ کام بہت چل نکلا ہے۔

قالین بافی کا کام سلطان زین العابدین بڈشاہ (۱۴۲۰ء-۱۴۷۰ء) کے دورِ حکومت میں شروع ہوا تھا۔ سلطان نے اپنے فرزند شاہی خان کو سمرقند روانہ کیا تاکہ وسطی ایشیا کے دستکار حاصل کئے جائیں۔ شاہی خان اپنے ہمراہ قالین باف سینا کار اور زین سازے آیا۔ کشمیریوں نے اُن سے قالین بافی، نمدہ سازی اور دیگر ہنر سیکھے۔ مغلوں کے دورِ حکومت میں قالین بافی کو فروغ حاصل ہوا۔ ڈوگرہ حکومت میں انگریزوں نے اس صنعت کو بہتر اور احسن طریقے پر منظم کیا اور چند ایک کارخانے قائم کئے گئے۔ کشمیری قالین یورپی ممالک کو جانے لگے۔ اب یہ صنعت مضبوط بنیادوں پر قائم ہوگئی ہے۔ قالین بافی کے لئے خام مواد اون، روئی اور رنگ ہے۔ مقامی اُون سے عمدہ قالین نہیں بن سکتے۔ اس لئے اُون آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جنوبی امریکہ سے درآمد کیا جاتا ہے۔ اور روئی کا دھاگہ احمد آباد اور دہلی سے منگوایا جاتا ہے۔ ابتدا میں رنگ مقامی طور سے سبزیوں، پھولوں اور پتھروں سے حاصل کئے جاتے تھے اب یہ چیزیں بھی باہر سے منگوائی جاتی ہیں۔ حال ہی میں آل انڈیا ہینڈی کرافٹ بورڈ نے ایک لیبارٹری اس مقصد کے لئے بنائی ہے کہ مقامی طور پر رنگ بنانے کے امکانات کا جائزہ لیا جا سکے۔

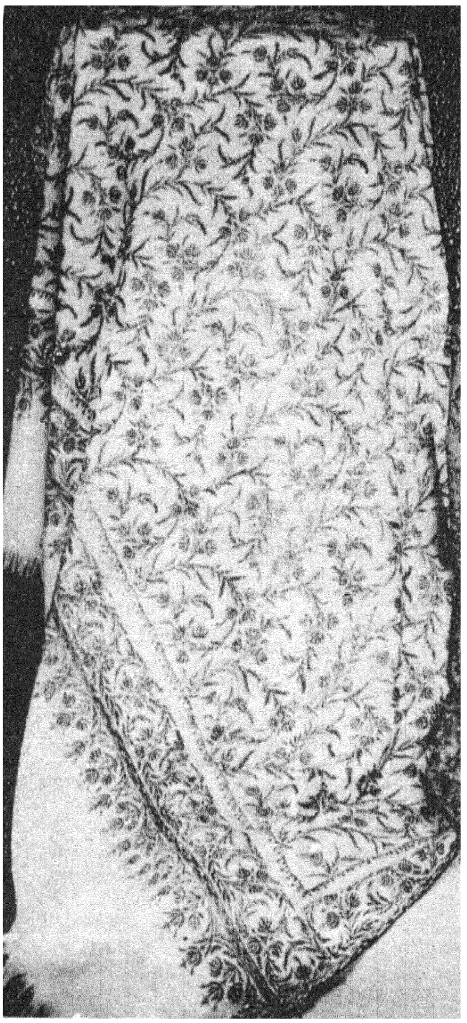

قالین کے ڈیزائن کا دارومدار اس امر پر ہوتا ہے کہ قالین کس صنف اور کس درجہ کا بنایا جائے۔ درجہ بندی کا انحصار اس امر پر ہے کہ ایک مربع انچ میں کتنی گانٹھیں لگائی جائیں۔ ایک انچ مربع کے لحاظ سے جتنی زیادہ گانٹھیں لگائی جائیں، قالین اتنا ہی قیمتی ہوا کرتا ہے۔ قالین میں ۷۰ سے لے کر ۶۰۰ گانٹھیں فی مربع انچ لگائی جا سکتی ہیں۔ پہلے قالین کا ڈیزائن ایک گراف کاغذ پر بنایا جاتا ہے۔ جس پر رنگ شیڈ اور دوسرے لوازم پُر کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد کاغذ کے پُرزوں پر کو ڈ حروف میں علامتی نشان لگائے جاتے ہیں۔ اس کاغذ کو "تعلیم" کہتے ہیں۔ 'تعلیم' کا کاغذ اُستاد کاریگر پڑھتا جاتا ہے اور سارے کاریگر 'تعلیم' سننے کے ساتھ ساتھ قالین پر گانٹھیں لگاتے جاتے ہیں۔ اور رنگ برنگی اُون سے قالین کے تانے بانے کو بھرتے جاتے ہیں۔ پہلے پہلے کشمیری دستکاروں نے ایرانی اور وسط ایشیائی ڈیزائن اپنائے تھے بعد میں انھوں نے یہاں کے قدرتی نظاروں شالامار، شالیمار، شگوفہ پہاڑ وغیرہ سے نئے نئے ڈیزائن مستعار لئے۔ ایک قالین باف کی آمدنی ۷۰ روپے سے ۷۵ روپے ماہوار ہے۔ اور کشمیر میں تقریباً تین ہزار قالین باف ہیں۔

نمدہ سازی کی ابتدا اکبر اعظم کے عہدِ حکومت میں ہوئی، جب کہ اُس نے کابل سے وہ کاریگر منگوائے جو گھوڑوں کی زین تلے اون کی ایک گدی جس کو جول کہتے ہیں، بنانے کے ماہر تھے۔ کشمیر میں نمدہ سازی کا باقاعدہ کام ۱۹۱۸ء کے بعد شروع ہوا۔ اس سے قبل نمدے یارقند سے آیا کرتے تھے۔ روس میں اشتراکی انقلاب کے بعد یہ راہیں مسدود ہو گئیں۔ یارقندی نمدے صرف اُون سے تیار کئے جاتے تھے۔ کشمیری نمدوں میں اُون اور روئی ۳:۱ کی مقدار میں لگائی جاتی تھی۔ بعد میں یہ تناسب گھٹتے گھٹتے ۲۰ فیصدی اُون اور ۸۰ فیصدی روئی تک آگیا۔ نتیجہ کے طور پر کشمیری نمدوں کا معیار حد سے زیادہ گر گیا۔ حکومت نے نمدہ کو الی کنٹرول ایکٹ نافذ کیا ہے، تاکہ معیار قائم ہو سکے۔ نمدوں کی اُون اب پنجاب، ہماچل اور راجستھان سے درآمد کی جاتی ہے۔ اور روئی امرتسر، انبالہ اور دہلی سے منگوائی جاتی ہے۔ صابن بھی باہر سے منگوایا جاتا ہے۔ پہلے ایک چٹائی پر لحاف پھیلائی جاتی ہے اور اس پر روئی کی تہہ لگائی جاتی ہے اور پھر اُون کی ماس کے بعد صابن ملایا جاتا ہے

تاکہ اُون اور روئی جڑ جائے۔ اس کے بعد چٹائی کو لپیٹ کر پیروں سے گھمایا جاتا ہے۔ گھنٹہ بھر کے بعد جب چٹائی بچھائی جاتی ہے تو نمدہ بن گیا ہوتا ہے جس کو سکھانے کے بعد دھوبی دھوتے ہیں۔ کشمیری دستکاروں نے نمدوں پر کشیدہ کاری کا کام ایجاد کیا ہے۔ اس سے یہ نمدے جاذبِ نظر بن جاتے ہیں۔ یارقندی نمدوں پر بیل بوٹے کاڑھے نہیں جاتے تھے۔

انت ناگ کشمیر میں گبہ دوزی کا کام ہوتا ہے۔ یہاں کے دستکار، پٹو کے پرانے کمبل حاصل کرکے ان کا مالیدہ کرتے ہیں اور پھر اُن پر اُون سے کشیدہ کاری کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اونی کمبل کے رنگ برنگے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک حسین دُنیا کا "گبہ" تیار کرتے ہیں جو کمروں میں بچھانے کے کام آتا ہے۔

پیپر ماشی کے لئے کشمیر مشہور ہے۔ یہ دستکاری قریباً پانچ سو سال پرانی ہے اور سمرقند سے درآمد کی گئی ہے، جہاں اس کو کارِ قلمدانی کہتے ہیں۔ سلطان بڈشاہ نے وسط ایشیائی کاریگر، کشمیر میں بسائے جنہوں نے اس کی ابتدا کی۔ پیپر ماشی کا خام مواد کاغذ، کپڑے اور چاول کو پیس کر حاصل کیا جاتا ہے اور اس کے گودے سے مختلف اشیاء مثلاً قلمدان، پھول دان ڈبے، ٹرے وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان پر عمدہ قسم کا چونہ لیپ دیا جاتا ہے۔ خشک ہونے پر ان اشیاء پر شیشے کے گوٹے سے مہرہ کیا جاتا ہے تاکہ اُن کی سطح چکنی اور ملائم ہو جائے۔ اُس کے بعد سفیدے کا شنگرف کو مایہ میں ملا کر ایک ہلکا سا لیپ دیا جاتا ہے۔ بعد میں رنگ برنگے اور سنہرے بیل بوٹے بنائے جاتے ہیں۔ یہ کام نقاش کا ہوتا ہے۔ سنہرے اور روپہلے نام کے لئے سونے اور چاندی کے ورق ان لکیروں پر چپکائے جاتے ہیں، جو مایہ یا گوند سے کھنچی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس کے بعد

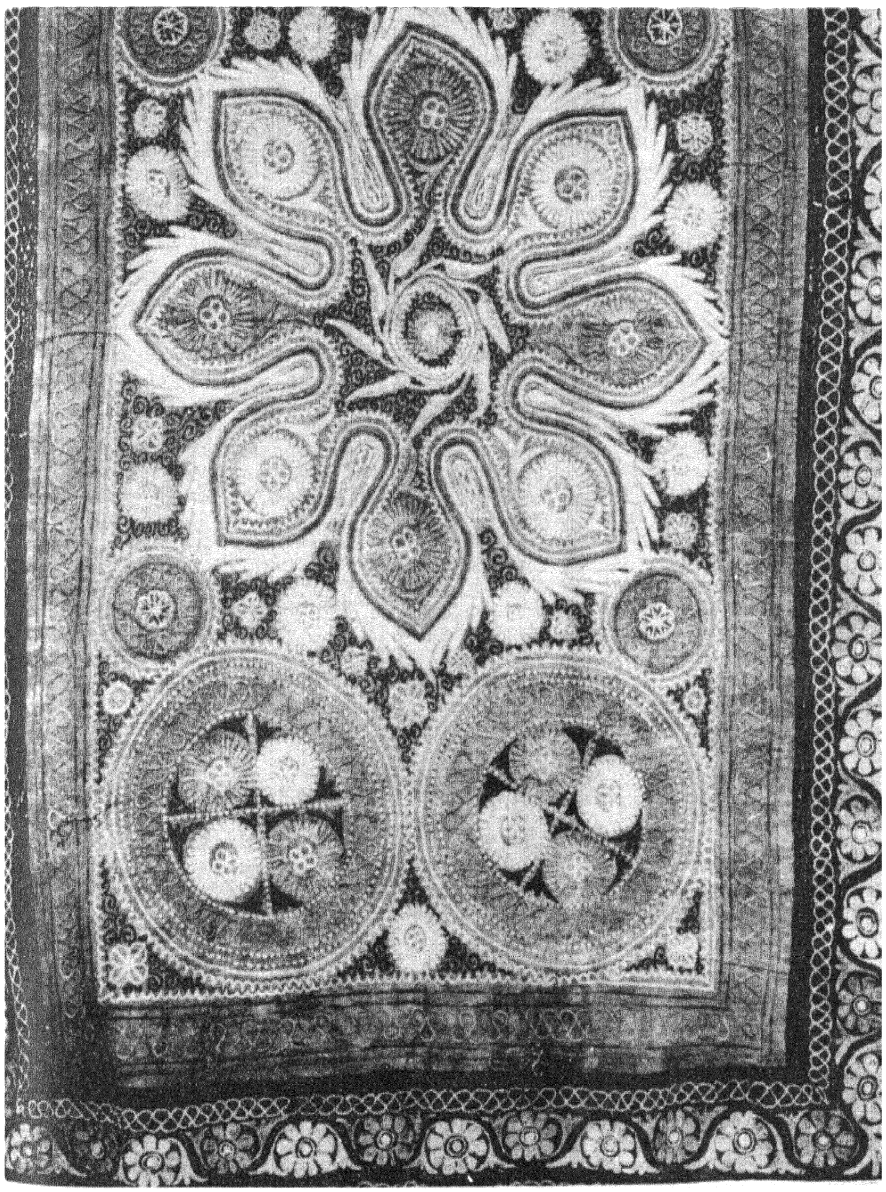

وارنش کا ایک لیپ دے کر ہلکی دھوپ میں سکھایا جاتا ہے خشک ہونے پر ان اشیاء کو سنگ یشم سے خوب رگڑا جاتا ہے تاکہ چمک اور ملائمت قائم و دائم رہے۔

پیپر ماشی کے لئے جو مواد اب استعمال ہوتا ہے وہ ریڈی میڈ قسم کا ہے۔ اور اس میں وہ پائیداری اور نفاست نہیں جو پہلے ہوا کرتی تھی آجکل کاغذی گودے کی جگہ لکڑی کا گودہ استعمال ہوتا ہے جس پر مشین سے بنے ہوئے رنگ و روغن استعمال ہوتے ہیں۔ سونے اور چاندی کے اصلی ورق کی جگہ نقلی ورق لگائے جاتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں پیپر ماشی کی اشیاء اتنی زیادہ پائیدار ہوا کرتی تھیں کہ گرم پانی بھی اُن پر اثر انداز نہیں ہو پاتا تھا زمانے کے ساتھ ساتھ یہ خصوصیت بھی ختم ہو گئی ہے۔ آج کل کی چیزوں میں وہ پختگی نہیں اور نہ رنگ روپ ہی دیرپا ہوتا ہے۔ ماضی میں کمروں کی سیلنگ پر پیپر ماشی کا کام ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ دروازوں کھڑکیوں پر بھی نقاشی یہ کام کرتے تھے۔ آج کل یہ کام نہیں ہوتا۔ آج کل پیپر ماشی کے پوڈر بکس، سگریٹ کیس، ٹیبل لیمپ، ٹرے، پھولدان، سگریٹ کیس، ایش ٹرے بنائے جاتے ہیں۔

اس دست کاری کا مرکز سری نگر ہے اور قریباً سوا سو خاندان اس دست کاری پر پل رہے ہیں اور ہر سال قریباً دس لاکھ روپے کا مال تیار ہوتا ہے۔

پیپر ماشی کے کام کے ساتھ ساتھ کشمیر میں لکڑی کا عمدہ کام ہوتا ہے۔ اور اس دست کاری کو "وڈ کارونگ" کہتے ہیں۔ اخروٹ کی لکڑی سے فرنیچر

پیپر ماشی کا کام

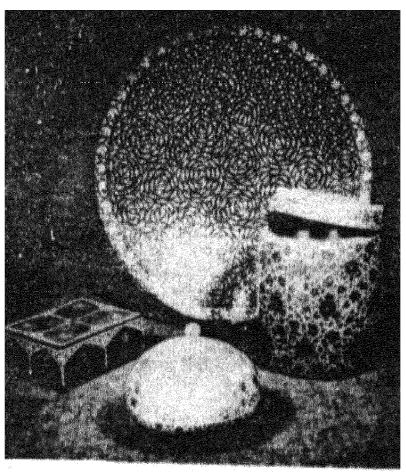

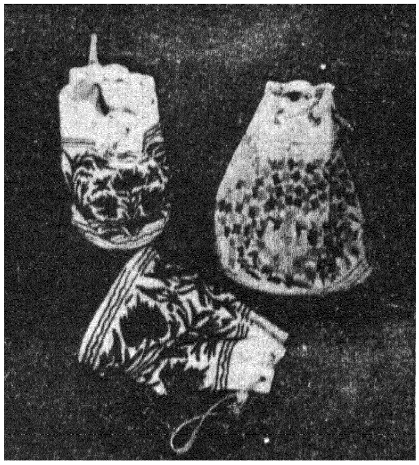

چمڑے کی چیزیں

سگار بکس، صندوقچے، ڈبے، سگریٹ کیس، اور آرائش کی کئی چیزیں بنائی جاتی ہیں اخروٹ کی لکڑی کے تختے دھوپ میں خشک کئے جاتے ہیں یا اسٹیم کے ذریعے۔ پھر دستہ کار، ان تختوں پر ڈیزائن بناتا ہے۔ اس کے بعد مختلف کاریگر کام کو ہاتھ میں لیتے ہیں۔ مختلف اشیاء پر کندہ کاری، نقاشی، اور ابھار کٹاؤ کا کام محنت سے کیا جاتا ہے۔ یہ کام کرنے کے بعد ان اشیاء کی سطح ریتی، ریگ مال اور ریتی سے رگڑی جاتی ہے تاکہ کھردرا پن ختم ہو جائے۔ بعد میں سنگ یشم سے خوب رگڑ رگڑ کر چمک اور ملائمت پیدا کی جاتی ہے۔ لکڑی کے کام میں تمام ماڈرن ڈیزائن اور خاکے کشمیر کے پھولوں اور بیلوں سے حاصل کئے گئے ہیں۔ مثلاً کنول کا پھول، چنار کے پتے، انگور کی بیل، مختلف پھل اور پھول، پرندے اس دست کاری کا مرکز بھی سری نگر ہے، کیوں کہ یہاں سیاح لوگ ان چیزوں کو خریدتے ہیں۔ دو سو کے قریب خاندان اس دست کاری پر پل رہے ہیں۔ اور ہر سال قریباً ۲۲ لاکھ روپے کا سامان تیار ہوتا ہے۔ ایک کاریگر کی روزانہ آمدن چار یا پانچ روپے ہے۔

مغلوں کے دور حکومت سے قبل کشمیر میں دھات کا کام بھی ہوتا تھا۔ اور یہاں، تلواریں، نیزے، برتن وغیرہ بنائے جاتے تھے۔ جس کو کشمیریوں نے کئی بار مغلوں کو شکست دی تھی، انھوں نے ہتھیار بنانے کا کام بند کروا دیا۔ کشمیری کاریگر چاندی اور تانبے کے برتن اور ان پر نقش و نگاری کا کام کرنے لگے۔ یہ کام کندہ کاری کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں کے کاریگر تانبے کے ظروف، چاندی کے ٹی سیٹ، پیالے، صراحیاں، لوٹے اور زیورات بناتے

(بقیہ صـ۱۹ پر)

میری کتاب تیری کتاب

میری کتاب —
روشنی کی اک کرن
دھرم، ذات، رنگ، نسل نام کے
زندانوں میں جو قید رہ سکتی نہیں
میری کتاب، —
انسان کی نظروں کو پاکیزہ کرے
روئے زمین کے سینکڑوں ہی راز کرے آشکار
اور کرے عقل و خرد کو بے پناہ وسعت عطا
انسان کو شفقت سے دیکھے، مسکرا کر یہ کہے
'نادان، اپنے آپ کو پہچان
تو بھی اک ایسی کرن ہے
تیرگی نے گھیر رکھا ہے جسے،
اے بے خبر، تو بھی کرن ہے، ان اندھیروں کے
جگر کو چاک کر دے'!

میری کتاب —
روشنی جس کی کبھی کم ہو نہیں سکتی،
چاند، سورج، سب سے بڑھ چڑھ کر ہے جو
گر نہ ہوتی یہ کبھی
تو سینکڑوں ہی چاند سورج
دور سرگز کر نہ پاتے
تیری لاعلمی کی ان تاریکیوں کو
آدمی کو آدمی تب کون کہتا؟

میری کتاب
جس میں اس مٹی کی خوشبو
اور اس دھرتی کے بیٹوں کا انوکھا بانکپن
اُن کے غور و فکر کا آبِ حیات
پھول سے کومل دلوں کی دھڑکنیں
اور اُجالوں کی لگن
میری کتاب۔
انسانیت کا اک نیا رشتہ ہے جو
ذات پات، رنگ و نسل کے بندھنوں سے پاک ہے!
صلح و آشتی کا ہے پیام
زندگی کا گیت ہے، سنگار ہے!!
اے میری دُنیا کے مالک:
یہ جو ہے تیری کتاب:
دھرم، دھرتی، ذات، رنگ و نسل کی آئینہ دار
مختلف ہیں ساز سب کے
مختلف آواز ہے:
ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی انسانیت
ہر طرف پرچم الگ
گونجتے نعرے الگ
تاریخ انساں میں رقم
تیری کتابوں کا نچوڑ:
سو لڑائیاں، قتل و غارت
بربادیاں، خونی جہاد

تبلیغ اور تیغ و سناں
تیری کتاب:
پیار کے بولوں میں نفرت
تیاگ کی باتوں میں کینہ
تیری کتاب:
آدمی گمراہ
منزل کی تلاش
گپ اندھیروں میں لرزتا، کپکپاتا گیت ہے
بے سُرا، بے تال سے اکھڑا ہوا
تیری کتاب!

تیری کتاب!
گر نہ ہوتی یہ
تو نہ ہوتا خمار
اور نہ ہوتا جنوں
اور نہ ہوتیں لڑائیاں بے شمار
دامنِ انسانیت ہے تار تار
تیری کتاب
ہے نشہ ظلم و تشدد کا، بربریت کا خمار
جس کے سبب انسان ہے
بُزدل، نکما اور بیمار

(ترجمہ: جتندر شرما)

پریم ناتھ در

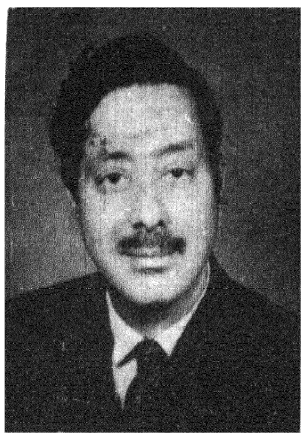

کشمیری کھانے

کاش میں شاعر ہوتا، شعروں کی تلاش میں کشمیر کے شوخ پھولوں کا جوبن دیکھتا نہ سرد آبشاروں کا جنون۔ رنگ پوش دیواروں کی سجی ہوئی صفوں میں سے ہوا کا یونہی آنا جانا دیکھتا نہ چوٹیوں کے برفیلے تیکھے پن پر سنہلی دھوپ کی نرمی بیں ڈال ڈال اور جھونکے جھونکے کا کھیل دیکھتا نہ پانی پتھر کا راگ سنتا میں جو گیت گاتا وہ گیت نئے ہوتے، نئی لذتوں کے، بے شمار پکوانوں کے بکی لبھانے والی خوشبو میں کشمیر کا سادہ پانی بھی آبِ زمزم بن جاتا ہے جن کو دیکھتے ہی اندر خانوں کے کواڑ سے کھلنے لگتے ہیں۔ آنکھ، ناک، زبان کی یک جہتی میں ایک بھرپور اور لذیذ ترین حسن کا احساس روح کی گہرائیوں میں اترتا ہے اور ایک انجانی اور انمول کیفیت میں آدمی ماحول کو پرکھتا، سمجھتا اور محسوس کرتا ہے۔

اس راز کو جاننے والا رنگین وادی کی گود میں بیٹھا ہوا، قدرت کا فنکار اور باذوق بیٹا، کشمیری، خود گھر سے جب بھی باہر نکلتا ہے ڈل کے نیلے پانی پر کشتی کی سیر کرنے، ہری گھاٹیوں میں لوٹ لگانے یا دور سبز بستہ علاقوں میں کنواری ہوا کے گھونٹ پینے وہ اپنے مخصوص پکوانوں کا سامان کندھے پر اٹھائے نکلتا ہے اور کہیں گرم گرم قہوے کی مہکتی ہوئی بھاپ میں اور کہیں پانی میں پہاڑ کے پرتو کو دیکھتا ہے۔ کہیں گوشتابے کی دمی ہوئی گرمی کو فوارہ دل کی پھنیٹیں کھلاتا ہے اور اس طرح دروں پروں کو ہم آہنگ بنا کر جنتِ ارضی کو پہلو پہلو سے اپناتا ہے اور اس لذت سے محروم نہیں رہتا جو اکثر انسان کشمیر کے سیاح بن کر بھی پانے کی کوشش نہیں کرتے۔

ویسے تو یہ کشمیری پکوان دنیا بھر میں مشہور ہیں، لیکن یہ ایک غلط خیال عام ہے کہ ان کی مخصوص لذت کشمیر کے مسالوں کی پیداوار ہے اور پھر یہ بھی کہ یہ مسالے خود کشمیر ہی کی مٹی سے اگتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ صاحبِ ذوق کشمیری کو یہ بنیادی فہم وراثت میں ملی ہے کہ قدرت نے جتنی چیزیں ہمارے کھانے کے لئے مہیا کی ہیں، ان میں سے ہر ایک شئے کی اپنی الگ خوشبو بھی ہے، اپنا مزا بھی۔ بناوٹ میں نرمی سختی کا اپنا درجہ بھی ہے اور خشکی اور تری کا اپنا تناسب، رنگ بھی الگ، صورت بھی الگ اور یہ کہ چیز کو پکاتے ہوئے، اس کی اپنی شکل کو نہ بگاڑنا ہے نہ بدلنا ہے بلکہ اس کی اپنی خام خو بو کو مناسب جوش دے کر پختہ کرنا ہے۔ ابھارنا ہے۔ مسالے کا دخل اگر ہے تو وہ آخری منزل میں جب کہ چیز اپنے پورے نکھار پر آگئی ہو

سبزیوں اور ترکاریوں میں ایک چیز جو کشمیری کو سب سے زیادہ بھاتی ہے وہ ہے "ہاک" جس کی نقل کو پنجاب میں کرم کا ساگ کہتے ہیں۔ یہ ساگ شکل وصورت اور بناوٹ کے لحاظ سے سرسوں کا خوبصورت بھائی لگتا ہے۔ ایک ایک پتہ پہاڑی چشتی میں کھڑا ہوتا ہے۔ جھکاؤ تو نرم نرم سا

توڑو توخستہ سا، دُنیا کا واحد ساگ جو ثابت پکایا جاتا ہے اور شوربے کے ساتھ۔ دعوت میں چاہے کتنے ہی گوشت بنے ہوں، مدارات اسی ساگ کی ہوتی ہے اور ساگوں کا یہ راجہ صرف نمک اور ثابت مرچ کے ساتھ پانی میں اُبالا جاتا ہے۔ کسی اور مسالے کا اس میں نام بھی نہیں ہوتا۔ اسی طرح کے کئی اور مقامی ساگ بغیر مسالے کے لیکن بالکل الگ الگ ڈھنگ سے غریب کشمیری کے دسترخوان کو امیروں کی ضیافتوں سے کہیں زیادہ لذیذ اور لطیف خوشبوؤں اور لذتوں سے سجاتے ہیں۔ ایسے پکوانوں سے جن کو بزرگوں کے مہیا کئے ہوئے نسخوں اور محض آگ تیل، نمک مرچ کے فنکارانہ میل سے ایسا بنایا جاتا ہے کہ اُن کے چھپے ہوئے ذائقے "فلیور Flavour" بھاپ کی پیاری پیاری تھپکی سے پھوٹ نکلتے ہیں۔ ایسے کھانوں کی ایک دلفریب مثال شلغم کی ہے۔ جی ہاں سیدھے سادے شلغم کی۔ بنیادی بات پہلے یہی طے کیجئے کہ شلغم کو چھلے بنا کر تلنا ہے یا چھیل کر۔ نہ چھلئے تو آپ یہی چاہتے ہیں کہ سبزی کل کو بھی ڈلی ڈلی کی صورت میں موجود رہے اور چھلکے کی اپنی الگ بات سبزی کی آخری صورت میں، اس کے فلیور میں شامل ہو۔ چھلکا اُتاریئے تو سبزی ہی دُوسری ہے۔ اسی ایک شلغم کی کئی سبزیاں بنتی ہیں۔ کبھی جھیل سے آئی ہوئی کمل ککڑی کے ساتھ اور کبھی دیہات سے آئی ہوئی رازماہ کے ساتھ طرح طرح سے پکئے اس شلغم کی گرم گرم بھاپ کو اٹھتا دیکھ کر سردی میں ٹھٹھرا کشمیری چاہے طبیعت سے کتنا ہی سنجیدہ ہو، اودھوں کی طرح مچلنے لگتا ہے۔ لیکن اس شلغم میں مسالہ کیا ذرا سی ہلدی ڈالئے تو اس کی رُوح ہی بدل جاتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ جیسے شلغم کے شکل کی کوئی اور چیز ہو۔

اسی طرح کشمیر کی جھیلوں میں پلی پنپی کمل ککڑی جسے کشمیر میں "نذر" کہتے ہیں، بیسوں شکلوں اور لذتوں کے ناشتوں اور سبزیوں میں تبدیل ہو جاتی ہے اور سبزی چاہے رنگین ہو یا کدو۔ کشمیر میں یہ چیز بن اکثر بنا مسالے کے یا معمولی مسالے کے ساتھ کھانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اور پھر جب کشمیری کو فرصت ہو تو عوامی آلو بھی خواص کا کھاجا بن جاتا ہے۔ آلو کی ایک شکل جو بہت لذیذ ہے دم آلو کے نام سے مشہور ہے اِدھر وادی سے باہر اب تقریباً ہر غیر کشمیری شادی میں ایک چیز اسی نام سے بنائی جاتی ہے۔ لیکن جس نے بھی کشمیر میں دم آلو کھایا ہو اور کھانے کی تھوڑی سی بھی سمجھ بوجھ رکھتا ہو میدانی نقل کو دیکھتے ہی ہنس دیتا ہے۔ کشمیر کا دم آلو ثابت ہوتا ہوا بھی آپ کی ہتھالی میں اندر ہی اندر ورق ورق میں بٹا ہوا آتا ہے۔ ورق ورق بھوسے رنگ کا of rust colour ورق ورق میں بھوسے رنگ کی چکنائی لئے خوشبوئیں اور لذتیں لئے۔ دم آلو یہیں سالے ڈالے جاتے ہیں۔ لیکن وہی آخری اسٹیج پر۔

دم آلو بنانے کی ترکیب یہ ہے۔ درمیانی سائز کے گول گول سخت سخت پہاڑی آلوؤں کو پانی میں اتنا ہی اُبالئے کہ لبسن نکال کر چھلکے اتر جائیں لیکن آلو چھلنے پر ٹوٹ نہ جائیں۔ پھر چھوٹی تیلیوں سے آلو کے چاروں طرف چھید کرتے جائیے۔ کوئی چھید ایسا نہ ہو جو آر پار نہ ہو جائے۔ پھر کڑاہی میں سرسوں کا تیل (گھی نہیں) اتنا گرم کیجئے کہ تیل کا رنگ بدل جائے اور کڑاہی میں سے دھواں اُٹھنے لگے پھر اس تیل کو نیچے اُتار کر ٹھنڈا کیجئے اُس میں آلوؤں کو ڈبو دیجئے، اور پھر آگ پر رکھ دیجئے۔ یہ آلو تیل میں دھیرے دھیرے پیلے اور خستہ ہوتے جائیں گے۔ بیچ بیچ میں تیل میں ڈوبے ہوئے آلوؤں پر پانی کا چھینٹا دیتے جائیے۔ بہتر نتیجے کے لئے پانی میں پہلے ہینگ ملا کر رکھ لیجئے۔ اور جب آلو اندر تک خستہ ہو جائیں اور باہر سے گلابی اور سخت ہو جائیں تو کڑاہی کو آگ سے نیچے اُتار لیجئے۔ الگ پتیلے میں پھر کڑاہی میں سے کچھ تیل ڈالئے، اور ایک کرچی میں سرخ مرچیں اور پانی ملا کر گرم تیل پر ڈالئے فوراً تھوڑا اور پانی ڈالئے تو تیل کا رنگ بدل جائے گا۔ اس میں پھر اور مسالے یعنی گھر میں تازہ پسا ہوا تھوڑا تھوڑا سا سونف، دھنیا، سونٹھ اور زیرہ ڈالئے اور ضرورت کے مطابق نمک اور منہ کھل ہوئی چھوٹی الائچیاں اور ذرا سی دارچینی، سیر بھر آلو ہوں تو آدھ سیر پانی پتیلے میں ڈالکر آلوؤں کو پکائیے۔ پانی سوکھ جائے تو آپ کے دم آلو تیار ہیں۔

کشمیری کھانوں پر یہ چھوٹا سا مضمون لکھتے ہوئے میں نے دانستہ سبزیوں کا ذکر چھیڑا ہے۔ کچھ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے کہ کشمیری صرف گوشت پکانے کے ماہر ہیں، اور کھانے کے بیحد شوقین اور اب جو گوشت کی بات آ ہی گئی تو پہلی بات یہی ہے کہ لہسن پیاز کے گاڑھے سالے میں بس ایک قسم کی ترکاری نہیں، کشمیر میں تو سو قسم کا گوشت پکتا ہے۔ ایک ایک سبزی کے ساتھ اس کے کئی کئی روپ کے پکوان پکتے ہیں۔ لیکن جو مشہور عالم کھانے ہیں اُن میں سے چند نام یہ ہیں۔ گوشتابہ، رستہ، ہریسہ، روغن جوش یخنی۔ کوفتہ۔ شفتہ، سیخ کباب طبق ماز، کبرگا، مرچی قورمہ، قلیہ کوفتہ خوبانی، کوفتہ شامی، ہندی روغن جوش وغیرہ

لذت کے اُستاد کشمیری کا کہنا ہے کہ گوشت کو لہسن پیاز کا موٹا اور ڈھنا دیکر پکانا کھانا انسانی تہذیب کے ابتدائی دور کی ترکیب تھی۔ یہ اُس زمانے کا طریقہ ہے جب انسان گوشت کی بو ناپسند کرتا تھا۔

جبھی اُس کو لہسن، پیاز جیسی ہمہ گیر بُو دستیاب ہوئی۔ فرماتے ہیں کہ گوشت کی بو ہی گوشت کے بے مثال فلیور Flavour

کی بنیاد ہی نہیں رُوح ہے اور اس رُوح کو باہر آنے کی ترغیب دینے والی ہے گھی اور پانی کی بھاپ جو صرف نمک کے ساتھ پتیلے کے اندر گھوم گھوم کر، موڑ موڑ پر مناسب دباؤ سے، خود سوکھ جل کر، پانی کا نیا چھینٹا پاکر ایک ایک بوٹی کے ساتھ سرگوشی کرتے ہوئے اپنے آپ بغیر کسی اور شے کے دخل کے، بغیر کسی مسالے کی مدد کے بوٹی بوٹی کا منہ گلابی سے لال کر دیتی ہے۔ بوٹی بوٹی ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ بوٹی بوٹی کا فلیور اُبھرتا ہے اور پھر چاہے آپ لونگ الائچی دارچینی، جائفل، اور دیگر مسالوں سے اسے سجائیے اور جیسے جی چاہے کھائیے۔ کشمیری پنڈت کے ہاں پچاس قسم کے گوشت پکتے ہیں لیکن پیاز، لہسن کے ایک چھلکے سے رسوئی جھوٹی ہو جاتی ہے۔ کسی کھانے میں ان کا دخل ہی نہیں۔ مسلمانوں کے ہاں بھی آپ کو لہسن پیاز میں لپٹا ہوا وہ گوشت نہیں ملے گا جس کا رواج کشمیر سے باہر ہر جگہ ہے۔

پکا ہوا گوشت کشمیر میں سفید رنگ کا بھی ہوتا ہے اور گہرے پیلے رنگ کا بھی اور ہرا ہرا بھی۔ روغن جوش تو خیر لال ہی ہوتا ہے لیکن ان کھانوں میں محض رنگ کا فرق نہیں ہوتا بلکہ ہر کھانے کی بات ہی اور ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہر اچھا کھانے والا ہر الگ چیز کو چاول کی نئی اور تازہ سطح پر ڈھونڈتا ہے اس سے لذت میں فرق اور ایک نیا ذائقہ محسوس ہوتا ہے۔

ایک مخصوص اور ہر دلعزیز پکوان کے لئے گوشت کا ایک ایک ٹکڑا گھنٹوں دودھ میں پکتا ہے دودھ گوشت کے ریشے ریشے میں جذب ہو جاتا ہے وہ ملائی کے غلاف میں اپنے آپ آجاتا ہے اور ہڈیوں کی بنیاد سے چمٹا رہ کر بھی اپنی ابتدائی شکل میں رہ کر بھی خود ملائی بن جاتا ہے۔ پھر فن کار کی ہوشیار انگلیوں سے گھی کی کڑاہی میں آتا ہے اور مناسب جوش پاکر ایک گلابی رنگ اختیار کرتا ہے۔ مہمان کی پلیٹ میں گرم گرم آکر اسے حیرت میں ڈالتا ہے کہ یہ کس جنت کی لطافت سامنے آئی ہے۔

گوشتابے کے لئے مخصوص اعضاء کے گوشت کو پتھر پر لیکن ایک خاص لکڑی کے موٹے ہتھوڑے سے گھنٹوں کوٹا جاتا ہے اور پھر ریشے ریشے کے ایک عجیب ملاپ میں ایک نیا مسالہ تیار ہوتا ہے جسکو پکنے کے بعد گوشت کہنا مشکل ہو جاتا ہے۔

کشمیر میں بھی وہی مسالے استعمال میں آتے ہیں جو ہندوستان میں ہر جگہ ہوتے ہیں۔ یہی سونف، سونٹھ، دھنیا، زیرہ، بڑی چھوٹی الائچی، دارچینی لیکن بات ساری ہے تناسب کی جس کے کشمیری ماہر ہیں۔ کس پکوان میں کس مسالے کی مقدار زیادہ ہو، کس میں کم، یہ بھی ایک اہم راز ہے۔ پھر کس کس مسالے کو ملا کر خالی کڑاہی میں بھون کر خوشبوؤں کا ایک مناسب امتزاج پیدا کر کے کس حد تک کوٹا جائے یہ بھی سیکھنے سمجھنے کی بات ہے جس کو کشمیر میں اہمیت دی جاتی ہے۔ اور اسی علم کا نتیجہ ہے وہ کشمیری مسالہ جس کو گول گول ٹکیوں میں ڈھال کر کئی کئی دن تک دھوپ سے بچا کر سائے میں سکھایا جاتا ہے لیکن اس ٹکیا میں سے بھی کتنی مقدار کس چیز میں ڈالی جائے یہ بھی ایک گورکھ دھندا ہے جس کو حساس اور لذت کا کیمیاگر کشمیری ہی جانتا ہے۔

ان کھانوں کا شوق پورا کرنے کی بہترین ترکیب یہی ہے کہ کشمیر بار بار جائیے، ملاقاتیں بڑھائیے اور پھر بے مثال مہماں نوازی کا لطف اٹھائیے۔

بقیہ: کشمیری لباس اور زیورات

جو چاندی یا سونے کی ایک پتلی سی سلاخ کے سروں کو جوڑ کر بنایا جاتا ہے۔ اس کو زیادہ دیدہ زیب بنانے کے لئے اس پر طرح طرح سے نقش ابھارے جاتے ہیں لیکن عام طور پر لوگ اُسے سادہ ہی پہنتے ہیں۔

کلائی پر پہنے جانے والے زیورات کے کشمیری نام بالخصوص "کوڑ اور ژنگر" ہیں۔ "کوڑ" ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں پہنے جانے والے ملائی اور نقرئی کڑوں کی ہی ایک قسم ہے۔ لیکن کشمیر میں اس کی مخصوص وضع کو "گنس" کہا جاتا ہے جو کہ ایک ٹھوس ملائی یا نقرئی سلاخ سی ہوتی ہے اور اس کے دونوں سروں پر پھلی یا اژدہائی صورت بنائی جاتی ہے۔

"ژنگر" ہندوستان میں دوسرے علاقوں میں پہنے جانے والی چوڑیوں کی ہی ایک قسم ہے۔

ماتھے اور سر کے زیور

کشمیر میں سر کا ایک مخصوص زیور "تالہ رز" ہے یعنی تالو کی رسی۔ یہ ایک جڑاؤ ملائی زنجیر ہوتی ہے۔ جو تالو کے اوپر سے گذرتی ہوئی دونوں طرف کے کنہ واجہ کو ملاتی ہے۔ ماتھے کے زیورات میں سے "تادیزہ" اور "ژندر" قابل ذکر ہیں لیکن یہ دونوں اب بہت حد تک متروک ہیں۔ "ژندر" کی شکل چاند سے مشابہ ہوتی تھی۔ ان دونوں زیورات کے بجائے اب جھومر یا ٹیکہ پہنا جاتا ہے۔ جو سر کے پچھلے حصے میں ایک دامنی یا سنکارپٹی سے منسلک کر دیا جاتا ہے۔ یہ عموماً تین اقسام کا ہوتا ہے۔ ایک مثلث دوسرا بیضوی اور تیسرا لون۔ آخر الذکر پنجاب اور یوپی میں مستعمل ہے۔ اور پہلی دو قسمیں خاص کشمیری وضع کی ہیں ٹیکہ سونے اور چاندی دونوں ہی طرح کا ہوتا ہے۔ اور مختلف اقسام کی میناکاری کے علاوہ نگینوں سے بھی مزین کیا جاتا ہے۔

آیئے عہد کریں

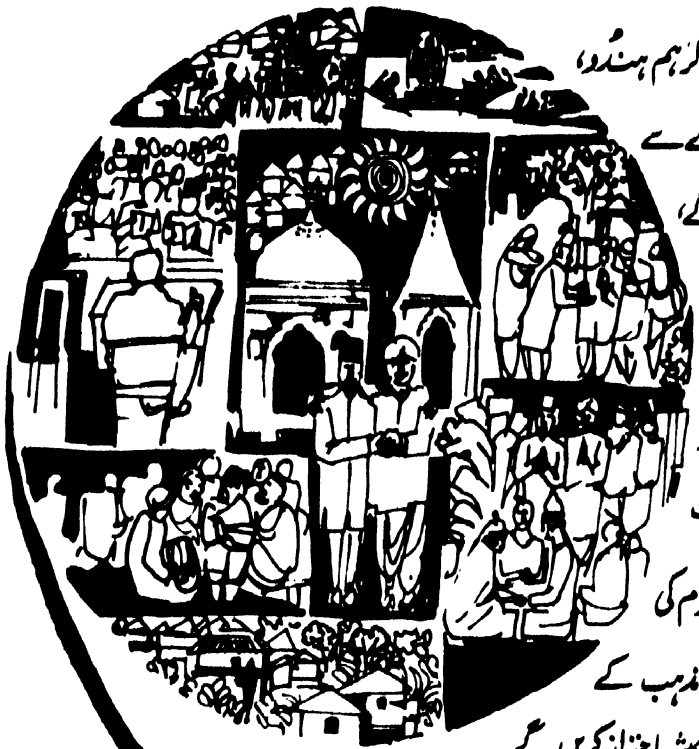

اللہ ابشور کو حاضر ناظر جان کر ہم ہندو،
مُسلمان اِعلان کرتے ہیں، کہ ہم ایک دُوسرے سے
ایک ہی ماں باپ کے بچّوں جیسا برتاؤ کریں گے،
کہ ہم تفرقات رَوا نہیں رکھیں گے، کہ ہمارے لئے
ایک کا دُکھ دُوسرے کا دُکھ ہوگا، اور کہ
ہر ایک اِسے دُور کرنے میں دُوسرے کی مدد کریگا۔
ہم ایک دُوسرے کے مذہب اور مذہبی جذبات
کا احترام کریں گے، اور دُوسروں کے مذہبی رسُوم کی
ادائیگی میں رکاوٹ نہیں ڈالیں گے۔ ہم مذہب کے
نام پر تشدّد برتنے سے ہمیشہ احتراز کریں گے۔

مہاتما گاندھی

ہندو مُسلم اِتحاد کا یہ حلف نامہ گاندھی جی نے مُلک کے لئے ۱۹۱۹ء میں تجویز کیا تھا۔ آج بھی یہ ہماری سیکولر ریاست کی پالیسی کا جزوِ اہم ہے۔

دو یا تین بچّے

ہوتے ہیں گھر میں اچھّے

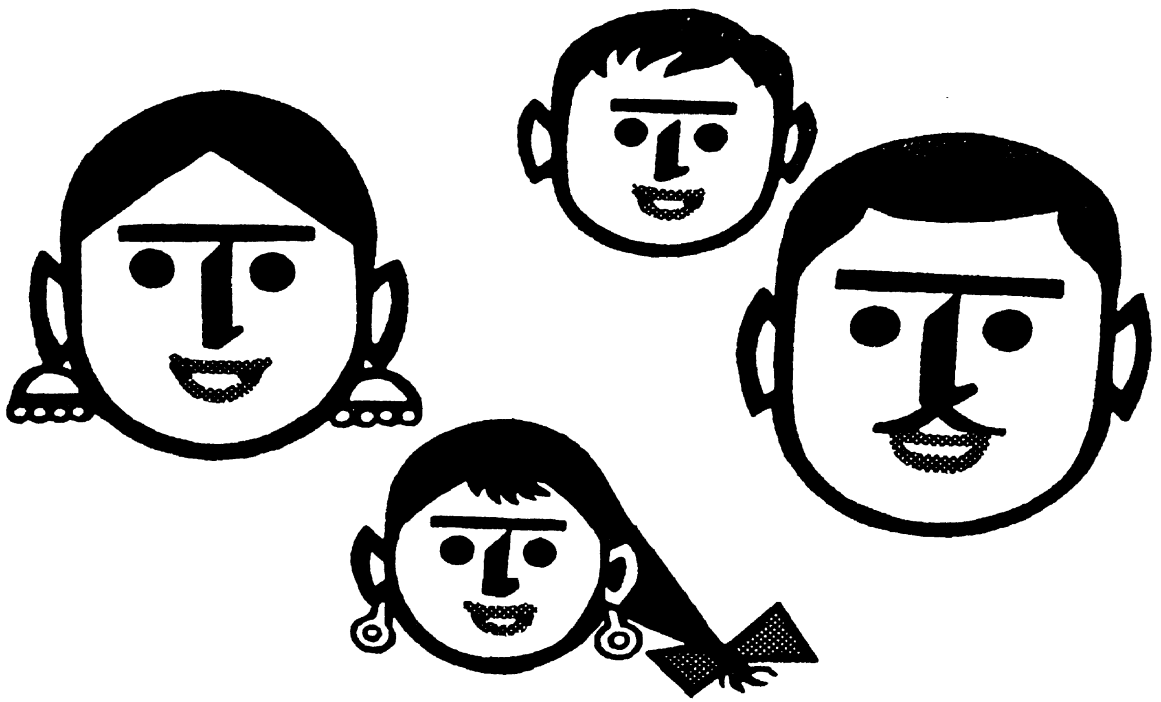

فیملی پلاننگ سینٹر کی پہچان : لال تکون

dovp 68/278

منصوبہ بند کنبہ ایسا کنبہ ہوتا ہے، جس کی
سبھی ضرورتیں آپ پوری کر سکتے ہیں
بھائی مجھے بتائیے۔ آپ اتنے اچھے طریقے
سے کیسے گزر بسر کر پاتے ہیں۔ میرا گزارا
تو بڑی مشکل سے چل پاتا ہے۔
میرا خرچہ کم ہے۔ کیونکہ میرا کنبہ
چھوٹا ہے۔ صرف
دو بچے ہیں میرے۔
دو؟ میری بیوی تو ہر برس
بچہ جنتی ہے۔
لیکن میں
کروں
بھی تو
کیا؟
وہی کرو، جو میں کرتا ہوں۔
نِرودھ استعمال کیا کرو۔
بچے کا جنم روکنا آپ کے اختیار میں ہے
اختیار کا استعمال کیجئے
فیملی پلاننگ کے لئے
نِرودھ استعمال کیجئے
۳ کے لئے ۱۵ پیسے - ۱ کے لئے ۵ پیسے
(سرکار کی طرف سے رعایتی قیمت)
فی الحال کچھ ضلعوں میں ہی مل رہے ہیں
dwp 68/252

دائیں سے بائیں: منی پارمو۔ اجیت بخشی۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن۔ دویارتن کھجوریہ۔ نور شاہ

رام ناتھ شاستری

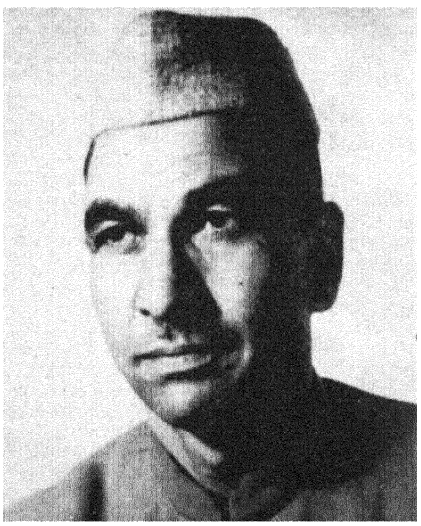

نیلامبر شرما

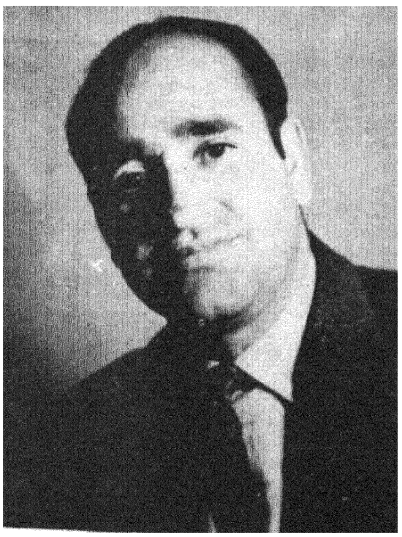

۷ جنوری ۱۹۶۹ء کو اعلیٰ حضرت شہنشاہ ایران اور شہبانو فرح ہندوستان کے ۱۲ روزہ سرکاری دورے پر تشریف لائے۔ پالم (نئی دہلی) کے ہوائی اڈے پر صدر جمہوریہ ہند اور وزیر اعظم ہند نے انہیں خوش آمدید کہا۔

Vol. 27 No. 6 **AJKAL** (Monthly) January 1969

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House. N. Delhi-;
Printed by The Asian Art Printers Private Ltd., D. B. Gupta Road, New Delhi.
Regd. No. D. 509

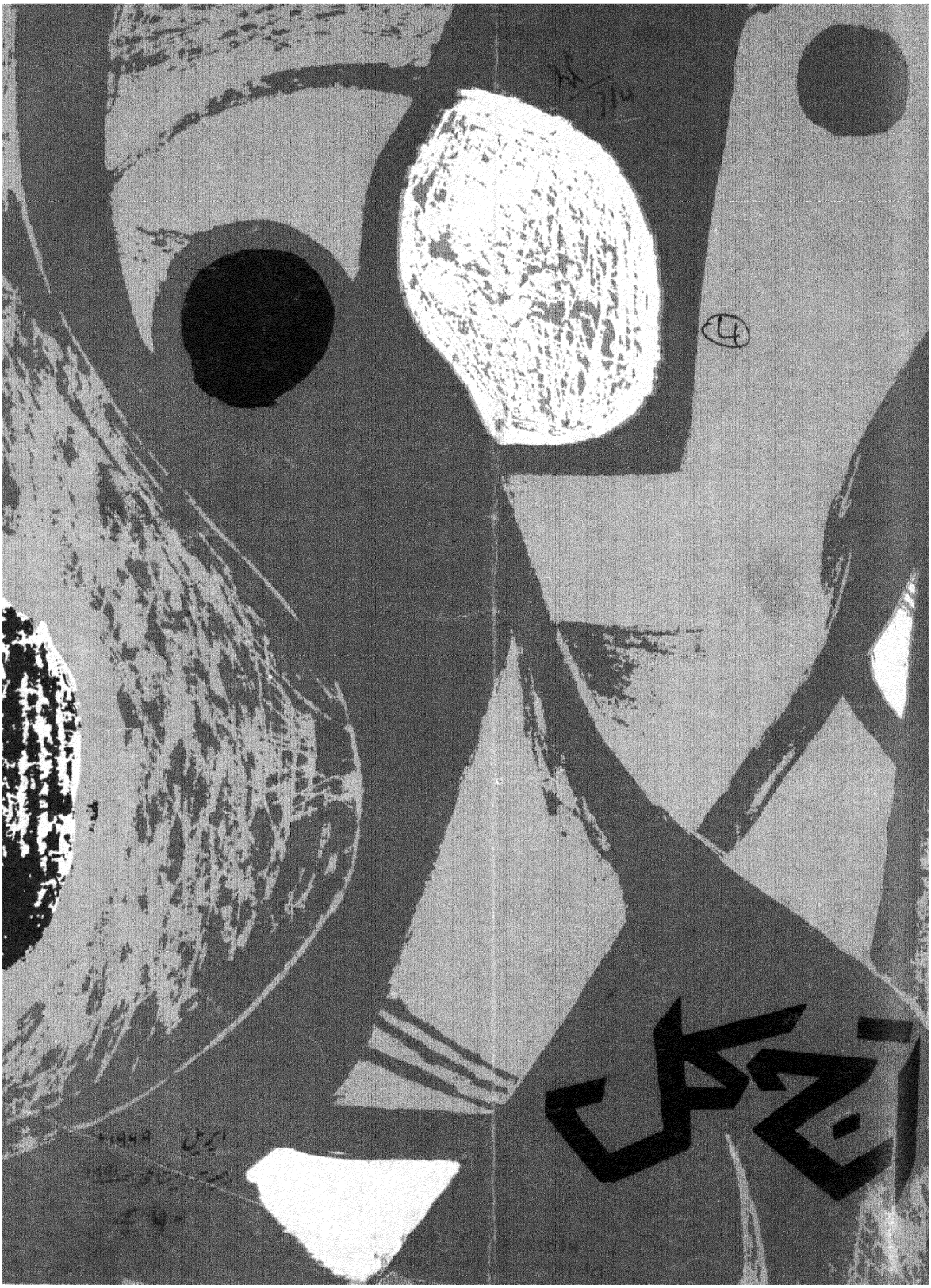
آج کل
اپریل ۱۹۶۹ء

اوپر :- ڈاکٹر ذاکر حسین غالب صدی تقریبات کا افتتاح کر رہے ہیں

نیچے :- 'غالب اور اُن کا عہد' اس نمائش کا افتتاح وزیر تعلیم ڈاکٹر وی۔ کے آر وی۔ راؤ نے کیا

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

اسسٹنٹ ایڈیٹر
راج نرائن راز

جلیانوالہ باغ سے متعلق ۴ صفحات کا ضمیمہ اس شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔

ترتیب

ملاحظات	ادارہ	۲
فرصت کے رات دن	ساغر نظامی	۵
غالب	ذاکر حسین	۶
کٹی ہوئی شاخ (افسانہ)	بادشاہ حسین رضوی	۱۱
دیارِ لوح و قلم میں	میر نقی علی خاں ثاقب	۱۴
انیس کی جذبات نگاری	مسیح الزماں	۱۵
ترائیلے	نریش کمار شاد	۲۲
ہندوستان کے بازی گر (۱)	محمد عمر	۲۳
غزلیں	بہار الدین کلیم	۲۸
کشمیر میں تعلیم کا فروغ	غلام نبی طوری	۲۹
غزل	عابد سناوری	۳۲
قدم قدم اُداس موڑ (ڈرامہ)	ابراہیم یوسف	۳۳
غزلیں	اختر نظمی، شیدا رومانی، ساحل مانکپوری	۴۰

جلد ۲۷ ——— شمارہ ۹

اپریل ۱۹۶۹ء

چیتر ویشاکھ شک سمت ۱۸۹۱

سرورق:- جیون اڈلجہ

مضامین کیلئے خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر "آج کل" (اردو) پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

شرح چندہ

سالانہ چندہ	ہندوستان میں	سات روپے
	پاکستان میں	سات روپے (پاک)
	دیگر ممالک سے	۱۰ شلنگ یا ۲ پینس یا ڈیڑھ ڈالر
قیمت فی پرچہ	ہندوستان میں	۶۰ پیسے
	پاکستان میں	۶۰ پیسے (پاک)
	دیگر ممالک سے	۱ شلنگ یا ۱۰ سینٹ

ملاحظات

۱۷ فروری ۱۹۶۹ء کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ترقی کے ان سنگ میلوں کا ذکر فرمایا جو ہندوستان نے ۱۹۶۸ء میں طے کئے ہیں۔

صدر جمہوریہ نے کہا کہ ۱۹۶۸ء میں ہماری زراعت نے نمایاں ترقی کی ہے اس زراعتی ترقی کی بدولت ہماری قومی آمدنی میں پچھلے برس کی نسبت ۱/۹٪ کا اضافہ ہوا ہے۔ ہماری صنعتوں نے بھی ترقی کی ہے۔ ہماری صنعتی پیداوار سال گزشتہ کی نسبت ۵ر۱ فی صد بڑھی ہے قیمتیں مستحکم رہی ہیں۔ اور ادائیگیوں کا فرق نمایاں طور پر کم ہوا ہے۔

صدر جمہوریہ نے امید ظاہر کی کہ ترقیاتی کاموں کے لئے بھارت کو غیر ملکی امداد حاصل رہے گی۔ لیکن انھوں نے فرمایا کہ بھارت ایسی پالیسی پر عمل درآمد کر رہا ہے کہ جس سے غیر ملکی امداد پر سے انحصار کو بتدریج گھٹایا جا سکے گا، اور ملک مقامی وسائل کی مدد سے اپنے ہی بل بوتے پر ترقی کر سکے گا۔

صدر جمہوریہ نے اُن انتہا پسند سیاسی جماعتوں کے کردار و عمل پر تشویش کا اظہار فرمایا جو بزور طاقت ہمارے سماجی سیاسی نظام کو بدلنے پر تلی ہوئی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اُن کا یہ عمل ہمارے آئین سے منافی ہے اور ملک کے امن و امان اور ترقی کے لئے مضرت رساں ہے۔

خارجہ پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے صدر جمہوریہ نے کہا کہ بھارت سرکار نے بارہا پورے خلوص کے ساتھ اور صاف صاف لفظوں میں چین اور پاکستان کے ساتھ ایسے دوستانہ تعلقات کی خواہش کا اظہار کیا جو ہماری خود مختاری اور علاقائی سالمیت سے مطابقت رکھتے ہوں اور یہ کہ ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہ ہونے کی بنیادوں پر مبنی ہوں۔

غالب صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں غالب ہفتہ یوں تو ۱۵ سے ۲۲ فروری تک منایا گیا، لیکن دہلی میں ان تقریبات کا آغاز ۱۳ر فروری سے ہو گیا تھا۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی دہلی یونی ورسٹی کے نظام اُردو خطبات ہیں۔ اس موقع پر اُردو کے مشہور ادیب اور صاحب طرز مصنف پروفیسر رشید احمد صدیقی نے غالب کی شخصیت اور شاعری پر مقالہ پڑھا۔ اپنے مقالے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی نے غالب کی شخصیت اور شاعری کے خدوخال پر اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالی۔ آپ نے فرمایا کہ اشعار میں غالب کی شخصیت کا جو پرتو ملتا ہے، وہ ایک نہایت خوددار، وسیع مشرب، صلح جو، نیک دل، وضع دار، اور دانش مند انسان کا ہے جس کی انفرادیت پسندی اور انسانیت کے پس پردہ بیسویں صدی کا مزاج روپوش ہے

دہلی یونی ورسٹی نے کلام غالب کے تراجم کے مسائل پر ایک مذاکرے کا انعقاد بھی کیا۔ اس مذاکرے کا افتتاح دہلی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ڈی این گنگولی نے کیا۔ اس مذاکرے میں برطانیہ کے پروفیسر رالف رسل، ہارورڈ یونی ورسٹی (امریکہ) کی پروفیسر شمل۔ اٹلی کے پروفیسر بوسانی، پاکستان کے ڈاکٹر داؤد رہبر، چیکوسلاواکیہ کی شریمتی ہیج نوا، دہلی یونی ورسٹی کے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر محمد حسن، اور ڈاکٹر نگیندر نے شرکت کی۔

کل ہند غالب صد سالہ یادگار کمیٹی کی طرف سے منائی جانے والی تقریبات کا آغاز ۱۵ فروری کو مزار غالب پر فاتحہ خوانی سے ہوا۔ اس

تقریب کا اہتمام دہلی کمیٹی نے کیا تھا۔ نائب صدر جمہوریہ ہند اس تقریب کے مہمانِ خصوصی تھے۔

مرکزی کمیٹی کی تقریبات کا افتتاح ۱۶ فروری کو وگیان بھون میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا۔ (خطبۂ افتتاحیہ صفحہ ۶ پر ملاحظہ فرمائیں) اس تقریب میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کو بھی شرکت کرنا تھی لیکن وہ خرابیٔ صحت کی وجہ سے تشریف نہ لاسکیں۔ اُن کا پیغام اُردو کے مشہور ادیب ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے پڑھ کر سُنایا۔ اپنے پیغام میں شریمتی اندرا گاندھی نے غالب صد سالہ تقریبات پر مسرت کا اظہار کیا اور امید ظاہر کی کہ ان تقریبات سے اس زبان کو تقویت پہنچے گی جو غالب بولتے اور لکھتے تھے۔ اس موقع پر غالب کی زندگی سے متعلق ایک دستاویزی فلم کی نمائش بھی کی گئی۔

۱۶ فروری ہی کو وزیر تعلیم ڈاکٹر ڈی آر دی راؤ نے وگیان بھون میں ایک تصویری نمائش "غالب اور اُس کا عہد" کا افتتاح فرمایا بائیس شعبوں اور چار سو تصویروں پر مشتمل اس نمائش میں غالب کا عہد زندہ و مجسم ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اس نمائش میں غالب کی تحریریں اُن کی تصانیف کے پہلے ایڈیشن، غالب پر شائع ہونے والی کتابیں اور رسائل اور بہت سی ایسی دوسری چیزیں موجود تھیں جن کا تعلق غالب اور اُن کے عہد سے ہے۔

۱۶ فروری ہی کی شام میں نیگیت ناٹک اکادمی کے زیر اہتمام غالب کی غزلوں پر مشتمل ایک پروگرام سپر وہاؤس نئی دہلی میں پیش کیا گیا۔ اس پروگرام میں بیگم اختر، بشیر احمد، نصیر احمد، حفیظ احمد خاں، مادھوری مٹو، جعفر حسین خاں اور یونس حسین خاں نے غالب کی غزلیں پیش کیں۔ اس پروگرام میں برجو مہاراج نے غالب کی ایک غزل جس کا مطلع ہے:

"ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گذرتا ہے گماں اور"

کتھک کی صورت میں پیش کی۔

اُس روز رات میں سپر وہاؤس میں ایک کوی سمیلن ہوا جس کی صدارت ہندی کے مشہور شاعر ڈاکٹر ہری ونش رائے بچن نے کی۔ کوی سمیلن میں موصوف کے علاوہ ہندی کے معروف شعراء بال سروپ راہی، رام اوتار تیاگی، ویریندر مشرا، رام ناتھ اوستھی، ڈاکٹر نیلاش باجپئی، گرجا کمار ماتھر وغیرہ نے غالب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

۱۷ فروری کو نائب وزیر اعظم شری مرارجی ڈیسائی نے ڈاک و تار بھون نئی دہلی میں غالب صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں خصوصی غالب ڈاک ٹکٹ کا اجرا کیا۔

اُسی روز وگیان بھون میں غالب پر بین الاقوامی مذاکرے کا انعقاد ہوا۔ مذاکرے کا افتتاح اُردو کے مشہور محقق جناب قاضی عبدالودود نے کیا۔ چھ اجلاس پر مشتمل اس سہ روزہ مذاکرے میں دیس اور بدیس کے متعدد ماہرینِ غالب نے شرکت کی۔ ان میں رُوس کے بابا غفوروف، ڈاکٹر سنخوچوف، ایران کے ڈاکٹر لطف علی صورت گر، ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) کی پروفیسر اے شمل، برطانیہ کے پروفیسر رالف رسل کے علاوہ داؤد رہبر (بوسٹن) پروفیسر یان مارک اور شریمتی نیلوا تیج مین (چیکوسلاواکیہ) اُلمی کے پروفیسر رائے یوسانی، کویت کے پروفیسر عبداللہ سنانی اور امریکہ کے جناب جوزف رائف نے حصہ لیا۔ غالب کے مصنف شیخ تلمذ اکرام بھی کناڈا سے تشریف لائے تھے۔

جن ہندوستانی عالموں نے اس سیمینار میں حصہ لیا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، پروفیسر بی۔ ایس اُپادھیائے، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر نظیر احمد، جناب مالک رام، جناب صباح الدین عبدالرحمٰن، جناب علی جواد زیدی، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، جناب ظ انصاری، ڈاکٹر محمد حسن، جناب اختر حسن، جناب سید سجاد ظہیر اور ڈاکٹر نورالحسن انصاری۔ ان ملکی و غیر ملکی عالموں نے غالب کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

۱۷ فروری کی شام میں کتھک کیندر نے ماؤنٹکر ہال کے آڈیٹوریم میں غالب کی غزلیات پر مشتمل ایک بیلے پیش کیا جو شب و روز تماشا

مرے آگے" پیش کیا جسکے اسکرپٹ جناب رفعت سروش کا تھا۔

۱۸ فروری کو غالب صد سالہ یادگار کمیٹی کے اہتمام میں نیا تھیٹر نے جناب حبیب تنویر کا ترتیب دیا ہوا ڈرامہ "میرے بعد" آل انڈیا فائن آرٹس اینڈ کرافٹس سوسائٹی کے آڈیٹوریم میں پیش کیا۔

۱۹ فروری کو لال قلعہ میں فرحت اللہ بیگ کی تصنیف "دلی کی آخری شمع" پر مبنی ایک تمثیلی مشاعرہ پیش کیا گیا۔ غالب کا رول مشہور کیرکٹر ایکٹر بلراج ساہنی نے ادا کیا۔

۲۰ فروری کو ڈاکٹر ترگنا سین نے آزاد بھون میں کل ہند غالب صد سالہ یادگار کمیٹی کی شائع کردہ کتابوں کی رسم اجرا ادا کی۔ نیز ایرانی سفارت خانہ کے ثقافتی شعبے کی طرف سے منعقدہ مضمون نگاری کے مقابلے کے انعامات تقسیم فرمائے۔

۲۰ فروری کو دہلی آرٹس تھیٹر نے فائن آرٹس تھیٹر میں ایس ایم مہدی کا لکھا غنائی ڈرامہ "غالب کون" پیش کیا۔ غالب کی حیات اور اُن کے عہد پر مبنی اس ڈرامے کی موسیقی حفیظ احمد خاں نے ترتیب دی تھی۔ ہدایت کاری شیلا بھاٹیہ کی تھی۔

۲۱ فروری کو نیشنل اسٹیڈیم میں ایک خصوصی پروگرام "شام غالب" پیش کیا گیا۔ اس پروگرام میں بہت سے فلمی اداکاروں، گلوکاروں اور موسیقاروں نے حصہ لیا۔ اس پروگرام کا آغاز اندیور کی ایک نظم سے ہوا۔ پروگرام میں حصہ لینے والوں میں سنیل دت، دلیپ کمار طلعت محمود، نیرج، ہیم لتا، مینا پرشوتم، مالا سنہا، مینا کماری، نمی، مہندر کپور، اور محمد رفیع، کے نام قابل ذکر ہیں۔

۲۲ فروری کو صدر جمہوریہ نے مزار غالب کے قریب واقع غالب اکیڈمی کی عمارت کا افتتاح فرمایا۔

۲۲ فروری کی رات میں لال قلعہ میں ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا۔ جس کی صدارت جناب یونس سلیم نائب وزیر وزارت قانون نے کی — افتتاح پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب نے کیا اس مشاعرے میں ملک کے نامور شعرا نے حصہ لیا، جن میں جناب فراق گورکھپوری، شمیم کرہانی، کلیم عاجز، نشور واحدی، جذبی، مخدوم، سکندر علی وجد، جوش ملسیانی، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد، ساغر نظامی، شاذ تمکنت، غلام ربانی تاباں اور کیفی اعظمی قابل ذکر ہیں۔

کل ہند صد سالہ یادگار کمیٹی کی طرف سے غالب تقریبات علاوہ دہلی کے بمبئی اور حیدر آباد میں بھی منائی گئیں

ان تقریبات کے علاوہ راجدھانی میں متعدد اور تقریبات ہوئیں۔ نیشنل آرکائیوز نے ایک نمائش "غالب اور انگریز" کا اہتمام کیا۔ اس نمائش کا افتتاح مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر وی کے آر وی راؤ نے کیا۔ اس نمائش میں انگریزی اور فارسی کی ایسی اصل دستاویزات رکھی گئیں۔ جن سے غالب کے انگریزوں سے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس نمائش میں اس دور کے بعض اخبارات کے بعض شمارے اور اور اس دور کی اہم شخصیات کی تصویریں بھی رکھی گئی تھیں۔ ڈاکٹر راؤ نے اپنی افتتاحیہ تقریر میں کہا "ہمیں اس بات کا فخر حاصل ہے کہ ہم اس دھرتی کے رہنے والے ہیں، جس نے غالب کو جنم دیا۔"

پروفیسر محمد مجیب نے دو مختلف تقاریب میں غالب کی ایک ایک تصویر ساہتیہ اکادمی اور دہلی یونی ورسٹی کو پیش کی۔ یہ تصویریں جامعہ ملیہ کے ایک آرٹسٹ رام چندرن کی بنائی ہوئی تھیں۔

مختصراً، غالب صدی کے سلسلے کی تقریبات، غالب کے شایان شان منائی گئیں۔

ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کی وفات کی خبر اردو حلقوں میں افسوس کے ساتھ سنی جائیگی۔ موصوف ۹۰ سال کے تھے۔

ڈاکٹر نارنگ اپنی ذات سے اک انجمن تھے۔ وہ مشہور ماہر تعلیم ہی نہیں، ایک صنعت کار، ایک مانے ہوئے وکیل، ایک جانے پہچانے سیاستداں بھی تھے۔ وہ اردو شعر و ادب کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ تین شعری مجموعے "نغمۂ جاوداں"، "اقوال بزرگاں"، اور "یاد رفتگاں" اُن کی یادگار ہیں

(ادارہ)

یہ پھول برسائیں

شہیدانِ وطن کی خاک پر

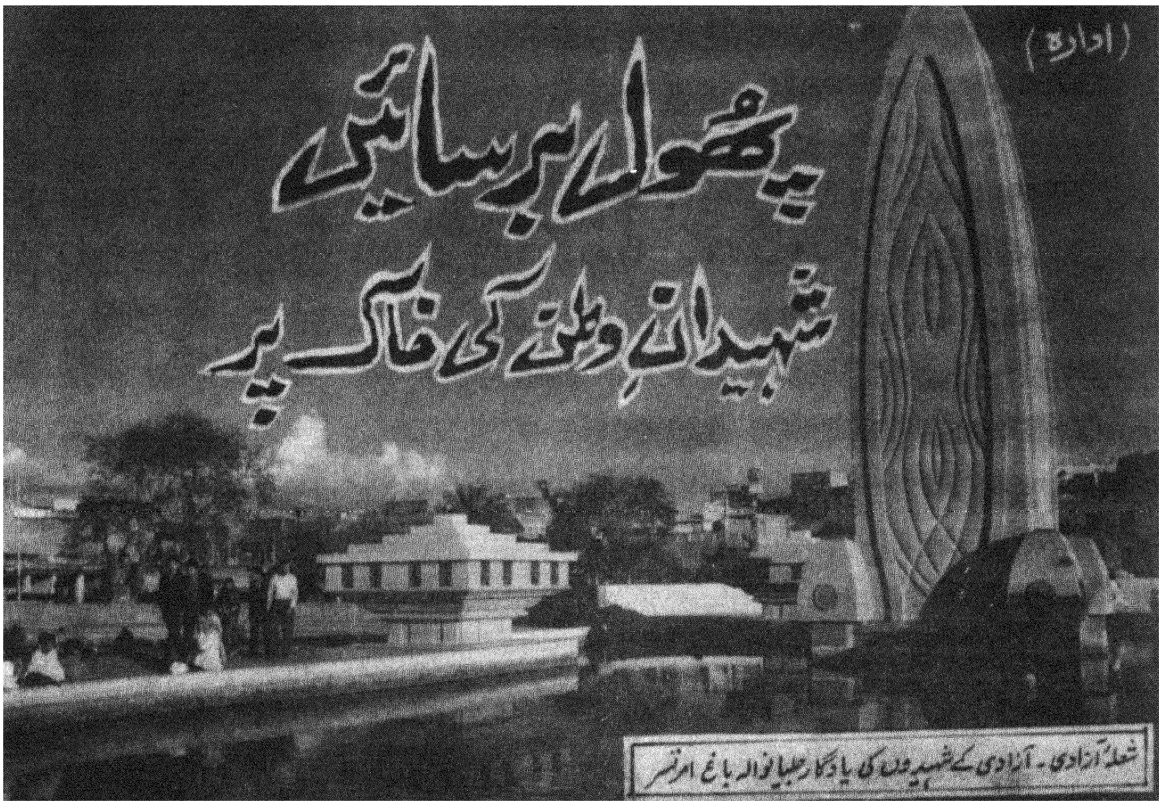

شعلۂ آزادی ۔ آزادی کے شہیدوں کی یادگار جلیانوالہ باغ امرتسر

۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء . . . .

یہ دن ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا ۔ اس دن برطانوی حکومت کی دہشت اور بربریت نے نہتے اور بے گناہ لوگوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ اس دن ہندوستان کی آزادی کے پودے کو سینکڑوں ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے خون سے سینچا تھا جس کے برگ و بار نے صرف ۲۸ برس کے بعد ملک سے غیر ملکی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

موجودہ صدی کی تاریخ میں اجتماعی طور پر اتنا بڑا قتل کہیں نہیں ہوا تھا۔ آج اس خونیں واقعہ کو ۵۰ برس ہو چکے ہیں۔ اب نہ ڈائر ہے اور نہ انگریزی حکومت مگر اس دل دوز واقعہ کی مقدس یاد اب بھی ہمارے دلوں میں باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گی کیوں کہ شہیدوں کا لہو کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔

پہلی جنگِ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ ہندوستانیوں کی پُر امید نظریں لندن کی طرف لگی تھیں کو جرمنی ۔ جیسے زبردست حریف کو شکست دینے کے بعد برطانوی حکومت اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گی۔ ہندوستان کو آزادی ملے گی۔ مگر جب سنہ ۱۹۱۹ء نے ہندوستان میں قدم رکھا تو مطلع ابر آلود تھا۔ مایوسی اور بے دلی کے ساتھ ساتھ غم و غصے کے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ جنگ کے زمانے میں انگریزوں سے جو تھوڑی بہت ہمدردی پیدا ہو گئی تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔ ایک محبِ وطن نے کہا: "اگر انگلستان ہندستانی عوام کی خواہشوں کا احترام نہیں کرے گا تو اس کا نتیجہ بہت برا ہوگا۔"

برطانوی سامراج نے تمسخر آمیز لہجے میں جواب دیا۔ "جس برطانیہ عظمیٰ نے دنیا کی سب سے بڑی جنگ میں فتح پائی ہے، کیا وہ ایسی فضول دھمکیوں سے ڈر جائے گا۔"

ہندوستان کی بربادی کے مشورے ہونے لگے۔ رولٹ رپورٹ کی بنیاد پر کئی ایسے قوانین بنائے گئے، جن سے سیاسی تحریک کا گلا گھونٹا جا سکے۔ رولٹ بل میں انقلابیوں کو کڑی سزائیں دینے اور فوجداری قانون میں عارضی تبدیلی لانے کے ساتھ ساتھ حکومت کو غیر معمولی اختیارات

دیئے گئے تاکہ آزادی کے متوالوں کو دار و رسن کی آزمائش میں مبتلا کیا جا سکے، لیکن اُس کا اثر اُلٹا ہوا۔ پنڈت مدن موہن مالویہ، سردار وٹھل بھائی پٹیل، محمد علی جناح، مولانا مظہر الحق اور شری نواس شاستری جیسے رہنماؤں نے حکومت کو سمجھایا کہ ان بلوں کو منظور کرنے سے ملک میں بے اطمینانی کی آگ مزید بھڑک اٹھے گی۔ لیکن اقتدار کا نشہ اور طاقت کا گھمنڈ صلاح و مشورے کی پروا نہیں کرتا۔

تب ہی ایک آواز گونجی۔ ان قوانین کی مخالفت کی جائے۔ ان کے خلاف پُرامن ستیہ گرہ کیا جائے۔ ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء کو سارے ملک میں مکمل ہڑتال ہو۔ لوگ برت رکھیں اور اپنے دِلوں کو پاک کریں۔

اس آواز نے سارے ملک میں جوش اور جذبے کی ایک نئی لہر دوڑا دی، ہنسا کا اہنسا سے مقابلہ کرنے کے لئے لاکھوں افراد سرفروشی کی تمنا لے کر میدان میں آ گئے۔ سارے ملک میں بڑی کامیاب اور شاندار ہڑتال ہوئی۔

پنجاب کے گورنر سر مائیکل اوڈائر کو ہندوستانیوں کی سرکشی بڑی گراں گذری۔ اس فتنے کو کچلنے کے لیے اُنھوں نے اپنا منصوبہ بنا لیا۔

۱۰ اپریل کو امرتسر کے ڈپٹی کمشنر نے ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو دھوکے سے گرفتار کر لیا تاکہ آزادی کی تحریک کمزور پڑے۔ دوسرے دن اپنے رہنماؤں کی رہائی کا مطالبہ کرنے کے لئے شہریوں کا ایک پُرامن جلوس ڈپٹی کمشنر کے گھر کی طرف چلا تو انگریزوں نے اس نہتے جلوس پر گولی چلا کر ۲۰ بے گناہ انسانوں کی جانیں لے لیں۔ سینکڑوں زخمی ہوئے۔ ردعمل کے طور پر تحریک نے کہیں کہیں شدت اختیار کر لی۔ ایک دو انگریزوں کو زدوکوب کیا گیا۔ گورنر اوڈائر نے سمجھا حالات بے قابو ہو گئے ہیں۔ اس نے فوج بلالی۔ ۱۱ اپریل کو امرتسر کا نظم و نسق فوج کے حوالے کر دیا گیا اور امن قائم رکھنے کی ذمہ داری جنرل ڈائر کو سونپی گئی۔ اس نے فوراً گرفتاریاں شروع کر دیں اور اپنے ہی حکم سے شہر میں مارشل لا کا نفاذ کر دیا۔

۱۳ اپریل کو اتوار کا دن تھا۔ اس دن بیساکھی کا تہوار بھی تھا اور آس پاس کے گاؤں کے لوگ میلہ دیکھنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ سارے شہر میں عدم تعاون کی تحریک کا زور تھا اور مکمل ہڑتال تھی۔ جنرل ڈائر نے ڈھنڈورا پٹوا کر اعلان کر دیا کہ شہر میں جلسوں اور جلوسوں پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ ڈھنڈورچیوں کے آگے پولیس پھر انگریزی فوج اور سب سے پیچھے خود جنرل ڈائر تھا۔ یہ گروہ ہال بازار، چوک، مجیٹھہ منڈی باغ جھنڈا سنگھ، کٹڑہ کرن سنگھ، لاہوری گیٹ اور لوہا گڑھ ہوتا ہوا گذرا اور جگہ جگہ رُک کر اعلان کرتا رہا۔ اس کے پیچھے بچوں کا ایک غول کنستر بجاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے اپنی شوخی اور شرارت سے انگریزی اقتدار کا مذاق اُڑا رہے تھے۔

دن میں ایک بجے کے قریب جنرل ڈائر کو پتہ لگا کہ جلیانوالہ باغ میں ایک جلسہ منعقد ہو رہا ہے۔ اس نے اس جلسے کے انعقاد میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ اگر وہ چاہتا تو اس جلسے کو روک سکتا تھا۔ اگر جلیانوالہ باغ کے تنگ راستے میں کچھ سپاہی کھڑے ہو جاتے تو وہ جلسہ گاہ کی جانب جانے والے کو روک سکتے تھے۔ لیکن ڈائر تو خون کی ہولی کھیلنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔

اس میدان میں داخل ہونے کا ایک ہی بڑا راستہ تھا، جس میں سے فوجی گاڑی گذر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ چار پانچ تنگ راستے تھے، جن میں سے ایک ایک شخص بمشکل گذر سکتا تھا۔ بڑے راستے کے سامنے ایک چبوترہ تھا۔ اس چبوترے پر کھڑے ہو کر انگریزی فوج نے گولیاں چلائی تھیں۔ اس لئے اس طرف سے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

مقررہ وقت پر جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ بیس پچیس ہزار افراد کے مجمع میں بچے، جوان، اور بوڑھے سبھی شامل تھے۔ دُور کچھ بچے اپنے کھیل میں محو تھے۔ میدان کے درمیان اُونچے چبوترے پر ابھی ابھی رائے رام سنگھ، درشن سنگھ، عبدالمجید برج گوپی ناتھ اور گوکل چند نارنگ اپنی تقریریں کر چکے تھے۔ ہندو مسلم زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے اور گرفتار شدہ رہنماؤں

کی رہائی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ اسی سے متعلق ایک ریزولیوشن پاس کر کے وہ حکومت کے پاس بھیجنا چاہتے تھے۔

اچانک شور مچ گیا۔ "آ گئے، وہ آ گئے۔" مقرر اور سامعین کی نگاہیں میدان میں داخل ہونے والے راستے کی طرف اُٹھ گئیں۔ بندوقوں سے لیس گوری پلٹن مارچ کرتی ہوئی آئی، اور دائیں بائیں ہو کر برابر برابر حصّوں میں بٹ گئی۔ بیچ میں جنرل ڈائر کھڑے تھے۔

جلسہ میں شریک لوگوں کے پاس کوئی بھی ہتھیار نہیں تھا، لاٹھیاں تک نہیں تھیں۔ ان کا گھبرا جانا قدرتی تھا وہ اٹھنے لگے تو اسٹیج سے آواز آئی۔ "وہ ہم نہتّوں پر خواہ مخواہ حملہ نہیں کریں گے۔ سب لوگ شانتی سے بیٹھے رہیں۔"

اس جملے سے پہلے ہی گوری پلٹن اپنی بندوقوں میں گولیاں بھر چکی تھی۔ کسی وارننگ کے بغیر، یہ کہے بغیر کہ جلسہ غیر قانونی ہے اور جو لوگ جمع ہیں وہ منتشر ہو جائیں، جنرل ڈائر نے حکم دیا:

"فائر۔"

پندرہ منٹ تک لگاتار گولیاں چلتی رہیں۔ بیٹھے ہوئے، بھاگتے ہوئے اور لیٹے ہوئے لوگوں پر گولیاں برسانے کا سفاکانہ عمل اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ گوروں کی گولیاں ختم نہ ہو گئیں۔

گھبراہٹ میں لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ ایک دوسرے کو ڈھکیلتے اور کچلتے لوگ اُن راستوں کی طرف دوڑے جن سے ایک وقت میں ایک آدمی مشکل سے گذر سکتا تھا۔ بڑے راستے پر متعین انگریزی فوج موت کا کھیل کھیل رہی تھی۔ جن جگہوں پر بھیڑ زیادہ تھی اُن کی طرف ڈائر نے انگلی کا اشارہ کر کے گولیاں چلوائیں۔ گولی لگنے سے جو لوگ نیچے گرتے وہ سینکڑوں پیروں سے کچلے جاتے۔ دیوار پھاند کر باہر نکلنے والے یا تو اسی طرف گر جاتے یا دوسری طرف کود بھی جاتے تو زندہ مشکل ہی سے بچتے۔ ۲۰ ہزار آدمی گولیوں کی باڑ پر تھے۔ بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ سامنے کی دیواروں پر چھ چھ انچ گہرے گڈھے پڑ گئے تھے۔ لاشیں اپنے ہی خون میں تیرنے لگیں۔ زخمیوں کی چیخ و پکار سے فضا کانپ اٹھی۔

یہ خونیں ڈرامہ کھیلنے کے بعد ڈائر اپنی فوج کے ساتھ واپس لوٹ آیا۔ اُس کا کہنا تھا کہ زخمیوں کی دیکھ بھال کرنا اُس کا کام نہیں ہے۔ اس المناک اور روح فرسا واقعہ کے عینی مشاہد لالہ گردھاری لال ڈپٹی چیرمین پنجاب چیمبر آف کامرس کا بیان ہے۔

"مکان کی چھت سے میں دُوربین سے دیکھ رہا تھا۔۔۔۔ میں نے دیکھا کہ کئی فوجی بندوق تھامے باغ میں گھسے۔۔۔۔ اچانک گولی چلانے کا آدیش دیا گیا۔ بھیڑ کو تتر بتر ہونے کے لئے کوئی چیتاونی نہیں دی گئی۔ دس بارہ منٹ تک لگاتار گولی چلی، جائے وقوع پر میں نے سینکڑوں آدمیوں کو مرتے ہوئے دیکھا۔ تیز فیر کرنے والی بندوقیں استعمال کی گئی تھیں۔ سب سے دردناک بات تو یہ ہے کہ جس دروازے سے لوگ باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے، اُن پر نشانہ لگا کر گولیاں چلائی گئیں۔ باغ سے باہر نکلنے کے لئے چھوٹے چھوٹے چار راستے تھے۔ مگر اُن سبھی پر گولیاں برسائی جا رہی تھیں۔ جہاں گھنی بھیڑ تھی اُن جگہوں کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر بھاگنے والوں کے پیروں سے ہی کتنے مرد اور عورت کچل گئے۔ خون کی ندی بہہ نکلی۔ جو لوگ زمین پر لیٹ گئے تھے اُنھیں بھی نشانہ بنایا گیا۔ فوجی گھٹنوں کے بل جھک کر نیچے کی طرف نشانہ لگاتے تھے۔ گولیاں برسانے کے فوراً بعد فوجی ایک دم چلے گئے۔ گھائلوں اور مرنے والوں کو وہیں چھوڑ گئے۔"

لالہ گیان چند نے بعد میں بتایا۔

"باغ میں پہنچتے ہی میں نے دیکھا کہ لاشوں کے انبار لگے ہیں۔ میں اپنے بھتیجے رام لبھایا کی تلاش میں گیا تھا۔ اُس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو رہا تھا۔ سر پھٹ گیا۔ اُوپر کے ہونٹ پر بھی گولی لگی تھی بائیں طرف بھی دو گولیاں لگی تھیں۔ ران پر تین گولیاں لگی تھیں۔ رام لبھایا کی عمر سترہ سال کی تھی اور اُس نے ابھی ابھی میٹرک پاس کیا تھا۔ ہائی اسکول سے آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کیا تھا۔"

ایک دوسرے شخص نے جسے گولی لگی تھی، بتایا کہ جہاں میں

گھائل پڑا تھا وہاں ایک بارہ سال کا لڑکا مرا پڑا تھا اُس کی گود میں تین سال کی ایک بچی تھی، دونوں کو گولی لگی تھی۔

اس طرح پندرہ منٹ کے اندر یہ خونیں ڈرامہ پورا ہوا۔ سورج غروب ہونے تک سارا میدان لاشوں اور گھائلوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس دن غروبِ آفتاب کے ساتھ ساتھ انگریزی حکومت کا سورج بھی ڈوب گیا تھا۔ آزادی کی لڑائی میں اس واقعے نے زبردست جوش و خروش بھر دیا تھا۔

بعد میں عوام کے مطالبے پر جنرل ڈائر کی اس خوں ریزی کی جانچ کرنے کے لیے جسٹس ہنٹر کی صدارت میں ایک کمیٹی بیٹھی۔ اس کمیٹی کے سامنے جنرل ڈائر نے جو جواب دیا ہے اس سے اس کی شقاوتِ قلبی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

سوال :- باغ میں گھستے ہی تم نے کیا کیا ؟

ج :- میں نے گولی چلوا دی۔

سوال :- فوراً ؟

ج :- ایک دم، تین سیکنڈ میں سوچ سمجھ کر میں نے اپنا لائحہ عمل طے کر لیا تھا۔

سوال :- جلسے میں موجود لوگ کیا کر رہے تھے ؟

ج :- وہ جلسہ کر رہے تھے۔ اسٹیج پر ایک مقرر کھڑا تھا ظاہر ہے وہ ہاتھ ہلا ہلا کر تقریر کر رہا تھا۔ وہ ہم سے ۵۰، ۶۰ گز دور تھا۔

بعد میں جنرل ڈائر سے پوچھا گیا۔ جلسے میں ایسے کئی لوگ ہوں گے جنھیں جلسہ وغیرہ کرنے پر عائد پابندی یا اعلان کا علم ہی نہیں ہوگا کیا ایسے لوگوں کو وارننگ نہیں دی جانی چاہئے تھی کہ وہ منتشر ہو جائیں ورنہ گولی چلائی جائے گی ؟ اس کا یہ جواب تھا۔

ڈائر :- "جی نہیں ! اُس وقت میں نے یہ نہیں کیا۔ میرا خیال تھا کہ ان لوگوں نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی ہے۔ مارشل لا کی بھی خلاف ورزی کی ہے۔ اُن پر گولی چلانا میرا فرض تھا۔"

وہ تو پورے پنجاب کو سبق سکھانا چاہتا تھا۔ پنجاب میں ہی نہیں سارے ملک میں سیاسی مظاہرے ہو رہے تھے۔ وہ ایک جگہ بے رحمی اور طاقت کا مظاہرہ کر کے سارے ملک کو خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔

ہنٹر کمیٹی نے ڈائر کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ "یہ گرگ دہن آلود" مرتے وقت تک سکون اور چین نہ پا سکا۔

بعد میں ولایت میں بھی اس خوں چکاں واقعہ کے ردِ عمل کو دبایا نہ جا سکا یہاں تک کہ وزیرِ ہند مسٹر ایڈورڈ مانٹیگو نے بھی ڈائر کی زوردار الفاظ میں مذمت کی۔ ہندوستان میں تو اُس کے خلاف طوفان بپا ہو گیا

ساری دُنیا میں ڈائر کی مذمت کی گئی۔ اُس کی سوانح عمری میں سرجی بیری نے لکھا ہے "مورخوں کی رائے ہے کہ ڈائر کی حرکت نے انگریزی راج کے خاتمے میں مدد دی"

اس کے ساتھ ہی کانگرس کی طرف سے بھی ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی گئی۔ اُس کے ممبر تھے پنڈت مدن موہن مالویہ، پنڈت موتی لال نہرو، مہاتما گاندھی، چترنجن داس، مولانا طیب جی، اور شری جے کر۔ اس کمیٹی نے متعدد لوگوں کے بیانات لیے اور ڈائر کی بے رحمی کا پردہ پوری طرح چاک کیا۔

پنجاب کا ظالم لیفٹننٹ گورنر ۱۳ مارچ ۱۹۴۰ء تک زندہ رہا۔ جبکہ اودھم سنگھ نے ولایت کے ایک جلسے میں اُسے پستول کی گولی کا نشانہ بنا کر جلیانوالہ باغ کا بدلہ لیا۔ اُودھم سنگھ نے بالکل صاف صاف الفاظ میں بیان دیا کہ میں نے جلیانوالہ باغ کا بدلہ لیا ہے۔ ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو میں سولہ برس کا تھا یہ خونیں واقعہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کے بعد میرے دل میں انگریزی راج اور اُس کے ظالم گورنر کے خلاف زبردست نفرت پیدا ہو گئی تھی۔

ہندیوں کے دل میں یہ داغ ہمیشہ تازہ رہا اور ۱۹۱۹ء سے لے کر اب تک "یومِ جلیانوالہ باغ" منایا جاتا رہا ہے۔ آئندہ بھی منایا جائے گا۔ پوری قوم نے خراجِ عقیدت کے طور پر اس مقدس مقام پر ایک یادگار تعمیر کرنے کے لیے چندہ دیا۔ یادگار قائم کرنے والی کمیٹی نے اس جگہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا ہے اور ۵ لاکھ ۶۵ ہزار کی لاگت سے یہاں ایک یادگار تعمیر کی ہے جو ان شہیدوں کی یاد کو ہمیشہ تازہ و تابندہ رکھے گی۔

فرصت کے رات دن

ساغر نظامی

اسرارِ آب و رنگ کو عریاں کئے ہوئے
ہر موڑ پہ حیات کو رقصاں کئے ہوئے
ظلمت کدے کو رشکِ گلستاں کئے ہوئے
مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

پھر اک جہانِ نور کا معمار ہے نفس
تاریکیٔ حیات سے بے زار ہے نفس
پھر پیکِ جلوہ باریٔ اسرار ہے نفس
پھر گرمِ نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے

ہوتی ہے یوں مصوریٔ جاں بہ خونِ دل
نقاشیٔ محبتِ جاناں بہ خونِ دل
پھر رکھ رہا ہوں طرحِ گلستاں بہ خونِ دل
پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بہ خونِ دل
سازِ چمن طرازیٔ داماں کئے ہوئے

پھر مسلکِ ریا پہ ہمیں طیش آئے ہے
پھر عشق ننگ و نام کے ٹکڑے اڑائے ہے
جوشِ گناہ میرے قدم پھر اٹھائے ہے
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

پھر عشق کو ہے کاکلِ و رخسار کی طلب
پھر زندگی کو ہے رسن و دار کی طلب
پھر جنسِ آرزو کو ہے بازار کی طلب
پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

پھر چاہتے ہیں ہم درِ گلزار کھولنا
پھر چاہتے ہیں درجِ گہربار کھولنا
پھر چاہتے ہیں دفترِ اسرار کھولنا
پھر چاہتے ہیں نامۂ دلدار کھولنا
جاں، نذرِ دلفریبیٔ عنواں کئے ہوئے

وہ فصلِ نو بہار، وہ طوفانِ رنگ و بو
دل کو ہے پھر تعیشِ ماضی کی جستجو
پھر چاہتے ہیں کوچۂ خوباں میں آبرو
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

رنگیں حریمِ حسن کو دیکھے ہے پھر نگاہ
اک جلوۂ لطیف کو لوٹے ہے پھر نگاہ
ہر روزنِ خیال سے جھانکے ہے پھر نگاہ
اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

عشرت کے ماہ و سال، مسرت کے رات دن
دل مانگتا ہے نشۂ فرقت کے رات دن
پھر روح چاہتی ہے وہ عشرت کے رات دن
جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

ذاکر حسین

غالب

وگیان بھون (نئی دہلی) میں غالب صدی تقریبات کا افتتاح کرتے ہوئے صدر جمہوریہ ہند نے فرمایا

"آج ہم مرزا غالب کی وفات کی سو سالہ برسی منا رہے ہیں اور دنیا کے کئی ملک اس مبارک تہذیبی کام میں ہمارے ساتھ شریک ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے سب منتظر تھے کہ یہ وقت آئے، تو جو کچھ ہو سکتا ہو کریں اور اُن کے منصوبوں میں خلوص کی ایک شان نظر آتی ہے جس سے بہت کم شاعروں کو نوازا جاتا ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ اب غالب کا کلام ہی نہیں بلکہ اُن کی شخصیت کا جو مقام ہماری تاریخ اور تہذیب میں ہے وہ نمایاں ہو جائے گا اور نمایاں رہے گا۔

غالب کو ایک تہذیب ورثے میں ملی تھی جسے انھوں نے اس طرح اپنایا کہ اُس کا ایک کامل نہیں تو مثالی نمونہ بن گئے۔ ہمیں اب یہ تہذیب ہندوستان کی سماجی تاریخ کا دور معلوم ہونے لگی ہے اور ہم بھول جاتے ہیں کہ اُس کی بُنیاد کیسے اعلیٰ اخلاقی اصولوں پر تھی۔ ایک اصول تھا انسان سے محبت کرنا۔ غالب نے اس اصول کو دل سے مانا اور اس پر عمل کیا۔ ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

"میں بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں، دُوسرا مانے یا نہ مانے۔"

اسی محبت نے انھیں اپنی تہذیب کے دُوسرے اصول پر عمل کرنا سکھایا، اُن کے دل میں فیاضی اور خیر خواہی کوٹ کوٹ کر بھر دی۔ جو کچھ اپنے پاس ہوتا بے سوچے بلکہ بے اختیار ضرورت مند کو دینے کے لئے تیار ہو جاتے، کوئی فقیر اُن کے دروازے سے خالی ہاتھ نہ جاتا، دوست کی مال سے مدد کرنا اپنے لئے بڑی سعادت جانتے تھے۔ عزیزوں کی پرورش کی ذمہ داریاں برابر بڑھاتے رہے۔ اُن کی آرزو تھی کہ ایک عالم کے میزبان بنیں اور یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم جس شہر میں رہتے ہوں اُس میں کوئی ننگا یا بھوکا دکھائی نہ دے۔ یہ تھے اُن کے حوصلے جب کہ اُن کی آمدنی ساٹھ باسٹھ روپے ماہوار تھی۔ اور گھر کا خرچ مشکل سے چلتا تھا۔ شاید فیاضی کرنا اُن کے لئے اتنا ہی لازمی تھا، جتنا کہ جینے کے لئے سانس لینا۔ اور ہمیں سمجھنا چاہئے کہ اگر کہیں اعمال اور نیت کا حساب رکھا جاتا ہے تو غالب کی فیاضی کا حساب رُوپے آنے پائی میں نہ رکھا جائے گا بلکہ یہ مانا جائے گا کہ ایک گنہگار بندے کے دل میں اُس کے رب کی ربوبیت کا عکس نظر آتا ہے اور وہ اپنے حاجت مند بھائیوں کی حاجت پوری کرنے کی ایسی آرزو رکھتا تھا کہ جو کچھ وہ کرنا چاہتا تھا اور کر نہ پایا، اُس کا بھی اُسے ثواب ملنا چاہئے۔

فیاضی اور خلوص کا ساتھ چولی دامن کا سا ہے۔ غالب کا خلوص ایک طرف اس سادہ ہمت میں نظر آتا ہے جس سے انھوں نے اپنی کمزوریوں کا اعتراف کیا اور دوسری طرف اُن کی دوست داری میں

اور اس اعلیٰ مرتبے میں جو انھوں نے وفاداری کو دیا، کون تھا جو غالب کی کسی عادت کو، چاہے وہ عام طور پر بُری مانی جاتی ہو معاف نہ کر دیتا جب وہ اپنے پیارے طریقے پر اس کا ذکر کرتے اور کون ہے جو اس سے نتیجہ نہ نکالے گا کہ اصل چیز دل کی صفائی ہے، عیبوں کی ناپ تول نہیں ہے۔ دوستوں سے غالب کو جو لگاؤ تھا جس بے چینی سے وہ ملاقات کے اور ملاقات نہیں تو خط کے منتظر رہتے تھے اس کا حال اُن کے خطوں سے معلوم کیجیے تو دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ کاش ہم بھی دوست رکھتے اور اُن سے اسی طرح محبت کر سکتے۔ دراصل آدمی دوست نہ رکھتا ہو اور دوستی کا حق نہ ادا کر سکتا ہو تو اس کا کوئی مذہب کوئی دھرم نہیں ہوتا:

نہیں کچھ سبحہ و زنّار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

یہ وفاداری کس سے ہوگی، خدا سے، اصول سے، یا دوست سے؟ شاید غالب کا جواب یہ ہوتا کہ کوئی مسلمان کہے کہ میں مسلمان ہوں اس لئے مجھے پسند کرو، کوئی ہندو کہے کہ میں ہندو ہوں اس لئے مجھے پسند کرو، تو بھئی یہ بات میرے جی کو نہیں لگتی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جو آدمی دوستوں کے ساتھ وفاداری اور خلوص نہ برتے وہ تسبیح اور جنیو کو خدا اور انسان کو پھانسنے کے لئے ایک پھندا بناتا ہے۔

خلوص اور دوستی کا ایک سماجی اور تہذیبی پہلو تھا جسے حق صحبت کہتے تھے۔ اسی کا رس نکال دیا جائے تو وہ چیز باقی رہ جاتی ہے جسے ہم رواداری کہتے ہیں۔ یہ ہمارے لئے کافی ہو سکتی ہے، غالب کی نظر میں کچھ اور تھا اپنے مسلمان ہونے کا عذر اس طرح پیش کرتے ہیں:

کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حق صحبت اہل کنشت کو

غالب کی شخصیت جس تہذیب کی نمایندگی کرتی ہے اس کا نقشہ بگڑ چلا تھا مگر معیار یہ تھا کہ حق صحبت ادا کیا جائے۔

قدرت کا کوئی ایسا قانون نہیں ہے جس کے مطابق خاص حالات کسی خاص قسم کے انسان کو پیدا کرتے ہوں۔ اگر بہت سے لوگوں پر حالات کا ایک سا اثر پڑتا تو ایسی بھی کافی مثالیں مل جاتی ہیں جو عام نمونوں کے خلاف ہوتی ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ غالب کے دل میں فن میں کمال حاصل کرنے کا حوصلہ اُن کے زمانے کی تہذیب نے پیدا کیا۔ اسی وجہ سے انھوں نے شروع ہی سے اپنے لئے ایک الگ راہ نکالی۔ عام راستے سے ہٹ کر، اردو اور فارسی کو اپنے خاص طرز پر ملا کر ایک نئی اور انوکھی زبان بنائی۔ جب اس زبان سے بھی طبیعت مطمئن نہ ہو سکی تو فارسی میں لکھنا شروع کیا اور پھر اسے بھی چھوڑ کر اس زبان میں شعر کہنے لگے جسے اب سنتے ہی ہم کہہ دیتے ہیں کہ یہ غالب کی زبان ہے۔ ہمیں اس پر فخر ہے کہ یہ زبان ہماری زبان ہے۔ اس میں چاشنی ہے، زندگی ہے، لچک ہے، روانی ہے اس میں دوستی کا وہ مادہ ہے جو خود غالب میں تھا اور یہ حق صحبت بھی غالب کی طرح ادا کر سکتی ہے۔

پہلے دور میں انھیں احساس تھا اور بعض قدر شناسوں نے احساس دلایا بھی کہ اُن کی زبان مشکل اور خیالات پیچیدہ ہیں، مگر انھیں یقین تھا کہ لوگ ایک دن اُن کے کلام کو ضرور سمجھیں گے اور اس کی قدر کریں گے۔ اس لئے کہ اُن کا نغمہ تخیل کے جوش نے پیدا کیا تھا اور کوئی بلبل اس طرح نغمہ سرا ہو تو کوئی موجود باغ اس کے ثنا خواں نہیں ہوتا مگر غالب اپنی دنیا سے الگ نہیں تھے بلکہ اس میں ایک نشے کی طرح سرایت کر گئے تھے، کہتے ہیں:

جام ہر ذرہ ہے سرشار تمنا مجھ سے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم میں لگایا ہے مجھے

اسی دور میں جب کہ وہ جوان تھے اور زندگی کا نشیب و فراز کچھ زیادہ نہیں دیکھا تھا، انھوں نے ایک خیال پیش کیا جو عمر بھر کے تجربے اور صدموں کا نچوڑ معلوم ہوتا ہے۔

عروج ناامیدی چشم زخم چرخ کیا جانے
بہار بے خزاں از آہ بے تاثیر ہے پیدا

فارسی کے ایک شعر میں انھوں نے شاعر کا منصب بیان کیا ہے کہ وہ اس دنیا کے کانٹوں کو اپنے دل کے خون میں رنگ کر دکھاتا ہے کہ باغبانی کس طرح کی جاتی ہے اور پھولوں کی قیمت کس طرح ادا کی جاتی ہے۔

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بہ خونِ دل
قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

شاید یہی وہ منزل ہے جب انسان، جو اپنے بس بھر محبت، خلوص، فیاضی برت کر حقِ صحبت ادا کر چکا ہے سوچنے لگتا ہے کہ آخر وہ ہے کیا، اُسے اپنے آپ کو پہچاننے، اپنے وجود کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے کبھی وہ سمجھتا ہے کہ وہ ہی سب کچھ ہے، کبھی دیکھتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں، کبھی شوق اُسے آسمان تک پہنچا دیتا ہے، کبھی مایوسی اسے نڈھال کر دیتی ہے۔ وہ مذہب کا سہارا لینا چاہتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ہر مذہب کے ماننے والوں نے اپنے مذہب کو، اپنی عبادتوں کو، ایک حد، ایک انتہا سمجھ لیا ہے۔ خدا تک پہنچنے کی اُمید نہیں رہی ہے، تھک کر بیٹھ گئے ہیں۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

مذہب کا سہارا اس وجہ سے ڈھونڈا جاتا ہے کہ آدمی کی اپنی تمنائیں پوری ہوں، لیکن کبھی وہ دیکھتا ہے کہ یہ تمنائیں بھی اتنی ہیں کہ وہ بے بس ہو گیا ہے، کبھی دونوں جہان کا مل جانا اُسے کافی نہیں معلوم ہوتا:

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

یا ساری دُنیا کو وہ اپنی تمنا کے ایک پیر کا نشان ٹھہرا کر پوچھتا ہے:

ہے کہاں تمنا کا دُوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

یا کبھی وہ سوچتا ہے کہ آرزو کرنا پست ہمتی کی دلیل ہے، آدمی دُعا مانگے تو سب کے لئے۔

تا چند بپست فطرتی بلعمِ آرزو
یارب ملے بلندیِ دستِ دعا مجھے

لیکن انسان کی طبیعت میں کشمکش پھر بھی باقی رہتی ہے۔ یہ دُنیا سکون کی جگہ نہیں، ایک وحشت کدہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ پناہ مل سکتی ہے تو عشق میں۔ اگرچہ یہ بھی ایک شعلہ ہے، برابر جلاتا اور گھلاتا رہتا ہے:

ہم نے وحشت کدۂ بزمِ جہاں میں جوں شمع
شعلۂ عشق کو اپنا سروساماں سمجھا

شاعر فلسفی نہیں ہوتا، کسی عقیدے یا نظریئے کو دلیلیں دے کر ثابت نہیں کرتا۔ اُس کا محرک ایک ہمہ گیر جذبہ ہوتا ہے جسے عشق کہا گیا ہے اور یہ نام ہے اُن تمام کیفیتوں کا، ان تمام قلبی واردات کا جو اُس پر گزرتی ہیں اُن ہی کو وہ دُوسروں تک پہنچاتا ہے اور اس کا کمال یہ ہے کہ اپنے بیان کے ذریعے اپنی کیفیتوں کو دُوسروں کی کیفیتیں بنا دے۔ غالبؔ کے عشق میں ہر رنگ ہے، وہ رنگ ہے جس میں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ عشق کی بات کر رہے ہیں یا ہنسی مذاق کی یا سیاست کی چند مثالیں لیجئے اور سوچیئے کہ غالبؔ کا منشا کیا ہے:

ہے بس کہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گذرتا ہے گماں اور
یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور

بے نیازی حد سے گزری، بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل، اور آپ فرمائیں گے کیا

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سُبک سر بن کے کیا پوچھیں، کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دُشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ایسے شعر زبان زد ہو جاتے ہیں اور بہت سے موقعوں پر بہت سے مختلف قسم کے لوگوں کے کام آتے ہیں۔ اُن ہی کی طرح غالبؔ کے وہ اشعار ہیں جن میں کچھ فلسفیانہ، کچھ مذہبی رنگ ہے، یا درد کی کیفیت ہے اور زبان میں وہ سادگی ہے جس سے ہر شخص متاثر ہوتا ہے جیسے:

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

پھر وہ اشعار ہیں جن میں حسن و عشق کے معاملات ہیں:

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخم کاری ہے
رنگ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

لیکن ایسے اشعار کا لطف اٹھاتے ہوئے ہمیں اس کلام کو مشکل سمجھ کر نظر انداز نہ کرنا چاہیے جس میں جذبات کو فکر میں اس طرح سمویا گیا ہے کہ اُن کا صرف دل پر اثر نہیں پڑتا بلکہ اُن سے دماغ میں بیداری پیدا ہوتی ہے، خیال اور شوق کے مرتبے اور تاثیر کا اندازہ ہوتا ہے۔ عشق ایک طاقت بن جاتا ہے، جو دنیا کو بنا بھی سکتا ہے اور بگاڑ بھی سکتا ہے:

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہتی کہ زندگی میں شاعر اور شاعری کا مقام کیا ہے۔ غدا کرے ہمارے دلوں میں وہ بے چینی رہے جو غالب کے دل میں تھی اور ہم اپنے اپنے طریقے پر انسان اور انسانیت کو ان بلندیوں تک پہنچانے کی کوشش میں لگے رہیں جن کا عکس غالب کے کلام میں نظر آتا ہے۔"

غزل

دورِ طوفاں میں بھی جی لیتے ہیں جینے والے
دُور ساحل سے کسی موجِ گریزاں کی طرح
دل کی وادی میں ترا درد برستا ہی رہا
ابرِ نیساں کی طرح، ابرِ بہاراں کی طرح
فاصلے وقت میں تبدیل ہوئے جاتے ہیں
زندگی رقص میں ہے گردشِ دوراں کی طرح
دل کی تسکین کو مانگے کا اُجالا کہیئے
رات اک شوخ کی یاد آئی تھی مہماں کی طرح
آرزو اور زمانے کی کشاکش سے گریز
زندگی اور چراغِ تہِ داماں کی طرح

ق

ایک تصویر بنی سرحدِ اظہار سے دُور
نطق حیراں ہے مرے دیدۂ حیراں کی طرح
چاند نکھرا ہے تری لوحِ جبیں کی صورت
رات بکھری ہے تری زلفِ پریشاں کی طرح
کس نے ہنس ہنس کے پیا زہرِ ملامت پیہم
کون رُسوا سرِ بازار ہے تاباں کی طرح

غلام ربانی تاباں

لمحۂ درد کو اعجازِ تمنّا جانو
ظرف کی بات ہے قاتل کو مسیحا جانو
ایک ہیں موجِ صبا، موجِ شرر، موجِ نمو
پھول کھِل جائیں تو ظالم کا سراپا جانو
تم نے کب دیکھے وہ لمحے جو گزرتے ہی نہیں
درد کی رات کِسے کہتے ہیں، تم کیا جانو
وقت بے درد سہی، ساقیٔ بے فیض سہی
میکشو تلخیٔ ایّام کو صہبا جانو!
آرزو سرکش و بے باک ہوئی جاتی ہے
شوق کہتا ہے، تغافل کو تقاضا جانو
یوں تو ہر جلوۂ رنگیں کو تماشا سمجھو
اُن کی محفل میں مگر خود کو تماشا جانو
عشق کرنا ہے تو آدابِ وفا بھی سیکھو
زہر پینا ہے تو پینے کا سلیقا جانو
دل میں خوں گشتہ تمنّا کے سوا کچھ بھی نہیں
اب یہ تم پر ہے چمن سمجھو کہ صحرا جانو
کیسے گزرو گے مراحل سے سفر کے تاباں
تم کہ منزل سے شناسا ہو نہ رستا جانو

بادشاہ حسین رضوی

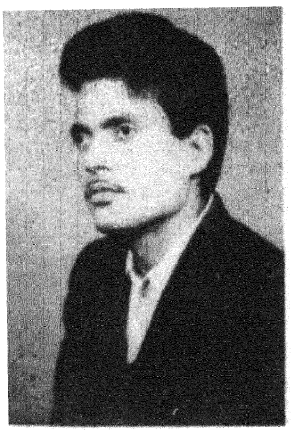

سوکھی ہوئی شاخ

دروازہ کھول کر باہر دیکھنے لئے اُس نے سر نکالا ہی تھا کہ گرم ہوا کا تیز طمانچہ منہ پر پڑا۔ ایک جھٹکے سے اُس نے اپنا سر اندر کی طرف کھینچ لیا اور زور سے دروازہ بند کر کے چارپائی پر لوٹ گئی۔

باہر دُھوپ بہت تیز تھی۔ گرمی کی شدت سے تارکول جا بجا پگھلنے لگا تھا اور لُو کے تیز جھکڑ چل رہے تھے۔ سڑک پر اِکا دُکا راہ گیر تیز تیز قدموں سے بھاگ رہے تھے۔ صبح نو بجے یہ سڑک کتنی آباد رہتی ہے۔ ایک ہی سمت کو بھاگتے ہوئے دفتر کے بابو لوگ جنھیں سویرے اُٹھتے ہی کل ٹرین پکڑنے کی فکر لگی رہتی ہے۔ اُس نے سوچا کہ اسکول بھی بند ہو چکے ہیں ورنہ کم از کم اسکولوں کے لڑکے لڑکیوں سے صبح شام اس سڑک پر چہل پہل تو رہتی تھی۔

کمرے میں اُس کا دم گرمی سے گھُٹ رہا تھا اُف! پنکھے کی ہوا بھی کتنی گرم ہے، صراحی سے ایک گلاس پانی پی کر اُس نے اپنے پیچھے پلٹ کر دیکھا جہاں اُس کے بچے لڑ جھگڑ کر اب سو گئے تھے۔

"وہ کہاں رہ گئے؟ اُنھیں تو کل رات ہی میں آجانا چاہئے تھا کسی وجہ سے رُک گئے ہوں گے۔ صبح والی گاڑی سے تو آنا بہت ضروری تھا منجو کو بیمار دیکھ کر گئے تھے۔ گھر میں پیسے بھی تھوڑے ہیں۔ یہ بھی وہ جانتے تھے۔ مگر اُن سے کیا؟ اُنھیں اپنے ہی کاموں سے کب فرصت ملتی ہے۔ وہ سوچتی رہی ——،

اچھا ہوا جو بڑھیا گاؤں چلی گئی۔ اُس نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔ مگر جب تک وہ زندہ ہے اُس سے کہاں چھٹکارا مل سکتا ہے۔ (من ہی من میں اُس نے بددُعا دی) دو ایک ہفتے میں جب وہاں سے دل بھر جائے گا تو پھر چلی آئے گی۔ اُسے وہاں پر کیا چین ملے گا۔ وہ آپ ہی آپ کچھ بوریت سی ہو گئی۔ میز سے کوئی میگزین اُٹھا کر دیکھنے لگی۔

باہر کوئی لاؤڈ اسپیکر پر کہہ رہا تھا۔

"منجو نام کی ایک لڑکی جو نیلا فراک، سُرخ ربن اور کانوں میں زنگ پہنے ہوئے ہے، عمر ۸ سال، رنگ سانولا ہے، صبح اسکول، رزلٹ سُننے کے لئے گئی تھی، لاپتہ ہے کسی سجن کو معلوم ہو تو وہ رتن کمار ایڈووکیٹ اندر لوک کے اپوزٹ پتے پر اُسے پہنچانے کا کشٹ کریں ہم بہت آبھاری ہوں گے۔"

اس آواز پر تقریباً وہ چونک پڑی۔ کتاب میں اُس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ اُسے لگا جیسے کوئی اُسی کو پکار رہا ہو۔ منجو ہی اُس کا بھی

تو نام تھا گھر پکارے کا ۔۔۔ اچانک اُسے محسوس ہوا وہ بھی تو کھو گئی ہے اور پھر وہ خود کو تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

اُسے لگا پورے کمرے میں ایک چمکیلا غبار سا بھر گیا ہے اور اس غبار کے اُس پار ایک چھوٹی سی بچی بغل میں بیگ لٹکائے، اسکرٹ اور بلاؤز میں گھر سے تھوڑی دُوری پر کانونٹ کی طرف چلی جا رہی ہے۔ ممی، پاپا، اُسے دروازے تک چھوڑنے جاتے، بہت سی ٹافیاں اور ناشتہ اس کے ساتھ کر دیتے۔ اسکول سے واپسی پر ماں اُسے کس طرح چمٹا لیتی تھی۔

گھر پر کوئی بھی مہمان آتا، سبھی اُس کی تعریف کرتے: "کتنی اچھی لڑکی ہے۔ پڑھنے میں بہت تیز ہے اور انگریزی کیسی فر فر بولتی ہے۔"

پاپا کہتے۔ "نمستے کرو بیٹی، انکل کو"

وہ جھٹ سے دونوں ہاتھ جوڑ دیتی۔

"شاباش بیٹا!"

تمہاری سسٹر نے کل کون سا Lesson یاد کرایا تھا۔

Jack and Jill went up the hill

خوب بہت خوب سنانا تو میری بیٹا، انکل اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتے۔ میری بٹیا بہت تیز ہے وہ دونوں ہاتھ اُوپر نیچے کر کے گھوم گھوم کر خوب ایکٹنگ سے سنانے لگتی۔ اُسے یاد آیا کہ جتنی بار گھر پر کوئی آتا اُسے کچھ نہ کچھ سنانا ہی پڑتا تھا۔

گھر میں سب اُسے کتنا چاہتے تھے۔ ذرا سی بات پر اپنے بڑے بھائی بہنوں سے لڑ جاتی۔ ایک دن بڑے بھائی نے کسی بات پر اُسے ڈانٹ دیا تھا، تو اُس کی شکایت پر پاپا نے اُنھیں کتنی ڈانٹ سنائی تھی اُسے پھر یاد آیا۔۔۔

گھر میں اُس کی برتھ ڈے پارٹی تھی ڈرائنگ رُوم دُلہن کی طرح سجایا گیا تھا، گیندوں دار سفید فراک میں وہ بالکل فیری جیسی لگ رہی تھی۔ ایک بڑا سا کیک ڈھیر سی موم بتیاں جلائی گئی تھیں۔ خوب گانا بجانا ہوا تھا۔ کیک کاٹا گیا Happy birth day to you سبھوں نے تالیاں بجا بجا کر گایا۔

ڈھیر سے تحفے رنگ برنگ کے کپڑوں کے بنڈل، قلم، مٹھائیوں کے رنگین پیکٹ اُس نے مسکرا مسکرا کر وصول کیے تھے کتنی دھوم تھی اُس دن اُس نے خود بھی سب لوگوں کی فرمائش پر ڈانس کیا تھا جس پر انکل نے اُس کا منہ چوم لیا تھا۔

"دیکھنا میری بچی جس گھر میں جائے گی راج کرے گی"

"بھابی کہیں، دُولہا تو پیچھے پیچھے لٹو ہو کر ناچے گا"

البتہ اس کی بوڑھی دادی کو یہ سب ذرا بھی نہیں بھاتا تھا۔ وہ اُس کے طور طریقوں اور پہناوے پر اکثر نکتہ چینی کرتی تھیں "یہ بھی کوئی پہناوا ہے۔ اتنی بڑی ہو گئی ہے، شرم، حیا کچھ بھی نہیں ہے۔ ہر دم کھلی کھلی ٹانگیں چاروں طرف کودتی پھرتی ہے۔" ۔۔۔ پاپا کو وہ ڈانٹتیں، ۔۔۔ چھوٹے کی تو عقل ماری گئی ہے۔ لڑکیوں کو کہیں اتنا لاڈ پیار سے رکھا جاتا ہے یا اتنی آزادی دی جاتی ہے؟ ۔۔۔ دیکھوں گی جب یہ اپنے گھر پر جائے گی۔ اگر سسرال اچھی نہ ملی تو سر پر ہاتھ رکھ کر یہ بھی روئے گی اور تم بھی۔"

اُس نے دیکھا کہ غبار کہیں کہیں سے چھٹ رہا تھا۔ کمرہ بڑا سونا سُونا سا لگ رہا تھا۔ ایک بے جان سی مسکراہٹ نے اُس کے ہونٹوں پر دم توڑ دیا۔

دیر تک اندھیرے کی پرتیں، یادوں کے ناخن سے وہ اُدھیڑتی رہی۔ دُھندلی شوخ بہت سی تصویریں اُبھرتی رہیں اور اُس کا بچپن اُس کی آنکھوں میں سمٹ آیا۔

بچپن کی تصویروں کو دیکھتے دیکھتے اُسے وہ دن بھی یاد آیا جس نے اُس کی زندگی کا رُخ ہی بدل دیا۔

اُس دن گھر پر بڑی تیاریاں تھیں۔ ڈرائنگ روم میں خوبصورت صوفے، میز کرسیاں جن پر بڑے بڑے پھولوں والے غلاف چڑھائے گئے تھے۔ قیمتی چادریں اور قالین بچھائے گئے۔ تخت پر گاؤ تکیہ اور سفید چادر لگا کر آنے والے مہمان کا انتظار ہونے لگا۔ یوں تو پاپا کے دوست احباب اکثر گھر پر آتے رہتے تھے۔ لہٰذا اُس دن یہ خاص اہتمام دیکھ کر اُسے کوئی اندازہ نہ ہو سکا۔ اُسے تو اُس وقت پتہ لگا جب اُس کی بھابی نے اُس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر پوچھا "ارے منجو! تو ابھی تک ایسے ہی گھوم رہی ہے۔ یہ کپڑے

بدل کر، خوب اچھی طرح میک اپ وغیرہ کرلے، تجھے کچھ معلوم ہے۔ آج کون لوگ آنے والے ہیں؟"

"مجھے کیا پتہ؟"

"اچھا اب بننا چھوڑو۔ چلو جلدی کرو۔"

بھابی اُسے اپنے ساتھ کمرے میں لے آئی تھیں اور دیر تک میک اپ کرتی رہی تھیں۔ کمرے میں پاپا کسی سے باتیں کر رہے تھے۔ شاید وہ لوگ آگئے تھے۔ بھابی نے ایک طرے میں خوبصورت سا سُوٹ رکھ کر اُس کے ہاتھوں میں تھما کر کہا تھا: "اسے لیکر کمرے میں جاؤ۔ ذرا بھی گھبرانا مت، اور خوب جی بھر کے دیکھ لینا اپنے اُن کو ــــ شرمانا مت، ورنہ پچھتاؤ گی۔"

اُس کے پاؤں مَن مَن بھر کے ہو رہے تھے۔ اُس کی ساری شوخیاں جانے کہاں چلی گئی تھیں۔ شرماتی، جھجکتی، پردہ ہٹا کر وہ آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہوئی۔ ٹرے کو میز پر رکھ دیا اور پاپا کے اشارہ پر اُنھیں کے پاس ایک خالی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

ایک نوجوان پتلون اور قمیص میں، جس کے بال اچھی طرح سے سنوارے ہوئے تھے، اُس کی طرف شوخ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ اُس نے بھی اُس کی طرف دیکھا تھا۔ اور پھر سر جھکا لیا تھا اور داہنے ہاتھ سے بائیں ہاتھ کے ناخن کی سُرخی کھرچنے لگی تھی۔

اُن لذت بخش لمحوں سے جگا کر جیسے کسی نے اُسے لا کر اُس کے کمرے میں کھڑا کر دیا ہو۔ پھر اُسے صرف اتنا یاد آیا ــــ خوابوں کے شیش محل میں شہنائیاں بجی تھیں۔ وہی نوجوان اُسے اُس کے چمن سے اپنے گھر میں لے آیا تھا۔

اُس کے معصوم چہرے پر پسینے کے قطرے اُبھر آئے۔ ہونٹوں پر لرزتے ہوئے پسینے کا کسیلا پن اُس نے زبان پر محسوس کیا اور آنچل سے پونچھ ڈالا۔ اُس نے پھر آنکھیں بند کر کے سوچا۔

"شادی کے بعد اُس نے بس طرح اپنے گھر کا خواب دیکھا تھا۔ چھوٹا سا ایک اپنا گھر اور آنگن میں کھیلتے ہوئے اُس کے اپنے بچے۔ مگر یہاں گل دو چھوٹے کمروں پر مشتمل مکان، آنگن تو سرے سے غائب۔ گرمیوں میں بھی اسی کمرے میں رات بھر سڑنا پڑتا ہے۔ جاڑوں میں دھوپ کا گذر بھی نہیں ہوتا اور برسات میں دروازے بند کر دو تو بس اتنی اُمس کہ دم گھٹتا ہے۔ اپنی پیشانی پر جھولتے ہوئے، بالوں کو اُوپر اُٹھاتے ہوئے اُس نے سوچا پچھلے سال اگر پاپا یہ پنکھا نہ خرید دیتے تو اس سال بھی اُسی طرح کمرے میں اُبلنا پڑتا۔

اُس نے کئی بار سوچا ہے کہ اب وہ اپنے گھر والوں سے کوئی چیز نہیں لے گی۔ یہی وجہ ہے کہ پاپا یا ممی سے وہ اپنا کوئی دُکھ بھی نہیں کہتی ہے۔ جب وہ لوگ اُسے کوئی چیز دیتے ہیں تو وہ محسوس کرتی ہے کہ وہ اس پر رحم کھا کر احسان کر رہے ہیں اور وہ شرم سے گڑ جاتی ہے۔

مگر یہاں اُسے اب تک کون سے سکھ ملے ہیں۔ مہینہ ہی کسی طرح سے کٹ جاتا ہے۔ مالک کا بڑا شکر ہے۔ چھوٹی سی نوکری اُس پر اتنا بڑا خاندان، اب تک اُس کے سارے شوق وہیں سے تو پورے ہوئے ہیں۔ ماں اُس کی حالت دیکھ کر کتنی اُداس ہو جاتی ہے۔ اُن کا سامنا کرتے ہوئے اب خود بھی وہ گھبراتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے وہاں جانا بھی کم کر دیا ہے۔

اپنی چھوٹی بہن نیلو کے بارے میں اُس نے سوچا، وہ کتنی خوش حال ہے اور اُس کے بچے بھی کتنے تندرست ہیں۔ جب وہ گھر پر جاتی ہے تو بچوں کے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر جاتی ہے۔ کتنی موٹی ہو گئی ہے۔ اُس دفعہ جب گھر پر گئی تھی اور شام کو چاچی کے یہاں جانا تھا۔ چلتے وقت جب سوتی ساڑھی پہن کر وہ اُس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوئی تو اُس نے کس طرح مُنہ بنا کر کہا تھا ــــ "دیدی یہ ساڑی باندھ کر چلو گی؟" اُتار دو اسے" اور اپنے ٹرنک سے نکال کر ایک قیمتی ساڑی اُس کی طرف اُچھالتے ہوئے کہا تھا: "دیدی اسے پہن لو" اور انکار کے باوجود اُس کی ضد پر اُسے پہننا ہی پڑی تھی۔

اُسے یاد آیا۔ ہولی کے موقع پر جب وہ گھر پر گئی ہوئی تھی تو اُس کی چھوٹی بہنوں نے پوچھا تھا کہ "تم اب کیسے رہ پاتی ہو دیدی؟ وہاں پر تم نے خود کو کیسے ایڈجسٹ کر لیا ہم تو کبھی نہ رہ پاتے" وہ اُن کے سوالوں کا کیا جواب دیتی۔ صرف مسکرا کر رہ گئی تھی ــــ ایسا اُن لوگوں نے کیوں کہا تھا۔ وہ اُسی وقت سمجھ گئی تھی۔ کیونکہ وہ کپڑے جو چھوٹے بھائی کے

نے بنوا کر وہ اپنے ساتھ لے گئی تھی، نیلو کے لائے ہوئے کپڑوں کے مقابلے میں کتنے معمولی تھے۔ جب اُس نے چھوٹے بھائی کو دینا چاہا تھا تو ماں نے بھی ڈانٹ کر کہا تھا۔

"یہ سب تو کیوں لے آئی؟ تُو، تو خود ہی پریشان رہتی ہے"۔ اور اُس کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کس طرح ماں نے اُسے خوش کرنے کے لئے وہ کپڑے رکھ لئے تھے۔ اُسے یاد کر کے اُس کا دل درد سے بھر آیا اور دیر تک اپنے بھاگ کو کوستی رہی۔ آتے سمے جب ماں نے اُسے دو ساڑیاں، دو بلاؤز اور پچاس رُوپے بہنوں سے چھپا کر دیئے تھے تو اُسے لگا تھا کہ وہ اب اُسی چمن کی نہیں ہے، وہ تو ایک کٹی ہوئی شاخ ہے۔ وہ اُسے لیتے ہوئے۔ اپنی نظروں میں ذلیل و خوار نظر آ رہی تھی۔ اور اُس کی نظروں کے سامنے اُس بھکارن کا رُوپ جھلک رہا تھا جو کسی سے بھیک لے رہی ہو۔

اُس نے اُٹھ کر پھر صراحی سے دو گلاس پانی پیا اور بھیگے ہوئے ہاتھ سے دونوں آنکھوں کے پپوٹوں کو تر کیا۔ ٹیبل واچ کی طرف دیکھا تو تین بج چکے تھے۔ گرمی اب بھی اتنی ہی سخت پڑ رہی تھی۔ اُسے یاد آیا۔ صبح راشن ختم ہو گیا ہے۔ وہ تو رات ہی ختم ہو جاتا مگر کسی طرح اُس نے صُبح تک چلا لیا ہے۔ کھڑکی سے جھانک کر اُس نے باہر دیکھا۔ سرکاری غلّے کی دوکان کے سامنے، دھوپ اور لُو میں بہت سی عورتیں اور بچے کھڑے تھے۔ اُس نے سوچا جا کر کم از کم کارڈ تو جمع کر آئے۔ ورنہ شام کو پھر کیا ہوگا؟ بازار سے خریدنے میں بہت مہنگا پڑے گا۔

وہ سوچنے لگی۔ پاپا، ماں، بھابی اور گھر کے سبھی لوگوں کی دُعائیں نیک تمنائیں اور پیار کچھ بھی تو اُس کے کام نہ آ سکا۔ اُس وقت اُسے اپنی بوڑھی دادی یاد آ گئیں۔ جانے کون سی گھڑی تھی جب اُنھوں نے وہ باتیں کہی تھیں جو وہی اُس کا نصیب بن کر رہ گئیں۔

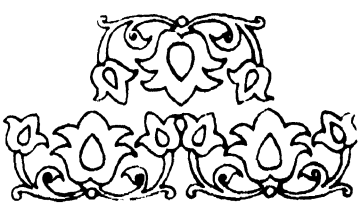

دیارِ لوح و قلم میں

آؤ، یہ عہد تو کر لیں کہ زمیں پر اپنی
زہر تاریک شبوں کو نہ اُگلنے دیں گے
گرد آلود روایات کے سناٹے کو
جذبۂ شوق کے ہمراہ نہ چلنے دیں گے
حسنِ تخلیق کے جاگے ہوئے ارمانوں پر
وار بے مہریٔ دوراں کا نہ چلنے دیں گے
اپنے زخموں کے اُفق زار پہ جو روشن ہے!
فن کے اُس مہرِ درخشاں کو نہ ڈھلنے دیں گے
ہر طرف آگ ہے، شعلے ہیں، دُھواں ہے لیکن
ہم جلیں گے بھی تو خوابوں کو نہ جلنے دیں گے

میر نقی علی خاں ثاقب

مسیح الزماں

انیسؔ کی

جذبات نگاری

مغرب کے کلاسیکی ناقدوں کے نزدیک ڈراما بلکہ تخیلاتی ادب کی ہر صنف کا مقصد ایسے انسانی اعمال و افعال کی پیش کش ہے جس سے انسانی فطرت اور اُس کی بُنیادی خصوصیات کا علم ہو سکے۔ اس لحاظ سے انیسؔ کے مرثیوں کو دیکھا جائے تو ان میں انسانی برتاؤ اور جذباتی ردِ عمل کے مختلف النوع نمونے نظر آتے ہیں۔ غم، خوشی، شجاعت کے سادہ جذبات بھی ملیں گے، جو دوسرے شعرا نے بھی کامیابی سے پیش کئے ہیں۔ لیکن جب ان جذبات میں مختلف احساسات کی کش مکش رُونما ہوتی ہے، یعنی کہیں محبت اور حیا، کہیں غصہ، شجاعت اور پاسِ ادب، کہیں فرض و محبت آپس میں دست و گریباں نظر آتے ہیں تو انیسؔ کی مہارت کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ ان ملے جلے جذبات کی مجموعی تصویر وہ کتنی کامیابی سے پیش کرتے ہیں۔ مثلاً مدینہ سے امام سفر کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مخدرات محملوں میں سوار ہو چکے ہیں۔ جناب صغرا بھی سب گھر والوں کے ساتھ جانا چاہتی ہیں لیکن امام کے حکم سے مجبور ہو کر سب سے رخصت ہوتی ہیں۔ عام رواج کے مطابق جناب شہر بانو پردۂ محمل سے ننھے علی اصغر کا منہ باہر کر کے اس کا ہاتھ ماتھے پر لے جا کر کہتی ہیں کہ لو علی اصغر تمہیں سلام کرتے ہیں۔

اُس پر جناب صغرا جو درد بھرے الفاظ کہتی ہیں انھیں سُن کر سب رونے لگتے ہیں اس منظر کو انیسؔ اس طرح ختم کرتے ہیں:

سب بیبیاں رونے لگیں سُن سُن کے یہ تقریر
چھاتی سے لگا کر اُسے کہنے لگے شبیر
لو صبر کرو، کوچ میں اب ہوتی ہے تاخیر
منہ دیکھ کے چُپ رہ گئی وہ بیکس و دلگیر
نزدیک تھا دل چیر کے پہلو نکل آئے
اچھا تو کہا منہ سے پہ آنسو نکل آئے

بیت میں باپ کے حکم کے آگے ایک لڑکی کی بے کسی، مایوسی اور صبر کی بڑی فن کارانہ تصویر پیش کی گئی ہے۔ ایسا ہی ایک اور منظر حضرت عباس کے صبر کا دیکھئے جو شجاعت اور بہادری کے ساتھ اپنے غصہ کے لئے بھی مشہور تھے۔ دلیر اور غصہ ور جوانوں کی خصوصیت ہوتی ہے کہ جب انھیں جلال آجائے اور مقابل شخص کی گفتگو یا عمل میں اہانت کا پہلو ملے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ ایسی ہی حالت میں جب امام انھیں تلوار کھینچنے سے روک دیتے ہیں۔ تو اُس وقت اس دلیر کی جذباتی کشمکش دیکھئے

پہلی مثال میں ایک لڑکی کے دل میں اطاعت اور خواہش کی ٹکر تھی۔ یہاں ایک بہادر جوان کی ہمت و خواہش اور بھائی کے حکم کی اطاعت کی ٹکر تھی۔

دونوں کی فطرت اور حالات کے فرق نے اس جذباتی ردِ عمل میں بھی فرق پیدا کر دیا ہے۔ یزیدی فوج نے قیامِ حسینؑ کو دریا کے پاس سے اٹھ جانے کو کہا ہے اس پر حضرت عباسؑ کو غصہ آگیا اور انھوں نے تلوار کھینچ لی کہ مخالفین کو اُن کی بدتمیزی کا مزہ چکھا دیا جائے لیکن امام حسینؑ نے اپنے سر کی قسم دے کر انھیں روک دیا۔

آقا نے دی جو اپنے سرِ پاک کی قسم
بس تھرتھرا کے رہ گیا وہ صاحبِ کرم
پر تھی شکن جبیں پہ نہ ہوتا تھا غیظ کم
چپ ہو گئے قریب جب آئے شہِ امم

گردن جھکا دی تا نہ ادب میں خلل پڑے
قطرے لہو کے آنکھوں سے لیکن نکل پڑے

تیغ و سپر کو پھینک کے بولا وہ نامور
کہہ دیجیے اُن سے کاٹ کے لے جائیں میرا سر
حکمِ خدا ہے حکمِ شہنشاہِ بحر و بر
اب کچھ کہوں زباں سے میں کیا تاب کیا جگر

میں ہوں غلام آپ کے ادنیٰ غلام کا
آقا مجھے خیال تھا بابا کے نام کا

گردن میں ہاتھ ڈال کے حضرت نے یہ کہا
کیوں کاٹتے ہو غیظ سے بھائی یہ کیا یہ کیا
لو اب اُٹھا لو تیغ و سپر تم پہ میں فدا
دریا کو تم تو لے چکے اے میرے مہ لقا

وہ شیر ہو کہ ڈھاک ہے ساری خدائی میں
دیکھو کوئی تمہارے سوا ہے ترائی میں

غصہ کو روکنے میں حضرت عباسؑ کی جو حالت دکھائی گئی ہے اس سے ایک طرف اُن کے جلال کی شدت اور دوسری طرف امام کا انتہائی لحاظ نظر آتا ہے اور انہیں جذبات کی کشمکش کا نتیجہ ہے کہ جسم کانپنے لگتا ہے، چہرہ قابو میں نہیں آتا تو گردن جھکا دیتے ہیں تاکہ چہرہ کی برہمی سوءِ ادب کا پہلو نہ پیش کرے۔ انتہائی غصہ اور انتہائی ضبط بہ یک وقت وہ کیفیت سامنے لاتے ہیں کہ آنکھوں سے خون ٹپکنے لگتا ہے۔ غصہ کی دوسری لہر دوسرے بند میں دکھائی گئی ہے جس میں ایک بہادر کی بے بسی کی حقیقی تصویر ہے۔ اس کے نزدیک اپنا سر کاٹ کر دے دینا اُس وقت ضبط و تحمل سے زیادہ آسان ہے۔ امام حسینؑ کے حکم کو حکمِ خدا کے برابر سمجھتے ہوئے بھی دل میں یہ کھٹک باقی رہتی ہے کہ اس وقت خاموش ہو جانا گویا خاندانی شجاعت کے منافی ہے، مگر اطاعت کو عین فرض سمجھ کر چپ ہو جاتے ہیں۔ امام حسینؑ بھی محسوس کر رہے ہیں کہ اس وقت عباسؑ کیسی آزمائش سے دوچار ہیں۔ وہ اُن کو تسلی دیتے ہیں، سمجھاتے ہیں، اور ایسی گفتگو کرتے ہیں جس سے ظاہر ہو کہ اُن کا حکم ماننے سے حضرت عباسؑ کی کوئی سبکی نہیں ہوئی اور نہ لوگوں کی نظروں میں اُن کی شجاعت پر کوئی حرف آیا ہے۔ ان تین بندوں میں جذباتی کشمکش کی جو تصویر انیسؔ نے پیش کی ہے وہ انسانی نفسیات پر ان کی گہری نظر، مختلف احساسات اور اُن کے مظاہر پر اُن کے عبور اور انھیں خوبصورتی سے پیش کرنے کی قدرت کی گواہ ہے۔

ارسطو کا خیال ہے کہ المیہ ہمیشہ جذبات کو مخاطب کرتا ہے مناسب موقعوں پر رحم اور خوف کے جذبات اُبھارنے میں کامیابی ہی المیہ کی کامیابی ہے۔ یہ جذبات عملی زندگی کی تصویر کشی سے اُبھرتے ہیں۔ المناک حالات میں گرفتار، سعی و جہد کرتے ہوئے، سوچتے ہوئے، فطری طور پر اپنی شخصیت کا اظہار کرتے ہوئے لوگ اس تصویر کشی کا موضوع ہونے چاہئیں۔ دوسرے الفاظ میں المیہ کردار کے فطری افعال و حرکات اس طرح پیش کیے جانے چاہییں کہ حالات کی المناکی نمایاں ہو جائے۔ یہ معلوم ہو کہ کچھ اچھے، نمایاں اور عالی رتبہ لوگ کس طرح مصیبتوں کے بھنور میں گرفتار ہو کر حالات کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ امام حسینؑ جن کی بزرگی اور شرافت کے سب قایل ہیں اپنے اصول کی حفاظت پر اڑے ہوئے ہیں۔ ساتھی ایک ایک کر کے شہید ہو چکے۔ جوان بیٹا باقی ہے اور وہ بھی راہِ حق میں جان دینے کی اجازت مانگتا ہے۔ امام خود جہاد کرنے

کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں۔ بیٹا اُن سے پہلے جانے پر اصرار کرتا ہے۔ حالات ایسے ہیں کہ میدان میں جاکر مرنا لازمی ہے۔ اصول کی خاطر ایک طرف، بیٹے کی محبت دوسری طرف۔ امام حسین بڑے اصول پرست، بڑے صابر، بڑے ہمت والے ہیں۔ لیکن پھر بھی انسان ہیں، باپ ہیں۔ انھیں ان دونوں پہلوؤں کو واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ جناب علی اکبر کہتے ہیں۔

چھوٹے تھے جو کہن میں بڑے کر گئے وہ کام
یا شاہ! کیا لڑائی کے قابل نہیں غلام
عمّو کے خوں کا لیں گے لعینوں سے انتقام
ہم نے بھی تیغ باندھی ہے بچپن سے یا امام

عزت ملی ہے خلق میں صدقے سے آپ کے
بیٹا وہی جو رنج میں کام آئے باپ کے

انصاف آپ کیجئے یا سرورِ عرب
بیٹا تو گھر میں بیٹھے لڑے باپ تشنہ لب
مارا گیا نہ آج تو کل یہ کہیں گے سب
کیسا لہو سفید ہے دُنیا کا ہے غضب
سر کو کٹا کے باپ جہاں سے گذر گیا
بیٹا جوان باپ کے آگے نہ مر گیا

شہ نے کہا تمہیں مرے دل کی نہیں خبر
پیارے کہاں سے لاؤں میں اس طرح کا جگر
ہے باپ کا عصائے ضعیفی جواں پسر
جب تم نہ ہوگے پاس تو مر جائے گا پدر

ایسے ہنسے نہ تھے کہ ہمیں تم رُلاتے ہو
شادی کے دن جو آئے تو مرنے کو جاتے ہو

رانیں یہ عیش کی ہیں مرادوں کے ہیں یہ دن
پورے جواں نہیں ابھی کیا ہے تمہارا سن
اکبر تری جوانی پہ روئیں گے انس و جن
کیوں کر قرار آئے گا ماں کو تمہارے بن
کیسی ہوا چلی ہے چمن روزگار میں:

سیّد کا باغ لٹتا ہے فصلِ بہار میں
دنیا اگر تمہیں کوئی فرزند ذوالجلال
ہوتی پدر کی قدر سمجھتے ہمارا حال
رخصت کا آپ سے یونہی کرتا وہ جب سوال
تب جانتے کہ دیتے اسے رخصتِ جدال
کیا جانے وہ مزہ جسے اس کا ملا نہیں
اچھا سدھارو، تم سے ہمیں کچھ گلا نہیں

ان باتوں کو اگر قدیم ہندوستان کے شعری نظریات کی روشنی میں دیکھا جائے تو انیس کی شاعرانہ عظمت اور زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ بھرت منی نے انسانی جذبات کو آٹھ قسموں میں تقسیم کیا ہے جن میں ہر ایک اپنی نوعیت اور اثر کے اعتبار سے دوسروں سے مختلف ہے۔ ان کی ترجمانی الگ الگ قسم کے جذباتی بحران پر منحصر ہے جو مجموعی طور پر پوری انسانی زندگی کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ یہ آٹھ رس حسب ذیل ہیں۔

(۱) شرنگار (محبت) (۲) ہاسیہ (مزاح) (۳) کرُنا (درد)
(۴) رودر (غصہ) (۵) ویر (شجاعت) (۶) بھیانکا (ڈر خوف)
(۷) بھاتسا (نفرت) (۸) ابھدت (حیرت)

ان جذبات کی تصویر کشی شاعر کی نفسیاتِ انسانی سے گہری واقفیت کا مطالبہ کرتی ہے۔ خصوصاً اس وقت جب اُن میں سے کئی کا امتزاج ہو جائے۔ انیس نے جو موضوع اپنی شاعری کے لئے منتخب کیا تھا اس میں شرنگار یعنی تعشق کا پہلو تو نہیں نکل سکتا تھا لیکن انسانی محبت کے دوسرے پہلوؤں کی گنجائش تھی۔ اس طرح مزاح کا عنصر بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن بھرت منی کی تقسیم میں مسرت کے جذبات بھی مزاح ہی کے ذیل میں ہیں۔ اگرچہ واقعۂ کربلا میں اس عنصر کی گنجائش بھی بہت کم ہے، لیکن انیس کو انسانی زندگی کا جو وسیع تجربہ تھا۔ اس کی بنا پر انھوں نے اپنی جذباتی مصوری کو مکمل کرنے کے لئے اس کی عکاسی کے پہلو بھی نکالے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ بھرت منی کے نزدیک رس (جذبات) کی ترجمانی کی ایک قریبی شاخ بھاؤ (حرکات سے اظہار) بھی ہیں۔ انیس اگرچہ ڈراما

نہیں لکھ رہے تھے لیکن جس نئی صنف ادب کو وہ اپنے فن سے جلا بخش رہے ہیں یا یوں کہئے کہ ایک مروجہ صنف ادب کو اپنے فن سے نئی سمتیں دے رہے تھے ان میں ناظرین و سامعین کی موجودگی، منبر پر نشست اور مرثیہ کو آواز اور اشاروں سے پیش کرنے کے خصوصیات نے اسے ڈرامے سے قریب کر دیا تھا۔ اس لئے جب ہمیں ان کے یہاں رسموں کی مصوری میں بھاؤ کے پہلو بھی نظر آتے ہیں تو اُن کے کمال کا اور بھی احساس ہوتا ہے۔

اس مختصر جائزے میں نہ ہر رس کی ترجمانی کی مثال دی جا سکتی ہے اور نہ اُن کے امتزاج سے پیدا ہونے والی صورتوں کو گنا یا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ امتزاج سے پیدا ہونے والی صورتوں سے قطع نظر ایک ایک رس ہی کے بے شمار پہلو ہیں۔ شدت اور کمی کی منزلیں ہیں اور پھر نئی نئی سمتیں اور رُخ ہیں۔ صرف محبت کے ایک رس کو لیجئے تو رشتے اور تعلقات کے اعتبار سے اُس کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔ مثلاً جناب زینب ہی کے جذبات دیکھے جائیں تو امام حسین، حضرت عباس، حضرت عون و محمد، جناب علی اکبر، جناب شہر بانو، حضرت سید سجاد جناب سکینہ وغیرہ کے لئے الگ الگ تہیں اور پرتیں سی ہیں۔ جن کو انیس نے پیش کیا ہے اور اپنے مرثیوں کو انسانی احساسات اور برتاؤ کا نگارخانہ بنایا ہے۔ مثال کے لئے عون و محمد ہی سے مختلف اوقات میں محبت کے مختلف انداز دیکھئے۔ یہ بچے علم کے اُمیدوار ہیں، اور چوں کہ اُن کے دادا اور نانا دونوں ہی لشکرِ اسلام کے علمدار رہ چکے ہیں اس لئے اپنے کو سب سے زیادہ مستحق سمجھتے ہیں۔ امام حسین نے اُن کو علم نہ دے کر اُن کے نزدیک ناانصافی کی ہے اس لئے وہ ملول سے ہیں۔ جناب زینب تجاہل عارفانہ برتتے ہوئے بچوں سے اس طرح مخاطب ہوتی ہیں۔

ہتھیار سج چکے ہیں شہنشاہ حق شناس
تم نے نہ زیبِ جسم کیا فاخرہ لباس
مردوں کو جان دینے میں ہوتا نہیں ہراس
دولہا بنے کے جاؤ امامِ اُمم کے پاس
کچھ مانگتے ہیں آؤ میں کپڑے اُتار دوں
سُرمہ لگا دوں گیسوئے مشکیں سنوار دوں

شب سے تو صبح تک یہ دُعا تھی ہر ایک بیل
تینوں میں پہلے ہم کو کرے رُخ رُد اجل
اب کیا ہوا یہ کون سا غصّے کا ہے محل
آنکھوں میں اشک، رُخ پہ عرق، ابروؤں پہ بل
وہ خوش مزاجیاں نہ وہ باتوں کے طور ہیں
اس وقت دیکھتی ہوں کہ تیور ہی اور ہیں

اس کا نہیں خیال کہ کیوں کر جئے گی ماں
ہوتا ہے آفتوں میں محبت کا امتحاں
تم میری دس برس کی ریاضت ہو میری جاں
مجھ سے سوا ہے کون تمہارا مزاج داں
جس پر یہ برہمی ہے وہ سب جانتی ہوں میں
غصّے کی آنکھ کا ہے کو پہچانتی ہوں میں

ایک دوسرے مرثیے میں یہی موقع پیش کیا ہے لیکن اس میں جذبات کا نیا رُخ دکھایا ہے۔

زینب نے تب کہا کہ تمہیں اس سے کیا ہے کام
کیا دخل مجھ کو مالک و مختار ہیں امام
دیکھو نہ کیجو بے ادبانہ کوئی کلام
بگڑوں گی میں جو دوگے زُباں سے علم کا نام
لو جاؤ بس کھڑے ہو الگ ہاتھ جوڑ کے
کیوں آئے تم یہاں علی اکبر کو چھوڑ کے

سُرکو ہٹو بڑھو نہ کھڑے ہو علم کے پاس
ایسا نہ ہو کہ دیکھ لیں شاہِ فلک اساس
کھوتے ہو اور آئے ہوئے تم مرے حواس
بس قابلِ قبول نہیں ہے یہ التماس
رونے لگو گے پھر جو بُرا یا بھلا کہوں
اس ضد کو بچپنے کے سوا اور کیا کہوں

عمریں قلیل اور ہوسِ منصبِ جلیل

اچھا نکالو قد کے بھی بڑھنے کی کچھ سبیل
ماں صدقے جائے گرچہ یہ ہمت کی ہے دلیل
ہاں اپنے ہم سنوں میں تمہارا نہیں عدیل
لازم ہے سوچے غور کرے پیش و پس کرے
جو ہو سکے نہ کیوں بشر اُس کی ہوس کرے

پھر تم کو کیا بزرگ تھے کچھ مخزنِ روزگار
زیبا نہیں ہے وصفِ اضافی پہ افتخار
جوہر وہ ہیں جو تیغ کرے آپ آشکار
دکھلا دو آج حیدر و جعفر کی کار زار
تم کیوں کہو کہ لال خدا کے ولی کے ہیں
تو جبھی پکار یں خود کو کہ نواسے علی کے ہیں

نرغے میں تین دن سے ہے شکل کشا کا لال
اماں کا باغ ہوتا ہے جنگل میں پائمال
پوچھا نہ یہ کہ کھولے ہیں کیوں تم نے سر کے بال
میں لٹ رہی ہوں اور تمہیں منصب کا ہے خیال
غم خوار تم مرے ہو نہ عاشق امام کے
معلوم ہو گیا مجھے طالب ہو نام کے

انھیں بچوں کے میدانِ جنگ میں جانے میں جب دیر ہوتی ہے تو جناب زینب کی محبت برہمی اور غصے کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس موقع پر طنزیہ انداز اختیار کر کے انیس نے اس منظر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔

خیمے میں یہ باتیں تھیں کہ آئے وہ دلاور
دیکھا کہ الگ بیٹھی ہوئی روتی ہے مادر
ساتھ اپنے انھیں لے کے گئی بانوئے مضطر
کی عرض کہ چھاتی سے لگا لو انھیں خواہر
یہ نورِ نظر لائقِ الطاف و عطا ہیں
تقصیر ہوئی کیا کہ حضور اُن سے خفا ہیں

منہ پھیر کے یہ کہنے لگی شاہ کی ہمشیر!
غیرت کی ہے جا غیر تو ہوں فدیۂ شبیر
منہ پھیریں وہ مقتل سے جو ہوں صاحبِ شمشیر
شکوہ ہے مقدر کا کچھ ان کی نہیں تقصیر
انصاف تو کیجے مجھے کیوں کر نہ گلا ہو
وہ پہلے نہ بے دم ہوں لہو جن میں بھلا ہو

تلواروں میں دم عشق کا بھرتے ہیں وفادار؟
سر دینے میں سبقت کہیں کرتے ہیں وفادار؟
موقع ہو تو دنیا سے گذرتے ہیں وفادار؟
سردار سے پہلے کہیں مرتے ہیں وفادار؟
کھلتا نہیں یہ جوشِ شجاعت انھیں کیوں ہے
حضرت تو سلامت ہیں یہ عجلت انھیں کیوں ہے

میں سمجھی تھی پہلے ہی یہ ڈھونڈھیں گے بہانا
کچھ منہ کا نوالہ نہیں تلواروں کا کھانا
لازم تھا اسی وقت انھیں خیمے میں آنا
سچ ہے کہ وفاداروں سے خالی ہے زمانا
جس تیغ میں تاثیر زبانوں میں نہیں ہے
غیروں میں اب الفت ہے یگانوں میں نہیں ہے

ماں کو تو سبک کر چکے کہنے کی نظر میں
میں لٹ گئی اس رنج و مصیبت کے سفر میں
پوچھے کوئی ان سے کہ یہ کیوں آئے ہیں گھر میں
کھولیں انھیں، باندھے ہیں جو ہتیار کمر میں
فوجوں میں یہی طور تھے خالق کے ولی کے؟
لو ناز ہے اس پر کہ نواسے ہیں علی کے!

یہ صغیر سن بچے جب میدان کو جانے لگتے ہیں تو جن تیوروں سے ماں انھیں رخصت کرتی ہے وہ محبت میں شجاعت اور خاندانی وقار کے ملے جلے جذبات ظاہر کرتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ یہ بچے موت کے منہ میں جا رہے ہیں وہ انھیں انسانی شرافت، وفاداری اور قربانی کا نمونہ بنا کر بھیجتی ہیں اور ان قدروں اور تصوروں کو

سامنے کر دیتی ہیں جو انھیں زندگی سے زیادہ عزیز ہیں۔

نیزوں کی طرف چھاتیاں تانے ہوئے جانا
ہاں تیروں کی بارش میں سپر منہ پہ نہ لانا
ہنس ہنس کے میں قربان گئی برچھیاں کھانا
لازم ہے وہ ہمت کو معرّف ہو زمانا
اس جنگ کا چرچا سحر و شام رہے گا
دُنیا میں اگر تم نہ رہے نام رہے گا

میلے نہ ہوں تیور یہ سپاہی کے ہُنر ہیں
جس کے ہیں بس اُس کے ہیں جدھر ہیں بس اُدھر ہیں
گہ عطر میں ڈوبے ہیں گہے خون میں تر ہیں
صحبت میں مصاحب ہیں لڑائی میں سپر ہیں
وہ اور کسی سے نہ جھکیں گے نہ جھکے ہیں
عزت میں فرق آئے کہ سر بیچ چکے ہیں

دریا کی طرف پیاس میں تکتے نہیں غازی
گر شیر بھی جھپٹے تو سرکتے نہیں غازی
تلواروں میں آنکھوں کو جھپکتے نہیں غازی
بجلی بھی گرے گر تو جھجکتے نہیں غازی
دم ہونٹھوں پہ آئے تو شجاعت نہیں جاتی
مرنے پہ بھی چہرے کی بشاشت نہیں جاتی

جاں ہونٹھوں پہ آجائے اگر پیاس کے مارے
غش کھا کے جو گر پڑیں بھی تو دریا سے کنارے
پانی کو ترستے رفقاء مر گئے سارے
یہ آبِ رواں بند ہے ماموں پہ تمہارے
تلواریں ہیں موجوں کی روانی نہ سمجھنا
دریا ہے لہو کا اُسے پانی نہ سمجھنا

پھر جہاد کرنے کے بعد جب ان بچوں کی لاشیں میدان سے خیمے میں آتی ہیں تو پہلے تو آپ اپنا فدیہ قبول ہونے پر شکر ادا کرتی ہیں لیکن جب اس کے بعد لاشوں پر نظر جاتی ہے تو ماں کی محبت جوش کر آتی ہے۔ صبر کا دامن ہاتھوں سے چھوٹ جاتا ہے اور مامتا کی وہ تصویر سامنے آتی ہے، جو وقت اور مقام کی قید سے آزاد ہے:۔

بانو نے رکھے زانوے زینب پہ سر اُن کے
جو بیبیاں تھیں آگئے منہ کو جگر اُن کے
زینب نے جو کی جھک کے رخوں پر نظر اُن کے
دکھلائی دیئے چاند سے منہ خوں میں تر اُن کے
رخسار بھی مجروح تھے ابرو بھی کٹے تھے
شانے تھے جدا چاند سے بازو بھی کٹے تھے

منہ چھاتیوں پہ رکھ کے یہ ناشاد پکاری
آرام نہیں ہوتا ہے غشی پیاس سے طاری
ہوتا ہے بیاں شوکت و ہمت کا تمہاری
تسلیم کرو قبلۂ کونین کو واری
سب میں کہ یہ باعث ہے یہ بیداریِ شب کا
پیارو یہ طریقہ نہیں اربابِ ادب کا

جنگل میں قیام آج کہاں ہوگا بتاؤ
ماں صدقے مقام آج کہاں ہوگا بتاؤ
دن تم کو تمام آج کہاں ہوگا بتاؤ
بستر سرِ شام آج کہاں ہوگا بتاؤ
ہموار زمیں شب کے بچھونے کو ملے گی؟
کیسی ہے جگہ جو تمہیں سونے کو ملے گی

تاریکی میں واری تمہیں نیند آئے گی کیوں کر
شب ہوگی تو بچوں کو یہ ماں پائے گی کیوں کر
مادر دلِ بیتاب کو سمجھائے گی کیوں کر
واں تک مرے رونے کی صدا جائے گی کیونکر
بکلوں جو تجسس میں تو بے جا نہیں واری
ماں ہوں مرا پتھر کا کلیجا نہیں واری

جناب عون و محمد سے متعلق جناب زینب کے جذبات کے یہ چند مقامات انیس کے یہاں سے پیش کئے گئے جن سے یہ اندازہ کیا

جا سکتا ہے کہ واقعات کربلا کے مختصر دائرے میں بھی انیس نے کرداروں کے باہمی میل جول اور مختلف اوقات میں اُن کے مختلف جذباتی ردِ عمل کی عکاسی کر کے اس میں کتنی وسعت پیدا کی ہے۔ جناب زینب کے اپنے بیٹوں کے تئیں جذباتی ردِ عمل کے ذکر کے لئے یہ تمام مقامات نہیں۔ ان مثالوں میں جناب عون و محمد کے ردِ عمل کی مثالیں ہم نے نہیں لکھی ہیں، ورنہ ان کا سلسلہ اور لمبا ہوتا۔ پھر جناب زینب اور امام حسین کی مختلف اوقات کی گفتگو یا جناب علی اکبر، جناب عباس وغیرہ وغیرہ کے سلسلے میں جناب زینب کے جذبات کی مثالیں دی جائیں تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ بیانات کس قدر طویل ہو سکتے ہیں۔

محدود فضا، محدود وقت اور محدود واقعات میں بھی انیس نے مختلف لوگوں کے مزاج کے اعتبار سے نفسیات انسانی کے بہت سے باریک پہلو بے نقاب کئے ہیں اور اگرچہ سب ہی مرثیہ گویوں کا موضوع وہی واقعات اور وہی کردار ہیں، لیکن انیس نے ان مشترک و معروف واقعات میں ایسے نفسیاتی رنگ اور موڑ پیدا کئے ہیں کہ ان کرداروں کے جذبات و احساسات ان کی شخصیتوں کو ابھار کر اُن کی جذباتی دُنیا کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ یہ احساسات زندگی سے اتنے بھرپور واقعیت سے اتنے قریب اور تئے دن کے تجربات کی کسوٹی پر اتنے سچے اترتے ہیں کہ ان سے انسانی افعال اور برتاؤ سے ہمیں آگاہی ہوتی ہے اور شاعر کے ساتھ بہت سے پڑھنے والے بھی ان جذباتی تجربوں سے گذرتے ہیں جن کی اس نے مصوری کی ہے۔

جذبات انسانی کا بیان اصل میں انسانی زندگی کی تاریخ ہے۔ اُس کی مختلف منزلوں کی عکاسی نہ صرف ماحول کو سامنے کر دیتی ہے بلکہ افراد کے کردار اور اُن کی شخصیت کو نمایاں کرنے میں اس کا اہم حصہ ہوتا ہے۔ آدمی کی شخصیت ان احساسات اور ردِ عمل کا نام ہے جو کہ مختلف حالات میں اس پر گذرتے ہیں۔ ان سے ان کے نظریات کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور نقطۂ نظر کا بھی انیس کا مرثیہ ایک مسلسل اور مربوط نظم ہوتا ہے جو واقعات کربلا میں سے کسی مختصر واقعہ کو ایک اکائی کی طرح پیش کرتا ہے۔ یہ واقعہ کچھ کرداروں کی مدد سے سامنے آتا ہے اور کرداروں کے برتاؤ اور جذباتی ردِ عمل سے ان کی شخصیت کا تعین ہوتا ہے۔ اچھا شاعر جذبات و احساسات کی ترجمانی اس طرح کرتا ہے کہ نہ صرف تصویر میں اصلیت و واقعیت موجود رہے بلکہ وہ ان میں تیور، انداز، اور خیالات کی ایسی لہریں سمو دیتا ہے کہ بیان کئے بغیر کرداروں کے خدوخال، ان کی شائستگی کا معیار، وفاداری، بہادری فرائض کا احساس، محبت و خلوص کی تہیں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ ان باتوں کو مدنظر رکھ کر انیس کے جذباتی مرقعوں کو دیکھئے تو فنی صلاحیتوں میں اُردو کا کوئی شاعر اس پہلو سے ان کے قریب نظر نہیں آتا۔ اُوپر کی مثالوں میں بیشتر گفتگو کے حصے پیش کئے گئے ہیں۔ جن میں زینب ایک بلند نظر ماں کے روپ میں نظر آتی ہیں جو راہِ حق میں اپنے بیٹوں کی قربانی دینے کو سب سے بڑا افتخار سمجھتی ہیں۔ کبھی وہ بیٹوں کی ناگواری سے انجان بن کر اُن کے شوق و شجاعت و جاں سپاری کو تیز کرتی ہیں، کبھی اُن کی برہمی کو بے ادبی اور گستاخی قرار دے کر ان کی فہمائش کرتی ہیں، کبھی اُن کے میدان کو جانے میں دیر ہوتی دیکھ کر طنز کرتی ہیں۔ کبھی اُن کو رخصت کرتے ہوئے عرب کی شجاع خاتون کی صورت میں دس بارہ سال کے بچوں کو بھی مردانگی، عزتِ نفس، ایثار، اور روایات کے احترام کا سبق سکھاتی نظر آتی ہیں۔

آخری مثال میں ماں کی ماتا کی جھلک بھی ہے جس کے بغیر کسی عورت کی تصویر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس آخری رنگ کے بغیر تصویر اس لئے بھی نامکمل رہتی کہ اپنے لاڈلے بچوں کی موت پر جو ماں نہ روئے اُس کے سینے میں عام عورت کا دل نہیں کہا جا سکتا۔ انیس کے کردار شرافت و ایثار، بلند نظری و شجاعت کا نمونہ ہوتے ہوئے بھی عام انسانوں کی طرح دُکھ سے متاثر اور غم سے سینہ ریش ہوتے ہیں وہ دیوتا یا مافوق الفطرت انسان ہی نہیں ہیں جن پر غموں کا اثر ہی نہ ہو، بلکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو مصائب اور غم کو اچھی طرح محسوس کرتے ہوئے بھی انسانی اقدار کی حفاظت کو زندگی کا آدرش مقصد قرار دیتے ہیں اور اصول کو قربان کر کے کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے۔ اُن میں ایسے افراد بھی ہیں جو غصہ میں آگ بگولا ہو جاتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جن

(بقیہ ص ۳۲ پر)

نریش کمار شاد

ترانے

میرا دل

دھڑک رہا ہے مرے دل میں کائنات کا دل
اس اک چراغ سے روشن ہیں بے شمار چراغ
اس ایک ذات میں ہے کائنات بھی شامل
دھڑک رہا ہے مرے دل میں کائنات کا دل
نہیں ہے دل ہی، یہ ایسا ہے اک مہِ کامل
خجل ہے جس سے بہر حال آفتابِ دماغ
دھڑک رہا ہے مرے دل میں کائنات کا دل
اس اک چراغ سے روشن ہیں بے شمار چراغ

کارنامہ

بایں سیاہ نصیبی، بایں شکستہ دلی
جہانِ شب کو پیامِ سحر دیا ہم نے
غموں کے مارے ہوئے ہیں مگر ہے اک یہ خوشی
بایں سیاہ نصیبی، بایں شکستہ دلی
نفس نفس کو تب و تابِ آگہی بخشی
نظر نظر کو شعورِ نظر دیا ہم نے
بایں سیاہ نصیبی، بایں شکستہ دلی
جہانِ شب کو پیامِ سحر دیا ہم نے

المیہ

چراغ بن کے جلے ہیں تمہاری محفل میں
وہ جن کے گھر میں کبھی روشنی نہیں ہوتی
بھنسے ہوئے ہیں جو خود تو عجیب مشکل میں
چراغ بن کے جلے ہیں تمہاری محفل میں
تمہارے غم کو بدلتے ہیں عشرتِ دل میں
خوشی کے وقت بھی جن کو خوشی نہیں ہوتی
چراغ بن کے جلے ہیں تمہاری محفل میں
وہ جن کے گھر میں کبھی روشنی نہیں ہوتی

فرمائش

پھولوں کے تو قابل نہیں شاید مرا دامن
اے صاحبِ گلشن اسے کانٹوں ہی سے بھر دے
ہوتی ہے مجھے دیکھ کے بے شک تجھے الجھن
پھولوں کے تو قابل نہیں شاید مرا دامن
لیکن یہ تغافل کہیں اے صاحبِ گلشن
خود داریٔ احساس کو مجروح نہ کر دے
پھولوں کے تو قابل نہیں شاید مرا دامن
اے صاحبِ گلشن اسے کانٹوں ہی سے بھر دے

محمد عمر

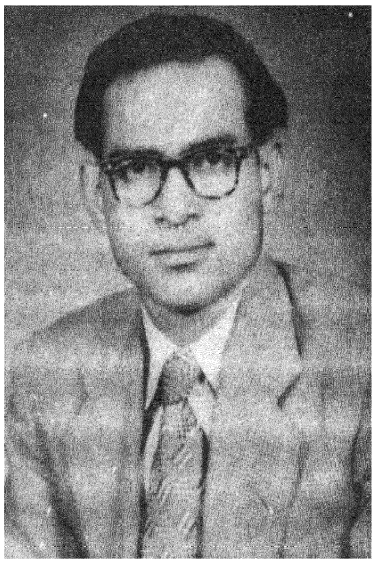

ہندوستان کے بازی گر

(۱)

ہندوستان میں قدیم زمانے سے بازی گری کے فن کا رواج رہا ہے۔ یہاں مختلف قسم کے بازی گر، جادوگر، شعبدہ باز اور نٹ پائے جاتے تھے۔ ان میں کچھ ایسے بھی فن کار تھے، جو سدھائے جانوروں کی مدد سے بازی گری کے کرشمے دکھاتے تھے۔ یہ لوگ نٹ کہلاتے تھے، جس کے معنی سنسکرت میں رقص کرنے والے کے ہیں۔ اسی لفظ سے مشتق لفظ نٹیا (नटया) ہے جس کا مطلب ہے ڈرامہ کرنے والے افراد کی ٹولی۔ اس کا سربراہ گروہ نٹ راج کہلاتا تھا۔ البیرونی نے اس پیشے کے لوگوں کو ایک مستقل ذات شمار کیا ہے۔ مرزا قتیل نے لکھا ہے "نٹ ایک فرقہ ہے۔ یہ سب ہندو مذہب کے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کے باشندے ہیں"[1] ابوالفضل نے مندرجہ بالا گروہوں کا ذکر ہندوؤں کے فرقوں کے ضمن میں کیا ہے[2]

نٹ اور بازی گر

مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد اس فرقے کے لوگوں کے لئے "بازی گر" اور اس فن اور کلا کے لئے "بازی گری" جیسے فارسی لفظوں کا استعمال شروع ہوا۔ مگر ابوالفضل کے بیان سے ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں گروہوں کے کاموں میں معمولی سا فرق بھی پایا جاتا ہے۔ اس نے ان دونوں گروہوں کا شمار "گانے والوں" کے ضمن میں کیا ہے۔ نٹوں کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ وہ لوگ رسّی پر کھیل کرتے تھے اور عجب عجب کام کرتے تھے۔ مجیرہ اور ڈھولک اُن کے ساتھ ہوتی تھی۔ اس کے برخلاف بازی گر اپنی تیز دستی سے عجیب عجیب کام کر دکھاتے تھے اور منتر کے اثر سے تماشائیوں کی نظریں باندھ دیتے تھے۔ چنانچہ کبھی ایسا نظر آتا تھا کہ کھیل کرنے والے کا بند بند جدا ہے مگر پھر وہ اصلی حالت میں آجاتا تھا[3]۔ رفتہ رفتہ روزمرہ کی زبان میں نٹ اور بازی گر دونوں نام ایک ہی معنی میں استعمال ہونے لگے۔ صرف یہ فرق ہوا کہ عوام انھیں نٹ کہتے تھے۔ اور شہروں میں یہی لوگ بازی گر کہلاتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس پیشے کے جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا ہو انھیں بازی گر کہا جاتا ہو، کیوں کہ مسلمانوں نے جو ہندوستانی پیشے اختیار کیے

---

[1] ہفت تماشا ص ۱۸۹

[2] آئینِ اکبری (ا۔ت) جلد دوم ص ۹۷ - ۹۸

[3] آئینِ اکبری (ا۔ت) جلد دُوم ص ۲۲۶ نیز ملاحظہ ہو
Rose: Glossary of Punjab Castes and Tribes, Vol III, PP163-164

یا جن پیشوں کو لے کر وہ اسلام میں داخل ہوئے انھیں فارسی نام دے دیا گیا اور اپنے غیر مسلم ہم قوموں سے ممتاز رکھنے کے لئے ان لوگوں کا وہی قدیم ہندوستانی نام برقرار رکھا۔ مثلاً کوئی نٹ مسلمان ہے تو بازی گر کہلایا۔ اور غیر مسلم ہے تو نٹ۔ کہیں کہیں اُن کو دار باز بھی کہتے تھے۔ مرزا قتیل کا بیان ہے کہ "یہ لوگ ہندوستان کے ہی باشندے ہیں۔ اب دوسری جگہوں پر بھی یہی فن ان لوگوں سے سیکھ کر کچھ لوگ دار باز کے نام سے موسوم ہو گئے ہیں"[1] اسی سلسلے میں مرزا قتیل نے لکھنؤ کے دار بازوں کا ایک واقعہ یوں بیان کیا ہے۔"

" ایک دن فرنگی دوستوں میں ایک شخص پالکی پر بیٹھا ہوا جا رہا تھا کہ ایک دار باز بائیں طرف سے اور ایک دائیں طرف سے ظاہر ہوا اور زمین سے بلند ہو کر پالکی کے اندر ادھر سے اُدھر اس طرح کود کر نکل گیا کہ اُس کا بدن پالکی سے نہیں لگا اور دوسرے ساتھی کی گردن پر جا بیٹھا اگر پالکی ٹھہری ہوتی تو اتنی حیرت اور تعجب کا مقام نہ تھا۔ ہر چند اس صورت میں بھی سوائے دار باز کے اور کوئی شخص ادھر سے اُدھر نہیں پھلانگ سکتا تھا اور کہاروں کے بھاگنے کی حالت میں تو ایسا شعبدہ صوفیوں کے خوارقِ عادات سے کم نہیں ہے یا جادوگر ایسا کر سکتا ہے۔"

اس فرقہ کا ارتقاء

بازی گروں کے اس فرقہ کے نکاس کی تاریخ تاریکی کے پردے میں پوشیدہ ہے۔ مختلف علاقوں کے بازی گر اپنے ارتقاء کی رسمی روایات بیان کرتے تھے۔ امرتسر کے بازی گروں کا بیان تھا کہ وہ لوگ دراصل سیواڑ کے برہمن تھے اور اُن کا کام چتا کے لئے لکڑیاں مہیا کرنا تھا۔ ایک مرتبہ اُن کے فرقہ کے کسی شخص کے ہاں شادی کی تقریب تھی اور چوں کہ اُن کو اس تقریب میں شرکت کرنا تھی لہٰذا اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُن کی غیر موجودگی میں اُن کے والدین میں سے کسی کی وفات ہو جائے اور اُن کو آنے میں دیر ہو جائے اور وہ اپنے فرائض انجام نہ دے سکیں، اس لئے وہ اپنے ساتھ لکڑی بھی لیتے گئے۔ اُن کے والدین نے اس فعل کو بدشگون سمجھا اور شادی کے موقع پر پروہتی کے فرائض انجام دینے سے انکار کر دیا لہٰذا تمام نٹ ایک فقیر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُس سے مدد کی درخواست کی۔ اس فقیر کے پاس ہنومان روپی ایک بندر تھا۔ اس بندر نے ان لوگوں کو پُھرتی اور چستی کے کچھ کرتب سکھائے۔ رفتہ رفتہ یہ لوگ چنگا، بیرو، اور بے نور فروش میں منقسم ہو گئے۔ ایک دوسری روایت یہ بھی ہے کہ یہ لوگ اپنے کاموں کے لحاظ سے کئی پیشہ ور گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ مثلاً سپیرے جادوگر بازی گر بندر کا ناچ دکھلانے والے، عطار یا جڑی بوٹی بیچنے والے۔

ایک عجیب روایت کے مطابق نٹوں کو موجودہ سرمور ریاست کا بانی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں سرمور کے راجا نے ایک نٹنی سے یہ وعدہ کیا کہ اگر وہ رسّی کی مدد سے گرہی ندی کے آر پار اُتر جائے تو وہ اُسے اپنی نصف سلطنت عطا کر دے گا۔ اُس عورت نے ندی پار کر لی اور واپسی کے وقت وہ جب دوسرے کنارے پر پہنچنے ہی والی تھی تو راجا نے اس خوف سے کہ اب اُسے اپنا وعدہ پورا کرنا پڑے گا، رسّی کٹوا دی اور وہ نٹنی پانی میں گر کر غرق ہو گئی۔ اس نٹنی کی موت کی وجہ سے گرہی ندی کو بڑا غصہ آیا اور انتقاماً اس میں باڑھ آ گئی اور راجا کی سلطنت برباد ہو گئی۔ ایک دوسری روایت کے مطابق اس نٹنی کے غرق ہو جانے کے بعد ایک فقیر ناہن پہنچا اور راجا کی دغابازی کے خلاف آواز بلند کی۔ اس وجہ سے اُس فقیر کو محل سے باہر کیا گیا۔ اُس نے ایک غریب برہمنی کے ہاں پناہ لی۔ اُس نے برہمنی کو کھانا لانے کے لئے بھیجا مگر یہ شرط لگا دی کہ یہ کھانا ناہن نہ ہونا چاہئے۔ آدھی رات کے بعد اُس نے دودھ مانگا اور برہمنی نے اُسے دودھ پیش کیا۔ بعد ازیں اُس نے برہمنی سے کہا کہ وہ یہاں سے بھاگ جائے کیوں کہ وہ شہر تباہ ہونے والا ہے۔ وہ عورت مع اپنے بچوں کے گرہی ندی کے اُس پار چلی گئی۔ جوں ہی وہ ندی کے اُس پار پہنچی۔ ندی میں ایک خوفناک طوفان آیا اور راجہ سمیت تمام لوگ پانی میں ڈوب مرے۔ اُس کے بعد نٹوں کی منڈلیاں جیسلمیر چلی گئیں۔ وہاں کے راجا سے اُنھوں نے ایک لڑکا مانگا تاکہ وہ لوگ اُسے سرمور کے تخت پر بٹھائیں۔

[1] ہفت تماشا ص ۱۸۹

راجا کی سات رانیاں تھیں اور اُن میں سے ہر ایک حاملہ تھی۔ راجا نے ایک رانی اُن کے حوالے کر دی۔ اُس رانی کو وہ ناہن لے گئے۔ سرمور تالاب کے قریب اُس کے بطن سے ایک شیر، چار دُوسرے درندے اور ایک لڑکا پیدا ہوا۔ نٹوں نے جانوروں کو جن کے نام، سوتن، چھاٹن، بتیھن، کھرن اور سبھاسو تھے، جنگل میں بھگا دیا۔ اور اس لڑکے کو تخت پر بٹھا دیا اور وہ لڑکا ریاست کا پہلا بادشاہ ہوا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ نٹوں کے فرقے کا پیشوا کبیر داس تھا۔ یہ خیال غالباً اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنا کھیل تماشا دکھاتے وقت کبیر داس کے دوہے گاتے ہیں۔

مُسلمان بازی گر

اس فرقے کے لوگوں نے کس زمانے میں مذہب اسلام قبول کیا، اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔ مگر شمالی ہندوستان میں مسلمان بازی گر بھی پائے جاتے تھے۔ مرزا قتیل کے ایک بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہویں صدی میں اس فرقے کے لوگ مسلمان ہو چکے تھے مگر اس بیان کی تردید اُس روایت سے ہوتی ہے جو بنگال کے بازی گر اپنے بارے میں بیان کرتے تھے۔ ۱۸۳۷ء میں کلکتہ کے بازی گروں کے فرقے کے ایک سردار نے یہ روایت بیان کی کہ دو سو سال قبل غازی پور اور الہ آباد کے علاقے میں چار بھائی رہتے تھے۔ اُن کے نام۔ سَا۔ سَمولا۔ گھوندرا۔ اور مَلّا تھے۔ جب اُن لوگوں نے اپنے ساتھیوں کی، جن کی تعداد کافی تھی اُن علاقوں میں گذر اوقات ہونا مشکل دیکھی تو انھوں نے اس علاقے کو خیرباد کہنے کا مصمم ارادہ کر کے کوچ کر دیا۔ سَا نے مشرق کا، سَمولا نے مغرب کا، گھوندرا نے شمال کا اور مَلّا نے جنوب کا رُخ کیا۔ اس طرح سَا بنگال پہنچا اور ہگلی میں سکونت اختیار کی۔ بہت برسوں تک بڑے اطمینان سے وہ اپنے قبیلہ کا سردار رہا۔ آخر میں بارا سوت کے قریب انور پور میں وہ فوت ہوا اور اس قبیلہ کے لوگوں نے اُس کی پرستش کرنا شروع کر دی اُس کے تین لڑکے تھے اور اُن میں سے ہر ایک نے یکے بعد دیگرے سرداری کی۔ پہلے کا لکھن، دُوسرے کا مومن اور تیسرے کا غازی خاں نام تھا۔ اُن کے بعد غلام خاں، علاؤالدین خاں، سادی خاں، عرب خاں، منوّر خاں مصری مندل خاں اور رجب خاں سردار ہوئے۔ آخر الذکر رجب خاں، مَن بھنگی کا باپ تھا جو ۱۸۳۷ء میں کلکتے میں رہنے والے بازی گروں کا سردار تھا۔

فرقوں میں تقسیم

شمالی ہندوستان کے بازی گر مختلف قسم کے فرقوں میں منقسم تھے۔ بنگال کے بازی گر سات ضمنی شاخوں میں بٹے ہوئے تھے۔ مثلاً چاری، پربھتی، کالکور، دوارکی گنگوار، اور اجھی بنسا۔ مگر ان میں صرف نام ہی کا فرق تھا، کیوں کہ وہ لوگ ساتھ ساتھ رہتے تھے اور ایک ہی قبیلہ کے افراد کی حیثیت سے آپس میں شادی بیاہ کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ وہ لوگ ایک ہی خاندان کے چار بھائیوں کی اولاد ہیں۔

عقائد

یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے کیوں کہ اُن کے ہاں ختنہ کی رسم ادا ہوتی تھی۔ ان کی شادی اور موت کی رسومات قاضی اور مُلّا ادا کرتے تھے۔ بس اسلام سے اُن کا اتنا ہی تعلق تھا۔ اور اس کے آگے وہ مسلمان نہیں تھے۔ اور باقی اُن کی رسمیں وہی تھیں جن پر وہ مسلمان ہونے سے پہلے عمل کرتے تھے۔ وہ توحید کا اقرار کرتے تھے اور اپنی تمام مصیبتوں سے نجات پانے اور امیدیں بار آور ہونے کے لئے اُسی سے ملتجی ہوتے تھے۔ مگر اپنے پیشے میں ترقی کے لئے وہ تان سین (بادشاہ اکبر کے عہد کا ایک مشہور گویّا) سے التجا کرتے تھے۔ کیوں کہ وہ لوگ تان سین کو اپنا سرپرست، خدا یا دیوتا مانتے تھے۔ مختصر یہ کہ اس خانہ بدوش قبیلے کے مذہبی عقائد اور موت کے بعد کی زندگی کے تصورات کی جھلک اُن کے گیتوں میں ملتی ہے۔ یہ گیت کبیر داس کے کلام سے ماخوذ ہیں۔ اور ہر موقع اور محل کے لحاظ سے اُن کو اُس کے اشعار یاد تھے۔

دُنیا کی بے ثباتی کے بارے میں اُن کا یہ تصور تھا۔

مایا مری نہ من مرا مر گیا سریر
آسا تسنا نا مٹی یوں کہت گئے کبیر

وہ وحدۃ الوجود کے فلسفہ پر عقیدہ رکھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا۔ کہ رُوح ہر جگہ جلوہ گر ہے۔ اور اُن کی رُوح اُس "رُوح کُل" کا ایک ذرّہ ہے۔

اور جب اُسے جسمانی قید سے آزادی ملے گی تو وہ "روحِ کُل" میں جذب ہو جائے گی

تفریحی مشاغل اور مذہبی رسومات

بازی گروں کے بہت سے تفریحی مشاغل تھے مگر ان جشنوں کا انحصار ان کی مالی حالت پر تھا۔ اگر اُن کے پاس پیسے ہوتے تو ان موقعوں پر بڑی خوشیاں مناتے اور مرد عورت بچے، بوڑھے اور جوان سبھی دل کھول کر شراب پیتے۔ اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ شراب زندگی کے لئے بہت ہی مقوی غذا ہے۔ دیوتا کو کافی مقدار میں سخت شراب پیش کر کے بڑے سے بڑے جرم کا کفارہ ادا ہو سکتا تھا۔ عموماً ایسا ہوتا تھا کہ جب کسی شخص کے پاس کافی مال اور دولت جمع ہو جاتی تھی تو وہ مجرم سمجھا جانے لگتا تھا اور اس کے خلاف بہت سے الزامات لگائے جانے لگتے تھے۔ آخر کار یہ شکایتیں ایک پنچایت کے روبرو پیش کی جاتی تھیں۔ عام طور پر یہ فیصلہ ہوتا تھا کہ وہ شخص اپنی برادری یا قبیلہ کے تمام لوگوں کو شراب پلائے۔ کیپٹن ڈیوڈ ریچارڈسن نے ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دو شخص اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس نے انھیں معمولی سا انعام دیا۔ ان لوگوں پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ انھوں نے ایک اجنبی کو اُن کے کچھ پوشیدہ راز بتا دیئے تھے لہٰذا رسمی سزا کے علاوہ انھیں زمین پر ناک رگڑنے کی سزا بھی دی گئی تھی۔

اگرچہ کہنے کے لئے یہ لوگ مذہب اسلام کے پیرو تھے مگر اُن کی مختلف تقریبات اور رسموں کی ادائیگی میں برہمن کو بڑا دخل ہوتا تھا جو فنِ نجوم میں پوری قدرت رکھتا تھا۔ بچے کی ولادت کے موقع پر وہ ہی جنم پتری تیار کرتا اور بچے کا نام تجویز کرتا تھا۔

ان کے قاعدے کے مطابق پانچ چھ سال تک بچہ ماں کا دودھ پیتا تھا۔ یہ حیرت کی بات نہیں تھی اور بالعموم ایسا بھی ہوتا تھا کہ پانچ چھ بچے بیک وقت دودھ پینے کے لئے ماں کے سینے سے چمٹے نظر آتے تھے اور اپنے حصے کا دودھ پینے کے لئے آپس میں لڑتے تھے۔ بظاہر اس عورت کی حالت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بچے کے لئے بھی اُس کا دودھ ناکافی تھا۔ کثرتِ اولاد اور جسمانی ورزش، جس کی تعلیم اُن کو طفلی سے ہی دی جاتی تھی۔ اور بے حد شراب نوشی ان بدبخت عورتوں کی عمر کم کر دیتی تھی۔

شادی بیاہ کے رسوم

بازی گروں میں بچپن کی شادی کا رواج نہیں پایا جاتا تھا۔ ہندوستان کے عام رواج کے برخلاف وہ بڑی عمر میں لڑکیوں کی شادی کرتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ رقص و سرود میں عورتوں کو پوری دسترس حاصل ہوتی تھی اور وہ ماں باپ کے لئے دولت سمیٹ جاتی تھیں، اور وہ ہی ذریعہ معاش تھیں۔ عموماً اُن کی لڑکیوں کو آزادی حاصل ہوتی تھی۔ وہ ہندوستان کی دیگر رقاصاؤں کی طرح رقص کرتیں اور گانا بھی گاتی تھیں۔ مگر ان پر منسائیت کی اخلاقی پابندیاں نہیں تھیں، تاہم ان لڑکیوں کی عصمت کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا، جو قلابازی کا ہنر دکھاتی تھیں۔ مگر یہ پابندیاں صرف اُسی وقت تک ہوتی تھیں جب تک دوسری لڑکیاں جوان نہ ہو جاتیں اور بڑی لڑکیوں کے کام نہ سنبھال لیتیں۔ اور تب وہ قلابازی کا کام چھوڑ کر صرف رقص کے لئے مخصوص کر دی جاتی تھیں۔ ناچنے والے مرد اُن عورتوں میں سے اپنا جوڑا منتخب کر لیتے تھے۔ شادی ہونے پر وہ لوگ عوام میں ناچنے گانے کا کام چھوڑ دیتے تھے۔ اس کے بعد وہ نئے طرز کی زندگی شروع کرتے اور ناچنا گانا ترک کر دیتے تھے۔

پورے شمالی ہندوستان میں بازی گروں کے جرگے آباد تھے، اور اس پیشے سے تحصیلِ معاش کرتے تھے۔ اس مختصر سے مضمون میں جگہ کی کمی کی وجہ سے ان سب کا تفصیلی ذکر ممکن نہیں ہے۔ یہاں صرف کلکتہ کے ساکن بازی گروں کا تفصیلی ذکر کریں گے کیوں کہ قدیم زمانے سے سارے ہندوستان میں یہ علاقہ اس فن کے لئے شہرۂ آفاق رہا ہے۔ کلکتہ اور اس کے قرب و جوار میں بازی گروں کے پانچ قبیلے آباد تھے۔ بچوں کے علاوہ، ہر ایک قبیلہ میں بیس سے تیس افراد ہوتے تھے۔ ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا تھا اور قبائلی سرداروں کے اوپر ایک بڑا سردار ہوتا تھا جو نادر

بوٹا کہلاتا تھا۔ ۱۸۰۳ء میں من بھنگی نامی شخص اس عہدے پر فائز تھا۔ ظاہر ہے کہ نام اسلامی نہیں ہے۔

وہ لوگ کسی مقام پر مستقل سکونت اختیار نہیں کرتے تھے۔ بلکہ عارضی جھونپڑیاں بنا کر رہتے تھے۔ یہ جھونپڑیاں سرکی کی چٹائیوں کی ہوتی تھیں جب وہ لوگ ایک مقام سے دوسری جگہ جانا چاہتے تھے تو اُن کو سامان منتقل کرنے میں کوئی زیادہ زحمت نہیں اُٹھانی پڑتی تھی۔ اُن کا گھر اور خانہ داری کا سامان اتنا مختصر ہوتا تھا کہ ایک شخص بڑی آسانی سے اُٹھا کر لے جا سکتا تھا۔

پیشے کی تنظیم قبیلے کا سردار خاص مدت کے لئے اور بالعموم ایک سال کے لئے ایک قبیلے کے افراد کی خدمت حاصل کر لیتا تھا۔ اور اس معاہدے کی مدت پوری ہو جانے کے بعد کسی دُوسری منڈلی میں شریک ہونے کی اُن کو پوری آزادی حاصل ہوتی تھی۔ نادر بوٹا کی بلا اجازت کوئی شخص اپنی منڈلی نہیں بنا سکتا تھا کیوں کہ زر آمدنی میں سے ایک چوتھائی اس کا حصہ ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں ہر منڈلی کی رقاصہ کو بھی دو روپیہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا، اس لئے کہ وہ اپنے قبیلے کے علاوہ کسی غیر شخص کو اپنی طرف ملتفت کر کے روپیہ حاصل کرتی تھی۔ چوں کہ عورتوں پر اخلاقی پابندی نہیں ہوتی تھی، اس لئے ان کے پوشیدہ ذرائع آمدنی بھی تھے۔ جب منڈلیاں کھیل تماشا دکھا کر واپس آتی تھیں تو یہ رقم نادر بوٹا کو ادا کی جاتی تھی اور اس موقع پر وہ اپنے قبیلہ کے تمام لوگوں کو جمع کرتا اور جب تک وہ رقم ختم نہ ہو جاتی اس وقت تک وہ لوگ دل کھول کر کھاتے اور شراب پیتے تھے۔ اگر کسی منڈلی کا کوئی سردار منافع کی رقم غلط بتاتا اور دروغ گوئی سے کام لیتا تو اس موقع پر بڑی پنچایت بلائی جاتی۔ مجرم کو پنچایت کے سامنے بڑی سخت جسمانی سزا دی جاتی۔ عموماً وہ سزا یہ ہوتی کہ مجرم سے کہا جاتا کہ ایک خوب گرم لوہے کی سلاخ پر وہ اپنی زبان رگڑے اور اگر وہ جل جائے تو اُس کا جرم ثابت ہو جاتا تھا۔ بطور جرمانہ عام طور پر اُسے شراب مہیا کرنی پڑتی تھی، جس کی مقدار جرم کے مطابق طے نہیں ہوتی تھی بلکہ جو پنچایت طے کر دے۔ یہ عدالت ایسی نہیں تھی جہاں سے کوئی شخص بری کر دیا جائے۔ اگر شراب فوراً مہیا نہ کی جاتی تو مجرم کو برادری سے خارج کر دیا جاتا۔ اُس کے بعد وہ جہاں کہیں بھی جاتا، ہدف طعن و تشنیع ہوتا۔ یہاں تک کہ اُس کے بیوی بچے بھی اُس کے قریب نہ پھٹکتے تھے۔ اس مظلومی سے تنگ آکر وہ فوراً نادر بوٹا سے سمجھوتہ کرنے کے لئے ملتجی ہوتا اور اُس کے فیصلے کو قبول کر لیتا۔ اگر اُس کے پاس رُوپے نہ ہوتے اور اس کے بھائی بند اُسے قرض دینے سے انکار کر دیتے تو بھی وہ جس طرح ممکن ہوتا روپیہ حاصل کرتا تھا۔ مختصر یہ ہے کہ یہ سزا اتنی سخت ہوتی تھی کہ قبیلہ کا کوئی نفر دروغ گوئی کی ہمت نہ کر سکتا تھا اور اُسے سچ بولنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ بنگال کے علاقے میں اُن کی دیانت داری مشہور تھی مگر حقیقت اُس کے برعکس تھی۔

بازی گری کے پیشے کے علاوہ اُن کے دُوسرے ذرائع آمدنی بھی تھے۔ بہت سے علاقوں میں اور بالخصوص بردوان میں اُن کی زمینیں تھیں اور وہاں وہ بڑی تعداد میں پائے جاتے تھے۔ مگر وہ کاشت کا کام خود نہیں کرتے تھے۔ بردوان کے علاقے کے بازی گروں کا پہلا بڑا سردار چندر کونا تھا۔ بعد کو جوق خاں کی بیوی طوطا سردار بنی۔ دراصل چندر کونا بنگال کے صوبے کے تمام بازی گروں کا سردار تھا مگر کلکتہ کے بازی گروں کا سردار من بھنگی اس دعوے کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اُس کے قبیلے کے لوگ چندر کونا کے مطیع نہیں تھے اور جو لوگ بظاہر اُس کے مطیع تھے بھی، وہ خوف کی وجہ سے۔ وہ خود بھنگی، اور جاتو کے بازی گروں کا سردار تھا۔ مگر من بھنگی اس بات کا اقرار کرتا تھا کہ چندر کونا بھی ایک ہی اسلاف کی اولاد میں سے ہیں اور اس کا علاقہ بردوان اور مرشد آباد تک محدود ہے۔ اس علاقے کے بازی گر من بھنگی کی بلا اجازت اس کے علاقے میں آکر روزی نہیں کما سکتے تھے اور اُن پر بھی ٹیکس ادا کرنا لازمی تھا۔ یہی طریقہ طرف ثانی کی طرف بھی مروج تھا۔ من بھنگی کے علاقے کی کوئی منڈلی طوطا کے علاقے میں بلا اس کی اجازت اور ٹیکس ادا کئے

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

بہاء الدین کلیم

غزلیں

حال میخانے کا بدلا نظر آتا ہے مجھے
کچھ عجب طرح کا نقشا نظر آتا ہے مجھے

رُخِ روشن پہ ترے چھا گئی یوں زلفِ سیاہ
اب اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے مجھے

نامرادی نظر و قلب پہ یوں چھائی ہے
صحنِ گلزار بھی صحرا نظر آتا ہے مجھے

تیری بیگانہ وشی آگئی جس منزل پر
تجھ سے چھٹ جاؤں گا ایسا نظر آتا ہے مجھے

رحم اے سوزِ دروں! آہ میں جل جاؤں گا
ہر طرف آگ کا دریا نظر آتا ہے مجھے

وقت تاریکیِ شب چھٹنے کا آیا شاید
دُور ہلکا سا اُجالا نظر آتا ہے مجھے

تجھ سے چھٹ کر، تری معصوم نگاہی کے نثار
حالِ دل کیا کہوں کیسا نظر آتا ہے مجھے

تیرے وعدے، ترے وعدوں کی وفا اُن کی شکست
سب تماشا ہی تماشا نظر آتا ہے مجھے

لوگ کہتے ہیں کلیم اہلِ نظر ہے، ہو گا
دیکھنے میں تو دِوانا نظر آتا ہے مجھے

منزل و راہ سے وحشت کبھی ایسی تو نہ تھی
جستجو تشنۂ لذت کبھی ایسی تو نہ تھی

آج کیا بات ہے، رہ رہ کے دھڑک اُٹھتا ہے
دلِ مہجور کی حالت کبھی ایسی تو نہ تھی

شمع کجلا گئی دُودِ پرِ پروانہ سے
نُور پر یورشِ ظلمت کبھی ایسی تو نہ تھی

چھوڑ کر اپنے وفا کیشوں کو اے جانِ کرم
غیر پر تیری عنایت کبھی ایسی تو نہ تھی

غیر بھی رونے لگے ہیں مری مہجوری پر
سَرد بازاریِ اُلفت کبھی ایسی تو نہ تھی

تجھ کو اے یادِ وطن! کوئی خبر ہو شاید
چشمِ خونبار کی رنگت کبھی ایسی تو نہ تھی!

ہائے اے بلبلِ بربادِ چمن! ہائے کلیم!
جیسی اب ہے تری حالت کبھی ایسی تو نہ تھی

کشمیر میں تعلیم کا فروغ

غلام نبی طوری

بیرونی سیاح جب کشمیر پہنچتا ہے تو کمرگ اور پہلگام کے بعد اُس کی ڈائری میں مغل باغات کی سیر کے ورق سرسراہٹ مچانے لگتے ہیں۔ شالیمار باغ کے ساتھ رنگین مزاج شہنشاہ جہانگیر اور اُس کی خوبصورت بذلہ سنج اور باتدبیر ملکہ نورجہاں کے رُومان انگیز نام وابستہ ہیں۔ شالیمار کی طلسماتی اور پُراسرار فضاؤں میں سیلانی ماضی کی داستانوں میں کھو سا جاتا ہے اور اُس کے پردۂ چشم کے آگے اُن طرب خیز مناظر کی پرچھائیاں اُبھرنے لگتی ہیں۔ جب اِس راحت افزا باغ میں بادشاہی عیش و حسن کی شوخیاں، اور عشق کی بے باکیاں مِل جل کر ایک جشنِ مسرت کی بساط سجاتے تھے۔ بہت کم سیاحوں کو یہ خیال رہتا ہے کہ اس باغ کے پیچھے کچھ ہی دُور کشمیر کے ماضی کی اگر اس سے زیادہ رُومان انگیز نہیں تو بھی بہرحال اُس سے زیادہ شاندار اور قابلِ فخر یادگار کے آثار موجود ہیں۔ یہ ہارون کی قدیم یونیورسٹی ہے جس کے معلّم اعظم بدھ فلسفے کے شہرہ آفاق شارح اور ترجمان ناگ ارجن تھے۔ یہ ایک اقامتی یونیورسٹی (RESIDENTIAL CAMPUS) تھی اور اسکی

اس قدر دھوم مچ گئی تھی کہ علم و حکمت کے اس سرچشمہ سے سیراب ہونے کے لیے چین، وسط ایشیا بلکہ مشرقِ بعید کے بعض ممالک سے تشنگانِ علم آتے تھے۔ ملک کے دوسرے حصّوں سے آنے والے طلباء کی تعداد تو زیادہ ہوتی ہی تھی۔ ان دنوں جو سیاح کشمیر آئے، انھوں نے اس مخزنِ علم کے معیار اور اس کی پاکیزہ فضا کا ذکر نہایت شاندار الفاظ میں کیا ہے۔

کشمیر میں علم کی یہ روایت مختلف سیاسی اور سماجی عوامل کے سبب اگرچہ کمزور پڑی تھی لیکن دورِ شاہجہانی میں بھی اس میں اس قدر دم موجود تھا کہ تخت کا نامزد وارث اور علم و حکمت کا رسیا شہزادہ داراشکوہ کشمیر آکر ملّا شاہ جیسے اُستاد کے سامنے اُس کے مکتب میں زانوے ادب تہہ کرتا تھا۔ ملّا شاہ کے اس مکتب کے آثار آج بھی کوہِ ماران کے جنوبی حصّے میں موجود ہیں۔ اس مکتب کی تنظیم افلاطون کے مشہور جہاں باغ دانش Academy کے طرز پر کی گئی تھی، پر اسے کشمیر کی علمی روایت کا ایک تابندہ گہر سمجھا جانا چاہیے

غلامی کے زمانے میں قدرتی طور پر کشمیر کی علمی روایت کا چراغ تقریباً گل ہو کے رہ گیا۔ جبر و استبداد اور معاشی بدحالی کے چکر میں پھنس کر اگر سعدی شیرازی کے الفاظ میں یارانِ دمشق عشق فراموش کر سکتے ہیں تو کشمیری اگر علم سے کنارہ کش ہو گئے تو اس میں تعجب کا مقام نہیں۔ صورتِ حال اس قدر خراب ہوئی کہ ریاست ملک بھر میں تعلیمی لحاظ سے پسماندہ ترین علاقوں میں شمار کی جانے لگی۔ ایک وقت تو ایسا بھی آیا جب رائے عامہ اور حالات کے دباؤ کے تحت راجواڑہ شاہی کشمیریوں کو بعض ملازمتیں عطا کرنے کے لئے آمادہ کرم ہو گئی لیکن یہاں موزوں تعلیمی قابلیت کے امیدوار چراغ لے کر بھی ڈھونڈھنے سے ہاتھ نہ آتے تھے۔ ان ہی مایوس کن حالات میں ۱۹۴۷ء میں آزادی کا سورج طلوع ہوا۔ اُس وقت ریاست کا کُل تعلیمی بجٹ ۳۳ لاکھ ۹۴ ہزار روپے تھا۔ چنانچہ عوامی حکومت نے اپنی توجہ کا سب سے پہلا مرکز اسی اہم شعبے کو بنایا۔ اس زبردست توجہ اور ترجیح کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج اکیس سال کے بعد تعلیمی میدان میں ریاست کی کایا پلٹ گئی ہے۔ اس تفصیل کو سمیٹنے کے لئے بہتر یہ ہوگا کہ حاشیہ آرائی کے بدلے ٹھوس اور مستند اعداد و شمار کے آئینے میں اس تعلیمی انقلاب کا ایک نقش اُتارنے کی کوشش کی جائے۔

اس تعلیمی انقلاب کا اہم ترین عنصر ریاستی حکومت کا وہ جرأت

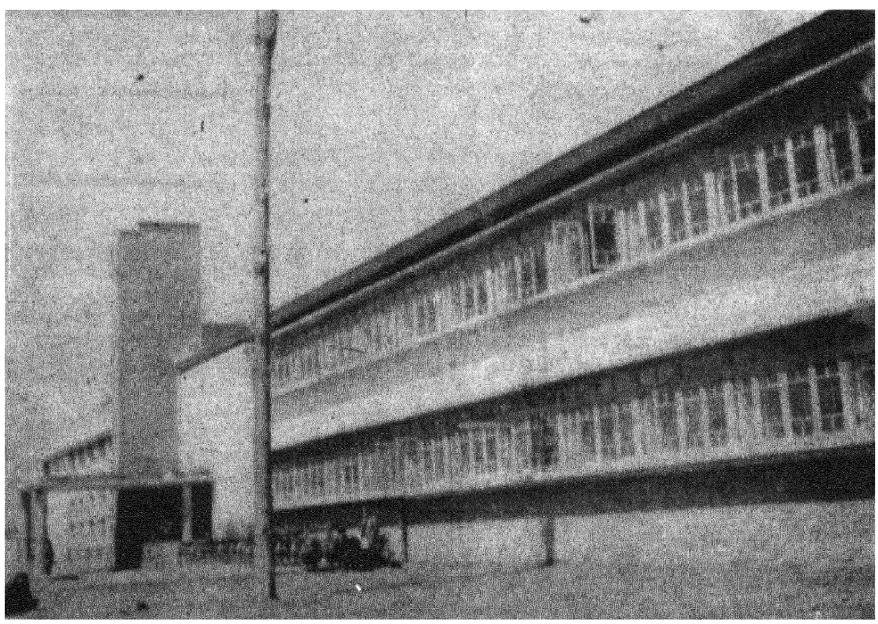

سرینگر میڈیکل کالج کی نئی عمارت

منزانہ اقدام ہے جس کے تحت کینڈرگارٹن سے یونیورسٹی سطح تک کی تعلیم کو بالکل مفت بنا دیا گیا ہے۔ جس وقت یہ اقدام کیا گیا، اُس وقت ملک بھر کے رجعت پسند حلقوں کی بھوئیں تن گئی تھیں۔ لیکن ریاست کے مخصوص مسائل نے ہماری حکومت کو اُس فیصلے پر استقلال سے عمل کرنے کا حوصلہ بخشا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج چھ سے گیارہ سال کی عمر کے ۶۷ فی صد بچے ریاست کے اسکولوں میں زیرِ تعلیم ہیں۔ حالاں کہ تیسرے پانچسالہ منصوبے کے لئے صرف ساٹھ فیصدی کا نشانہ مقرر تھا۔ خود تعلیمی بجٹ میں جو اضافہ ہوا ہے اُس کا اندازہ اس بات سے ہوگا کہ پچھلے سال اس شعبے کے لئے چھ کروڑ اکیاسی ہزار روپے مخصوص کئے گئے تھے۔

ریاست کا یہ تعلیمی انقلاب پرائمری سطح سے یونی ورسٹی کی سطح تک ہر مرحلے پر اپنے نقوش سے پہچانا جا سکتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ریاست میں پرائمری اسکولوں کی تعداد صرف گیارہ سو نوّے تھی۔ ۱۹۶۸-۱۹۶۸ء میں یہ تعداد پانچ ہزار ایک سو ساٹھ تک پہنچ گئی ہے۔ اس طرح سے صرف اس مد میں انتہائی غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔

۱۹۴۷ء میں مڈل اسکولوں کی تعداد ۲۰۳ تھی۔ یہ تعداد ۱۹۶۸-۶۷ء میں ۵۲۳ تک پہنچ گئی۔ اس مد میں اضافے کا تناسب پانچسو فیصدی رہا۔ ریاست میں سیکنڈری طریقۂ تعلیم کو خاصی اہمیت دی گئی ہے، اور یہ اسکول تعلیم کو کتابی بنانے کے بجائے عملی بنانے میں اہم حصّہ ادا کر رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں یہاں ہائی اسکولوں کی تعداد ۵۴ تھی۔ لیکن اب یہ تعداد ۴۲۷ تک پہنچ گئی ہے۔ اور اُن میں ۱۴ سے ۱۷ سال تک کی عمر کے ۴۲ ہزار طلبا زیرِ تعلیم ہیں۔

کالجوں کی تعداد ۱۹۴۷ء میں صرف چار تھی۔ جن میں کوئی تین ہزار کے قریب طلبا پڑھتے تھے۔ اس وقت ۱۷ کالج قائم ہیں۔ جن میں خواتین کے چار کالج بھی شامل ہیں۔ پیشہ ورانہ تعلیم دینے والے کالجوں، جن میں میڈیکل کالج، انجینئرنگ کالج، ڈو زراعتی کالج ایک آیورویدک کالج، ایک طبیہ کالج، ڈو پالی ٹیکنیک اور سات انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ شامل ہیں، میں بھی ہزاروں نوجوان زیرِ تربیت ہیں۔ اُس کے علاوہ اُستادوں کی تربیت کے لئے کئی ٹیچرس کالج بھی قائم ہیں۔

ہارون کی قدیم یونی ورسٹی جھیل ڈل کے مشرقی کنارے پر واقع تھی۔ اس جھیل کے مغربی کنارے پر جدید کشمیر کی ایک نئی دانش گاہ اُبھر آئی ہے۔ جموں و کشمیر یونی ورسٹی اب ایک مکمل تدریسی ادارہ ہے، جس میں ۲۱ شعبوں میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم دینے کے انتظامات موجود ہیں ——— اس کے علاوہ ریاستی طلبا کی ایک بہت بڑی تعداد سرکاری خرچے سے ملک اور بیرونِ ملک میں تعلیم کے مختلف شعبوں میں اعلیٰ تعلیم اور تربیت حاصل کر رہی ہے اور اُن میں سے بعض کی ذہانت ابھی سے چکا چوند پیدا کر کے اقبال کے اس شعر کی پیش گوئی پوری کر رہی ہے ؎

چھپے رہیں گے زمانے کی آنکھ سے کب تک
گہر ہیں آبِ دُر کے تمام ریگ دانے

ریاست میں ۱۹۴۷ء میں خواندگی اوسطاً چھ فیصد تھی۔ اس وقت یہ گیارہ فی صد تک پہنچ گئی ہے اور بہت جلد وہ دن آئے گا جب کشمیر ملک کے تعلیمی نقشے پر ایک معزز مقام حاصل کرے گا۔

آج کل کا جنوری کا شمارہ "نظم نمبر" ہوگا۔
ایجنٹ حضرات اپنی زائد ضروریات سے
بذریعہ منی آرڈر فوراً مطلع کر دیں

غزل

عابد مناوری

اتنے چہروں میں نہیں کوئی شناسا اپنا
اس سنہری دُنیا میں اک شخص تو ہوتا اپنا

کھو گئے بھول بھلیوں میں ترے کوچے کی
ورنہ کچھ اور ہی تھا آج ارادا اپنا

ہم تھے بہروپیے دُنیا کا اُڑاتے تھے مذاق
لوگ دیکھا کیے خوش ہو کے تماشا اپنا

اتنی دُشوار نہ تھی منزلِ مقصود مگر
ہم نے دانستہ بدل ڈالا ہے رستا اپنا

لوگ کرتے رہے نظارہ لبِ دریا سے
ڈگمگاتا رہا موجوں میں سفینا اپنا

دل کے آئینے میں جب غور سے دیکھا عابد
اجنبی سا نظر آیا ہمیں چہرا اپنا

بقیہ: انیس کی جذبات نگاری

کے دل میں عہدہ و امتیاز کی خواہش انگڑائیاں لیتی ہے جو ٹھنڈی ہوا سے لطف اٹھانا بھی جانتے ہیں اور ساغرِ آب کی تسکین سے واقف بھی ہیں۔ دُوسرے الفاظ میں اُن کے احساسات و جذبات میں عام انسانوں کی خوشی اور غم کی لہریں اُٹھتی ہیں۔ ان سب کے الگ الگ جذبات مختلف اوقات میں انیس نے پیش کئے ہیں۔ ان کے مدارج اور عمر کا فرق نازک پہلوؤں سے سامنے لائے ہیں کہ بچوں، بوڑھوں، جوانوں، عورتوں مردوں کی یہ جماعت اپنے ارادوں، حوصلوں، عقاید اور احساسات کے ساتھ ابھر کر آجاتی ہے۔ زمانی اور تاریخی حالات کے فرق کے باوجود جذبات اور محسوسات کی دُنیا میں کچھ ایسے مشترک عناصر مل جاتے ہیں جو ماضی کو حال میں کھینچ لاتے ہیں، فاصلوں کو مٹا دیتے ہیں اور ہم آہنگی کی وہ فضا پیدا ہو جاتی ہے جو ادب کے آفاقی اور ابدی پہلوؤں کو نمایاں کرتی ہے۔

بقیہ: ہندوستان کے بازی گر

روزی نہیں کما سکتی تھی۔

جو بازی گر ان تنظیموں سے علیحدہ تھے وہ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے اور بڑی دقتوں سے تحصیل معاش کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ بچوں کے کھلونے بھی بیچتے تھے۔ یہ کھلونے یا تو وہ خود بناتے یا بازاروں سے خرید لیتے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر میلوں ٹھیلوں اور دیہات کے بازاروں سے روزی کماتے تھے۔

یہ بازی گر فرقے خانہ بدوش بازی گر قبیلوں سے زیادہ مہذب تھے، حالانکہ انھوں نے بھی مذہب اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کا کھانا پینا اور لباس مسلمانوں جیسا تھا۔ ان کی بعض عورتیں بہت خوبصورت ہوتی تھیں اور ان کے ڈھیرے قابلِ توجہ تھے مگر تہذیب کے معاملے میں پچھڑے ہوئے تھے۔ (باقی آئندہ)

ابراہیم یوسف

قدم قدم اداس موڑ

افرادِ تمثیل :

پروین	:	لیڈی ڈاکٹر
ناظمہ	:	پروین کی چھوٹی بہن
وحید بیگ	:	پروین کے والد
آصفہ بیگم	:	پروین کی والدہ
منظر حسین	:	ایک نوجوان، پروین کا منگیتر
کلکرنی	:	پروفیسر آف سرجری، اس خاندان کا دوست

منظر :

ڈاکٹر پروین کا ڈرائنگ رُوم، جس میں قیمتی فرنیچر رکھا ہے۔ خوبصورت پردے لگے ہیں اور بیش قیمت قالین بچھا ہے۔ کونے کی ایک ٹیبل پر ٹیلیفون رکھا ہے۔ اسی کے پاس ایک کھڑکی ہے، جس میں سے دُور تک کا منظر اور ایک سڑک نظر آتی ہے۔ کمرے کی سجاوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ باذوق اور کھاتے پیتے ہیں۔

دن کے گیارہ بجے ہیں۔ ناظمہ ایک گلدان میں بونہی بے مقصد پھول برابر کر رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر کلکرنی اور لیڈی ڈاکٹر پروین کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ (کلکرنی، ناظمہ کو دیکھ کر)

کلکرنی : ہلو ناظمہ !

ناظمہ :۔ (کلکرنی کو دیکھ کر) ڈاکٹر صاحب آداب عرض ہے۔

کلکرنی :۔ (مسکرا کر) خوش رہو۔ (پروین کی طرف دیکھ کر) پروین! اب تم آرام کرو (ناظمہ کی طرف دیکھ کر) ناظمہ بیٹی! پروین کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔ یہ رات بھر جاگتی رہی ہے

ناظمہ :۔ بہت اچھا ڈاکٹر صاحب!

کلکرنی :۔ (پروین کا کاندھا تھپتھپا کر) ڈاکٹر! ہمیں اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہئے۔ (مسکرا کر) اگر ہمارا اپنے جذبات پر قابو نہ ہوگا تو ہم علاج کیا کریں گے۔

پروین :۔ اُسے ہر حالت میں زندہ رہنا چاہئے، ڈاکٹر صاحب۔ ہر حالت میں۔

کلکرنی :۔ آپریشن کیا ہے خدا بہتر صورت پیدا کرے گا۔ موت اور زندگی تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔

پروین :۔ مگر ڈاکٹر صاحب.....

(پروین کی آواز رُندھ جاتی ہے اور آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ڈاکٹر کلکرنی پھر اس کا کاندھا تھپتھپا کر بزرگانہ انداز میں)

کلکرنی :۔ خدا پر بھروسہ رکھو ڈاکٹر۔ تم نے تین راتیں اُس کے سرہانے

گزار دیں نرس سے بڑھ کر خدمت کی اس سے بڑھ کر ایک ڈاکٹر اور کیا کر سکتا ہے (ناظمہ کی طرف دیکھ کر) دیکھو بیٹی۔ اب اس کے مکمل آرام کا بندوبست کر دو (پھر پروین کی طرف دیکھ کر) میں نے ڈاکٹر عصمت کو پابند کر دیا ہے وہ وہاں رہیں گے اور ہر گھنٹے تمہیں اطلاع دیتے رہیں گے (محبت آمیز لہجے میں) جاؤ اب تم آرام کرو۔

پروین:۔ بہت اچھا ڈاکٹر صاحب۔

کلکرنی:۔ اچھا خدا حافظ۔ دیکھو آرام کرنا۔ ویسے پریشانی کی کوئی خاص بات نہیں ہے۔

(ڈاکٹر کلکرنی کمرے سے چلا جاتا ہے۔ پروین بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگتی ہے۔

ناظمہ اُس کا چہرہ دیکھ کر)

ناظمہ:۔ آہا! آپ آرام کیجئے۔ دیکھئے تو آپ کی آنکھیں سُرخ ہو رہی ہیں (پروین کوئی جواب نہیں دیتی اسی طرح کمرے میں ٹہلتی رہتی ہے (ناظمہ کچھ دیر خاموش رہ کر) منظر بھائی کا تار آیا ہے۔

پروین:۔ اچھا۔

ناظمہ:۔ وہ ابھی آنے والے ہیں آپا جی انھیں رسیو کرنے اسٹیشن گئے

پروین:۔ ہوں (رسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کر کے) ہلو — کون ہے؟ مس کٹی: میں ڈاکٹر پروین بول رہی ہوں۔ اب حالت کیسی ہے؟ بے ہوش ہے: ابھی ہوش نہیں آیا؟ ڈاکٹر عصمت موجود ہیں اچھا اچھا کوئی خاص بات ہو تو مجھے فون کرنا۔

(رسیور رکھ کر ایک آرام کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ ناظمہ کچھ دیر خاموش رہ کر)

ناظمہ:۔ آپا: آپ کچھ دیر آرام کر لیجئے۔ منظر بھائی کے آنے پر میں آپ کو جگا دوں گی۔

پروین:۔ (آنکھیں کھول کر ناظمہ کو دیکھ کر) کب آ رہے ہیں؟

ناظمہ:۔ (پروین کا چہرہ غور سے دیکھ کر) ابھی۔ آپا جی انھیں رسیو کرنے اسٹیشن گئے ہیں (پروین خاموش رہتی ہے اور آنکھیں بند کر لیتی ہے) میں نے اُن کے ٹھہرنے کا انتظام آپ کے کمرے کے پاس والے کمرے میں کر دیا ہے (پروین کوئی جواب نہیں دیتی۔ ناظمہ پھر اُس کا چہرہ غور سے دیکھ کر) آخر آپا آپ کو ہو کیا گیا ہے؟

پروین:۔ کچھ نہیں ناظمہ۔ (کھڑی ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگتی ہے۔ پھر اپنے آپ سے) اسے زندہ رہنا چاہیئے۔

ناظمہ:۔ لیکن آپا۔

پروین:۔ (سوچتے ہوئے) یہ ڈاکٹروں کے ساتھ ناانصافی ہے کہ مریض مرض سے لڑنا چھوڑ دے تنہا ڈاکٹر مرض سے نہیں لڑ سکتا۔

ناظمہ:۔ آپا اسپتال میں ہزاروں مریض روزانہ آتے ہیں۔ ڈاکٹر اُن کے لئے یوں پریشان تو نہیں ہوتے۔

پروین:۔ ہاں ناظمہ۔ مگر یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ وہ زندہ رہے۔

ناظمہ:۔ خدا آپ کی خواہش پوری کرے گا مگر —

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ پروین تیزی سے رسیور اُٹھاتی ہے۔ اُس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ چہرے پر پریشانی کے آثار اور گہرے ہو جاتے ہیں)

پروین:۔ ہلو۔ میں ڈاکٹر پروین بول رہی ہوں۔ جی۔ (ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر ناظمہ سے) آپا جی کہاں ہیں؟

ناظمہ:۔ اسٹیشن گئے ہیں۔

پروین:۔ (ماؤتھ پیس پر سے ہاتھ ہٹا کر) اسٹیشن گئے ہیں۔

(رسیور رکھ دیتی ہے۔ ناظمہ پروین کا چہرہ دیکھ کر)

ناظمہ: کس کا فون تھا؟

پروین:۔ جانے کس کا تھا۔ شاید آپا جی کا پوچھ رہا تھا۔

ناظمہ:۔ آپ اس قدر پریشان ہیں کہ — آپ تھوڑی دیر آرام کر لیجئے تھکاوٹ دُور ہو جائے گی۔ (مسکرا کر) آپ کے اس طرح پریشان ہونے سے مریض اچھا تو نہیں ہو جائے گا۔

پروین:۔ ہاں ناظمہ تم سچ کہتی ہو مگر — (خاموش ہو کر دروازے کی طرف بڑھتی ہے پھر پلٹ کر ناظمہ کو دیکھ کر) میرا فون آئے

تو فوراً مجھے اطلاع کر دینا۔

ناظمہ بہت اچھا۔ (پروین دروازے کی طرف بڑھتی ہے۔ ناظمہ چند سیکنڈ خاموش رہ کر) آپا۔ (پروین پلٹ کر سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہے) وہ مریض ہے کون؟

(پروین کچھ دیر اس طرح خاموش رہتی ہے، جیسے جواب دینے کے لئے خود کو تیار کر رہی ہو پھر آہستہ سے)

پروین: وہ ایک لڑکی ہے۔

ناظمہ:۔ (حیرت سے) لڑکی! (پروین اثبات میں سر ہلاتی ہے) کون لڑکی ہے وہ؟

پروین:۔ انجم (ناظمہ سوالیہ نظروں سے پروین کو دیکھتی رہتی ہے۔ پروین کچھ دیر خاموش رہ کر) جسے دیکھنے شاید تمہارے منظر بھائی آرہے ہیں۔

ناظمہ:۔ (حیرت سے) اُسے دیکھنے! لیکن انجم اور منظر بھائی۔

پروین:۔ کالج کے زمانے میں وہ اُن کی گہری دوست تھی۔

ناظمہ:۔ اس سے محبت کرتے تھے؟ مگر وہ تو آپ سے۔۔۔۔۔

پروین:۔ ہاں۔ مگر۔ شاید۔

ناظمہ:۔ کیا اُن سے۔۔۔۔۔۔

پروین:۔ میں اُن سے بہت محبت کرتی ہوں اور اسی لئے چاہتی ہوں کہ اُن کو ہر وہ چیز مل جائے جو وہ چاہتے ہیں۔

(ناظمہ حیرت سے اس کا چہرہ دیکھتی ہے۔ پروین آہستہ آہستہ قدموں سے کمرے سے چلی جاتی ہے۔ ناظمہ حیرت زدہ کمرے میں کھڑی رہ جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد آصفہ بیگم کمرے میں آکر)

آصفہ بیگم:۔ ناظمہ! (ناظمہ پلٹ کر آصفہ بیگم کو دیکھتی ہے) یہاں کیا کر رہی ہو؟ منظر میاں کے لئے کمرہ تیار کرا دیا؟

ناظمہ:۔ جی ہاں! وہ تو صبح ہی تیار کرا دیا تھا۔

آصفہ بیگم:۔ پروین کہاں ہے؟ اسپتال سے واپس آگئی؟

ناظمہ:۔ جی ہاں! ابھی ابھی آئی ہیں۔ بہت تھکی ہوئی تھیں۔ اپنے کمرے میں آرام کرنے چلی گئی ہیں۔

آصفہ بیگم:۔ رات ڈیوٹی کرنے کے بعد اب گیارہ بجے تک وہاں کیا کرتی رہی؟

ناظمہ:۔ کوئی اہم کیس تھا صبح آپریشن کے بعد واپس آئی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب انھیں چھوڑنے آئے تھے۔

آصفہ بیگم:۔ کون ڈاکٹر صاحب؟

ناظمہ:۔ ڈاکٹر کلکرنی۔

آصفہ بیگم:۔ (غور سے ناظمہ کا چہرہ دیکھ کر) لیکن تو اس قدر پریشان کیوں ہے؟ (ناظمہ خاموش رہتی ہے) ابھی تک تیرے والد اسٹیشن سے نہیں لوٹے؟ (گھڑی دیکھ کر) ساڑھے گیارہ بجے والے ہیں۔ گیارہ بجے کا کہہ گئے تھے۔

ناظمہ:۔ گاڑی لیٹ ہو گئی ہوگی۔ (کچھ دیر بعد) منظر بھائی کا تار سے پہلے کوئی خط آیا تھا؟

آصفہ بیگم:۔ نہیں (ناظمہ کا چہرہ غور سے دیکھ کر) کیا بات ہے؟

ناظمہ:۔ کوئی بات نہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ اس طرح یکایک آنے کا کیا مطلب ہے؟

آصفہ بیگم:۔ حیرت کی کیا بات ہے۔ کئی مہینوں سے نہیں آیا تھا۔ فرصت ہو گئی تو آرہا ہے۔

ناظمہ:۔ (سوچتے ہوئے) کیا سچ مچ وہ پروین آپا کو چاہتے ہیں؟

آصفہ بیگم:۔ سچ مچ کی کیا بات ہے؟ اب تو بات ہی پکی ہو گئی ہے۔ خدا نے چاہا تو دسمبر جنوری تک شادی ہو جائے گی۔ (ناظمہ کا چہرہ دیکھ کر) تجھے یہ فکر کیوں پڑ گئی؟

ناظمہ: کچھ نہیں امّی۔ میں نے ایسے ہی پوچھ لیا۔

آصفہ بیگم:۔ مگر پروین ہے بہت غیر ذمہ دار۔ آج تو اُسے جلدی آجانا چاہئے تھا۔ اچھا ہوتا کہ وہ تیرے والد کے ساتھ اسٹیشن چلی جاتی۔

ناظمہ:۔ وہ اپنے فرض کو دُنیا کی ہر چیز پر مقدم سمجھتی ہیں۔ ایک جاں بلب مریض کو کیسے چھوڑ سکتی تھیں۔

آصفہ بیگم:۔ یہ تو اسپتال ہے۔ روز ہی متعدد جاں بلب مریض آتے

اور جاتے رہتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر یونہی اُن کی گنتی کرتے رہیں تو زندگی حرام ہوجائے (مسکراکر) اور ڈاکٹر خود مریض بن جائے۔

ناظمہ:۔ کچھ مریض ڈاکٹر کی نظروں میں خصوصی توجہ کے لائق ہوتے ہیں۔ شاید کوئی۔

آصفہ بیگم:۔ (بات کاٹ کر) اور ہاں ڈاکٹر کلکرنی کو فون کردے کہ آج رات کھانا یہیں کھائیں۔ منظر سے بھی ملاقات ہوجائے گی۔

ناظمہ:۔ (فون کی طرف بڑھتے ہوئے) بہت اچھا۔

آصفہ بیگم:۔ اور ہاں دیکھ مسز کلکرنی کا ضرور کہہ دینا (مسکراکر) بڑھیا کی باتیں بڑی چٹخارے دار ہوتی ہیں۔

ناظمہ:۔ مگر امّی وہ خالص ویجی ٹیرین ہیں۔

آصفہ بیگم:۔ ایک دن ویجی ٹیرین کھانا ہی کھالیں گے تو کہاں کا غضب ہوجائے گا اور ہاں آج کی ساری ذمہ داری تیری ہے۔

ناظمہ:۔ مگر امّی:۔۔۔

آصفہ بیگم:۔ (بات کاٹ کر) میں آخر کب تک دیکھ بھال کرتی رہوں گی۔ تم لوگوں کو بھی تو کچھ سیکھنا چاہیئے تم تو میز پر ایسے آکر بیٹھ جاتی ہو جیسے مہمان ہو۔ اور تو ذرا محنت سے کہہ دینا آج کھانے میں کوئی بے پروائی نہ ہو۔ اس روز ڈاکٹر عصمت کی دعوت پر سائے مُرغ کا ستیاناس کردیا تھا۔

ناظمہ:۔ (مسکراکر) سب اُس کے موڈ کی بات ہوتی ہے۔

آصفہ بیگم:۔ ایسا بھی موڈ کیا۔ اُس کی بعض وقت کی غیر ذمہ داری سے مہمانوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ (باہر موٹر کا ہارن) وہ آگئے (کھڑکی سے جھانکتی ہیں پھر پلٹ کر ناظمہ سے) اور دیکھو منظر کے سامنے اپنی زبان پر قابو رکھنا۔ قینچی کی طرح چلتی ہے تو رُکنے کا نام نہیں لیتی۔ (کچھ دیر بعد آگے وحید بیگ اور اُن کے پیچھے منظر حسین آتا ہے۔ منظر آصفہ بیگم کو جھک کر سلام کرتا ہے)

خوش رہو منظر میاں۔ اچھے تو ہو؟

منظر:۔ دُعا ہے آپ کی (مسکراکر ناظمہ کی طرف دیکھتا ہے) ناظمہ بیگم آپ کا مزاج کیسا ہے؟

ناظمہ:۔ مہربانی اور دُعا ہے آپ کی۔

(ناظمہ غور سے منظر کا چہرہ دیکھتی ہے جیسے اُس کے چہرے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کررہی ہو۔ منظر اُسے اپنا چہرہ یوں غور سے دیکھتے ہوئے مسکراکر)

منظر:۔ کیا بات ہے؟ (ہنس کر) کسی ڈاکٹر نے میرے چہرے پر پلاسٹک سرجری تو نہیں کی ہے۔

ناظمہ:۔ جی نہیں! (بات ٹالنے کے انداز میں) میں دیکھ رہی تھی کہ یہ مونچھیں۔۔۔۔۔

منظر (ہنس کر) کب آگ آئیں۔ بھئی یہ ایک لمبی کہانی ہے پھر کبھی سُنائیں گے (مسکراتے ہوئے) بچوں کو ڈرانے کے لئے نہیں ہیں۔

وحید بیگ:۔ پروین کہاں ہے؟

ناظمہ:۔ ابھی ابھی اسپتال سے آئی ہیں۔ بہت تھک گئی تھیں تھوڑی دیر کے لئے اپنے کمرے میں آرام کرنے چلی گئی ہیں۔

وحید بیگ:۔ آس کی نائٹ ڈیوٹی تھی۔ نائٹ ڈیوٹی کے بعد تو وہ بہت ہی سویرے واپس آجاتی ہے۔

ناظمہ:۔ جی ہاں! کوئی اہم کیس تھا اُس کے آپریشن کے بعد واپس آئی ہیں (منظر کا چہرہ دیکھ کر) کسی اہم لڑکی کا آپریشن تھا۔

وحید بیگ:۔ اہم لڑکی!

ناظمہ:۔ جی ہاں! جانے کیوں اُس کے لئے بہت پریشان ہیں۔

وحید بیگ:۔ (مسکراکر) ہر مریض کے لئے یہ لڑکی یوں پریشان ہوکر خود مریض نہ ہوجائے (ناظمہ کی طرف دیکھ کر) جاؤ اُسے منظر میاں کے آنے کی اطلاع دیدو۔

ناظمہ:۔ بہت اچھا!

(ناظمہ کمرے سے چلی جاتی ہے۔ آصفہ بیگم منظر کی طرف دیکھ کر)

آصفہ بیگم:۔ منظر میاں اپنے آنے کی اطلاع دو چار روز پہلے تو دی ہوتی

منظر:۔ یکایک پروگرام بن گیا (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) میں ایک بزنس کے سلسلے میں افریقہ جارہا ہوں۔ جانے سے پہلے آپ سے ملنا بھی ضروری تھا۔

آصفہ بیگم:۔ افریقہ!

منظر:۔ ہماری فرم کو وہاں سے ایک اچھا آرڈر ملنے کی امید ہے۔ اسی سلسلے میں وہاں جانا ضروری ہے۔

آصفہ بیگم:۔ اس سے پہلے تو تم نے کبھی اس پروگرام کے بارے میں نہیں لکھا۔

منظر حسین:۔ جی ہاں پروگرام یکایک بنا ہے۔ اگر میں نہ جاؤں تو فرم کو لاکھوں کا گھاٹا ہو سکتا ہے۔

آصفہ بیگم:۔ کتنے دن کا پروگرام ہے؟

منظر:۔ ویسے تو دو مہینے کا پروگرام ہے اگر کام جلد ہو گیا تو جلد واپس آجاؤں گا۔ دعا کیجئے کہ مجھے اس سفر میں کامیابی ہو۔

(ناظمہ کمرے میں آکر وحید بیگ سے)

ناظمہ:۔ ابا جی آپا تو نماز پڑھ رہی ہیں۔

وحید بیگ:۔ (حیرت سے) نماز پڑھ رہی ہیں (ہنس کر) یہ بھی خدا کی شان ہے (کچھ سوچ کر) اس وقت کون سی نماز کا وقت ہے۔

ناظمہ:۔ (منظر کی طرف دیکھ کر) شاید اسی لڑکی کے لئے دعا کر رہی ہوں۔

وحید بیگ:۔ (مسکرا کر) آخر وہ کون خوش قسمت لڑکی ہے جس کے لئے ڈاکٹر دوا کے ساتھ ساتھ نمازیں بھی پڑھ رہا ہے۔

ناظمہ:۔ پتہ نہیں۔ (منظر کی طرف دیکھ کر) انجم نام بتلا رہی تھیں۔

وحید بیگ:۔ (آصفہ بیگم کی طرف دیکھ کر) میں جا کر کپڑے بدلتا ہوں تم منظر میاں کے آرام کا بندوبست کرو۔ تھکے ہوئے آئے ہیں۔

آصفہ بیگم:۔ کمرہ تو ان کے لئے تیار ہے (ناظمہ کی طرف دیکھ کر) نوکر سے کہہ دو، گرم پانی غسل خانے میں رکھ دے۔ (پھر وحید بیگ کی طرف دیکھ کر) کھانا کس وقت کھائیے گا۔؟

وحید بیگ:۔ منظر میاں نہا دھو لیں ــــ کھانا تیار ہے؟

آصفہ بیگم:۔ کھانا تو تیار ہے اور ہاں آج شام ڈاکٹر کلکرنی کو کھانے پر بلائے لیتے ہیں منظر میاں سے ملاقات ہو جائے گی۔ (منظر کی طرف دیکھ کر) بڑا بھلا اور نیک ڈاکٹر ہے۔ پروین کے اوپر تو غیر معمولی مہربان ہے۔ میڈیکل کالج میں پروفیسر آف سرجری ہے۔

وحید بیگ:۔ ہاں! ضرور بلا لو اور دیکھو مسٹر اور مسز جمیل کو بلانا نہ بھولنا۔ کئی دن سے ان سے بھی ملاقات نہیں ہوئی ہے۔

آصفہ بیگم:۔ بہت اچھا (وحید بیگ کمرے سے چلے جاتے ہیں) آصفہ بیگم ناظمہ کی طرف دیکھ کر) مسٹر جمیل کو بھی فون کر دینا منظر میاں کا کہہ دینا کہ آئے ہیں۔ ڈاکٹر کلکرنی سے کہنا مسز کلکرنی کو ضرور ساتھ لائیں۔

ناظمہ:۔ بہت اچھا (منظر کی طرف دیکھ کر) لیجئے آج رات تو ساگ پات کا انتظام ہو گیا (منظر سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے) مسز کلکرنی خالص دیسی ٹیرین ہیں۔

آصفہ بیگم:۔ میں جا کر باورچی خانہ دیکھتی ہوں۔ (منظر کی طرف دیکھ کر) منظر میاں تم جلدی تیار ہو جاؤ۔

منظر:۔ بہت اچھا (آصفہ بیگم کمرے سے چلی جاتی ہیں۔ منظر مسکرا کر ناظمہ کو دیکھ کر) کہیئے آپ نے گریجویشن تو کر لیا۔ اب کیا ارادہ ہے؟

ناظمہ:۔ (روکھے پن سے) ایم اے میں داخلہ لے لیا ہے۔

(منظر غور سے ناظمہ کو دیکھتا ہے۔ جیسے اس کے ناظمہ کے اس روکھے پن پر حیرت ہوئی ہو۔ چند سیکنڈ خاموش رہ کر)

منظر:۔ کس مضمون میں؟

ناظمہ:۔ تاریخ میں۔

منظر:۔ تاریخ سے آپ کو کافی دلچسپی ہے۔؟

ناظمہ:۔ بس یونہی سمجھ لیجئے۔

منظر:۔ (پھر غور سے ناظمہ کو دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) آپ کچھ ناراض نظر آرہی ہیں۔ میرا آنا ناگوار گزرا؟

ناظمہ:۔ جی نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔

منظر:۔ آپ کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ پریشان ہیں۔ کیا کوئی خاص بات ہے۔

ناظمہ:۔ جی ہاں! کچھ پریشانی تو ضرور ہے۔ اپنے لئے نہیں آپا کے لئے۔

منظر:۔ آپا کے لئے کیوں؟ خیریت تو ہے؟

ناظمہ:۔ ہاں! ہیں تو خیریت سے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے مگر ــــ

(منظر سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے مگر ناظمہ خاموش رہتی ہے۔

منظر کچھ دیر بعد)

منظر:- پھر ایسی کیا بات ہے جس کے لئے آپ اس قدر پریشان ہیں؟

ناظمہ:- تین دن سے وہ ایک مریضہ کے لئے بہت پریشان ہیں۔ اپنے پر کھانا پینا حرام کر رکھا ہے (منظر خاموش رہتا ہے۔ ناظمہ کچھ دیر بعد) انجم نام ہے اس لڑکی کا۔ آپ اسے جانتے ہیں؟

منظر:- انجم! (سوچنے لگتا ہے۔ چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی پرانی یادوں میں کھو گیا ہے۔ ناظمہ برابر اس کا چہرہ تاکے جاتی ہے، منظر دل ہی دل میں جیسے بڑبڑاتے ہوئے) انجم! (پھر اثبات میں سر ہلا کر کسی حد تک محرمانہ لہجے میں ہاں! میں اس نام کی ایک لڑکی کو جانتا ہوں۔

ناظمہ:- وہ اسی لڑکی کے لئے پریشان ہیں۔ (غور سے منظر کا چہرہ دیکھ کر) میرا تو خیال تھا آپ سیدھے اسپتال جائیں گے۔

منظر:- (ناظمہ کا چہرہ اس طرح دیکھتا ہے جیسے اس کے طنز کو محسوس کر لیا ہو۔ پھر آہستہ سے) ناظمہ بیگم! بعض اتفاقات زندگی کے بڑے حادثات بن جاتے ہیں (ٹھنڈی سانس بھر کر کھڑکی کے پاس جاتا ہے اس میں سے باہر دیکھتے ہوئے) اب جا کر بھی کیا کرتا؟ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔"

ناظمہ:- (طنزیہ لہجے میں) جی نہیں شاخ تو ابھی موجود ہے کوئی خونِ دل سے اسے سینچ رہا ہے۔

(منظر پلٹ کر ناظمہ کو دیکھتا ہے۔ چند سیکنڈ بہت غور اور گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہتا ہے پھر آہستہ سے)

منظر:- کون سینچ رہا ہے؟

ناظمہ:- آپا پروین۔

منظر:- پروین یا ڈاکٹر پروین؟

ناظمہ:- (طنزیہ) یونہی سمجھ لیجئے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

منظر:- دونوں میں بہت فرق ہے۔ ناظمہ بیگم ایک عورت ہے ایک ڈاکٹر (مایوسی سے مسکرا کر) ڈاکٹر کو ہمیشہ اپنا فرض پیارا ہوتا ہے۔

ناظمہ:- گویا اس کے سینے میں دل نہیں ہوتا پتھر ہوتا ہے۔

منظر:- نہیں — موم سے ملائم دل ہوتا ہے جو ذرا سی آنچ سے پگھل جاتا ہے۔

ناظمہ:- اور پھر اسی آنچ سے ڈاکٹر کے اندر کی عورت جل جاتی ہے۔ راکھ ہو جاتی ہے اور لوگ کھڑے ہو کر اس راکھ پر قہقہے لگاتے ہیں۔

منظر:- (کچھ دیر خاموش رہ کر) ناظمہ! میں انجم کو اچھی طرح جانتا ہوں مگر تمہیں کیا معلوم کہ —

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے اور منظر خاموش ہو جاتا ہے ناظمہ ریسیور اٹھا کر)

ناظمہ:- ہلو — کون ڈاکٹر عصمت۔ جی ہاں۔ جی ہاں — اچھا ہوش میں آ رہی ہے۔ بہت اچھا میں کہے دیتی ہوں۔ جی بہت اچھا — اچھا اچھا — ابھی کہے دیتی ہوں (ریسیور رکھ کر) انجم ہوش میں آ رہی ہے۔

منظر:- (کچھ دیر خاموش رہ کر) ذرا اپنی آپا کو بلا دیجئے۔

(ناظمہ غور سے منظر کو دیکھتی ہے اور بلا کچھ کہے خاموشی سے کمرے سے چلی جاتی ہے۔ منظر خاموشی سے کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد آصفہ بیگم پھر کمرے میں آ کر)

آصفہ بیگم:- ارے منظر میاں ابھی تک نہیں نہائے؟

منظر:- بس جا ہی رہا ہوں۔

آصفہ بیگم:- کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اور یہ ناظمہ کہاں گئی۔

منظر:- پروین کو بلانے گئی ہے۔

آصفہ بیگم:- پروین نے ابھی تک تمہاری خبر نہیں لی بھئی غضب کی غیر ذمہ دار لڑکی ہے۔ (پھر دروازے کی طرف مڑ کر) میں گرم پانی غسل خانے میں رکھوائے دیتی ہوں۔ بیٹا جلدی نہا دھو لو لمبے سفر سے آئے ہو تھکے ہوئے ہو گے اور بھوک بھی ستا رہی ہو گی۔

منظر:- بہت اچھا۔

آصفہ بیگم (دروازے کی طرف جاتے ہوئے بلند آواز سے) ارے

فوراً دوڑ ـــ (کمرے کے باہر چلی جاتی ہیں۔ کمرے کے باہر سے آواز) پانی غسل خانے میں رکھ دیا۔ اور بی بی تم کیا کر رہی تھیں منظر میاں کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔

(کچھ دیر بعد پروین آہستہ آہستہ کمرے میں آتی ہے۔ اس کے چہرے اور چال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت تھکی ہوئی ہے۔ کمرے میں تھکی تھکی نظروں سے منظر کو دیکھتی ہے۔)

منظر :۔ آئیے آپ کچھ زیادہ تھکی ہوئی معلوم ہو رہی ہیں۔

پروین :۔ جی نہیں!

منظر :۔ ابھی ناظمہ نے بتلایا کہ آپ مسلسل کئی راتوں سے جاگ رہی ہیں۔

پروین :۔ جی نہیں! بس کل رات ہی نہ سو سکی۔

منظر :۔ آپ تشریف تو رکھئے (پھیکی مسکراہٹ سے) آپ تو بیمار سی نظر آ رہی ہیں۔

پروین :۔ (ایک صوفے پر بیٹھ کر) میں تو خاصی تندرست ہوں۔ آپ تشریف رکھئے۔

منظر (سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ کر) انجم اب کیسی ہے؟

پروین :۔ (نظریں جھکا کر) ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ مگر وہ کچھ ضرورت سے زیادہ ناامید ہے۔ اس نے مرض سے لڑنا چھوڑ دیا ہے۔ یہ ناامیدی کی انتہا ہے۔

منظر :۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) ابھی فون پر بتلایا گیا تھا کہ وہ ہوش میں آ رہی ہے۔

پروین :۔ بعض وقت کی غیر معمولی بے چینی کو ہم ہوش میں آنا سمجھ لیتے ہیں۔ میرے خیال میں ابھی اس کا بے ہوش رہنا ہی مناسب ہے۔

منظر :۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) بعض لوگ عجیب قسمت لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ بے چاری انجم کو کبھی سکھ نصیب نہیں ہوا۔

پروین :۔ یعنی ؟ ـــ آپ کا مطلب ہے کہ ـــ کالج میں تو وہ بہت شوخ اور چنچل تھی۔ اور ـــ

منظر :۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) اور قسمت ایسے ہی لوگوں کے ساتھ بھیانک کھیل کھیلتی ہے۔

پروین :۔ کیا مطلب! (منظر خاموش رہتا ہے۔ پروین غور سے اس کا چہرہ دیکھتی رہتی ہے۔ منظر خیالات میں کھو جاتا ہے اور خلا میں گھورنے لگتا ہے کہ یکایک فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ پروین تیزی سے ریسیور اٹھا کر) ہلو ـــ میں ڈاکٹر پروین بول رہی ہوں۔ کون ڈاکٹر عصمت! ـــ جی ـــ کولیپس ہو گئی (ریسیور رکھ دیتی ہے اور آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں کچھ دیر خاموش رہتی ہے۔ پھر منظر کی طرف دیکھ کر) کوئی اسے نہ بچا سکا۔ (منظر خاموش رہتا ہے) کاش آپ آخری وقت اس سے مل لیتے۔ شاید اس میں حوصلہ پیدا ہو جاتا۔

منظر :۔ (کھڑے ہو کر آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس جاتا ہے اور اس سے باہر دیکھتے ہوئے) میں وہاں جا کر بھی کیا کرتا۔ میرا اس سے کیا تعلق رہا تھا۔

پروین :۔ کیا مطلب! آپ تو اس سے ـــ

منظر (ٹھنڈی سانس بھر کر) جب تک میں نے اسے چاہا لوگوں کو کوئی اعتراض نہ ہوا، اور جب اس نے مجھے چاہا تو اس کی شادی کر دی گئی اور چند مہینوں کے بعد وہ بیوہ ہو گئی۔

پروین :۔ مگر میں تو سمجھ رہی تھی کہ آپ اب بھی ـــ اب بھی ـــ

(پروین خاموش ہو کر آنسو پونچھنے لگتی ہے۔ منظر برابر کھڑکی میں سے دور خلا میں گھورتا رہتا ہے۔)

پردہ

غالبیات میں اضافہ

آئینہ غالب: ۲۲ مقالات ۔ بڑا سائز ۔ ٹائپ کی عمدہ چھپائی
صفحات ۲۷۸ قیمت: ۵ روپے

گنجینۂ غالب: ۱۴ مقالات ۔ بڑا سائز ۔ ٹائپ کی عمدہ چھپائی
صفحات ۱۸۶ قیمت ۴ روپے

محصول ڈاک ہمارے ذمے۔ تین روپے اور اس سے زائد کی کتابیں وی پی سے منگوائی جا سکتی ہیں۔

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

غزلیں

شرم سے عارضِ گُل ہو گئے شبنم شبنم
آئینہ دیکھ رہے تھے کہ نظر آ گئے ہم
کتنے مے نوش تہی جام لئے بیٹھے ہیں
اپنے ساغر میں تو صہبا ہے، زیادہ ہو کہ کم
مجھ سے پہلے بھی کوئی سجدہ کناں گذرا ہے
دھندلے دھندلے نظر آتے ہیں ترے نقشِ قدم
رات ہے اب بھی جواں، رات کہاں ڈھلتی ہے
ڈھل بھی جائے تو وہی ہم ہیں، وہی سایۂ غم
مجھ کو مایوسِ کرم بھی نہیں ہونے دیتا
وہ جو پیغام ہے اُن آنکھوں میں مُبہم مُبہم
کس سلیقے سے گذرتے ہیں گذرنے والے
کیا یہ وہ راہ نہیں، جس پہ بہکتے ہیں قدم
تھی پریشانیٔ خاطر، مگر ایسی تو نہ تھی
یُوں تو پہلے بھی تھا شیرازۂ ہستی برہم
پردۂ ساز میں نغمے نہیں چھپتے نظمیؔ
گونجتی رہتی ہیں ماضی کی صدائیں پیہم

اختر نظمی

اللہ کی پناہ! وہ طوفانِ غم ہے آج
حُسنِ نشاطِ کار بھی باچشمِ نم ہے آج
فکرِ کشود کار نہ پروائے غم ہے آج
مجھ پر کسی کی خاص نگاہِ کرم ہے آج
اُلٹا ہوا نقابِ رُخِ ہر صنم ہے آج
جنت صنم کدہ بھی خدا کی قسم ہے آج
یارب یہ کس کے خونِ تمنا کا رنگ ہے
کتنا حسین قصۂ روئے صنم ہے آج
فصلِ بہار آئی تو اور اوس پڑ گئی
جو پھول ہے چمن میں وہ باچشمِ نم ہے آج
کالی گھٹا میں گیسوئے شبگوں کا رنگ ہے
کیا خوشگوار منظرِ شام الم ہے آج
آمد چمن میں ہے کسی رشکِ بہار کی
طوفانِ رنگ و نور بہ ہر یک قدم ہے آج
کیا جانے کیوں خموش ہے یہ ساحلِ حزیں
شاید کہ ختم قصۂ دردِ والم ہے آج

ساحل مانکپوری

کسی معصوم دل کی بد دُعا ہوں
خود اپنی راہ کا پتھر بنا ہوں
بھلا کیوں غیر پر تہمت لگاؤں
خود اپنے درد کا مارا ہوا ہوں
مجھے دُنیا کہاں پہچانتی ہے!
مگر دُنیا کو میں پہچانتا ہوں
سُلگتی خواہشوں کی انتہا ہوں
جہنم کے دہانے پر کھڑا ہوں
ذرا اے گردشِ دوراں ٹھہر جا
کئی صدیوں سے پیچھا کر رہا ہوں
مجھے کیوں آپ اچھا کہہ رہے ہیں
زمانے کی نگاہوں میں بُرا ہوں
تعجب خیز نظروں سے نہ دیکھو
شکستہ حسرتوں کا آئینہ ہوں
تراشیدا ہوں اے جانِ تمنا
کسے چاہوں اگر تجھ کو نہ چاہوں

شیدا رومانی

کھُلا گھر

میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر کے آس پاس، چاروں طرف
ڑی کردی جائیں۔ میرے گھر کی کھڑکیاں بند رہیں۔ میں
وں کہ تمام مُلکوں کی تہذیبوں کی ہوائیں میرے گھر کے
ں میں بلا روک ٹوک چلتی رہیں۔ لیکن میں یہ نہیں
گا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ اُڑا لے جائیں۔ میرا
یدخانہ کا دھرم نہیں۔ اس میں پرماتما کی ہر
وق کے لئے گنجائش ہے۔ نسلی، مذہبی یا معاشرتی
ری جیسے بیہودہ جذبات اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

(ینگ انڈیا، جون ۱۹۲۱ء)

مہاتما گاندھی

davp 68/301

اَن چاہے بچّوں کے ماں باپ بننے کا اندیشہ
دِل میں لائے بغیر اِزدواجی زندگی کا سُکھ پائیے۔
.... اَب سبھی مرد برتھ کنٹرول کے محفُوظ
اور تسلّی بخش طریقے....
نِرودھ ـــــــ سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

صرف ۲۸ برسوں میں بھارت کی آبادی ۵۰ کروڑ سے بڑھ کر ایک سو کروڑ ہو جائے گی۔ لیکن ذرا سوچئے تو اُس وقت مکان، تعلیم، دوا دارُو، خوراک، کپڑے وغیرہ کی مُنہ بھی ضرُورتیں اِتنے سارے لوگوں کو کیسے مُہیّا کی جا سکیں گی۔ یقیناً بچّوں ـــــ آپ کے بچّوں ـــــ کو تنگی ترشی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ابھی عمل کیجئے۔ اپنے گُنے کو چھوٹا رکھئے۔

بچّے کا جنم روکنا آپ کے اختیار میں ہے
اختیار کا استعمال کیجئے
نِرودھ استعمال کیجئے

نِرودھ

فیملی پلاننگ کے لئے
۳ کے لئے ۱۵ پیسے - ۱ کے لئے ۵ پیسے
(سرکار کی طرف سے رعایتی قیمت)
فی الحال کچھ فیصلوں میں ہی مل رہے ہیں

بڑھیا کوالٹی چاہیے؟

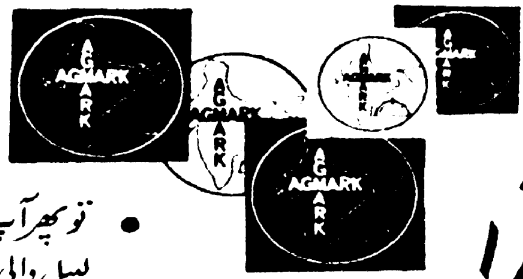

- تو پھر آپ "اگ مارک" لیبل والی اشیا ہی خریدیں۔
- وُہ گاہک، جنہیں اعلیٰ کوالٹی کی چیزیں پسند ہیں، گھی، مکھن، بناسپتی تیل یا گرم مصالحے وغیرہ خریدتے وقت ہمیشہ "اگ مارک" لیبل والی اشیا ہی خریدتے ہیں۔
- پچھلے برس تقریباً ۱۵۰ کروڑ روپے کی مالیت کی اشیا — گھی، مکھن، گرم مصالحے وغیرہ — پر "اگ مارک" لیبل لگائے گئے۔
- اور ۸۲ کروڑ روپے کی مالیت کی "اگ مارک" لیبل والی اشیاء برآمد کی گئیں۔

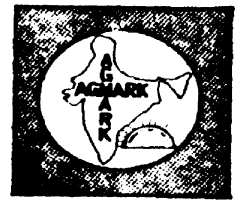

سرکار کی طرف سے
چیزوں پر "اگ مارک"
کا لیبل تبھی لگایا جاتا ہے،
جب اعلیٰ لیبارٹریوں میں
اُن کا خوب مُعائنہ کرلیا جاتا ہے

"اگ مارک" لیبل، خالص ہونے اور بڑھیا کوالٹی کی ضمانت ہے

davp 68/482

غالبِ صدی تقریبات کی جھلکیاں

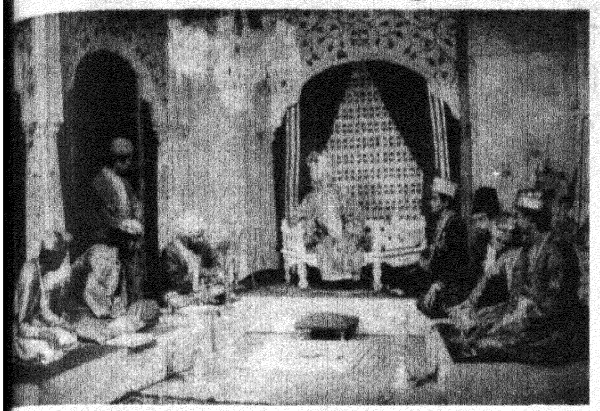

دو میانے جائیں:۔
مشہور اداکار
بلراج ساہنی غالب
کے رُوپ میں،
تمثیل
"دلّی کی آخری شمع"

نیچے
"شامِ غالب"
میں فلمی ستاروں
کی شرکت
مالا سنہا غالب کی
غزل سُنا رہی ہیں

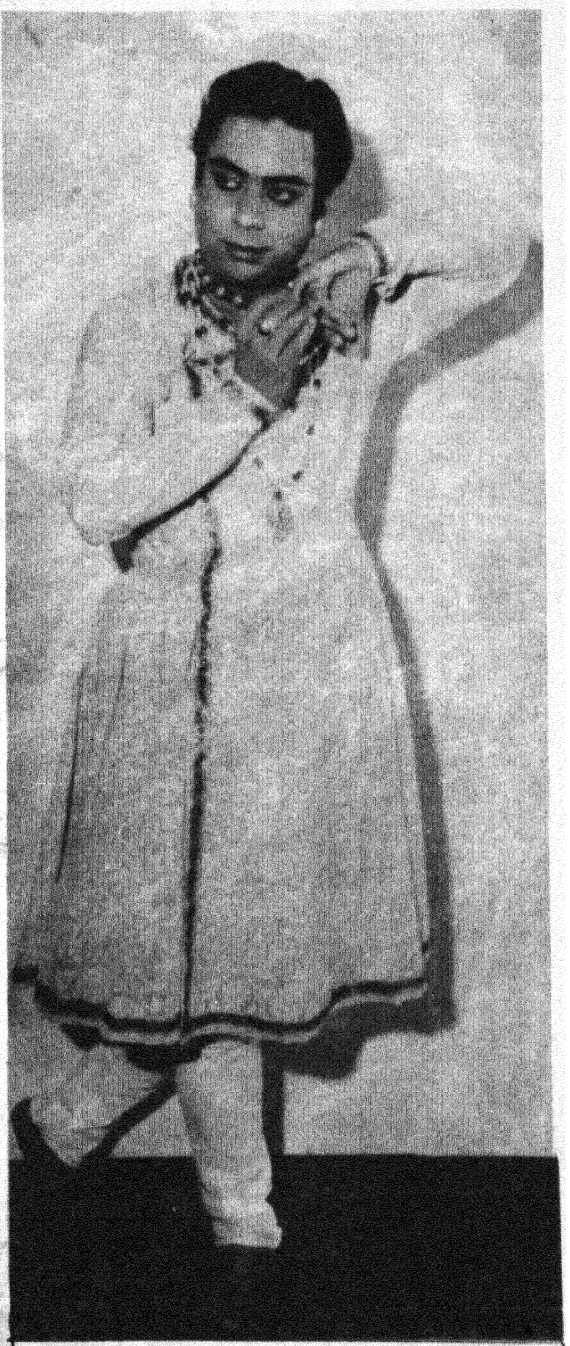

اُوپر:۔ برجو مہاراج نے غالب کی غزل کو کتھک رقص کی شکل میں پیش کیا۔
اُوپر بائیں:۔ ٹیلی وژن پر پیش کردہ غالب سے متعلق پروگرام کا ایک منظر

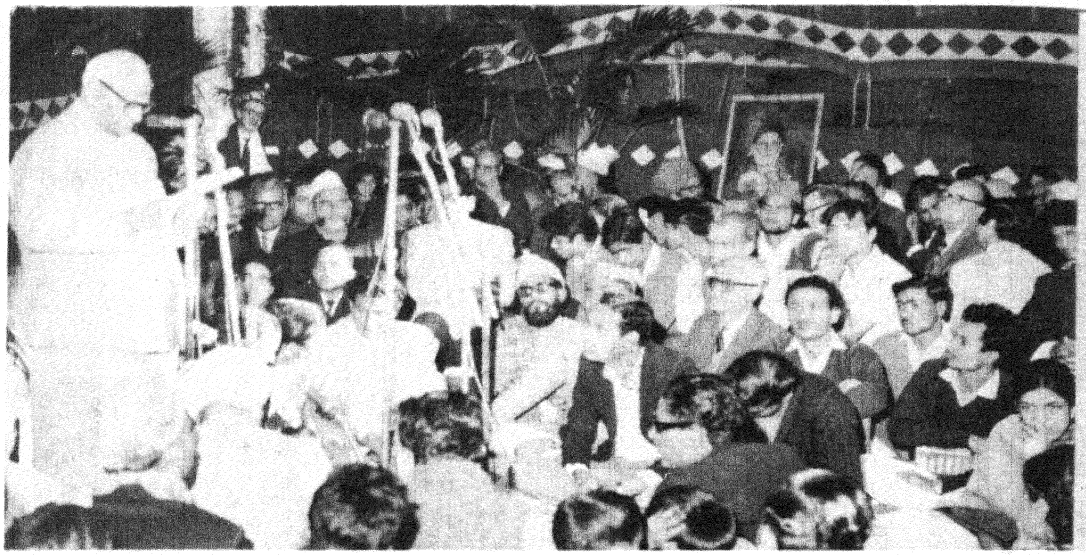

غالب پر منعقدہ سہ روزہ سیمینار کا افتتاح جناب قاضی عبدالودود نے فرمایا
(تصویر میں دائیں سے بائیں) لطف علی صورت گر، اے شمیل، بابا جان غفروں

عکسیت ناٹک اکادمی کے ایک پروگرام میں بیگم اختر غالب کی غزل سنا رہی ہیں

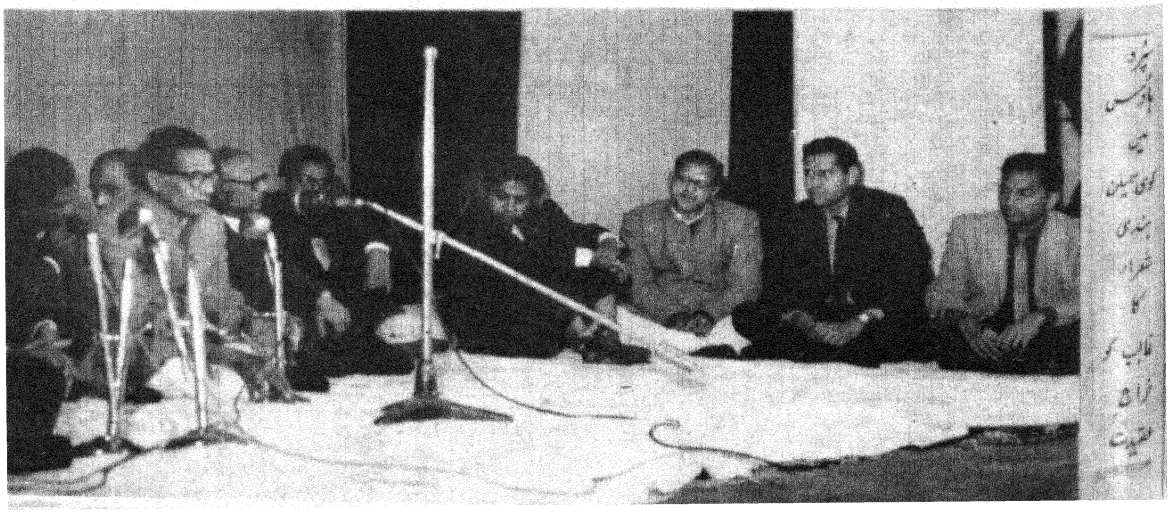

نائب وزیر اعظم شری مرارجی ڈیسائی نے غالب خصوصی ڈاک ٹکٹ کا اجرا فرمایا۔
تصویر میں وہ شری ستیہ نرائن سنہا وزیر اطلاعات و نشریات و رسل و رسائل سے یہ ڈاک ٹکٹ خرید رہے ہیں۔

Vol. 27 No. 9 AJKAL (Monthly) APRIL 1969

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, N. Delhi-1
Printed by The Asian Art Printers Private Ltd., D. B. Gupta Road, New Delhi
Regd. No. D. 509

آج کل

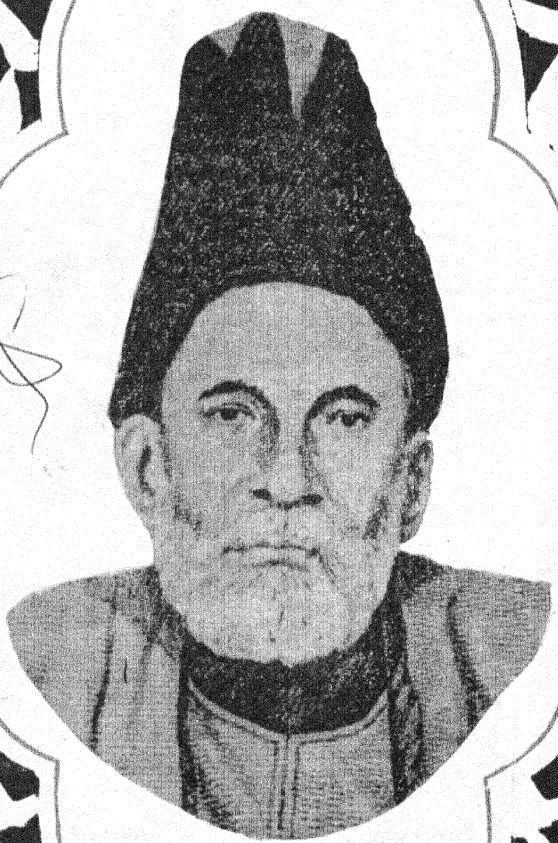

غالب نمبر

غالب کی ایک تصویر جو انھوں نے پیارے لال آشوب (دہلی) کو دی تھی

غالب کی ایک رنگین تصویر (لال قلعہ میوزیم میں)

غالب کی تحریر

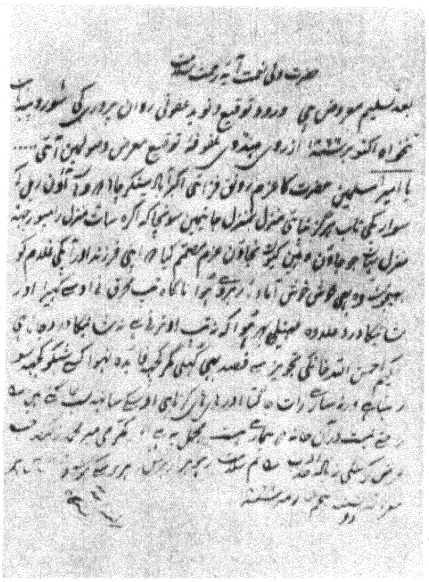

مثنوی ابر گہربار کا سرورق

عود ہندی کا سرورق

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

ترتیب

ملاحظات	ادارہ	۲
[illegible]		
کلامِ غالب کے صوتی آہنگ کا ایک پہلو	مسعود حسین خاں	۴
محاوراتِ غالب	ضیاء احمد بدایونی	۸
دلی کی سماجی زندگی (خطوطِ غالب کے آئینے میں)	سحی حسن نقوی	۱۶
میں ہوں اپنی شکست کی آواز	شمیم حنفی	۲۴
غالب کی شاعری میں جنس	سلیم اختر	۳۲
رسالہ سوالاتِ عیدالکریم کا مصنف	منظور الحسن برکاتی	۴۰
انشائے نورچشم	عبدالقوی دسنوی	۴۵
غالب اور ملازمینِ سرکار	یوسف ناظم	۴۹
[illegible]	[illegible]	
فراق گورکھپوری		۳
روش صدیقی		۷
منور لکھنوی		۱۴
بسمل سعیدی۔ سلام مچھلی شہری		۲۲
گوپال متل، شمیم کرہانی		۲۳
شہاب جعفری، حسن نعیم۔ کمار پاشی		۳۹
مخمور سعیدی، رفعت سروش، مصور سبزواری		۴۴
اسما سعیدی، طالب جکوالی		۴۸
شارق۔ فصیح اکمل قادری		۵۲
جگر ناتھ آزاد		۱۵
نازش پرتاب گڑھی		۲۰
کرشن موہن، حرمت الاکرام		۲۱
سعادت نظیر		۴۸
واحد پریمی		۵۲
نئی کتابیں (تبصرے)		۵۲

شرح چندہ

سالانہ چندہ	ہندوستان میں	سات روپے
	پاکستان میں	سات روپے (پاک)
	دیگر ممالک سے	۱۰ شلنگ ۶ پینس یا ڈیڑھ ڈالر
قیمت فی پرچہ	ہندوستان میں	۶۰ پیسے
	پاکستان میں	۶۰ پیسے (پاک)
	دیگر ممالک سے	۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مضامین کیلئے خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر "آج کل" اردو) پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مرتبہ و شائع کردہ
[illegible] پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

فروری ۱۹۶۹ء میں اُردو کے عظیم اور آفاقی شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب کی صدسالہ برسی ہندوستان بھر ہی میں نہیں بلکہ دُنیا کے متعدد دُوسرے ملکوں رُوس، امریکہ انگلستان، ایران، نیپال، افغانستان، پاکستان وغیرہ میں بھی منائی جارہی ہے ہندوستان میں جہاں ان تقریبات کو مرکزی و ریاستی سرکاروں کی سرپرستی و امداد حاصل ہے وہاں چھوٹی بڑی ادبی انجمنیں بھی اپنے طور پر سرگرم عمل ہیں۔

صدسالہ برسی کی یہ تقریبات اور سرگرمیاں ہمہ پہلو اور گوناگوں ہیں

غالب کی صدسالہ یادگار منانے کے لئے جو مرکزی کمیٹی بنی ہے اس کی چیئرمین خود وزیراعظم اندرا گاندھی ہیں۔ یہ کمیٹی ایک سیمینار بھی منعقد کرے گی، جس میں مختلف ممالک کے کئی اہل علم شرکت کریں گے۔ اس کے علاوہ غالب سے متعلق ایک اوپیرا دستاویزی فلم کی نمائش اور غالب کے عہد کی تصویروں کی نمائش بھی کی جائے گی۔ ماتا سُندری روڈ (نئی دہلی) پر حکومت ہند کی امداد سے غالب میموریل ہال، آڈیٹوریم اور لائبریری تعمیر کی جائیگی۔ غالب کی دہلی کے تحت بستی نظام الدین میں ریسرچ لائبریری غالب میوزیم اور آڈیٹوریم تعمیر ہوگا۔ ان دونوں اداروں میں غالب کا مطالعہ کرنے والوں کو خصوصی سہولتیں حاصل ہوں گی۔

ان تقریبات کے سلسلے میں ملک کے مختلف رسائل غالب نمبر شائع کر رہے ہیں۔ غالب کی کتابوں کے نئے ایڈیشنوں کے علاوہ غالب کے فکر و فن پر کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ نیز ہندوستان کی متعدد علاقائی زبانوں میں غالب کے کلام کا ترجمہ شائع کیا جارہا ہے یونسکو کی امداد سے ایف رسل اور خورشید الاسلام غالب کے کلام اور خطوط کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ انھیں تقریبات کے ذیل میں مشہور مصوروں کی بنائی ہوئی غالب کی تصویروں پر مشتمل ایک البم شائع کرنے کا پروگرام بھی ہے اس ضمن میں مشاعروں اور نمائشی مشاعروں کا انعقاد بھی ذکر کے قابل ہے۔ اس موقع پر خصوصی غالب ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا جارہا ہے۔

دُنیا کے دُوسرے ملکوں، مثلاً رُوس، امریکہ، انگلستان، ایران، افغانستان وغیرہ میں بھی غالب تقریبات خصوصیت سے منائی جارہی ہیں۔ روسی زبان میں غالب کے فکر و فن پر غالبیات کے روسی ماہروں اور دیگر ماہرین غالبیات کے مضمون شائع کئے جارہے ہیں۔ مختلف مقامات پر مذاکروں کے انعقاد کے علاوہ روسی زبان میں غالب کی منتخب غزلیں بھی شائع کی جارہی ہیں۔ ایران اور انگلستان سے غالب کی فارسی تصانیف کے نئے ایڈیشن شائع کئے جارہے ہیں۔ نیز متعدد دُوسری غیر ملکی زبانوں میں غالب کا کلام و ترجمہ شائع ہو رہا ہے۔

غالب کو ان کے اپنے عہد میں وہ قدر و منزلت تو نہیں ملی جو انھیں ملنی چاہئے تھی لیکن ان کے قدردانوں اور مداحوں کا حلقہ خاصا اور بڑا وسیع تھا۔ مرزا کے قدردانوں اور عزیزوں میں ہندو مسلمان یکساں طور پر شامل تھے۔

مرزا ہرگوپال تفتہ اور منشی شیونرائن آرام سے غالب کا دلی تعلق اُن کے خطوط میں جا بجا نمایاں ہے۔ اور آج جو غالب تقریبات، بلا لحاظ قوم، نسل و مذہب منائی جارہی ہیں اس عظیم شاعر اور وسیع المشرب انسان کے شایان شان ہیں۔ آج کی اصطلاح میں مرزا غالب پر کوئی لیبل چسپاں کرنا مناسب نہ ہوگا لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ ایک سیکولر ذہن رکھتے تھے اور رواداری اُن کے مزاج کا خاصا تھی۔ جس کا ثبوت اُن کے اشعار میں جا بجا ملتا ہے۔

"آج کل" کا یہ غالب نمبر غالب کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کی ایک حقیر سی کوشش ہے۔ امید ہے آپ اسے پسند کریں گے۔

غالب کی صدسالہ برسی سال بھر تک منائی جائے گی۔ ہم دوسرے شماروں میں بھی وقتاً فوقتاً غالب سے متعلق مواد شائع کرتے رہیں گے۔

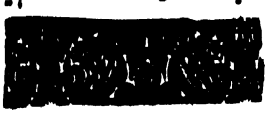

فراقؔ گورکھپوری

غزل

اہلِ ایماں کا سراسیمہ و حیراں ہونا
کفرِ عشاق کا وہ رُوکشِ ایماں ہونا

سر بسر جسم کے امکان میں ہے جاں ہونا
رگِ ہستی کو نہ آیا ابھی لرزاں ہونا

رازِ سربستہ ہے شیرازۂ دل کی ترکیب
یہ یک انداز اُسے یکجا و پریشاں ہونا

وہ گنہ گارِ محبت ہوں میں واعظ کہ مجھے
قبلۂ دیں تو کبھی کعبۂ ایماں ہونا

بات یہ ہے کہ میں ناشاد بھی ہوں شاد بھی ہوں
عُقدۂ عشق کو دشوار نہ آساں ہونا

ہم تو درماں کو بھی دَرد بنا لیتے ہیں:
یوں تو اے دردِ مبارک تجھے درماں ہونا

دلِ سوزاں شبِ غم پیکرِ بے خبری ہے
نہ شبستاں نہ اسے شمعِ شبستاں ہونا

ذرّہ اپنا بھی ہے خورشیدِ قیامت لیکن
مجھے منظور نہیں چاک گریباں ہونا

کس طرح عشق کی مشکل کوئی آساں کرے
جس کے آساں کو بھی آیا نہیں آساں ہونا

دہر میں جا کے کہاں کیجئے انساں کی تلاش
آدمی کو بھی تو آیا نہیں انساں ہونا

نزع میں دادِ وفا مل گئی بیماروں کو
سربسر حسن کا تاخیرِ پشیماں ہونا

تجھے دیکھا بھی تو اس طرح کہ دیکھا ہی نہیں
تیرا سرتابقدم عشوۂ پنہاں ہونا

کتنی بے لاگ لگاوٹ نگہِ ناز کی تھی
یوں ملی جیسے اُسے دردِ نہ درماں ہونا

جنگ اور ظلم کو دُنیا میں کیا ناممکن
آدمی سیکھ گیا آج سے انساں ہونا

دفترِ رازِ محبت تھا، ملالِ دلِ پر
وہ سکوتِ نگہِ ناز کا پُرساں ہونا

میری سو بات میں اک بات کا بننا بھی محال
اس کی ہر بات میں سو بات کا امکاں ہونا

یاں سخن ساز بھی ہو جاتے ہیں اکثر عاجز
لوگ آساں سمجھتے ہیں سخن داں ہونا

بزمِ رنداں میں مجھے حضرتِ واعظ بھی ملے
یاد آیا مجھے حضرت کا بھی انساں ہونا

رشکِ صد لطف و کرم ہے یہ نیا رنگِ ستم
کچھ نہیں جان کے تیرا پشیماں ہونا

اور ہے شان مری وادیٔ وحشت کا فراقؔ
اب ہے زنداں نہ بیاباں نہ گلستاں ہونا

مسعود حسین خاں

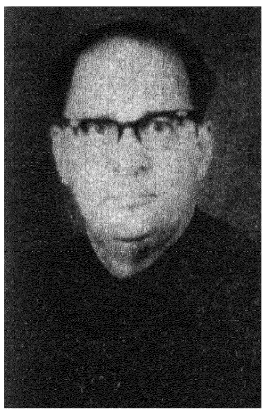

کلامِ غالب

کے صوتی آہنگ کا ایک پہلو

زبان کی بنیاد اصوات پر قائم ہے لیکن اصوات بے معنی ہوتی ہیں۔ ان میں معنی پیدا ہوتے ہیں لفظ کی سطح پر۔ ادبی اسلوب کا دارومدار الفاظ کے انتخاب اور استعمال پر ہوتا ہے۔ تاہم اچھا فن کار، بالخصوص شاعر اپنے ادبی اسلوب کی تشکیل میں زبان کی صوتیاتی سطح کا، شعوری یا غیر شعوری طور پر احساس رکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عظیم شاعری میں ماورائے صوت بھی کچھ ہوتا ہے تاہم اچھی شاعری زبان کے صوتی وسائل سے بے نیاز ہو کر نہیں کی جا سکتی۔

محاسن و معائبِ سخن کے تحت قدماء نے آہنگ صوت اور تنافر صوت کے مسئلہ کو بارہا اُٹھایا ہے۔ پچھلے چار دہوں میں توضیحی لسانیات کی حیرت انگیز ترقی کی وجہ سے صوتیات کے مسائل میں زیادہ درک اور بصیرت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ اور اُس کے ذریعہ قدماء کے فرمودات کی بہتر تشریحات کی جا سکتی ہیں۔ قدماء کے لسانی شعور پر "حرف" کا تصور مستولی رہا ہے۔ موجودہ لسانیات کے مطابق "حرف" پر "صوت" کو فوقیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ ایک زبان ایک سے زائد رسم خط میں لکھی جا سکتی ہے۔

اُردو کے کسی شاعر کے صوتی تار و پود کا تجزیہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس زبان کی بُنیادی آوازوں، اُن مخارج اور طریقِ ادائیگی سے بخوبی واقفیت رکھتے ہوں۔ اُردو کی بُنیادی اصوات دس مصوتے جنھیں حروفِ علت کہا جاتا ہے۔) اور ۳۷ مصمتے (یعنی حروف صحیح) ہیں۔ مصوتوں میں زیر (अ) درمیانی ہے، زیر (इ) ی (ई)، ـِ ے (ए) منہ کے اگلے حصے سے برآمد ہوتے ہیں۔ پیش (उ) و (ऊ)، و (ओ) ـَ و (औ) اور الف (आ) منہ کے پچھلے حصے سے نکلتے ہیں۔

جہاں تک مصمتوں کا تعلق ہے سب سے زیادہ تعداد بندشی (Stops) آوازوں کی ہے۔ یعنی ۲۱۔ اس کے بعد صفیری (Fricative) آوازیں آتی ہیں جو تعداد میں ۹ ہیں آوازوں کی دوسری اقسام انفی (Nasals) (م ن/ اور پہلوئی (Lateral) /ل/ اور تھپک دار Flaps /ڑ اور ڑھ/ ہیں۔ ان کے علاوہ ایک نیم مصوتہ /ی/ بھی ہے۔

بنیادی طور پر آوازوں کی دو قسمیں ہیں۔ مسموع (Voiced) اور غیر مسموع (Voiceless) اُردو کے سارے مصوتے مسموع ہیں اور اُن کی ادائیگی کے وقت صوت تنتریوں (Vocal card) میں تھرتھراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ مصوتوں میں مسموع کی تعداد ۲۲ ہے اور غیر مسموع کی ۱۵۔ اس طرح اُردو کے صوتی دام میں کل ۳۲ آوازیں مسموع ہیں اور ۱۵ آوازیں غیر مسموع۔

یہ ہے غالب کی صوتی جولاں گاہ اور میدانِ عمل۔ غالب اُردو کے علاوہ فارسی کے بھی شاعر تھے۔ دو لسانی شاعر ہونے کی حیثیت سے وہ دونوں زبانوں کے نظامِ صوت کا شعور رکھتے ہیں۔ جس طرح اُن کی فارسی دانی بلکہ پرستی نے اُن کی اُردو شاعری میں فارسی الفاظ و تراکیب کا غیر معمولی ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ اسی طرح فارسی آہنگ صوت میں مسلسل عمل کرنے کی وجہ سے انھوں نے اُردو نظام صوت میں خاصے ردّ و قبول سے کام لیا ہے۔ جہاں تک فارسی اور اُردو کے مصوتوں کے تقابلی مطالعہ کا تعلق ہے

بعید ہے سود ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان میں فارسی اُردو مصوتوں پر ڈھال کر بولی جاتی رہی ہے۔ ہندوستان فارسی بولنے والا "شیر بیشہ" اور "شیر مادر" تلفظ کے فرق کے ساتھ بولتا تھا جب کہ ایرانی یائے مجہول اور یائے معروف میں فرق نہیں کرتا البتہ جہاں تک مصوتوں کا تعلق ہے فارسی اور اُردو میں دو قسم کے اہم اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ایک تو فارسی میں اُردو کی کوز (Retroflex) آوازیں (ٹ، ٹھ، ڈ، ڈھ، ڑ، ڑھ) نہیں پائی جاتیں۔ دیوانِ غالب کے صفحے کے صفحے الٹتے جائیے۔ شاعر میر، سودا، اور نظیر اکبر آبادی کی صوتی روایت کے علی الرغم ان آوازوں سے مرکب الفاظ استعمال نہیں کرتا اور اگر کرتا ہے تو بہت احتیاط سے اور بہت کم۔ مثلاً غالب کی مشہور غزل جس کا مطلع یہ ہے ؎

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا

گیارہ اشعار کی یہ غزل ۲۰۲ الفاظ پر مشتمل ہے جن میں سے کوز آوازیں صرف چار لفظوں (جھوٹ، توڑ، ٹپکنا، اٹھتا) میں آئی ہیں۔ اس لحاظ سے تناسب دو فیصد سے زیادہ نہیں۔ یہی صورت دوسری کامیاب غزل

ع "نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے"

کی ہے۔ پوری غزل میں صرف چار لفظ ایسے آئے ہیں جن میں کوز آوازوں کو استعمال کیا گیا ہے۔ غالب کی بعض معرکۃ الآرا غزلیں جن میں کوز آوازیں مطلق استعمال نہیں ہوئی ہیں، حسب ذیل ہیں:

ع دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟
ع کوئی امید بر نہیں آتی
ع گئی وہ بات جو ہو گفتگو تو کیوں کر ہو
ع گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
ع اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
ع مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
ع یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
ع نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں
ع کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں
ع جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
ع کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ع آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
ع نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
ع ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
ع وہ میری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
ع تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا

یہ ایسی غزلوں کی مکمل فہرست نہیں تاہم اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ غالب کے کلام کے بہترین حصے میں ہند آریائی کوز آوازیں غائب ہیں۔ ان سے قطع نظر دیوانِ غالب میں ایسی غزلیں بھی بے شمار ہیں جن میں کوز آوازیں ایک یا دو بار استعمال میں آئی ہیں۔

صوتیاتی نقطۂ نظر سے اُردو کی کوز آوازیں وہ آوازیں ہیں جن میں زبان کی نوک موڑی جاتی ہے۔ اور پھر ہوا یا تو روک کر یا ایک تھپک کے ساتھ خارج کی جاتی ہے۔ /ٹ، ٹھ، ڈ، ڈھ/ بندشی آوازیں ہیں۔ لیکن ان میں ہوا زبان کی نوک موڑ کر اُوپر کے مسوڑھوں پر روک کو چھوڑی جاتی ہے۔ /ڑ۔ ڑھ/ تھپک دار آوازیں ہیں۔ اُن کی ادائیگی کے وقت ہوا مکمل طور پر نہیں روکی جاتی بلکہ ایک تھپک کے ساتھ چھوڑی جاتی ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر /ڑ، ڑھ/ مابعد کا ارتقا ہیں۔ اور قدیم کوز آوازیں جو ویدک سنسکرت سے اب تک آریائی زبانوں میں قائم ہیں /ٹ، ٹھ، ڈ، ڈھ/ ہی ہیں۔ ان میں /ٹ اور ٹھ/ غیر مسموع ہیں اور /ڈ اور ڈھ/ مسموع۔ ایک دوسرے لحاظ سے تقسیم کریں تو /ٹھ ڈھ/ ہکاری آوازیں ہیں جب کہ /ٹ اور ڈ/ غیر ہکاری۔ کوز آوازیں قدیم و جدید ایرانی میں نہیں پائی جاتیں ایرانی گروہ کی جس زبان میں ان کا چلن ملتا ہے وہ پشتو ہے۔ اس لئے ان آوازوں کو قبل آریائی کہا جا سکتا ہے۔ دراوڑی زبانوں میں خاص طور پر پائی جاتی ہیں۔

غالب کی ایرانی نسل اور اساتذہ کے بارے میں جو بھی شبہات ظاہر کئے جائیں، یہ امر مسلم ہے کہ جہاں تک اُردو کی کوز آوازوں کا تعلق ہے، ان کے شاعرانہ صوتی نظام میں ان کی حیثیت محض ضمنی ہے۔ انھوں نے ان آوازوں سے کوئی خصوصی تاثر قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ جہاں جہاں وہ اپنے کلام کے اچھے حصے میں اس سے مرکب الفاظ لائے ہیں، ان کو اپنے صوتی نظام سے ہم آہنگ کرنے میں انھیں کچھ دقت ہی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ان کی معرکۃ الآرا غزل

ع سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

میں کوز آوازیں صرف حسب ذیل مصرع اور شعر میں آئی ہیں

ع ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

ہ رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

پوری غزل پڑھ جائیے۔ ان مصرعوں پر صوت کی جو ٹھوکر لگتی ہے اور کہیں نہیں ملے گی۔ /ٹ + گ/، /ٹ + ج/ کا اتصال خود صوتی رخنہ اندازی کی غمازی کر رہا ہے۔

صوتی کھٹکے کا ایک اور مصرعہ ملاحظہ ہو

ع تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا

عام طور پر غالب نے کوز آوازوں کی ثقالت کو مصوتوں سے رام کیا ہے، چنانچہ ذیل کے مصرعوں میں کوز آوازوں کے استعمال کے باوجود ثقالت کا وہ احساس نہیں ہوتا جو مذکورہ بالا غزل کے مصرعوں میں ہوتا ہے۔

ع دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے (ٹ + ا)
ع غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی (ٹ + ی)
ع چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں (ڑ + ا)
ع بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کئے (ڑ + وں)
ع کٹتے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے (ٹ + ے)
ع دوڑے ہے پھر ہر ایک گل لالہ پر خیال (ڑ + ے)
ع حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد (ٹ + ا)
ع کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے (ڈ + زبر + و)
ع میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد (ڑ + زیر)
ع در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا (ٹ + زیر)
ع ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا (ڈ + زیر + تو)

لیکن جہاں غالب صرفی و نحوی وقفوں کی وجہ سے کوز آوازوں کے ساتھ مصوتوں کا اجتماع نہیں کر سکے ہیں، وہاں کوز آوازوں کی ثقالت کا اُن کے آہنگ کلام میں احساس ملتا ہے، مثلاً

ع غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں (ڑ + ج)
ع زنّار باندھ سبحہ صد دانہ توڑ ڈال (ڑ + ڈ)
ع اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے (ڑ + ن)
ع جو پا نو اٹھ گئے وہی اُن کے علم ہوئے (ٹھ + گ)
ع جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی (ٹ + ج)
ع اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے (ٹھ + ک)
ع گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا (ڑ + ب)
ع کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں (ڑھ + ی + نیم)
ع دل سے ہوائے کشت و خامٹ گئی کہ واں (ٹ + گ)

یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ غالب نے اُردو کی کوز آوازوں کا اتصال صرف آوازوں کے ساتھ نہیں کیا ہے۔ ممکن ہے مزید چھان بین سے کوئی ایک آدھ مثال مل جائے لیکن حسب ذیل صوتی اجتماع بادی النظر میں نہیں ملتا: /ٹ + ش/ - /ڑ + ز/ - /ڈ + ف/ - /ٹھ + س/ - /ڑ + ج/ - /ٹ + غ/ وغیرہ۔ اُردو زبان میں خالص ہند آریائی آوازوں (ٹ، ٹھ - ڈ، ڈھ - ڑ، ڑھ - پھ، بھ - تھ، دھ - جھ، چھ - کھ، گھ) کے ساتھ خالص عربی فارسی آوازوں (ق، غ - ف - ز - خ - ژ) کا اجتماع اُردو شاعر کے لئے ایک عجیب و غریب مخلوط نظام صوت فراہم کرتا ہے۔ غزل کا عام مزاج صوتی اعتبار سے بھی ایرانی ہے۔ غالب نے زبان کی دیگر سطحات کی طرح اُردو کی صوتیاتی سطح پر بھی ان ایرانی اثرات کا غلبہ قائم کیا ہے۔ غالب کے کلام کے صوتی نظام کا یہ صرف ایک پہلو ہے اس مفروضے کی تصدیق کے لئے، اس کے دوسرے پہلوؤں پر اس نقطۂ نظر سے کام کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

بقیہ غالب کی شاعری میں جنس

کے حوالے سے اس کے پاؤں کا تذکرہ ہو بلکہ "ہلتے ہیں خود بخود میرے اندر کفن کے پاؤں" کہہ کر اپنے پاؤں کا تو ذکر کر ہی دیا۔

اس امکانی اعتراض کی طرف یوں اشارہ کر دیا کہ غالب کے یہ اشعار میری دانست میں کیونکہ اُس کی جنسیت کے ایک اہم زاویہ پر روشنی ڈالتے ہیں (وہ ناکافی ہی سہی) اس لئے اس ضمن میں پیدا ہونے والی غلط فہمی کی وضاحت بھی لازمی تھی۔ اب اشعار ملاحظہ ہوں۔

لے تو لوں سوتے میں اُس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیمتن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

اس کے برعکس میر کے ہاں زیادہ والہانہ پن ملتا ہے،

آنکھیں کفک سے اس کی لگا کر خاک برابر بھی ہوئے
مہندی کے رنگ ان پاؤں نے تو بہتوں کو پامال کیا

اس کی پا بوسی کی توقع پر
اپنے تئیں خاک میں ملائے تھا

تہذیبِ غزل

روشؔ صدیقی

نازفرما ہے فروغِ شعلۂ رخسارِ دوست
سر جھکا دے ، اے ہجومِ حسرتِ دیدارِ دوست

عشق کہتا ہے کہ ہے دشمن کی غم خواری بھی شرط
یہ تو آساں ہے کہ کوئی دوست ہو غم خوارِ دوست

حادثہ کچھ سخت گذرا ہے مسیح و خضر پر
سرنگوں بیٹھے ہیں زیرِ سایۂ دیوارِ دوست

عشق نے سلجھا دیئے ، سب زندگی کے پیچ و خم
یہ سلیقہ ہے عطائے گیسوئے خم دارِ دوست

حرفِ انکارِ محبت کی دلِ آویزی نہ پوچھ
جیسے سچ مچ مل گئی ہو دولتِ اقرارِ دوست

جان دیتے ہیں جو نادیدہ جمالِ یار پر
دیکھ اُن کو بھی ذرا اے طالبِ دیدارِ دوست

ذکرِ دنیا ، فکرِ عقبیٰ ، گم ہوئے اس شغل میں
زندگی کو ہم نے سمجھا اہتمامِ کارِ دوست

اس ہجومِ بے نیازی میں بہت یوسف ہیں گم
اک ذرا پاسِ ادب اے دل سرِ بازارِ دوست

حسنِ تہذیبِ غزل ، کچھ اور ہے اے نکتہ داں
جا کہیں سے لا ، جنونِ شوخیٔ گفتارِ دوست

زندگی کی رات آنکھوں میں کٹے گی اے روشؔ
سہل مت جانو ، پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

مجھ سا آشفتہ نوا ، اور مصرعۂ غالب روشؔ
کچھ نہ کچھ کہنا پڑا آخر کہ تھا اصرارِ دوست

آج کل دہلی (غالب نمبر)

ضیا احمد بدایونی

محاوراتِ غالب

ایک ادبی شاہ کار کو جانچنے کے لئے مواد و ہئیت دونوں کو پرکھنا ضروری ہے۔ مواد رُوح ہے اور ہئیت جسم۔ اور زندگی روح و جسم دونوں کے تعاون سے عبارت ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ادب کے لئے ہئیت کی حیثیت مقدم ہے اور مواد کی ثانوی۔ پوپ نے تو صرف اتنا ہی کہا تھا کہ "اسلوب خیال کا لباس ہے"۔ کارلائل نے اس حقیقت کو زیادہ صحت کے ساتھ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ "اسلوب کسی ادیب کا کوٹ نہیں ہے کہ جب چاہا اُتارا اور جب چاہا پہن لیا۔ یہ اُس کی جلد ہے"۔ دراصل یہ تفریق و تقسیم بھی مسئلے کی توضیح اور تجزیہ کی سہولت کے پیش نظر کی گئی ہے۔ ورنہ جہاں تک ادب و شعر کا تعلق ہے ادیب و شاعر کے ذہنی عمل میں اور نیز اس کی خارجی تشکیل میں مواد و ہئیت ایک وحدت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسلوب جو ہئیت کا دوسرا نام ہے ایک فن کار کی شخصیت کے متعین کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔ یہ خیال ہمارے ناقدین کی طرف سے بار بار دُہرایا گیا ہے۔ ہمیں اس سے انکار نہیں، لیکن اگر ہم اس کی حدود کو پیش نظر رکھے بغیر اس کو بے کم و کاست تسلیم کر لیں تو یہ گمراہی کا سبب ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ ادیب و شاعر کا رول ایک مصوّر کا سا ہے۔ جس طرح مصوّر کبھی بالقصد اور کبھی وسائل کے فقدان کی مجبوری سے تصویر کے گرد و پیش کے مناظر کو کسی جگہ نمایاں اور کسی جگہ دُھندلا کر کے دکھاتا ہے، اُدیب یا شاعر بھی ہمیشہ ایک صداقت کو بتمام پیش نہیں کرتا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہلکے خطوط جو اُس نے کھینچے ہیں وہ خود چھوٹے ہوئے خطوط کو سمجھانے (Suggest) کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ جو چیز اسلوب کے بارے میں بیان کی گئی وہی پوری شاعری یا پورے ادب پر بھی صادق آتی ہے۔ جیسا کہ پروفیسر آل احمد سرور نے ایک جگہ کہا ہے "کہا جاتا ہے کہ شاعری شخصیت کا آئینہ ہے۔ یہ قول نہایت گمراہ کن ہے جس طرح آئینے میں کسی شخص کا عکس نظر آجاتا ہے اس طرح شخصیت کا عکس شاعری میں نظر نہیں آتا۔ نہ شخصیت اتنی سادہ اور واضح شے ہے اور نہ شاعری اتنی شفاف اور ہموار سطح رکھتی ہے کہ ہمیں شاعر کی شخصیت اُس کے کلام میں بجنسہٖ نظر آئے۔ شخصیت شاعری میں مزور جھلکتی ہے مگر اس پر شاعری کے مخصوص اظہار اور فن کے تقاضوں کا پردہ ہوتا ہے۔"

ان تمام حد بندیوں کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک بڑے فن کار (ادیب یا شاعر) کے یہاں اسلوب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسلوب دراصل ایک طرح کی علامت ہے جو اپنے خالق کی طرف کم و بیش اشارہ کر ہی دیتی ہے۔ جب ہم فردوسی و نظامی، انوری و خاقانی، سعدی و حافظ یا میر و سودا، ذوق و مومن، داغ و امیر وغیرہ کا کلام سُنکر کہتے ہیں کہ اس میں اُن کا خاص رنگ ہے یا نہیں تو اسی حقیقت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔

اسلوب کے اجزائے ترکیبی کیا ہوتے ہیں اس کا جواب بہت مشکل ہے۔ اوّل تو ہر فنکار کا اسلوب جدا ہوتا ہے اس کے علاوہ وہ کوئی ایسا کیمیچر نہیں جس کو دیکھ کر اس کے اجزا کی الگ الگ نشاندہی کی جا سکے۔ سائنس کی دُنیا میں تو ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک مرکّب کو آلات کی مدد سے جانچ کر اس کے اجزا کی نشان دہی کر دیں۔ مگر ذہنی یا روحانی فضا میں یہ آلات کام نہیں دیتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصل خیال یا جذبے کے علاوہ ہر چیز، زبان،

بیان، تراکیب، روزمرہ، محاورہ، تمثیل، تشبیہ، استعارہ اور اسلوب کے تحت آجاتی ہے۔ پھر بھی ہر فن کار کا انداز (Mode) ایسی چیز ہے جس کا تجزیہ یہ کما حقہ، دشوار ہے۔ بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُس کے علائم اور آثار کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے صحیح کہا ہے کہ "لسانیات کے باب میں تحلیل اور تجزیئے کے وہ اصول عہدہ برآ نہیں ہو سکتے جو طبیعیات و مادیات پر حاوی ہیں۔ زبان سالمات و سالبات کے قدغن سے مبرا ہے" پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے اسی بحث کو دُوسرے پہلو سے زیادہ واشگاف طور پر پیش کیا ہے وہ لکھتے ہیں "ادب اور زبان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہر ادبی کارنامے خصوصاً شاعری کے میدان میں آخری تجزیئے میں دراصل زبان ہی عہدہ برآ ہونے کا ایک وسیلہ ہے۔ تخلیقی عمل میں الفاظ کو اضافی یا آرائشی چیز سمجھنا یا انھیں ایک منفعل (Passive) وظیفے کا حامل سمجھنا صریح غلطی ہے کیوں کہ الفاظ ہی کی وساطت سے خیالات و جذبات کے مرکب (Complex) کی داگذاشت عمل میں آتی ہے اور اُسی کی مدد سے عام تجربہ گہرائی اور معنی خیزی حاصل کرتا ہے۔"

بقول فراق "غزل کے اشعار میں بسا اوقات ایک لفظ یا دو تین لفظوں کا ٹکڑا جادو کا حکم رکھتا ہے اور سہل ممتنع کے کئی مدارج ایک (بظاہر) معمولی لفظ یا ٹکڑے سے طے ہو جاتے ہیں غرض زبان و بیان کی سحر طرازی سے کوئی بڑے سے بڑا نابغہ (Genius) بے نیاز یا کوئی سخت سے سخت ناقد شکر نہیں ہو سکتا۔ آج کی صحبت میں ہم چاہتے ہیں کہ مرزا غالب کے اُردو کلام میں جو محاورات استعمال ہوئے ہیں، ان کی افادیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں۔

محاورہ یوں تو گفتگو یا بات چیت کے معنی دیتا ہے لیکن زبان داں اصحاب کی اصطلاح میں جب ایک یا کئی لفظ مصدر سے مل کر حقیقی معنی سے متجاوز ہو کر کچھ دُوسرے معنی دیں تو اُس کو محاورہ کہتے ہیں مثلاً اُتارنا از روئے لغت کسی چیز کو اُوپر سے نیچے لانا ہے۔ مگر جب ہم احسان اتارنا، نقل اُتارنا، تصویر اُتارنا بولتے ہیں تو محاورہ بن جاتا ہے۔ غالب فارسی زبان کے ساتھ اُردو پر بھی کامل قدرت رکھتے تھے۔ انھوں نے بکثرت محاورے برتے ہیں جن میں سے کچھ پہلے سے زبان میں متعارف تھے اور کچھ انھوں نے خود فارسی سے ترجمے کے ذریعے سے اخذ کئے۔ اگرچہ محاورے میں تصرف یا ترجمہ جائز نہیں مگر اُن کو اپنے اجتہادات پر اصرار تھا۔ اس کی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اُن کی آزاد طبعی ادب و زبان میں قیود اور حدود کی قائل نہ تھی۔ دوسرے وہ جانتے تھے کہ اُردو کے مقابلے میں فارسی ایک ترقی یافتہ زبان ہے جس میں مختلف مطالب کو ادا کرنے کے لئے بنے بنائے پیمانے موجود ہیں ان پیمانوں میں حسن بھی ہے، ایجاز بھی۔ اس لئے شاعر کا فرض ہے کہ یا تو ان کو جوں کا توں استعمال کرے یا اُن کا ترجمہ دیدے چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ یہ یقیناً زبان کی توسیع کی طرف ایک مبارک اقدام تھا۔ لیکن جب تک عوامی چلن زبان کی پشت پر نہ ہو اس کا چلنا اور رواج پانا بہت مشکل ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس قسم کے ترجمے کم مقبول ہوئے۔ ذیل کی مثالوں سے اُن کے استعمال کردہ محاورات کی نوعیت ظاہر ہوگی۔

جوئے شیر لانا: کوئی بڑا کٹھن کام انجام دینا۔ فرہاد کی کوہ کنی کی طرف اشارہ ہے۔ غالب لکھتے ہیں:

کاوِ کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

دامِ شُنیدن بچھانا: سُننے کی تدبیر یا کوشش کرنا۔ سننے کو جال قرار دیا ہے۔ جس سے مدعا یا مضمون گرفت میں آسکتا ہے۔

آگہی دامِ شُنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بہ روئے کار آنا: میدان میں آنا۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا

نقش درست کرنا: نقش قائم کرنا۔ درست کردن نقش فارسی میں بولتے ہیں۔

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دُود تھا

مدعا پانا: مراد پانا۔ مگر غالب کے شعر میں مدعا پانا بات کی تہ کو پہنچنا کے معنی میں آیا ہے۔

کہتے ہو کہ نہ دیں گے دلِ اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ کم کیجئے ہم نے مدعا پایا

مرغوب آنا: مرغوب ہونا۔

شمار سبحہ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردن صد دلِ پسند آیا

دانت میں تنکا لینا: خس بہ دنداں گرفتن کا ترجمہ ہے اور فارسی دانانِ ہند کی ایجاد ہے۔ ہندوستان میں قاعدہ تھا کہ جو شخص مغلوب ہوتا وہ غالب کے سامنے دانت میں تنکا دبا کر حاضر ہوتا یعنی ہم تمہاری گئو (گائے) ہیں۔ یہ اظہارِ عجز کا طریقہ تھا۔

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

تماشا کرنا: یعنی دیکھنا تماشا کردن سے ماخوذ ہے۔ ورنہ اردو میں تماشا کرنا بازی گروں کا کام ہے۔

اُگا ہے گھر میں ہر سُو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

لہو پانی ہونا: انتہائی اذیت اُٹھانا۔

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

عرفہ ہونا: نفع ہونا، بہجت ہونا۔

عرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

اسی طرح مرزا نے کھلنا مختلف الفاظ کے ساتھ مختلف معانی میں استعمال کیا ہے۔ یعنی وا ہونا، بے تکلف ہونا، زیب دینا وغیرہ

گلستاں ہونا: پھولنا، پھلنا۔

لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا

برباد دینا: (بہ باد دادن) برباد کرنا۔

نالہ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بہ باد
یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

جگر تشنۂ فریاد آنا: فریاد کا مشتاق ہونا۔ جگر تشنہ بمعنی مشتاق۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

جائے دو ہوائے یک نگہِ گرم ہونا: کسی کا (معشوق کا) ایک نگاہ غضب کا آرزومند ہونا۔

جاں در ہوائے یک نگہِ گرم ہے اسد
پروانہ ہے وکیل ترے دادخواہ کا

دندانے کا دزقے کرنا: (انگلی کو) دانتوں سے کٹوانا افسوس کے طور پر۔

افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی درخورِ عقد گہر انگشت

انگشت دکھلانا: شوخی سے انگوٹھا دکھانا۔

کافی ہے نشانی ترے چھلے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلانے کو وقتِ سفر انگشت

انگشت رکھنا: اعتراض کرنا، نکتہ چینی کرنا۔

لکھتا ہوں اسد سوزشِ دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

نفس کھینچنا: سانس لینا۔ نفس کشیدن کا ترجمہ ہے۔ اسی طرح انتظار کھینچنا۔ انتظار کرنا جو فارسی میں انتظار کشیدن تھا۔

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

علیٰ ہذا ناز کھینچنا۔ حالاں کہ اردو محاورہ ناز اُٹھانا ہے۔ سب سے پُرلطف کبابِ دلِ سمندر کھینچنا ہے جس سے مراد دسترخوان پر سمندر کے دل کے کباب چُننا ہے۔ یہ ان محاورات میں ہے جن کو اردو مطلق ہضم نہیں کر سکی۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے بعض لوگ انگریزی کی تقلید میں کہہ دیتے ہیں کہ میں نے چائے لے لی۔ میں نے دوا لے لی، یعنی پی لی۔

مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں
بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

سفیدی پھرنا: دیوار وغیرہ پر سفیدی کرنا۔

نہ چھوڑی حضرتِ یوسفؑ نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوبؑ کی پھرتی ہے زنداں پر

آئینہ باندھنا: آئینہ لگانا یا نصب کرنا۔

بزنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بے تابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

تسلی ہونا: بمعنی تسلی پانا۔ فارسی میں تسلی شدن مستعمل ہے۔ صائب لکھتا ہے:

ز حسن شوخ تسلی مشو بہ دیدنِ خشک: گلے کہ می رود از دست از وگلاب بگیر

جگر تشنہ آزار تسلی نہ ہوا
جوئے خوں ہم نے بہائی بن ہر خار کے پاس

آتش لگانا: آگ لگانا کے موقع پر اردو میں صحیح نہیں۔ مگر غالب کہتے ہیں

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگا دے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

ا اسی قبیل سے ہے خمیازہ کھینچنا (انگڑائی لینا)، منت کھینچنا (احسان اُٹھانا)

ارزانی دھنا :- مبارک ہونا۔ یہ بھی فارسی کا اثر ہے۔

مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہو جیو
نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

سر ہونا : پیچھے پڑ جانا۔ نیز رسائی ہونا (مہم سر ہونے کے قیاس پر)

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

عہدے سے باہر آنا : اُردو میں عہدہ برآ ہونا مستعمل ہے۔

عہدے سے مدح ناز کے باہر نہ آسکا
گر اک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں

پاؤں میں چکر ہونا : آوارہ گردی کی عادت ہونا۔

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

دریغ آنا کسی کام میں تامل ہونا۔

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

آگے والے اشعار میں باندھنا مختلف مفاہیم کا فائدہ دیتا ہے مثلاً نظم میں کوئی مضمون استعمال کرنا نیز شہرت دینا۔ دھوم مچانا جیسے

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

ہماری زبان میں مہندی (یا حنا) لگانا بولا جاتا ہے۔ مگر فارسی میں حنا بستن برابر آتا ہے۔ غنی نے لکھا ہے۔

جلوۂ حسن تو آورد مرا بر سر فکر
تو حنا بستی و من معنیٔ رنگیں بستم

غالب بھلا کیوں کر نہ لکھتے۔

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

پیمان باندھنا بھی اُردو میں کم آتا ہے۔ عہد و پیماں کرنا عموماً استعمال میں ہے مگر غالب کہتے ہیں۔

سادہ پُرکار ہیں خوباں غالب
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

پُرافشاں ہونا : پھڑپھڑانا۔ مضطرب ہونا

ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پرافشاں جوہر آئینے میں مثلِ ذرہ روزن میں

منت اُٹھانا : احسان اٹھانا۔

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق
یعنی ہنوز منتِ طفلاں اٹھائیے

طرف ہونا : مقابل ہونا۔ حریف ہونا۔ فارسی میں رائج ہے صائب کہتے ہیں۔

کارِ مرداں نیست با نامرد گردیدن طرف
ورنہ رستم از گریبانِ فلک کوتاہ نیست

اُردو کے اساتذہ کے یہاں بھی ملتا ہے۔ سودا

سودا تو اس زمین میں غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میر سے اُستاد کی طرف

اس کے مقابلے میں میر کی بد دعائی بھی ملاحظہ فرمائیے۔

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں
یونہی سودا کبھی ہوتا ہے، سو جاہل ہے کیا جانے

غالب نے بھی ایک شعر میں یہ محاورہ برتا ہے۔

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد
زنہار نہ ہونا طرفِ ان بے ادبوں سے

اجارہ کرنا : ذمہ داری قبول کرنا۔

غالب ترا احوال سنا دیں گے ہم اُن کو
وہ سن کے بُلا لیں یہ اجارہ نہیں کرتے

جاگرم کرنا : جاگرد کردن کا ترجمہ ہے۔ یعنی قرار پکڑنا۔ بیدل کہتا ہے۔

ایام چوں فتیلۂ داغم تمام سوخت
تا ہمچو شمع پیش تو جا گرم کردہ ام

اُردو میں یہ محاورہ نہیں چلا۔ مگر غالب نے لکھا ہے۔

کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا
آئے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

کھویا جانا : (حیران ہونا) اور پایا جانا (سمجھ جانا) اچھے محاورے ہیں۔ جو بہت برمحل صرف ہوئے ہیں۔ ایہام تضاد بھی بے ساختہ آگیا ہے

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

دل بیٹھنا: (متعارف محاورہ تھا مگر مرزا نے فارسی کے محاورے نقش نشستن (اعتبار پیدا کرنا) سے نقش بیٹھنا بھی مستعار لیا اور پورے بندوبست کے لئے استعمال کیا۔

اس کی بزم آرائیاں سن کر دلِ رنجور یاں
مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

رنگ کھلنا: رنگ صاف ہونا۔ رنگ اڑنا۔ رنگ فق ہونا۔ منہ اُتر جانا۔

ہو کے عاشق وہ پری رو اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

نقش (تصویر) کے لیے دو فعل متعدی اور لازم کھینچنا اور کھنچنا ایک شعر میں لائے ہیں۔ پہلا تصویر کشی کے اور دوسرا غرور و ناز کے مفہوم میں اور دونوں پُر لطف ہیں۔

نقش کو اُس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اُتنا ہی کھنچتا جائے ہے

گل کترنا (گل تراشیدن): کاغذ کے پھول بوٹے بنانا۔

دیکھو تو دلِ فریبیٔ اندازِ نقش پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

تقریر کرنا: کلام کرنا۔ شک کرنا۔

کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

جگر کھودنا: کلیجہ چھلنا یا زخمی کرنا جس کو فارسی والے جگر کاویدن کہتے ہیں۔

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

گفتار میں آنا: گفتار آمدن سے لیا ہے۔ مگر اردو نے اُسے اب تک قبول نہیں کیا ہے۔

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آئے
جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آئے

مستی جھاڑنا: مستی نکال دینا۔ دور کر دینا۔

غم زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اُٹھاتے تھے لذّت الم آگے

آگے آنا: بدلا ملنا۔

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
تمہارے آئیو اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

چل نکلنا: ہنگامہ برپا کرنا۔

میں انھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پیے ہوتے

دن پھرنا: قسمت کا موافق ہونا۔ مشہور اور متعارف محاورہ ہے۔

شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر
دیکھیے کب دن پھریں حمام کے

پہلو تہی کرنا: بے اعتنائی کرنا، جا خالی ہونا۔ کسی غیر حاضر شخص کی موجودگی کا ناپسندیدہ ہونا۔ اس موقع پر اہل ایران کہتے ہیں جائے فلاں خالی است یا سبز است یا پیدا است۔

تغافل دوست ہوں میرا دماغِ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجئے تو جا میری بھی خالی ہے

خوش آنا: بھانا

گلشن کو تیری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے
ہر غنچے کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

پشت گرمی دینا: تقویت پہنچانا۔

سیماب پشت گرمیٔ آئینہ دے ہے ہم
حیراں کیے ہوئے ہیں دلِ بے قرار کے

لیجیے: کھینچنے کے محاورے نے پھر کشش کی۔ مے کھینچنا، شراب پینا (یعنی مے کشی)۔ اپنے کو کھینچنا، اپنے آپ کو الگ رکھنا، پرہیز کرنا

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر
جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے

اگلے شعر میں سمجھنا، جاننا اور سمجھنا یعنی سزا دینا اردو کے مشہور محاورے ہیں۔

چاہنے کو ترے کیا سمجھا تھا دل
بارے اب اُس سے بھی سمجھا چاہیے

جاننے بننا اور **جانتے** بنانا میں بظاہر تو "یک الف بیش" کوئی فرق نہیں لیکن دراصل دونوں میں بڑا بُعد ہے۔ پہلا تدبیر کار گر ہونا کے اور دوسرا

حیلے بہانے سے کام لینا کے معنی میں آتا ہے۔

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

زہر اُترنا: یوں تو ایک مبارک فال ہے لیکن اگر رگ و پے میں اُترنا کہیں تو سمجھ لیجئے کہ بُرا حال ہے۔

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کامِ و دہن کی آزمائش ہے

آنکھیں دکھلانا بھی اسی قبیل کا محاورہ ہے۔ اگر کوئی خوش چشم آنکھیں دکھلائے (دکھائے) تو سینکڑوں نظر باز نظارے کے لئے ٹوٹ پڑیں۔ لیکن اگر نگاہِ عتاب بھی شامل ہو تو ہر کسی کا ٹھہرنا مشکل ہو۔

منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا، پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

پاک ہوجانا: چھٹے ہوئے رند بن جانا۔

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

نیز پاک ہوجانا، حساب صاف ہوجانے اور جھگڑا فیصل ہونے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

صَرف بہائے مے ہوئے آلاتِ مے کشی
تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

راہِ سخن واہونا: گفتگو کا ڈھب پیدا کرنا۔

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

اٹھا دینا: نکال دینا، اٹھا دینا، کسی جگہ سے اٹھانا بٹھانا کی ضد۔ نیز مُردے (جنازے) کو کاندھے پر لے کر چلنا۔

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

بھرم کھل جانا: اعتبار جاتا رہنا۔

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے!

پیچ آپڑنا: ضد ہوجانا۔ بات کی لاج ہونا۔

پیچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

وقت پڑنا: مصیبت آنا۔ ذیل کے شعر میں 'سایہ' کے لفظ سے خاص فائدہ لیا ہے۔ کیوں کہ سائے سے وقت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

آنکھ پڑنا: حسرت یا رغبت سے نظر کرنا۔

اک خوں چکاں کفن پہ کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

چور بننا: چھپے چھپے پھرنا۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

متداول دیوان کے علاوہ نسخۂ حمیدیہ میں بھی گلدستہ باندھنا (سجانا) آئینہ باندھنا (لگانا۔ رکھنا) وغیرہ ملتے ہیں۔ جن میں فارسی کی تقلید صاف جھلکتی ہے۔

اُن محاورات سے قطعِ نظر، جو پہلے سے زبان پر رائج تھے، مرزا نے بکثرت نئے محاورات برتے ہیں جو اُن کی مجتہدانہ طبیعت کی پیداوار ہیں اور جن میں سے اکثر کو قبولِ عام کی سند نہیں ملی۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ وہ محاورے دوسرے شعراء کی طرح صرف محاورے کی خاطر نہیں لائے گئے بلکہ اُن کو مرزا کے فن میں وہی حیثیت حاصل ہے جو ایک مشین میں اہم پرزوں کو حاصل ہوتی ہے۔ انھوں نے سچ کہا ہے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظِ غالب مرے اشعار میں آئے

بقیہ دلی کی سماجی زندگی

کا جیسا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہو سکتا۔ خطوں میں کاتب مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے، جو خیال اُس کے دل میں ہوتا ہے ..... اُسے کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے۔ اور اگر وہ دل ایسا ہو جو سراسر درد سے لبریز ہو، جس میں ہمدردیٔ نوعِ انسان کوٹ کوٹ کر بھری ہو، جو پریم کے رس سے سینچا گیا ہو تو بتاؤ کہ اُس دل کی تراوش کیسی ہوگی۔ اگر تم ایسے دل کی زیارت کرنی چاہتے ہو، تو آؤ اور دیکھو کہ وہ پاک دل اِن خطوں میں لپٹا ہوا ہے۔"

بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی

غزل

جب تک مرا سجود ترا در نہ ہوا تھا
گردوں پہ شرف مجھ کو میسّر نہ ہوا تھا

شاید مری تقصیر کی تقریب سے پہلے
برپا کوئی ہنگامۂ محشر نہ ہوا تھا

صدمات مسلسل سے بھی ہوتا نہ شکستہ
دل سخت ہوا تھا ابھی پتھر نہ ہوا تھا

گستاخیٔ بے باک کا کیا حوصلہ کرتا
دل زلف کی مانند ابھی خود سر نہ ہوا تھا

کیا سوچ کے گل چیں کی ہوئی اس پہ توجہ
اک پھول کا دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

جذبات جنوں زا نے مرے ہوش اڑائے
میں جامۂ ادراک سے باہر نہ ہوا تھا

جس شوق سے اب خانہ خرابی پہ تلا ہوں
اس شوق سے تعمیر مرا گھر نہ ہوا تھا

آیا ہوں وطن میں تو حوادث سے گھرا ہوں
غربت میں بپا قہر یہ مجھ پر نہ ہوا تھا

کیا کاتب تقدیر پہ آتا کوئی الزام
تحریر کوئی حرف مکرّر نہ ہوا تھا

دیکھا ہے جو مجھ کو تو لبوں پر ہے تبسّم
اب تک کرم ایسا کبھی مجھ پر نہ ہوا تھا

میں سوچ کے انجام جراحت تڑپ اٹھا
اک رگ میں بھی داخل ابھی نشتر نہ ہوا تھا

اتنا تو مجھے یاد ہے درماندہ بھی رہ کر
دیوار کے سائے کا میں خوگر نہ ہوا تھا

تشنہ ہی رہی تھی مری دیوانگی جب تک
گوشہ کوئی صحرا کا مرا گھر نہ ہوا تھا

دامان و گریباں نہ سلامت رہے پھر بھی
دیوانہ سا دیوانہ منوّر نہ ہوا تھا

جگن ناتھ آزاد

غالب

ثانی ترا پھر آ نہ سکے گا جہان میں — "لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہے تو
تیرے ہی دم سے خاکِ وطن آسماں ہے آج — "رُتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہے" تو
تیرا ہر ایک شعر ستاروں کا کارواں — "کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہے" تو
نازاں ادب ہے تجھ پہ تفکّر کو تجھ پہ ناز — ہے فلسفی بھی محض سخن ور نہیں ہے تو

ایماں کو جس سے بیر ہو مذہب کو جس سے ضد
بتخانۂ وطن کا وہ آذر نہیں ہے تو

عالم ہے تیرے فکرِ نہاں کی تلاش میں — "عرضِ متاعِ عقل و دلِ وجداں کیے ہوئے"
دُنیا ہے تیرا شعر سمجھنے کے شوق میں — ایماں کو کفر، کفر کو ایماں کیے ہوئے
تجھ کو عطا ہوئی تھی ازل سے وہ موجِ فکر — گذری جو دشت و در کو گلستاں کیے ہوئے
عالم کے اہلِ فکر کہ تجھ تک پہنچ سکیں — ہیں اپنی بزمِ شوق چراغاں کیے ہوئے

تیرا کلام آج بھی پڑھتے ہیں اہلِ دل
"جاں نذرِ دلفریبیٔ عنواں کیے ہوئے"

تیرے کلام نے یہ دیا شاعروں کو درس — ہر لمحہ تازہ فکر نئی بات چاہیے
یہ کہہ رہا ہے تیرا قصیدہ ہے یا غزل — "ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے"

چاہے نشہ خودی کا ہو یا بے خودی کا ہو
"عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے"

دل پھر ہیں بے قرار اُس آواز کے لیے — اک دور اپنے ساتھ جو لے کر گذر گئی
وہ مثنوی کی ہے کہ قصیدے کی ہے ادا — جو بھی ادا ہے دل سے جگر تک اُتر گئی
دم سے ترے غزل کا مقدر چمک اُٹھا — تیرے طفیل نظم کی قسمت سنور گئی
زندہ ہے تجھ سے شیوۂ اہلِ نظر کا دور — گو آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی
باقی ہے آج بھی جو ہنر ہے تری عطا — یوں ورنہ قدر و قیمتِ فن و ہنر گئی
قطرے میں دجلہ، جز میں کل دیکھتی ہو جو — اس دور میں وہ چشمِ حقیقت نگر گئی
تیرے ادب کی بات کرے تجھ سے کون اب — کل تو گیا کو ہم پہ قیامت گذر گئی

ہے ابتری کی نذر جہانِ سخن تمام
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خواب سحر گئی

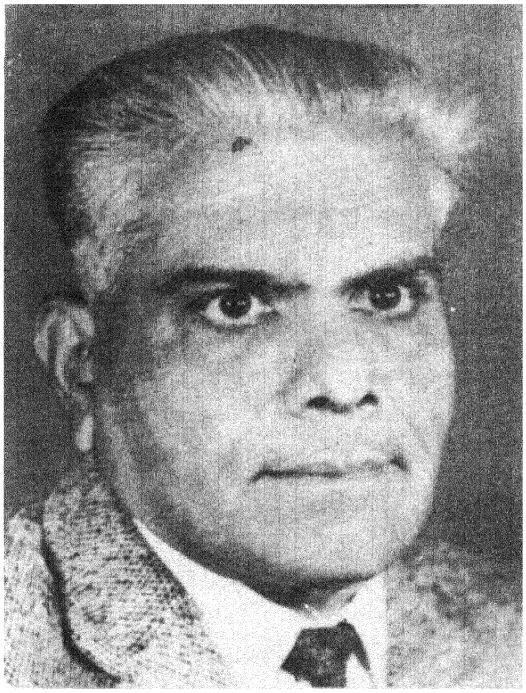

سخی حسن نقوی

دلی کی سماجی زندگی

خطوطِ غالب کے آئینے میں

مولانا حالی نے سچ کہا ہے کہ مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر اُن کی اُردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے ویسی نظم اُردو اور نظم فارسی اور نثر فارسی سے نہیں ہوئی[1]۔ اسی خیال کی وضاحت عہد جدید کے نقاد مرزا محمد عسکری نے کی ہے جو لکھتے ہیں۔

"یہ عجیب بات ہے کہ مرزا نے فارسی نظم و نثر میں اُردو سے چند چہار چند زیادہ لکھا، مگر اس میں اُن کو وہ شہرت و مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ متمنی اور مستحق بھی تھے۔ برخلاف اس کے اردو نظم و نثر کو وہ ہمیشہ دون مرتبہ سمجھتے رہے اور اس کی اشاعت کے بھی وہ زیادہ خواستگار نہ تھے، مگر اس کو قسمت کی ستم ظریفی سمجھنا چاہیے کہ ایک مختصر دیوان اور چند خطوط کی بدولت اُن کو وہ شہرتِ عظیم حاصل ہوئی جو اُردو تو اُردو کسی فارسی شاعر کو بھی بہ استثنا چند بہ مشکل نصیب ہوئی ہوگی[2]۔"

خطوطِ غالب کی ادبی اہمیت کو تمام ادبی دُنیا نے بالاتفاق تسلیم کیا ہے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ مرزا کی نثر پر لوگوں نے توجہ کم کی ہے اور وہ ہنوز تحقیق و تدقیق اور عمیق مطالعہ کی محتاج ہے۔ موجودہ دور میں غالب پر کافی تحقیقی کام ہوا ہے، لیکن خطوطِ غالب کا تجزیہ اب بھی بہت کم لوگوں نے کیا ہے۔

خطوطِ غالب دلی کی ہمعصر سماجی زندگی پر بڑی دلچسپ و کارآمد روشنی ڈالتے ہیں۔ ان خطوط میں غالب نے سادہ، سلیس، عام فہم، اور بول چال کی زبان میں دلی کی معاشرت، غدر کے زمانے کا آنکھوں دیکھا حال، اُس کا ردِ عمل، دلی کی مہنگائی، بدنظمی اور طوائف الملوکی اور بہت سی دیگر سماجی باتوں کا تذکرہ اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے۔

غالب کی ہمعصر دلی میں جاگیردارانہ نظام سوسائٹی کے رگ و پے میں رچا ہوا تھا۔ ایک دلی ہی نہیں بلکہ سارا ملک اس وقت ایک عظیم سیاسی اور سماجی انقلاب سے دوچار تھا۔ شہنشاہیت اور نوابیت دم توڑ رہی تھی۔ غالب کے عہد کا ہندوستان اور غالب کی دلی دورِ انقلاب کے فرانس اور پیرس کا نقشہ پیش کر رہے تھے جس میں امرا نام کے امیر رہ گئے تھے اور اصلاً اُن کی ریاست اور امارت ختم ہو چکی تھی۔ رسّی جل گئی تھی مگر بل نہیں گئے تھے۔ غالب بھی اسی نظام کے نمائندہ تھے۔

اگرچہ غالب ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہے اور اُن کی اکثر و بیشتر زندگی مالی مشکلات میں گذری لیکن وہ نواب بہرحال تھے۔ اُن کے خطوط میں ان کی مفلسی اور عسرت کی طرف بے شمار اشارے ملتے ہیں، یہاں تک کہ شراب تو درکنار ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ روٹیوں کے لیے محتاج نظر آتے ہیں۔ ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں!

"وہ عزت اور وہ ربط ضبط جو ہم رئیس زادوں کا تھا اب کہاں روٹی کا ٹکڑا ہی مل جائے تو غنیمت ہے[3]۔"

---

[1] مولانا حالی۔ یادگارِ غالب ص ۱۷۹ [2] مرزا محمد عسکری: ادبی خطوط ص ۵۔ [3] غالب: اُردوئے معلیٰ

اسی طرح میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں:

"کتابیں کہاں سے چھپواتا۔ روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے آتے ہیں۔ لحاف توشک کی فکر ہے کتابیں کیا چھپواؤں گا"[1]

لیکن اس کے باوجود اپنے مکان کے مردانے حصے کو وہ "دیوان خانہ" سے تعبیر کرتے ہیں اور زنانے حصے کو محلسرا کا نام دیتے ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میاں میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محلسرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھے گیا ہے۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ دیوان خانہ کا حال محلسرا سے بدتر ہے ..... ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے .... اگر تم سے ہو سکے تو مجھ کو وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے ہیں ..... میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گذر جائے گی، مرمت ہو جائے گی پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے"[2]

لیکن اُن کے نوابی ٹھاٹ باٹ میں کوئی فرق نہیں آتا۔ نوکروں کی تعداد میں جو کم و بیش ایک درجن تھی، کبھی کوئی کمی نہ آئی۔ وہ ہمیشہ پالکی میں سوار ہو کر شہر میں نکلتے تھے۔ غذا ہمیشہ بہت لذیذ اور قیمتی کھاتے تھے اور قیمتی لباس پہنتے تھے۔ شرابیں ہمیشہ ولایتی پیتے تھے جن میں دو خاص طور پر انھیں مرغوب تھیں۔ "کاسٹے لی اَن" اور "ایڈل ٹم"۔ گرچھال کی دیسی شراب سے انھیں نفرت تھی۔ مختصراً وہ فطرتاً اور عادتاً مکمل نواب تھے اور چاہتے تھے کہ دوسرے لوگ بھی انھیں نواب سمجھیں اور نواب کہہ کر خطاب کریں، اور اُن کے نام کے ساتھ "بہادر" کا لفظ ضرور استعمال کریں۔ منشی شیو نرائن کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"سنو میری جان، نوابی کا مجھکو خطاب ہے .... اطراف و جوانب کے امرا سب مجھکو نواب لکھتے ہیں، بلکہ بعض انگریز بھی۔ چنانچہ صاحب کمشنر بہادر نے جو روبکاری بھیجی ہے تو لفافہ پر نواب اسد اللہ خاں لکھا لیکن یہ یاد رہے نواب کے لفظ کے ساتھ میرزا یا میر نہیں لکھتے۔ یہ خلاف دستور ہے۔ یا نواب اسد اللہ خاں لکھو یا میرزا اسد اللہ خاں لکھو اور بہادر کا لفظ تو دونوں حال میں واجب اور لازم ہے"[3]

غالب کے خطوط کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اُن میں کہیں کہیں ۵۷ء کے انقلاب کا آنکھوں دیکھا حال اُنھوں نے بیان کیا ہے جو تاریخی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے۔ اُنھوں نے دلّی کو تباہ ہوتے اور اجڑتے ہوئے بچشم خود دیکھا تھا۔ اس لئے اُنھوں نے کہیں کہیں دلّی کی تباہی و بربادی کا جو مرثیہ پڑھا ہے وہ تاریخی اعتبار سے نہایت اہم اور قومی نقطۂ نظر سے بہت دلچسپ و مؤثر ہے۔ ایک خط میں چودھری عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں:

"یہاں کوئی طرح آسائش کی نہیں ہے۔ اہل دہلی عموماً بُرے ٹھہر گئے۔ یہ داغ اُن کی جبین حال سے مٹ نہیں سکتا۔ میں اموات میں ہوں۔ مُردہ شعر کیا کہے گا۔ غزل کا ڈھنگ بھول گیا۔ معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روش ضمیر میں آوے۔ رہا قصیدہ، ممدوح کون ہے۔ ہائے انوری میری زبان سے کہتا ہے:

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوار مدیح
اے دریغا نیست معشوقے سزاوار غزل"[4]

ایک خط میں میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں

"بھائی کیا پوچھتے ہو، کیا لکھوں، دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پُل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں؛ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔ ..... اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفےٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں، بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود و مطرود و محروم و مغموم ..... تم آتے ہو چلے آؤ۔ جان نثار خاں کے چھتے کی، خانچند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ۔ بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھینا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز میدان کا نکلنا سن جاؤ"[5]

اس کا مطلب یہ ہے کہ جامع مسجد کے گرد میدان نکالنے کی خبریں گرم تھیں لیکن اس تحریر کے وقت تک نکالا نہیں جا سکا تھا۔ اور اس کے بعد میر مہدی ہی کو میدان نکلنے کی اطلاع ان الفاظ میں دیتے ہیں۔

"مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو، کا عالم ہو جائے ..... کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی

---

[1] غالب: اردوئے معلیٰ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً

دروازہ تک میدان ہوگیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج
سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام
والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ حویلی، اُن میں سے کسی کا پتہ
نہیں۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہوگیا۔ . . . اللہ اللہ دلی والے اب
تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد!
ارے بندۂ خدا اُردو بازار نہ رہا، اُردو کہاں؟ دلی کہاں! واللہ
اب شہر نہیں کیمپ ہے، چھاؤنی ہے، نہ قلعہ ہے، نہ شہر، نہ
بازار، نہ نہر۔"[1]

۱۸۵۷ء کے انقلابی دَور میں دلی میں ایک قیامت برپا تھی، نہ کوئی قانون تھا نہ کسی کا حکم، لوگوں کا جان و مال، عزت و آبرو کوئی چیز محفوظ نہ تھی۔ ایک افراتفری کا عالم تھا۔ شہریوں میں دہشت طاری تھی۔ لوگ جان اور آبرو بچانے کے لیے اپنے مکان اور زمینیں چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ اس کیفیت کا نقشہ غالب نے مولوی عزیز الدین کے نام خط میں اس طرح کھینچا ہے:

"صاحب کیسی صاحب زادوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ دلی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو جیسی آگے تھی۔ قاسم جان کی گلی میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔ ہاں آباد ہے تو یہ ہے کہ غلام حسین خاں کی حویلی ہسپتال ہے۔ ضیاء الدین خاں کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں . . . . لال کنویں کے محلے میں خاک اُڑتی ہے، آدمی کا نام نہیں . . . . کھیمی کی دوکان پر کتے لوٹتے ہیں۔"[2]

اور اس سے زیادہ پُرسوز و پُردرد وہ منظر ہے جو غالب نے مولوی احمد حسین قنوجی کو یکم ستمبر ۱۸۶۶ء کے خط میں کھینچا ہے۔

"تم دلی کو آباد اور قلعہ کو معمور اور سلطنت کو بدستور سمجھے ہوئے ہو . . .
ایں دفتر را گاؤ خورد گاؤ را قصاب بُرد و قصاب در راہ مُرد۔
بادشاہ کے دم تک یہ باتیں تھیں۔ خود میاں کالے صاحب مغفور
کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑ دی، کاغذ کا پُرزہ، سونے
کا تار، پشمینہ کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کا مقبرہ
اُجڑ گیا۔ کیا ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ اُن کی اولاد کے لوگ
تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے اب ایک جنگل ہے اور
میدان میں ایک قبر۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں کے لوگ اگر
گولی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہوگا کہاں ہیں۔"[3]

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کا ردِ عمل تمام ملک میں عموماً اور شہر دلی میں خصوصاً بڑا شدید ہوا۔ خصوصیت کے ساتھ دلی کے مسلمانوں کو اس کی مکافات سب سے زیادہ بھگتنی پڑی اور مسلمانوں کو انگریزی سرکار نے بڑی مشتبہ نگاہوں سے دیکھا۔ شہر میں اُن کی نقل و حرکت پر کڑی پابندی لگائی گئی۔ اس پابندی کا تذکرہ غالب نے بڑی حسرت سے کیا ہے۔ انگریزی سرکار نے تمام مسلمان شہریوں کو شہر میں رہنے کے لیے چھپے ہوئے پرمٹ یا اجازت نامے تقسیم کرا دیئے تھے جنھیں غالب نے ٹکٹ کا نام دیا تھا۔ اس ٹکٹ کے بغیر شہر میں سڑک پر نکلنے کی ممانعت تھی۔ تمام تھانوں کو حکم تھا کہ فہرست تیار کریں کہ کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ چناں چہ میر مہدی مجروح نے جب دلی آنے کا ارادہ کیا تو غالب نے انھیں مشورہ دیا کہ بے ٹکٹ ہرگز نہ آئیں۔

بہادر شاہ ظفر، اُن کے ساتھیوں اور ہمدردوں پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے گئے۔ بہت سوں کو تہ تیغ کیا گیا یا پھانسیاں دی گئیں، جو بچے اُن میں سے کسی کو دیس نکالا دیا گیا، کسی کی جائیداد ضبط کر لی گئی۔ غالب نے اِن حالات کو بریقیناً بڑی شدت سے محسوس کیا ہوگا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وہ چُپ سادھے رہے۔ جیسے اُن کی زبان پر پہرے لگا دیئے گئے ہوں۔ جیسے کسی نے اُن کے ہونٹ سی دیئے ہوں۔ مگر حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ غالب "گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل" کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ اس کشمکش کی نشاندہی اس خط سے ہوتی ہے جو انھوں نے ۲۶ دسمبر ۱۸۵۷ء کو حکیم غلام نجف خاں کو لکھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"انصاف کرو لکھوں تو کیا لکھوں۔ کچھ لکھ سکتا ہوں؟ کچھ
قابل لکھنے کے ہے؟ تم نے مجھ کو لکھا تو کیا لکھا، اور اب
جو میں لکھتا ہوں تو کیا لکھتا ہوں ——— بس اتنا
ہی ہے کہ اب تک ہم تم جیتے ہیں۔ زیادہ اس سے نہ تم لکھو
گے نہ میں لکھوں گا۔"[4]

آخری فقرے نہایت معنی خیز ہیں اور اس کیفیت کی عمازی کرتے ہیں جو انسان "گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل" کی ذہنی کشمکش میں اُلجھ کر محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح ۳ فروری ۱۸۵۸ء کے خط میں جو میرزا تفتہ کے نام ہے

[1] غالب اُردوئے معلی [2] ایضاً

ایک بہت ہی مختصر سا جملہ لکھتے ہیں جس میں بے بسی اور لاچاری کا اتھاہ سمندر چھپا ہوا ہے — "بھائی بُری آ بنی ہے۔ انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ قصہ مختصر یہ کہ قصہ تمام ہوا۔" اور پھر، دسمبر ۱۸۵۸ء کو میرزا تفتہ ہی کو لکھتے ہیں:

"مبالغہ نہ جاننا۔ امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولتمند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ مُلازمانِ قلعہ پر شدت ہے اور بازپرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں۔"

اس کے بعد سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ غالب نے انگریزی حکومت سے وفاداری ظاہر کرنے اور ملکہ وکٹوریہ اور دُوسرے حکّام کی شان میں قصیدہ خوانی کی کیوں ضرورت محسوس کی۔ اور اگرچہ وہ "اَن" "سکّوں"[1] کے الزام سے اپنا دامن نہ بچا سکے جو اصلاً ذوق نے بہادر شاہ ظفر کی تاجپوشی کے موقع پر بادشاہ کی نذر کئے تھے، لیکن انگریزی سرکار نے زبردستی غالب کے سر تھوپ دیئے تھے، پھر بھی وہ اپنی قصیدہ خوانی کے ذریعے انگریزی سرکار کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ذوق کی طرف سے سکّے نذر ہونے کی خبر مولوی باقر دہلوی نے اپنے ہفتہ وار اخبار "دہلی اُردو اخبار" میں شائع کی تھی۔[2] لیکن وہ اخبار باوجود کوشش کے غالب کو کہیں پر دستیاب نہ ہو سکا۔ پھر بھی آگے چل کر غدر کے رفع ہونے اور دلّی کے فتح ہونے کے بعد ان کی پنشن بحال ہو گئی، چڑھا ہوا روپیہ دام دام مل گیا۔ اور اُن کی زندگی جیسے تیسے گذر گئی۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ وہ زندہ بچ گئے لیکن اگر وہ کہیں مارے گئے ہوتے، یا اقتصادی دباؤ سے اپنی موت مر گئے ہوتے تو ہم ایک عظیم شاعر، انشا نگار، اور ادیب کے فن سے محروم رہ جاتے۔

غالب کے خطوط میں دلّی کی سماجی زندگی کی طرف جا بجا اشارے ملتے ہیں جن کے باعث خطوطِ غالب کی تاریخی اہمیت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے نتیجہ میں جو اقتصادی بحران دلّی پر محیط ہوا، اس کے بڑے مُضر اثرات مرتب ہوئے جن سے شرفاء و امرا دلّی کی اخلاقی قدروں کو زبردست ٹھیس لگی۔ مقامِ عبرت ہے کہ "معزول بادشاہ کے ذکور تو تلوار سے بچ رہے وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پانے لگے اور روٹیوں کے لئے محتاج ہو گئے۔ "عورتوں میں سے جو بوڑھی تھیں وہ "کٹنیاں" بن گئیں اور جوان "کسبیوں" کا کام کرنے لگیں۔ غالب احباب، اعزاء اور امرائے دلّی کو نام بہ نام یاد کرتے ہیں۔ اور اُن کی تباہی اور بربادی کا مرثیہ پڑھتے ہیں جسے سُن کر کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ مرزا علاء الدین خاں کو لکھتے ہیں:

"امرائے اسلام میں سے اموات گنو۔ حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا، سو روپے روز کا پنشن دار، سو روپے مہینہ کا روزینہ دار، مر گیا۔ میر ناصر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان، بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے، بیمار پڑا۔ نہ دوا نہ غذا۔ انجام کار مر گیا۔ تمہارے چچا کی طرف سے تجہیز و تکفین ہوئی۔"[3]

غالب کی دلی میں معلوم ہوتا ہے "ہندوستانی قوم" بسی ہوئی تھی جو مشترکہ کلچر کا مثالی نمونہ تھی، جس میں ہندو مسلمان کی وہ تفریق نہ تھی جس نے ہمارے دیکھتے دیکھتے سماجی لعنت کی صورت اختیار کر لی۔ غالب کی دلی میں ہندو مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ میل جول اور باہمی اختلاط رکھتے تھے اور مغائرت اور منافرت تو درکنار ایک دوسرے کے ساتھ بڑے خلوص و محبت اور یگانگت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ غالب ایک کثیر الاحباب آدمی تھے۔ جن میں کافی تعداد ہندوؤں کی تھی اور کافی تعداد میں اُن کے ہندو شاگرد تھے جو اپنے اُردو و فارسی کلام پر اُن سے اصلاح لیتے ہیں۔ خطوطِ غالب کے مکتوب الیہم جہاں مسلمان ہیں وہاں ہندو بھی ہیں جنہیں غالب اپنے خطوط میں والہانہ پیار و محبت سے مخاطب کرتے ہیں۔ منشی ہرگوپال کو پیار میں انھوں نے میرزا کا لقب اور تفتہ کا تخلص دیا۔ ایک خط میں میرزا تفتہ کو ہر مہینہ کم از کم ایک خط صرف اپنی خیریت کا بھیجنے کی تاکید کرتے ہیں۔ ایک دُوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ اگر میرا سگا بھائی زندہ ہوتا، اور وہ تمہاری بُرائی کرتا تو میں اُس کو جھڑک دیتا اور اُس سے آزردہ

---

[1] سکّہ وہ بیت ہوتی تھی جو شاید کسی قطعہ کے ساتھ کہہ کر جشن تاجپوشی کے موقع پر سکّہ پرکندہ کرانے کے لئے بادشاہ کی نذر کرتا تھا

[2] مالک رام نے علیگڑھ میگزین ۱۹۶۰ء کے حوالہ سے غالب کا ایک جملہ نقل کیا گیا ہے جسے صاحب کشنر بہادر سے ملاقات کے دوران اُن کی زبان سے نکلا ہوا بتایا گیا ہے اس سے یہ شک گذرتا ہے کہ غالب کو معلوم نہ تھا کہ سکّے کس نے بھیجے۔ نیز یہ کہ اخبار نے غلط طور پر اُن کا نام لکھ دیا۔ حالاں کہ چودھری عبدالغفور کے نام خط میں انھوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ اس کی وضاحت کر دی ہے کہ وہ سکّے ذوق کے کہے ہوئے تھے اور اخبار نے ذوق کے نام سے شائع کئے تھے۔ [3] غالب: اُردوئے معلّیٰ

ہوتا۔

اسی طرح منشی شیونرائن کو "نورِ بصر"، "لختِ جگر"، "فرزندِ دلبند"، برخوردار اور "نورِ چشم" کے پیار بھرے الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ منشی شیونرائن کے والد منشی بنسی دھر اور غالب ہم سن اور لنگوٹیا یار تھے۔ دونوں ایک محلّے میں رہتے تھے، ایک جگہ اٹھتے بیٹھتے اور کھیلتے کودتے تھے۔ ایک ساتھ بیٹھ کر شطرنج کھیلتے اور کوٹھے پر پتنگ اڑاتے تھے منشی شیونرائن کے خاندان اور غالب کے گھرانے کے دیرینہ مراسم تھے منشی شیونرائن کے پردادا اور غالب کے نانا گھرے دوست تھے۔ غالب کے نانا نے جب اپنے کسی گاؤں کا مقدمہ لڑا، تو پیروی منشی شیونرائن کے دادا نے کی۔

مختصر یہ کہ غالب کے ہمعصر دور میں دلی کے سماج میں "ہندو ثنائیت" رچی ہوئی تھی جس کو آگے چل کر تنگ نظری اور تعصب نے بالکل مسخ کر دیا اور اب ہماری یاد میں جس کے ازسرِ نو احیار کے لئے مہاتما گاندھی آبجہانی نے اپنی زندگی کو وقف کر دیا اور آخرکار اسی کے لئے اپنی جان قربان کر دی۔

غالب کے خطوط سے بہت سی اور باتیں سماجی تاریخ کے طالب علم کو حاصل ہوتی ہیں جن کا ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مثلاً نواب غلام بابا خاں[1] نے غالب کو ستمبر میں گھڑی بھیجی جس کا مطلب یہ ہے کہ گھڑی ہندوستان میں رائج تھی مگر اس کا استعمال عام نہیں ہوا تھا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ غالب اپنے خطوط میں جہاں دن اور تاریخ لکھنے کے عادی ہیں

وہاں خط لکھنے کا وقت بھی ظاہر کر دیتے ہیں یا غالب کے زمانے میں عینک استعمال ہوتی تھی خود غالب آخر عمر میں عینک کی مدد سے پڑھتے لکھتے تھے۔ غالب کے خطوط میں چند اشارے ایسے ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے عہد میں شریف گھرانوں کی عورتیں بھی عام طور پر پڑھی لکھی نہ ہوتی تھیں۔ غالب جگہ جگہ لکھتے ہیں:

"اپنی دادی کو یہ خط پڑھ کر سنا دینا" یا "اپنی اُستانی[2] کے پاس جا کر یہ رقعہ سراسر پڑھ کر سنا دینا۔"

غالب نے ایک خط میں دُم دار ستارے کا ذکر کیا ہے جو بعد غروب آفتاب دلی کی افقِ غربی پر نظر آتا تھا۔ غالب ہیئت سے دلچسپی رکھتے تھے اس کے اثرات کے بارے میں غالب کا خیال تھا کہ "یہ صورتیں قہرِ الٰہی کی ہیں اور دلیلیں ملک کی تباہی کی" ایک اہم بات غالب کے خطوط سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ چھاپے خانے کا رواج عام ہوتا جا رہا تھا دھڑا دھڑ کتابیں چھپ رہی تھیں اور متعدد اخبارات ملک میں نکل رہے تھے۔ غالب نے اپنے خطوط میں دلی، لکھنؤ، آگرہ اور کلکتہ کے متعدد اخبار گنائے ہیں۔ غالب ان کی اشاعت سے دلچسپی رکھتے تھے اور اخبار کے شوقین تھے۔

غالب کے خطوط سے ایک بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ غالب کے زمانے میں ڈاک کے انتظام میں خاصی باقاعدگی آگئی تھی۔ غالب کے خطوط کی اتنی کثیر تعداد جو ہم تک پہنچ گئی ہے وہ بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ سنہ ۵۷ء کی افراتفری اور طوائف الملوکی کے باوجود خط پہنچنے میں کبھی کبھار دیر تو ہو جاتی ہو۔ لیکن خطوط ضائع نہیں ہوتے تھے۔ اور ہرکارے یا پوسٹ مین باقاعدہ گھر پر جا کر دن میں ایک سے زیادہ بار ڈاک تقسیم کرتے تھے اور غالب کے نام خطوط پر اگر پتہ غلط بھی ہوتا تھا تب بھی خطوط اُن کو مل جاتے تھے۔ اُن کے پتہ میں صرف اُن کا نام اور دہلی لکھنا کافی ہوتا تھا۔ ایک دوست کو لکھتے ہیں: "میرے نام کا کوئی لفافہ ضائع نہیں ہوتا۔"

مرزا مہدی عسکری نے لکھا ہے کہ مرزا کے زمانے میں ڈاک کا انتظام اچھا نہ تھا، اسی وجہ سے وہ اکثر کہتے کہ "ڈاکئے اب ڈاکو ہو گئے۔ ڈاک کیا ہے خاک ہے"، لیکن یہ الفاظ مزاجِ لطیف، رعایتِ لفظی اور شاعرانہ مبالغہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ حکیم احمد حسن مودودی کو غالب ہی لکھتے ہیں:

"میرے نام کا لفافہ جس شہر سے چلے اسی شہر کے ڈاک گھر میں رہ جائے تو رہ جائے ورنہ دلی کے ڈاک خانے میں پہنچ کر کیا امکان کہ تلف ہو۔"[3]

---

[1] سورت کے نواب جن کا عرف چھوٹے صاحب تھا، غالب کے خاص عقیدتمندوں میں سے تھے۔

[2] اُستاد کی بیوی سے مراد ہے۔ یہ خط شہاب الدین خاں ثاقب کے نام ہے جو مرزا کے سسرال کے رشتے سے بھتیجے بھی تھے اور شاگرد بھی۔ یہاں اُستانی سے مطلب خود غالب کی اپنی بیگم سے ہے۔ سائل دہلوی مرحوم شہاب الدین مرحوم کے چھوٹے فرزند تھے۔ ایک دوسرے خط میں بھی غالب نے "اُستانی" سے مراد اپنی بیگم سے لی ہے۔

[3] غالب: اُردوئے معلّیٰ

اور ایک آدھ خط کی حد تک تو آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ضائع ہو جاتا ہے۔

مرزا محمد عسکری نے ڈاک کی بدنظمی کی دوسری دلیل یہ دی ہے کہ "شاید اسی وجہ سے وہ بیرنگ خط بھیجنا پسند کرتے تھے اور دوسروں کو فہمائش کرتے کہ تم بھی بیرنگ خط بھیجو۔" لیکن غالب جو بیرنگ خط بھیجنے کا مشورہ دیتے تھے تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ڈاک کا انتظام خراب تھا، بلکہ یہ تھی کہ غالب کا یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ بیرنگ خط بمنزلہ رجسٹری ہوتا ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ایک قاعدہ آپ کو بتاتا ہوں۔ اگر اس کو منظور کیجیے گا تو خطوط کے نہ پہنچنے کا احتمال اٹھ جائے گا اور رجسٹری کا درد سر جاتا رہے گا۔ آدھ آنہ نہ سہی ایک آنہ سہی۔ آپ بھی بیرنگ خط بھیجا کیجیے، اور میں بھی بیرنگ بھیجا کروں ... اس قاعدہ کا جیسا کہ میں واضع ہوا ہوں، بادی بھی ہوا اور یہ خط بیرنگ بھیجا ہے"[1]

کبھی کبھی غالب جب بالکل ہی دست ہوتے تھے تو پیسے نہ ہونے کی وجہ سے بھی بیرنگ خط بھیجنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں "بھائی نہ کاغذ ہے نہ ٹکٹ ہے۔ اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے۔ کتاب میں سے یہ کاغذ پھاڑ کر تم کو خط لکھتا ہوں اور بیرنگ لفافہ میں لپیٹ کر بھیجتا ہوں"۔ اور مرزا شہاب الدین خاں کو لکھتے ہیں "آج میرے پاس نہ ٹکٹ ہیں نہ دام معاف رکھنا۔ لیکن جب پیسے پاس ہوتے تو دوسروں کے بیرنگ خط وصول کرنے میں ذرا تکلف نہ کرتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: ہر مہینہ میں آٹھ بیرنگ خط تک، بلکہ سولہ خط تک نہ گھبراؤں گا"۔ بہرحال، بیرنگ خط کی اس تدبیر کو وضع کرنے والے اور بیرنگ خط سے رجسٹری کا فائدہ اٹھانے والے غالباً دنیا میں سب سے پہلے آدمی غالب تھے۔

غالب کے خطوط سے تصویر کشی کی ایک نئی تکنیک کا اندازہ ہوتا ہے جو اس سے پہلے کہیں دیکھنے یا سننے میں نہ آئی تھی۔ ماڈل کو سامنے بٹھا کر تصویر اتارنے کا طریقہ تو کافی پرانا ہے۔ لیکن غالب کے زمانے میں مصوروں نے تصویر کشی کا ایک آسان تر طریقہ یہ ایجاد کیا تھا کہ مصور تصویر کھنچوانے والے کے سامنے آئینہ رکھ کر آئینہ پر اس کا عکس اتار لیتا تھا۔ اور اس کے بعد اس میں حسب منشا نقوش ابھارتا، لائٹ اور شیڈ دیتا یا رنگ بھرتا تھا۔ لیکن اس میں خرابی یہ تھی کہ اس طرح تصویر کھنچوانے والے کو ماڈل بننے کی زحمت تو اٹھانی پڑتی تھی اور اس زحمت کے بعد بھی صرف اس کا بسٹ بن سکتا تھا اور پورے جسم کی تصویر اس میں نہیں اتر سکتی تھی۔ غالب کو یہ بات پسند نہ تھی۔ ایک خط میں نواب غلام بابا خاں عرف چھوٹے صاحب کی تصویر بننے کے بعد میاں دادخاں سیاح کو لکھا گیا تھا، کہتے ہیں:

"خیر (چھوٹے صاحب کا) دیدار تو میسر ہوا، گفتار بھی اگر خدا چاہے گا سن لیں گے۔ دیکھو منشی صاحب آئینہ کی تصویر کی صنعت کو بہت پسند کرتے ہیں، مگر فقیر اس کا معتقد نہیں۔ اب دیکھو حضرت کی تصویر میں کہنیوں تک ہاتھ کی تصویر ہے۔ آگے پہنچے اور نیچے کا پتہ نہیں۔ مکالمہ ایک طرف، مصافحہ کی بھی حسرت رہ گئی"[2]

غالب نے اپنے خطوط میں جگہ جگہ مہنگائی کا شکوہ کیا ہے اور بعض خطوط میں اپنے دوستوں کو دلی میں مختلف اجناس کے رائج الوقت نرخ لکھے ہیں جو ہمارے لئے قابل رشک ہیں اور جن پر ہم اپنی لاکھوں ارزانیاں قربان کر سکتے ہیں۔ غالب نے اپنے زمانے کے جو نرخ لکھے ہیں اور جسے وہ مہنگائی سے تعبیر کرتے ہیں انھیں سنکر بے اختیار جی چاہتا ہے۔ کاش وہ مہنگائی ہمیں مل جائے۔ چودھری عبدالغفور کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"غلہ گراں ہے۔ موت ارزاں ہے۔ میوہ کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال ۸ سیر، باجرہ ۱۶ سیر، گیہوں ۱۲ سیر چنے ۱۶ سیر، گھی ۱½ سیر[3]"

غالب ایک زندہ دل آدمی تھے۔ وہ کھاؤ، پیو، اور مزے اڑاؤ کے قائل تھے۔ جن پریشانیوں سے وہ زندگی بھر دوچار رہے، ان میں کوئی دوسرا مبتلا ہوتا تو چیخ اٹھتا۔ وہ شراب دراصل غم غلط کرنے کے لئے پیتے تھے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

انھوں نے خود کہا ہے۔ لیکن غالب غم حیات اور غم روزگار کے باوجود ہمیشہ ہنستے رہے اور دوسروں کو اس ہنسی میں شریک کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی پر جو ان کے خطوط کی جان ہے کبھی کبھی اس طرح سر دھننے کو جی چاہتا ہے۔ جس طرح ان کے اچھے سے اچھے شعر پر۔ لیکن وہ دراصل روتے میں ہنستے تھے اور روتے ہوؤں کو ہنساتے تھے۔ ان قہقہوں میں دکھی دل کی کراہیں چھپی ہوئی ہیں، اور اس میں ان کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔

مولانا عبدالحق نے بہت خوب کہا ہے "خطوں سے انسان کی سیرت

[1] غالب اردوئے معلی [2] ایضاً [3] ایضاً

(باقی ص ۱۲ پر)

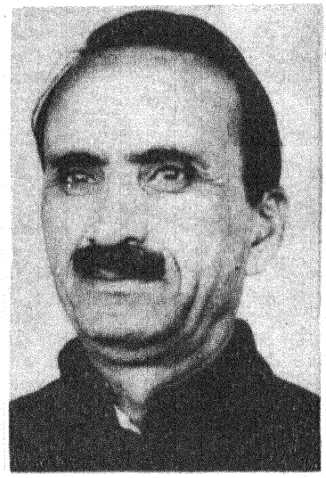

بسمل سعیدی

سلام مچھلی شہری

رہروِ راہِ محبت کو سبھی منزل میں ہے
دل ہے بیزارِ محبت اور محبت دل میں ہے

جستجو کا ایک بہانہ شوقِ منزل دل میں ہے
ننگِ ذوقِ جستجو ہے جو قدم منزل میں ہے

کاروانِ حسن و عشق اب تک کہیں ٹھہرا نہیں
فیس ابھی صحرا میں ہے لیلیٰ ابھی محمل میں ہے

کر چکا ہے عشق کتنی منزلوں کو گرد راہ!
عقل جس منزل میں تھی اب تک اُسی منزل میں ہے

اُس کی کثرت پر فدا میں اُس کی وحدت پر نثار
جس کسی کے دل میں ہے گویا اُسی کے دل میں ہے

چاہتے ہیں تم سے بھی سُن لیں جوابِ عرضِ شوق
ورنہ ہم خود جانتے ہیں جو تمہارے دل میں ہے

ہو چکے مقتل تو سب دارالاماں میں منتقل
پھر یہ اب کس کا جنازہ کوچۂ قاتل میں ہے

منزلِ مقصود بسملؔ وہ نظر آنے لگی
ہر نظر منزل پہ جیسے ہر قدم منزل میں ہے

ساغر بدست صبح تو شب مے فروش ہے
دل ہے کہ ایک میکدۂ بے خروش ہے

اب صبح نو ہے اور گلستاں بدوش ہے
افسوس نکہتوں کا پیمبر خموش ہے

"اک عندلیب گلشن نا آفریدہ تھا
اک صبح تھی دلیلِ سحر سو خموش ہے"

ہنس کر نہ دیکھ کہنہ چراغوں کو اے صبا!
ان میں بھی زندگی کی حرارت ہے، جوش ہے

چاہوں تو بخش دوں تجھے ادراکِ رنگ و بو
اے زہرۂ نشاط! ابھی اتنا ہوش ہے

جب میں نے جام اٹھایا تھا روشن تھی بزمِ ناز
کب بجھ گئے چراغ، کسے اتنا ہوش ہے

میں محوِ فکر تھا کہ یہ آئی صدائے ساز
"سب سے اداس گیت ہی فردوس گوش ہے"

ذہنوں کے انقلاب سے آتا ہے انقلاب
ویسے تو انقلاب کے نعروں میں جوش ہے

منسوب کس کے نام کروں یہ غزل سلام
شمعِ مزارِ غالبِ خستہ خموش ہے

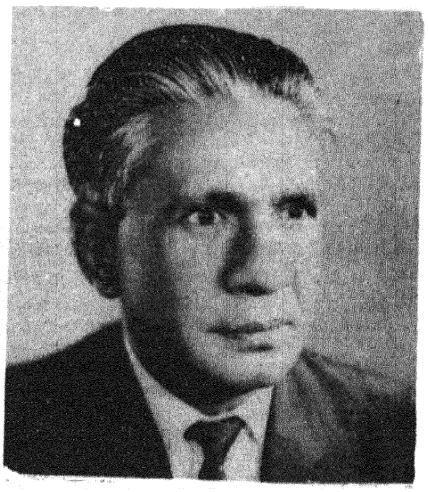

جو شعاعِ لب ہے موجِ نو بہارِ نغمہ ہے
خامشی بھی آپ کی آئینہ دارِ نغمہ ہے

گوش اک مدت سے محرومِ سماعت ہے مگر
دلِ عجب ناداں ہے اب تک اعتبارِ نغمہ ہے

فرق یہ ہے نطق کے سانچے میں ڈھل سکتا نہیں
ورنہ جو آنسو ہے درِ شاہوارِ نغمہ ہے

منکرِ سازِ مسرت ہوں تو کافر ہوں مگر
ہم نفس مضرابِ غم پر انحصارِ نغمہ ہے

اے کہ شکوہ تھا تجھے سنگیں مزاجی کا مری
دیکھ اس پتھر میں بھی موجِ شرارِ نغمہ ہے

گوپال متل

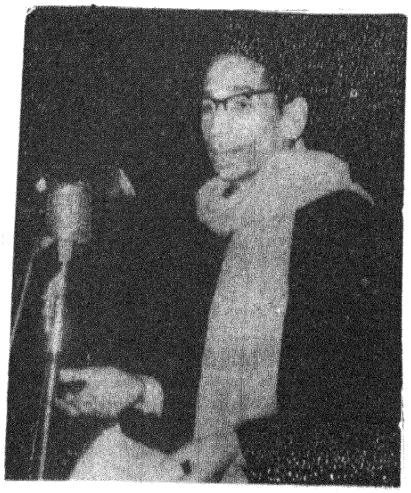

شمیم کرہانی

حسن تو حسنِ لامکاں، قیدِ مکاں میں آئے کیوں
تو نے جبینِ آرزو، دیر و حرم بنائے کیوں

حسن، فریبِ کار ہے، حسن کی بات چھوڑیئے
عقل تو سادہ دل نہیں، عقل فریب کھائے کیوں

گریۂ شامِ ہجر پر، خندۂ طنز کس لیے
شمع اگر نصیب ہو، پھر کوئی دل جلائے کیوں

پردہ و جلوہ دو نہیں، دیدۂ شوق ضد نہ کر
پردہ تو جزوِ حسن ہے، پردہ کوئی اٹھائے کیوں

تجھ سے خفا ہیں نکتہ چیں، تو نے شمیم نکتہ داں
بارشِ سنگ و خشت میں شیش محل بنائے کیوں

شمیم حنفی

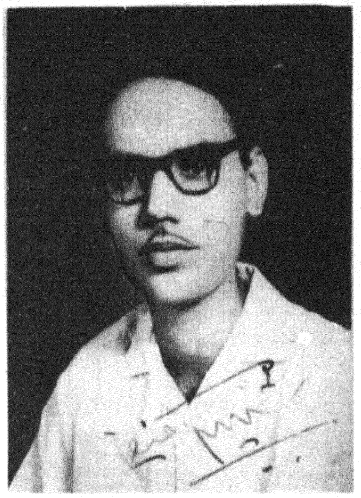

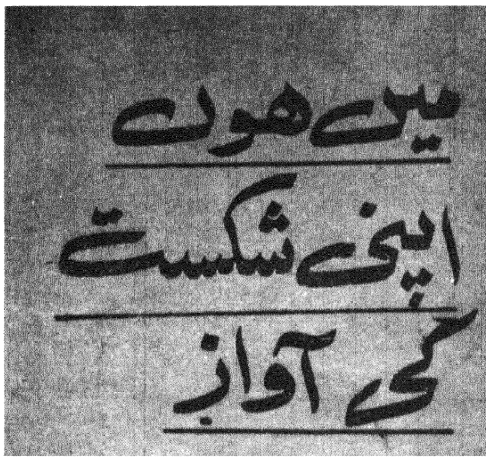

مالی دشواریاں زندگی بھر ساتھ لگی رہیں اور مایوسی اور نامرادی کا ایک ہجوم سائے کی طرح دن رات تعاقب کرتا رہا۔ شراب نوشی اور آزادہ روی کو دلی کے شرفاء نے کبھی اچھی نظروں سے نہ دیکھا جنھیں سامنے برا بھلا کہنے کی ہمت نہ تھی، گالیوں بھرے گمنام خطوط لکھتے رہے۔ زمانہ ایسا پُرآشوب تھا کہ حفظِ وضع کا حوصلہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔ قید کی سزا نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی اور ذلت و رسوائی کا ایسا بوجھ کاندھوں پر آیا کہ زندگی عذاب بن گئی۔ صدیوں کی محبوب اور محترم روایتیں ساتھ چھوڑ رہی تھیں۔ ایک عظیم الشان تہذیبی ورثہ ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں بکھرتا جا رہا تھا۔ پھر صلاحیتیں ایسی کہ قدردانوں کی راہ دیکھتے دیکھتے تھک گئیں۔ جس شاعری کا دربار اور بازار میں چرچا تھا وہ بس میں نہیں تھی اور عرضِ ہنر کی جو دولت پاس تھی اس کی قدر و قیمت کا احساس رکھنے والے بہت کم تھے۔ زمانہ دشمن تھا اور تلخیِ زندگی بھی کچھ ایسی خوشگوار نہ تھی۔ یکے بعد دیگرے ساری اولادیں شہرِ مدام میں جا بسیں ـــــ عارف کو شفقت و محبت کا مرکز بنایا تو فلک پیر سے یہ بھی نہ دیکھا گیا اور بالآخر اُسے بھی موت نے چھین لیا۔ مرزا یوسف جب مرے تو شہر میں ایسا انتشار تھا کہ کفن دفن کا سامان بھی دشوار تھا۔ غرض کہ مصائب و آلام کی ایک طویل، بے حد طویل زنجیر میں غالب کے پیر ہمیشہ اُلجھے رہے اور ہر چند کہ وہ آتش زیرِ پا رہے لیکن یہ زنجیر ٹوٹ نہ سکی۔ اُن کی زندگی اور زمانے پر ایک لمحے کے لئے بھی نظر ڈالی جائے تو کیسے ہولناک اور حشر زا مناظر ایک دوسرے میں گڈمڈ آنکھوں کے دامن میں اتر آتے ہیں۔ عزت و افتخار کی بساط اُلٹ چکی تھی۔ عقائد اور روایات کی چھتیں ٹوٹ رہی تھیں۔ فضا میں ایک طرف پھول والوں کی سیر کے تماشے تھے تو دوسری طرف شہزادوں کے سر تن سے جدا کئے جا رہے تھے۔ لیڈروں نے شہر میں تباہی مچا رکھی تھی۔ گھر اُجڑ رہے تھے۔ بہادر شاہ ظفر لال قلعہ کی سنگین دیواروں کو محفوظ نہ پا کر ہمایوں کے مقبرے کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ مولوی محمد باقر کو گولی ماری جا رہی تھی، وہ خود بین اور خود سر شرفا جن کی پُرغرور گردنیں صرف طوقِ انا سے سجی رہتی تھیں، تشحنۂ دار کی طرف لے جائے جا رہے تھے۔ ایک طرف صہبائی، علوی مومن، آزردہ، نیر، شاہ نصیر، ذوق، ممنون، احسان اور غالب کی شعری صحبتیں تھیں، تو دوسری طرف دلی دروازے کے باہر سپاہیوں نے کم عمر محمد حسین آزاد کے ہاتھوں سے ذوق کے کلام کا پلندہ چھین کر فرش پر پھینک دیا تھا، اور آزاد بکھرے ہوئے اوراق کو ایک ایک کر کے چُن رہے تھے کہ زمانہ انھیں فراموش کاری کی گرد میں نہ چھپا دے۔

مصنف سیر المحتشم کے لفظوں میں:

. . . . [چاندنی چوک میں] صبح سے تا نصف شب رونق و آبادی ہے۔ گرداس کے دوکانیں کانچ دار اور شان و قطعہ داری

ہیں نامدار۔ شب ماہ میں وہ قطعہ مدوّر بھی ماہ زمین کہلاتا ہے اور اس کے بیچ کا حوض نقطۂ مرکز دائرۂ قمر نظر آتا ہے۔ عصر کے وقت مجمع خلقت سے وہاں ایک کیفیت ہوتی ہے۔ ہر امیر و غریب بہ طریق تفنن ہوا خوری کو اس طرف سے نکلتا ہے۔ وہاں ہر ولایت کا آدمی دکھائی دیتا ہے۔

غالب کہتے ہیں:

وہ دلّی نہیں جس میں سات برس کے سن سے آتا جاتا تھا۔ وہ دلّی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم تھا۔ بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار، اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود قصبہ تھا، اب پتہ نہیں کہ کہاں تھے۔ صاحبانِ مکنہ و دکاکین نہیں بتاسکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور ہماری دکان کہاں تھی؟

●

اے بندۂ خدا! اردو بازار نہ رہا، اردو کہاں؟ دلّی کہاں؟ واللہ اب شہر نہیں ہے، کیمپ ہے چھاؤنی ہے، نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔

●

سی۔ ایف۔ اینڈریوز کا بیان ہے

بہادر شاہ ظفر اب بھی سجے ہوئے ہاتھیوں پر زرق برق پوشاک میں ملبوس قلعۂ معلیٰ کے ایک مینار خاص کی بلندی سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تیوہاروں اور تقریبات کا نظارہ کرتے تھے۔ قلعے کے باہر وسیع میدانوں میں اکٹھا ہجوم کی نظریں اُن پر پڑتیں اور مغلیہ خاندان کی گزشتہ عظمت کے احساس و احترام اور جوشِ عقیدت میں سب کے سر جھک جاتے

●

غالب لکھتے ہیں

مبالغہ نہ جانا۔ امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہلِ حرفہ کوئی بھی نہ رہا۔ مفصّل لکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے۔ بازپرس اور داروگیر میں مبتلا ہیں۔

●

یہ تصویریں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ایک دوسرے پر مستقل طنز معلوم ہوتی ہیں، ایک ہی شخص نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔ غالب کا حصہ دور کا جلوہ بھی نہ تھا وہ خود بھی ایک جیتے جاگتے کردار کی طرح تاریخ کے اس المیہ ڈرامے میں شریک تھے۔ اور فتح و شکست کا ہر تازہ ایک ذاتی تجربے کے ردِعمل کی طرح قبول کیا تھا۔ قدروں کا ٹوٹنا اور بکھرنا ہر دور میں ہوتا آیا ہے۔ ایسے سانحات وقت کے فطری تسلسل کو رنگا رنگی عطا کرتے ہیں اور انسان کے تہذیبی و فکری سفر میں منزلوں کا تنوع پیدا کرتے ہیں۔ لیکن المیہ یہ تھا کہ ایسی قدریں جنھیں غالب نے حرزِ جاں بنا رکھا تھا اور جو اُن کی شخصیت اور مزاج کا اشاریہ بن چکی تھیں، سیاسی اور معاشرتی انتشار کی فضا میں نہ صرف یہ کہ دھندلائی گئیں بلکہ بری طرح اُن کی بے توقیری بھی ہوئی۔ اُن کی شکست و تقیر غالب کے لئے ایک ذاتی اور نجی المیے کا حکم رکھتی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی نے ان قدروں کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ مغلوں کے سیاسی زوال نے ایک گراں مایہ تہذیب کو رفتہ رفتہ معدوم کر دیا جس کی رسوائی کا سلسلہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے استحکام کے ساتھ ہی شروع ہو چکا تھا۔ اس تہذیب کے انحطاط کی رفتار ۱۸۵۷ء میں پلاسی کی فیصلہ کن جنگ کے ساتھ ہی تیز ہو چکی تھی۔ سراج الدولہ کی موت اس تہذیب کی موت کا علامیہ بن گئی۔ اسی وقت کلائیو کی قیادت میں انگریزی افواج نے بنگال کے نظام پر قبضہ کر لیا اور اُسی واقعے کے بعد انگلستان میں صنعتی انقلاب کی ابتدا ہوئی۔ یہ واقعات بظاہر دور از کار [illegible] ہوتے ہیں لیکن غالب کے عہد کو سمجھنے کے لئے ان باتوں کو جاننا بھی ضرور [illegible] کہ یہی اس کا پس منظر بنی تھیں۔ انگلستان کو صنعتی انقلاب کی کامیابی کے لئے دولت کی ضرورت تھی اور اس ضرورت کی تکمیل کا سارا بوجھ لارڈ کلائیو نے بنگال کے سر ڈال دیا۔ انگلستان میں شہر بستے گئے اور بنگال اجڑتا گیا۔ قحط کی حشر سامانی نے بہار اور بنگال کی تین چوتھائی آبادی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد سے ۱۸۵۷ء تک کا زمانہ عہدِ وسطیٰ کے تمدنی نظام کی پے در پے شکست کا افسانہ ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ساتھ ہی انگلستان کے صنعتی انقلاب کی تکمیل بھی ہو گئی اور ہندوستان کی تہذیبی بساط پر مغربی ثقافت اور فکر و فلسفہ کے تازہ دم مہرے نظر آنے لگے پہلی نومبر ۱۸۵۸ء کو ملکہ وکٹوریہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ختم کر دیا کہ تجارت نے حکومت کے لئے راہ ہموار کر دی تھی اور اب ہندوستان باقاعدہ طور پر برطانیہ عظمیٰ کی جلیل القدر مملکت کا حصہ بن گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے

لفظوں میں:

"ہندوستان اس سے پہلے بھی فتح کیا گیا تھا، لیکن ان لوگوں کے ذریعہ جنھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا اور خود ہندوستانی معاشرے کا ایک جزو بن گئے [اس سے پہلے] ہندوستان نے کبھی بھی اپنی آزادی نہیں کھوئی تھی، اسے کبھی بھی غلام نہیں بنایا گیا تھا۔ ہندوستان کبھی بھی ایسے سیاسی اور اقتصادی اقتدار کی گرفت میں نہیں آیا تھا جس کا مرکز اس کی جغرافیائی حدود سے باہر ہوتا اور کبھی بھی کسی ایسی طاقت کا غلام نہیں ہوا تھا جو تہذیبی اور سیاسی اعتبار سے اس سے اس قدر مختلف اور بیگانہ ہو۔"

غالب کے زخموں کی قطار میں سب سے گہرا اور پائیدار زخم یہی تھا یوں وہ ایک عام انسان تھے۔ اپنے عہد کی سیاسی سرگرمیوں میں انھوں نے عملی طور پر کوئی حصہ نہیں لیا، لیکن سیاسی تبدیلیوں کا عذاب اس عہد کے دوسرے شعراء کے مقابلے میں سب سے زیادہ غالب ہی کے حصے میں آیا کیوں کہ وہ صاحب ادراک بھی تھے اور انھوں نے اپنے شعور کی کھڑکیاں کھلی چھوڑ رکھی تھیں۔ ایک تھکے ہوئے مسافر کی طرح وہ ان سمتوں اور راستوں کا زوال دیکھتے رہے جن سے گذر کر انھوں نے تاریخ کی اس المناک اور طوفان خیز منزل پر قدم رکھا تھا۔ اب ان کے سامنے فکر و کی نئی دنیا تھی۔ یہ دنیا ان کے لئے اجنبی بھی تھی اور اندیشوں سے پُر بھی۔ مصیبت یہ ہے کہ اس دنیا نے جس معاشرے کی قبر پر اپنے استحکام و امتیاز کی دیواریں کھڑی کی تھیں، اس میں بھی غالب کی حیثیت ہمیشہ ایک ناکام اور ہارے ہوئے انسان کی ہی رہی۔ اس معاشرے میں دنیاوی عیش و مسرت کے حصول کے لیے ضمیر کی جن آزمائشوں سے گذرنا ضروری تھا وہ غالب کے لئے قابلِ قبول نہ تھیں کیوں کہ وہ صرف غالب نہ تھے، نجم الدولہ دبیر الملک نواب مرزا اسد اللہ خاں بھی تھے، سلجوقی ترک بھی تھے اور آبا کا پیشہ سپہ گری تھا۔ وہ صرف شاعری کو ذریعۂ عزت سمجھنے پر قانع نہیں تھے۔ بہرحال انھوں نے ایسا سمجھا بھی ہوتا تو کوئی فرق نہ پڑتا کیوں کہ بقول ناصر کاظمی "کیا ستم ہے کہ عجم کا ایک سرور واں بلیماراں کے کوچے میں خاک پھانکتا پھرے اور لال قلعہ میں زاغ و زغن کہرام مچائیں۔" اس شور میں غالب کی آواز ہر چند کہ سب سے زیادہ پُرجلال تھی لیکن صدا بصحرا ہی ثابت ہوئی۔ ایک ایسے زمانے میں جب کم و بیش ہر شخص زبان و ادب کا مذاق رکھتا تھا، گنتی کے دس پانچ آدمیوں کا غالب کو شاعر یا بڑا شاعر سمجھنا بہت بڑی بات نہیں۔ پھر تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ انھیں بحیثیت شاعر آسمان پر اٹھا لیا جاتا اور نیچے زمین ویسی ہی لرزہ خیز ہوتی تو بھی کیا ہو جاتا؟

اس صورتِ حال میں غالب کے سامنے نجات کے راستے بھی تھے۔ وہ جیسی کمیاب ذہانت اور بصیرت رکھتے تھے اس کے سہارے بڑی آسانی سے انھیں اس حلقے میں جگہ مل سکتی تھی جس نے قومی تعمیر اور معاشرتی اصلاح کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔ لیکن وہ صاحبِ شعور ہونے کے باوجود ایک مصلح یا نظریاتی مبلغ بننا شاید پسند نہیں کرتے تھے کیوں کہ انھیں سچے تخلیقی فنکار کے منصب مقام کا پاس تھا۔ اسی لئے وہ خاموش اور متحیر اپنی ذات کے مرکز پر قدم جمائے رہے اور کائنات کے بدلتے ہوئے رنگوں کا طلسم دیکھتے رہے۔ دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ وہ تصوف کے نام پر ایک انفعالیت زدہ اور مجہول تصور کی خیالی دنیاؤں میں جا بستے لیکن اُن سے یہ بھی نہ ہو سکا۔ انھیں تصوف سے دلچسپی ہوئی بھی تو ایسی کہ نیم علمی اور فلسفیانہ نوعیت سے الگ نہ ہو سکی۔ آخری صورت یہ تھی کہ انھوں نے تبدیلی اور تباہی کے ہر شور کی طرف سے کان بند کر لئے ہوتے اور بحر و وزن یا ردیف و قوافی کے مشاغل میں ڈوب جاتے یا غفلت اور بے بصری کو اپنا شعار بنا لیتے لیکن یہ ان کے لئے سب سے زیادہ دشوار تھا کیوں کہ شعور کی مشعل نے اُن کے دل و دماغ کو ہمیشہ روشن رکھا اور شاعری کے معاملے میں اُن کا رویہ شروع سے یہ رہا کہ وہ فکر کی تجسیم کے لئے لفظ ڈھونڈھتے رہے اور لفظوں کو کبھی اپنا رہنما نہیں بنایا۔

انیسویں صدی کا یہ دور جس تہذیبی بحران سے دوچار ہوا اس نے غالب پر بہت گہرے اور دور رس اثرات ڈالے۔ عملی زندگی کی ناکامیوں اور گرد و پیش کی دنیا کے مسلسل انتشار نے انھیں خارجی سطح پر بالکل پسپا کر دیا تھا۔ دل شکستگی کے بہانے اسی وقت سے غالب کا تعاقب کر رہے تھے جب سے انھوں نے ہوش سنبھالا تھا۔ شب و روز کے تماشوں نے انھیں یہ سوچنے پر بھی مجبور کر دیا تھا کہ دنیا بازیچۂ اطفال ہی نہیں، آئینۂ آگہی بھی ہے، جس میں عبرت و حیرت کی ہزار ہا تصویریں چھپی ہوئی ہیں۔ پنشن کی بحالی کے لئے جب انھوں نے کلکتے کا سفر کیا اور اہلِ کلکتہ نے ایک مہمان شاعر کی پذیرائی کے بجائے اس پر بے مہریوں کی یورش شروع کر دی تو غالب ایسے پریشان ہوئے کہ کچھ دیر کے لئے پاسِ وضع کا بھی انھیں خیال نہیں رہا اور آباؤ اجداد

کی شوکت و حشمت کا راگ الاپنے والے اور اپنی محرومیوں پر ظرافت اور بذلہ سنجی کا غلاف چڑھانے والے سپاہی نے خستہ حال اور بے سروسامان شاعر کے مقابلے میں ہار مان لی۔ انھوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی ہی لاش ڈال دی اور آپ اپنے نوحہ گر بن گئے۔ مثنوی بادِ مخالف کے یہ اشعار دیکھیے:

کیستم؟ دل شکستہ غمزدۂ ٭ بید لے خستۂ ستم زدۂ
برق بے طاقتی بجاں زدۂ ٭ آتشِ غم بخانماں زدۂ
از گدازِ نفس بہ تاب و تبے ٭ در بیابانِ یاس تشنہ لبے
خس طوفانیٔ محیطِ بلا ٭ سر بسر گردِ کاروانِ فنا
دردمندے جگر گداختۂ ٭ از غمِ دہر زہرہ باختۂ

●

اُن کے احساس پر یہ درد بھی چھایا ہوا تھا کہ رسوائی کی یہ داستان اُن کے بعد بھی دہرائی جائے گی اور لوگ کیا کچھ نہ کہیں گے:

کہ پس از من بسا لہائے دراز ٭ بہ زباں ماندریں حکایت باز
کہ سفیہے رسیدہ بود ایں جا ٭ چند روز آرمیدہ بود ایں جا
با بزرگاں ستیزہ پیش گرفت ٭ زحمتے داد و راہِ خویش گرفت
شوخ چشمے و زشت خوئے بود ٭ بے حیائے و ہرزہ گوئے بود
ہم سفیہانہ گفتگوئے داشت ٭ ہر خرابا تیانہ ہوئے داشت
بر گِ دُنیا نہ ساز و نیش بود ٭ ننگِ دہلی و سرزنیش بود

●

ان اشعار میں المناکی اور ویرانی کی جو ہولناک اور طوفان خیز فضا ملتی ہے اس سے مجموعی طور پر تاثر مرتب ہوتا ہے کہ غالب اپنے شخصی وقار اور افتخار کا ہر نقش کھو بیٹھے تھے، لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے۔ اپنے بے برگ و بار ہونے کا ماتم کرتے ہوئے بھی انھوں نے یہ یاد رکھا کہ آنے والا زمانہ اُن کی شوخ چشمی، زشت خوئی اور قلندرانہ ہاؤ ہو کو بھی فراموش نہ کر سکے گا۔ اس تاثر کے پردے میں شخصیت کے انفرادی نشان اور سربلندی کا سراغ بھی مل جاتا ہے اور ذہن اس نظریاتی حقیقت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کی وضاحت غالب نے ایک شعر میں فرزندِ آذر کی مثال دیتے ہوئے اس طرح کی کہ صاحب نظری دینِ بزرگاں کو کبھی خوش نہیں کرتی۔ مصائب و حرماں نصیبی کے حصار میں بھی ذہانت اپنی فلسفہ طرازی سے ناکامیوں کا جواز فراہم کر لیتی ہے۔ اس ذہانت نے ہر بُرے وقت میں غالب کا ساتھ دیا، توکل اور قناعت اُن کے بس کی بات نہیں تھی کہ یہ رویہ ان لوگوں کا ہے جو دُنیا کی آسائش و کشش کی طرف سے غافل رہتے ہیں یا پھر ایسے خدا رسیدہ لوگوں کا جو سلوک کی منزلیں طے کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچ جاتے ہیں جہاں اصل حقیقت کے علاوہ سب کچھ باطل دکھائی دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وحدت الوجود کی اس روایت کا عکس غالب کے شعور میں بھی ملتا ہے لیکن انھوں نے اپنی شخصیت کو اس دائرے میں سمٹنے نہیں دیا تھا۔ بے چون و چرا پڑی سے بڑی حقیقت کو تسلیم کر لینا اُن کے فطری تجسس اور ذہنی کرید کے منافی تھا۔ اسی لیے انھوں نے یہ دونوں راستے چھوڑ کر ایک تیسرا راستہ ڈھونڈھ نکالا۔ عروج و زوال کے باہمی روابط کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ اس نتیجے پر جا پہونچے کہ جب روشنی اور تیرگی ناگزیر ہیں تو اُن سے گھبرانا فضول ہے۔ ان کے نزدیک یہ باہم برسرِ پیکار آوازیں ایک ہی ساز سے بیدار ہوئی تھیں اور وہی ساز وجود و عدم دونوں کا علامیہ ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر دانش و عبادت دونوں لاحاصل ہیں۔ کیوں کہ نیا و دیں کی بساط دُردِ یک ساغرِ غفلت سے زیادہ کچھ اور نہیں۔ دُنیا غالب کی نظروں میں اندھیری تھی اور عقبیٰ کی طرف سے بھی انہیں کوئی خوش فہمی نہیں تھی چناں چہ دونوں پر خطِ تنسیخ کھینچ کر انھوں نے اپنی بے بضاعتی کی کوفت سے نجات پائی۔ یہ صحیح ہے کہ اس طرزِ فکر نے غالب کی شخصیت کے انفرادی نقوش کو معدوم ہونے سے بچا لیا۔ لیکن ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کا ذہن جب معرفت کے لمحاتی تجربے سے آزاد ہو کر حقائق کی زد میں آیا تو ایک کبھی نہ ختم ہونے والی بے اطمینانی، کسک، اضطراب اور خلش ان کا مقدر بن گئی۔ اضطراب مسلسل کا یہی انداز غالب کی شخصیت میں اس وقت بھی ایک فکری تابندگی اور نظم و ضبط کا پتہ دیتا ہے جب اُن کے حواس ہواؤں کے قہر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتے ہیں۔

اب غالب کی تصویر کے ایک اور رُخ پر نظر ڈالیے۔ سرسید نے جب بڑی محنت اور لگن سے آئینِ اکبری کی تصحیح کی، اور غالب سے ایک منظوم تقریظ کی شکل میں اپنی جاں فشانی کی داد طلب کی تو غالب نے دوستی کی جذباتی کمزوریوں یا مصلحت کی پروا کیے بغیر بہت کھلے لفظوں میں کہا۔

مُردہ پروردن مبارک کار نیست
خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

یہاں مُردہ پروری سے مراد ماضی کے غبار میں کھوئے ہوئے آئین کے تئیں اظہارِ عقیدت سے ہے جو غالب کے خیال میں آئینِ روزگار کے سامنے اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غالب کا شخص جس نے مغلوں کے ثقافتی ورثے کی بربادی کا ماتم کیا تھا، ایک بار گی اُن کی کہانی سُن کر بے مزہ کیوں ہو گیا اور

اُن کی رفعت و شکوہ سے منحرف کیوں ہو گیا؟ یہاں معاملہ انحراف کا نہیں بلکہ تاریخ کے جدلیاتی ارتقاء کے شعور اور ایک ترقی پذیر زندہ و متحرک احساس کا ہے۔ پرانی قدروں میں کچھ ایسی بھی تھیں جنھیں غالب نے اپنی شخصیت کی تعمیر اور تشکیل میں خام مواد کی حیثیت دی تھی اور اُن کے بغیر غالب کی وجودی ہیئت کی تکمیل دشوار تھی۔ وہ خود پرست نہیں تھے لیکن عرفانِ نفس کا مرتبہ سمجھتے تھے۔ اپنی ذات سے انھیں محبت بھی تھی کیوں کہ انھوں نے اپنی صلاحیتوں کا مقام اور معیار بھی سمجھا تھا۔ ان میں اپنی خامیوں اور کوتاہیوں پر ایماندارانہ تنقیدی نظر ڈالنے کی عادت بھی تھی چنانچہ اُن پر لعنت ملامت کرنے والوں اور طنز و تمسخر کی بوچھار کرنے والوں میں خود اُن کا نام اپنے دشمنوں اور معترضوں سے پیچھے نہیں۔ اُن کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ بہرصورت وہ خود کو بچانا چاہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ مڑی تڑی شخصیت بھی جوہرِ حیات سے خالی نہیں۔ اس لئے انھوں نے ان قدروں کا مرثیہ بھی کہا جو انھیں عزیز تھیں، اور زندگی کے اُن تمام نئے تقاضوں کا خیر مقدم بھی کیا جو اِن قدروں کو نیا لباس عطا کرنے اور اُن کی حفاظتی فصیل بننے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ لگ بھگ اکتیس برس کی عمر میں غالب نے کلکتے کا سفر کیا تھا وہاں انھوں نے اس توانا اور سرکش عالمی معاشرے کے خال و خط دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دیکھے تھے جو صنعتی انقلاب اور سائنسی تصورِ حیات کے غلبے سے عصرِ رواں کا کردار بن چکا تھا۔ ہندوستان پر انگریزوں نے پہلے معاشی تسلط قائم کیا، پھر سیاسی اقتدار حاصل کیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانۂ عروج میں ہر چند کہ مغل شہنشاہ کا نشان باقی تھا لیکن نام مٹتا جا رہا تھا۔ معاشی اور سیاسی اقتدار کی ایک متوازی لکیر کے طور پر مغربی فکر و فلسفہ، علوم اور نظریۂ زندگی کی لکیر بھی ہندوستان کے تمدنی نقشے پر کھنچتی گئی۔ ہندوستانی کلچر لارڈ میکالے کے لفظوں میں خرافات اور توہمات کا پشتارہ قرار دے دیا گیا۔ سرکاری نظم و نسق کی زبان فارسی کی جگہ انگریزی ہو گئی۔ دلی، کلکتہ اور ملک کے دوسرے حصوں میں انگریزی کالج قائم کئے گئے۔ اصلاحی تحریکات کا شور بلند ہوا اور دیکھتے دیکھتے کئی انجمنیں قائم ہو گئیں جن کا مقصد قدیم عقائد کو جدید سے ہم آہنگ کرنا یا از کار رفتہ ہونے کی صورت میں اُن سے چھٹکارا پانا تھا۔ تہذیبی اور فکری تبدیلیوں کی رفتار اتنی تیز ہو گئی کہ ماضیٔ قریب کا زمانہ بھی صدیوں پرانا اور فرسودہ نظر آنے لگا۔ صدیوں کے تسلیم شدہ اخلاقی اور تہذیبی معیار ناقص اور بے معنی قرار دے دیئے گئے۔

یہ معزول غالب کے لئے بہت دشوار تھی ایک طرف ماضی کی اُداس اور شادماں یادوں کا بارِ گراں تھا اور دوسری طرف حال کی دیدہ دلیریاں۔ وہ ان دونوں کی طرف سے نہ تو آنکھیں بند کرنا چاہتے تھے اور چاہتے بھی تو یہ ممکن نہ تھا۔ انھوں نے دلی کا شباب دیکھا تھا۔ پھر اس کی ویرانی دیکھی اور اب نئے رُوپ رنگ میں اس کا نیا جنم دیکھ رہے تھے۔ انھیں یہ اطلاع بھی تھی کہ لندن کے رخشندہ باغ میں شہر بے چراغ روشن ہیں۔ وہاں نغمہ و ساز محتاجِ زخمہ نہیں رہ گئے اور فضاؤں میں حروفِ طیور کی طرح پرواز کرتے ہیں۔ ایک طرف بیتے ہوئے لمحوں کی کسک تھی اور دوسری طرف سامنے کی دُنیا کا شور شرابہ تھا۔ حالی کے بیان کے مطابق اُن کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ مانگ کر کتابیں پڑھنے کے علاوہ کتابیں خریدنے کی انھوں نے کبھی ضرورت نہیں محسوس کی۔ پھر کتابِ زندگی کے اِن واقعات کو وہ کیسے فراموش کر سکتے تھے جو تاریخ نے اُن کے شعور کے صفحات پر لکھے تھے اور اب ہوا کی پیشانی پر نئے سوالات کی شکن تھی جن پر غالب کی زمانہ شناس اور دُوربین نگاہیں جمی ہوئی تھیں۔ نتیجہ ایک کشمکش کی شکل میں نمودار ہوا۔ غالب کے لئے سب سے بڑا سہارا یہی تھا کہ انھوں نے نہ تو ماضی سے اپنی نظریاتی عقیدتیں رشتۂ ایمان کی طرح منسلک کی تھیں اور نہ حال کا طنطنہ اُن کے لئے حرفِ حق کی حیثیت رکھتا تھا۔ زندگی کے چند انتہائی بدنصیب اور حوصلہ شکن لمحات کو چھوڑ کر اُن کی وفاداری اپنی ذات سے مسلّم رہی اور کائنات کے ہر پہلو کو انھوں نے اپنی ذات ہی کے آئینے میں دیکھا۔ خارجی حالات اور عوامل نے اُن کی مادّی زندگی کے راستوں کے تعین میں بہت اہم حصہ لیا لیکن اُن کی ذات تبدیلیوں کا اثر قبول کرنے کے باوجود اپنی انا اور انفرادی وجود کے سائے سے کبھی باہر نہ نکلی۔ اس لئے غالب کی شخصیت نہ تو صوفیانہ عقائد کے پردوں میں چھپ سکی، نہ زمانے کے مروّجہ ادبی مذاق میں جذب ہو سکی، نہ تبدیلیوں کے نشے میں ماضی سے بالکل بے تعلق ہو سکی اور نہ غیر مشروط طور پر اُس نے حال کے آئینِ روزگار کو الف سے 'یے' تک قبول کیا۔ حالات اور واقعات کے بلا تاخیر سمندر میں گردن تک ڈوبے ہونے پر بھی انھوں نے انفرادیت کے ساحل سے نظریں نہیں ہٹائیں۔ مادّی پریشانیوں کے انتہائی پُرآشوب زمانے میں جب گھر کے کپڑے لتے تک بک چکے تھے اور وہ پنشن کی بحالی کے لئے کلکتے جا رہے تھے، انھوں نے لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں معتمد الدولہ آغا میر سے محض اس لئے ملنا پسند نہیں کیا کہ ملاقات کی شرطوں کو وہ اپنے احساسِ غیرت کے منافی سمجھتے تھے۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں جب اُن کے اندر کا شاعر انتہائی مفلوک الحال ہو چکا تھا اور نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں کے لئے عزت کی روٹی بھی حاصل کرنا دشوار تھا، انھوں نے دلی کالج کی فارسی مدرسی کا عہدہ صرف اس لئے ٹھکرا دیا کہ مناسب طریقے سے اُن کا خیر مقدم نہیں کیا گیا۔ اُن کی آزادی اور خود بینی درِ کعبہ کو بھی بند دیکھ کر

احساس بندگی کے وفور کے باوجود دیتا، دینے کی روادار نہیں تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس رویّے نے انھیں انتشار اور عدم توازن سے بچالیا، ورنہ حالات نے کون سی کسر باقی رکھی تھی۔

غالب کے اشعار میں ذات کی شکست کا احساس ضرور ملتا ہے لیکن شخصیت کے زوال کا شائبہ تک نہیں۔ اُن کی شکست دراصل ایک سپاہی کی شکست تھی اسی لئے اس کے المیاتی احساس کا شکار ہوکر بھی انھوں نے اپنی آواز کا سر جھکنے نہ دیا۔ عرصہ ہوا، خوشبو کی ہجرت کے عنوان سے ایک مذاکرہ سویرا میں شائع ہوا تھا۔ اس مذاکرے میں شیخ صلاح الدین ناصر کاظمی، انتظار حسین اور حنیف رائے شامل تھے۔ غالب کے عہد پر باتیں کرتے ہوئے انتظار حسین نے کہا تھا۔ "غالب اپنے ابا و اجداد کے پیشے کے لحاظ سے سپاہی تھے اور سپاہی کو جنگ، فتح اور کبھی کبھی شکست سے بہرہ ور اور دوچار ہونا پڑتا ہے۔" یہاں تک تو بات ٹھیک ہے لیکن جب آگے چل کر انتظار حسین یہ کہتے ہیں کہ [غالب] کے جذبات ایک ایسے ذہین بچے کے سے ہیں جو ہر چیز پر قبضہ چاہتا ہے، ہر آسائش کو اپنا حق سمجھتا ہے اور جب اسے مایوسی ہو تو کہرام مچاتا ہے، لڑنے مرنے پر تل جاتا ہے اور اس کے بعد منہ لپیٹ کر کسی کونے میں تخیلات کی دنیا میں کھو جاتا ہے، جہاں اُسے آخری پناہ ملتی ہے تو انتظار حسین ایک بہت بڑی بھول کے شکار ہو جاتے ہیں۔ مادّی وسائل اور دنیاوی جاہ و مال کے حصول کی طلب ایک حد تک غالب میں ضرور تھی لیکن انھوں نے محض اسی کو اپنا نصب العین کبھی نہیں سمجھا۔ انھیں جو سوالات پریشان کر رہے تھے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مادّی نہیں بلکہ تہذیبی اور فکری تھے۔ یہ صحیح ہے کہ زندگی میں کبھی بھی انھیں معاشی فراغت اور خوشحالی نصیب نہیں ہوئی لیکن ان باتوں نے انھیں حواس باختہ کرنے کے باوجود بجھایا نہیں۔ شکست ذات کے جو گہرے، گونجیلے اور پیچ در پیچ تاثرات اُن کی شاعری میں ملتے ہیں، وہ معاشی پراگندگی سے زیادہ اس عہد کی فکری اور تہذیبی کشمکش کا ردِ عمل تھے۔ ماضی اور حال غالب کے لئے کعبہ اور کلیسا کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھیں دونوں کی حرمت اور تکریم کا پاس تھا۔ اُن کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ دونوں میں سے کسی ایک کے ہو کر رہ جاتے۔ اسی لئے ایک طرف اُن کے ہاں ماضی کے دُور افتادہ مناظر کی بازدید کی تڑپ ہے تو دوسری طرف حال کے بدلتے ہوئے موسموں کا ادراک۔ انھوں نے اپنی ذات کی وسعتوں میں نئی اور پرانی قدروں کے تصادم اور ٹکراؤ کا جو تماشہ دیکھا وہ عصری کائنات کا سایہ تھا۔ یہ ضرور ہے کہ غالب کے شعور تک پہنچنے کے لئے اُسے غالب ہی کی آنکھ سے گذرنا پڑا جو قطرے میں دجلہ دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ ہر سچے فن کار کی طرح غالب کو یہ مُہر بھی آتا تھا کہ کس طرح ایک لمحاتی یا عارضی تجربے کو ابدیت سے ہم کنار کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج جب کہ دُنیا غالب کے زمانے سے بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ ہمیں اُن کی شاعری کے آئینے میں اُن کے ساتھ ساتھ اپنا چہرہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ کوئی بھی تہذیبی، مذہبی، فکری، یا سیاسی نظریہ اُن کے متجسس، تیز رو اور سیماب صفت تخلیقی ذہن کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ذہنی آزادی کے جیسے نقوش ہمیں غالب کی شخصیت میں نظر آتے ہیں اُن کے ہم عصروں میں کسی کے ہاں نہیں ملتے۔ اُن کے پاس کوئی نظریہ نہیں تھا لیکن وہ صاحبِ نظر تھے اور چوں کہ اُن کی شگفتہ مزاجی آپ اپنا مذاق اُڑانے سے بھی باز نہیں آتی تھی، اس لئے کسی نظریئے کی قید اور حد بندیوں میں اپنے فنی احساس اور سبکیاں تخیل کو محصور کر دینا اُن کے لئے کبھی بھی ممکن نہ ہو سکا۔

آخر میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ شاعری غالب کے لئے پناہ گاہ ہرگز نہیں تھی۔ اُسے غالب نے اپنی شخصیت اور ذات کے اظہار کا وسیلہ سمجھا اور اپنے عہد کی تغیر پذیر فکری اور مادّی کائنات کا تجزیہ بھی انھوں نے اپنی انفرادیت ہی کی روشنی میں کیا۔ وہ مصلح اور تخلیقی فن کار کا فرق اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اس لئے ایسے رجحانات جو اُن کی زندگی کی صرف خارجی سطحوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا شعری تجربہ نہ بن سکے۔ اپنے عہد کے انسان کو پڑھتے وقت انھوں نے ہر عہد کے انسان کے مسائل کو مطالعے کا مرکز اور موضوع بنا لیا اور خیر و شر کی تمام لہروں کو ایک روشن اور کھلے ہوئے دل و دماغ رکھنے والے انسان کی حیثیت سے جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی۔ اس عمل میں جذباتی سطح پر غالب کو بہت دیر پا صدمے بھی جھیلنے پڑے لیکن اُن کی شاعری صدمات اور ذاتی مصائب کا مرقع نہیں ہے۔ وہ اُن کا اعمال نامہ بھی نہیں بلکہ ایک ایسے سوانحنامے کی حیثیت رکھتی ہے جس کے جواب میں غالب نے ظاہر اور باطن کی تمام دُنیاؤں اور فصلوں میں زندگی بھر تلاش کئے اور اس عہد کی سیاسی و معاشرتی پراگندگی، تفسیر و تبدل اور مادّی مصائب کے ہاتھوں شکست کے شدید المیاتی احساس کے باوجود انھوں نے اپنے نفسِ ارادی کو مغلوب نہ ہونے دیا بلکہ ہر المیہ تجربہ اُن کی انفرادیت کو اور زیادہ روشن اور اُجاگر کرتا گیا۔ شکست میں تعمیرِ ذات کا یہ حُسن کچھ غالب ہی کا حصّہ تھا۔

غالب

صحرائے زندگی کو گلستاں بنا دیا
زہرِ آبِ غم کو درد کا درماں بنا دیا
ہر جوئے خوں کو شمعِ فروزاں بنا دیا
جو مشکلیں پڑیں انھیں آساں بنا دیا

ادراکِ کائنات کا طالب کہیں جسے
آئینۂ حیات ہے غالب کہیں جسے

الفاظ کو بلندیٔ افکار کر دیا !
بندش کو آبِ دے کے گہربار کر دیا
معنی کو رنگِ فکر سے تہہ دار کر دیا
مے کو سپہرِ طرفِ قدح خوار کر دیا

تشکیک کے دیار سے ہو کر گذر گیا
اپنے جنوں کی آگ میں تپ کر نکھر گیا

خود داریوں کا حال ہر اک فرد پر کھلا
پایا نہ تو نے یار کا دروازہ گر کھلا
عقدہ خود آگہی کا تجھے جان کو کھلا
اٹھا پھر آیا تو جو نہ کبھی کا در کھلا

رہزن کو لٹ لٹا کے دعا دے گیا ہے تو
انساں کی غلطیوں کا پتہ دے گیا ہے تو

حیران رہ گیا ہے ہر اک شوخ تند خو
یوں مہ رخوں سے پوچھا ہے انداز گفتگو
تیرا سخن جواب بد آموزیٔ عدو
ٹپکا نہ آنکھ سے تو نہ مانا اسے لہو !

پابستگیٔ رسم و رہِ عام سے الگ
تو اور چیز ہے دلِ ناکام سے الگ

یوں ہٹ کے طرزِ عام سے گرمِ سخن ہوا
ماحول بے دلوں کے لئے کوہ کن ہوا
لذت شناسِ تلخیٔ کام و دہن ہوا
احوال آزمائشِ دار و رسن ہوا

تجھ سا نہ دوسرا کوئی اہلِ نظر ملا
لیکن ستم بہائے متاعِ ہنر ملا

ایسے بھی غم کہ جن کے لئے رو سکا نہ تو
ایسے بھی داغ جن کو کبھی دھو سکا نہ تو
رنگِ حیاتِ عام بشر کھو سکا نہ تو
اچھا ہوا کہ خشک ولی ہو سکا نہ تو

برتا جہاں کو یوں کہ حق آگاہ ہو گیا
شہرِ سخن وری کا شہنشاہ ہو گیا

مہمل ہے بات دشنہ و خنجر کہے بغیر
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
چلتا نہیں کوئی تجھے رہبر کہے بغیر
جھکتے ہیں اہلِ فن ترے در پر کہے بغیر

اوجِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہ ہو سکا
ہو کر بھی کوئی تیرے برابر نہ ہو سکا

"تو وہ نہیں کہ جس کو تماشا کرے کوئی"
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی
جب تک نہ خود کو دیدۂ بینا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

تا کا کرے بلندیٔ دست دعا تجھے
بخشا گیا ہے بادۂ مرد آزما تجھے

کتنے ہی دام سخت رہے نرد آشیاں
ٹھہرا نہ اک نفس کو بھی سخئیل پرفشاں
ہر چند قطع ہوتی رہیں تیری انگلیاں
لکھتا رہا جنوں کی حکایات خوں چکاں

غالب کی بات اہلِ نظر کو سناؤں کیا
کوئی بتائے اور کہاں میں بتاؤں کیا

نازش پرتاب گڑھی

شاعرِ رازہائے سینہ گداز

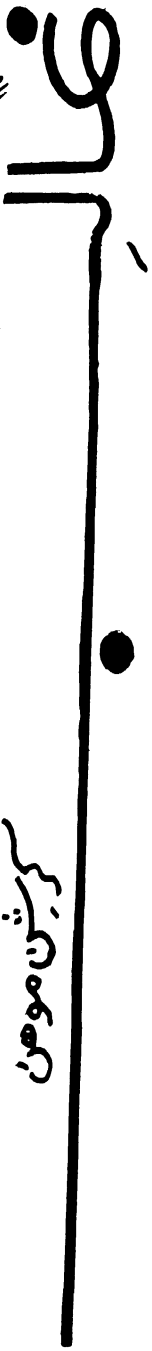

ایک شاعر جلیل اور عظیم
ایک ساحر جدید اور قدیم
گُلِ نغمہ بھی تھا وہ پردۂ ساز
شاعرِ رازہائے سینہ گداز
ہمہ گیر اُس کے شعر کا اعجاز
اور فلک بوس فکر کی پرواز
گلشنِ ہند کا وہ زمزمہ ساز
مُنکشف جس پہ تھی حقیقتِ راز
جس کو آرائشِ خم کاکُل
وجہِ اندیشہ ہائے دُور دراز
آج تک گونجتی ہے دُنیا میں
اُس کے دِل کی شکست کی آواز
جلوہ افگن ہیں اُس کے شعروں میں
جادۂ زیست کے نشیب و فراز
اُس کی تخئیل طرحدار و جمیل
اُس کا احساس ایک پیکرِ ناز
درحقیقت زُبانِ اُردو ہے
اُس کے دم سے جہاں میں سرافراز
کرشنؔ موہن وہ شاعرِ خوش فن
تھا حق آگاہ جس کا رنگِ مجاز
ایک تھا، ایک ہی رہے گا وہ
ہے کہاں اور ایسا حُسن طراز
اُس کا ہمسر ہوا نہیں پیدا
سب پہ غالب ہے غالبِ ممتاز

کرشن موہن

آج کل دہلی (غالب نمبر)

نذرِ غالب

حرمت الاکرام

دلِ دانش کے تقاضوں میں کہیں ربط نہیں
کوئی پامال گماں ہے کوئی پامال یقیں!
کتنی بے مہر ہوئی جاتی ہے آغوشِ زمیں!
زندگی کہتی ہے انسان سے، چل اور کہیں
سوچتا ہوں کہ یہ کس طرح کی محرومی ہے؟
سب کچھ انسان کا، انسان خود اپنا ہی نہیں
تیرا کوچہ تھا کبھی اور کوئی راہ گذر
کیا خبر زندگی کھو آئی کہاں دل کا نگیں؟
سوچنا یہ ہے، خطا وار کسے ٹھہرائیں؟
آدمی خاک نشیں، آدمی افلاک نشیں
راہ تکتے ہوئے اُس لمحے کی مدت گذری
اپنے محور پہ ذرا دیر کو رُک جائے زمیں
نہ بھڑکتا ہے کوئی شعلہ نہ اُٹھتا ہے دُھواں
اک شرارہ سا ہے قرنوں سے دل و جاں میں مکیں
ہم نے تیشے کو نہ ہونے دیا پابندِ جمال
خسروی لاکھ دکھاتی رہی خوابِ شیریں
جرعۂ آبِ بقا نے بھی بدل دی تاثیر
تشنگی ہی مری شاید کہ ہے کچھ زہر آگیں
چھوٹی فردوس تو یہ سانحہ گزرا حرمت
اپنے ہی نور سے دُھندلا گئی آدم کی جبیں

سلیم اختر

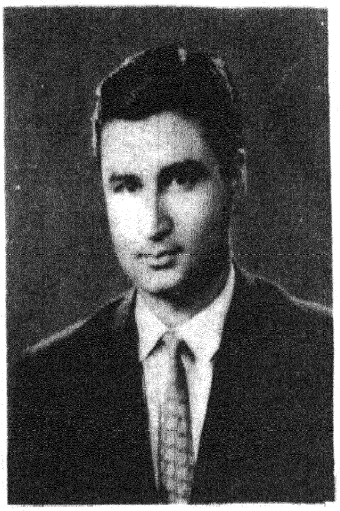

غالب کی شاعری میں جنس

غالب کی شاعری میں جنس، جنسی عناصر اور اشارات کے مطالعہ سے پیشتر ان اہم اُمور کو ذہن نشین رکھنا ضروری ہے جو غزل کی روایات کی صورت میں مختلف نسلوں کے لئے سامانِ تہیج بہم پہنچاتے رہے۔ لکھنؤ میں رنگینی اور واسوخت ایسی اصناف اور غزل میں معاملہ بندی وغیرہ دراصل جنسیت ہی کی مرہونِ منت تھیں لکھنؤی شعراء بدنام سہی لیکن غزل میں جنس نگاری صرف انھیں سے مخصوص قرار نہیں دی جا سکتی کیوں کہ دلی کے علاوہ بھی بعض اور دکھنی شعراء کے ہاں اس رجحان کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ دکھن کا شاعر کیوں کہ زمین اور اُس کی بُو باس سے شمالی ہند کے شعراء کی مانند دُور نہیں تھا، اس لئے اس کے ہاں جذبہ جسم کی پکار کے مترادف ہے۔ شاید اسی لئے دکھن میں جنس نگاری نسبتاً معتدل اور صحت مند نظر آتی ہے جبکہ تمدنی پیچیدگیوں اور اختلاط پذیر تہذیب کے ملمع کی بنا پر لکھنؤ میں یہ جنس نگاری کجروی کی حدود میں جا داخل ہوتی ہے۔ اسی لئے تو دکھن میں عورت کے عاشق بننے سے غزل میں وہی کوملتا اور جذبات کی گھلاوٹ پیدا ہوئی جو ہندی گیت کی عظیم ترین خصوصیات میں سے ہے۔ اس کے برعکس لکھنؤ میں عورت کا عاشق بننا سخن کو جنم دیتا ہے۔

تصوف اکثر شعراء کے لئے برائے شعر گفتن ہی سہی، لیکن اس کے زیرِ اثر لاجنس شاعری کا جو سلسلہ اُردو غزل کی ابتدا ہی سے ملتا ہے، اس نے ایک ایسے دھارے کی صورت اختیار کر لی جس میں مختلف عمرانی اور سیاسی حالات کے ردِ عمل کے باعث کمی بیشی تو ہوتی رہی، لیکن جو کلیتاً ختم نہ ہو سکا۔ تصوف کے زیرِ اثر عشق کے جس تصور نے فروغ پایا اس سے اگر ایک طرف محبوب میں ماورائیت پیدا ہوئی تو دوسری طرف اس عاشقانہ خود سپردگی نے جنم لیا جس کی منزل فنا فی العشق اور جس کا مقصود ؎

ع عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

— قرار دیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں تصوف سے اخلاقیات کے جن تصورات کا اکتساب عمل میں لایا گیا اُن کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم — کیوں کہ اُن کی بدولت عاشق کے کھل کھیلنے پر پابندی عائد رہی — یوں دیکھیں تو غزلیہ شاعری دو قوی ترین مقناطیسوں کے درمیان لرزاں عشق کی ترجمان نظر آئے گی۔ اگر عشق کا جسمانی سطح پر جنسی جبلت کی ترجمان زبان میں اظہار کیا گیا تو تصوف کی صورت میں واردات اور تزکیہ کی اصلاحات بروئے کار لائی گئیں۔

ہم جنسیت پر مبنی شاعری بھی اہمیت میں کم نہیں بلکہ اُسے تو دو دریاؤں کے درمیان "دوآبہ" سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے اور ہم جنسی "کو حقیقت اور "مجاز" دونوں ہی سے وابستہ کیفیات کا مرکز بنا کر عشق کے جسمانی اور روحانی مظاہر کے لئے وسیلۂ اظہار بنایا جاتا رہا۔ اس پر مستزاد یہ کہ محبوب کی جنس واضح

نہ کہنے کی روایت کی موجودگی میں تو ہم جنسیت پر مبنی شاعری کو قطعی اور دو ٹوک قسم کی عشقیہ شاعری قرار دیا جا سکتا ہے (چنانچہ اپنی غیر ملاوٹ شدہ صورت میں تصوف کی ماورائیت اور جذبات کی شوریدہ سری سے معرّا یہ دو اور دو چار قسم کی جنسی شاعری قرار پاتی ہے۔

غالب کے تخلیقی شعور کی پختگی تک غزل ترقی کے کئی ادوار مکمل کر چکی تھی۔ ولی، میر، درد اور لکھنوی شعراء کی صورت میں غزل کے انفرادی رجحانات روایات کی صورت میں تخصیص حاصل کر چکے ہیں۔ جسمانی اور روحانی سطح پر عشق نے دو دھاروں کی صورت اختیار کر کے ایک طرف درد اور دوسری طرف بعض لکھنوی شعراء (مثلاً جرأت، انشاء وغیرہ) کے ہاں روحانیت اور جنسیت کی دو انتہاؤں کو جنم دیا جبکہ ذوجنسیت (Bi sexuality) میر تقی میر کی نمایاں ترین خصوصیت قرار دی جا سکتی ہے۔ ہم جنسیت اور مخالف جنسیت (Hetro sexuality) ترازو کے دو پلڑے ہیں جن میں تول کر ہی میر کی شاعری کی قدر و منزلت متعین کی جا سکتی ہے۔

خود غالب کے ہم عصر مومن کی شاعری میں بھی جنس کا واضح شعور ملتا ہے[1] جب کہ مومن کو تو اس بنا پر غالب پر فوقیت بھی دی جا سکتی ہے کہ غالب نے اگر ایک عشق کیا تو مومن نے کوئی نصف درجن کے قریب (اُن کے ہر عشق کی یادگار ایک ایک مثنوی بھی ہے) کہنے کا مطلب یہ ہے کہ غالب کے ہاں بھی اگر ایسے اشعار ملیں جن کی جنس کی روشنی میں تشریح و توضیح کی جا سکتی ہو تو یہ نہ تو کوئی ایسا باغیانہ فعل ہے اور نہ ہی چونکا دینے والا اقدام (جیسا کہ مضمون کے عنوان سے قاری کو احتمال ہو سکتا ہے)۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رہے کہ غالب کا زمانہ سیاسی ابتری اور اس کے زیر اثر قدروں کی شکست کا زمانہ تھا۔ غالب اپنی نجی زندگی میں حسن پرست اور ایک جذباتی مرد بھی ہوگا۔ وہ آرام و آسائش کا دلدادہ اور ہر قیمت پر اپنا بھرم قائم رکھنے والا بگڑا رئیس بھی تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ ابتری اور انتشار سے بھی آنکھیں بند نہ کر سکا۔ اسی لئے تو ایسے اشعار بھی ہیں[2]

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا
دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے
غم زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اُٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

غالب نے ایک ذکی الحس شاعر کی مانند اپنے ماحول کے تضادات اور اُن سے جنم لینے والے ردِ عمل کو کئی جہات پر محسوس کرتے ہوئے موضوعِ سخن قرار دیا۔ اس کی شاعری کے مجموعی تاثر کو "فلسفیانہ" قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے ہاں اقبال کی مانند باضابطہ نظامِ فکر تو نہیں، لیکن غالب نے اپنے عصری مسائل اور اس میں بسنے والے افراد کی تفہیم میں اپنے مشاہدے اور تجربات سے حاصل کردہ بصیرت ہی کو اپنا فلسفہ قرار دیا۔ لیکن فلسفی محض ذہن ہی تو نہیں بلکہ جسم بھی رکھتا ہے۔ غالب مرد بھی تھا، اس لئے اس کے کلام میں ذہنی پیچیدگیوں کے سراغ بھی ملتے ہیں۔ یہ وہ نفسی کیفیات ہیں جو جنسی ترغیب اور امتناعات (inhibitions) سے جنم لینے والے گریز کے درمیان توازن سے اعتدال کا ایک انداز مرتب کرتے ہوئے غالب (یا کسی بھی مرد) کے جنسی مزاج اور مردانہ انفرادیت کو اُجاگر کرنے کا باعث بن سکتی ہیں۔

خطوط اور شاعری کے مطالعہ سے غالب کی جو تصویر اُبھرتی ہے، وہ زندگی اور اس کی دلچسپیوں سے پیار کرنے والے فرد[3] کی ہے کیوں کہ اپنی ذات سے پیار ہے، اس لئے وہ اس کے حوالے سے افراد اور اشیاء کو چاہتا ہے۔ یہ نکتہ اہم ہے کیوں کہ اسی سے غالب کی طبع اور سخن کا رنگ "چوکھا" ہوتا ہے۔

---

[1] ایک خط ملاحظہ ہو۔

"۶۵ برس کی عمر ہے، پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع ذوق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ اور مزے اڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا۔ کسی کے مرنے کا غم وہ کرے جو آپ نہ مرے، کیسی اشک فشانی اور کہاں کی مرثیہ خوانی۔ آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ۔"

اس خط کے ساتھ ہی یہ اشعار بھی قابلِ غور ہیں

اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ میرے آگے

[2] غالب کا ایک شعر ہے

سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بُتِ آئینہ سیما میرے آگے

غالب کی شاعری میں جنس کی رنگ آمیزی کے تجزیہ کے لئے اس قسم کے سوانحی حالات اور نجی مواد کے فقدان کی صورت میں، جب خطوط کی طرف رجوع کیا جائے تو ایک خط سے غالب کے عشق کا حال بھی معلوم ہوتا ہے:

"بھئی! مغل بچے بھی غضب کے ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں، مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں، عمر بھر میں ایک بڑی سم پیشہ ڈومنی کو مار رکھا تھا۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے بایں کہ یہ کوچہ چھٹ گیا۔ اس فن سے بھی بیگانہ نہ محض ہو گیا ہوں، لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔"

"اعتراف" کی بنا پر یہ خط تاریک ماضی کو ٹٹولنے کے لئے روشنی کی ایک کرن ایسی اہمیت حاصل کر لیتا ہے گو اس سے جوانی کے اس جذباتی حادثے پر مجمل سی روشنی پڑتی ہے لیکن کسی ایسے حادثے کی وقوع پذیری کا علم بذاتِ خود بھی تو بہت اہم ہے۔ اس عشق کو جوانی میں چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش کا والہانہ اظہار بھی سمجھ سکتے ہیں، اور اسے شاعر کا اپنے تخیلی ہیولی کی محبوب کے پیکر میں صورت پذیری بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ حقیقت خواہ کچھ ہی ہو لیکن جوانی کے اس واقعہ نے غالب پر جو شدید اثر کیا وہ اس فقرہ سے عیاں ہے کہ "اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا"۔ غالب کیونکہ اعلیٰ تخلیقی قوتوں کا حامل تھا اس لئے شاعری کی صورت میں جذبے کا ترفع کر لیا اور یوں "زخمِ مرگِ دوست" تخلیقی تہیج بن جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خواہشات جن کی لگن کئی نفسیاتی الجھنوں کا باعث بن کر شخصیت کی صحت مند نشو و نما کے لئے رکاوٹ بن سکتی تھیں، ان سب کا اظہار بلکہ تزکیہ جب غزل میں ہوا تو ــــ آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ــ ایسی حالت ہو گئی۔ غالب کے ہاں روایتی مضامین سے قطع نظر عشق اور محبوب کا جنس پر استوار جو تصور ملتا ہے، کہیں وہ اس ناکام عشق کا عطیہ تو نہیں؟

ے خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس!
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے
اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے
ع میں اور "حظِ وصل" خدا ساز بات ہے
ع غالب مجھے ہے اس سے "ہم آغوشی" آرزو

"خواہش" ــ "ہوس" ــ "تاکے ہے پھر نگاہ" ــ "حظِ وصل" ــ "ہم آغوشی" آرزو" محض الفاظ نہیں بلکہ تمناؤں کے اظہار اور کیفیات کی تفہیم کے لئے اشاریوں کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ یہ اور اس نوع کے دیگر اشعار کے مطالعہ سے غالب کے جذبات کے بارے میں جو خاکہ ذہن میں ابھرتا ہے، وہ یک رنگ نہیں بلکہ اسے Mosaic سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے، جب کہ اس مشہور شعر میں تو اس نے اپنے حوالے سے ہر مرد کی خواہش کا اظہار کیا ہے:

ے نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں!

اس ضمن میں غالب کے تصورِ محبوب کا جائزہ بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی واضح رہے کہ کچھ شعراء نے عشق (حقیقی یا مجازی کی تخصیص نہیں) سے وابستہ جذبات و احساسات کی عکاسی کو مرکزِ توجہ بنا کر ان رنگ بدلتی کیفیات کے اظہار ہی کو کمالِ فن بنا لیا جب کہ بعض نے محبوب کی ذات کے گرد تصورات کا جہانِ نو" تعمیر کیا۔ محبوب کا پیکر ایک منشور (Prism) کی صورت اختیار کر لیتا ہے، عشق یک رنگ شعاع ہے جب کہ محبوب کی ذات اس میں قوسِ قزح ایسی رنگا رنگی پیدا کرتی ہے، بظاہر عشق اور محبوب میں فرق نہیں معلوم ہوتا اور انھیں بالعموم مترادف سمجھا جاتا ہے، لیکن ان میں باریک سا فرق ہے، عشق لطیف اور دائمی نوعیت کا جذبہ ہی نہیں بلکہ "لاجنس" سے لگاؤ کی اعلیٰ ترین صورت بھی۔ ابتداً محبوب بھی اس کا محرک بنتا ہے لیکن انتہائی صورتوں میں محبوب سے بھی بے نیاز ہو کر اور اس کے شخصی تصورات سے ماورا ہو کر جب فنا فی العشق کی منزل آتی ہے تو شاعر اس نفسی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے، جہاں فطرت اور اپنی ذات دونوں ہی میں اُسے کبھی اور جمالِ جہاں آرا کا عکس نظر آتا ہے۔ اور یوں اس کا دل اور نبض کائنات ایک ہی تال پر رقص کناں ملتے ہیں لیکن محبوب کے وجود سے پھوٹنے والے تصورات اتنی بلند پروازی کی اجازت نہیں دے سکتے۔ ان کی اساس کیوں کہ جنس پر استوار ہوتی ہے اور مقصود وصل سے تکمیلِ ذات ہے، اس لئے ماورائیت اور بلند پروازی کی بجائے زمین کے پودوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف جھکنے اور چمٹنے کا رجحان نمایاں نظر آتا ہے ــ غالب نے عشق کا تذکرہ بھی کیا مگر وہ درد کی مانند اس میں ڈوب کر نہیں رہ جاتا وہ طبعاً صوفی نہیں اس لئے "یہ مسائلِ تصوف، یہ تیرا بیان غالب" کہہ کر ساتھ ہی یہ بھی احساس کرا دیتا ہے:

"تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا"

غالب کی شاعری میں Profane اور sacred

کا مجیب فن کارانہ امتزاج ملتا ہے چنانچہ یہ اور اس نوع کے دیگر اشعار یوں کلیدی اہمیت حاصل کر لیتے ہیں کہ اس کے عشق اور محبوب کے تصور میں کسی حد تک اس کی کارفرمائی دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ انفرادیت پسندی کے باوجود غالب کے ہاں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جو اس کی نفسی کیفیات کے غماز یا عکاس نہیں بلکہ محض قافیہ کی رعایت یا غزل کی روایت کی پیروی ان کا باعث ہے۔ اس لئے غالب کے تصورِ محبوب کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں صرف انہی اشعار پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہوگی جو اس کے مخصوص رنگ کے مظہر اور نفسی طبع کے غماز ہوں :

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں نہیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں
ضد کی ہے اور بات مگر خو بُری نہیں!
بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کئے
غیر کو یارب وہ کیوں کر منعِ گستاخی کرے
گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے
ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے
اس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا!
ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے[1]

محبوب کی یہ تصویر یک رخی نہیں، بلکہ متنوع خصائص اُجاگر کرتی ہے۔ اس کا یہ کہنا کہ "ہم حور نہیں" اسے ماورائیت سے معرا کر کے زمین پر لے آنے کے مترادف ہے۔ وہ ضدی سہی لیکن خو بُری نہیں اور پھر حیادار اتنا کہ شرم کی بنا پر وہ غیر کو منعِ گستاخی بھی نہیں کر سکتا اور شاید اسی لئے عاشق ہو کر اس پری رُخ کا رنگ کھلتا جائے ہے"

غالب کے ہاں sacred اور profane کے جس امتزاج کا اشارتاً ذکر کیا گیا ہے اس کا اندازہ محبوب کے تصور کے ضمن میں بھی ہو جاتا ہے۔ مندرجہ بالا اشعار سے ایک کومل شخصیت کا تصور اُبھرتا ہے۔ اب ذرا یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں جہاں حیادار پری رُخ کا دوسرا رُخ ہے،

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا
بغل میں غیر کی آج آپ سوئے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا ہے خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا
مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب
آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا
میں انہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پیے ہوتے
کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

سوال یہ ہے کہ ان متضاد خطوط سے مرتب ہونے والی محبوب کی یہ تصویر حقیقی ہے یا غالب کی اپنی (Projection) یہ ایک ایسا دلچسپ اور اہم سوال ہے، جس کا صحیح جواب نہ ملنے کے باوجود سوال کی نفسیاتی اہمیت کم نہ ہوگی۔

غالب کا ایک مشہور شعر ہے :

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

نفسیاتی لحاظ سے اس شعر کی تحلیل کریں تو غالب کے تحت الشعور میں دو رجحانات کی کارفرمائی کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے، ایک کمزوری کا احساس اور دوسرے نظارے سے تسکین۔ یہ دونوں رجحانات بہت قوی ہیں۔ بظاہر تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا نظارہ پرستی کمزوری کی وجہ سے ہے۔ لیکن اشعار کے تفصیلی مطالعہ کے بعد ایسا نہیں معلوم ہوتا، کیوں کہ اپنی جداگانہ حیثیت میں بھی ایسے اشعار کی کمی نہیں کمزوری کا احساس اشعار کے علاوہ خطوط سے بھی مترشح ہے۔ خطوط میں مختلف بیماریوں کے حوالے سے جسمانی کمزوری کا تذکرہ ملتا ہے۔ بلکہ کافی سے زیادہ تذکرہ ہے، ظاہر ہے اشعار میں معدہ کی خرابی اور پاؤں کے ورم اور اُن سے پیدا ہونے والی جسمانی کمزوری کی تصویر کشی نہ ہو سکتی تھی، لیکن پھر بھی کمزوری کی بات کی گئی ہے۔ یہ اعصابی کمزوری بھی

---

[1] غالب کو یہ تصور بہت محبوب معلوم ہوتا ہے ایک اور شعر بھی اسی مضمون کا ہے:
ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

[2] ولی کا ایک شعر ہے ؎
آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس کو
جو ناز کرتی ہے نگاہ جس قدر نازک یہ گرانی

ہوسکتی ہے اور اس سے بڑھ کر جنسی کمزوری بھی۔

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بارِ نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

کر دیا ضعف نے عاجز غالب ؛ ننگِ پیری ہے جوانی میری
مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں ؛ وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

کم از کم یہ اشعار محض اور بے معنی کمزوری کے غماز تو نہیں ہو سکتے۔ اس موقع پر اعتراض کرتے ہوئے اسے محض توجیہہ قرار دیا جا سکتا ہے، اگر یہ توجیہہ ہی ٹھہرے تو توجیہہ ریت کے محل کی طرح بے بنیاد تو نہیں ہوتی یا اگر اب تک اور کسی نقاد کا اس مفہوم کی طرف دھیان نہیں گیا تو ان اشعار سے جو ایک خاص نوع کا مفہوم بالکل واضح طور سے مترشح ہے، اسے غارت تو نہیں کیا جا سکتا ؛ غالب کو اس کمزوری کا "مراق" معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ متفرق اشعار کے ساتھ ایک مسلسل غزل بھی کہی ہے۔ آٹھ اشعار کی اس غزل میں صرف حذف شدہ دو اشعار مرکزی موڈ سے ہٹ کر ہیں، ورنہ باقی سب کا مضمون کمزوری اور اس سے وابستہ کیفیات ہی ہیں۔

وہ فراق اور وہ وصال کہاں ؛ وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں؛
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے ؛ ذوقِ نظارۂ جمال کہاں؛
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا ؛ شورِ سودائے خط و خال کہاں؛
ایسا آساں نہیں لہو رونا ؛ دل میں طاقت جگر میں حال کہاں؛
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق ؛ واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں؛
مضمحل ہو گئے قویٰ غالب ؛ وہ عناصر میں اعتدال کہاں؛

مسلسل غزل نفسیاتی لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ غزل کے تکنیکی لوازم جس انتشارِ فکر کے متقاضی ہیں، اس کی بنا پر یہ جذبہ پھیل کر نہیں بلکہ سمٹ کر اظہار پاتا ہے۔ اُمڈے احساسات کیوں کہ گھٹاؤں کی طرح کھل کر نہیں برستے، اس لئے دو مصرعوں میں ۔۔ بجلی کی لمحاتی چمک کی مانند غزل گو کو سب کچھ دکھانا ہوتا ہے۔ لیکن بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ تخلیق کی صورت میں جو ارتفاع ہوتا ہے اور اس سے شاعر جو لاشعوری تسکین حاصل کرتا ہے، وہ اُسے ایک شعر تک محدود نہیں رہنے دیتی اور یوں وہ ایک خاص نفسی کیفیت کے تحت مسلسل کہے جاتا ہے۔ غالب کے ہاں مسلسل غزلیں کم ہیں۔ لیکن جو ہیں وہ کسی نہ کسی نفسی کیفیت کے لئے کلید کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔

غالب کے ہاں نظارہ پرستی کو دوسرا قومی رجحان قرار دیا جا سکتا ہے یا کیا اس کی وجہ گو ہاتھ میں جنبش نہیں ہے یا کوئی اور نفسیاتی باعث! اس کے بارے میں حتمی طور سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن اتنا ہے کہ اشعار اور مصرعوں کے علاوہ غالب کے ہاں ان تراکیب کی بھی کمی نہیں جن کا تعلق "دید" یا "دیدہ" سے ہے۔

"دیدۂ نم" ۔۔ "عیدِ نظارہ" ۔۔ "جلوۂ گل" ۔۔ "نگاہِ شوق" ۔۔ "دیدۂ یعقوب" ۔۔ "جلوۂ ناز" ۔۔ "بہارِ نظارہ" ۔۔ "چشمِ حسود" ۔۔ "نگاہِ آفتاب" ۔۔ موجِ نگہ ۔۔ برقِ نظارۂ سوز وغیرہ ایسی ترکیبوں کی محض چند مثالیں ہیں۔

مندرجہ ذیل مصرعوں میں بھی یہی مضمون ابھارا ہے:

ع شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا ؟
ع کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست ؛
ع تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
ع لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں
ع مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی

نظارہ پرستی سے لے کر جنسی نظارہ پرستی (Voyerism) تک دیکھنے کے جو مراحل ہیں، غالب کے ہاں ان کے نشانات ملتے ہیں۔ کچھ تو اس روایت کے باعث کہ اُس عہد کی معاشرت میں عورت سے چونکہ سماجی سطح پر میل ملاپ کے مواقع کا فقدان تھا، اس لئے جو کچھ بھی تھا "عیدِ نظارہ" ہی تھا شاید اسی لئے ہمارے ہاں لمس پر مبنی اشعار کی کمی ہے۔ اور حواسِ خمسہ میں سے بھی زیادہ تر آنکھوں سے کام لیا گیا (علاوہ ازیں تصوف میں "دیدِ وادید" کو اساسی اہمیت حاصل ہے) مگر غالب کے ہاں روایت کے ساتھ ساتھ کچھ اور ذہنی تقاضوں کا بھی سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ روایتی شعر خوبصورت تراکیب یا الفاظ کے حسنِ ترتیب کے باوجود اس والہانہ پن سے عاری ہوتا ہے، جو جذبہ کی آمیزش سے شعر کو بلند کر دیتا ہے اور اس لحاظ سے شعروں کا انتخاب واقعی دل کا معاملہ کھول سکتا ہے۔ بہت سے اشعار میں سے چند مثالیں پیش ہیں

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشہ غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

ہوئی ہے کس قدر ارزانیٔ مے جلوہ
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو!
ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

تماشا کرائے محو آئینہ داری ؛ تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

دل کو نیاز حسرتِ دیدار کر چکے ؛ دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشہ ہو ؛ کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

آنکھ کی تصویر سر نامہ پہ کھینچی ہے کہ تا ؛ تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا ؛ مستی سے ہر نگہ ترے رخ پہ بکھر گئی

ہوتا ہے نہاں گرد میں خورشید جہاں تاب ؛ دیتا ہے دکھائی دلِ بے تاب کسی کا

ہوں محوِ آفرینشِ حسن کہ ترستا ہوں ؛ کرے ہے ہر بنِ مو کام چشمِ بینا کا

ان مثالوں سے غالب کی دیدار پرستی کے مدارج کا اندازہ لگانا دشوار نہیں رہتا۔ اب سوال یہ ہے کہ غالب نے اس نظارہ پرستی سے کیا کام لیا؟ اس ضمن میں یہ اساسی حقیقت ملحوظ رہے کہ ایک مرد عورت کو یا عاشق اپنے محبوب کو جب جنسی نگاہ سے دیکھتا ہے تو تمام جسم سے بیک وقت جنسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا جاتا بلکہ اپنی نفسیاتی ساخت اور جنسی مزاج کی بنا پر ایک آدھ عضو سے اس کشش کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس طرح جنسی نظارہ حواس جنسہ کا تابع و ممنونِ منت ہوتا ہی ہے لیکن اس میں بھی جنسی انتقاد کے باعث کسی ایک حس سے وابستہ تہیجات کو بقیہ پر فوقیت دی جاتی ہے۔ چنانچہ عام زندگی کی مانند شعراء نے بھی اپنی مخصوص جنسی اٹھان کی وجہ سے کسی ایک حس سے وابستہ تہیجات کو اپنے لئے باعثِ تسکین محسوس کرتے ہوئے ان سے وابستہ کیفیات کی ترجمانی میں خصوصی دلچسپی شغف اور والہانہ پن کا اظہار کیا۔ مثلاً میرؔ کے ہاں محبوب کے پاؤں سے اتنی زیادہ دلچسپی ملتی ہے کہ بعض اوقات تو اس پر پاپرست Foot Fetisthist کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ــــ مصحفیؔ اور حسرتؔ نے ملبوسات اور رنگوں سے خصوصی شغف ظاہر کیا ہے۔ مزید برآں حسرتؔ کے ہاں تو بو کی بھی جنسی اہمیت ہے۔ لکھنوی شعراء کے ہاں معاملہ بندی کے نام پر اس حسیاتی شاعری نے خوب فروغ پایا۔ اس نقطۂ نظر سے جب غالب کا جائزہ لیں تو اس کے ہاں رجحان دیدؔ کے تحت قد اور رفتار سے زیادہ اور پابوسی و بوسہ بازی کے تذکرہ میں اس سے قدرے کم لمس سے دلچسپی ملتی ہے۔ یوں تو قد اور رفتار کا تذکرہ بھی غزل کی مسلمہ روایات میں سے ہے اور دید کے نفسی رجحان سے عاری ہونے کی بنا پر بھی بہت سے شعراء نے یہ مضمون اس لئے ادا کیا ہوگا کہ پردہ کی بنا پر صرف قد اور رفتار ہی حسن پیما بن سکے۔ تھے۔ لیکن غالب کا والہانہ پن ہی ان کا معاملہ کھول دیتا ہے۔

جب تک نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

قد کے بعد اب رفتار پر اشعار ملاحظہ ہوں:

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر
جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کہ جا کرے کوئی

قد اور رفتار کا ایک ہی شعر میں حسین امتزاج دیکھئے:

اگر وہ سروِ قد گرمِ خرامِ ناز آجاوے
کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

غالب کے ہاں Sacred اور Profane کی جس خصوصیت کی طرف سطورِ بالا میں اشارہ کیا گیا اس کی کارفرمائی یہاں بھی دیکھی جا سکتی ہے قد اور رفتار بہ جمالیات کے اعلیٰ ترین معیار پر پورے اترنے والے

لہ بہت سے اشعار کے علاوہ معاملاتِ عشق میں بھی یہ اشعار ملتے ہیں:

رفتہ رفتہ سلوک بیچ آیا ؛ ہاتھ پاؤں کو اپنے لگوایا!
گاہ بے گاہ پاؤں پھیلاتے ؛ میری آنکھوں سے تلوے ملواتے
چل کر آتے تھے جب کبھی ادھر ؛ پاؤں رکھتے تھے میری آنکھوں پر
میر تقی میرؔ

لہ پانی بھرے ہے یار و یاں قرمزی دوشالہ ؛ لنگی کی سج دکھا کے سقی نے مار ڈالا
دریائے خوں میں کیوں کر ہم نیم قد نہ ڈوبیں ؛ لنگی کے رنگ سے جب تا کمر ہو لالا
صاف چولی سے عیاں ہے بدنِ سرخ ترا ؛ نہیں چھپتا ہے شبنم چمنِ سرخ ترا
(اس زمین میں مصحفیؔ نے چوغزلہ کہا ہے) مصحفی

لہ رونق پیرہن ہوئی خوبیِ جسمِ نازکی ؛ اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

(سلسلہ اگلے صفحے پر)

ایسے اشعار کے ساتھ جب وہ بوسہ بازی پر اشعار کہتا ہے تو اس میں جنسی خواہش اپنی Crude صورت میں اظہار پاتی ہیں۔ نہ بوسہ بُرا نہ اس کی خواہش بری لیکن غالب نے بعض اوقات جس تمسخر آمیز لہجے میں اس خواہش کا اظہار کیا اُسے صرف جنسیت کی شدت کو کمیو فلاج کرنے کی سعی ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایسے کمیو فلاج کرنا ہی اسے profane بنانا ہے، ورنہ اگر صحت مندانہ انداز سے اس کا بیان ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں، چند مثالوں سے یہ نکتہ مترشح ہو جائے گا۔

بوسہ نہیں نہ دیجئے دُشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

جاں ہے بہائے بوسہ و لے کیوں کہے ابھی
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پُوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

کیا خوب تم نے غنیہ کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو!
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

دکھائے جنبشِ لب میں تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

بوسہ کی صورت میں لمسی حسیات کو غالب نے profane تو بنایا ہی تھا مگر اسی پر اکتفا کرتے ہوئے اس نے پابوسی کی صورت میں اسے جنسی انحراف Deviation کی صورت بھی دے دی ہیں کجروی Per version کی اصطلاح یوں نہیں استعمال کر رہا کہ انحراف "نسبتاً بے ضرر ہے جب کہ کجروی سے ذہن میں مریضانہ اور مجرمانہ تصورات کے ساتھ ساتھ گھناؤنے پن کا احساس بھی اُبھرتا ہے۔ غالب کے ہاں پابوسی کی خواہش تو ہے لیکن اس کا اظہار جس انداز سے ہوا، اس کی وجہ سے قاری کے ذہن میں اگر کوئی اصلی جمالیاتی تصورات نہیں ابھرتے تو کم از کم گندگی وغیرہ کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ میر و غالب کی کئی مشابہتیں دریافت کی گئی ہیں لیکن اب تک اس طرف کسی کی نگاہ نہ گئی کہ دونوں کے ہاں پابوسی کا رجحان بھی ہے۔ البتہ یہ ہے کہ میر کے اشعار میں اس خواہش نے اچھی خاصی obsession کی صورت اختیار کر لی جب کہ غالب کے ہاں اتنی شدت اور بے چینی نہیں ملتی۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں یہاں بھی جنسیت کو بعض اوقات مزاح سے کمیو فلاج کرنے کی کوشش کی ہے اس ضمن میں اس کا بہت ہی مشہور شعر ہے:

آمد خوشی سے سرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

یہ بظاہر پُرمزاح بات ہوتی ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں، پاؤں سے جنسی دلچسپی رکھنے والے کے لئے پاؤں دابنے کی فرمائش دعوتِ وصل سے کم نہیں (بلکہ انتہا پسندانہ یا تجریدیانہ صورتوں میں تو یہی وصل ہے) ہاتھ پاؤں پھولنا محاورہ سہی اور یہاں غالب نے اسے باندھ کر بظاہر اس سے تشنن پیدا کیا ہے لیکن درحقیقت یہ اس جنسی اضطراب کے لئے اشارہ ہے، جو ایسے ہی مواقع سے مخصوص ہوتا ہے۔ غالب نے کئی اشعار میں ایسی کیفیت کے تحت وصل کا مضمون بھی باندھا ہے۔

میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

اسی نوع کے بعض اور اشعار سے یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ غالب کے ذہنی اضطراب" اور خوشی سے مرنے" کی جو کیفیت وصل سے وابستہ ہے، اس کا اظہار اس نے غیر شعوری طور پر ہاتھ پاؤں پھولنے کا محاورہ باندھ کر کیا،

میر اور غالب کے پابوسی کے اشعار کے تقابلی مطالعہ سے کم از کم یہ تو بآسانی واضح ہو جاتا ہے کہ میر کے ہاں غالب کے مقابلے میں ان اشعار میں زیادہ شدت اور بے چینی پائی جاتی ہے اور یہ شدت ہی اُن کی نفسیاتی اہمیت متعین کرتے ہوئے انھیں جنسی مزاج کی تفہیم کے لئے اہم اشاریہ کی حیثیت دے دیتی ہے۔

غالب کے ہاں رفتار سے جس شیفتگی کا اظہار ملتا ہے گو اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ رفتار سے پاؤں کا بھی تعلق ہے، لیکن ان اشعار سے جو منظر ہمارے سامنے اُبھرتا ہے وہ ساکت پاؤں کا ہے۔ جب کہ آٹھ اشعار کی جس غزل کی ردیف میں پاؤں ہے، اس میں ایک بھی شعر ایسا نہیں، جس میں محبوب کی رفتار

(بقیہ ص ۶ پر)

پیرہن کوئی اُتارا نہ اُنھوں نے حسرت ؛ وہ کہ خوشبوئے محبت سے ہم آغوش نہ تھا
خوشبو ترے ملبوس کی لائی ہے کہاں سے ؛ تجھ تک نہ ہوا تھا جو گذر بادِ صبا کا
محتاج بوئے عطر نہ تھا جسمِ خوب یار ؛ خوشبوئے دلبری تھی جو اس پیرہن میں تھی

—— حسرت موہانی

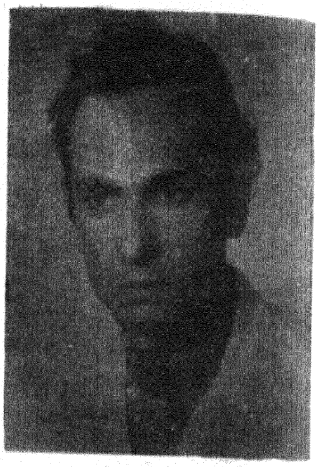

شوق در پردہ ہوس کا سروساماں نکلا
اک گریباں بھی پسِ چاک گریباں نکلا
آپ اُلجھنے کو دمِ صبح بس اتنا ہی ملے
ایک سایہ سا پسِ خوابِ پریشاں نکلا
زندگی اشکِ ندامت نے بھی پیاسا رکھا
ایک قطرے میں جو اترے تو بیاباں نکلا
شب کی شب اور بھی عاجز ہے مرا دستِ جنوں
یا گریبانِ سحر یا مرا داماں نکلا!
تھا جو صحرا کہ یہ زورِ طلب اُٹھا ہم سے
ہے وہ ذرّہ کہ یہ اندازۂ داماں نکلا

شہاب جعفری

جب تک شعورِ عشق ہے، پاسِ جمال ہے
زندانِ آرزو سے نکلنا محال ہے
ہر لمحہ اضطراب ہے، ہر لحظہ انتشار
دل کا وہی ہے حال، جو دُنیا کا حال ہے
جو بھی صلہ ہو تجھ سے محبت کا اے حیات
ہر شخص اپنے آپ وفا کی مثال ہے
گذرا جو کوئے یار سے اُس نے صدا نہ دی
دل ہے کہ اتنی بات سے ناحق نڈھال ہے
سنتے ہیں اے نعیمؔ سوائے کمالِ فن
دُنیا میں ہر عروج پہ اک دن زوال ہے

حسن نعیم

دل کی صدائے درد یونہی بے اثر گئی
نقطوں کی اک لڑی کہ گری اور بکھر گئی
اک چاند کی تلاش میں اپنی یہ زندگی
ظلمت کے اک عمیق بھنور میں اُتر گئی
منظر کھلا جو سامنے اُن کے جمال کا
دُنیا مرے خیال کی رنگوں سے بھر گئی
نکلے دیارِ خوابِ طرب سے تو کیا ہوا
اک دشتِ بے کراں تھا جہاں تک نظر گئی
اک شعلہ سا تھا جو تن میں جلا گیا
اک موج تھی لہو کی جو سر سے گذر گئی
شعروں میں کہہ گیا ہوں میں پاشی حدیثِ دل
غالب کی یہ زمیں بھی بڑا کام کر گئی

لما پاشی

منظور الحسن برکاتی

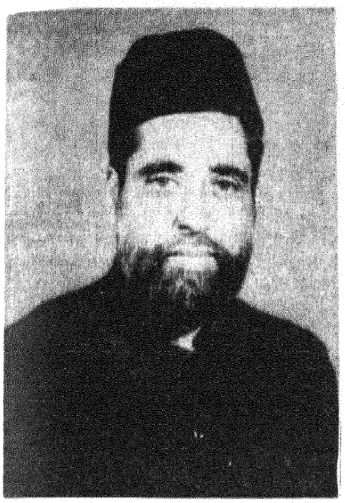

رسالہ سوالات عبدالکریم کا مصنف

مرزا غالب کی حمایت، اور محرق قاطع کے جواب میں جو کتابیں اور رسالے لکھے گئے، ان میں ایک رسالہ "سوالات عبدالکریم" بھی ہے جس کے متعلق "مہیش پرشاد" علیگڑھ میگزین (بابت ۴۸-۱۹۴۷ء) کے غالب نمبر میں "برہان قاطع اور قاطع برہان کا قضیہ" کے ذیل میں راقم ہیں۔

"سوالات عبدالکریم، کسی طالب علم کی تصنیف اردو میں ہے سترہ سوالات پر مبنی ہے۔ محرق قاطع برہان ہی کی تردید میں ہے۔ اس کا ذکر بھی مرزا کے خطوط میں کئی جگہ ملتا ہے۔ "دافع ہذیان" کا جو نسخہ میری نظر سے گذرا ہے۔ اسی کے آخر میں اس رسالہ کے سات صفحات شامل ہیں علیحدہ کوئی نسخہ نہیں ملا"

صـ ۱۳۳

اور مرزا غالب غلام غوث بے خبر کو لکھتے ہیں۔

"ایک مولوی سبحٰن علی صاحب ہیں۔ باوجود فضیلت علم عربی فارسی میں اُن کا نظیر نہیں، وہ جو ایک مجہول الحال نے اہل دہلی میں سے میرے کلام کی تردید میں کتاب تصنیف کی ہے۔ مسمّٰی بہ محرق قاطع برہان، انھوں نے اس کی توہین اور مسودہ کی تفضیح میں، دو جزو کا ایک نسخہ مختصر لکھا اور ایک طالب علم مسمّٰی بہ عبدالکریم نے سعادت علی مولف محرق قاطع سے سوالات کئے ہیں۔ اور ایک محضر اس نے بخط ائے علمائے شہر مرتب کیا ہے۔ ایک میرے دوست نے بصرف زر اس کو چھپوایا ہے ایک نسخہ اس کا آج اسی خط کے ساتھ بسبیل پارسل ارسال کیا ہے"

اردوئے معلّٰی مطبوعہ فاروقی صـ ۲۱۹

لیکن اس رسالہ کے مصنف کے بارے میں آج تک کوئی صحیح نشان دہی نہیں ہوسکی ہے اور "عبدالکریم" کی شخصیت اب تک پردۂ راز میں رہی ہے۔ بلکہ مرزا غالب کی اس صراحت کے باوجود کہ یہ ایک طالب علم مسمّٰی عبدالکریم کی تصنیف ہے۔ محققین غالب، میں سے مہیش پرشاد کے علاوہ قاضی عبدالودود صاحب، اور مالک رام صاحب نے یہ قیاس کیا ہے کہ یہ رسالہ خود مرزا کا تصنیف کردہ ہے۔ اور عبدالکریم واقعی کوئی شخصیت نہیں ہے۔ یہ نام مرزا نے اخفائے حال کی غرض سے استعمال کیا ہے۔ چناں چہ قاضی عبدالودود صاحب حواشی آثار غالب علیگڑھ میگزین میں لکھتے ہیں۔ کہ

"غالب نے دو رسالے دوسروں کے نام سے محرق کی تردید و تضحیک میں لکھے، رسالہ عبدالکریم اور لطائف، تیسرا رسالہ دافع ہذیان، اگرچہ خود غالب کے قلم سے نہیں، لیکن میرا قیاس ہے کہ اُن کے کسی معتقد کی تحریک سے تحریر ہوا ہے۔"

صـ ۴۷

مالک رام صاحب، تحریر فرماتے ہیں۔

"سوالات عبدالکریم (اُردو) یہ آٹھ صفحہ کا مختصر رسالہ بھی اکمل المطابع دہلی سے ۱۲۸۱ھ میں چھپا تھا، اس میں کل سولہ سوال ہیں۔ اور آخری صفحہ پر دُو سوالوں کا استفتا ہے۔ میرے خیال میں یہ رسالہ بھی غالب کا لکھا ہوا ہے۔ یا کم از کم اُس کی تصنیف میں اُن کا بہت زیادہ ہاتھ ہے۔"

حاشیہ ذکر غالب ص۱۷۶

اس کے علاوہ مالک رام صاحب نے ایک مستقل مضمون بھی "سوالاتِ عبدالکریم" پر قلمبند فرمایا ہے جو فروری ۵۲ء کے "آج کل" میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں مالک رام "سوالات عبدالکریم" کا تعارف کراتے ہوئے رقمطراز ہیں۔ کہ

"میں نے ذکرِ غالب میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور اب بھی میرا خیال ہے، کہ یہ رسالہ کا ملاً میرزا کے رشحۂ قلم کا ممنون نہیں، تو کم از کم اس کی تصنیف میں اُن کا بہت زیادہ ہاتھ ہے۔ سب سے اوّل اس رسالہ کا شگفتہ اور مزاحیہ طرزِ تحریر ہے جو میرزا کی نگارش کا طرۂ امتیاز ہے۔"

اس کے بعد مالک رام صاحب "سوالات" کی عبارت کا اقتباس دیتے ہیں اور پھر لکھتے ہیں۔

"دوسرا ثبوت اس تحریر کے مرزا کے قلم سے ہونے کا یہ ہے کہ اس میں مرزا کی ایک خاص روش عام طور پر ملتی ہے مرزا کی یہ عام عادت ہے کہ وہ کسی کو "آپ" سے خطاب کرتے کرتے "تم" لکھنے لگتے سوالاتِ عبدالکریم میں قدم قدم پر یہی انداز ہے۔"

مولانا عبدالمجید سالک نے صرف یہ لکھ کر چھوڑ دیا ہے کہ

"سوالات عبدالکریم، عبدالکریم نامی کسی صاحب سے منسوب ہے۔"

(علی گڑھ میگزین غالب نمبر ص۱۲۳)

غرض کہ اب تک یہ بات تشنۂ تحقیق ہے کہ یہ رسالہ کسی واقعی عبدالکریم نے لکھا ہے یا خود مرزا نے لکھ کر فرضی نام سے اس کو چھپوا دیا تھا۔

اب اگر ہم اس رسالہ کو مرزا غالب کا مصنفہ مان لیتے ہیں تو پھر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مرزا نے اس رسالہ کو اپنے کسی "معروف" اور قریبی شاگرد کے نام کیوں منسوب نہیں کیا؟ ایک غیر معروف شخص "عبدالکریم" کے نام منسوب کرنے میں کیا مصلحت تھی؟ فطرتاً غالب کو اپنے شاگرد یا قریبی دوست کے نام اس رسالہ کو منسوب کرنا چاہئے تھا۔ جیسا کہ انھوں نے "لطائف غیبی" کے ساتھ کیا ہے،

اس لئے ہمیں یہ فیصلہ کرنا پڑے گا، کہ یہ رسالہ غالب کا مصنفہ نہیں ہے بلکہ اس کے مصنف واقعتاً کوئی عبدالکریم ہیں۔

اس رسالہ کا کسی واقعی عبدالکریم کا لکھا ہوا ہونے کا پہلا ثبوت تو یہی ہے کہ مرزا غالب نے غلام غوث بے خبر کو جو خط لکھا ہے جس کا اقتباس اوپر گذرا۔ اس میں مولوی نجف علی خاں کے ذکر کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ

"ایک طالب علم مسمّٰی عبدالکریم نے سعادت علی مولف محرق قاطع سے سوالات کئے ہیں الخ"

غلام غوث بے خبر سے مرزا غالب کے ایسے دور کے پاتکلف تعلقات نہ تھے، کہ اگر غالب خود اس رسالہ کو لکھ کر کسی غیر کے نام سے شائع کراتے تو اس بات کو اپنے خط میں غلام غوث سے بھی پوشیدہ رکھتے اور بے خبر کو بے خبر ہی رکھتے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اس رسالہ کا جو رنگ تحریر ہے، وہ "غالب ہی کا خاص" رنگِ تحریر" نہیں ہے بلکہ یہ اندازِ خطاب ایسے تمام لوگوں کا تھا جو دربار دں سے تعلق رکھتے تھے۔

یہ ایک نفسیاتی انداز ہے وہ لوگ کہ جن کے دماغ اور طبیعت میں اپنی بڑائی بسی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ بالعموم دوسروں کو "تم" سے خطاب کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ مہذب پیرایہ میں گفتگو اور مراسلت میں ایک دُو مرتبہ رسمی طور پر وہ مخاطب کو چاہے "آپ" سے خطاب کرلیں لیکن اس کے بعد وہ فوراً ہی اپنی عادت مستمرہ پر آجاتے ہیں اور مخاطب کو "تم" سے خطاب کرنے لگتے ہیں۔

اس بنا پر یہ کہنا کہ یہ اندازِ تحریر غالب ہی کا خاص تھا صحیح نہیں رہتا۔

تیسری بات قابلِ لحاظ یہ ہے کہ رسالہ کا انداز خالص مولویانہ اور مناظرانہ ہے اور غالب کا طرزِ فکر، اور افتادِ طبیعت یہ ہرگز نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ اپنے دفاع میں ادبی میدان کو چھوڑ کر مذہبی فتووں اور محضروں کی پناہ لیتے پھریں رندانہ طبیعت رکھنے والے لوگ یہ راہ اختیار نہیں کرتے۔

لہٰذا مذکورۂ بالا وجوہات و دلائل کے پیش نظر ہمیں یہی فیصلہ کرنا پڑے گا کہ یہ رسالہ غالب کا مصنفہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے مصنف، واقعتہً کوئی "عبدالکریم" ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ عبدالکریم کون ہیں۔ اس کی تحقیق ہم اس طرح کر سکتے ہیں کہ اولاً تو ہم اس کا جائزہ لیں کہ اس زمانہ میں دہلی، یا اطراف دہلی میں غالب کے معتقدین، احباب، اور ہمدردوں میں کیا کوئی شخص اس نام کا بھی ہے۔ اس کے بعد ہمیں اُن کتابوں کے مصنفین کے احباب کا جائزہ لینا ہوگا جنہوں نے مرزا کی حمایت میں اُس وقت جوابی کتابیں یا رسائل تحریر کیے ہیں۔ کیا اُن مصنفین کے احباب میں "عبدالکریم" نام کی کوئی شخصیت پائی جاتی ہے۔

جہاں تک پہلے نمبر کا تعلق ہے۔ محققین غالب کی تحقیق و تفتیش کے باوجود آج تک "عبدالکریم" نام کی کوئی شخصیت دریافت نہیں ہو سکی ہے جس کا شمار غالب کے احباب، معتقدین، یا اُن کے ہمدردوں میں ہوتا ہے۔ اور وہ اس زمانہ میں دہلی کا باشندہ بھی ہو۔

اب رہا دوسرا نمبر، کہ اُن مصنفین کا جائزہ لیا جائے تو اس سلسلہ میں ہماری نظر سب سے پہلے "دافع ہذیان" کے مصنف کی جانب اٹھتی ہے۔ کیوں کہ "رسالہ سوالات عبدالکریم" انکی کتاب (دافع ہذیان) کے ساتھ بطور ضمیمہ شائع ہوا ہے۔ اور اب تک جس قدر اس رسالہ کی کاپیاں دستیاب ہوئی ہیں وہ سب "دافع ہذیان" کے ساتھ ہیں علیحدہ نہیں ہیں یہ بات اپنی جگہ متحقق اور ثابت ہے کہ "دافع ہذیان" مولوی نجف علی خاں کی تصنیف ہے اور ۱۲۸۱ھ م ۱۸۶۵ء میں شائع ہوئی ہے اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مولوی نجف علی خاں نے جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی تھی یعنی ۱۲۸۱ھ میں وہ کہاں تھے؟ اور یہ کہ کیا اُن کے احباب یا رفقاء میں اس وقت "عبدالکریم" نام کی کوئی شخصیت تھی؟

چناں چہ تحقیق و تلاش کرنے پر معلوم ہوتا ہے۔ کہ مولوی نجف علی خاں اُس وقت ٹونک میں تھے۔

تاریخ ٹونک مصنفہ مولوی اصغر علی آبرو میں، "ٹونک کے تیسرے فرماں روا نواب محمد علیخاں کے ایک دربار منعقدہ ۱۷ شعبان ۱۲۸۱ھ میں جن عمائدین ریاست، و علمائے کرام، و شعرائے عظام کو خطابات دیئے جانے کا ذکر ہے۔ ان میں مولوی نجف علی خاں کا نام بھی شامل ہے کہ "تاج العلما بحر علوم کا خطاب عطا ہوا" ص۶۱ تاریخ ٹونک

گمان غالب ہے کہ مولوی نجف علی خاں نے یہ رسالہ دافع ہذیان ٹونک ہی میں بیٹھ کر تحریر کیا ہے۔ ٹونک میں اُس وقت مرزا غالب کے ہمدردوں دوستوں اور واقف کاروں میں اُستاد طالع یار خاں[1] اور سراج الدولہ[2] سراج احمد موجود تھے۔ نیز حکیم امام الدین[3] خاں دہلوی بھی نواب وزیر الدولہ کے علاج کے سلسلہ میں ٹونک آئے ہوئے تھے اور یہاں ہی مقیم تھے۔ ہو سکتا ہے کہ مولوی صاحب نے ان ہی حضرات کے ایما اور اشارہ سے یہ رسالہ تصنیف کیا ہو۔

ٹونک میں اُس وقت مولوی نجف علی خاں کے رفیقوں، ہم نشینوں اور ساتھ کام کرنے والوں میں ایک مولوی عبدالکریم صاحب ٹونکی بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ جب مولوی صاحب "دافع ہذیان" لکھ رہے ہیں تو ان کے ہم صحبت و رفیق مولوی عبدالکریم صاحب کو اُن کے اس شغل کا علم ہوگا اور چونکہ مرزا غالب کی شخصیت کو خدائے اُن کی زندگی ہی میں مقبول خلائق بنا دیا تھا۔ اور اس علمی و ادبی بحث کا چرچا، ٹونک، رام پور، لکھنؤ اور کلکتہ سب ہی جگہ جہاں غالب کے دوست موجود تھے۔ پہنچا ہوگا۔

چناں چہ مولوی عبدالکریم صاحب نے بھی اس بحث میں حصہ لیا اور "دافع ہذیان" کے ساتھ "رسالہ سوالات عبدالکریم" تحریر کر دیا۔ یا یوں کہیئے کہ مولوی نجف علی خاں نے ایک رسالہ تو خود تصنیف کیا اور دوسرا رسالہ اپنے ساتھی و ہم نشیں مولوی عبدالکریم سے لکھوایا۔

نواب وزیر الدولہ، اور نواب محمد علی خاں بڑے علم دوست رئیس تھے علماء کی صحبت، اور علمی و ادبی تصنیف و تالیف سے شغف خاص رکھتے تھے نواب وزیر الدولہ نے ٹونک کے قلعہ میں نایاب کتابوں کا ایک بڑا قیمتی ذخیرہ جمع کیا تھا۔ اس کتب خانہ کے مہتمم و نگراں مولوی عبدالکریم صاحب تھے۔ دارالمطالعہ میں علماء جمع ہوتے تھے اور تصنیف و تالیف کا کام انجام دیتے تھے۔ مولوی نجف علی صاحب اور مولوی عبدالکریم صاحب میں گہرے روابط

---

[1] ملاحظہ ہو مضمون جمیل الرحمٰن صاحب "طالع یار خاں" نوائے ادب بمبئی اکتوبر ۱۹۵۴ء

[2] ملاحظہ ہو میرا مضمون سراج الدین احمد، شائع شدہ رسالہ آجکل فروری ۱۹۵۸ء

[3] ملاحظہ ہو، غالب کا خط بنام مرزا علاء الدین خاں مطبوعہ اُردو معلیٰ فاروقی ص۲۳۶ اور ۱۸۵۶ء کا تاریخی روزنامچہ مرقومہ عبداللطیف صاحب۔ مرتبہ خلیق احمد نظامی صفحہ ۱۷۹ نیز ترجمہ اُردو تاریخ واقعات ہفدہ سالہ امیر و بست سالہ وزیر قلمی ص۱

تھے۔ اور قلعہ معلیٰ میں ایک ساتھ نشست و برخاست رہتی تھی اور اس وقت جو کتابیں تصنیف ہو رہی تھیں، اُن کی تصنیف میں یہ دونوں حضرات برابر کے شریک تھے۔ چنانچہ "فتوح الاسلام" کے نام سے جو منظوم تاریخ شاہنامہ کے طرز پر نواب محمد علی خاں کے ایما سے تصنیف کی گئی، اس کی تصنیف میں جملہ دوسرے علماء شعراء کے مولوی عبدالکریم اور مولوی نجف علی خاں برابر کے شریک ہیں

اس لئے یہ قیاس کرنا غلط نہ ہوگا۔ کہ قلعہ معلی ٹونک کے کتب خانہ میں جب مولوی نجف علی خاں نے "دافع ہذیان" لکھی، تو مولوی عبدالکریم نے رسالہ سوالات لکھ ڈالا۔ اور مولوی نجف علی خاں نے اپنی کتاب کے ساتھ یہ رسالہ بھی مرزا غالب کے پاس دہلی بھیجدیا۔ اور ایک ساتھ دونوں رسالے شائع ہو گئے۔

مولوی عبدالکریم کو نواب محمد علی خاں نے "محقق العلماء" کا خطاب دیا تھا اور جب نواب صاحب معزول کر کے بنارس بھیجدیئے گئے، تو مولوی عبدالکریم صاحب مع کتب خانہ کے اُن کے ساتھ بنارس چلے گئے تھے اور نواب صاحب کے اس دور میں معتمد اور ہم نشین خاص رہے تھے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد وہ حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے۔ مکہ معظمہ میں حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی۔ ٹونک آنے کے بعد حاجی صاحب کی مراسلت اُن سے رہتی تھی۔

غرض کہ مولوی عبدالکریم صاحب اپنے دور کے ممتاز علماء میں گزرے ہیں۔ بڑے ممتاز خوشنویس، اور سخت قلم استاد تھے۔ وہ ایک زبردست فقیہ عربی کے ادیب، اور عربی فارسی، اردو کے پختہ مشق شاعر تھے۔ اصول فقہ، اصول حدیث اور علم فرائض میں ان کی کتابیں، عربی، فارسی اور اردو نظم میں موجود ہیں۔ ریاست ٹونک کے مفتیان کرام کے زمرہ میں اونچا درجہ رکھتے تھے۔ دوسرے علماء کے مقابلہ میں بعض معرکۃ الآرا افتوؤں میں اُن کی رائے کے مطابق فیصلے ہوئے ہیں۔ وہ بڑے شوخ طبع اور ظریفانہ مزاج رکھتے تھے۔

"سوالات عبدالکریم" میں جو شوخی اور ظرافت ہے وہ اُن کی ادبیت اور شاعرانہ طبیعت کی غماز ہے۔ اہل علم خواہ کو سوں دُور ہوں، ایک دوسرے کی قدر کرتے ہیں، اور باہم محبت رکھتے ہیں۔

چونکہ مرزا غالب سے اور مولوی عبدالکریم صاحب کے درمیان براہ راست تعلقات نہ تھے، اس لئے اُن کا رسالہ مولوی نجف علی خاں نے اپنے رسالہ کے ساتھ غالباً یہ لکھ کر بھیجا ہوگا کہ یہ ایک طالب علم عبدالکریم خاں نے لکھا ہے یا یہ کہ چونکہ رسالہ اردو زبان میں تھا اور وہ بھی پھکڑ انہ" اس لئے خود غالب ہی نے مصنف رسالہ کو طالب علم تصور کیا ہو۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ۱۲۸۱ھ میں شہرت و عزت کے اس بام عروج پر مولوی عبدالکریم صاحب نہ پہنچے ہوں جو بعد میں ان کو حاصل ہوا۔ تصنیف و تالیف کا ابتدائی دور ہو، اس لئے طالب علم کہہ کر مرزا غالب سے تعارف کرایا گیا ہو۔ شخصیت کو چھپانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مخاطب کا مخالف پریہ اثر مرتب ہو کہ غالب کی حمایت میں طالب علم ہی کافی ہیں جن کے سوالات کا جواب اس سے بن نہیں پڑتا۔ یہ ظاہر ہے کہ ٹونک سے باہر دہلی کے حلقوں میں اُس وقت مولوی عبدالکریم صاحب کو کوئی نہیں جانتا تھا۔

مولوی عبدالکریم صاحب کی ایک تصنیف سے ۱۳۰۶ھ تک ان کا بقید حیات ہونا ثابت ہے۔ یہ تصنیف نظم میں ہے۔ اور حالت مرض میں کسی شفاخانہ میں بستر پر لیٹے لیٹے لکھی گئی ہے۔ غالباً ۶۰ برس کی عمر سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے ۱۳۰۱ھ میں ان کی عمر نصف ہی سمجھ لی جائے۔ تو ۲۷ برس کی عمر ہوئی۔

اُن کے انتقال کے وقت چونکہ ٹونک میں تہلکہ عظیم مچ گیا تھا اس لئے خیال ہوتا ہے کہ زیادہ عمر نہیں تھی، اور ایک بہترین عالم کے اچانک اُٹھ جانے کا لوگوں کو بڑا صدمہ ہوا تھا۔

پھر اس قیاس کو اس چیز سے اور تقویت ملتی ہے۔ کہ رسالہ سوالات عبدالکریم کا طرز تحریر، مولوی عبدالکریم صاحب کے رنگ تحریر سے ملتا ہے۔ مولوی صاحب اکثر اپنی تصنیفات کا آغاز اسی طرح کرتے ہیں جس طرح اس رسالہ میں ہوا ہے۔ رسالہ "سوالات عبدالکریم" کے آغاز میں ہے کہ "اضعف بندگان رب کریم حاجی عبدالکریم عرض کرتا ہے" اور فتوح الشام کے مقدمہ میں یوں درج ہے کہ

"ایں فقیر اضعف بندگان قدیر عبدالکریم غفر اللہ لہ"

اصول حدیث میں ان کی ایک کتاب "نتیجہ نیر نظم منار" ہے۔ اس کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

"فقیر ضعیف العباد عبدالکریم ابن احمد خاں متوطن ٹونک غفر اللہ تعالیٰ"

استاذی مولوی حبیب اللہ خاں فنائی مرحوم، جو مولوی عبدالکریم صاحب

(باقی صفحہ پر)

صدیاں گزر گئیں کہ یونہی پائمال ہے
دُنیا نہیں ہے، رہ گذرِ ماہ و سال ہے
دیکھا اصلیت کا حسن، کہ رُوئے حیات پر
اب غازۂ طرب ہے، نہ گردِ ملال ہے
آنگن میں ایسا حبس کہ گھر میں رُکا نہ جائے
رستوں پہ اتنی بھیڑ کہ چلنا محال ہے
کرنے لگی یہ کس کی نظر چارہ سازیاں!
ہر زخمِ دل کو آرزوئے اندمال ہے
سرمستیِ نشاطِ تمنا کے باوجود
تسکینِ اضطرابِ تمنا محال ہے
رقصاں نظر نظر ہے، غزلخواں نفس نفس
یہ کون جلوہ گر سرِ بزمِ خیال ہے
ہوتی ہے محوِ نظر اُن کے روبرو
جرأت فزائے شوق خود اُن کا جمال ہے
دیکھیں اب اُن کی چشمِ کرم کیا جواب دے
مبہم سا ایک اپنی نظر میں سوال ہے
مجبور اُن کی بزم کہاں اور ہم کہاں
افسونِ خواب ہے کہ طلسمِ خیال ہے

محمود سعیدی

اے زندگی میں تیرا پرستار بھی نہیں
لیکن ترے جمال سے بیزار بھی نہیں
یہ زندگی کا دشت، یہ محرومیوں کی دھوپ
بیٹھیں کہاں کہ سایۂ دیوار بھی نہیں
کیا لائے ہو، خلوصِ محبت، خلوصِ دل!
اس جنس کا تو کوئی خریدار بھی نہیں
ساقی مری خموش طبیعت کی لاج رکھ
اقرار گر نہیں ہے تو انکار بھی نہیں
اک عالمِ خیال ہے اور اُن کا غم سروش
صد شکر اب یہاں کوئی غم خوار بھی نہیں

رفعت سروش

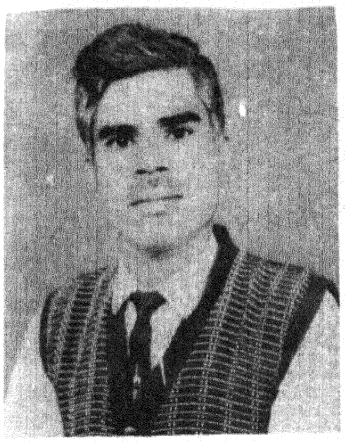

مجرم ضمیر سائے کی صورت چھپا مجھے
بھڑکا ہوں بن کے یاد کا شعلہ بجھا مجھے
پیہم پکارتا رہا کوہِ ندا مجھے
اک چہرہ پتھروں سے بلاتا رہا مجھے
کب نظارہ کرتے ہی آنکھیں بھی بجھ گئیں
شیشوں کے ایک شہر نے دھندلا دیا مجھے
تجھ کو بھلا کے بھیڑ میں سڑکوں کی کھو گیا
اک موج کی سزا میں سمندر بلا مجھے
اترا تھا میں صباحتِ صد رنگ میں ابھی
پتوں کا زرد ہاتھ کوئی چھو گیا مجھے
یہ سوگ بھی ہے ترکِ مراسم کے ساتھ ساتھ
گھیرے ہوئے ہے ایک سیہ دائرہ مجھے
بکھروں گا ریزہ ریزہ جہاں کے وجود پر
دینے لگے خلوص کے پتھر دعا مجھے
ان بے شمار آنکھوں سے بچ کر کدھر کو جاؤں؟
ہر موڑ تک رہا ہے کوئی حادثہ مجھے
وقتِ شکستگی بھی مصور تھا میں چٹان
حیرت سے دیکھتا ہے مرا المیہ مجھے

مصور سبزواری

عبدالقوی دسنوی

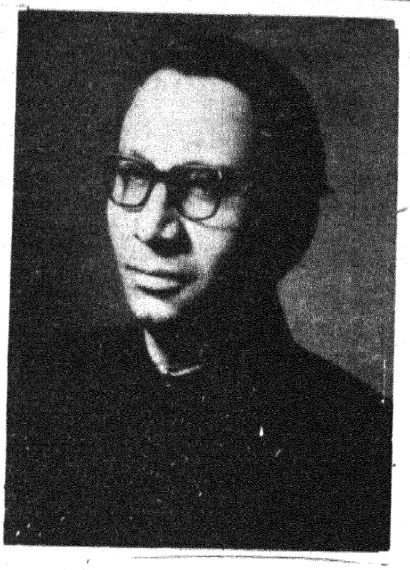

"انشائے نورچشم"

غالب کے ایک شاگرد

نواب یار محمد خاں شوکت کی تصنیف

ایام غدر یعنی ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں نواب سکندر جہاں بیگم والیہ بھوپال نے کوشش کی کہ مرزا غالب بھوپال تشریف لے آئیں۔ انھوں نے تمام اخراجات کی ذمہ داری اپنے سر لے لی، لیکن مرزا غالب دلی چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ نواب سکندر جہاں چونکہ غالب کی قدرداں تھیں اس لئے وہ اپنے ماموں فوجدار محمد خاں کو مرزا کی خدمت میں نذرانے کے ساتھ بھیجا کرتی تھیں۔ یہ اسی آمدورفت اور تعلقات کا نتیجہ تھا کہ مرزا غالب نے نواب فوجدار محمد خاں کو اپنے اصل دیوان کا نسخہ نذر کیا تھا۔ یہی نسخہ بعد میں متداول دیوان کے ساتھ نسخہ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوا۔

نواب یار محمد خاں شوکت انھیں فوجدار محمد خاں کے فرزند تھے جن کی پیدائش ۱۶ جولائی ۱۸۳۳ء (۲۷ صفر ۱۲۴۹ھ) کو ہوئی تھی۔ عربی فارسی کی تعلیم مولوی سید محمد عبداللہ سے حاصل کی اور شاعری میں مرزا غالب کے علاوہ مولوی محمد عباس شیروانی رفعت سے بھی اصلاح لی۔ ۱۸ اگست ۱۹۱۲ء کو انتقال ہوا۔

نواب یار محمد خاں شوکت نے تقریباً پندرہ کتابیں تصنیف کیں "انشائے نورچشم" جس کا یہاں تعارف کرایا جا رہا ہے انھیں میں سے ایک ہے جو آج سے سو سال پیشتر ۱۲۸۹ھ میں شائع ہوئی تھی اور جس کا سرورق حسب ذیل ہے۔

سرورق

بفضل منشی سواد و بیاض متضادین بر صفحہ قرطاس پردہ عینین از افادات گہربریزی چشمہ قلم

جادو رقم مرومک عین اعیان نظر بینش افزای خداوندان بصر قرۂ باصرہ بہروزی بخرۂ ناصیۂ فیروزی لوازمۂ علم اقبال و دولت جناب میاں یار محمد خاں بہادر متخلص بہ شوکت تبصرہ فروغ بخش دیدۂ ارباب نثر و نظم یعنی

انشائے نورچشم

۱۲۸۹ھ

باہتمام حاجی غفران محمد عبدالرحمن بن حاجی محمد رحمت خاں مغفور و تربیت یافتہ خدمت برادر معظم محمد مصطفےٰ خاں مبرور

در مطبع نظامی واقع کان پور مطبوع گردید

یہ کتاب انشائے نورچشم ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے اور سائز ۲۰×۳۰/۸ ہے۔ کتاب کے شروع میں مصنف یار محمد خاں شوکت نے تصنیف کی وجہ حسب ذیل بتائی ہے۔

"... بعدازاں اذہان زاکیہ پر مخفی نہ رہے کہ شوکت خاکسار

نے زبان اُردو میں ایک انشا تصنیف کی ہے مراسلات شوکت اس کا نام ہے۔ عبارت نثر مقفیٰ مرجز عاری اور قریب ایک حصہ منظوم طرب افزائی طبائع خاص و عام ہے جب برخوردار سعادت و اقبال نشان میاں دوست محمد خاں طال عمرہ مکتب نشین ہوئے عنایت الٰہی سے لکھنے پڑھنے کے ہم قریں ہوئے۔ انشائے مذکور کا چھپوانا منظور خاطر ہوا لیکن اس ارادے کے ساتھ یہ امر دل میں ظاہر ہوا کہ انشائے مرقوم میں اکثر خطوط عاشق ناکام کی طرف سے بنام معشوق خود کام اور معشوقۂ دلستاں کی جانب باسم عاشق دل دادہ مذبور ہیں، اور چند خط مشتمل مضامین رندانہ و تقریر بیباکانہ سراپا جدل و ہزل مسطور ہیں ایسے خطوط آغاز تعلیم میں اطفال کو پڑھانا غیر مفید ہے بلکہ اس قسم کے مضامین سے ابتدائی عمر میں آشنا کرنا آئین تعلیم و تہذیب سے بعید ہے بایں خیال صواب اشتمال یہ رسالہ مینے (میں نے) تصنیف کیا ایک ہفتہ میں بسہولت تالیف کیا نور چشم اس کا نام ہے" اختر کاویان تاریخ اختتام ہے"

کتاب مذکور چار باب پر مشتمل ہے۔

باب اوّل: "بارہ خط مقفیٰ ہیں مضامین بوقلمو"

باب دوم: "بارہ رقعات بعبارت عاری ہیں فوائد سے مشحون"

باب سوم: "بارہ خط فارسی قابل تعریف نہایت فصیح و لطیف ہیں"

باب چہارم: "بعض حکماء کے اقوال اعلما کے احوال، بلغا کے نکات، فصحا کے ابیات"

باب اوّل کے پہلے خط کی عبارت حسب ذیل ہے۔

"مہربان من تمہارا خط بسبیل ڈاک میرے پاس آیا مینے (میں نے) تمکو انشا پردازی و سخن سازی میں کامل پایا، تقصیر معاف ہو بڑے بے انصاف ہو کل کی بات کیا بھول گئے جو آج آپ بھول گئے۔ ایسی باتوں کا ہرگز اعتبار نہیں گلشن عالم بے خار ہیں، خوش تقریر ہو مگر شریر ہو ....."

اسی باب میں آٹھواں خط منظوم ہے جس کے آخر میں شوکت نے اپنی ایک غزل بھی شامل کر لی ہے جس کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

اندلوں مونس ہے اپنا پاسبان کوئی دوست
کیا دل شیدا کو اب خوف گمان کوئی دوست

یاد روی آتشیں میں سوزشیں جسے ترے
لوٹتے ہیں اگ پر افتادگان کوئی دوست

غیرت حور و جنان ہے یار اور اُس کا مکان
کیا کریں جنت کو لے کر ساکنان کوئی دوست

شوکتا فریاد سے تیرے قیامت آگئی
زلزلے میں ہے زمین و آسمان کوئی دوست

باب سوم کے پہلے خط میں اپنے والد نوجدار محمد خاں صاحب کا ذکر شروع ہی میں اس طرح کرتے ہیں۔

"حضرت قبلہ گاہ ضیاء الملک مجد و تفاخر نوجدار محمد خان صاحب بہادر علم نحو و صرف و منطق و فقہ و ہیئت و ہندسہ و جغرافیہ و علم طب و علم ادب میں ذی استعداد و علم موسیقی کے اُستاد تھے۔ ۔ ۔ ۔"

اسی باب کے دوسرے خط میں مرزا غالب کے انتقال کے بارے میں اس طرح تحریر کرتے ہیں۔

"نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ دہلوی المتخلص بغالب مصنف مہر نیم روز ماہ نیم ماہ، پنج آہنگ، دستنبو، دیوان فارسی، دیوان اُردو قاطع برہان، تیغ تیز، عود ہندی و رفش کاویانی، گوہر افشاں، قادر نامہ، پسا چین، رواں شیریں، اُردوئے معلیٰ ثانی ظہیر ظہور تھے۔ دوم ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ دہلی میں راہی ملک بقا ہوئے۔ جناب ممدوح کے صدہا شاگرد رشید ہیں۔ سب سے کمتر یہ راقم آثم ہے جناب ممدوح نے ایک قصیدہ جو دیوان فارسی میں مرقوم ہے۔ وزیر الدولہ امیر الملک نواب وزیر محمد خاں بہادر مرحوم رئیس ٹونک کی مدح میں لکھ کر ممدوح کے پاس بھیجا۔ نواب موصوف نے ارسال صلۂ قصیدہ میں عمداً یا سہواً دیری کی۔ مرزا صاحب نے ایک خط منظوم لکھ کر بھیجا۔ نواب صاحب نے بعد ملاحظہ ہزار روپیہ بطریق جائزہ روانہ کئے۔ چند سال وفات سے پہلے مرزا صاحب نے خطوط اُردو میں لکھنا شروع کیا تھا۔ مولانا محمد عباس رفعت نے بھوپال سے مرزا صاحب کو لکھا کہ میں فارسی عنایت نامہ کا مشتاق ہوں جناب مرحوم نے اونکو خط فارسی تحریر فرمایا جو کہ ہر دو خط منظوم و منثور کلیات دیوان و انشائے جناب موصوف میں میری نظر سے نہیں گذرے اور وہ میرے پاس موجود تھے بمراد اشاعت کلام استاد و استفادۂ ادبای نقاد احقر العباد نے تبرکاً اس اپنی انشا میں رقم کئے۔"

منظوم خط حسب ذیل ہے۔

گفتم بخرد بخلوت انس ٭ کے شمع و چراغ ہفت ایوان
آیا زچہ رو بود کہ نواب ٭ نوشت جواب نامہ ام ہان

آنگونہ عریضہ کہ دانی : ٭ درویش نوشتہ سوی سلطان
آنگونہ قصیدہ کہ گوئی ٭ از صفحہ دمید سنبلستان
این ہر دو رسید و نیست پیدا ٭ زآنسو اثرے بہیچ عنوان
زنجید مگر ز مدح نواب ٭ ای کاش نگشتی ثنا خواں
بیہات چہ گفتہ ام کہ باشم ٭ از گفتہ خویشتن پشیماں
عقلم بجواب گفت غالب ٭ زنہار مخور فریب شیطاں
نواب بفکر ارمغان ست ٭ نانامہ فرستدت بساماں
وانہا کہ بخاطرش گذشت ست ٭ زود انہمہ جمع کرد نتواں!
زود است کہ جمع نیز گردد ٭ دیرست کہ دادہ است فرماں
تا ہر وان بحر و بر گرد ٭ آرند بجوشش فراواں
دیبا ز دمشق و مخمل از روم ٭ الماس زمعدن وزر از کاں
نیل از دکن و زتر د از کوہ ٭ لوسن زعراق و در زعماں
فیروزۂ نغز از نشاپور ٭ یاقوت گزیدہ از بدخشاں
جمازۂ تیز رو ز بغداد ٭ شمشیر برندہ از صفاہاں
پشمینۂ قیمتی ز کشمیر ٭ زربفت گراں بہا ز ایراں
بالجملہ درنگ چوں ازیں روست ٭ بررنج و ملال نیست برہاں
چوں پیر خرد بدل فریبی ٭ گفت اینہمہ راز ہائے پنہاں
گشتم بدم امید واری ٭ مرہم نہ زخم یاس و حرماں
گفتم کہ چو با من این کرم کرد ٭ آں قبلہ و قبلہ گاہ اعیاں
ناچار ز راہ حق گزاری: ٭ تا کردہ شود تلافی آن !
من نیز طلب کنم برایش ٭ این مشکل اگرچہ نیست آساں
آئینہ و تاج از سکندر ٭ انگشتر و تخت از سلیماں
از عالم غیب جام جمشید ٭ از چشمہ خضر آب حیواں
عمر ابد و نشاط دائم ! ٭ نیروی دل و ثبات ایماں

توفیق جواب نامۂ خویش
تعمیل عطا و بذل واحساں

خط منشور بنام مولانا محمد عباس رفعت

"والا یزداں ہست و بود آفرین را کہ گماشتن و خشور و فرستادن منشور از آلای اوست بے مرنیالیش و آورندۂ گرامی منشور ہمانا ہمایوں و خشور را کہ پس از دے از ان دہ و دو پیرۂ و خشور کہ باز پسین آن جمع با خداوند در نام انبازی دارد ہر یکے ہر ہنگام بجائ اوست بے اندازہ ستایش غالب سخن گزار ہیچ منگار اگر درین مردہ دلی سوی کلک و کاغذ گرایش دارد نامہ نگار را یسا دوستانند کہ سواد مردم چشم گزرگاہ آنان نشدہ و در سیہ خیمۂ سویدای دل میانند نیرنگ روزگار دورنگ نگر ستی ست پست پایگی بدان پایہ کہ از فرو ماندگی خاک نشین یکشہرم و بلند نامی بدان اندازہ کہ بمیا نجیگری خامہ و نامہ روشناس اعیان دہرم حاشہ اینچنیں پست پایہ بلند نام خرمن در دہر توان یافت از دیریاز بہ نظم و نثر دنمی گراہم، نظم خواہی پارسی خواہی اُردو خوا بے ست فراموش نامہ در پارسی لوشتن نیز آئین نگذاشتہ ہر چہ نوشتہ میشود یکدست در اُردو دست اینک خواجہ حق پرست حق شناس بلند پایہ مولانا عباس کہ ہم ازاں گروہ پرشکوہ ست کہ با من بزبان قلم راہ سخن کشودہ اند از بھوپال فرمان فرستاد کہ غالب فرسودہ روان بنام آں ہمدان نامہ در پارسی زبان نویسد یارب فرمان چوں بجا آرم و در نامہ چہ نویسم بارے نہ از توانائی بنان بلکہ از اثر روائی آن فرمان جنبش خامہ لفظے چند کہ بخواندن نیرزد بر روی ورق فرود ریخت تا آن ورق ہم پیچیدہ سوی کار فرماروان داشتہ آمد چشمداشت انکہ برگ سبز از درویش بہ تحفگی پذیرفتہ آید نگاشتہ سہ شنبہ و چہارم ربیع الاول سال رستاخیز"

صفحہ ۶۰ پر مولانا عباس رفعت کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔

"مولانا و بالفضل اولانا خلف الشیخ الشہیر المانی احمد بن محمد المشروانی تسخۃ الاکیاس استاذی محمد عباس المتخلص برفعت سلمہ رب العزت نظم دل افروز، قیصر نامہ، قنبات القیاس، سلک گوہر، چشمۂ نوش، انیس المجلسین، روان افزا، ہوش افزا، زینت الانشا، قلادۃ الجواہر شہنشاہ نامہ، نور العینین، انوار الغزال، عمدۃ الاخبار، گل صد برگ، گل برگ، گل نسرین، چار باغ، تاج اللطائف، تحقیق انیق، جواب باصواب رسائل مذکور گواہ کمالات ادیب مسطور ہیں"

اس کے بعد چار خط دو منظوم اور دو منثور مولانا عباس رفعت کے درج ہیں۔

باب چہارم بارہ مقالوں پر مشتمل ہے۔ آخر میں مختلف شعراء کے فارسی اشعار کا انتخاب درج ہے جس میں غالب کے اشعار بھی منتخب کئے گئے ہیں۔

آخری حصہ "خاتمۃ الطبع" ہے جس کے ساتھ ہی کتاب "انشائے نور چشم" ختم ہو جاتی ہے۔

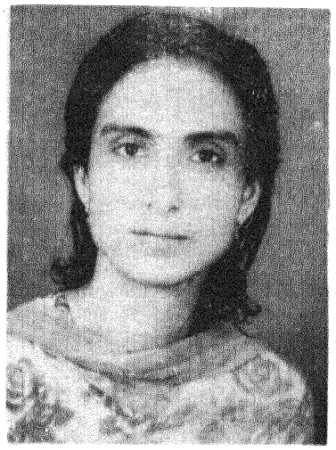

عزیز تر ہیں تیری یہ بخشش غم ہے
بہ اعتبارِ تمنا مگر بہت کم ہے
خوشا یہ حسنِ تصور زہے خیال حسیں
نظر کے سامنے رنگینیوں کا عالم ہے
رہا ہو لطفِ نظر سے بھی جو سدا محروم!
بہشتِ عیش بھی اس کے لئے جہنم ہے
گناہ اس کے خطائیں بھی درگذر کیجئے
کہ یہ فرشتہ نہیں ہے، بشر ہے، آدم ہے
سنا ہے کشتۂ تیغِ ستم وداع ہوئے
ذرا تو دیکھئے سنئے یہ کس کا ماتم ہے
پیا تھا بادۂ الفت سمجھ کے ہم نے اسے
کہاں خبر تھی یہ زہراب، بادۂ سم ہے
کہاں وہ تابِ توانائی جوش و ہوش اسما
بہت دنوں سے طبیعت کا اور عالم ہے

اسما سعیدی

نذرِ عقیدت

سعادت نظیر

وہ پھول آج کہاں کل جو مسکراتے تھے
نئی زمین، نیا آسماں بناتے تھے
ہزاروں شاعرِ نازک خیال گذرے ہیں
زبان و فن کے بڑے باکمال گذرے ہیں
نئی شراب، نئے جام تو نے چھلکائے
جمالیات کے دھندلے مقام جھلکائے
حقیقتوں کا ہے عکس جمیل تیرا کلام!
ترے کلام سے ملتا ہے زندگی کا پیام
طلسمِ معنیِ ہر اک لفظ کو بنایا ہے
کہیں 'بلیغ اشارہ' کہیں کنایہ ہے
تری غزل میں محبت کے واقعات بھی ہیں
دو روزہ زندگی کے تلخ تجربات بھی ہیں
غزل مشاہدۂ حق کی گفتگو بھی ہے
نگارِ شعر و سخن کی اک آبرو بھی ہے

گلشنِ پُر بہار میں بادِ خزاں نہ آئے کیوں
حسنِ بہار زندگی موت کو بھی نہ بھائے کیوں!
فکر و نظر پہ لگ گئیں راہ و روش کی بندشیں
جلوہ گہِ خیال میں آئے تو کوئی آئے کیوں
جس نے بنا لیا اُسے قبلہ نمائے زندگی!
موت بھی اُس کے سامنے بن کے دُلہن نہ آئے کیوں
عرصۂ روزگار میں عزم و عمل کی جیت ہے
خوفِ شکست سے بھلا آدمی خوف کھائے کیوں
محفلِ انبساط میں ذکرِ ملال، بے محل!
سازِ حیات پر کوئی نغمۂ غم سنائے کیوں
اپنی نگاہِ یاس میں منظرِ مرگِ دل لئے
جا کے بہشت میں کوئی دوزخ اُسے بنائے کیوں
طالبِ ضبط کوش کو بیٹھے بٹھائے کیا ہوا
چپ سی زباں کو لگ گئی آنکھ میں اشک آئے کیوں

طالب چکوالی

یوسف ناظم

غالب اور ملازمین سرکار

میں یہ نہیں کہتا کہ غالب اپنی زندگی میں مشہور نہیں تھے مشہور تو وہ اس وقت بھی تھے اور اُن کے نام جو خط وغیرہ آتے تھے اُن پر ٹھیک سے پتہ بھی نہ لکھا ہوتا تو وہ اُن تک پہنچ پاتے تھے۔ کیوں نہ ہو وہ فرماں روائے کشورِ ہندوستان تھے۔ خود انہوں نے ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ در دہلی، بہ اسد اللہ برسد۔ پتہ لکھنا کافی ہے — لیکن اس زمانے کی شہرت اور تھی اور آج کی شہرت کچھ اور۔ پتہ نہیں اسد اللہ خاں غالب کو کیا ہو گیا ہے کہ جیسے جیسے وہ پُرانے ہوتے جا رہے ہیں اتنے ہی جوان اور مقبول ہوتے جا رہے ہیں۔ تھے تو وہ یوسف ہندی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے۔ مِلا اُنھیں حُسنِ زلیخا تھا جو آج پھر لوٹ آیا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ غالب نے اپنی شاعری میں غریب ملازمین سرکار کو فراموش نہیں کیا اور اُن کی فلاح و بہبود کے لئے کافی تعداد میں شعر کہے — اور لوگ تو شاید غالب کو بھول جائیں لیکن ملازمین سرکار جن کی تعداد غموں اور دُکھوں کی طرح بڑھتی جا رہی ہے، اُنھیں کبھی نہیں بھول سکیں گے۔ وہ کتنے ہی رہینِ ستمہائے روزگار رہیں۔ غالب کے خیال سے غافل نہیں ہو سکتے۔

میں سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود ہوں اس لئے میں نے غالب کے کلام کا خالص دفتری نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا ہے اور میری رائے میں غالب اس نقطۂ نظر سے بھی پڑھے جانے کی چیز ہیں۔ غالب کو پڑھا ہی لوگوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ہے۔ میرے ایک دوست ہیں جو جنگل کی لکڑی کی تجارت کرتے ہیں۔ پہلے وہ اس لکڑی کو ھیمۂ سوختنی کے نام سے فروخت فرمایا کرتے تھے لیکن جب اس نام کی وجہ سے اُن کی دوکان بجائے چلنے کے بیٹھنے لگی اور دوکان کے بیٹھنے کے ساتھ ساتھ اُن کی کمر بھی بیٹھنے لگی تو انھوں نے اس لکڑی کو جلانے کی لکڑی کے نام سے بیچنا شروع کر دیا یہ صاحب جنگل کی زمین کو ہمیشہ شہر کی زمین پر ترجیح دیتے ہیں اور غالب کے حوالے سے فرماتے ہیں ؎

سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

اُن کا خیال ہے کہ اگر انہوں نے غالب کو نہ پڑھا ہوتا تو وہ جنگل کی لکڑی کے اتنے کامیاب ٹھیکیدار نہیں بن سکتے تھے۔ وہ اپنی حساب فہمی کو بھی غالب کے کلام کی دین سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں۔

میری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

اپنی نگاہ پر بھروسہ کرنے کی خوشی میں انھوں نے حساب کے رجسٹرات کبھی نہیں رکھے۔

میرے ایک ایڈوکیٹ دوست کو وہی اشعار پسند آتے ہیں جن میں قانونی داؤ پیچ ہوں۔ موصوف مقدمے کی کاروائی کے دوران بھی غالب کے اشعار پڑھنے سے نہیں چوکتے۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

اس شعر میں اُنہیں قانونِ شہادت کی سپرٹ ملتی ہے۔

گھر ہمارا نہ روتے بھی تو دریا ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

وہ کہتے ہیں اس شعر سے بھی انھیں وکالت میں بڑی مدد ملی ہے اور اس کے حوالے سے اُن کے کتنے ہی موکلوں کو شبہ کا فائدہ دے کر بَری کر دیا گیا ہے۔

علم الابدان کے ایک پروفیسر صاحب کو بھی غالب کا کلام بہت پسند ہے حالاں کہ غالب کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ علم الابدان کے کسی پروفیسر کا نام بھی اُن کے شیدائیوں کی فہرست میں لکھا جائے گا۔ یہ پروفیسر صاحب ہمیشہ اپنے طالب علموں سے کہا کرتے تھے کہ ایک دن آئے گا جب آدمیوں کو اپنے ہاتھ، پیر، آنکھ، کان اور ناک کے علاوہ جسم کا اندرونی سامان بھی یعنی دل گُردے وغیرہ بازار سے قیمتاً مل جایا کریں گے۔ اپنے اس بیان کی تائید میں وہ غالب کا مصرع پیش کرتے تھے۔

لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ اب ایک آدمی کے سینے میں دوسرے غیر آدمی کا دل اس آسانی سے بدل کر رکھ دیا جاتا ہے جیسے تکیے کا غلاف بدلا گیا ہے اور ایک عمر رسیدہ شخص کو بغیر قومی خدمت یا بہادری کا کوئی کارنامہ انجام دیئے بغیر ایک تندرست اور نوجوان طالب علم کا دل مل جاتا ہے۔ اس دل کے مل جانے پر وہ شخص جو خود اپنی شکست کی آواز تھا اور جو ہمیشہ یہ کہتا تھا۔

دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خط و خال کہاں

وہی عمر رسیدہ شخص جس کے قویٰ مضمحل ہو گئے تھے اور عناصر میں اعتدال باقی نہ رہا تھا۔ نیا دل پا لینے کے بعد اب دن رات بیٹھا رہتا تھا، تصورِ جاناں کیے ہوئے۔ بعض خوش قسمت لوگوں کے حصے میں تو عورت کا دل بھی آجاتا ہے۔ ورنہ عورت بھلا کب کسی کو اپنا دل دیتی ہے

میرے ایک اور دوست ہیں جو جاکیوں کو ریس کے گھوڑے دوڑانے کی ٹریننگ دیتے ہیں اور اپنے شاگردوں کو بس یہی نصیحت کرتے ہیں کہ دیکھو ریس جیتنی ہے تو نے ہاتھ باگ پر ہو نہ پا ہو رکاب میں ـــ کہنے ہی جا کی اس ترکیب پر عمل کر کے اپنے ہاتھ پاؤں تڑوا چکے ہیں

میں نے بھی بحیثیت ملازم سرکار غالب کے کلام میں ہر درد کی دوا پائی اور ہر جگہ اپنا دلِ خون کیا ہوا دیکھا اور گم ہوا پایا ـــ غالب ملازمین سرکار میں کافی مقبول ہیں۔ ۱۳ تاریخ کے بعد ہر ملازم سرکار غالب کا یہی مصرع گنگناتا ہے ؎

ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

آپ کو شاید علم ہوگا کہ غالب سے پہلے اور غالب کے وقت تک ملازمین سرکار کو مہینوں تنخواہ نہیں ملا کرتی تھی۔ اُس زمانے کا قاعدہ تھا کہ ملازمین کی تنخواہ صرف تسلیم کیجاتی تھی تقسیم نہیں کیجاتی تھی کہتے ہیں لوگ اُس زمانے میں سرکاری ملازم سے نہیں خود سرکاری ملازمت سے ڈرتے تھے اور صرف وہی شخص سرکاری ملازمت قبول کرتا تھا جسے دین دل کی پروا نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت کے ملازمین سرکار احتجاجاً نہیں عزوشاً مرن برت رکھا کرتے تھے اُن کے روزہ رکھنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیوں کہ

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو
اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

اُن کی اس ناچاری کا سبب یہی تھا کہ سرکاری دفاتر میں تنخواہ وقت پر تقسیم کرنے کی سہولت عام تھی بلکہ بعض دفاتر میں تو تنخواہ بالکل ہی تقسیم نہ ہوتی تھی۔ خود غالب دربارِ شاہی سے تنخواہ پاتے تھے لیکن خیالی یہ تھا کہ اگر انھیں اس سال کی سردیوں کے لیے گرم کپڑے سلوانے ہوتے تو اس کام کے لیے انھیں اگلی سردیوں کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔

پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں
ذوقِ آرائشِ سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر
تا نہ دے بادِ زمہریر آزار

غالب بمبئی میں نہیں، دلی میں رہا کرتے تھے اور دلی میں تو موسم گرما میں بھی سردی کا رواج ہے۔

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش
جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار

پھر غالب نے سوچا جب پیر و مرشد سے شکوہ ہی کرنا ٹھہرا تو کیوں نہ سارے شکوے ایک ہی وقت میں اور ایک ہی بحر میں کر لیے جائیں ـــ غالب نے بائیں ہاتھوں تنخواہ کے بارے میں بھی عرض کر دیا۔

میری تنخواہ جو مقرر ہے
اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سُود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا
ہوگیا ہے شریک ساہوکار

پیرو مرشد نے تنخواہ کے اس ہنجار پر ہمدردانہ غور فرمایا اور یہ حکم جاری ہوا کہ نہ صرف دربار شاہی کے متوسلین کو بلکہ تمام ملازمین سرکار کو یہ دیکھے بغیر کہ وہ کیا کام کرتے ہیں، ماہ بہ ماہ تنخواہ ادا کی جایا کرے یہ بھی حکم دیا گیا کہ مستحق ملازمین کو جاڑوں میں گرم پوشاک بھی سرکاری طور پر مہیا کی جائے۔ ریلوے گارڈز اور پولیس کانسٹبلوں کے جسم پر جو چسٹر اور گرم اوورکوٹ نظر آتے ہیں وہ غالب ہی کے ان چند اشعار کا طفیل ہیں۔

اسد اللہ خاں غالب نے ملازمین سرکار کو رخصتوں کی سہولت بھی بہم پہنچائی۔ قیاس کہتا ہے کہ اُن کے زمانے تک ان ملازمین کو کوئی چھٹی ہی نہیں ملتی تھی حالاں کہ اس زمانے میں بھی انھیں بیمار ہونا پڑتا تھا اور اکثر و بیشتر مسہل کی بھی نوبت آجاتی تھی۔ مسہل لینے والے ملازمین کی کیا ضرورتیں اور کیا مشکلیں ہوتی ہیں، سوائے غالب کے اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ ان کی ان تکالیف کا بھی غالب نے پیرو مرشد سے ذکر کیا اور کہا:

سہل تھا مسہل و لے یہ سخت مشکل آپڑی
مجھ پہ کیا گذرے گی اتنے روز بن حاضر ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے، تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل تین تبریدیں، یہ سب کے دن ہوئے

غالب کی اس توضیح کے بعد ان سب دنوں کو جوڑا گیا اور ملازمین سرکار کو اُن کی صفائی شکم کی غرض سے خاصی طویل چھٹی دی جانے لگی — یہ قاعدہ بھی بنایا گیا کہ یہ بے چارا جب بھی مسہل لے اُسے تنخواہ کے ساتھ چھٹی دی جایا کرے — آج اس سہولت کی وجہ سے ملازمین سرکار میں پیچش کی بیماری عام ہے اور یہ لوگ کثرت سے اس بیماری کی طرف رجوع کرتے ہیں —

غالب کو صرف دفتری ملازمین ہی نہیں دفتری زبان بھی بہت پسند تھی۔ اپنی محبت کی بنا پر انھوں نے اپنی ایک غزل بھی دفتری زبان میں کہی ہے جس کے یہ چند اشعار آپ کو بھی یاد ہوں گے:

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز
گرم بازارِ فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سر رشتہ داری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب
اشک باری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اس کی روبکاری ہے

ملازمین سرکار غالب کی بہت عزت کرتے ہیں اور خلوص دل سے انہیں چاہتے ہیں۔ آج بھی جب کسی ملازم سرکار کا کوئی کام رک جاتا ہے تو وہ قبلہ رو ہو کر غالب کا یہ شعر پڑھتا ہے اور اپنی مراد پاتا ہے:

قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

بقیہ رسالہ سوالات عبدالکریم

کے نواسہ تھے۔ اُن سے میں نے اس سلسلہ میں ایک مرتبہ استفسار کیا تھا چناں چہ انھوں نے میرے استفسار پر اپنے خط میں تحریر فرمایا تھا کہ "یہ رسالہ قطعاً نانا میاں مرحوم کا مصنفہ معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اس جملہ سے پہچانا۔ "اضعف بندگان رب کریم عاصی عبدالکریم" وہ اپنے دستخط بھی یوں کیا کرتے تھے "عبد ربہ الکریم" بندگان رب کریم" کی ترکیب بتاتی ہے کہ یہ رسالہ انھیں کا لکھا ہوا ہے۔

غرض کہ ان محکم دلیلوں کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ رسالہ سوالات عبدالکریم" کے مصنف، یہی ٹونک والے مولوی عبدالکریم تھے۔

یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ جب کہ رسالہ کے مصنف یہ ٹونک والے مولوی عبدالکریم تھے تو پھر انھوں نے اپنے کو دلی کا باشندہ کیوں کہا اور یہ کیوں لکھا کہ

"میں دلی کا روڑا ہوں، آپ منہ زور ہیں تو میں کوڑا ہوں
اگر پھکڑ لڑنے کا قصد کیجیے تو خم ٹھونک کر موجود ہوں گا"
(سوالات عبدالکریم ص۷)

تو اس کی وجہ مخاطب کو مرعوب کرنے کے سوا اور کوئی نہیں ہے کیوں کہ جب کسی کی حمایت میں مقامی لوگوں کی شمولیت ہو جاتی ہے تو اس تحریک میں جان پڑ جاتی ہے اور مخالف بھی سوچ سمجھ کر سامنے آتا ہے۔

گلہائے عقیدت

شارق

کسی سے کہیئے اب اے ہم نوا کیا
نمودی کیا چیز ہے شانِ خدا کیا

نہ کر توہین آئینِ وفا کی
کسی سے درد مانگ اے دلِ دوا کیا

سُن اے ناآشنائے رازِ الفت
ہوس کی راہ میں ذکرِ وفا کیا

نہیں واقف جو دستورِ وفا سے
وہ رکھیں گے محبت کی بنا کیا

ہر اک منظر سے گذری جاری ہے
نہ جانے ہے نظر کا مدعا کیا

نہیں کانٹوں سے جب کوئی شکایت
گلوں کی بے وفائی کا گلہ کیا

بجائے شمع لوگوں کے جلیں دل
تری محفل میں ہے یہ بھی روا کیا

حریفانہ اُٹھالے جام و مینا
گدایا نہ کسی سے التجا کیا

جسے ہے پاس خودداری کا شارق
زباں پر لائے حرفِ مدعا کیا

واحد پریمی

اے شہنشاہِ تغزل اے امامِ شاعری
رونقِ صد جام جم ہے تیرا جامِ شاعری

جس کو کہہ سکتے ہیں ہم اوجِ دوامِ شاعری
تو نے حاصل کر لیا ہے وہ مقامِ شاعری

تیرے اک اک شعر میں ہیں زندگی کی دھڑکنیں
وقت کی آواز ہے تیرا پیامِ شاعری

تیری پروازِ تخیل کی کوئی حد ہی نہیں!
آسماں سے بھی پرے ہے تیرا بامِ شاعری

تیرے جامِ فکر سے، تیری مے جذبات سے
فیضیاب ہوتے ہیں کتنے تشنہ کامِ شاعری

عالمِ شعر و ادب میں تو ہے مثلِ آفتاب
تیرے رنگِ خاص سے روشن ہے نامِ شاعری

تجھ سے اے غالب ہوں جب پیغمبرِ شعر و سخن
کیوں نہ ہو واحد کے دل میں احترامِ شاعری

فصیح اکمل قادری

قدر رفتہ کا ہے محرومِ نوا ہو جا
لفظ کا اپنے معانی سے جدا ہو جا

خوں بہا مانگ رہا ہے نفسِ گرم مرے
وہ لپکتے ہوئے شعلوں کا صدا ہو جا

اُنکی نسلوں سے ذرا پوچھئے مفہومِ فنا
وہ جو آسان سمجھتے تھے فنا ہو جا

وقت نے خوابِ سحر توڑ دیا ہو جیسے
ذرہ ذرہ کا یہ خورشید نما ہو جا

درد کی اب تو کوئی حد ہی نہیں ہے جو کہیں
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جا

اپنی حالت پہ نظر پہلے کہاں تھی لیکن
تیری آنکھوں کا وہ آئینہ نما ہو جا

صندلیں جسم سے اٹھتی ہوئی خوشبوئے لطیف
رنگ کا جیسے ہم آہنگِ صبا ہو جا

آج پھر ہم سے تقاضائے غزل ہے اکمل
جیسے آسان ہو اس حق کا ادا ہو جا

ہے اِدھر "جلوۂ گل" اور اُدھر کربِ حیات
"چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جا"

"کہانی میری زبانی میری۔ غالب کی آپ بیتی"

مرتبہ: حفیظ عباسی ــ ناشر: مجلس اشاعت ادب دہلی

ملنے کا پتہ: ۱۵۰۳ قاسم جان اسٹریٹ دلی اور مکتبہ شاہراہ اُردو بازار جامع مسجد دلی

صفحات: ۱۶۰ ــ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت: ساڑھے چار روپے

حفیظ عباسی صاحب نے غالب کے خطوط سے اُن کی آپ بیتی مرتب کی ہے یہ کتاب حسنِ صورت اور حسنِ سیرت دونوں سے آراستہ ہے کیوں کہ نہ صرف "ذکر اس پری وش کا" ہے بلکہ حسنِ بیان بھی اُسی کا ہے۔ کلام صرف حسنِ ترتیب میں ہے۔ اصل کتاب صفحہ ۱۹۰ تک ہے اس کے بعد صفحہ ۱۶۰ تک غالب کا وہ اُردو دیوان شامل کر دیا گیا ہے جو انھوں نے نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور کو بھیجا تھا۔

غالب کے خطوط سے اُن کی خود نوشت سوانح تیار کرنے کا خیال نہایت عمدہ تھا جس کے لئے فاضل مولف لائق تحسین ہیں لیکن خیال و عمل کا تفاوت یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ غالب سے ہماری دلچسپی محض ایسے خارجی واقعات تک محدود نہیں رہتی کہ وہ کب پیدا ہوئے۔ انھوں نے کیسے اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالا، کتنی کتابیں شائع کیں اور کب مرگئے۔ ہمیں تو غالب کی ذات کے ہر پہلو اور اُس کے ہر روپ میں دلچسپی ہے اور غالب کے اپنے دوستوں اور عزیزوں، شاگردوں اور مربیوں سے تعلقات کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ وہ خطوط ہیں جن میں غالب نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ اور اپنی خامیوں اور کمزوریوں کو بھی اُسی بے جھجک طریقے سے بیان کیا ہے جیسا کہ اپنی بزرگی و برتری کو جس نے بھی غالب کے خطوط کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے اُسے یہ کتاب پڑھ کر تشنگی اور مایوسی کا احساس ہوگا اور یہ خلش ستائے گی کہ کاش مولف خطوط کے اس بحرِ ذخار کو چھاننے میں سہل انگاری سے کام نہ لیتا تو کتنی اچھی کتاب بن سکتی تھی لیکن:

ع حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

پھر غالب کے سلسلے میں ادارت کی چھوٹی چھوٹی کوتاہیاں بھی قاری کو جھنجھلا دیتی ہیں۔ جو کتاب محض اقتباسات سے بنائی گئی ہو اس میں حوالے نہ دینا زیادتی ہے جب یہ صراحت نہ ہوگی کہ خطوط کس تاریخ کو اور کہاں سے لکھے گئے تھے تو کہیں کہیں مطلب بھی خبط ہو جائے گا۔ مثلاً "مالدے کا آم یہاں ہوندی اور دلاتی کر کے مشہور ہے"، علاوہ ازیں ایک علمی کتاب میں اشاریہ کی کمی بھی کھٹکتی ہے۔ ان سب پر طرہ کتابت کی غلطیاں ہیں۔ پھر بھی اس کتاب میں غالب ہے غالب کے خطوط ہیں۔ غالب کا کلام ہے۔ اور غالب کے مزاج کے نمونے شامل ہیں جس کے صلے میں سب کچھ بھول کر مرتب کا شکریہ ادا کرنے کا جی چاہتا ہے۔

غالب کی کہانی مصنفہ: شفیع الدین نیرؔ

اُردو میں چند ہی ایسے لکھنے والے ہیں جنھوں نے مسلسل مگر صرف بچوں کے لیے لکھا ہے ایسے ادیبوں میں جناب شفیع الدین نیرؔ کا نام سرفہرست ہے ان کی تاریخی و اخلاقی کہانیوں اور نظموں کے متعدد مجموعے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

غالب کی صد سالہ یادگار کی تقریب کے موقعے پر شفیع الدین صاحب نے بچوں کیلئے "غالب کی کہانی" لکھ کر بڑا مفید کام انجام دیا ہے جس سے بچوں کو غالب کو پڑھنے اور سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

پہلے غالب کے حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں انداز بیان دلچسپ ہے بیچ میں بامونع اشعار دیئے گئے ہیں دوسرے باب میں اُن کی غزلوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور بڑے آسان انداز میں غالب کی شاعری کی خصوصیتوں کو واضح کیا گیا ہے۔ اُن کی شاعری میں جو اخلاقی تعلیم ملتی ہے اس کی وضاحت بھی کی گئی ہے تیسرے باب میں کلام غالب کی باقی قسموں کے عنوان سے اُن کی قصیدہ نگاری مرثیہ گوئی اور رُباعی وغیرہ کا جائزہ ہے۔ ان اصناف کی صراحت بھی کر دی گئی ہے آخر میں اُن کی خطوط نگاری کا ذکر کیا گیا ہے اور خطوں سے دلچسپ اقتباسات میں دیئے گئے ہیں بحیثیت مجموعی یہ ایک اچھی تصنیف ہے جو نہ صرف بچوں بلکہ بالغوں کے لئے بھی کارآمد ہے۔

کتابت طباعت قابل تعریف ہے۔ قیمت دو روپے، صفحات ۱۲۶

ملنے کا پتہ: نیز کتاب گھر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

نئے ناسٹنیۂ غالب مرتب: اکبر رضا

"نئے ناسٹنیۂ غالب کے نام سے جناب اکبر رضا جمشید نے غالب کا عنر متداول

کلام شائع کیا ہے۔ یہ مجموعہ انھوں نے نسخۂ حمیدیہ، آسی و عرشی سے مرتب کیا ہے۔ نسخۂ عرشی کی اشاعت کے بعد اس مجموعے کا جواز صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اس کی قیمت دو روپے ہے۔ کتابت و طباعت ادنیٰ ہے۔

ملنے کا پتہ: بک ایمپوریم سبزی باغ پٹنہ۔۴

غالب نمبر — فروغ اُردو لکھنؤ

نومبر و دسمبر ۱۹۶۸ صفحات ۸۳۲ قیمت ۱۵ روپے

ملنے کا پتہ: ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں ادارہ فروغ اُردو کا یہ ضخیم غالب نمبر سب سے پہلے مارکٹ میں آیا ہے اور گو کہ اس کی قیمت ۱۵ روپے ہے لیکن صفحات کی تعداد، کاغذ، کتابت اور طباعت کا معیار دیکھتے ہوئے اسے زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس شمارے کی خصوصیت یہ ہے کہ مختلف اوقات میں غالب پر لکھے گئے مشہور مضامین کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا قدیم و جدید کی کوئی تخصیص نہیں رہی۔ مواد کو احوال، تنقید، تحقیق، فارسی، مزاحیہ، مکتوبات، منظومات قندِ مکرر اور فہرست کتب کی سرخیوں کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔ فروغ اُردو سے پروفیسر احتشام حسین کی وابستگی اس کے معیار کی ضامن ہے۔ لیکن دبی زبان سے یہ کہنا پڑے گا کہ مواد اتنا زیادہ ہے کہ اس کے پڑھنے اور لطف اندوز ہونے کے لئے مدت اور فرصت چاہئے۔ لہٰذا اندیشہ ہے کہ یہ نمبر محض لائبریری کی زینت بن کر رہ جائے گا۔ یعنی اگر تحقیق نگار اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے تو عام قاری اُسے ہاتھ لگاتے ڈرے گا

بہرصورت ادارہ فروغ اُردو کی ہمت اور حوصلہ قابل داد ہے۔ اور سرفراز قومی پریس لائق تحسین کہ دونوں کے اشتراک سے اُردو ادب میں یہ قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ سرورق، غالب کے مداح مشہور آرٹسٹ عبدالرحمٰن چغتائی کا بنایا ہوا ہے۔

(ادارہ)

پانی کی زبان

مصنف: مظفر حنفی

شب خون کتاب گھر، ۳۱۳ رانی منڈی۔ الہ آباد

قیمت: تین روپے

مچلے چھلکے گھس آیا ہے میرے گاؤں میں شہر
سونگھ رہا ہوں کھیتوں کی شاداب ہوا میں زہر

مظفر حنفی کا یہ مجموعۂ کلام دراصل اسی احساس کی تشریح ہے۔ اُن کی شاعری کا موضوع نئی نسل کا وہ کرب ہے جو اُس کے جذبات کی دُنیا اور خارجی دُنیا کے تضاد کی بدولت وجود میں آیا ہے۔ سماجی سطح پر تبدیلیوں کی تیز رفتاری نے اس کی نظروں سے وہ سیدھا رستہ اوجھل کر دیا ہے، جو اب تک بالکل صاف نظر آتا تھا اور وہ بے خطر اُس پر چلتا جا رہا تھا۔ آج کی سماجی پیچیدگیاں انسانی زندگی اور اُس کے باہمی رشتوں کو پیچیدہ تر کئے دے رہی ہیں۔ پرانی شرافتوں اور وضع داریوں کا خون ہو رہا ہے۔ پرانی اقدار ٹوٹ رہی ہیں۔ اُن کی جگہ نئی اقدار نے نہیں بلکہ ایک بحران نے لے لی ہے۔

تفسیر ہے اس عہدِ بغاوت مزاج کی
مرکز کے انہدام پہ گولائیوں کا ناچ

نئے مرکز کی تلاش مظفر حنفی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ تلاش کی اس منزل میں وہ کفر مہبوت نظر آتے ہیں۔ اور نئے خدا کا قہر اُن پر طاری ہونے لگتا ہے اور خدشہ محسوس ہوتا ہے کہ یہی اُن کی شاعری کا رنگ بن کر نہ رہ جائے۔ شاعر کی آواز کی شکست اور پسپائی بڑی شاعری کو جنم نہیں دے سکتی۔ اُن کی نظم 'آج کی بات' سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس حقیقت سے واقف ہیں۔

مظفر حنفی کی غزلیں، نظموں سے زیادہ متاثر کرتی ہیں گو کہ اس مجموعے میں اچھی نظمیں بھی ہیں۔ جیسے "ایک فسادزدہ رات"، "وقت کے حمام میں"، وغیرہ۔ غزلوں میں بحروں، ترنم اور اظہار کی سادگی اور جذب و فکر کا ایک نیا موڑ نمایاں ہے۔

کانٹے نہیں کہ گرتے ہوئے تھام لیں تمہیں
آسان راستوں پہ سنبھل کر چلا کرو!
موسم نے کھیت کھیت اُگائی ہے فصلِ زرد
سرسوں کے کھیت ہیں کہ جو پیلے نہیں رہے
بہت گھٹا ٹوپ تھا اندھیرا مگر خیال آ گیا جو تیرا
تو ابر باراں پہ ایک چاندی کا تھال بھی تیرنے لگا ہے
ہر چیز کو ہزار طرح دیکھتا ہوں میں
آئینہ خیال مرا پاش پاش ہے۔

صدیقہ الرحمٰن قدوائی

دو یا تین بچّے

ہوتے ہیں گھر میں اچھّے

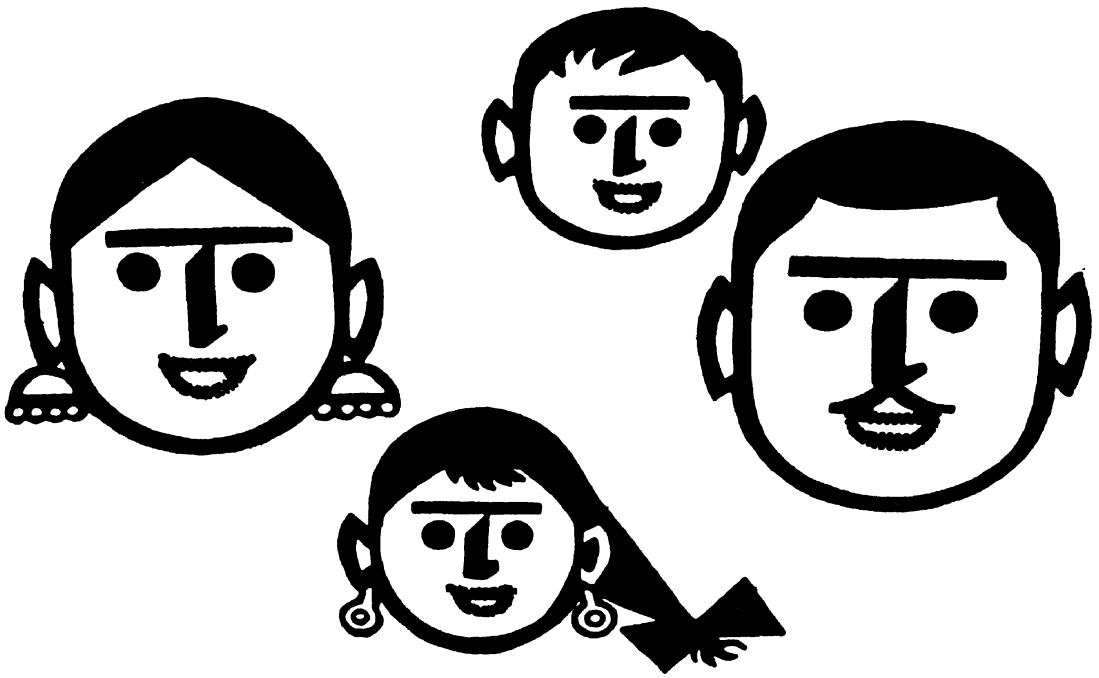

فیملی پلاننگ سینٹر کی پہچان : لال تکون

dovp 68/278

کھُلا گھر

میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر کے آس پاس، چاروں طرف دیواریں کھڑی کر دی جائیں۔ میرے گھر کی کھڑکیاں بند رہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمام مُلکوں کی تہذیبوں کی ہوائیں میرے گھر کے ردو نواح میں بلا روک ٹوک چلتی رہیں۔ لیکن میں یہ نہیں چاہوں گا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ اُڑا لے جائیں۔ میرا دھرم قید خانہ کا دھرم نہیں۔ اس میں پرماتما کی ہر مخلوق کے لئے گنجائش ہے۔ نسلی، مذہبی یا معاشرتی برتری جیسے بیہودہ جذبات اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

(ینگ انڈیا، جون ا

مہاتما گاندھی

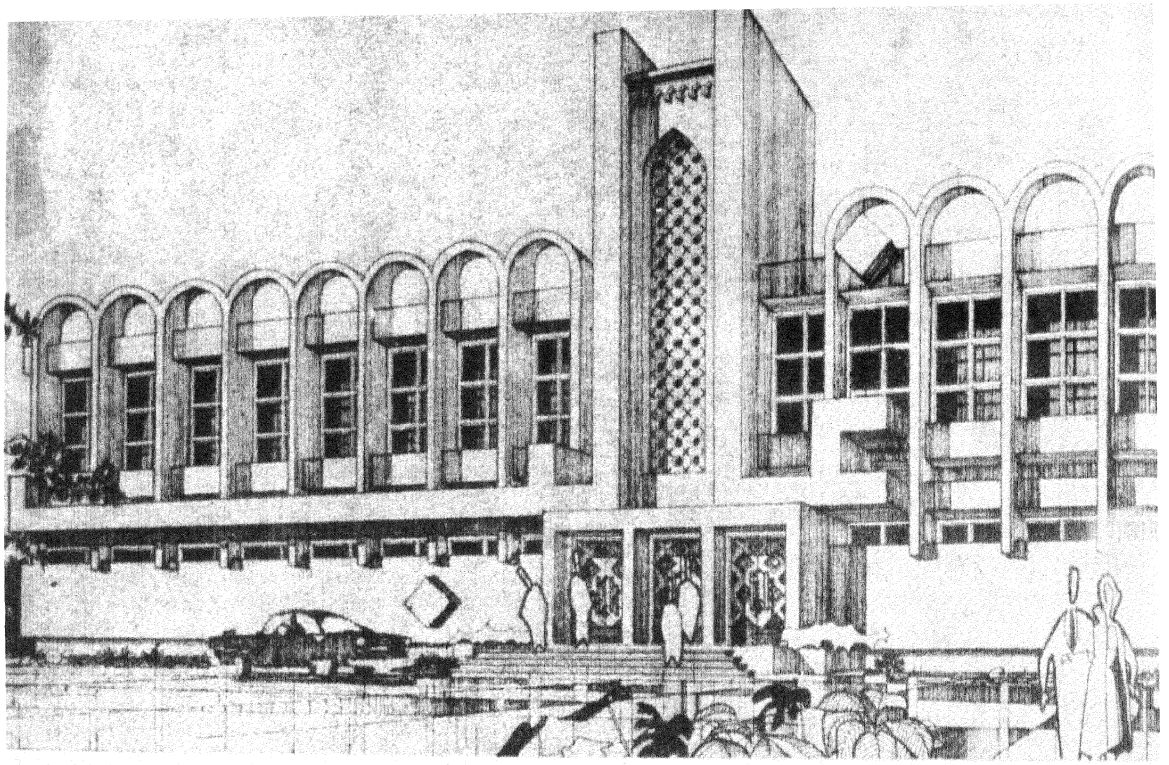

ماتا سندری روڈ (نئی دہلی) پر غالب میموریل
عمارت کا نقشہ۔ اس کا سنگِ بنیاد صدر جمہوریہ
ڈاکٹر ذاکر حسین نے ۱۴ فروری ۱۹۶۸ء کو رکھا
تھا۔ اس میں ایک آڈیٹوریم، اوپن ایئر تھیٹر
ہال اور لائبریری ہوگی۔
عمارت پر اخراجات کا تخمینہ ۱۵ لاکھ روپے ہے

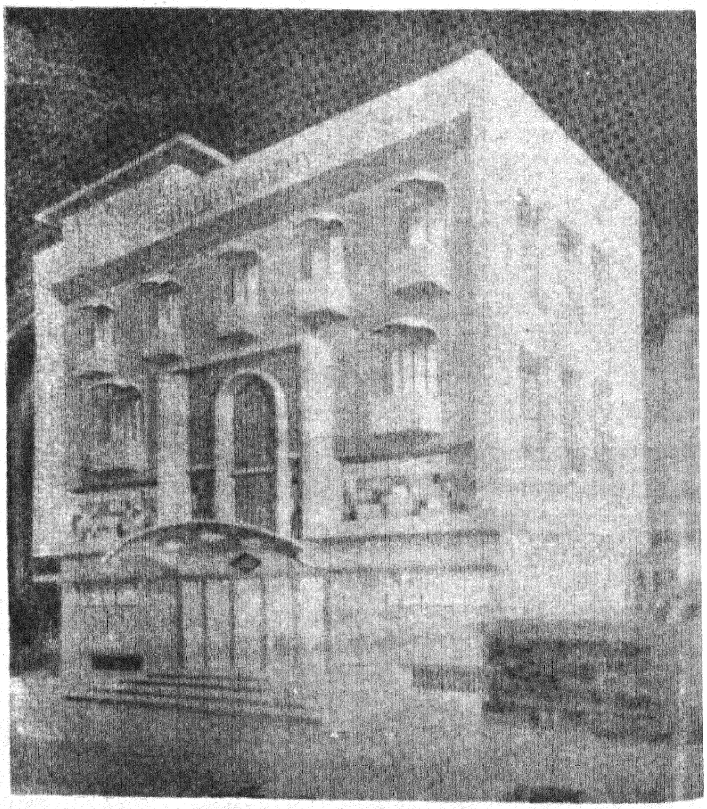

غالب اکیڈمی (نئی دہلی) کے زیر اہتمام مزارِ
غالب کے نزدیک بستی نظام الدین اولیاء میں
تیار ہونے والی عمارت کا نقشہ۔ اس میں بھی
لائبریری، میوزیم اور آڈیٹوریم ہوگا۔

Vol. 27 No. 7 AJKAL (Monthly) February 1969

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, N. Delhi-1
Printed by The Asian Art Printers Private Ltd., D. B. Gupta Road, New Delhi.
Regd. No. D. 509

اداریہ
مرکزی حکومت اور اُردو ۲
مصنف کے مسائل
قرۃ العین حیدر ۔ ظ۔ انصاری ۔ جوگندر پال ۴
حامدی کاشمیری ۔ مجتبیٰ حسین ۔ ضیا فتح آبادی تا
ستیش بترا ۱۸
مدیر کے مسائل
اعجاز صدیقی ۔ عابد سہیل ۔ محمد یوسف ٹینگ ۱۹ تا
مالک رام ۔ احمد سعید ملیح آبادی ۲۶
ناشر کے مسائل ۲۷
محمد حسین شمس علوی ۔ دیانند ورما ۔ عابد علی خاں تا ۳۱
قاری کے مسائل ۳۲ تا
دیویندر اسر ۔ وہاب دانش ۔ حکیم منظور ۳۷
درسی کتابوں کا مسئلہ ۔ حسینی شاہد ۳۸
ترجمہ کی اہمیت اور مسائل ۔ شہباز حسین ۴۲
اُردو اصطلاحات اہمیت اور مسائل ۔ میر حسن ۴۵
غزل ۔ عارف نقشبندی ۴۴

آجکل

نئی دہلی

۱۴/۱۰/۷۳

ایڈیٹر

مہدی عباس حسینی

ٹیلیفون نمبر ۳۸۷۰۶۹

سب ایڈیٹر

نند کشور وکرم

جلد ۳۲ ـــــ شمارہ ۳

اکتوبر ۱۹۷۳ء آشون کارتک سمت ۱۸۹۵

آجکل

ضمیمہ اُردو نمبر

ہند پاک سمجھوتہ

پاکستانی وفد کی دہلی میں آمد

پاکستانی وفد راج گھاٹ پر

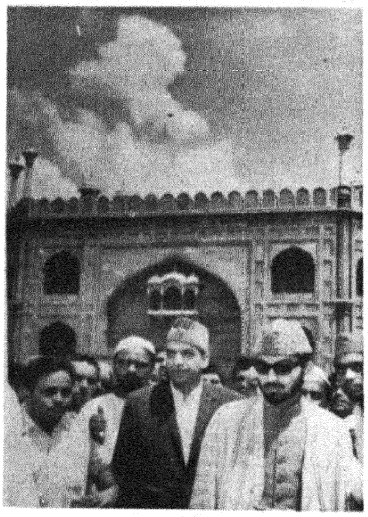

عزیز احمد صاحب نے نمازِ جمعہ جامع مسجد میں ادا کی

گفت و شنید جاری ہے

سمجھوتے پر دستخط - ۲۸ اگست ۱۹۷۳ء

وہ — اجی وہ تو سب چور اور قانون سے بالاتر ہیں۔ اُن کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ لیجئے قصہ ختم ہو گیا۔ اب کیجئے آپ کیا کر لیجئے گا۔

اُردو ادب میں لاقانونیت ہمیشہ سے ہے گو اب اس کے DIMENSION میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ایک روشن مثال کے طور پر میں اپنا گراموفون بجا کر سُناتی ہوں تاکہ آپ عبرت حاصل کر سکیں۔

اس فقیر حقیر کے ماں باپ، نانی اور ایک عدد ماموں ان پانچ افراد کی لکھی ہوئی کتابوں کی اگر فہرست بنائی جائے تو خاصی طویل ہوگی۔ ان میں سے بیشتر کتابیں بے حد مقبول اور مشہور رہی ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے اسکولوں اور یونی ورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں شامل رہی ہیں۔ یا اب ہیں۔ اُردو ادب میں اُن کا خاصا مقام ہے۔ وغیرہ وغیرہ وغیرہ

لیکن ان کتابوں کے مصنفین کا ریکارڈ یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر کتابوں کی رائیلٹی کے نام کا ایک پیسہ محترم مصنفین کو آج تک نہ ملا۔ یا کبھی اگر تکلفاً ملا ایک آدھ کتاب کا تو وہ بقدر اشک بلبل۔ یہ صورت حال صرف اس برصغیر میں ممکن ہے۔

والدہ کے ناشرین کو میں بری الذمہ ٹھہراتی ہوں کیوں کہ ۱۹۰۸ء سے لے کر آخر عمر تک وہ اپنی کتابیں ناشرین کو مفت عطا کرتی رہیں۔ (معاوضہ لینا کسر شان تھی) ان کی پھوپھی کے پانچوں ناول اسی طرح چھپے۔ سب سے زیادہ مشہور "گوڈر کا لال" کے کئی ایڈیشن پاکستان میں چھپ چکے ہیں۔ اور چند سال قبل نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے بھی اسے اسی "فری اسٹائل" سے شائع کیا۔ مرحومہ کے ورثا بفضل خدا دونوں ملکوں میں موجود ہیں۔ میں نے نسیم بکڈپو کو خط لکھا۔ فرعونیت اور لاقانونیت کا یہ عالم ہے کہ کسی نے اس کا جواب دینے کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔

دوسرا ریکارڈ اس ناچیز نے بسلسلہ "آگ کا دریا" قائم کیا ہے۔ پاک و ہند میں ۱۹۶۰ء سے اب تک اس کے لاتعداد چوری کے اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن پہلے قانونی اڈیشن سمیت اُس وقت سے آج تک اس کی رائلٹی کا ایک پیسہ خاکسار کو نہیں ملا۔ یہ ایسا عجیب و غریب واقعہ ہے جب غیر ملکی ادیبوں، ناشروں اور صحافیوں کو معلوم ہوتا ہے تو وہ یقین نہیں کرتے۔

میری ساری کتابیں اسی طرح دونوں ملکوں میں چھپ رہی ہیں۔ متعدد اُردو ادیب اس لاقانونیت کا شکار ہیں۔ مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سب نے اس صورت حال کو ایک لاعلاج مرض کی طرح قبول کر لیا ہے۔ علاوہ ازیں ساہتیہ اکاڈمی۔ رجسٹرار آف کاپی رائیٹس۔ محکمہ پولیس۔ وزارت اطلاعات و نشریات۔ سب کو اس صورت حال کا بخوبی علم ہے۔ لیکن چونکہ ادیبوں کے حقوق کی حفاظت ایک نہایت غیر اہم اور فالتو بات ہے لہٰذا اس مسئلے کی طرف ایک سرے سے توجہ ہی نہیں دی جاتی۔ پولیس اسمگلرز کا درآمد کیا ہوا سونا، گھڑیاں، چرس، گانجہ وغیرہ پکڑنے کے لئے مستعد رہتی ہے۔ فلم اسٹارز کے گھروں پر چھاپے مارے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ سنسنی خیز خطرناک یا گلیمرس لوگ ہیں اور لاکھوں کروڑوں کی ہیرا پھیری کے معاملات ہیں۔ غریب مصنفوں کے چند ہزار روپے مارے گئے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ چور ناشروں کا کوئی ذکر تک نہیں کرتا۔

البتہ ادبا کے لئے حسب موقعہ رائٹرز کیمپ، سمینار اور ایٹ ہوم ہوتے رہیں گے۔ اور جب کوئی ادیب یا شاعر بیمار پڑے گا تو اس کے علاج کے لئے چندہ جمع کیا جائے گا۔

اس سال فروری میں ساہتیہ اکاڈمی کی جنرل کونسل میٹنگ میں میں نے تجویز کیا کہ ہر ہندوستانی زبان کے ضرورت مند ادبا کے لئے وظیفے اُن کے بچوں کے لئے مفت تعلیم کا انتظام، طبی امداد وغیرہ کے لئے ایک فاؤنڈیشن یا فنڈ قائم کرنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اکاڈمی کے سکریٹری نے بتایا کہ یہ تجویز منسٹری آف کلچر کے "زیر غور" ہے۔

سوال یہ ہے کہ منسٹری آف کلچر کے فرائض کیا ہیں۔؟

میرے پاس کلکتہ سے ایک بنگالی ادیب کا خط آیا جنہوں نے اسٹریٹڈ ویکلی کے لئے کہانی بھیجتے ہوئے لکھا تھا کہ بیمار ہیں۔ ملازمت چھٹ گئی ہے اور علاج کے لئے پیسہ نہیں۔ ایک اور نامور بنگالی ادیب افلاس کی وجہ سے ایک گاؤں کے کچے جھونپڑے میں رہتا ہے۔ یہ ایک متمول زبان کے لیکھکوں کی حالت ہے۔ بمبئی کے ایک بے حد دولت مند ناشر نے جو انگریزی کتابیں شائع کرتا ہے۔ ڈاکٹر ملک راج آنند کے پندرہ ہزار روپے ہضم کر رکھے ہیں۔

ہم نہ جانے کس خوش فہمی کی بنا پر اپنے ادبی مسائل کا مقابلہ مستقل مغرب سے کرنے کے شوقین ہیں۔ اور کبھی یہ عقل میں نہیں آتا کہ ہمارے اور مغربی لیکھکوں کے معاشی اور سماجی حالات میں زمین آسمان کا فرق ہے اور ان کی تخلیقات ان کی زندگیوں کی عکاس اور ترجمان ہیں۔

آج سے تقریباً پندرہ بیس سال قبل برطانیہ کے "برہم نوجوانوں" نے ESTABLISHMENT کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ یہ اب ہمارا مرغوب ترین لفظ ہے۔ ہمیں وقتاً فوقتاً اطلاع ملتی رہتی ہے کہ فلاں فلاں ESTABLISHMENT میں شامل ہو گیا۔ یہ ایک قسم کی گالی بھی ہے اور معراج بھی۔ جو لوگ اس پُراسرار شے میں شامل ہو جاتے ہیں، گویا "ہندی فلم" کے ویلین ہیں۔ ہیرو ہمیشہ باغی رہتا ہے۔ جب وہ بھی ESTABLISHMENT میں پہنچ جاتا ہے۔ باقی باغی رہتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

اور اس ساری کشمکش، تلخی، رقابت اور ذاتی بغض و عناد کی ایک بنیادی وجہ ادیبوں کی مالی نا آسودگی ہے۔ متمول معاشروں کے متمول ادیب کو ان جھگڑوں میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

اور کیا عرض کروں ــــ والسلام۔

ظ۔ انصاری

۳۲ شیریں، ۳۱ کولابا روڈ، بمبئی-۵

بات کہنے سے پہلے مجھے اپنے موضوع کی حد بندی کر لینی چاہئے۔

مصنف کے لفظ میں ادیب، شاعر، فن کار اور کسی بھی موضوع پر ذاتی غور و فکر سے لکھنے والے آجاتے ہیں۔ اُن کے مسائل ہر ایک زمین یا ہر ایک زبان میں مشترک بھی ہوں گے کسی قدر مختلف بھی تو ہم یہاں اپنی سہولت اور تخصیص کی خاطر مصنف سے محض اُردو مصنف مراد لیں گے۔

اور مسائل سے صرف وہ خارجی مسئلے جن سے اُسے آج گزرنا پڑتا ہے۔ وہ مسئلے نہیں جو کسی اہل قلم کو کسی غیر معین زمانے یا زمین پر پیش آتے رہے ہیں یا آئیں گے۔ اس کے لئے تو پورا دفتر درکار ہے۔

تصنیف اور مصنف کے درمیان جبر و اختیار کا ایک گہرا اور پُراسرار رشتہ ہوتا ہے۔ یہ محض اختیاری عمل نہیں کہ چاہا تو مصنف نے قلم اُٹھایا۔ نہ چاہا تو نہیں اُٹھایا۔ تصنیف وہی کام کی ہے جس کے لکھنے پر مصنف نے خود کو اندر سے مجبور پایا ہو، چاہے یہ مجبوری شخصی ہو یا سماجی، علمی ہو یا جذباتی، اخلاقی ہو یا نفسیاتی جب مصنف اس کشمکش سے گزر کر ع

"کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہو"

موضوع کے لئے الفاظ یا کوئی اور لباس چنتا ہے، پلاننگ، ترتیب، تراش خراش پر آنکھیں ٹپکاتا ہے تو یہاں سے معاملہ اس کے اختیار کا ہے۔ اس کی قدرتِ اظہار کا ہے۔

یہ دعویٰ کہ ہم صرف اپنے لئے لکھتے ہیں، اسی معنی میں درست ہے۔ ورنہ کسی خیال کو کاغذ پر اُتارنے کا عمل بجائے خود جانی یا انجانی کوشش اور عین فطری خواہش ہے اس بات کی کہ ہم دوسروں تک پہنچیں۔ جب دوسروں تک پہنچنا ٹھہرا تو وہ "دوسرے" بھی نظر میں ضرور رہتے ہیں چاہے وقتی طور سے پس منظر میں بکھرے ہوئے ہوں۔

ہر زمانے میں بڑے مصنفوں نے اس سے انکار کیا یا انکار کرنا چاہا کہ وہ دوسروں کا پاسِ خاطر کرتے ہیں، پھر گلے شکوے بھی کئے کہ اُن کا زمانہ یا اردگرد کے لوگ دیدہ ور نہیں، جیسی قدر دانی ہونی چاہئے، نہیں کر سکتے۔ اور خود وقت نے ثابت کر دیا کہ کہیں نہ کہیں، کبھی نہ کبھی فن پارے یا تصنیف کے مخاطب، اہل نظر وارث یا حقدار سامنے آتے ہیں اور یوں تصنیف اور مصنف کا منشا پورا ہو جاتا ہے (یہ سطریں لکھتے وقت فردوسی سے لے کر اقبال اور ٹیگور تک ایک ہزار برس کی تاریخِ ادب کی اہم شخصیتیں میری آنکھوں میں پھر رہی ہیں۔)

یہ بنیادی بات سامنے رکھ کر چلئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج کے ہندوستان میں اُردو کا سچا مصنف بننا گھر پھونک تماشے کے لئے کمر کسنا ہے

کبرا کھڑا بزار میں لئے لکٹیا ہاتھ
جو گھر پھونکے آپنا، چلے ہمارے ساتھ

اُردو کے تصنیفی عمل میں سرگرمی آئی سرسید کے دور سے۔ پہلے صرف خوش حال زمیندار اور شہری متوسط طبقے کے گنے چنے خاندان ہی کتاب خرید کر پڑھا کرتے تھے۔ ۱۹ویں صدی کے وسط تک یہ حال تھا کہ مصنف چھپوانے سے پہلے اپنی کتاب بکوانے کی ذمہ داری لے۔ اثر و رسوخ کی ضمانت دے تو مقررہ جلدیں لیتھو کے پتھر تلے سے نکلیں۔ ۲۰ویں صدی کے آغاز میں اُردو کی (غیر مذہبی) تصانیف کے لئے ایک تنگ سا شہری مارکیٹ بننے لگا۔ دوسری جنگِ عظیم کے آس پاس ہائی اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے سندیں لینے والی نسل ریلوے میں، راشننگ اور سپلائی میں، سی اوڈی میں، فوجی شعبوں میں اور نئے کالجوں میں کھپنے لگی۔ اچھی خاصی تعداد میں وہ "دوسرے" سامنے آئے۔ ہزاروں نوجوان جنہوں نے اُردو کا مضمون لے رکھا تھا، خود کمانے لگے۔ اخبار اور رسالے خرید کر پڑھنے لگے تو اُن کے مصنف بھی اُبھرے جیسی روح ویسے فرشتے۔ جاسوسی، جنسی اور نیم تاریخی یا فرضی تاریخی ناول لکھنے والے کا کام تو آسان ہو گیا۔ ع

کہ بدست و دہن ذائقہ ارزاں رفتم

لیکن مغربی ادبیات اور علمی مضامین ہضم کئے ہوئے لوگوں کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا۔ اس "بہت کچھ" کے مخاطب اُردو میں شروع سے بہت کم تھے۔ کم ہی رہے۔ آج کمتر ہیں۔

کچھ تو یہ کہ اُردو زبان شمالی ہند کے شہروں میں رسی بسی حیدرآباد ملا تو وہ دہلی اور لاہور سے بھی پسماندہ جاگیرداری کا مرکز۔ گاندھی جی کی تحریک اور قومی آزادی کی رو کے ساتھ دیہات نے شہروں پر بڑھنا شروع کر دیا تھا صنعتی سرگرمی کے پہلو بہ پہلو سائنسی تجربات کے مرکز پنپتے ہیں سو وہ بیشتر اُردو والوں کی دسترس سے دور رہے۔ کچھ یہ کہ سائنس کی ٹھوس

تعلیم کا چلن عام نہیں تھا۔ گنتی کے تین چار ادارے (انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، جامعہ عثمانیہ، ہندوستانی اکاڈیمی (الہ آباد) علی گڑھ اور پنجاب یونی ورسٹیوں کے اشاعتی شعبے) سال میں دو تین کتابیں تبرک کے طور پر نکال دیتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ سائنسی سطح پر کام کرنے والے مصنف کو اپنے وجود و عدم کا مسئلہ درپیش رہا اور تصنیفی قوت جیسی کچھ تھی، پورا فیض نہیں پہنچا سکی۔ حالات پیدا ہو رہے تھے کہ اس کا فیض پہنچتا، مصنف کسی غیر متعلق سرپرستی سے بے نیاز رہ کر اعلا دماغی کاوش کا نتیجہ پیش کر کے صرف اسی پر بسر کر سکتا، سو تقسیم ہند (۱۹۴۷ء) نے

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

۴۸-۱۹۴۷ء کی شکست و ریخت نے اردو کے دو اہم مرکزوں، اردو مصنف کی دو پناہ گاہوں (پنجاب اور حیدرآباد) پر بل ڈوزر چلا دیا، یوپی اور بہار کے اسکولوں میں اردو کا رواج اٹھ جانے سے ۲۵ برس کے دوران ایک اجنبی نسل اٹھی۔ جو مصنف تب تک ابھر چکے تھے مستند ہو چکے تھے، انہیں یونی ورسٹیوں میں، فلموں اور ریڈیو میں جینے کا سہارا مل بھی گیا۔ جو ابھی اٹھان کے ابتدائی مرحلے میں تھے، وہ یا تو دب کر رہ گئے اور تن آسانی کا شکار ہو گئے۔ یا انہوں نے تصنیفی صلاحیتوں کے لئے دوسری زبانوں (مثلاً ہندی اور انگریزی) اور سبیلوں کا (یعنی لکھنا چھوڑ کر ریسرچ اداروں میں ملازمت کا) رخ کیا۔ جو اچھے خاصے جا رہے تھے، انہوں نے دیکھا کہ مصنف کا مسئلہ نازک ہو گیا ہے تو رفتار ہی روک لی۔ کیا لکھیں؟ کس کے لئے لکھیں؟ کیوں کر لکھیں؟ مصنف کا موٹو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ؎

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

ہندوستان کی تمام زبانوں سے بڑھ کر تامل زبان میں سائنسی تصانیف کی گرم بازاری ہے، بنگالی میں ناول اور ڈرامے کی، مراٹھی میں تاریخ لسانیات اور ڈرامے کی، ملیالم میں فنون لطیفہ اور شاعری کی — تو ظاہر ہے اس میں دوسرے اسباب کے علاوہ "عیارِ طبعِ خریدار" بھی ضرور شامل ہے۔ اردو کا مصنف کس کے در پر دہائی دے؟ شاعر کے مخاطب شعر سنتے ہیں۔ شاعر کو نوازتے ہیں۔ اس کا مجموعۂ کلام نہیں خریدتے۔ ڈرامہ نگار کو نہ اسٹیج میسر ہے، نہ کتاب گھر۔ افسانوی ادب خاصا بک جاتا ہے لیکن سب سے زیادہ شہرت یافتہ مصنف (کرشن چندر) بھی افسانوں ناولوں کی دوہری تہری فروخت سے اپنی شاموں کا چرخ پورا نہیں کر سکتا۔ تاریخ، تنقید اور فلسفے کے پڑھنے والے ۴۰ برس سے اوپر کے لوگ ہیں جن کے بجٹ میں کتابوں کی خریداری کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ فنی مضامین کسی یونی ورسٹی میں اردو میں پڑھائے نہیں جاتے۔ پڑھنے والوں میں تشنگی ہے، لیکن ان کے مصنف کی نہ مانگ ہے، نہ اسے لگن۔ سائنسی تصانیف پر کل تک خاک اڑ رہی تھی اب کچھ سرکاری سرپرستی نے سہولتیں فراہم کی ہیں۔

پہلے کے دنوں میں اردو مختلف علاقوں کی کسی قدر ترقی یافتہ مگر نہایت جاندار زبان تھی، اب وہ زبان کے بجائے دین ایمان ہو گئی ہے یا کم از کم ہندوستانی مسلمانوں میں جزو ایمان بنتی جا رہی ہے۔ دس بیس برس کے اندر ہندوستانی مسلمان اسے اپنی پہلی یا دوسری زبان ماننے لگیں گے۔ دھتکار اور کسمپرسی نے اسے یہاں تک پہنچا دیا کہ غیر منطقی سبب سے سہی، مگر زندہ رہے گی اور سیکھی سکھائی بھی جائے گی۔

دینیات کی تصنیفیں پہلے بھی "دنیاویات" سے زیادہ ہی بکتی تھیں۔ اقبال اور جوش کے مجموعوں سے کئی گنا، مولانا اشرف تھانوی کا "بہشتی زیور" چلا۔ اور اب تو مذہبی موضوعات کا مصنف اور ان کا ناشر پہلے سے بہتر حالت میں ہے۔ مسلمانوں کی سماجی پستی کے ساتھ اس کے پڑھنے والے، بیچنے والے اور کتب خانے اور بڑھ گئے ہیں۔ دنیا تو سدھرتی نہیں، آخرت ہی سدھار لیں۔ خواندگی عام ہونے سے اردو میں مذہبی تصانیف اور رسائل کی خواندگی بڑھی ہے۔ اللہ بس۔ باقی ہوس!

مصنف کا اول مسئلہ یہ ہے کہ اس کا قدرداں حلقہ موجود ہو، دربار اور درباری نہ ہوں تو ہمدرد سرکار ہو، بازار ہو۔ علمی ادبی ادارے ہوں۔ بحث و تکرار کے اکھاڑے ہوں۔ اداروں اور اکھاڑوں کا اکھڑ جانا مصنف کو کساد بازاری کی چیتاونی دیتا ہے۔ "تحسینِ ناشناس" سے اتنا نقصان مصنف کو نہیں پہنچتا جتنا "سکوتِ سخن شناس" سے۔ فرانس ایک زمانے سے جدید اور جدید تر ادبی و فنی تحریکوں کا علمبردار رہا۔ تو یہ نہیں کہ وہاں ہر ایک اہلِ قلم تصنیف کے سہارے آسائش سے جی لیتا ہے، البتہ قابلِ ذکر تصنیف بیدار حلقوں میں گونج پیدا کرتی ہے۔ بحث و تکرار کی راہیں کھولتی ہے۔ صدائے بازگشت کی ڈوری تھام کر مصنف گمنامی اور مفلسی کی کھوہ پار کر جاتا ہے۔ روس میں

لہ یہاں یہ تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ "آج کل" نئی دہلی کے ایک سابق ایڈیٹر عرش ملسیانی کے تقاضے پر میں نے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ کٹھ پتلی کا تماشا، بیلے ڈراما، اندر سبھا اور اوپیرا، نوٹنکی، اور اوپیریٹا۔ پہلا مضمون "بیلے کا تعارف" لکھنے میں پورے ۵۶ دن لگ گئے۔ اور جب چھپا تو ۹۸ روپے کے منی آرڈر کے سوا نہ کوئی تجسس بھرا خط آیا نہ اصرار۔ صرف یہ ہدایت ملی کہ مضامین مختصر کیجئے کئی قسطوں میں چھاپنا دشوار ہے۔

...زیوں کی انجمن ہر ایک مصنف کو پال سکتی ہے۔ نہ سرکاری وظیفے اور انعام یا کثیر اشاعتی اڈیشن کسی مصنف کا بیڑا پار کرتے ہیں۔ یہ سو فیصدی تعلیم اور ذہنی بیداری کی برکت ہے۔ جو قابلِ قدر تصنیف مصنف کو دو چار سال کے اندر سارے ملک سے روشناس کرا دیتی ہے۔

آج اُردو میں بعض رسالے (ان میں ڈائجسٹ بھی شامل ہیں) پچاس ہزار سے زیادہ اشاعت رکھتے ہیں، کئی روزنامے بھی منافع سے چل رہے ہیں۔ لیکن نہ تو اُن کے ذریعے کوئی واقعی مصنف اُبھرنے پاتا ہے۔ نہ اُنہیں اُردو مصنفین کے مسئلے سے کوئی سروکار ہے۔ پھر وہ اس کمائی کو مصنف پر لگانا منافع کا سودا نہیں سمجھتے۔ جن اخبارات و رسائل میں چھپ کر کوئی نیا اہلِ قلم مصنفین کی صف میں جگہ پائے، اُن کی اشاعت محدود، مالی حالت ناگفتہ بہ اور ادارت کُل وقتی نہیں۔ اشاعت گھروں کا نام جن کتابوں کے سرورق کی زینت بنتا ہے، وہ صرف اپنا پتہ دینے کے قصوروار ہوتے ہیں۔ خرچ عموماً مصنف کی جیب سے نکلتا ہے۔

اب البتہ ساہتیہ اکادمی، نیشنل بک ٹرسٹ، ترقی اُردو بورڈ، اُردو اکادمی (یوپی) ادارہ ادبیاتِ اُردو، اسلامک کلچر (حیدرآباد) اور کسی قدر مکتبۂ جامعہ نے مشکل آسان کی ہے۔

ہمارے یہاں مصنف کا مسئلہ صرف اتنا نہیں جتنا کسی بھی ترقی یافتہ زبان کے مصنف کو درپیش ہوتا ہے یعنی اپنے شعور اور قوتِ بیان کی تربیت، وسیع مطالعہ، تیاری وغیرہ۔ بلکہ وہ بھی ہے جو اپنے ملک یا وطن سے دور تک پھیلی ہوئی زبانوں میں وقت و مقام کے ساتھ خود بخود اپنا حل نکال لیتا ہے یعنی خاص خاص حلقوں، خیالوں، فکری یا فنی تجربوں کے نمائندہ رسالے، اخبارات، اور اشاعت گھر جو شہد کے چھتوں کی طرح اُن رجحانوں کے مصنف کی تصنیفی کوششوں کے لئے مرکز اور غذائی سپلائی کا سامان کرتے ہیں۔ وہ اُبھرتے ہیں ایڈیٹروں یا اڈی ٹوریل بورڈ کے مخصوص رجحانوں اور اُن کی تصنیفی صلاحیت کے ساتھ (یہاں اچھے منیجروں سے کام نہیں چلتا) سرکاری مدد سے چلنے والے رسالے سجل، سنجیدہ اور قابلِ قدر ہو سکتے ہیں۔ (جیسا کہ آج کل "شیرازہ"، "نیا دور" ہیں) لیکن وہ بحث اور تکرار کا، آئڈیالوجی یا جدید تجربوں کی بحث کا، مصنف سے کشتی لڑنے اور داؤ پیچ سکھانے کا ذمہ نہیں لے سکتے۔ یہ کام "شب خون" "عصری ادب" "سوغات" اور "کتاب" جیسے رسالے اور ان کے حلقے انجام دے سکتے تھے لیکن ان میں کسی کی اشاعت ایک ہزار سے اوپر نہیں جاتی، جو لہو پسینہ ایک کرنے والے مصنف کے لئے بہت حوصلہ شکن ہے اور یہ دیئے بھی اڈیٹروں کی باہر کی آمدنی کا تیل جلا جلا موت و حیات کی درمیانی رہ گزر میں ٹمٹماتے رہتے ہیں ؎

کیا پوچھے ہے وجود و عدم اہلِ شوق کا
خود اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

پہلے کبھی دیوانِ عام اور دیوان خانے تھے، حویلیاں اور مردانے تھے۔ وہ نہ رہے تو پبلک ہال، ادبی کلب اور ادبی حلقوں نے، لائبریریوں اور کتب خانوں نے اکھاڑوں کی منڈیر آگے تک بڑھائی، اسکولوں، کالجوں میں، سرکاری ملازمتوں میں اُردو کو جگہ دلوانے کی جو کوششیں جاری ہیں، وہ اپنی جگہ۔ لیکن مصنف کا اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ جہاں اُردو زندہ ہے وہاں ایسے عوامی ادارے، مرکز، کتب خانے اور کلب موجود ہوں (یا وجود میں لائے جائیں) جو لکھنؤ کے نخاس اور امین آباد کے چائے خانوں کا رول انجام دے سکیں، جو تصنیفی مال کے لئے شیئر بازار اور اسٹاک ایکس چینج کا کام کر سکیں۔ جہاں نئی تصنیف پر، اس کی جدت یا بے راہ روی پر آہ یا واہ کی جا سکے اور مصنف کو اس کی خبر لگتی رہے۔ جس گنبد میں بازگشت نہ گونجے وہاں کا مزار ویران ہو جاتا ہے۔

مصنف کا اہم مسئلہ آئڈیالوجی نہ پہلے تھا، نہ اب ہے۔ متضاد اور معاند نظریوں کی تو تکرار سے تو مصنف کو اتنا دہلتا ہے۔ وہ انہی کی آویزش اور آمیزش سے نئے تجربوں کی سرحدیں تلاش کرنے نکلتا ہے اور جب تلاش کر لیتا ہے تو پرانی تجربہ گاہوں میں اختلاف کا نیا فتنہ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ فتنہ جو مصنف کے لئے خیر و برکت کا سبب ہے۔ مصنف کا اہم مسئلہ تجربہ گاہ کا مہیا ہونا ہے۔ وہی نہ ہو تو بے کسی کی فضا مصنف اور تصنیف دونوں کو برف خانے میں رکھ دیتی ہے ؎

بہر قیمت کہ می گیرند ایں جنسِ وفا خوبست
پس از مدت گزر افتاد بر ما کاروانے را (نظیری)

جس طرح مسجدوں سے ذرا ہٹ کر خانقاہیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ آج اُردو کے مصنف کی ایک ضرورت یہ ہے کہ کالجوں، یونی ورسٹیوں اور مدرسوں یا یتیم خانوں کی مسندوں سے الگ ایسے ادبی کلب اور حلقے مہیا ہوں جہاں نئے رسائل اور تصانیف پر بحث کرنے میں لوگ ایک دوسرے کا گریبان پکڑنے اور پگڑی اچھالنے سے نہ گھبرائیں۔ عام سرد مہری، کساد بازاری، بے رخی اور بے زاری کے ماحول میں ہمارے مصنف کو جب تک مشاعرہ باز شاعروں سے بڑھ کر گلے لگانے یا ہوٹ (HOOT) کرنے والے نہ ملیں، پرانے مصنف کا تازہ دم رہنا اور نئے کا اُبھرنا دشوار ہے۔ روٹی تو کسی نہ کسی ذریعے سے کما لے لیکن مصنف بحیثیت مصنف جو کچھ اور کمانا چاہتا ہے، وہی اس

کی شہ رگ سے قریب بھی ہے اور شہ رگ کو لہو سے سیراب بھی رکھتا ہے۔ اُردو رسم خط اور علمی تصنیفی زبان کی تہہ داری سے عام بے نیازی کے اس دَور میں مصنف کے سامنے یہ سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس کے لئے کوئی اکسیری نسخہ تلاش کرنا چاہیئے۔

جوگندر پال

مقبرہ روڈ، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

ہر مصنف کا بنیادی مسئلہ ایک ہی ہے: وہ واقعی مصنف ہے یا محض اپنے الفاظ کا بوجھ ڈھوتا رہتا ہے؟ — اگرچہ قلم کے مزدوروں کی مجلسی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی تخلیقی تحریر کسی چور کے مانند دبے پاؤں مصنف کے دل و دماغ میں وارد ہوتی ہے اور اتنی معصوم نظر آتی ہے گویا یونہی بھٹکتی ہوئی اچانک اُدھر آنکلی ہو اور پھر یہ ہوتا ہے کہ مصنف پہلے ہی فلیش میں اُس پر اپنا تن من دھن لٹانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ قلم کی مزدوری بڑا معزز پیشہ سہی، لیکن پیشہ ہونے کے باعث پیشہ وری کے ہتھکنڈوں سے پاک نہیں، اور اگر بالفرض کوئی بڑا تیک آدمی اپنے آپ کو ان ہتھکنڈوں سے بچائے رکھنے میں کامیاب ہو جائے تو بھی وہ اپنے سوچنے اور محسوس کرنے کے معیار کو سود و زیاں کے تابع رکھنے پر مجبور ہوتا ہے، کیونکہ اِس اصول کے بغیر کسی بھی پیشہ ور کی بیلنس شیٹ سے تجارت کے خوشگوار نتائج برآمد نہ ہوں گے۔

اگر یہ سچ ہے کہ تخلیق کے جوہر لُٹ جانے، سچائیوں کی کنواری شکلوں کی تلاش میں کھو جانے اور دانشوری کی متعینہ حدود سے آگے نکل کر فکر و احساس کی ذاتی واردات سے کھلتے ہیں تو مصنف کو اپنی دیوانگی کی رہبری میں یہ کچے راستے طے کئے بغیر چارہ نہیں، جبکہ کوئی غیر مصنف اپنے ڈرائنگ روم میں اُس دیوانے کا مذاق اڑاتے ہوئے، انعام و خلعت کی نمائش کر کر کے، اپنے مجلسی رتبے کے دعوے گنوا گنوا کر اپنے پرستاروں کو یقین دلا رہا ہوگا میری طرف دیکھو، میں کتنا بڑا مصنف ہوں، مجھے فلاں فلاں انعام ملا ہے، میں فلاں ادبی کمیٹی کا صدر رہوں، اپنی فلاں کتاب سے مجھے ہزاروں کا فائدہ ہوا ہے!

میں اُن تمام شخصی اور غیر شخصی خطرات سے بخوبی واقف ہوں جو ہمیں ازلی سچائیوں کی غیر ہموار سطحوں کی مسافت میں پیش آتے ہیں، اور اگر میرے خدا کو اپنے اَن گنت جھنجھٹوں سے فرصت ہے تو میری دعا ہے کہ وہ میری مدد کرے، اُن خطرات سے سدا نبرد آزما ہونے کی میری ہمت بنی رہے، میں اپنی ہار کو تقدیر کا لکھا ہوا سمجھ کے اطمینان سے نہ بیٹھ جاؤں۔ میری بے چینی کی ہشاش بشاش کیفیت بنی رہے اور میں بخوشی اپنے شعور کی سزا بھگتتا رہوں۔

ادائل میں تخلیق کار کو اپنا نام بڑا پیارا معلوم ہوتا ہے۔ گویا بھولے بھالے انداز میں کسی خوبصورت لڑکی سے فلرٹ کرنے کی بجائے اسے اپنے آپ سے ہی فلرٹ کرنا پسند ہو۔ میرے اِس رویے سے مجھے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ میں تین چار سال ہی میں اپنے آپ سے مایوس ہو گیا اور مجھے نئے سرے سے اپنی نشاندہی کی فکر لاحق ہونے لگی: میں محض اپنا نام ہوں یا اپنا آپ؟ اپنا آپ ہوں تو کیا میں ذاتِ خود ایک وحدت ہوں، یا ایک برتر خارجی وحدت کا باطن؟ — جوں جوں زندگی اور فن میں میری شرکت میں اضافہ ہوتا چلا گیا، توں توں میں اپنے نام، ذات اور تعصبات سے بری طرح ڈسٹرب ہونے لگا۔ میں نے اکثر ایسے ادباء کے بارے میں بھی سوچا ہے جن کے نام کی مالا ہر سُو جپی جا رہی ہو اور جنہیں ادب میں سر سے بھی اوپر تک ڈوب کر اپنا نام یکسر بھول چکا ہو۔ اس تپسیا اور لگن کے بغیر شاید آپ کو ساری دنیا میسر آ جائے لیکن زندگی کا عرفان اسی اٹوٹ انہماک سے نصیب ہوتا ہے۔

ادب اور عرفان کے اس پہلو کی طرف میرا دھیان شاید اس لئے چلا گیا ہے کہ ہم بیشتر لکھنے والے آج اپنی تخلیقی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی خواہش سے اتنے بے تاب نظر نہیں آتے جتنے اس خواہش سے کہ ہماری تشہیر کے ذرائع کے امکانات وسیع تر ہوتے چلے جائیں۔ ہمارے دور کی 'عظمتوں' کے کئی اسباب میں ایک نمایاں سبب یہ بھی ہے کہ اپنے آدرش کے اشتہار کو مکمل تر بناتے جانے کی کوشش میں ہمارے پاس اُس آدرش کی تکمیل کی فرصت نہیں رہی۔ سو ہمارے راکٹ ہمیں خلا میں لا کے چھوڑ دیتے ہیں۔ لیجئے، آپ ساتویں آسمان پر آ پہنچے، مزے سے اِس سورگ پُوری میں جھنجھنا بجا بجا کر اپسراؤں کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہیئے، تاکہ وہ بڑے پیار سے آپ کو گود میں اٹھا اٹھا کر جھلاتی پھریں، ہائے، کتنا پیارا بچہ ہے! — کس کا ہے؟ — اور کس کا؟ — اپنی ہی اکھلی سمجھ بوجھ کا۔

ادب کے عنوان سے سیاست یا فلسفہ پر بحث کی فارمل سمتیں بھی ادیب کو بے سمت کر سکتی ہیں۔ اگر میں پہلے سے ہی اپنے اوپر یہ پابندی لاد لوں کہ مجھے کسی نظریئے کا تابع ہو کر کہانی لکھنی ہے تو میں شاید اس نظریئے کی وضاحت میں الفاظ کی مناسب نشست کا اہتمام تو کر لوں مگر میری کہانی، کہانی نہ ہو گی۔ کہانی تو ساری کی ساری اپنے مخصوص ماحول کی تہذیب، اپنے کرداروں کی جداگانہ خُوؤں، ان کے اپنے اعمال و مسائل، اور ان کی گفتار و فکر کے اپنے اپنے لہجے سے جڑی ہوتی ہے۔ مصنف ہونے کے تعلق سے میں اپنے آپ کو اپنی کہانی اور اس کے کرداروں کی آزادیوں

کا پابند بنا لیتا ہوں۔ فنونِ لطیفہ کو اسی لئے انسان کی متمدن اور بالغ عادتوں میں شمار کیا جاتا ہے کہ ان میں اُس کے کسی ذاتی تعصب کی گنجائش نہیں۔ اپنے اِسی رویّے کی بدولت کہانی کار اپنے قاری کو بھی اپنے ساتھ کہانی کی تخلیق میں شریک کر لیتا ہے۔ نتیجۃً جس طرح وہ اپنی متجسّس جہد اور توفیق کے مطابق کہانی لکھتا ہے، اسی طرح اس کے قاری کی فہم میں اس کا اپنا تجسّس کارفرما ہوتا ہے اور کہانی کو پڑھ کر گویا وہ اِسے از سرِ نو تخلیق کرتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر میں اپنے کمزور لمحوں میں اپنے کرداروں سے جارحانہ سلوک روا رکھوں اور اُنہیں اپنی مرضی کا اسیر بنا لینے کے درپے ہو جاؤں تو وہ میرے ذہن میں چلتے پھرتے، اپنے سانس خود آپ لیتے، اپنے طور پر اپنی زندگی جیتے، اپنے دکھ جھیلتے، اپنے سکون کا جتن کرتے، اپنی کہانیاں بُنتے نظر نہ آئیں۔ میرا ذہن اسپتال سا بن جائے۔ یہاں اِس کی جان بچانے کے لئے اسے آکسیجن چڑھائی جا رہی ہے (نہیں بھئی، موت کے ڈر سے یوں نہیں چیخا جاتا، یوں چیخو۔ یوں ــــ ں!)، یہاں اِس اپاہج کو لکڑی کی ٹانگوں پر چلنا سکھایا جا رہا ہے (لو، چلو اب! یوں ــــ ں!)، یہاں اِس ماؤف الذہن کو سوچنے کا ڈھنگ سکھایا جا رہا ہے (یوں ــــ ں!) ــــ نہیں! خدارا میرے ذہن کی بھری پُری بستی کو اِس نادر شاہی یلغار کے دردناک نتائج سے بچا رہنے دو، مجھے بستیاں اس لئے نہیں اجاڑنی ہیں کہ ہاری ہوئی فوجوں کی پشت پر اپنے لئے آرمی میڈیکل ایگزیکیوٹو کے فرائض کی انجام دہی کے مواقع فراہم کر سکوں، جیو اور جینے دو!

کئی نیم ذہن لوگ ایک طویل مدت تک لکھے ہوئے لفظ کی کھلم کھلا آبروریزی کرتے رہے اور اُنہیں ٹوکنے کا مسئلہ اس لئے نہ اٹھا کہ انھوں نے نہایت معتبر لہجے میں اپنے آپ کو اور دوسروں کو ڈانٹ ڈپٹ کر سمجھا بجھا دیا کہ شرافت کا تقاضہ بس یہی ایک ہے۔ اُن کی دھاندلی سے ادب کو یہ فائدہ ضرور پہنچا کہ لکھا ہوا لفظ، رسمیت سے اکھڑ جانے پر مجبور ہو گیا، مگر یہ بھی کیا کہ بیچارے کو منہ سے ٹپکے ہوئے لفظ سے بھی گیا گزرا سمجھ کر کوئی پناہ ہی نہ دے۔ مجھے اپنا ایک دوست اس لئے نہایت بھلا معلوم ہوتا ہے کہ بولتے بولتے جب اس کا لہجہ نہایت گمبھیر، نہایت فراواں ہو جاتا ہے تو وہ غیر شعوری طور پر اپنا قلم کھول کر انگلیوں میں لے لیتا ہے۔ لکھا ہوا لفظ، بولا جائے یا لکھا جائے، وہ ہمارے زبان کے تخلیقی استعمال سے بہرہ ور ہوئے بغیر وجود پذیر نہیں ہوتا۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ زبان جتنی زیادہ تخلیقی ہوتی ہے اتنی ہی گہری وہ اپنے معنی میں ڈوبی ہوتی ہے اور قاری کو نظر نہیں آتی۔

کہانی کی زبان اور اسلوب کے ضمن میں بیشتر نقاد اس لئے دھوکا کھا جاتے ہیں کہ اپنی علمی عادات کے باعث وہ فن کے قالب اور روح کو جدا جدا دیکھتے ہیں۔ کوئی جسم اپنے ہی جوہر سے پھوٹ کر باہر آتا ہے اور اس کی ہیئت سے اُس کی مخصوص جینس کا سراغ ملتا ہے۔ سو کہانی کے ان گنت فارم ممکن ہیں؛ گڑبڑ کا اندیشہ البتہ اُس وقت ہوتا ہے جب کوئی لکھنے والا کسی بھی ہیئت میں ایک سالم کہانی پیش کرنے کی بجائے اپنی اس خواہش سے بے چین ہو ہو جاتا ہے کہ اسے صرف فارم کا کوئی انوکھا تجربہ پیش کرنا ہے، اور بس۔ میرے دوست جب مجھ سے کہانی پن کے مسئلہ پر استفسار کرتے ہیں تو مجھے لگتا ہے کہ وہ دراصل یہ جاننے ہیں، اب بھی ہمارے کرداروں کو وہی واضح اور بھولے بھالے واقعات پیش آتے چلے جائیں جو انہیں اپنی جوانی میں پیش آیا کرتے تھے: شادی یا جنازہ!۔ پر اب اس کا کیا کیا جائے کہ ایک واقعہ صرف ایک ہی بار پیش آتا ہے۔ چونکہ سبھی واقعات کا سیاق و سباق الگ الگ ہے اس لئے بظاہر ایک جیسے واقعات کا حلیہ بھی الگ الگ ہوگا۔ کئی ایک تو کسی ہیئت میں بندھنے میں ہی نہیں آتے، جس سے اُن کی بے ہیئتی ہی سے اُن کی کسی ہیئت کا برآمد ہونا قابلِ یقین معلوم ہوتا ہے۔

"پر پھر ہم اسے کہانی کا نام کیسے دیں گے"؟

"دیل! جیسے آج آپ اپنی اس قدر بدلی ہوئی زندگی کو زندگی ہی کہنے پر مجبور ہیں"۔

کئی سال پہلے کہانی سے جب میرا میل جول بڑھنے لگا تو ایک بار اُس نے جھجک کر خواہش ظاہر کی کہ سارا سارا دن تمہاری فرصت کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہوں، کیسے عاشق ہو کہ مجھ سے اپنا دھندا عزیز رکھتے ہو؟ میری بھی خواہش ہے کہ سارے کام چھوڑ کر اب ہمہ وقت عشق ہی کروں۔ دو ایک بار میں نے نہایت گرمجوشی سے اپنی اور کہانی کی خواہش کو پورا کرنے کا اقدام بھی کیا ہے لیکن پٹ کر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا ہوں۔ مجھے کسی سے شکایت نہیں، اک میرا حوصلہ ماڈرن لائف کے اہتمام میں محصور نہ ہوتا۔ یا خدا، مجھے سب کچھ تج دینے کی توفیق دے تاکہ میری ان لکھی کہانیاں میرے وجود میں دھنسی نہ رہ جائیں، میرے ساتھ ہی مٹی نہ ہو جائیں!

حامدی کاشمیری
۳۹۶ جواہر نگر سری نگر کشمیر

تخلیق و تصنیف کی چوبیس سالہ مدت میں، جس اہم مسئلے کا مجھے سامنا

رہا ہے وہ شخصی ہوتے ہوئے بھی عمومی نوعیت کا ہے۔ یعنی مالی دشواریوں کا مسئلہ۔ ریاست میں معلّم کی حیثیت سے اپنے تدریسی فرائض کی انجام دہی میں مالی دشواریاں ہمیشہ اس سکون اور یکسوئی میں مخل انداز ہوتی رہی ہیں۔ جو ادب کی تخلیق کے لئے ذہنی ارتکاز کی ضمانت ہے۔ مالی مشکلوں سے کم و بیش ہر ہندوستانی مصنف اور شاعر کا سامنا رہتا ہے۔ گزشتہ ادوار میں، جاگیردارانہ نظام میں وجہِ شیفتہ، ذوق یا داغ جیسے درباری شعراء، جو مالی طور پر خوشحال تھے، استثنیٰ کی حیثیت رکھتے ہیں نہیں تو عام طور پر شعراء (ان میں میر اور غالب بھی شامل ہیں) تمام عمر مالی پریشانیوں میں مبتلا رہے اور فکرِ معاش میں گھلتے رہے۔ شاعر ہونا ہی افلاس زدہ ہونے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ یہاں کے ادیب کو اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے کوئی نہ کوئی ذریعۂ معاش ڈھونڈنا ہی پڑتا ہے۔ اس کام میں اسے اپنے وقت اور توانائی کا بہترین حصہ قربان کرنا پڑتا ہے۔ وہ تھکا ماندہ گھر لوٹتا ہے۔ تو مشکل ہی سے چند لمحے اُسے نصیب ہوتے ہیں جن میں وہ ادب کی تخلیق پر توجہ دیتا ہے۔ ہمارے ملک میں کسی مضمون، افسانے یا نظم کے معاوضے کے طور پر ملنے والی رقم اتنی حقیر ہوتی ہے کہ اس کا ذکر نہ کیا جائے تو اچھا ہے۔

سرکاری، نیم سرکاری یا غیر سرکاری ادبی اداروں سے وقتاً فوقتاً بہترین قرار دی گئی کتابوں پر جو انعامات دیئے جاتے ہیں، وہ بھی آٹے میں نمک کی حیثیت رکھتے ہیں اور کوئی ٹھوس مقصد پورا نہیں کرتے۔ ریاستی اکاڈمی سے میری دو تنقیدی کتابوں "جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات" اور "غالب کے تخلیقی سرچشمے" پر سات سات سو روپے کے انعامات ملے۔ ظاہر ہے یہ رقم دل بہلاوے کے لئے بھی کافی نہیں چہ جائیکہ اس سے حوصلہ افزائی یا عزت افزائی کا پہلو برآمد ہو سکے۔

اُردو تنقید میں موضوعاتی کتب کی قابلِ لحاظ کمی کے پیشِ نظر میں نے چند موضوعاتی کتابیں لکھی ہیں۔ سرمایہ مسودے کی تکمیل کے بعد جو حوصلہ شکن اور صبر آزما مسئلہ آن کھڑا ہوا ہے وہ مسودے کی اشاعت کا ہے۔ یہ مسئلہ یک رُخا نہیں، بلکہ کئی پہلو رکھتا ہے۔ اور ہر قدم پر دُوری منزل کو نمایاں کرتا ہے۔ سب سے پہلے سرمایہ کی فراہمی کا مسئلہ ہے۔ جہاں صورتِ حال یہ ہو کہ مشکل ہی سے گزر بسر ہو رہی ہو، وہاں کتاب کی اشاعت کا خواب دیکھنا دیوانگی سے کم نہیں۔ میں نے اپنی دیوانگی کا یہ قائل نہ پا کر چند کتابیں مثلاً ایک ناول "بلندیوں کے خواب" ایک افسانوی مجموعہ "سراب" اور تنقیدی کتاب "جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات" کو خود ہی چھپوانے کا بیڑہ اٹھایا، اور اپنے اس شوق فضول پر رفیقۂ حیات سے لے کر دوستوں اور رشتہ داروں سبھی کے سنگِ ملامت کے وار سہے۔

پیسے کی فراہمی کے بعد بھی کئی اور حوصلہ شکن مرحلے باقی رہ جاتے ہیں، مثلاً کاتب کا ملنا۔ اس زمانے میں اچھی یا معیاری کتابت تو امرِ محال بن چکی ہے۔ جدید معاشرے میں قدروں کے انہدام اور مادی منفعت اندوزی کے رجحان کے نتیجے میں ہر کام میں سطحیت راہ پا رہی ہے اور قابلیت کا تنزل واقع ہو رہا ہے۔ ہمارے کاتب حضرات بھی آخر اسی معاشرے کے افراد ہیں۔ میں کاتب حضرات کی معذوریوں کو سمجھتا ہوں لیکن اُن کی تغافل شعاریوں کا ستم رسیدہ ہوں، اور پھر کتابت کرتے ہوئے وہ جس بے رحمی سے مسوّدے کا حلیہ بگاڑتے ہیں اس سے مزید اُلجھن ہوتی ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ آج کے سائنسی دور میں بھی ہم کاتب کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکے ہیں۔

کاتب کے چنگل سے خدا خدا کر کے نکل جائیے تو لیتھو کے کرشمے دیکھنے کو ملیں گے۔ سری نگر میں عام طور پر لیتھو کا کام غیر اطمینان بخش رہا ہے۔ الفاظ تو کیا بعض صفحات پر سطروں کی سطریں غائب ہو جاتی ہیں۔ کبھی سیاہی کی زیادتی طباعت کا سارا حسن غارت کرتی ہے، اور پھوٹے کالے حروف کے ڈھیر کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ کتاب چھپ بھی گئی تو بلاک سازی کے لئے ریاست کے باہر کسی فرم سے رابطہ پیدا کرنا پڑتا ہے جو وقت کی بربادی میں رہی سہی کسر کو پورا کرتا ہے۔ اگر آپ اس جھنجھٹ میں پڑے بغیر سستے چھوٹے کے مصداق مسودہ کسی پبلشر کے ہاتھ اونے پونے بیچ ڈالیں تو یاد رکھئے کتاب کو منظرِ عام پر دیکھنے تک عمر خضر کی ضرورت پڑے گی۔ اتفاق سے اگر کسی دن کتاب آ ہی گئی تو اس کی کتابت، طباعت اور کٹ اپ دیکھ کر آپ اپنا سر پیٹیں گے۔

کتاب چھپ کر آتی ہے تو ایک انجانا نشہ رگ رگ میں اُترنے لگتا ہے، بشرطیکہ کتاب اچھی چھپی ہو۔ لیکن یہ نشہ اُترتے دیر نہیں لگتی جب کتاب کی نکاسی کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ کئی مہینے بلکہ سال بھی گزر جانے کے بعد کتاب کی سبھی جلدیں آپ کے کمرے کے بڑے حصے پر پھیلی ہوں اور کاغذ کے کیڑوں کے لئے خوراک مہیا کر رہی ہوں تو یہی کتابیں آپ کا منہ چڑانے لگتی ہیں اور آپ اپنے اندر کے مصنف کی بدنصیبی پر ماتم کرتے ہیں۔ اُردو زبان میں کتاب کی نکاسی کی کوئی مؤثر صورت ہے ہی نہیں۔ کتب فروش اداروں یا ایجنسیوں کے مالک و منتظم آج بھی اپنے کاروبار کو جدید سائنسی لائنوں پر وسعت دینے کے موڈ میں نہ ہوں اور پڑھنے والی کی غالب اکثریت جاسوسی کتابوں یا

رومانی ناولوں کو مکمل کا تعویز بنانے پر مصر ہو تو کتاب کی نکاسی کا مسئلہ کیونکر حل ہوگا؟ ابتدائی مرحلوں میں مصنف کی حیثیت سے زیادہ معروف نہ ہونے کی بنا پر کتابوں کو کیڑوں کی خوراک بننے کے نظارے کی تاب نہ لاکر اپنے دوستوں (ان میں باذوق حضرات کی کوئی تخصیص نہیں) میں بڑی فیاضی سے تقسیم کرتا رہا۔ لیکن اب صورت حال ذرا مختلف ہے۔ تازہ کتاب چھپتے ہی بعض قارئین کی جانب سے اور خاص کر چند معروف کتب فروشوں کے آرڈر وصول ہوتے ہیں اور کتاب (چالیس فیصد کمیشن پر ہی سہی) نکل جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ رقم کی وصولی میں کبھی کبھی برسہا برس لگ جاتے ہیں۔ پھر بھی مقام شکر ہے کہ نکاسی میرے لئے کوئی سنگین مسئلہ نہیں رہا۔ لیکن اس مقام تک آتے آتے کتنے ہفتخوان طے کرنا پڑے ہیں، وہ میں جانتا ہوں۔ اور ہر ہندوستانی مصنف کو ان سے گزرنا پڑتا ہے۔ ایک صحت مند اور خوشگوار ادبی فضا کا فقدان بھی مصنف کے لئے کبھی کبھی گھٹن پیدا کرتا ہے۔ تسلیم کہ تاریخ ادب میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جو اس خیال کی تردید کرتی ہیں۔ انتہائی غیر انسانی بخش حالات میں بھی اعلیٰ ادب کی تخلیق ہو سکی ہے۔ سائنس کی مثال پہلی جنگ عظیم کے انتشار بکنار عہد کی ہے جس میں جیمس جوائس اور ایلیٹ جیسے بڑے فنکار پیدا ہوئے۔ غالب بھی شدید انتشار اور تخریب کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ان مثالوں کے باوجود موافق ادبی ماحول کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ ساتھ ہی اپنے ہم خیال اور ہم مشرب ادیبوں اور شاعروں سے مل کر اور مختلف نزاعی ادبی مسئلوں پر تبادلہ خیال کرنے سے فکر و خیال کی بعض گتھیاں حل ہونے میں مدد ملتی ہے۔ دوسری جانب بعض مصنفوں کا زیادہ وقت ایسی جگہوں پر گزرتا ہے، جہاں نہ اکثر تر ادبی مسئلوں پر بے لاگ انداز سے گفتگو کرتے ہیں۔

ملک کے جس حصے میں میں رہتا ہوں وہاں خالص ادبی نوعیت کی کوئی انجمن نہیں، اور اگر ہے تو نظریاتی وابستگی کی بنا پر ادب سے زیادہ سیاست کی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ اس لئے لامحالہ خلوت گزیں ہونا پڑتا ہے اور بعض ادبی نکات کی تفہیم کے لئے ذاتی سمجھ بوجھ پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ سرحد سے کوئی خالص ادبی ماہنامہ بھی نہیں نکلتا۔ جو فکر و خیال کی ترسیل کا ذریعہ بنتا۔ تاہم یہ بات میرے لئے سدراہ نہیں رہی ہے۔ پھر بھی جہاں میں رہتا ہوں ایک گہرے سناٹے کا احساس ہوتا ہے اور میں پرورش لوح و قلم میں مصروف ہوں۔

مصنف بھی دوسرے انسانوں کی طرح معاشرے کا ایک ہوشمند فرد ہے۔ وہ ان تمام خانگی اور معاشرتی اور ملکی رسوم و رواج کا پابند ہے جنہیں تہذیبی اور اخلاقی تقدیس کا شرف حاصل ہے۔ بظاہر یہ اچھی بات ہے۔ معاشرتی زندگی کی موثر کارکردگی کے لئے سماجی اور اخلاقی رسوم کا احترام کرنا تہذیبی قدروں کی توسیع کے مترادف ہے۔ لیکن شخصی طور پر بارہا یہ محسوس کرتا آیا ہوں کہ یہ پابندیاں مصنف کی خود مختار اور آزادی پسند شخصیت کو پابہ جولاں کرتی ہیں۔ اور تخلیق و تصنیف کے شخصی آزادی کے تعلق سے جو مطالبے ہیں، ان کی نفی کرتی ہیں۔ میرے ساتھ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ لکھنے کے حاوی موڈ کو جو ہفتوں بلکہ مہینوں کے کرب انگیز انتظار کے بعد نصیب ہوا ہے خیر باد کہہ کے کسی عزیز یا دوست کے یہاں کسی خانگی تنازعے یا شادی بیاہ یا کسی اور تقریب سعید کے سلسلے میں جانا پڑا اور جب گھنٹوں کی مغز ماری کے بعد اس سماجی فریضے سے عہدہ برآ ہو کر گھر لوٹا ہوں تو اگلے دو روز تک بے سدھ پڑا رہا ہوں۔ رہا لکھنے کا موڈ، سو ؎

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا . . .

بالکل اسی طرح تخلیقی لمحات اس وقت بھی درہم برہم ہو جاتے ہیں جب آپ وقت بے وقت کے ملاقاتی نازل ہوتے ہیں اور چشمہ شور کی تکنیک میں بازار کے بڑھتے ہوئے بھاؤ سے لے کر چاند پر انسان کے اترنے کے موضوعات پر بے تکان بولتے چلے جاتے ہیں اور آپ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے ہیں۔ میں اس خیال کی وکالت نہیں کر رہا ہوں کہ ادیب کو دنیوی اور سماجی ذمہ داریوں سے کھلی چھٹی دی جائے۔ ایسا شاید ممکن نہیں لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اسے اتنی پابندیوں میں نہ جکڑا جائے کہ "رنج گرانباری زنجیر" محسوس کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی فنکارانہ حیثیت کو بے رحمی سے نظر انداز نہ کیا جائے۔

آخر میں ایک ایسے مسئلے کی طرف اشارہ کروں گا جو شخصی ہوتے ہوئے بھی غیر شخصی ہے اور جس کا تعلق موجودہ عہد کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ہے۔ یہ مسئلہ روایت کے حصاروں میں اپنے آپ کو محفوظ خیال کرنے والے ادیبوں کے مقابلے میں ایسے ادیبوں اور مصنفوں کو پریشان کرتا ہے جو برق رفتار سائنسی اور میکانکی ترقی کے نتیجہ میں اور اس سے بھی بڑھ کر حیات و کائنات کے تعلق سے نئی حسیت کے تحت اپنے وجود کو معرض ہلاکت میں دیکھتے ہیں۔ مسئلہ یہ نہیں کہ نئی ہیومن سچویشن میں فنکار نئے تجربات سے گزرتا ہے۔ ایسا ہونا فطری عمل ہے۔ البتہ مسئلے کی سنگینی کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب نئے تجربات کے موثر اظہار کے لئے اظہار و بیان کے روایتی اور فرسودہ اسالیب کی عدم معنویت ظاہر ہوتی ہے اور نئے اسالیب کی تخلیق کے لئے لفظ کے دشت و سراب سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ مسئلہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ آپ اپنے تجربات کی نئی لسانی تشکیل کے بعد ایک

اور مسئلے سے دوچار ہوتے ہیں جو پہلے مسئلے سے غیر متعلق نہ ہوتے ہوئے بھی آپ کی دست رس سے باہر ہے۔ اور پڑھنے والوں کی جانب سے آپ پر چسپاں ہوتا ہے۔ یعنی ابلاغ کا مسئلہ۔ اس مسئلے سے اپنے وقتوں میں کیٹس، ایلیٹ اور غالب کو بھی نمٹنا پڑا۔ اس مسئلے کا کئی دوسرے ہم عصروں کی طرح مجھے بھی سامنا ہے۔ میں نے حال ہی میں ایک ناولٹ لکھا ہے۔ "پرچھائیوں کا شہر" یہ "شاعر" کے ناولٹ نمبر میں شائع ہوا ہے۔ اس میں بدلتے ہوئے حالات میں نئی حسیت کی مصوری کے لئے مجھے اسلوب میں کچھ تبدیلیوں سے کام لینا پڑا۔ مثلاً اس میں سوئیلزم کے اثرات حاوی ہیں۔ یہ ناولٹ جب روایتی ناول کے عادی قارئین کی نظر سے گزرا تو ان کی جانب سے کسی دل خواہ جواب RESPONSE کا اظہار نہ ہوا۔ یہی حال نئے عہد میں لکھے جانے والے ان افسانوں اور نظموں وغیرہ کا ہے جو نئی حسیت کی غیر روایتی انداز میں مصوری کرنے کی مساعی کرتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین
۶۲ پٹودی ہاؤس نئی دہلی

مصنف کے مسائل پر کیا اظہار خیال کیا جائے جب کہ مصنف کی ذات خود ایک مسئلہ ہوتی ہے۔ اور جب بات اردو کے مصنف کی آتی ہے تو معاملہ ذرا کیا بلکہ بالکل ہی ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ آپ کو یہ حقیقت تسلیم کرنی ہی ہوگی کہ مصنف ایک الگ چیز ہوتی ہے اور اردو کا مصنف بالکل جداگانہ مخلوق ہے۔ ہر مصنف مصنف تو ہو سکتا ہے لیکن اردو کا مصنف ہرگز نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ بدقسمتی سے اردو کے مصنف ہونے کا الزام اپنے سر اٹھائے پھر رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اردو میں تصنیف و تالیف کا کام "کار ثواب" کے زمرے میں آتا ہے۔ اس کا اجر آپ کو اس دنیا میں نہیں بلکہ دوسری دنیا میں ملتا ہے۔ ہم لوگ حقیقتوں کو تسلیم کرنے کے معاملہ میں بڑے معصوم واقع ہوئے ہیں۔ ایک مزاح نگار کی حیثیت سے میں عادتاً مجبور ہوں کہ حقیقت کو حقیقت ہی رہنے دوں اور اس پر کوئی نقاب نہ چڑھاؤں۔ اس موقع پر مجھے وہ لطیفہ یاد آ رہا ہے کہ ایک صاحب کے تین بیٹے تھے۔ ایک دن ان صاحب کے ایک پرانے ملاقاتی ایک عرصہ بعد راستہ میں مل گئے۔ خیریت پوچھی پھر پوچھا "آپ کے بیٹے کیسے ہیں؟"

ان صاحب نے کہا "میرا ایک لڑکا ڈاکٹر بن گیا ہے، دوسرا وکیل ہے۔ ان کے علاوہ میرا ایک اور لڑکا بھی تھا"۔

ملاقاتی نے بات کاٹ کر پوچھا "تو کیا وہ مر گیا؟"

ان صاحب نے کہا "بس یونہی سمجھ لیجئے کیونکہ وہ اردو کا شاعر بن گیا ہے۔ اب اس کے لئے "تھا" کا استعمال نہ کروں تو اور کیا کروں؟"

سماجی طور پر اردو کے شاعر اور ادیب کا امیج (IMAGE) ہی کچھ اور ہے۔

حیدرآباد میں ایک بار ایک صاحب نے اردو کے چند ادیبوں اور شاعروں کو اپنے ہاں کھانے پر بلایا تھا۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ اس ضیافت کا اہتمام کس ضمن میں کیا جا رہا ہے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد کسی نے پوچھا "حضرت! یہ آپ کو اردو ادیبوں اور شاعروں کو کھانا کھلانے کی کیا سوجھی؟ آخر معاملہ کیا ہے؟"

وہ صاحب بڑی متانت سے بولے "بھئی! اصل معاملہ یہ ہے کہ میں نے منت مانی تھی کہ اگر میرا لڑکا میٹرک کے امتحان میں کامیاب ہو گیا تو میں اردو کے گیارہ ادیبوں اور شاعروں کو کھانا کھلاؤں گا۔ بس اتنی سی بات ہے۔ آپ اس حرکت میں ادب دوستی اور سخن فہمی کے جراثیم تلاش کرنے کی کوشش نہ کریں تو اچھا ہے۔"

آج اردو کے مصنف کے لئے لکھنا اتنا مشکل کام نہیں ہے جتنا کہ لکھے ہوئے کو "چھپوانا" اور "پڑھوانا" مشکل ہے۔ ہمارے نئے ادیبوں کی اکثریت ایسی ہے جو ادب کی تخلیق پر اتنی توجہ صرف نہیں کرتی جتنی کہ اپنے ادب کی اشاعت پر۔ اس کے لئے سب سے پہلے تو آپ کو رسالوں کے ایڈیٹروں سے اپنے مراسم استوار کرنے پڑتے ہیں۔ مراسم استوار کرنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ آپ کو وقفے وقفے سے ایڈیٹروں کے نام خطوط لکھنے پڑتے ہیں جن میں بار بار ان کی مزاج پرسی کی جاتی ہے۔ خط میں ہر دو جملوں کے بعد اردو ادب کی بقا کے لئے ان کی کوششوں کو خراج تحسین ادا کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ ایسا نہ کریں تو آپ کی تخلیق کی فوری اور مناسب جگہ پر اشاعت ممکن نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر نئے لکھنے والے ایڈیٹروں کو خطوط زیادہ اور افسانے یا شعر کم بھیجتے ہیں۔ افسانہ یا غزل چاہے "قابل اشاعت" ہو یا نہ ہو۔ ایڈیٹر کے نام خط کا قابل اشاعت ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ بعض تخلیقات تو صرف ان کے ساتھ آنیوالے خطوط کی بنا پر شائع ہو جاتی ہیں۔ مجبوری یہ ہوتی ہے کہ کسی اچھے خط کو شائع کرنے کے لئے برے افسانے یا بری نظم کو چھاپنا ہی پڑتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ مصنف اور ایڈیٹر کے تعلقات بڑے لطیف

اور نازک ہوتے ہیں۔ ادیب کو ہر دم یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ کہیں آبگینوں کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ ایک بار ایک رسالہ کے ایڈیٹر کی صحت خراب ہوگئی۔ تو کئی ادیبوں نے اُن کی مزاج پُرسی کچھ اس انداز سے کی تھی جیسے اگر وہ فوراً صحت یاب نہیں ہوئے تو یہ لوگ خودکشی کرلیں گے۔ اس دھمکی کے نتیجہ میں ایڈیٹر کو فوراً صحت یاب ہو جانا پڑا۔ مجبوری انسان سے کیا نہیں کرواتی۔ اگرچہ یہ باتیں بہت معمولی ہیں۔ لیکن اگر آپ کو غور سے دیکھنے کی عادت ہو تو پتہ چلے گا کہ ادب میں "پیروکاری" اب ایک مستقل صنف کا درجہ اختیار کرتی جارہی ہے۔

ہر ادیب کی فطری خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ ادب میں "مقام" حاصل کرے اور مقام کے سلسلے میں مشکل یہ ہے کہ ادب کے اکثر "مقامات" پر پہلے ہی سے "پرانے ادیب" بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ اُٹھیں تو نئے لکھنے والوں کو جگہ ملے۔ آپ ادب میں جس مقام پر پہنچنا چاہتے ہیں اس مقام پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اوّل تو وہاں پہلے ہی سے کچھ ادیب بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور دوم یہ کہ اس مقام پر پہنچنے کے لئے ادیبوں کی ایک قطار لگی ہوئی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے قطار کے اگلے سرے پر "ادب میں مقام" تقسیم ہو رہا ہو بلکہ راشن تقسیم ہو رہا ہو۔ پھر جن ادیبوں کو "مقام" مل جاتا ہے۔ اُن کی حالت ان سیاستدانوں سے مشابہ ہوتی ہے جنہیں ایک بار "کرسی" مل جائے تو پھر وہ کرسی کو اُس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک وہ خود سے نہ ٹوٹ جائے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے پرانے ادیب اور اُن کے نقاد "مقام" کے معاملہ میں بڑے لالچی اور کنجوس واقع ہوئے ہیں۔ ہم ادب کی اپنی "استطاعت" کے مطابق "خدمت" انجام دینے کے بعد مطمئن نہیں ہوجاتے۔ میرے خیال میں ایک ادیب کو اپنی "شاہکار تخلیق" لکھ لینے اور یہ جان لینے کے بعد کہ وہ اس سے بہتر کوئی اور چیز ادب کو نہ دے سکے گا ادب سے ریٹائر ہو جانا چاہئے۔ اور اپنا مقام کسی اور کے لئے خالی کردینا چاہئے۔ دُنیا کے ہر پیشہ میں ریٹائرمنٹ کی گنجائش ہوتی ہے۔ لیکن مصنف کا پیشہ ہی ایک ایسا پیشہ ہے جس میں آدمی ادب اور دُنیا سے ایک ساتھ "ریٹائر" ہوتا ہے۔ سچ پوچھئے تو ہمارے بہت سے ادیب ایسے ہیں جو ایک منزل پر پہنچنے کے بعد اگر لکھنا ترک کردیتے تو ادب کی بہت بڑی خدمت انجام دیتے۔ بعض اوقات کچھ نہ لکھنا بھی ادب کی خدمت کی تعریف میں آتا ہے۔ بعض اپنی ماضی کو شہرت کے بل بوتے پر اپنی کسی بھی تیسرے درجے کی تخلیق کو پہلے درجہ کی تخلیق منوانے کی کوشش کرنا خود ادب کی ایک "بدخدمتی" ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِدھر چند برسوں سے ادب میں "بتوں" کو توڑنے کا ایک سلسلہ چل پڑا ہے۔ پرانے بت نہ ٹوٹیں تو نئے بت کیسے بنیں۔

اس سلسلہ میں ہمارے نقادوں پر بھی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے ہمارے نقادوں نے عرصہ سے یہ وطیرہ بنا رکھا ہے کہ کسی بھی ادیب کی تخلیقات کی طرف اس وقت تک آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے جب تک کہ وہ نہ مرجائے۔ "زندہ ادیب" اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنا کہ ایک "مُردہ ادیب"۔

پھر اُردو تنقید کی ایک بدبختی یہ ہے کہ اُردو پڑھانے والا ہر لیکچرار یا پروفیسر اپنے آپ کو نقاد بھی سمجھتا ہے۔ دُنیا کے کسی اور ادب میں آپ ایسی مثال نہیں بتا سکتے کہ انگریزی یا فرانسیسی پڑھانے والا ہر پروفیسر اپنے آپ کو نقاد بھی سمجھتا ہو۔ کسی زبان کو پڑھانا ایک الگ چیز ہے اور تنقید نگاری بالکل ہی ایک الگ چیز۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگیا ہے کہ اُردو کی تنقید اب تک "کالج کی چار دیواری" سے باہر نہیں نکل سکی ہے۔ وہ اب بھی اسنابری SNOBBERY کا شکار ہے۔ اصلی اور کھرے نقاد آپ کو بہت ہی کم نظر آئیں گے۔ اُردو تنقید نگاری کی اس گھٹی گھٹی سی فضا میں اردو کے نام نہاد نقاد نئے ادیبوں کو مقام عطا کرنے کے معاملے میں بڑی کوتاہی سے کام لیتے ہیں۔ بحیثیت مزاح نگار میں یہاں صرف ایک مثال دینے پر اکتفا کروں گا کہ مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ اُردو مزاح نگاری کو جو کچھ دیا ہے اس کی روشنی میں اُردو کے پچھلے مزاح نگاروں کے بہت سے بت بھلے ہی نہ ٹوٹے جائیں مگر اُن کے بازو مشتاق احمد یوسفی کو ایک نیا بت تو کھڑا کیا جاسکتا ہے مگر کسی نقاد کو یہ توفیق عطا نہیں ہوئی کہ وہ مشتاق احمد یوسفی کے فن کا سیر حاصل جائزہ لے سکے۔ اصل میں اب ادب میں "دفتریت" داخل ہوتی جارہی ہے۔ جو ادیب داخل رجسٹر ہو چکے ہیں۔ اُن کا بال بھی بیکا نہیں کیا جاسکتا۔ نقادوں کے اس "دفتری رویہ" کی وجہ سے نئے ادیبوں میں دو رجحان پروان چڑھتے جارہے ہیں۔ ایک رجحان تو وہ ہے جس کے تحت وہ رسالوں کے ایڈیٹروں اور نقادوں کی خوشنودی حاصل کرکے ادب میں "مقام" پانا چاہتے ہیں۔ اور دوسرا رجحان وہ ہے جس کے تحت ادیب اپنے آپ کو "نمایاں" کرنے کے لئے بے معنی اور بے ہنگم تخلیقات کا سہارا لیتے ہیں۔ اپنے آپ کو نمایاں کرنا ہر ادیب کی فطری خواہش ہوتی ہے۔ اور اپنے آپ کو "نمایاں" کرنے کے ہزاروں طریقے ہوسکتے ہیں۔ اگر آپ اپنے کوٹ کے کالر میں گلاب کا پھول لگانے کی بجائے "گوبھی کا پھول" لگا کر سڑک پر چل پڑیں تو آپ دیکھتے ہی دیکھتے سڑک پر چلنے والوں میں یقیناً "نمایاں" ہوجائیں گے۔ ہمارے بعض نئے ادیب ادب میں جس قسم کے "اوٹ پٹانگ تجربے" کر رہے ہیں۔ وہ گوبھی کے پھول کو کوٹ کے کالر میں لگانے کی تعریف میں آتے ہیں! ادب

یہ مقام کے حصول کی اس "افراتفری" میں بجائے تخلیقی ادیب بنتے جا رہے ہیں۔ وہ صرف اپنے سکون قلب کے لئے شعر کہتے اور افسانہ لکھتے ہیں۔

ایک مصنف کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنی تصنیف کو شائع بھی کرے۔ اور اردو میں تصنیف کی اشاعت اب ایک مشکل مسئلہ بنتی جا رہی ہے۔ لہٰذا اکثر مصنفین بیٹھے بٹھائے "ناشر" میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ایک ناشر نے مجھے بتایا تھا کہ کرشن چندر جیسے ادیب کی کسی کتاب کے ہزار نسخے چھاپے جائیں تو ان سارے نسخوں کی نکاسی کے لئے کم از کم تین سال درکار ہوتے ہیں۔ ایسے میں بھلا دوسرے ادیبوں کو کون گھاس ڈالے گا۔ ناشرین یہ سمجھتے ہیں کہ اردو کے کسی ادیب کی کتاب چھاپنے سے بہتر یہی ہے کہ وہ کیلنڈر یا ڈائریاں چھاپیں۔ اگر سنجیدگی سے سروے کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اردو کے ۸۰ فی صد مصنفین اپنی کتابیں خود اپنے صرفے سے چھاپتے ہیں اور "خود کشی" کے مرتکب ہوتے ہیں۔ میں اردو کے ایک مقبول افسانہ نگار سے واقف ہوں جنہوں نے آج سے دس بارہ سال پہلے محض "ادب کی خدمت" کے جذبے کے تحت ایک ساہوکار سے تین ہزار روپے قرض لے کر اپنے افسانوں کا مجموعہ چھاپا تھا۔ رسالوں میں تو خیر اس مجموعے کی بڑی تعریف چھپی۔ لیکن آج تک کہیں یہ خبر نہیں چھپی کہ افسانہ نگار موصوف اب تک اپنے کئے کی سزا بھگت رہے ہیں۔ اور ساہوکار کو نہ صرف سود ادا کر رہے ہیں۔ بلکہ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد وہ اور بھی نئے ساہوکاروں کے مقروض ہو گئے ہیں۔ ورنہ افسانوں کے مجموعہ کی اشاعت سے قبل وہ اچھی خاصی پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب ان کے افسانوں کا مجموعہ نیا نیا چھپ کر ان کے گھر آیا تھا تو ان کا گھر اس مجموعے کے نسخوں سے بھر گیا تھا۔ الماریوں میں نسخے تو خیر رکھے ہی جاتے ہیں لیکن ان کے ہاں تو پلنگوں اور برتنوں میں بھی افسانوں کے اس مجموعے کے نسخے رکھے گئے تھے۔ سارے گھر میں "ریفریجریٹر" ہی ایک ایسی چیز تھی جس میں کتابوں کے نسخے موجود نہیں تھے۔ اس واقعہ کو دس سال بیت گئے مگر آج بھی ان کے بچے ان نسخوں کو قطار کی شکل میں رکھ کر انہیں اسٹول یا کرسی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ دیوار پر کسی اونچی جگہ کیل ٹھونکنی ہو تو بچے ان نسخوں کی "سیڑھی" بنا لیتے ہیں۔ حالانکہ ان دس برسوں میں افسانہ نگار موصوف نے اپنے مجموعہ کے "سینکڑوں" اعزازی نسخے، مختلف ادیبوں، ایڈیٹروں، اور شاعروں کو بھیجے ہیں۔

آپ ہی بتائیے ایسے میں کس کی شامت آئی ہے کہ وہ اپنی تصنیف چھپواتا پھرے۔ اردو والوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ کتاب خرید کر پڑھنے کو ایک تعزیری جرم سمجھتے ہیں اور حتی الامکان اس جرم کا ارتکاب نہیں کرتے۔ اس ضمن میں اردو مصنفین کی دشواریوں کا اندازہ آپ کو کسی اردو کتاب کے مصنف کے لکھے ہوئے "دیباچے" اور کتاب کے "انتساب" کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ "دیباچے" میں مصنف جس اہتمام و احترام کے ساتھ ان اصحاب کا شکریہ ادا کرتا ہے جو اس کی کتاب کی اشاعت میں ممد و معاون ثابت ہوئے، یہ کسی اور زبان کے مصنف سے ممکن نہیں۔ میرے خیال میں اردو کا مصنف جتنے "شکریئے" ادا کرتا ہے۔ اتنے "شکریئے" کسی اور زبان کا مصنف ادا نہیں کرتا۔ یوں لگتا ہے جیسے کتاب کی اشاعت کے بعد وہ دنیا کے ہر فرد کے احسانوں کے بوجھ تلے دب گیا ہے۔ وہ اپنی "انا" کو بیچ کر بس شکریہ ادا کرتا رہ جاتا ہے۔ ناشر کا شکریہ ادا کرنا تو خیر کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اردو کا مصنف کتاب کے جلد ساز کا شکریہ ادا کرنے پر بھی مجبور ہوتا ہے۔ کتابوں کے "انتسابات" میں مصنف کی انا کا سودا صاف دکھائی دیتا ہے۔ ایک کتاب نظر سے گزری تھی جس کا انتساب کچھ اس قسم کا تھا۔

"——— صاحب کے نام جو چمڑے کے کاروبار میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے، جن کی دکان فلاں بازار میں ہے اور ٹیلیفون نمبر فلاں ہے، ایک بار آپ ان کی دکان سے مال خریدیں تو پھر آپ کسی اور دکان کا رُخ نہیں کریں گے۔ ——— اور یہ کتاب انہی کی ادب دوستی، سخن فہمی اور ادبا پروری کے نتیجہ میں شائع ہو رہی ہے۔"

اس انتساب کے پیچھے اردو مصنف کی ساری بے بسی اور مجبوریوں کی داستان چھپی ہوئی ہے۔ ورنہ کہاں چمڑے کا کاروبار اور کہاں شعر و شاعری۔ اردو کتابوں کے "دیباچوں" سے اردو مصنف کا جو تصور ابھرتا ہے۔ وہ ایک لاچار، بے بس، مظلوم اور کمترین انسان کا تصور ہوتا ہے۔

جن ادیبوں کے پاس تھوڑی سی "انا" ہوتی ہے۔ وہ اپنی غیر مطبوعہ تخلیقات کا انبار اپنے گھروں میں لگاتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ادب ان کے سارے گھر پر قابض ہو جاتا ہے۔ میں ایک شاعر سے واقف ہوں جو گزشتہ چالیس برسوں سے بہ پابندی شعر کہتے چلے آ رہے ہیں۔ ہزاروں غزلیں انہوں نے کہیں، مگر کبھی کتابی صورت میں ان کی اشاعت کی نوبت نہ آئی۔ ان کا کلام کئی صندوقوں اور دراز میں بند پڑا رہا۔ پھر قدرت کو نہ جانے کیا غصہ آیا کہ ایک رات شہر میں موسلا دھار بارش ہوئی اور اس نالے میں طغیانی آ گئی جو شاعر موصوف کے گھر کے سامنے بہتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانی ان کے گھر میں داخل ہو گیا۔

اور اپنے ساتھ ان کے سارے غیر مطبوعہ کلام کو بھی بہا لے گیا۔ دوسرے دن یہ ملے تو بڑے اُداس اُداس سے تھے میں نے اُداسی کی وجہ پوچھی تو بولے "اب تمہیں اپنے دکھ کا حال کیا بتاؤں۔ کل رات نالے میں جو طغیانی آئی تو میرا وہ سارا غیر مطبوعہ کلام بھی نالے میں بہہ گیا جو میں نے چھ صندوقوں میں بند کر رکھا تھا۔ میری تو ساری کائنات ہی لُٹ گئی۔ اب میرے پاس بچا ہی کیا ہے؟"

اس پر میں نے انہیں دلاسہ دیتے ہوئے کہا: "بھائی صاحب! اس میں قصور تو آپ ہی کا ہے۔ اگر آپ پہلے ہی اپنے کلام کو نالے میں پھینک آتے تو نالے کو آپ کے کلام تک پہنچنے اور اُسے اپنے ساتھ بہا لیجانے کی ضرورت پیش نہ آتی اور دوسرے لوگوں کے گھر بھی نہ اُجڑتے۔"

یہ تو ہوئیں کتابوں کی اشاعت کی دشواریاں۔ دوسری طرف اُردو کے مصنفین "قاری" کی عدم موجودگی سے پریشان ہیں۔ میرے خیال میں اب خالص ادب کے مصنفین ہی آپس کے "قاری" بھی ہیں یعنی اب ایک مصنف دوسرے مصنف کا قاری ہے۔ مصنفین ایک دوسرے کی چیزیں پڑھ کر خوش ہو لیتے ہیں اُردو کے قاری کی گمشدگی کے بارے میں جب بھی غور کرتا ہوں تو مجھے اس کی حالت اس سوتیلی اولاد کی سی معلوم ہوتی ہے جو والدین کے بیجا ظلم و ستم اور زیادتیوں سے تنگ آکر گھر سے بھاگ گئی ہو۔ ۱۹۶۰ء کے بعد ادب میں اچانک نئے تجربوں کی جو بھرمار شروع ہوئی وہ "اولاد" پر "والدین" کے ظلم و ستم کا درجہ رکھتی تھی۔ "اولاد" اس ظلم و ستم کو کچھ عرصہ تک تو بڑے صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کرتی رہی۔ اُردو قاری کے صبر و ضبط کا یہ عرصہ ۱۹۶۰ء سے شاید ۱۹۶۵ء تک رہا ہو۔ اس کے بعد قاری نے رفتہ رفتہ کھسکنا شروع کیا اور اب یہ حال ہے کہ قاری تلاش کے بعد بھی نہیں ملتا۔

مجھے ایک مشاعرہ میں شرکت کا موقع ملا تھا۔ اس میں شاعر تو کوئی تیس چالیس تھے۔ مگر سامعین پانچ سے زیادہ نہیں تھے (بشمولہ میرے) یہ بات عجیب سی لگ رہی تھی کہ تیس چالیس شعراء تو ڈائس پر بیٹھے رہیں۔ اور صرف پانچ سامعین ہال میں بیٹھے رہیں۔ کسی منچلے نے یہ تجویز پیش کی کہ ہال کی خالی کرسیوں کو پُر کرنے کے لئے شاعر حضرات نیچے بیٹھ جائیں اور سامعین ڈائس پر پہنچ جائیں چنانچہ یہی ہوا۔ اور ایک ایک شاعر باری باری سے مائک پر پہنچ کر ان پانچ سامعین کو کلام سُناتا رہا۔

اگر قارئین اور سامعین کی قلت کا یہی حال رہا تو ایک دن وہ بھی آئے گا جب سامعین کو باضابطہ معاوضہ دے کر مشاعروں میں بلانا پڑے گا اور پھر مشاعرہ کے بعد شاعر حضرات ان کے آٹوگراف بھی لیا کریں گے۔

اصل میں اُردو کا پرانا قاری اب دوسری زبانوں کی طرف متوجہ ہونے لگا ہے۔ آج کا مصنف جو کچھ بھی لکھتا ہے اس کی حیثیت اندھیرے میں تیر چلانے کے برابر ہوتی ہے۔ اُسے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کا تیر کسی قاری کو گھائل کر بھی رہا ہے یا نہیں؟

مصنف اپنی تخلیق رسالوں میں چھپواتا تو ہے مگر اُسے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کسی نے اُسے پڑھنے کی غلطی کی بھی یا نہیں؟ اس صورتِ حال نے بالخصوص اُردو کے مصنفین میں ایک بے بسی اور بے حسی کی سی کیفیت طاری کر دی ہے۔ قاری نہ ہوں تو مصنف کے اطراف GLAMOUR کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ GLAMOUR پیدا نہ ہو تو مصنف میں لکھنے کی URGE کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ میرے مضامین کو اُردو کے مقابلہ میں ہندی کے قارئین نے زیادہ پسند کیا ہے اور انہوں نے زیادہ خطوط لکھے۔ اب ہم کسی اُردو مصنف کے سامنے اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں، تو وہ استہزائیہ انداز میں اپنے ردِ عمل کو یوں پیش کرتا ہے "بھئی ہندی کے قارئین ان مضامین کو پسند نہ کریں تو اور کون کرے گا۔ اُن کے پاس اچھا ادب ہے ہی کہاں؟"

اس تجزیے میں ایک خوفناک قسم کے (SECLUSION) کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ جب تک اُردو مصنفین اپنے آپ کا تجزیہ نہیں کریں گے اور گمشدہ قاری کو پھر سے دریافت کرنے کی کوشش نہ کریں گے۔ تب تک اُن کے مسائل یونہی اُلجھتے رہیں گے۔ اُن کی بے بسی اور بے حسی اور بھی بڑھتی جائے گی۔ اور قدم قدم پر اُن کی "انا کا سودا" ہوتا رہے گا۔

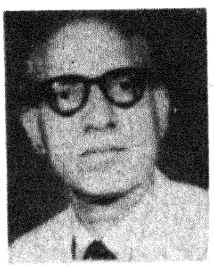

ضیا فتح آبادی

جے ۱/۵، راجوری گارڈن،
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۷

مصنف کے مسائل پر غور کرنے سے پیشتر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہاں مصنف سے مراد وہ فنکار ہے جو اپنی ذہنی و شعوری استعداد کی زائیدہ شعری یا نثری تخلیق کو کتابی صورت میں پیش کرتا ہے۔

۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کے زمانے کو اُردو زبان کا سنہری دَور کہا جاسکتا ہے۔ اسی زمانے میں وہ ریڈیو میں سکۂ رائج بنی۔ اُس کی ترویج و ترقی کے لئے بے شمار ادارتی اور اشاعتی اِدارے قائم کئے گئے، سینکڑوں رسائل و جرائد جاری ہوئے اور مختلف موضوعات پر کتابیں تصنیف پاکر ہزاروں کی تعداد میں اشاعت پذیر ہوئیں۔ اُردو مصنفین نے فیصلہ کیا کہ زندہ رہنے کے لئے اُن کو اپنے فن کی قیمت وصول کرنی ہوگی۔ اس فیصلے کے تحت ایک خاص گروپ نے اپنی تخلیقات اشاعت کے لئے مفت تقسیم کرنے سے انکار کر دیا۔ تصنیف و تالیف کے کام نے پیشے کی صورت اختیار کرلی اور فنی و تنقیدی شعور بیدار ہوا۔ حیدرآباد دکن اور پنجاب میں وہ کارہائے نمایاں سرانجام پائے جنہیں بھلایا نہیں جاسکتا۔ نتیجتاً اُردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہی نہیں ہوا بلکہ اُردو ادب میں تازہ خون کے دخول نے اس کو اتنی توانائی بخش دی کہ وہ دوسری عالمی زبانوں کا مقابلہ کر سکے۔ لیکن یہ سب کچھ تقسیم اور حصول آزادی سے قبل کا واقعہ ہے۔

زمانہ مابعد میں اُردو اپنے ہی گھر میں اجنبی بن گئی۔ گو تصنیف و تالیف کا کام جاری رہا مگر اُردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد بتدریج کم ہوتی چلی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اب اُسے ایک اقلیتی طبقے کی زبان کے طور پر محفوظ رکھنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔

مصنف کا سب سے بڑا مسئلہ اُس کا حلقۂ قارئین ہے۔ قارئین کا حلقہ جتنا وسیع ہوگا کتابوں کی مانگ اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ اور جب کتابوں کی مانگ زیادہ ہوگی تو زیادہ کتابیں زیادہ چھپیں گی۔ بلکہ کتابیں چھاپنے والے بھی پیدا ہوں گے اور جب کتابوں کی مانگ بڑھے گی تو مصنفین کی قدر و قیمت میں بھی اضافہ ہوگا۔ بدقسمتی سے اُردو ادب کی حالت اس وقت اس کے برعکس ہے جہاں اس کی توام بہن ہندی سرد لعزیز اور مقبول ہو رہی ہے۔ وہاں اُردو کے ساتھ سوتیلوں جیسا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں مصنف عمل تصنیف سے عہدہ برا تو ہو سکتا ہے مگر وہ اس کو ذریعۂ معاش نہیں بنا سکتا۔

جب کتابوں کی کھپت کم ہوتی ہے تو اشاعتی ادارے خود بخود کم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اشاعتی ادارے خسارے پر چل کر محض خدمت ادب کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور اگر وہ منافع نہیں کماتے تو مصنف کو کیا دے سکتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اُردو کے جو گنے چنے اشاعتی ادارے ہیں۔ وہ بیشتر اُن مصنفین کی کتابیں چھاپتے ہیں جن کا نام چلتا ہے اور ایسے مصنفین یقیناً فائدے میں رہتے ہیں مگر افسوس اس بات کا ہے کہ اُردو ادب میں اس قسم کی اجارہ داری اس کی مقبولیت اور ترقی میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔

زیادہ تعداد اُردو مصنفین کی ایسی ہے جو شکم پُری کے لئے غیر ادبی اور اُردو سے غیر متعلق کام کرتے ہیں مگر اُردو علم و ادب سے انہیں والہانہ عشق ہے اور وہ اپنے اوقات فرصت خدمت اُردو میں صرف کر کے تسکین ذات کرتے ہیں۔ اُن کی خدمات و تخلیقات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور اُن سے اُردو کے کاز کو تقویت بھی ملتی ہے مگر وہ جب کوئی تصنیف مکمل کر لیتے ہیں تو ان کے سامنے جو سوال ایک پہاڑ بن کر کھڑا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس طباعت و اشاعت کی صورت کیونکر پیدا ہو۔ یہ ایسا پہاڑ ہے جس کا کاٹنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ بغیر کسی سفارش یا ذاتی رسوخ کے کتاب کا مسوّدہ کسی اشاعتی ادارے کو بھیجنا سعی لاحاصل ہے چنانچہ یا تو وہ کتاب مسوّدے ہی کی صورت میں پڑی رہ جاتی ہے یا پھر چھپتی ہے تو مصنف کے اپنے پیسوں سے جو وہ اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ کاٹ کر جمع کرتا ہے۔ میرے علم میں ایک ایسا شاعر ہے جس نے اپنا پہلا دیوان شائع کرنے کے لئے ذاتی مکان تک فروخت کر دیا تھا جو کتابیں اس طریقے سے طبع ہوتی ہیں اُن کی نکاسی اور فروخت کا مسئلہ مصنف کے لئے دردِ سر بن جاتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسی کتابیں زیادہ تر مفت تقسیم کرنی پڑتی ہیں اور باقی کتابیں یا تو ردی الماریوں کی زینت بن جاتے ہیں۔ مصنف کا بیشتر وقت تو اپنے غیر ادبی مستقل کام میں صرف ہوتا ہے۔ باقی ماندہ وقت میں وہ اتنا بھی نہیں کر سکتا کہ جو چند خود شائع کردہ کتابیں وہ کسی طرح کتب فروشوں تک پہنچا چکا ہے۔ اُن سے معلوم کرے کہ کتنی کتابیں فروخت ہوگئیں۔ یہ کتب فروش زیادہ کمیشن پر ایسی کتابیں اپنے یہاں رکھتے ہیں اور فروخت کے بعد اُن کی قیمت بعد وضع کمیشن اگر مصنف کو مل جائے تو اُسے اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنا چاہئے۔ ورنہ ان کتب فروشوں سے روپیہ وصول کرنا کارِ محال ہے۔ اشاعتی اداروں کا سلوک بھی عام مصنفین کے ساتھ اُن کتب فروشوں سے جدا نہیں چنانچہ اگر کسی مصنف کی تصنیف کسی ایسے ادارے سے شائع ہوتی ہے تو اُس کو حق تصنیف کا صلہ بہت معمولی ملتا ہے یا ملتا ہی نہیں۔ بعض اوقات تو اشاعتی اداروں سے چھپنے والی کتابوں کا بارِ اشاعت خود مصنف برداشت کرتا ہے اور گو کہ یہ ادارے اپنی ایجنسیوں اور اشتہارات کے ذریعے اُن کی کافی جلدیں فروخت کر لیتے ہیں تاہم جو معاوضہ مصنف کو ملتا ہے

وہ اخراجات سے بہت کم ہوتا ہے۔

کچھ ادارے حکومت نے بھی قائم کر رکھے ہیں مگر ان سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کا حال بھی مختلف نہیں۔ یہاں بھی مصنف کا نام، اثر و رسوخ کارگر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ حکومت نے ضرورت مند مصنفین کو تصانیف کی طباعت وغیرہ کے لئے فنڈ بھی مہیا کیا ہے مگر اوّل تو ایسے مصنفین کی تعداد بہت کم ہے اور دوسرے کتاب چھپنے کے بعد کے جو مسائل اوپر بیان کئے گئے ہیں اُن کا حل یہ بھی تلاش نہیں کر سکے۔

تو یہ رہے اُردو مصنف کے عام مسائل جو ہتی اس بات کی ہے کہ ہزارہا مشکلات کے باوجود عمل تخلیق و تصنیف جاری ہے۔ اور یہی چیز آگے چل کر اُردو کے احیاء و بقا کی ضامن بن سکتی ہے۔ اُردو ایک زندہ زبان ہے۔ اور یہ مسائل اس کی زندگی کا ثبوت۔

ستیش بترا

ای-۹، گریٹر کیلاش انکلیو بترا

نئی دہلی ۱۱۰۰۴۸

جہاں ہندوستانی مصنف کی یہ خوش قسمتی ہے کہ ابھی تک اس کی سوچ اور فکر پر پہرے نہیں بٹھائے گئے، وہاں اس کا یہ المیہ ہے کہ وہ آج بھی محض اپنی تصانیف کے سہارے گزر بسر نہیں کر سکتا۔ اقتصادی طور پر اس کی حالت نہایت قابل رحم ہے۔ بیشتر رسالے، اخبار اور ادارے اُس کی کاوشوں کا معمولی معاوضہ بھی نہیں دیتے اور جو معاوضہ اُسے ملتا ہے، اس سے اُس کے کاغذ، قلم اور ڈاک وغیرہ کا خرچ بھی مشکل ہی سے پورا ہو سکتا ہے۔ کسی مصنف کا محض اپنی تصانیف کے سہارے زندہ رہنا قریب قریب ناممکن ہے۔ اگر اس حالت میں اُسے روزی کے لئے کسی اور شعبہ کا سہارا لینا پڑے تو ہم اس سے اپنی تصانیف کے ساتھ پورا انصاف کرنے کا تقاضا کیونکر کر سکتے ہیں! نہ اُس کے پاس تجزیہ اور تحقیق کے لئے وقت ہے اور نہ ہی وہ گھوم پھر کر زندگی کی وسیع کتاب کا بخوبی مطالعہ کر سکتا ہے۔ اس کی نظر کا محدود ہونا لازمی ہے۔ ایسے میں اُس کی تخلیقات پر گھٹن اور تنگ نظری کی چھاپ رہے گی۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ شروع میں جوش اور ولولوں کے سہارے قربانی دیتا ہے۔ لیکن پھر جلد ہی وہ اُن شعبوں میں کھو کر جو کہ اُس کا پیٹ پالتے ہیں، ادب سے کنارہ کش ہو جاتا ہے اور اس طرح سے سماج ایسے لوگوں کی صلاحیتوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ اور پھر اُس سماج میں جہاں مالی حالت ہی کسی فرد کا سماجی رتبہ متعین کرتی ہے، کیا کسی قلاّش لیکن قابل قدر مصنف کا کوئی سماجی رتبہ ہو سکتا ہے؟ اس کے لئے ایک کلرک، وکیل، حکیم، ڈاکٹر یا کوئی اور پیشہ کر لینا قریب قریب لازمی ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ایک مصنف کا محض مصنف ہونا ہندوستان میں ناقابل تصور ہے۔ تاہم یہ کسی سماج کے لئے بھی باعث ننگ و ذلت ہے کہ وہ اپنے ادیبوں اور دانشوروں کو اُن کے صحیح رُتبے سے نہ پہچانے۔

یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حال ہی میں مصنفین کے لئے سرکاری اعزاز، امداد اور انعامات کی کچھ راہیں کھلی ہیں لیکن یہ آٹے میں نمک برابر ہیں۔ کہنے کو یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب جنتا کے بنیادی مسئلے حل نہیں ہو سکے تو مصنفین کے اس چھوٹے سے طبقے کے لئے اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔ ہر ملک میں دانشوروں اور ادیبوں کی تعداد ہمیشہ کم رہتی ہے۔ لیکن یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی تحریروں سے وقت کے دھارے موڑ سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس اہم طبقہ کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی لازم ہے۔ مصنف یہ نہیں چاہتا کہ اُسے ہمیشہ اعزاز اور انعامات سے ہی نوازا جائے بلکہ تقاضا اس بات کا ہے کہ حالات اس قدر سازگار بنائے جائیں کہ اُس کے اقتصادی مسائل اُس کی راہ میں حائل نہ ہوں اور وہ خود اپنے تئیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔ بالکل اسی طرح جیسے بیکاری کا مسئلہ عطیہ یا بھتہ دینے سے نہیں بلکہ روزگار کے زیادہ سے زیادہ وسیلے پیدا کر کے حل کیا جا سکتا ہے۔

ایک مصنف کو اقتصادی طور پر آزاد کرانے کے لئے ضروری ہے کہ مصنف کی زبان کو ملک کی دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ یکساں طور پر فروغ حاصل ہو۔ نہ کہ اُس پر پابندی اور پہرے بٹھا دیئے جائیں۔ یہ حکومت اور سماج کا فرض ہے کہ ہر زبان کو پنپنے کا یکساں موقعہ ملے۔ اگر زبان زندہ ہے تو مصنف بھی زندہ رہنے کی آرزو کر سکتا ہے۔

ہر زبان کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ زبان جاننے والے موجود ہوں اور اُن کی تعداد بڑھتی رہے۔ اُن کے لئے تعلیم و تصنیف کی سہولتیں میسر ہوں۔ کاغذ، چھپائی کا معقول انتظام ہو۔ کتابوں کے چھپنے اور بکنے کے ذرائع ہوں تاکہ کتابیں کثیر تعداد میں چھپیں۔

(بقیہ صفحہ ۴۱ پر)

مدیر کے مسائل

اعجاز صدیقی

عابد سہیل

یوسف ٹینگ

مالک رام

احمد سعید ملیح آبادی

اعجاز صدیقی

مدیر شاعر "قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶

بمبئی

میں ایک علمی و ادبی رسالہ کا مدیر ہوں۔ میری پوری عمر اسی دشت کی سیاحی میں گذری ہے، یہ میرا خاندانی ورثہ بھی ہے شوق بھی اور پیشہ بھی۔ میرے چالیس سالہ ادارتی تجربات اب وہاں پہنچ چکے ہیں جہاں نہ کوئی مسئلہ نیا معلوم ہوتا ہے اور نہ کوئی تجربہ انوکھا ہیں نے اتنے تجربات کئے ہیں اور مجھے اتنے زیادہ مسائل سے گذرنا پڑا ہے کہ اگر انہیں بیان کروں تو ایک کتاب بن جائے۔

یہ حقیقت ہے کہ رسائل کے مسائل ان کے اپنے دور سے وابستہ ہوتے ہیں۔ دور بدلتا ہے تو مسائل کی شکلیں بھی بدل جاتی ہیں۔ میں نے وہ دور بھی دیکھا ہے، جب ادبی رسالے بہت ہی کم تھے اور غیر منقسم ہندوستان میں پڑھنے والوں کی تعداد زیادہ۔ اہل قلم بھی گنے چنے تھے اور بیشتر ایسے علمائے ادب اور اساتذۂ سخن تھے، جن کی اکملیت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ وہ علم و فن پر زبردست عبور رکھتے تھے اور ان کی تخلیقات کو پڑھنے کیلئے اردو والے چین رہتے تھے۔ رسائل کے مدیر ان کے رشحات قلم آنکھ بند کر کے شائع کر دیا کرتے تھے۔ نہ مسودہ میں کاٹ چھانٹ کی ضرورت ہوتی تھی اور نہ اشعار میں انتخاب کی۔ نہ ہمارا ادب اتنے خانوں میں بٹا ہوا تھا اور نہ شاعری کے اتنے رنگ و آہنگ تھے، جتنے آج ہیں۔ قاری کو نہ طویل غزل پر اعتراض ہوتا تھا اور نہ بیانیہ نظم پر، نہ وہ فنی نکات سے اکتاتا اور کتراتا تھا، نہ علمی مباحث سے۔ مشکل عربی فارسی الفاظ و تراکیب کو بہ آسانی ہضم کر لیا جاتا تھا۔ اس وقت اظہار و ابلاغ کا کوئی خاص مسئلہ نہ تھا۔ رسالہ کے سادہ سے سرورق اور اوسط درجہ کی کتابت و طباعت سے قاری کو مطمئن کیا جا سکتا تھا۔ ترتیب مضامین میں کسی تنوع کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔ قاری صرف اپنی بلند ادبی شخصیتوں کی نئی تخلیقات پڑھنے کے لئے بے چین رہتا تھا۔ اسے نہ مدیر سے شکایت ہوتی تھی اور نہ ادیب و شاعر سے وہ کوئی گلا کرتا تھا۔ بس ادبی رسائل کا مطالعہ جزو زندگی تھا اور ممتاز اہل قلم کا احترام لازمۂ ادب۔

دوسری جنگ عظیم تک ادبی رسائل سے قاری کا رشتہ بڑا گہرا اور مستحکم تھا۔ عید نمبروں، دیوالی نمبروں، محرم نمبروں اور دوسرے خاص نمبروں کی کاپیاں ان بڑے شہروں میں جہاں سے یہ رسالے نکلتے تھے، مقامی طور پر ہزار بارہ سو فروخت ہو جایا کرتی تھیں۔ آج کئی شہروں میں مل کر بھی اتنی فروخت نہیں ہو پاتیں۔

اس دور میں "شاعر"، "ادبی دنیا" اور "ساقی" نے نئے لکھنے والوں کو تلاش کیا۔ اس آنے والی ادبی نسل کے بیشتر لوگ مغربی تعلیم پانے کے باوجود بنیادی طور پر مشرقی علوم سے جڑے ہوئے تھے۔ یہ جہاں مغرب سے آنے والی ادبی ہواؤں سے اپنی سانسوں کو سنوار رہے تھے، وہیں مشرقی مزاج سے بھی آشنا تھے۔ انھوں نے ادب و شعر کو ایک خوشگوار موڑ دیا اور مدیران رسائل نے انہیں اپنے یہاں جگہ دینے میں افتخار محسوس کیا۔ قارئین نے بھی ان میں گہری دلچسپی لی۔ اسلئے کہ ادیبوں اور شاعروں کا وہ قافلہ زبان و ادب کے تعمیری پہلوؤں کو سامنے رکھ کر آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے علم و فن سے رو گردانی نہیں کی تھی۔ زبان کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ بلکہ نئے موضوعات و اسالیب پیدا کر کے ادب و شعر کو زندگی سے اور زیادہ قریب کیا تھا۔ اس دور کے بعد وہ دور آیا، جب رسائل کی نہایت، لکھنے والوں کی کثرت اور پڑھنے والوں کی سخت قلت ہو گئی۔ ادب میں بے ادبی آگئی اور فکر و فن میں انتشار پیدا ہو گیا۔

آج کے ادبی رسائل کے لئے مندرجہ ذیل باتیں اہم مسئلہ بنی ہوئی ہیں۔

۱۔ ادبی رسائل کا سرکلیشن

۲۔ ادبی رسائل کا معیار

۳۔ ادبی رسائل کے قاری

اردو کے ادبی رسالے عام طور پر ہزار، دو ہزار کی تعداد اشاعت سے آگے نہیں بڑھتے۔ بعض رسالوں کا سرکلیشن تو اتنا کم ہے کہ اسے ظاہر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ تین چار ہزار کی تعداد میں چھپنے والے رسالے مشکل سے ایک دو ہی ہوں گے۔ سبھی ادبی رسالے پُر زور اپیلیں کرتے رہتے ہیں مگر ان کا سرکلیشن نہیں بڑھتا اور نتیجہ

یہ نکال لیا جاتا ہے کہ ادب کے پڑھنے والوں کا قحط ہے۔ مگر یہ پوری سچائی نہیں، البتہ آدھی خود فریبی ضرور ہے۔

ہمارا کوئی رسالہ ایسا نہیں ہے، جسے صحیح معنوں میں ادبی ماہنامہ کہا جاسکے۔ معیار لکھنے والوں سے بنتا ہے۔ چونکہ ادبی رسائل بڑے ادیبوں اور شاعروں کو معاوضہ نہیں دے سکتے، اس لئے وہ تازہ معیاری تخلیقات سے محروم رہتے ہیں۔ کوئی مُدیر اپنے اثر و رسوخ سے ہر شمارہ کے لئے چند بڑے ادیبوں کی تخلیقات حاصل کرلے تو یہ ایک الگ بات ہے۔ پھر بھی اُسے رسالہ کا پیٹ بھرنے کے لئے بڑی تعداد میں دوسرے اور تیسرے درجہ کی تخلیقات شامل کرنا پڑتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معیار میں یکسانیت پیدا نہیں ہو پاتی اور عدم یکسانیت اس اُردو قاری کو گراں گذرتی ہے جو کالجوں میں میرؔ، غالبؔ، مومنؔ حالیؔ، شبلیؔ، سرسیدؔ، اقبالؔ، حسرتؔ، سیمابؔ، فانیؔ، جوشؔ، نیازؔ فتحپوری، ایڈیٹر مجنوںؔ گورکھپوری اور رشید احمد صدیقی وغیرہ کو پڑھ کر آیا ہے۔ ادبی رسالے پڑھنے والوں میں غالب اکثریت ان ہی تعلیم یافتہ لوگوں کی ہے۔ جو پچیس سے چالیس سال تک کی عمر کے ہیں۔

نظم و نثر کی تخلیقات کا انتخاب مُدیر کے لئے ایک زبردست دردِ سر ہے۔ اس کا بیشتر وقت اسی کی نذر ہو جاتا ہے۔ وہ رسالہ کے سلسلے میں اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتا۔ معتبر اہلِ قلم کی تخلیقات کے علاوہ اُسے جو مواد موصول ہوتا ہے وہ نوّے فیصد غیر معیاری ہوتا ہے۔ سو افسانوں میں سے دس۔ دو تین سو نظموں غزلوں میں سے پچیس تیس اور چالیس پچاس مضامین میں سے سات آٹھ معیاری ہوں تو اندازہ لگائیے کہ مُدیر کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ ایک اوسط درجہ کا افسانے اور مضمون کو پڑھنے میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ صرف ہوتا ہے۔ بڑی تعداد میں آئی ہوئی تخلیقات کو پڑھنا، غیر معیاری تخلیقات کو واپس کرنا اور لکھنے والوں کی برہمی کو برداشت کرتے ہوئے۔ انھیں مطمئن کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا کوئی حل نہیں۔ آج چونکہ قلم کاری عام ہے اور کچی تحریروں کی اشاعت کی آرزو تیز، اس لئے رسالے اور قلم کار کے مابین کوئی مفاہمتی رشتہ قائم نہیں ہوتا، ایک کش مکش سے دونوں کو گذرنا پڑتا ہے۔ پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ادیب و شاعر اپنی وہی تخلیقات اشاعت کے لئے بھیجتے تھے جو معیارِ ادب پر پوری اُتر سکیں۔ ہر ادیب و شاعر اپنی ذمہ داری محسوس کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کیا "چھپنے" کے قابل ہے اور کیا چھپانے کے لائق۔

اِسی سلسلے کا ایک اور مسئلہ چھپی تخلیقات اور مطبوعہ مضامین نثر و نظم کا ہے۔ بعض تخلیقات ایک رسالہ کے دفتر سے کئی رسالوں کے دفاتر تک گھومتی رہتی ہیں۔ بعض تخلیقات کے متعلق جب یہ علم ہوتا ہے کہ وہ مطبوعہ تھیں اور اُن کے شائع ہونے کے بعد قارئین کی شکایتوں کے جو دفتر کھلتے ہیں۔ ان سے اور بھی افسوس ہوتا ہے۔

مُدیر کے مسائل میں ایک بڑا مسئلہ کتابت کا بھی ہے۔ تعلیم یافتہ اور اصول کتابت سے اچھی طرح واقف کاتب مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ اگر خوش قسمتی سے مل جائیں تو اُن کی ناز برداری آسان نہیں۔ عموماً کتابت کی ایسی بھیانک اور اتنی زیادہ غلطیاں ہوتی ہیں کہ انھیں بنواتے بنواتے جان پر بن جاتی ہے۔ مگر غلطیاں پھر بھی رہ جاتی ہیں: "ڈلیش کی جگہ "کاما" اور "کاما" کی جگہ "ڈلیش"۔ غلط جوڑ، بڑے چھوٹے دوائر، مرکب اور مفرد الفاظ قاعدہ لکھا جانا، نوک پلک کا پیدا ہونا تو عام بات ہے۔ بعض قلم کاروں کے مسوّدات بھی اتنے شکستہ لکھے ہوئے ہوتے ہیں کہ کاتب تو کاتب خود مُدیر کو پڑھنا دشوار ہوتا ہے۔ دوسری زبانوں میں ٹائپ کا رواج ہے اور اکثر قلم کار ٹائپ شدہ مسودے بھیجتے ہیں۔ پہلے پریسوں میں کام کم تھا۔ ہر پریس میں ایک "مصلح سنگ" ہوتا تھا جو پتھر بنانے اور معکوس لکھنے میں ماہر ہوتا تھا۔ اب پریسوں میں کام کی بھرمار ہوتی ہے۔ رسائل تو کیا کتابوں تک کے پروف نہیں ملتے۔ غلطیاں دُور ہوں تو کیسے؟

ادبی رسائل کے قارئین میں بڑی تعداد خود ادیبوں اور شاعروں کی ہوتی ہے۔ اِن میں سے بیشتر کو اعزازی طور پر رسالہ بھیجا جاتا ہے اور وہ اس کے مستحق بھی ہیں۔ مستقل قلمی معاونین کو معاوضہ نہ دیا جاسکے تو کم از کم رسالہ تو پہنچنا چاہیئے۔ بعض قلم کار اتنے دردمند ہوتے ہیں کہ وہ نذرِ رسالہ نہ بھی ادا کرتے ہیں اور اپنی تخلیقات بھی بھیجتے ہیں۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو مانگ کر رسالہ پڑھتا ہے اور تیسرا طبقہ ہماری درس گاہوں کے طلبہ اور اساتذہ کا ہے۔ مگر ان کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اُردو تعلیم کم سے کم ہوتی جارہی ہے۔ اُردو مادری زبان والے طلبہ کالجوں میں ٹیکنیکل مضامین لے لیتے ہیں، اس لئے انہیں ادب سے وہ دلچسپی نہیں ہوسکتی جو ہونی چاہیئے۔ وہ فلمی گیتوں اور فلمی رسالوں سے وقتی طور پر دل بہلا لیتے ہیں۔ رہا اُردو عوام میں ادبی رسائل کی مقبولیت کا سوال تو اس پر آج تک کسی نے سوچنے کی زحمت ہی نہیں کی۔ ادبی رسالے ہیئت و مواد میں اتنے یکساں ہوتے ہیں کہ اگر ایک کا سرورق دوسرے پر لگا دیا جائے تو فرق کرنا مشکل ہو جائے۔ ادبی رسائل کی ناکامی اور سکڑتے ہوئے حلقۂ قارئین میں ان محدود نظریات و وسائل کو بھی دخل ہے، جن میں ہمارے رسالے جکڑے ہوئے ہیں۔ سچائی یہ ہے کہ ادبی رسائل وقت کے تقاضوں کو پُورا کرنے میں سخت ناکام ہیں۔ اُردو میں وہ ادب پیدا نہیں ہو رہا ہے جو دوسری زبانیں پیدا کر رہی ہیں۔ اس میں موضوعاتی تنوّع کا سخت فقدان ہے۔ یہ مسئلہ مدیرانِ رسائل اور قلم کار، دونوں کے سوچنے کا ہے۔

عابد سہیل

ماہنامہ "کتاب" کپور مارکیٹ، لکھنؤ-۳

اُردو کے ادبی رسائل کو مُدیر نصیب ہی کہاں ہیں؟ کسی بھی ادبی جریدے کو لیجئے آپ کو کوئی ایسا مدیر نہیں ملے گا جو سرکولیشن، کتابت، طباعت، پروف ریڈنگ، سرورق کے ڈیزائن اور حد یہ ہے کہ رسالہ سپرد ڈاک کئے جانے کے مراحل تک کی ذمہ داریوں سے بے نیاز رہ سکتا ہو۔ ایک ہی شخص کے سر اتنی بہت سی ذمہ داریاں اگر ڈال دی جائیں یا پڑ جائیں تو ظاہر ہے کہ وہ ان میں سے کسی سے بھی پوری طرح عہدہ برآ نہ ہو سکے گا۔

جب صورت حال یہ ہو تو اس بات کا اندازہ لگانا کوئی مشکل بات نہیں کہ یہ نام نہاد مدیر رسالہ کے معیار کو برقرار رکھنے، اسے نئے ادبی رجحانات کا مزاج شناس بنانے، غلط رجحانات کی نشاندہی کرنے اور نئے لکھنے والوں کی مناسب ہمت افزائی کرنے کے لئے واقعی وہ سب کچھ کس حد تک کر پاتے ہوں گے جس کی ان سے توقع کی جاتی ہیں۔ اگر لشٹم پشٹم کوئی رسالہ زندگی کی آٹھ دس بہاریں دیکھ چکا ہے اور اسے زیادہ بہتر جرائد کی عدم موجودگی کے سبب اچھی خاصی شہرت مل چکی ہے تو تخلیقات کے لئے بیشتر صورتوں میں کوئی خاص پریشانی نہیں ہوتی۔ ان میں ایک آدھ قدر اوّل کی ہوتی ہیں باقی دوسرے اور تیسرے درجے کی اور ان کی آمیزش سے ایک ایسا معجون مرکب تیار ہو جاتا ہے جس میں کچھ پرانے اور مشہور نام ہوتے ہیں کچھ نئے لیکن مشہور، کچھ بالکل نئے، کچھ تجربہ، کچھ تجربہ کے نام پر نقلیں، کچھ روایات، کچھ کھوٹا کچھ کھرا۔ چلئے اللہ اللہ خیر صلّا۔ تازہ شمارہ تیار ہو گیا۔

لیکن کیا کسی ادبی جریدے کے مدیر کا کام یہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح ہر ماہ ایک شمارہ تیار کر دے؟ نئے ادیبوں کی ہمت افزائی اور ان کی کوتاہیوں اور خامیوں پر ہمدردانہ طریقہ سے غور کرنے کی صلاحیت اور پرانے اور مشہور لکھنے والوں کی خراب چیزوں کو واپس کرنے کی جرأت اگر کسی شخص میں نہیں تو وہ ممکن ہے کسی اور شعبہ میں کامیاب ہو جائے لیکن اچھا مُدیر ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہمارے یہاں کے بیشتر ادبی جرائد کچھ اس طرح کے ہیں کہ اگر ٹائٹل، فہرست و اداریہ کے صفحات اور پیشانی جہاں عام طور پر رسالہ کا نام لکھا ہوتا ہے الگ کر دیئے جائیں اور انھیں ملا دیا جائے تو ایک رسالہ کو دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ کاتب کی شانِ خط سے کوئی پہچان لے تو بات دوسری ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس کا سبب یہی ہے کہ ہمارے ادبی جرائد کو مُدیر نصیب ہی نہیں۔

ہمارے ادبی جرائد کو بعض چیزیں ورثہ میں ملی ہیں مثلاً یہ کہ وہ جتنا خشک، خراب کتابت، طباعت اور غیر جمالیاتی سرورق سے مزین ہو اسی قدر معیاری ہے کہ حسن اور نفاست کا، ادبی جرائد کی حد تک، ایک دوسرے سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ چھ سات افسانے، دو تین تنقیدی مضامین، پندرہ بیس نظمیں، غزلیں، کچھ تبصرے کچھ خطوط جن میں مُدیر کی تعریف زیادہ ہوتی ہے اور پچھلے شمارہ میں شائع شدہ تخلیقات کے حُسن و قبح سے بحث کم، یہ ہوتی ہے کل کائنات ہمارے ادبی جرائد کی۔ سائنس، نفسیات، فلسفہ، معاشیات، سماجیات اور دوسرے علوم (DISCIPLINE) کو ان جرائد نے اپنے اُوپر حرام قرار دے رکھا ہے۔ آرٹ کے نام پر ایک آدھ پینٹنگ کسی ادبی جریدے میں شائع بھی ہو جاتی ہے لیکن عام طور پر صرف اس صورت میں کہ بلاک مفت مل جائے۔ کسی عمدہ فلم پر، چاہے وہ فنی شہپارہ ہی کیوں نہ ہو، تبصرہ۔ توبہ کیجئے۔ ادبی جریدہ نہ ہوا فلم فیر ہو گیا۔ روس سے لے کر امریکا تک کے کسی بھی ادبی جریدہ کو اٹھا لیجئے۔ آرٹ، رقص، موسیقی، سینما پر نہ صرف مضامین اور سیمینار ملیں گے بلکہ درجن درجن بھر تصاویر تک، چھپائی ایسی خوب صورت ہوگی کہ کاؤنٹر پر نظر پڑ جائے تو آپ خریدے بغیر وہاں سے نہ ہٹیں۔ لیکن اُردو کے ادبی رسائل کی دنیا ہی نرالی ہے۔

ہم یہ تو جانتے ہیں کہ وہ طبقہ اشراف ختم ہو گیا جو کبھی کبھی واقعی علم دوستی اور پیشہ کے نام و نمود کے لئے علم و ادب کی سرپرستی کرتا تھا اور نئے معاشی رشتوں اور حقیقتوں نے پڑھے لکھے لوگوں کے ایک بڑے حصے کو اس قابل نہیں رکھا ہے کہ وہ ادب، فلم، علوم اور دوسرے فنونِ لطیفہ کے الگ الگ رسالے خرید سکیں۔ لیکن ہم نے اس صورت حال کے مضمرات پر اب تک غور نہیں کیا ہے۔

ہم نے مسئلہ کو اس نقطہ نظر سے بھی نہیں دیکھا ہے کہ نہ صرف مختلف علوم کا تعلق ادب سے روز بروز بڑھتا جا رہا ہے بلکہ مختلف علوم خود بھی ایک دوسرے کو (OVERLAP) کرنے لگے ہیں نفسیات کا مطالعہ سماجیات کے بغیر ممکن نہیں، معاشیات کو خریدار کی نفسیات کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا اور کوئی ادب

نوٹ: یہ بات کم از کم "آج کل" کے لئے نہیں کہی جا سکتی جو ہر شمارے میں ایک خاص موضوع پر خصوصی مضامین شائع کرتا ہے۔ اور اس طرح سائنس، اقتصادیات، ادب، زبان، کلچر، سیاحت وغیرہ کے موضوع پر مضامین شائع کر چکا ہے۔ (ادارہ)

اپنے وقت کے سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی محرکات سے بے نیاز نہیں رہ سکتا ادبی جریدہ کے مدیر کو اتنی سی بات سمجھنے کے لئے۔ روس کو چھوڑیئے۔ امریکا برطانیہ اور CONTINENT کے پچھلے تین سو برس کے فلسفیانہ افکار، جمالیات، لسانیات، نفسیات کی کم از کم اہم تحریکوں اور تحریروں پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ کارل مارکس، فرائڈ یونگ، ایڈلر، سارتر یا کرکے گارڈ وٹگنسٹائن، وجودیت Picture theory of meaning اور Theory of Verification کا ذکر ادبی مضامین میں کبھی کبھی مانگے کے اجالے کی طرح ضرور آجاتا ہے لیکن سچ پوچھیئے تو ہمارے یہاں ان سب کو پڑھا کتنوں نے ہے۔ آج کے زمانے میں ان سب تحریکوں اور نقطہ ہائے نظر سے واقفیت نہ ہونے کے باوجود ممکن ہے کوئی شاعر اور ادیب اپنا حق ادا کردے اور داد سخن بھی پالے لیکن ۱۹۷۳ء میں کوئی مدیر اُن سے بے بہرہ رہ کر ادارت کے فرائض ایمانداری سے انجام نہیں دے سکتا۔

فرانس نے دیوقامت شاعر پیدا کئے ہیں ہم ان کی تخلیقات کے تراجم بھی برابر شائع کرتے ہیں لیکن کسی ادبی جریدے کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ وہ چند سال قبل فرانس کے ناکام انقلاب کے دوران کی جانے والی ان بے نام شاعروں کی تخلیقات کا ترجمہ پیش کرتا جو پیرس کے مکانوں اور تعلیمی اداروں کی دیواروں پر رات کی تاریکی میں لکھ دی جاتی تھیں۔ کیا اس شاعری کا دنیا کی شعری روایت سے کوئی تعلق نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ شاعری ہماری شعری روایت کا حصہ نہ بن سکے لیکن یہ ہماری شعری دنیا کے کسی گوشے کو روشن اور منور تو کرسکتی تھی۔

اب ایک اور مسئلہ کی طرف آیئے۔ مدیر اپنے رسالہ میں کس طرح کی تخلیقات شائع کرے؟ آج شاید ہی کوئی ایسا ہو جو ادب اور زبان کے جامد تصور کو تسلیم کرتا ہو۔ ادب کے معیار بھی بدلتے ہیں، ادبی اقدار بھی اور زبان بھی زبان سیاسی حالات، سماجی اور معاشی رشتوں سے بھی متاثر ہوتی ہے اور اپنے اندرونی تضاد سے بھی۔ یہی حال ادب کا بھی ہوتا ہے۔ زبان و ادب کے اس بدلتے ہوئے پس منظر میں کسی تخلیق کے بارے میں فیصلہ کرنا شاید سب سے مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ زبان و ادب کے معیار میں تبدیلی کا تصور شاید معیار کے تصور کے بغیر ممکن نہیں لیکن تجربے، جزوی طور پر ہی سہی، معیار کو پامال کئے بغیر نہیں کئے جاسکتے۔ اور کونسا تجربہ ایسا ہے جس پر وقت قبولیت کی مہر ثبت کردیگا اور کسے پامال کرکے آگے گذر جائے گا؟ ظاہر ہے ہر مدیر نہ تو ہر ایسی بجلی کو جس کے جیب و داماں پر اپنی بجلیوں سے یکسر خالی ہوں یہ کہہ قبول کرسکتا ہے کہ ہم فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں، فیصلہ تو وقت کریگا اور نہ ہر تجربہ کو زبان و ادب کے بنے بنائے سانچوں سے ناپ کر رد ہی کرسکتا ہے۔ یہ منزل کسی بھی مدیر کے لئے سب سے کٹھن ہوتی ہے۔ لیکن اگر مدیر کو وقت کی چاپ کا عرفان اور اس بات کی آگہی ہے کہ زبان سے آگے جانے کا راستہ زبان ہی سے ہوکر گذرتا ہے تو شاید وہ اس پل صراط سے آسانی سے گذر جائے۔

ادبی جرائد کے بیشتر مسائل رسالہ کی معاشی حالت سے جڑے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی رسالہ ایک باتنخواہ مدیر کے علاوہ کم از کم دو کارکنوں کا بوجھ اٹھا سکے تو ظاہر ہے مدیر متعدد دوسرے متعلقہ کاموں سے بے نیاز ہوکر اپنی ادارتی ذمہ داریاں یکسوئی سے پوری کرسکے گا۔ لیکن ہمارے یہاں حالت یہ ہے کہ بیشتر ادبی جرائد خسارہ کا سودا ہیں اور چند سرپھروں کے شوق فضول سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ ویسے مسئلہ کا ایک پہلو یہ بھی ذرا گر یہ رسائل متعلقین رسالہ کا ذریعہ معاش بھی ہوتے تو شاید یہ حالت نہ ہوتی۔

اب دو لطیفے سنیئے:۔

تقریباً دو سال ادھر ایک صاحب کی شعری تخلیق کتاب میں شائع ہونا تھی کہ تعریفی خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ ان میں دو تین خطوط میں تخلیق کو مقابلتاً بعد میں جگہ دینے کی شکایت کی گئی تھی اور ایک خط میں ٹائیٹل پر شاعر کا نام نہ ہونے کا شکوہ بھی تھا۔ دو ایک دن بعد ایک نئے مقابلتاً معروف شاعر کا خط آیا کہ یہ غزل زیادہ بہتر Treatment کی مستحق تھی۔ کم سے کم اسے پورے صفحہ پر شائع کیا جانا چاہیے تھا۔ یہ خط تلخ، تند، شیریں کے صفحات پر اشاعت کیلئے فوراً ہی کاتب کے حوالہ کردیا گیا۔ دوسری ڈاک سے انہی صاحب کا دوسرا خط موصول ہوا۔ خدارا وہ خط شائع نہ کریں۔ موصوف نے یہ خط اپنے سامنے بیٹھ کر لکھوایا تھا۔ میں انکار نہ کرسکا۔ اگر چھپ گیا تو میری بڑی سبکی ہوگی۔

دوسرا واقعہ بالکل حالیہ ہے۔ ایک صاحب نے اپنی چند غزلیں بھیجیں اور اس کے ساتھ یہ بھی پیشکش کی کہ اگر ان کی کوئی شعری یا نثری تخلیق ہر ماہ رسالہ شائع کرنے کے لئے تیار ہو تو وہ ہر مہینہ رسالہ کو تین روپے پیش کیا کریں گے۔

یہ دونوں اور اس طرح کے دوسرے واقعات محض لطیفے نہیں ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس طرح کے واقعات کیوں پیش آتے ہیں؟ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو ادب کی دنیا روز بروز سکڑ رہی ہے۔ ادبی جریدے خریدنے والے زیادہ تر یا تو آج کے ادیب ہیں یا کل کے ہونے والے ادیب۔ بساط کے اس اختصار کی ذمہ داری مدیران جرائد پر بھی کچھ کم نہیں ہم نے اپنے رسالوں کو ایسا بنا رکھا ہے کہ عام پڑھا لکھا شخص ان میں کوئی دلچسپی نہیں پاتا۔ کیا کوئی ایسی صورت نہیں کہ ادبی رسائل کم از کم پانچ چھ ہزار کی تعداد میں شائع ہوں اور کم سے کم بیس پچیس ہزار لوگوں کی نظروں سے ہر جریدہ ہر ماہ گذرے؟

الٰہی یہ بساط رقص اور بھی بسیط ہو صدائے تیشہ کامراں ہو کوہکن کی جیت ہو

محمد یوسف ٹینگ
مدیر "شیرازہ" کلچرل اکاڈمی، شہید گنج
سری نگر

ایک مدیر کی حیثیت سے جب میں اپنے مسائل کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے کسی گرہستن کی یاد آجاتی ہے۔ بھات بھاجی میں ذائقہ ہو اور وہ اچھے بنے ہوں، تو گھر والی کو اس کی داد دینا فضول ہی نہیں بلکہ غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اگر کہیں سالن میں ذرا بھی مرچ مسالے کی کمی بیشی رہی تو سارے گھر میں مہا بھارت چھڑ جاتی ہے۔ ایک مدیر کو بھی اپنے معاملات میں اس قسم کے تجربات سے آئے دن گذرنا پڑتا ہے۔

مدیر کے مسائل کے دو موٹے موٹے عنوانات ہیں۔ پہلے عنوان کا تعلق رسالے کے ظاہری رنگ روپ اور شکل و شباہت سے اور دوسرے کا مدیر اور اس کے قارئین کے باہمی رشتے سے، جو کبھی رفیقانہ ہوتا ہے اور کبھی حریفانہ۔

مدیر کو نہ صرف اپنے قارئین کو اپنے ذوقِ نظر کے قریب لانے کی سعی کرنا پڑتی ہے بلکہ ان کا مذاق اور جمالیاتی حس خود اسے بھی متاثر کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اخذ و قبول کا یہ سلسلہ اثباتی بھی ہو سکتا ہے۔ اور منفی بھی۔ اور یہ کبھی خطِ مستقیم میں سفر نہیں کرتا۔ میں تجارتی رسالوں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ لیکن ادبی رسالوں کو لیجئے۔ "مخزن" "نگار" "نقوش" وغیرہ سے لے کر سردار جعفری کے "گفتگو" اور فاروقی کے "شب خون" تک مدیر کو اسی خاص مسئلے سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

"نیرنگِ خیال" تو ایک سرکاری رسالہ تھا اور اس طرح اس کی تعمیر میں کچھ مجبوریاں مضمر تھیں۔ لیکن میری ادارتی کدوکاوش نے مجھے جلد ہی یہ بات سمجھا دی کہ ان حدود میں حسبِ ضرورت لچک آسکتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی بہرحال رسالے کی سرکاری حیثیت اور تخلیقی ادب کے کج کلاہانہ مزاج میں تصادم ناگزیر ہے۔ اور مدیر کی حالت اس وقت بالکل اس مصرعے کے مانند ہو جاتی تھی۔ ع "ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے، ادھر تقاضائے وردِ دل ہے"

مدیر کیلئے آزمائش کا موقع وہ ہوتا ہے جب اس کی ذاتی پسند عام ڈگر سے ہٹ کر نیا راستہ اختیار کرے۔ ہندوستان میں اردو کی ادبی صحافت کی بدنصیبی یہ ہے کہ اس کا مقابلہ نہایت ارزاں قسم کی تجارتی اور فلمی صحافت سے ہے۔ ہر مدیر کی یہ بڑی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا رسالہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے اور داد پائے۔ لیکن جب وہ رسالے کو خالص تحقیقی اور ادبی معیاروں پر نکالتا ہے تو اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ رسالہ غیر مقبول بن گیا ہے۔ اور اس کا حلقۂ اشاعت کتنا محدود رہ گیا ہے۔ ظ۔ انصاری کے "آئینہ" کی مثال سامنے ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اردو کا حلقہ بدقسمتی سے سکڑتا جا رہا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اردو رسالہ خریدنے کے لئے بہت کم لوگ مائل ہوتے ہیں۔ جب مدیر کو معلوم ہو کہ اس کا رسالہ صرف چند مفت خوروں کے پاس جاتا ہے، تو وہ رسالے کے تخلیقی کردار سے مایوس ہو کر اس کو محض رسماً جاری رکھتا ہے۔ یہ کیفیت رسالے کے بکنے والوں تک بھی پہونچ جاتی ہے۔ وہ چند پیسے کمانے کے لئے کالم پُر تو کرتے ہیں لیکن "دل و جان کی بیزبانی" کے لئے کسی ایسے رسالے کا دسترخوان چن لیتے ہیں جو بھلے ہی کچھ روپے نہ دے سکے مگر جو واقعی قارئین میں شوق اور ذوق سے پڑھا جاتا ہو۔

مدیر کے مسئلے کا یہ پہلو بھی کچھ کم افسوسناک نہیں ہے کہ اس کے پاس آنے والی تخلیقات کا ستر فی صدی ایسی منظومات پر مشتمل ہوتا ہے، جو نہایت فرسودہ لب و لہجے اور مزاج کی ہوتی ہیں۔ اس قسم کی منظومات کی فراوانی یہ ظاہر کرتی ہے کہ کچھ محترم اور معزز مستثنیات کے بغیر ابھی اردو میں جاگیردارانہ دور کی ذہنیت بدستور حاوی ہے۔ ہمیں اردو کے عام قاری اور لکھنے والے کو جواں مردی، بغاوت اور کفر کے کچھ آداب سکھانے ہوں گے۔

اردو رسالے کے مدیر کو ملنے والے مضامین کے بارے میں جتنا کم کہا جائے اتنا اچھا ہے۔ عام طور پر مدیر کو مضامین موسم کے مطابق ملتے ہیں یعنی اگر کسی بڑے آدمی کا انتقال ہو گیا، تو اس کے کھانے پینے، معاشقوں اور اس کے کارناموں پر ہر ایک پہلو کے بارے میں مضامین ملنا شروع ہو جائیں گے۔ جن میں کسی قسم کی طبع زاد جودت کا سُراغ دُور دُور تک نہیں ملتا۔

اردو چونکہ بہت دنوں تک درباروں کے سائے میں پروان چڑھی اور پناہ گزیں رہی ہے۔ اس لئے میرے خیال میں اس کی ذہنی بساط پر سچی جمہوریت کا عرفان پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ چنانچہ جب مضمون نگار حضرات کی توجہ ان کوتاہیوں کی طرف دلائی جاتی ہے تو وہ رسالے اور مدیر دونوں سے برہم ہو جاتے ہیں۔

اردو رسایل کی ایک بڑی محرومی یہ بھی ہے کہ انھیں اپنے ان بزرگ اور سربرآوردہ ترین لکھنے والوں کا تعاون بہت کم حاصل ہوتا ہے۔ جنھوں نے اردو میں لکھ کر شہرت پائی اور اپنے ساتھ اردو کے تن و قامت کو بھی بلند کیا۔ یہ بزرگ ادیب اپنی زبان کے کیف و کم کے ساتھ شمولیت کر کے اس کے مصائب کو کم کر سکنے کا باعث بن سکتے تھے مگر اس کے برعکس انھوں نے اپنے پسینے میں غرق ہونے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ہمارے کچھ اور چوٹی کے ادیبوں اور خاص طور پر نقاد حضرات کی ایک صف ایسی ہے جنھوں نے ماضی میں چند مضامین لکھ کر اُفقِ ادب

پر قبضہ تو کر لیا ہے لیکن اب کمیٹیوں، کمیشنوں اور بورڈوں کی غیر تخلیقی فضاؤں میں نظر بند ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ ادیب لکھنا تو درکنار، خطوط کا جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کر سکتے۔ البتہ کرم فرمائی کا بھرم قائم رکھنے کے لئے مجموعوں اور کلیات کے لئے پیش لفظ ضرور لکھتے ہیں۔

آج سے تیس چالیس سال پہلے ذہنی اور فکری انقلابات میں وہ تیزی نہ تھی جیسی آج کے زمانے میں ہے۔ ایک رسالے کے مدیر کو اس فکری تبدیلی سے واقف ہی نہیں رہنا پڑتا بلکہ اپنے رسالے کو اس کے ساتھ ہم آہنگ بنانے کے لئے بھی مستعد رہنا پڑتا ہے۔ لیکن اس میں ایک بھاری رکاوٹ جو سامنے آتی ہے۔ وہ رسالے کا مزاج ہوتا ہے جو مسلسل روایت سے تشکیل پاتا ہے۔ جب مدیر اپنے رسالے کو جدید رجحانات کی پٹڑیوں سے جوڑنا چاہتا ہے تو اس کے حلقۂ قارئین کو ذوق کی سطح پر جھٹکے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ایک زندہ رسالے کو نہ صرف یہ کام کرنا پڑتا ہے بلکہ قارئین کے زیادہ سے زیادہ حصے کو نئی تحریک کا مزاج آشنا بنانے کے لئے طرح طرح کی ترغیبات کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے۔

مدیر کے مسائل کا ایک اور رخ رسالے کی ظاہری شکل و صورت سے وابستہ ہوتا ہے۔ اردو میں ابھی ٹائپ کا رواج نہیں ہے اور آفسیٹ کی سہولت بھی بہت کم خوش نصیبوں کو حاصل ہے۔ ان حالات میں خوشنویسی کے مسائل جو مشکلات کھڑی کر دیتے ہیں اس کا اندازہ مدیر بنے بغیر شاید کیا ہی نہیں جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خوشنویسی ایک فن کی حیثیت سے دم توڑ چکی ہے۔ اور کشمیر جیسے مقام میں جو کبھی محمد حسین زرین رقم، محمد مراد شیریں رقم جیسے سرخیل خوشنویسوں کا مامن تھا۔ اب ایسے کاتب ملتے ہیں جو یہ کام محض اس لئے کرتے ہیں کہ ان کو کوئی دوسری ملازمت نہیں ملی۔

اردو کے رسالے کا مدیر آج کے زمانے میں ایک خاصی سہمی ہوئی آشفتہ خاطر شخصیت ہے۔ اس زبان کے مسائل نے زمانے کے دوسرے آشوبات کے ساتھ مل کر اسے آزمائش کے صحرا میں کھڑا کر دیا ہے۔ اور اگر اس ابتلاء میں کوئی چیز اسے پیش قدمی پر آمادہ رکھ سکتی ہے۔ تو وہ اس کی ذاتی لگن ہے۔

مالک رام
مدیر "تحریر" سی ۳۹۶، ڈیفنس کالونی۔
نئی دہلی

میں پچھلے چھ سات برس سے تماہی "تحریر" شائع کر رہا ہوں۔ لیکن "تحریر" عام پرچوں سے کچھ مختلف ہے۔ یہ خالص علمی اور تحقیقی پرچہ ہے؛ اس میں ادبی مضامین افسانے، نظمیں، غزلیں شائع نہیں ہوتیں ظاہر ہے اس پابندی کے باعث ہمیں بعض مشکلات اور مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ انھیں میں سے چند کا بیان یہاں مقصود ہے۔

سب سے پہلی مشکل تو یہی ہے کہ تحقیقی اور علمی مضمون لکھنے والے نہیں ملتے۔ میں نے پہلے دن ایک اصول بنا لیا تھا کہ مضمون ہر کسی سے طلب نہیں کروں گا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر کسی صاحب نے میری درخواست پر مضمون لکھا اور وہ ہمارے معیار سے کمتر ہوا، تو دشواری پیدا ہوگی۔ نہ اسے چھاپ سکوں گا، نہ واپس کرنے کا موقع رہے گا کیونکہ ان کے ناراض ہو جانے کا قوی اندیشہ ہوگا۔ لہٰذا میں نے محض ان اصحاب سے مضمون کی درخواست کی تھی جن کی اہلیت اور علمی روایت کا مجھے علم اور یقین تھا۔ اس سے فایدہ یہ ہوا کہ ہمیں کسی موقع پر محض مروت کے مارے کوئی مضمون شائع نہیں کرنا پڑا۔ ایک آدھ مضمون کی قسم نہیں کھاتا جو نہ چھپتا، تو بہتر تھا۔ لیکن بالعموم ہمارا معیار بلند رہا ہے۔ اور اب تو عام طور پر ہمارے لکھنے والوں کو (اور پڑھنے والوں کو بھی) اعتراف ہے کہ ہمارا علمی معیار قابلِ اطمینان ہے۔

اس سے یہ نہ خیال کیا جائے کہ تحریر کے تمام مضمون بلند پایہ ہیں، یا میں انھیں اس موضوع پر حرفِ آخر سمجھتا ہوں۔ حاشا، ایسی بات نہیں۔ حرفِ آخر تو کسی انسانی کوشش کیلئے بھی نہیں کہا جا سکتا، چہ جائیکہ علم اور تحقیق کے میدان میں جہاں آئے دن نئی معلومات منظرِ عام پر آتی رہتی ہیں۔ بے شک یہ واقعہ ہے کہ میں نے کبھی کبھی بعض ایسے مضمون بھی شامل اشاعت کئے ہیں۔ جو مکمل نہیں تھے۔ جن کی معلومات ناقص تھیں۔ یہ محض اس لئے ہوا کہ اس موضوع پر پہلے سے کوئی مواد موجود نہیں تھا۔ خیال ہوا کہ جتنا کچھ جمع ہو گیا ہے، اسے تو محفوظ کر دیا جائے۔ اس سے خود مضمون نگار کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ کہاں کھانچے رہ گئے ہیں اور وہ مزید معلومات مہیا کرنے کی کوشش کریگا۔ اور جن اصحاب کو اس موضوع سے دلچسپی ہے، انھیں یہ منتشر معلومات یکجا مل جائیں گی۔ اور اگر وہ چاہیں تو مزید کی فراہمی کا خود اہتمام کریں۔

بات اس سے چلی تھی کہ اردو میں علمی مضمون لکھنے والے بہت کم ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اردو میں لکھنے والے تحقیقی مضمون کیوں نہیں لکھتے؟ یا لکھتے ہیں، تو بالعموم وہ علمی معیار پر پورا کیوں نہیں اترتا؟

میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں، اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ آج تک شعر و شاعری کے دلفریب جال سے آزاد نہیں ہو سکے۔ ہر ایک موضوع کے لیے الگ زبان ہوتی ہے، الگ اسلوب اور طرزِ بیان؛ اس کی اپنی فضا ہوتی ہے۔ اگر اس نکتے کو مدنظر نہ رکھا جائے، تو مضمون عدمِ توازن کا شکار ہو جائے گا۔ بالکل وہی اعتراض اس پر بھی وارد ہوگا، جو غزل پر ہوتا ہے کہ اس کے اشعار میں تسلسل اور ربط مفقود ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمارے بیشتر مضمون نگار اچھا خاصا علمی اور سنجیدہ مضمون لکھتے لکھتے اسمیں شعر لکھنے لگتے ہیں، مرصع و مسجع و مقفی فقرے لے آتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہوائی باتوں اور انشا پردازی کے اتنے دلدادہ ہیں کہ کسی وقت تھوڑی دیر کیلئے بھی بالکل سنجیدہ نہیں رہ سکتے۔ ان کے لیے لطیفہ

مستعار لی سے اپنا دامن چھڑانا محال ہے۔ یا پھر یہ تسلیم کیا جائے کہ انھیں علم، تحقیق اور شعور و انشا کی فضا میسر نہیں جو فرق ہے اس کا تعین ابھی نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ مضمون نگار اپنے موضوع کے تمام ماخذ پر حاوی ہونے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہ بات اسے اس وقت تک نہ سوجھے جب تک اس کی تمام مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ لیکن یہ سوجھنا اور وہ سہل انگاری سے کام لیتا ہے۔ دونوں صورتیں افسوس ناک ہیں۔ مجھے کئی مرتبہ اس طرح کے مضمون مکمل کرنا پڑے ہیں۔ حوالے کی کمی تو اکثر دیکھنے میں آئی ہے اور یہ بھی سبب میری سمجھ میں یہ آیا ہے کہ مضمون نگار نے اصلی ماخذ نہیں دیکھا بلکہ اس نے وہ بات کسی اور مضنف کے ہاں دیکھی ہے اور وہ اسے پیش اس طرح سے کرتا ہے جیسے یہ خود اس کی اپنی تحقیق ہو۔ اسے دوسرے مصنف کا نام لکھنے یا اس کا حوالہ دینے میں عار محسوس ہوتی ہے۔ یہ بات جہاں تنگ نظری کی دلیل ہے وہیں اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ شخص صحیح معنوں میں محقق نہیں ہے۔ نہ وہ کبھی محقق بن سکتا ہے۔ اصلی محقق کبھی دوسرے کا جائز حق غصب نہیں کرتا! اگر وہ کسی سے استفادہ کرتا ہے، تو بے جھجک اس کا اعتراف کرتا ہے۔ اس کے برخلاف بعض مضمون نگاروں کی روش یہ ہے کہ وہ دوسرے مصنفوں سے لمبے لمبے اقتباسات نقل کرتے ہیں۔ یہ بھی غلط طریقہ ہے اور اکتا دینے والا۔ مضمون نگار اپنی تائید میں کسی بزرگ یا معاصر مصنف کا قول یا رائے پیش کرنا چاہے تو اس کا مافی الضمیر ایک آدھ فقرے میں بیان کر کے اس کا حوالہ دے سکتا ہے لیکن یہ بالکل نامناسب ہے کہ وہ اس سے طویل عبارت لے کر اسے اپنے مضمون کا حصہ بنا لے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خود اس موضوع کو ہضم نہیں کر سکا یا نفس مدعا کو اپنے لفظوں میں ادا کرنے سے قاصر ہے۔ بعض اوقات مجھے ایسے مضمونوں میں کانٹ چھانٹ کرنا پڑتی ہے اور احساس یہ ہوتا ہے کہ میں مضمون نگار سے انصاف نہیں کر رہا ہوں کیونکہ خدا معلوم وہ اس بات کو کس طرح سے کہتا۔

ایک اور مسئلہ نفس موضوع کا ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ اُردو رسائل میں موضوع کا تنوع بہت کم ملتا ہے۔ کسی قدیم شاعر کی تاریخ ولادت و وفات، کسی قدیم متن کی دریافت، ایک مصنف یا شاعر کا دوسرے سے استفادہ یا سرقہ۔ ہر پھر کے یہی تحقیق کے موضوع رہ گئے ہیں۔ دنیا میں ان کے علاوہ بھی موضوعات ہیں: تاریخ، جغرافیہ، لسانیات، عمرانیات، معاشیات، نفسیات، سیاسیات۔ غرض بیسیوں ایسے موضوع ہیں جن پر مغرب میں آئے دن نئی نئی تحقیق ہو رہی ہے، لیکن ان کے بارے میں اُردو میں برائے نام بھی کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اُردو ادب اور اس کی تاریخ کے علاوہ کچھ دوسرے عنوانوں پر بھی مضمون لکھواؤں، لیکن اس میں قابل قدر کامیابی نہیں ہوئی۔ مشکل سے دو چار مضمون ملے جو شائع ہو چکے ہیں لیکن ان سے بہت زیادہ کی ضرورت ہے ان میں سے چند مضمونوں کے عنوان یہ ہیں، اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ میرے نزدیک کس طرح کے عنوانوں کی ضرورت ہے: ڈوگری زبان، ایک نیا رسم الخط؛ قانون ابن سینا اور اس کی شرحیں، ہندستانی دفتر خانوں میں فارسی دستاویزیں، محکمۂ آثار قدیمہ۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی زبان کو ہر طرح کے علوم و فنون سے مالا مال کرنے کی پوری سعی کریں۔ جو اصحاب ان موضوعات پر لکھنے کی اہلیت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اس میں کوتاہی نہ کریں۔ اس سے جہاں ان کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوگا اور اس کا دامن وسیع ہوگا، وہیں نئے لکھنے والوں کی تربیت کا سامان بھی پیدا ہوگا۔

میں نے یہاں تا محض ان مسائل کا ذکر کیا ہے جو بحیثیت مدیر میرے سامنے آئے۔ لیکن آج اُردو کے رسائل و جرائد کے سامنے دو اور مسئلے ایسے ہیں جن کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ پہلا کاغذوں کی قلت کا ہے۔ چھاپہ اور زمہ دار کاغذ کی کمیابی سے بھی زیادہ مہنگا ہے۔ دوسری خریداروں کی کمی کا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے، گویا اُردو والے کتابوں اور رسالوں کو خرید کر پڑھنا فضول خرچی تصور کرتے ہیں۔ خدا خیر کرے، لیل و نہار اچھے نہیں۔

احمد سعید ملیح آبادی

مدیر روزنامہ "آزاد ہند" ۲۲ اے ساگر دت لین
کلکتہ

ایک روزانہ اخبار کے مدیر کے مسائل مختلف النوع ہوتے ہیں۔ اور اس کی بہت سی ذمہ داریاں اور پابندیاں ہوتی ہیں۔ پہلی پابندی تو وقت کی ہے۔ ریل اور ہوائی جہاز کی طرح اخبار لیٹ نہیں ہو سکتے۔ اخبار کو وقت پر نکلنا ہی چاہئے۔ اس کے لئے ایڈیٹر کو اور اس کے ساتھ اخبار کے پورے اسٹاف کو گھڑی کی سوئی کے ساتھ حرکت میں رہنا پڑتا ہے۔ اسی لئے ایڈیٹر کے وقت کو بہت قیمتی سمجھا جاتا ہے

اخبار چھپنے سے پہلے اور اس کے بعد، تن کی ذمہ داریاں ایڈیٹر سے دامن گیر رہتی ہیں۔ پورے اخبار میں جو کچھ چھپتا ہے۔ خبروں اور مضامین سے لے کر اشتہارات تک، سب کے لئے ایڈیٹر ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہ قانون کے سامنے بھی جواب دہ ہوتا ہے اور اپنے صحافتی پیشے کے ضابطۂ اخلاق کے سامنے بھی اور اپنے قارئین کے سامنے بھی۔

پبلک کی نظر میں ایڈیٹر کا تصور یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی ہر خبر سے واقف ہوتا ہے! کسی جگہ کوئی واقعہ پیش آجائے اور اخبار کے کالم میں وہ خبر جگہ نہ پا سکے تو اس علاقے کے لوگ بہت ناخوش ہوتے ہیں کہ آپ کیسے ایڈیٹر ہیں، ہماری طرف ایسی ایسی واردات ہو گئی اور آپ کو کچھ خبر ہی نہیں؟ انھیں کیا معلوم کہ ایڈیٹر کو علم غیب حاصل نہیں ہوتا۔ وہ بھی اپنے ذرائع معلومات کا محتاج ہوتا ہے۔

ایڈیٹر، اپنے قارئین کے ذہن کا معلم ہوتا ہے۔ وہ رائے عامہ بنانے والا

سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ وہ ذہنوں کی تعمیر کرتا ہے۔ اسلئے ایڈیٹر کی ذمہ داریاں بہت بڑی اور نازک ہوتی ہیں۔ ایڈیٹر، ایک فکر اور نظریہ بناتا اور پھیلاتا ہے کوئی قاری یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ شعوری یا لاشعوری طور پر ایڈیٹر کے افکار وخیالات اور پالیسی سے متاثر نہیں ہوا۔ یہ تاثر، ہمیشہ ایڈیٹوریل ہی کے ذریعہ نہیں ہوتا۔ دوسرے مضامین اور خبروں کی تراش خراش اور کتر بیونت سے بھی ہوتا ہے۔ خبریں کس ڈھنگ سے پیش کی جائیں۔ سرخیاں کیسی لگائی جائیں، کون سی خبر نمایاں اور مفصل شائع کی جائے، کسے دبایا اور گھٹایا جائے۔ اس سارے عمل میں ایڈیٹر کی پالیسی اور اس کے ذہن کی کرشمہ سازیاں موجود ہوتی ہیں۔ پڑھنے والوں کا ذہن ہر روز "ایڈیٹر کا ڈوز" ہضم کرتا رہتا ہے پھر کوئی کیسا ہی سخت جان ہو، ایڈیٹر کا رنگ چڑھنے سے کب تک بچ کر رہ سکتا ہے۔

ایڈیٹر کو تمام ملکی اور غیر ملکی اہم معاملات اور واقعات پر گہری نظر رکھنا پڑتی ہے۔ کامیاب ایڈیٹر کو معلوم ہونا چاہئے کہ کل اس کے قارئین اس سے کیا سننے کی امید کرسکتے ہیں۔ ایڈیٹر کے ایک ہاتھ میں قلم اور دوسرے ہاتھ میں پبلک کی نبض ہوتی ہے۔ یہ ایک کٹھن کام ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایڈیٹر کو پبلک کے عام رجحان سے ہٹ کر بات کرنا ہوتی ہے۔ اس وقت خوب چیخ پکار ہوتی ہے۔ لوگ کسی خاص معاملے میں جذباتی ہو کر ایڈیٹر سے جسے وہ اپنا ترجمان سمجھتے ہیں، اپنی من بھاتی بات سننا چاہتے ہیں اور جب اخبار سامنے آتا ہے تو ایڈیٹر کا راگ دوسرا ہی ہوتا ہے۔ سیاسی اور قومی معاملات میں ایسے ہیجانی مواقع اکثر آتے رہتے ہیں۔ یہ وقت ایڈیٹر کی کڑی آزمائش کا ہوتا ہے۔ اس کا فرض اسے مصلحت اور پبلک کی مانگ سے مختلف آواز دینا ہے۔ ایڈیٹر کو وہی بات کہنا چاہیئے جو اس کی دانست میں حق ہو۔

انتخابی مہم کے دوران ایڈیٹر کو مختلف سیاسی طاقتوں کی طرف سے بہت زیادہ دباؤ سہنا پڑتا ہے۔ جماعتوں، گروہوں اور افراد کی طرف سے ایڈیٹر پر بیجا دباؤ پڑنے کے رجحان میں پچھلے کچھ عرصہ میں خاصا اضافہ ہوا ہے اور ایڈیٹر کو اپنے اظہار رائے کے حق کی حفاظت کے لئے چومکھی لڑنا پڑتی ہے۔ وہ مصیبتیں جھیلتا ہے۔ قید و بند تک بات پہنچ سکتی ہے۔

کہتے ہیں کہ کامیاب ایڈیٹر وہی ہوسکتا ہے جو دن میں دس گھنٹے پڑھے اور صرف دو گھنٹے لکھے۔ جی ہاں، ایک اچھا ایڈیٹر بننے کے لئے بہت مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کتابوں، رسالوں کے علاوہ ایڈیٹر کو ملکی اور غیر ملکی اہم اخبارات کا کثرت سے روزانہ مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور کرنا چاہیئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد جنھوں نے اپنی پبلک زندگی کا آغاز ایک مدیر کی حیثیت سے کیا تھا، اپنے کثیر اور وسیع مطالعہ کے لئے بہت مشہور تھے۔ کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ مولانا، اخبارات میں خبروں اور مضامین کے علاوہ اشتہارات تک پڑھ ڈالتے تھے۔ حتیٰ کہ اخبار کو سونگھتے بھی تھے! جی ہاں، مختلف اخباروں کے کاغذ کی خوشبو جدا جدا ہوتی ہے۔ ایک متجسس صحافی جو ہمیشہ سیکھنے اور معلومات اکٹھا کرنے کی دھن میں رہتا ہے، بخوبی معلوم کئے بغیر کیسے رہ سکتا ہے کہ جو اخبار وہ پڑھ رہا ہے اس کی خوشبو کیسی ہے جو اس کاغذ کے کارخانے اور برانڈ کا پتہ دیتی ہے۔ نوجوان صحافیوں کے لئے اس مثال میں ایک اچھا سبق ہے۔

اب ذرا ایک نقطہ علاحدہ سے اردو اخبار کے ایڈیٹر پر بھی ڈال لیں۔ اردو اخبار کے ایڈیٹر کے مسائل کچھ اور بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً اسے اپنے اخبار کیلئے بیشتر مواد انگریزی سے منتقل کرنا پڑتا ہے۔ خبریں اور اکثر مضامین بھی انگریزی میں آتے ہیں۔ ان کا ترجمہ ہر روز تیزی اور روانی سے کرنا پڑتا ہے عام طور سے اردو پریس کم سرمائے کی وجہ سے بہت پچھڑا ہوا ہے۔ اردو اخبار کا ایڈیٹر، مالک اور منیجر سب کچھ ایک ہی آدمی ہوتا ہے۔ اسے بیک وقت متضاد قسم کا ہمہ جہت کام کرنا ہوتا ہے۔ اس بیچارے پر محنت سوا ہوتی ہے۔ دوسری زبانوں کے بڑے اخبارات کے مدبران کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہر روز خود ہی ایڈیٹوریل لکھیں۔ ان کے ہاں مختلف موضوعات پر اداریہ لکھنے والے علاحدہ ہوتے ہیں۔ لیکن غریب اردو اخبار کے ایڈیٹر کے پاس بڑا اسٹاف نہیں ہوتا۔ اسے خود ہی تمام ملکی و غیر ملکی معاملات پر لکھنا پڑتا ہے۔ اسے دوسروں سے زیادہ محنت اور مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے اردو اخبار کے ایڈیٹر کے لئے ایک اچھا مترجم ہونا بھی ضروری ہے۔ اتنی محنت کے بعد بھی اس بیچارے کے اخبار کی اشاعت محدود ہوتی ہے۔ لیکن امید ہے کہ ایک وقت آئے گا جب اردو کے بھی بعض بڑے اخبار ہوں گے اور ان کا ایڈیٹر بھی اپنے ہم عصروں کے برابر ہوگا۔

بقیہ: قاری کے مسائل

کیونکہ میں صرف قاری نہیں میری کچھ اور ذمہ داریاں بھی ہیں۔ اس لئے کتابوں کی غیر منصفانہ قیمتیں بھی ایک قاری کی حیثیت میں میرا مسئلہ ہیں۔

جیسے یہ صحیح ہے کہ ہر ایک تخلیق کار اپنی تخلیق کو دوسرے تک پہنچانے کے لئے بیتاب رہتا ہے، اسی طرح میرے خیال کے مطابق، ایک اچھا قاری بھی ایک اچھی تخلیق پڑھ کر اپنی خوشی میں دوسروں کو شریک کرنا چاہتا ہے۔ چونکہ موجودہ دور میں قاری مختلف خانوں اور نظریوں میں بٹ گیا ہے اور اسے کتابوں کی عدم دستیابی یا پھر اس کی خرید کے مسائل درپیش ہیں، اس لئے میں بحیثیت قاری کے کم و بیش تنہائی کا شکار ہوں۔ جو میں پڑھتا ہوں یا جو میں مقولے سناتا ہوں، اس سے یا تو بہت سے ناآشنا ہوتے ہیں یا پھر اپنے نظریئے کے تحت محفوظ ہی نہیں ہو پاتے! میرے خیال میں یہ مسئلہ بھی اہم ہے!

ناشر کے مسائل

محمد حسین شمس علوی

دیانند ورما

عابد علی خاں

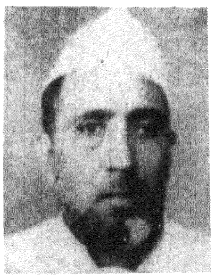

محمد حسین شمس علوی

ادارۂ فروغ اُردو، امین آباد پارک، لکھنؤ (یوپی)

جس طرح دنیا کے سب کاموں میں کچھ مشکلات ہوتی ہیں اسی طرح نشر و اشاعت اور پبلشنگ کے کام میں بھی کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ناشروں کو پہلی دشواری تو یہی پیش آتی ہے کہ وہ کسی اچھے اور معیاری مصنف کو تلاش کریں تاکہ جو کتاب چھاپی جائے اس کی جلد سے جلد کاسی ہو سکے اور کتاب کی تیاری اور اس کے اشتہار پر پبلشر جو روپیہ صرف کرے وہ جلد سے جلد سمٹ آئے۔ اسی لئے مقبول و معروف مصنف کو تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ پبلشر کو یہ بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کتاب کسی ایسے موضوع پر ہو جو عوام کے مذاق کے مطابق ہو اور وہ اس سے دلچسپی لے سکیں۔ ان دونوں باتوں کا خیال اسلئے رکھنا پڑتا ہے تاکہ ناشر کا روپیہ کتاب کی شکل میں زیادہ عرصہ تک پھنسا نہ پڑا رہے۔ سرمایہ جتنا گردش میں رہے گا اتنا ہی فائدہ زیادہ حاصل ہوگا۔ اگر اس کتاب کا پہلا ایڈیشن جلد نکل جائے گا تو اسی روپیہ سے اسی کتاب کا دوسرا ایڈیشن یا کوئی دوسری نئی کتاب فوراً ہی چھپوائی جا سکتی ہے۔

بعض کتابوں کی نکاسی جلد ہو جاتی ہے اور بعض کی بہت دیر میں۔ ایک غیر معروف مصنف کی کتاب دیر میں نکلتی ہے اور کسی جانے پہچانے مصنف کی ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہے اسی طرح اگر کتاب کسی عام فہم موضوع پر ہوئی تو جلد فروخت ہو جاتی ہے اور اگر کتاب فلسفے منطق قانون یا کسی ٹھوس اور ٹھس موضوع پر ہوئی تو اس کی نکاسی بہت کم اور بتدریج ہوتی ہے۔ چنانچہ، جاسوسی اور رومانی ناول اور جنسیات کے متعلق کتابیں بڑی تیزی سے فروخت ہو جاتی ہیں۔ لٹریچر جتنا فحش اور ننگا ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ مقبول ہوتا ہے۔

جن ناشروں کے پیش نظر صرف روپیہ کمانا ہی ہوتا ہے وہ زیادہ تر ایسی ہی مخرب اخلاق کتابیں چھاپتے ہیں وہ ایسے لٹریچر پر جو روپیہ لگاتے ہیں وہ کم وقت میں زیادہ منافع لے کر پبلشر کو واپس مل جاتا ہے۔

مگر وہ پبلشر جن کے پیش نظر روپیہ کمانا ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ علم و ادب کی خدمت بھی کرنا چاہتے ہیں وہ نسبتاً زیادہ نقصان میں رہتے ہیں۔ ان کے لئے کسی معیاری یا فنی کتاب کا پہلا ایڈیشن بھی نکالنا جوئے شیر لانے سے کم مشکل نہیں ہوتا۔

جب کسی پبلشر کو کسی ممتاز مصنف کی کوئی کتاب چھاپنے کو مل گئی تو پبلشر کے سامنے پہلا مرحلہ آتا ہے کسی اچھے کاتب کی تلاش جس کا خط اچھا ہو صحیح نویس ہو اور وعدہ کا پابند ہو۔ ہمارے کاتب حضرات ہمیں معاف کریں گے اگر ہم صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے یہ کہیں کہ ان کی اکثریت وعدہ کی پابندی نہیں کرتی۔ پیشگی اجرت لینے کے بعد بھی وہ عام طور پر لکھ کر نہیں دیتے۔ پبلشر ان کا پیچھا کرتے کرتے عاجز آجاتا ہے۔ کاتبوں میں دوسرا نقص یہ ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے کتابت کر بھی دی تو جب کاپیاں تصحیح کرنے کے لئے ترمیم کے لئے ان کے حوالے کی گئیں تو ترمیم بنانے میں وہ کتابت سے بھی زیادہ وقت لے لیتے ہیں اور سیکڑوں تقاضوں اور ان کے گھر کے چکر لگانے کے بعد ترمیم بنا کر کاپیاں ملتی ہیں تو وہ بھی زیادہ ناقص ہی ہوتی ہیں۔ بعض کاتب ترمیم بنانے کے چور ہوتے ہیں اور کتابت کی اجرت لینے کے بعد بھی وہ ترمیم کا بنانا بیگار سمجھتے ہیں۔ اگر بادلِ ناخواستہ وہ اس بیگار کے لئے تیار بھی ہو گئے تو بھی وہ توجہ اور دلچسپی کے ساتھ ترمیم نہیں بناتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کاپیوں میں پھر بھی بہت سی غلطیاں رہ جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جو کتاب بڑے اہتمام سے چھاپی جاتی ہے جس کی کتابت و طباعت دیدہ زیب ہوتی ہے جس میں بڑھیا کاغذ لگا ہوتا ہے اور جس کا "گیٹ اپ" عمدہ ہوتا ہے اس میں بھی کتابت کی غلطیاں دیکھنے میں آتی ہیں جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ کاتب نے ترمیم

توجہ سے نہیں بنائی اور بہت سی غلطیاں چھوڑ دیں اور پبلشر نے کاتب کی دیانتداری پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ دیکھے بغیر کہ ساری غلطیاں بنا دی گئی ہیں یا نہیں کاپیاں چھپنے کے لئے دیدیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پبلشر ان تمام کاپیوں پر پھر سے نظر ڈال لے جو ترمیم بنانے کے بعد کاتب نے اسے واپس کی ہیں۔ جو پبلشر ایسا نہیں کرتے اور غلطیوں کی جانچ کئے بغیر کاپیاں چھپنے کے لئے دیدیتے ہیں۔ انہیں بعد میں ایک غلط نامے کا اضافہ کرنا پڑتا ہے جو کتاب کے روشن چہرے پر ایک بدنما داغ کی حیثیت رکھتا ہے۔

کاپیوں کے بعد پروف ریڈنگ کی منزل آتی ہے۔ ناشر صاحب نے پروف پڑھ کر ان غلطیوں کو اگر پھر بنا دیا جو کاتب سے بھی چھوٹ گئی ہیں تو ان غلطیوں کو "مصلح سنگ" پلیٹ پر نہیں بناتا کیونکہ مصلح سنگ کی ذہنیت بھی کاتبوں جیسی ہی ہوتی ہے اور وہ بھی عموماً انہیں کی طرح "کام چور" ہوتا ہے اور کم وقت میں زیادہ سے زیادہ پیسہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اگر مصلح سنگ پر بھی بھروسہ کر کے پلیٹیں چھپنے کے لئے دیدی گئیں تو کتاب چھپنے کے بعد جب سامنے آئے گی تو اس میں بہت سی غلطیاں نظر آئیں گی اور کاتب اور مصلح سنگ کی لاپروائی کی وجہ سے غریب ناشر اور لیتھو چھپائی مفت میں بدنام ہوگی۔

اگر کتاب کسی زندہ مصنف کی ہے اور پبلشر نے اس خیال سے کہ "تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں" کے مصداق مصنف ہی کاپیاں اچھی طرح اور آسانی کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ کاپیاں مصنف کے حوالے کر دیں تو مصنف نے کاپیوں میں لفظوں پر لفظ اور جملوں پر جملے بدلنا شروع کر دیئے اور بعض اوقات پیراگراف کے پیراگراف بدل ڈالے۔ اس طرح کی ترمیم بنانا کاتب کو بہت زیادہ کھلتی ہے اور پھر ترمیم بنانے کے سلسلہ میں کاتب جو کاٹ چھانٹ کرتا ہے اور چیپیاں لگاتا ہے یا مصلح سنگ جو چھیل چھال کرتا ہے وہ کتابت کے حسن کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے اور طباعت کی خوبصورتی بالکل بگڑ جاتی ہے۔ اس قسم کی کتر بیونت وہی مصنف کرتے ہیں، جنہیں اپنے لکھے پر اعتبار نہیں ہوتا اور جو چاہتے ہیں کتاب کے پڑھنے والوں کو میری عبارت آرائی میں کوئی سقم نظر نہ آئے اور وہ بے عیب دکھائی دے۔ ممکن ہے کہ مصنف کی ادبیت بے عیب بن جائے لیکن اس کا ردعمل یہ ضرور ہوگا کہ کتاب کی لکھائی اور چھپائی داغ دار نظر آنے لگے گی اور ان تمام نقائص کا ذمہ دار غریب ناشر کو سمجھا جائے گا۔

جب کتاب چھپ گئی تو کتاب کی نکاسی کے لئے ناشر کو اس کے ذرائع ڈھونڈنا پڑتے ہیں۔ اس کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں کہ یا تو پبلشر اس کتاب کا اشتہار مختلف اخبار و رسائل اور جنتریوں میں دے یا کتاب کو عوام سے متعارف کرانے کے لئے ہزار ہا ہینڈ بل تقسیم کرائے۔ ظاہر ہے کہ کسی ایک کتاب کے اشتہار پر ناشر کو اتنا زیادہ خرچ کرنا پڑ جائے گا جس پر "سونے سے گڑھاؤن مہنگی" کا مقولہ صادق آسکتا ہے۔ اشتہارات دے کر اگر کچھ کتابیں فروخت ہوئیں تو اس میں نقصان ہی نقصان ہوگا اور اگر اکا دکا کچھ فرمائشیں آئیں بھی تو مثلاً اگر ایک روپیہ قیمت کی کتاب ہے تو اس پر ایک روپیہ پچاس پیسے ٹکٹ ڈاک خرچ ہو جائیں گے اور اگر انہی دی پیوں میں سے کچھ واپس آگئیں تو ٹکٹ ڈاک کی رقم کا بوجھ غریب ناشر ہی کی جیب پر پڑے گا اور اس پر "آؤ پیرو گھر سے لے جاؤ" کی مثل کا پوری طرح اطلاق ہوگا۔

دوسرا نسبتاً کم خرچ طریقہ یہ ہے کہ وہ مختلف بک سیلروں سے رابطہ قائم کر کے انہیں کمیشن پر کتابیں مہیا کرے۔ اس کے لئے وہ مختلف بک سیلروں کے پاس خود جائے گا اور محض بیرونی کتب فروشوں سے خط و کتابت کرے گا۔ مقامی بک سیلروں کے پاس پبلشر کو متعدد بار جانا پڑتا ہے۔ بک سیلر بڑی شانِ استغنا سے دریافت کرتا ہے کہ اچھا یہ تو بتائیے آپ کمیشن کتنا دیں گے؟ ناشر نے ڈرتے ڈرتے کہا ۳۳ فیصدی۔ بک سیلر صاحب بولے کہ جی ۲۵، ۳۳ فیصدی تو ہم خود دوسروں کو دیتے ہیں۔ آپ اگر ۶۰ فیصدی کمیشن دیں تو دس پانچ کتابیں رکھ جائیے۔ جب کتابیں بک جائیں گی تو اس کے دام دے دیئے جائیں گے۔ ۶۰ فیصدی آپ کمیشن دیں گے تو ہم آپ کی کتاب محنت سے بیچیں گے بھی اور ہمیں بھی چار پیسے بچ رہیں گے۔ غرض مختلف کتب فروشوں کے یہاں دس دس پانچ پانچ کتابیں رکھ دی گئیں اور ناشر نے جو سیکڑوں ہزاروں روپیہ اس کتاب کی تیاری پر خرچ کیا تھا وہ کتابوں کی شکل میں متعدد کتب فروشوں کے حوالے کر دیا صرف اس امید پر کہ اس صورت سے شاید کچھ نکاسی ہو سکے۔ اگر کتب فروش خوش دہند نکلا تو اس نے دس دس پانچ پانچ روپے مختلف قسطوں میں دیدیے اور نادہند بک سیلروں نے سانس ڈکار تک نہ لی۔

پبلشر کو ایک زحمت اور پیش آتی ہے وہ یہ کہ اگر پبلشر کو اتفاق سے کوئی مقبول و متعارف مصنف کی تصنیف چھاپنے کو مل گئی اور کتاب کی نکاسی بھی تیزی سے ہونے لگی تو دوسرے بے ایمان اور خدا ناشناس پبلشروں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اور ان میں سے کسی ڈھیٹ پبلشر نے اس کی کتاب کو فوٹو آفسٹ پر چھپوا لیا۔ چونکہ فوٹو آفسیٹ پر چھپوانے کے بعد اصل اور نقل میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس لئے اس بے ایمان پبلشر کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کر کے اس میں کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اب ہم اگر اس کتاب پر ۳۳ فیصدی کمیشن دیتے ہیں تو جعلی ایڈیشن چھاپنے والے پبلشر کو پچاس ساٹھ فیصدی کمیشن دینے میں عذر نہیں ہوتا اور دل کھول کر کمیشن دینے کے بعد بھی وہ نفع ہی میں رہتا ہے۔ کیونکہ اسے نہ مصنف کو رائلٹی دینا پڑتی ہے اور نہ بہت سے ابتدائی اخراجات اور شروع میں پیش آنے والی دشواریوں پر قابو پانے کے لئے اسے کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ ایسے بے ایمان پبلشر مصنف کے ساتھ بھی مکر و فریب سے کام لیتے ہیں اور اسے رائلٹی ادا کرنے سے بچنے

کے لئے وہ پہلا ایڈیشن چھاپنے کے بعد کتابت کی پلیٹیں محفوظ کر لیتا ہے اور مصنف سے یہی کہتا رہتا ہے کہ جناب ابھی تو پہلے ایڈیشن کی کتابیں ہی نہیں نکل سکی ہیں جب دوسرے ایڈیشن کی نوبت آئے گی تو رائلٹی حاضر کر دی جائے گی اور یہ پہلا ایڈیشن ختم ہونے اور دوسرا ایڈیشن چھاپنے کی نوبت کبھی نہیں آتی اور یہ چکر ایسا ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔

فوٹو آفسٹ پر درسی کتابیں تو ضرور چھاپ لی جاتی ہیں اس لئے کہ ان کی نکاسی ضرور ہوتی ہے اور نفع کا تناسب اچھا خاصا ہوتا ہے۔ مگر اس کی گرفت نہ پبلشر کر سکتا ہے اور نہ حکومت ہی کر سکتی ہے۔ بس گرفت اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ دورانِ طباعت میں پولیس بے ایمان ناشر کو گرفتار کرے۔

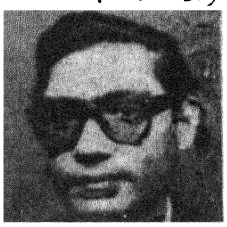

دیانند ورما

ڈائرکٹر اساٹر پبلیکیشنز و پنجابی پستک بھنڈار،
دریبہ کلاں دہلی ۱۱۰۰۰۶

مختلف زبانوں کی کتابوں کے ناشران کے مسائل الگ الگ ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں صرف اُردو کتابیں شائع کرنے والے اداروں کے مسائل کا ذکر کرنا مقصود ہے۔ اُردو کتابوں کی نشر و اشاعت کے میدان میں کئی سرکاری، نیم سرکاری، تجارتی اور غیر تجارتی ادارے سرگرمِ عمل ہیں۔ ان میں ہر ایک کے مسائل کی نوعیت مختلف ہے۔ یہاں میں صرف ان اداروں کے مسائل کا ذکر کر رہا ہوں جو وسیلۂ روزگار کے طور پر ناشر کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

جس طرح اشاعتی اداروں کی کئی قسمیں ہیں اسی طرح کتابوں کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ مثلاً نصابی کتابیں، مذہبی کتابیں، عوامی پسند کی کتابیں شعری مجموعے، ناول، افسانے اور ادبی تخلیقات۔

اُردو کی نصابی کتابیں آج کل سرے سے ہی کم چھپتی ہیں۔ اس لئے ان کتابوں کو حاصل کرنا خریدار کے لئے بجائے خود ایک ہزار مرحلہ داستان ہے۔ مذہبی کتابوں کے زمرے میں قرآن شریف کی اشاعت میں منافع بیشک کم ہے لیکن اس میں اصل لاگت کے ڈوب جانے کا اندیشہ نہیں ہوتا، علاوہ ازیں مذہبی کتابیں نسبتاً کم فروخت ہوتی ہیں۔ قصہ آرائش محفل ایسی عوامی پسند کی کتابوں کی سرپرستی دیہاتی عوام کرتے ہیں جو ہر ایک کتاب کو ایک مقدس شے سمجھتے ہیں اس نوع کی کتابیں کثیر تعداد میں فروخت ہوتی ہیں۔ ان کا کاپی رائٹ کسی ایک ادارے کے پاس محفوظ نہیں ہوتا۔ لہٰذا ایک ہی کتاب کو کئی ادارے بیک وقت چھاپ لیتے ہیں۔ اس لئے کم قیمت رکھنے کے سلسلہ میں مقابلہ شدید ہوتا ہے۔ ناشر کو اصل رقم کا سود جتنا بھی ہاتھ نہیں لگتا۔ شعری مجموعے صرف نامور شعرا کے بکتے ہیں۔ لیکن نامور شعرا کی تعداد پانچ فی صدی سے بھی کم ہوتی ہے باقی ۹۵ فیصدی کے لئے مسئلہ ہی مسئلہ ہے۔ رہ گئے ناول، افسانے اور ادبی تخلیقات تو صورتِ حال یہ ہے کہ اچھے خاصے علم دوست بھی کتابیں خرید کر پڑھنے سے گریز کرتے ہیں۔ درحقیقت لفظ مسئلہ اسی نوعیت کی کتابوں کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔

ان مسائل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بینک (جو اب قومی ملکیت بن چکے ہیں) کتابوں پر قرض دینا مناسب نہیں سمجھتے۔ بینک سادے کاغذ پر قرض دے سکتے ہیں۔ مطبع کی سیاہی پر اپنا روپیہ لگا سکتے ہیں کیونکہ ان اشیاء کو کسی وقت بھی معمولی خسارہ اٹھا کر فروخت کیا جا سکتا ہے لیکن جب کورے کاغذ اور سیاہی میں ایک مصنف کی کوشش شامل ہو جاتی ہے۔ تو وہ اس بنا پر اپنا روپیہ لگانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ کیونکہ وہ پراڈکٹ (PRODUCT) جسے کتاب کہا جاتا ہے بوقت ضرورت سکوں میں منتقل نہیں کرائی جا سکتی۔ وہ ایک خصوصی شخص کے کام کی چیز رہ جاتی ہے۔ اس خاص شخص کو تلاش کرنا مسئلہ کی گنجلک ڈوری کا پہلا سرا ہے۔

کتاب کا ضرورت مند تلاش کرنے کے سلسلہ میں پبلسٹی بھی ایک ذریعہ ہے لیکن یہ اس قدر مہنگا ہے کہ جس قدر ایک مشہور ماہنامے میں ایک صفحہ اشتہار دوبارہ شائع کرانے پر صرف ہوتی ہے اس سے ڈیڑھ صد صفحات پر مشتمل ایک کتاب کی پانچ سو کاپیوں کا بلا جلد ایڈیشن تیار ہو جاتا ہے لہٰذا کوئی بھی ناشر اشتہارات کے مصارف برداشت نہیں کر پاتا۔

سرکار یافتہ کتب بھی پبلسٹی کا ایک ذریعہ ہے لیکن اس وسیلہ سے ہر خاص و عام کو مطلع نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ کتب فروشوں اور لائبریریوں تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ سارے ملک میں ایسے تاجرانِ کتب کا شمار انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے جو دیگر ناشروں کی تمام مطبوعات کا بھرپور سٹاک رکھتے ہیں ورنہ زیادہ تر ایسے ہیں جو مختلف زبانوں کی دیسی کتابوں اور اسٹیشنری کی دوکان کھولے بیٹھے ہیں۔ وہ لوگ دوکان کے ایک گوشہ میں اُردو کی کچھ پاپولر کتابیں بھی رکھ لیتے ہیں۔ وہ اپنے ہاں محض خریدارِ اردو کی پسند کی کتابیں رکھتے ہیں۔ مردوں میں صادق حسین سردھنوی کے تاریخی ناول اور کچھ غیر ملکی مہمی (ADVENTUROUS) ناولوں کے ترجمے مقبول ہیں۔ عورتیں خواتین کے لکھے ناول پسند کرتی ہیں۔ عورتوں کی پسند کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے کچھ ناشر مردانہ تحریروں کو خواتین کے نام سے چھاپ دیتے ہیں۔

اب رہی ادب کے معیار پر پوری اترنے والی کتابیں۔ تو اُن کی سرپرستی لائبریریوں کے ذمہ ہے۔ لیکن بیشتر لائبریریوں میں اردو کتابوں کیلئے بجٹ بہت کم ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ صرف نامور ادیبوں کی تصانیف پر حقیر سی

رقم خرچ کر کے باقی ماندہ کتابوں کو خدا کے آسرے پر چھوڑ دیتی ہیں۔

اب اس ضمن میں کچھ امور قابل ذکر ہیں کہ ادبی کتابوں سے شغف رکھنے والے زیادہ تر لوگ اقتصادی اعتبار سے خوشحال نہیں ہوتے اور استعمال کی دیگر اشیاء کی طرح کتاب (CONSUME) نہیں ہو جاتی۔ بیک وقت کئی افراد کے ذریعہ پڑھی جانے کے باوجود کتاب کا کچھ نہیں بگڑتا۔ قاری کے حق میں جہاں کتاب کی یہ ایک خوبی ہے وہاں ناشر کے نزدیک سراسر قباحت ہے خسارہ ہے۔ قاری کتاب خرید کر پڑھنے کی بجائے مستعار لے کر پڑھنا پسند کرتا ہے یا پھر کسی کتب فروش کو کتاب کرائے پر اٹھا دینے کے لئے رضامند کر لیتا ہے۔ آج جا بجا ایسی دکانیں کھلی ہیں جہاں سے بیس پچیس ۲۵ پیسے یومیہ پر پانچ دس روپے کی کتاب لے کر پڑھی جا سکتی ہے اس سے دوکاندار کا کام تو چل نکلتا ہے لیکن ناشر اور مصنف کا حق مارا جاتا ہے۔

کتابوں کی کھپت کے مذکورہ بالا محدود ذرائع کو دیکھتے ہوئے ایک اچھا خاصہ ناشر اپنی کتاب کا ایڈیشن پانچ صد جلدوں سے زیادہ کا نہیں چھاپتا۔ مقبولِ عام یا شہرۂ آفاق کتابوں کا ایڈیشن ایک ہزار جلدوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ نتیجتاً کاتب، پریس، آرٹسٹ وغیرہ کے اخراجات کم جلدوں پر پڑ جاتے ہیں۔ کتاب گراں قیمت ہو جاتی ہے

ناشر کو یہ سہولت ہے کہ اگر ایک کتاب چھاپنے پر اس کی گزر اوقات نہ ہو تو وہ زیادہ سرمایہ لگا کر زیادہ قسم کی کتابیں چھاپ سکتا ہے۔ اپنی آمدنی میں اضافہ کر سکتا ہے لیکن ایک مصنف اپنے قلم کو انڈسٹری کی صورت میں منتقل نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُردو کا ادیب اُردو کتابوں کی رائلٹی پر خوشحال زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اسے معاش کے لئے دوسرا ذریعہ تلاش کرنا پڑتا ہے۔

دیگر ذریعۂ معاش کی ضرورت صرف اُردو کے ادیب کو نہیں پڑتی۔ اُردو کے ناشر کو بھی اقتصادی فارغ البالی کے لئے آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ اپنانا پڑتا ہے۔ مثلاً کسی مقبولِ عام ماہنامہ کی اشاعت، دوا کا کوئی کارخانہ، ادبی معمہ یا مشغلہ یا کتابوں کی امپورٹ، ایکسپورٹ کا دوسرا شعبہ۔ ورنہ جو ناشر صرف اُردو کتابوں کی اشاعت کے نفع پر زندہ رہنا چاہتے ہیں اُن کی مالی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔

زیرِ بحث مسائل کے سبب نئے اور اُبھرتے ہوئے ادیبوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ سیل کے محدود ذرائع کو مدِنظر رکھتے ہوئے جب ناشر کسی نئے مصنف کی کتاب چھاپنے کے لئے تیار نہیں ہوتا تو مصنف اپنی تحریر خود چھاپ لیتا ہے اور مسائل کے اسی گرداب میں پھنس جاتا ہے جس میں سے اُبھرنے کی کوشش میں ناشر ہاتھ پاؤں مار رہا ہوتا ہے۔ متذکرہ ادیب نڈھال ہو کر اپنی کتاب کی سول ایجنسی کسی باقاعدہ ناشر کے حوالے کر کے کمبل سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔ لیکن اس پر یہ حقیقت اب واضح ہوتی ہے کہ نشر و اشاعت کی تجارت میں کرنسی نوٹوں کو کتابوں کے اوراق کی صورت عطا کرنا آسان ہے لیکن ان "سنہری اوراق" کو دوبارہ کرنسی نوٹوں میں منتقل کرنا از حد دشوار ہے۔

عابد علی خاں

مدیر روزانہ سیاست، مہاتما گاندھی روڈ
حیدرآباد (آندھرا)

گذشتہ ماہ مئی میں بنگلور میں جناب برکت اللہ خاں صاحب چیف منسٹر راجستھان سے ملاقات ہوئی تھی جس میں اردو زبان و ادب اور حیدرآباد کے ادیبوں و شعرا کے مسائل بھی زیرِ بحث رہے۔ خانصاحب نے کہا کہ میں انہیں مخدوم محی الدین کا مجموعۂ کلام "بساطِ رقص" فراہم کر دوں۔ ان سے میں نے وعدہ کر لیا لیکن میں جانتا تھا کہ بساطِ رقص کا ایک بھی نسخہ اب برائے فروخت موجود نہیں ہے کیونکہ پُرانا ایڈیشن ختم ہو چکا اور نیا شائع نہیں ہوا ہے۔ مخدوم صاحب کی ادبی خدمات کے اعتراف کے لئے منعقدہ ایک جلسہ میں کیسۂ زر کے علاوہ مخدوم کمیٹی نے انہیں ان کے مکمل کلام کا ایک مجموعہ بطور تحفہ پیش کیا تھا۔ اس کی اشاعت سے میرا ہی تعلق تھا۔ ہم نے ایک ہزار نسخے شائع کئے تھے جو ختم دسمبر ۱۹۷۲ء تک فروخت ہوتے رہے۔ مخدوم محی الدین نہ صرف آندھرا پردیش کے بلکہ دنیائے اُردو کے ممتاز اور صفِ اول کے شعراء میں سے تھے۔ ان کی نظموں کا انتخاب تلگو اور ہندی میں بھی شائع ہوا ہے۔ غالباً سوویت یونین میں بھی ان کی نظموں کے ترجمے شائع ہوئے ہیں لیکن ان کا مکمل مجموعۂ کلام جو صرف ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہوا تھا تین چار سال تک فروخت ہوتا رہا۔ اس واقعہ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُردو کتابوں کی رفتار فروخت کیا ہے اور جب یہ ایڈیشن ختم ہوتا ہے تو اس کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کس قدر مشکل کام ہے۔ بہرحال مجھے بازار سے ایک پُرانا نسخہ خرید کر جناب برکت اللہ صاحب کی خدمت میں پیش کرنا پڑا۔

آزادی سے پہلے حیدرآباد اُردو کتابوں کا بڑا مرکز رہا ہے۔ لیکن آندھرا پردیش بننے کے بعد اکثر ادارے بند ہو گئے۔ انجمن ترقی اردو کا کتب گھر اور مکتبہ ابراہیمیہ جو اُردو کتابوں کی فروخت کے کل ہند اہمیت رکھنے والے ادارے تھے ختم ہو گئے۔ ان حالات کے باعث نواب مہدی نواز جنگ مرحوم نے ادبی ٹرسٹ کے تحت ایک بکڈپو بھی قائم کیا جس کا انتظام میرے تفویض تھا۔

اس بکڈپو سے یہ تجربہ حاصل ہوا کہ حیدرآباد میں اچھی کتابوں کی اشاعت اور فروخت کی رفتار بڑی سست ہے۔

ادبی ٹرسٹ کتابوں کی اشاعت کا بھی کار بار انجام دیتا ہے غالب صدی تقاریب کے موقع پر حیدر آباد کے ایک ممتاز نقاد و ادیب ضیاء الدین شکیب نے سالار جنگ لائبریری اور آرکائیوز ڈیپارٹمنٹ کی مدد سے "غالب اور حیدر آباد" پر بڑی تحقیقی کتاب لکھی اور کتاب کی تشہیر کے لئے مناسب طریقے بھی اختیار کئے گئے لیکن دو سال تک بمشکل تین سو کتابیں فروخت ہوئیں۔ بالآخر میں نے ٹرسٹ کی متعدد مطبوعات کو ریاست کے کتب خانوں کیلئے خریدنے کا انتظام کرادیا۔

آج کل کے سابق مدیر شہباز حسین صاحب نے ۱۹۶۸ء میں اُردو کتابوں کی اشاعت کے بارے میں سوال نامہ اور دیگر مواد کے ذریعہ یہ اندازہ لگایا تھا کہ آزادی کے بعد تقریباً دس ہزار کتابیں شائع ہوئیں۔

ایک اور تجزیہ کے بموجب اوسطاً ہر روز دو اردو کتابیں شائع ہوتی ہیں یہ اعداد مایوس کن نہیں ہیں۔ گو یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان میں بڑی تعداد جاسوسی، فلمی اور جنسی ادب سے متعلق ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے باعث تحقیقی موضوعات پر مضامین کی ترتیب و تیاری بھی اچھے اعلیٰ لٹریچر کی شکل میں سامنے آرہی ہیں۔

ایم اے اور ڈاکٹریٹ کے لئے جو مقالے لکھے گئے وہ کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ اُردو میں اچھی کتابوں کی اشاعت کے لئے کافی مواد موجود ہے۔

دو تین سال قبل ممتاز مزاحیہ نگار مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی مرحوم کے صاحبزادے مرزا شرافت اللہ بیگ نے مجھ سے کہا تھا کہ مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کے بعض غیر مطبوعہ مضامین ان کے پاس ہیں جن کی اشاعت کا انتظام کرنا چاہیئے۔ اس طرح قدیم اور جدید دونوں قسم کے اچھے معیاری ادب کے مسودات کی کمی نہیں لیکن اصل سوال اس کی طباعت اور اشاعت کا ہے

حیدر آباد میں کوئی بڑا ناشر نہیں ہے اور ایسی کتابیں بھی شائع کرنے پر آمادہ نہیں جو جلد فروخت نہ ہوسکیں۔

بیرون حیدر آباد مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی اور گنتی کے چند ایسے ادارے ہیں جو مشہور ہیں لیکن ان کے لئے تمام مصنفین کی کتابوں کی اشاعت آسان نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف خود اپنی کتاب کی اشاعت کا انتظام کرتا ہے لیکن کتاب کی اشاعت کے بعد اس کی فروخت و تقسیم کا کام مصنف کے بس کی بات نہیں اردو ادب و زبان کی ترقی کے مختلف پہلوؤں پر نظر رکھنے والوں اور بالخصوص انجمن ترقی اردو کو چاہیئے کہ وہ کتابوں کی فروخت کے انتظام کو سنبھالے۔ انجمن کی شاخیں ہر ریاست میں قائم ہیں۔ خود انجمن ایک بہت بڑی ناشر ہے اس لئے اسے ملک بھر کی اُردو تصانیف کی فروخت اور نکاسی میں مدد دینی چاہیئے یا رہنمائی کرنی چاہیئے۔

اردو اداروں اور بالخصوص انجمن ترقی اردو کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ریاستی شاخوں کے تعاون سے ہر نئی کتاب کے نوٹ لے اور ان کی فروخت و نکاسی کا انتظام کرے۔

اردو بورڈ بھی اپنا فرض پورا کرے گا اگر وہ اردو کتابوں کی اشاعت کے لئے انجمن کو مالی امداد دے۔ بالخصوص اردو میں معاشی، سیاسی اور عصری مسائل پر کتابوں کی شدید ضرورت ہے۔ شاید میرا اندازہ غلط نہ ہو کہ معاشی و سیاسی مسائل پر سال بھر میں اچھی بارہ کتابیں بھی شائع نہیں ہوتیں۔

کشمیر سے مدراس تک اور جے پور سے کلکتہ تک میں نے مختلف شہروں کا دورہ کیا ہے اور کئی دوستوں نے مجھے اپنی تصانیف اپنے آٹوگراف کے ساتھ دیں۔ یہ سب معیاری ادب ہیں اور تقریباً سب ہی کتابیں مصنف نے اپنے صرفہ سے شائع کی ہیں جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ زبان و ادب اور تنقیدوں کے مسائل پر ہمارے ملک میں بہترین اردو ادب شائع ہو رہا ہے۔ لیکن یہ غیر منظم کام ہے۔ نیز اس کی تشہیر اور نکاسی کے کوئی موزوں ذرائع نہیں ہیں۔ اب اردو بورڈ اور انجمن ترقی اُردو کو ان مسائل پر غور کرنا چاہیئے کتابوں پر انعام کے بجائے کتابوں کی نکاسی اور اس کے لئے انجمن ترقی اُردو کے اشاعت گھر اور مکتبہ جامعہ کی ہمت افزائی اور مالی مدد کرنی چاہیئے تشہیر اور نکاسی کا انتظام کیا جائے۔ ہمارے ملک میں معیاری اردو ادب میں گرانقدر اضافہ ہوگا۔ ساہتیہ اکیڈیمی کی مطبوعات اور نیشنل ٹرسٹ کی مطبوعات کے تجربے سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صرف کتابوں کی اشاعت ہی کافی نہیں بلکہ اس کی تشہیر و نکاسی بہت ضروری ہے۔

کسی زبان کی ترقی کے لئے نیا عصری ادب نہایت ضروری ہے۔ خود حکومت اور ترقی اردو بورڈ نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اردو انسائیکلوپیڈیا، اردو ڈکشنری اور فنی و سائنسی کتابوں کی اشاعت کی طرف توجہ کی ہے جو یقیناً ایک اہم اور اثباتی اقدام ہے۔ اب ریاستی حکومتیں بھی اردو کتابوں کی اشاعت کے لئے مالی امداد یا انعامات دے رہی ہیں۔ اتر پردیش اور آندھرا پردیش میں حکومت نے شعراء اور ادیبوں کو اُن کی تصانیف کے لئے مالی امداد دینے کا تجربہ شروع کیا ہے۔ اب اُردو کتابوں کی اشاعت بڑھ رہی ہے۔

کتابوں کی نئے انداز سے اشاعت، آفسٹ میں طباعت اور اُن کی تشہیر و نکاسی کے لئے بھی ابھی سے منظم طریقوں کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ اس سلسلہ میں انجمن ترقی اُردو، مکتبہ جامعہ، ترقی اردو بورڈ اور ریاستی اُردو اکیڈیمی مشترکہ طور پر غور کریں تو اردو کتابوں کی نشر و اشاعت کے مسائل کو حل کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔

پالم پور تشریف لائیے

کانگڑا وادی میں سیّاحی کا مرکز
پٹھان کوٹ سے ۸۵ کلومیٹر پر
کلو، منالی اور دھرم سالا کی راہ میں

★ اب یہاں ایک ٹورسٹ بنگلہ ہے جس میں بہترین فرنیچر سے آراستہ سنگل اور ڈبل بیڈ سویٹ ہیں۔

★ دھولا دھار پہاڑی کا عظیم الشّان نظارا

★ چائے کے باغات اور صنوبر کے درختوں سے گھرا مقام

★ صحت افزا آب و ہوا

★ جوالا مُکھی کانگڑا اور ڈاڈھ کے تیرتھ استھانوں کے قریب

ریزرویشن اور دوسری سہولتوں کے لئے

ٹورسٹ آفیسر پالم پور (ٹیلی فون ۸۱)
سے رابطہ قائم کیجئے

جاری کردہ:۔ مینیجنگ ڈائریکٹر
ہماچل پردیش ٹورزم ڈولپمنٹ کارپوریشن (لیمیٹڈ)
کینیڈی ہاؤس شملہ-۴ (فون ۳۲۹۴)

قاری کے مسائل

دیویندر اسر

دیویندر اسر
۱۱/۴۷ ایسٹ پٹیل نگر، نئی دہلی

میں نے افسانے لکھے بھی ہیں اور پڑھے بھی، لیکن گذشتہ چند برسوں میں میں نے بہت کم افسانے لکھے ہیں اور بہت کم پڑھے ہیں۔ میں نے بارہا سوچنے کی کوشش کی کہ اس کا باعث کیا ہے؟ کیا یہ اُس دیرینہ مرض کی نشاندہی تو نہیں جس سے "آغازِ عالمِ پیری" کا احساس ہوتا ہے؟ یا اس کا باعث "ستم ہائے روزگار" ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ اس کا اصلی باعث یہ ہو کہ افسانے کی تخلیق اور اس سے زیادہ افسانے کا مطالعہ ایک لایعنی اور لاحاصل عمل محسوس ہونے لگا ہو۔ اب تو بعض حضرات یہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ موجودہ دور میں ادب زندگی کے لئے ایک غیر متعلق مسئلہ ہے۔ ادب پڑھنے کی کسے فرصت اور کیا ضرورت ہے؟

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے عمل میں میرے ذہن میں کئی اور سوالات جنم لیتے ہیں۔ میں افسانہ کیوں پڑھتا ہوں؟ اور کیوں نہیں پڑھتا۔ بحیثیت قاری میرا مسئلہ کیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ میرا مسئلہ، ہر قاری کا مسئلہ نہ ہو۔ یا بیشتر قارئین کے لئے ادبی مطالعہ کا جواز "ادبی" نہ ہو کر "غیر ادبی" ہو۔

اگر ہم تنقید نگاروں کی اصطلاحات میں سوچنے کی کوشش کریں تو اس سوال کا جواب بہت سہل ہے۔ میں ادبی تخلیق کا مطالعہ تمالیاتی حظ یا حقیقت کا ادراک حاصل کرنے کے لئے کرتا ہوں۔ کیا میں افسانہ اس لئے پڑھتا ہوں کہ میرے علم میں اضافہ ہو۔ جس دور میں ہم زندہ ہیں اس میں حقائق کے علم کی کمی نہیں، بلکہ انفارمیشن ایکس پلوژن (INFORMATION EXPLOSION) ہے۔ ماس میڈیا ہر قسم کے علم۔ سائنس، تکنالوجی، نفسیات، سماجیات وغیرہ کو نئی سے نئی تحقیقات اور اصولوں کو انسان کی رسائی کے دائرے میں لے آیا ہے۔ انسانی ذہن کے ہر گوشے، اس کی عمیق ترین نفسیات، جنسی محرکات، ذہنی ساخت، شخصیت کے پیچ و خم، شعور، تحت الشعور اور لاشعور عمل، سماجی عوامل، فکر، احساس اور عمل، جبر و اختیار غرضیکہ ہر گوشے کی آگاہی دوسرے علوم سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ پھر ادب کی ہماری زندگی میں کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میں افسانہ یا نظم، ناول اور ڈرامہ پڑھتا ہوں۔ کیونکہ ادب اعداد و شمار، حصولِ علم کا ذریعہ یا اس کا بدل نہیں بلکہ زندگی کی حقیقت اور فرد کی حسیت کے ایک نئے امتزاجی پیٹرن کا نام ہے جو علم محض سے ممکن نہیں۔ روزمرہ کی زندگی اور افسانوی کردار کے مابین ایک مہین سی جھلی ہے جو دیوارِ چین نہیں لیکن جو زندگی سے منسلک ہوتے ہوئے بھی اُسے زندگی کی ریاست سے فن کی عملداری میں لے آتی ہے جس کے باعث اس کا کردار، اس کا طرزِ زندگی اور حقوقِ شہریت بدل جاتے ہیں۔ کیونکہ عام تارکِ ایک ریاست سے دوسری ریاست میں غیر قانونی طور پر داخل ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے فن کے ضابطے کے بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جو فن اور زندگی دونوں کے لئے مہلک ثابت ہو سکتے ہیں۔

بحیثیت قاری میرے لئے یہ سوال بڑا اہم ہے کہ کسی فن پارے میں حقیقت اور تصورِ تخیل اور ادراک، وجدان اور فلسفہ، احساس اور فکر، رومان اور صداقت، تکنیک اور موضوع، پلاٹ اور ٹیکسچر، جذبات اور علامت، پیٹرن اور تسلسل، زماں اور مکاں، لمحہ اور نقطۂ نظر، کردار اور منظر، حسن اور بصارت کے علاوہ حرکت، رنگ، لَے، شکل، جذبہ، قدر ایک مکمل پیٹرن کس طرح اختیار کرتے ہیں اور احساس کی گہرائی میں کس طرح اترتے

دیویندر اسر

وہاب دانش

حکیم منظور

ہیں؟ اور جب روزمرّہ کی خارجی حقیقت اور حواس سے محسوس ہونے والی حقیقت سے پرے افسانہ زندگی کی اصلیت کی تمثیل بن جاتا ہے اور حقیقت کا نیا روپ، نیا تصوّر اور شعور پیش کرتا ہے تو اس کے تاثر میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ ایسا روپ، تصوّر اور شعور علم کے اکتسابی مطالعے یا زندگی کے براہِ راست مشاہدے سے میسر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ تخلیق نہ صرف ادیب کے لئے بلکہ قاری کے لئے بھی ایک مشترکہ داخلی تجربہ بن جاتی ہے۔ عام طور پر جب کوئی قاری ابہام کی شکایت کرتا ہے تو اس کا بیشتر باعث یہی ہوتا ہے کہ وہ اس نئے پیٹرن میں داخل ہونے کے بجائے اپنے خودساختہ پیٹرن میں ہی رہ کر اس کی تفہیم کرنا چاہتا ہے جو مشترک داخلی تجربے کے لئے سدِ راہ ثابت ہوتا ہے اور ترسیل اور ابلاغ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ آج کے ادب کا مطالعہ ایک مجہول عمل نہیں بلکہ فعّال عمل ہے۔

میرے لئے افسانے یا ناول کی اہمیت محض تکنیک، اسٹائل یا پلاٹ (جیسے کرسٹوفر اشروڈ نے افسانے یا ناول کے لئے سم قاتل قرار دیا ہے) کے باعث نہیں بلکہ کردار اور زندگی کے اصل جوہر کے انکشاف میں ہے جس کی جستجو ریسرچ کے آلہ جات سے نہیں، تخیل اور بصیرت کے جوہر سے ہی ممکن ہے۔

ادبی مطالعہ "خالص ادبی اقدار" یا "جمالیاتِ مطلق" کی تسکین کا ذریعہ نہیں ہوتا کیونکہ اسمیں دوسرے سماجی اور نفسیاتی عوامل کارفرما رہتے ہیں۔ آج فرد کو جس نوعیت اور شکل کے تجربات، مشاہدات اور حوادث نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے اس کے لئے جمالیاتی تسکین کے بجائے مکروہ کے شعور نے لے لی ہے۔ یہ امر عین ممکن ہے کہ آج بھی قارئین کی بیشتر تعداد ادب کا مطالعہ ذاتی ذوق کی تسکین، تفنّنِ طبع یا جمالیاتی حظ کے لئے کرتی ہو۔ لیکن شہری اور صنعتی زندگی نے جس خوف، دہشت، تنہائی، خودبیگانگی، احساسِ گناہ، تردّد، تذبذب، تشکیک، احساسِ جلاوطنی، اجنبی پن، فنا کے خطرے اور زندگی کی بے معنویت اور لغویت کو جنم دیا ہے، وہ آج جمالیاتِ محض کی تسکین کی نہیں، سوالات کی فراوانی، احساسِ گناہ اور فرد کی بے مائیگی، جھلاہٹ، غصّہ اور باغیانہ جذبے کا مطالبہ کرتی ہے۔ موجودہ ادب کی ماہیت میں جو غیر معمولی تبدیلی ظہور پذیر ہوئی ہے اُسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

چونکہ ہمارا ادب ان مسائل سے نبرد آزما ہونے میں تذبذب کے دور سے گذر رہا ہے میرے اور اس کے درمیان ذہنی فاصلہ بڑھتا جارہا ہے اور جب بھی ہمارا جدید ادب اِن مسائل سے دوچار ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ تو اس میں وجودی دہشت کے بجائے بوراقی دہشت کا عنصر زیادہ غالب رہتا ہے کیونکہ ایسے ادب میں حصولِ لذّت اور حقیقت کے عناصر یکجا ہوجاتے ہیں۔ میرے نزدیک مطالعہ حقیقی تسکین کا نعم البدل نہیں اور نہ ہی نفسی دباؤ کو کم کرنے اور نفسی ضرورتوں کے درمیان توازن قائم کرنے کا ذریعہ ہے نہ ہی یہ دبی ہوئی خواہشوں کے اخراج کا راستہ یا کتھارسس (CATHARSIS) کا عمل ہے۔ کسی حد تک یہ ارتفاعی عمل ضرور ہے۔ لیکن کسی بھی صورت میں خارجی یا نفسی حالات کی تلافی کا باعث نہیں۔ ہاں اکثر ایسا ہوا ہے کہ موجودہ زندگی میں حالات کو برداشت کرنے پر مجبور ہونے کے باعث احساس گناہ جب شدّت اختیار کرلیتا ہے تو مطالعہ کی خواہش بڑھ جاتی ہے کیونکہ جب کوئی اوّلین عمل کا اہل نہیں ہوتا تو وہ اس قسم کا ثانوی عمل اختیار کرتا ہے۔ ایسی صورت میں میں ایسے ادب کو پڑھنا پسند کرتا ہوں جو کلائمکس کی کی جانب نہیں بڑھتا بلکہ کرائسس کو ایک مستقل صورت کی شکل میں پیش کرتا ہے۔

جب فلابیر اپنے ناول مادام بوواری (ایما) میں ایما کی خودکشی کا بیان تحریر کررہا تھا تو اس نے اپنے جسم میں زہر کے اثرات محسوس کئے اور اس نے کہا۔ "میں ایما ہوں"۔

جب تک افسانہ نگار کا "میں" افسانوی کردار کا "میں" اور میرا "میں" ایک دوسرے کے رگ وپے میں سرایت نہیں کرجاتے۔ ایک دوسرے کے نفس میں گہرے نہیں اُتر جاتے اس وقت تک ادیب اور قاری کا ذہنی فاصلہ نہیں مٹ سکتا۔ اور اس اشتراک کے بغیر مطالعہ قاری کے لئے محض ایک بیانیہ تحریر ہے، ایک تجربہ نہیں۔ اور بغیر اس تجربے کے مطالعہ جستجو اور انکشاف کا حامل نہ ہوکر ایک لایعنی عمل بن جاتا ہے۔

وہاب دانش

لوئر بازار، رانچی (بہار)

قارئین کے مسائل کیا ہیں۔ ایک عام قاری اور ادب کا ہیدار طالب علم آج کن مسائل سے دوچار ہے اس پر ٹھنڈے دل سے اگر غور کیا جائے تو مندرجہ ذیل مسئلوں اور دشواریوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱۔ ۱۔ غیر ملکی ادبی مسلک و نظریئے کی آمد اور خارجی دباؤ سے اردو ادب کے فکری اور منطقی نظام کے اندر خلفشار

۲۔ کسی بھی تحریک یا رجحان کی بڑھتی ہوئی طاقت سے متاثر ہوتے ہوئے اذہان اور توجہ ادبی قدروں کا انہدام۔

۳۔ اُردو ادب کے اندر ادبی گروہ بندیاں، اجارہ داری، تعصب، علاقہ پرستی اور تیسرے درجے کے مکتوبی ناقدین کی بھرمار۔

۴۔ نظم و نثر میں شدید قسم کی داخلیت کی بنا پر مبہم تخلیقات کی کثرت، تجریدی اور علامتی انداز کے بہانے ناقابلِ فہم چیستانی تحریروں کی بہتات۔

۵۔ اُردو زبان کی نازک و ناگفتہ بہ حالت اور حکومت کی چشم پوشی و عدم توجہی۔

آج کا سرمایا اور پرانا قاری مندرجہ بالا مسائل سے دوچار ہے۔

۱۹۳۶ء کے بعد اُردو ادب میں جس ادبی نظریئے نے اپنی جڑیں دور دور تک پیوست کر دی تھیں اور کسی حد تک ایک خاص گروہ کی ایک ذہنی تہذیب و تعمیر کا کام مکمل کر دیا تھا۔ وہ ۱۹۵۰ء کے بعد اچانک اپنے اثرات کھو کر عہدِ ماضی کی داستان بن گیا اور اس عرصے کے درمیان جن لوگوں نے اس ادبی نظریئے کی حمایت میں خود کو باذوق قارئین کے زمرے میں شامل کیا تھا اُن کے لئے آج کوئی ٹھوس زمین موجود نہیں۔ آج کے نئے ادبی رجحان کے ساتھ اُن کی وفاداریاں مشکوک سمجھی جاتی ہیں۔ حالانکہ تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہر بیس پچیس سال کے اندر ادب میں اچانک تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جن میں خود کوئی ثبات نہیں ہوتا۔ لہٰذا کون جانتا ہے کہ آج کے جدید ادب کے پرستار قارئین کا حشر کیا ہوگا۔ بنیادی مسائل وہی رہیں گے جو آج ہیں۔ یعنی غیر ملکی ادبی مسلک و نظریئے کی آمد اور خارجی دباؤ سے اُردو ادب کے فکری اور منطقی نظام میں خلفشار اور قارئین کے لئے ذہنی کرب اور امتحان کا لمحہ۔ کیونکہ ترقی پسند ادب اور جدید ادب کی آپسی چپقلش کے باعث ادب کا کوئی واضح تصور آج کے قاری کے ذہن میں مرتسم نہیں ہو سکا۔ بلکہ اس دو دہائی کے اندر ادبی قدروں کی جس سرعت و سختی کے ساتھ شکست و ریخت ہوئی ہے اُس نے تو آج کے ایک عام قاری کو ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا ہے۔

آج کے اُردو رسالوں اور پرچوں کو اُٹھا کر دیکھ لیجئے اور اندازہ لگائیے کہ قارئین کو بے وقوف بنانے، آزمائش اور ذہنی ورزش میں مبتلا کرنے اور پہیلیاں بجھانے کے کس قدر نت نئے سامان موجود ہیں۔ اگر کسی پرچے میں پچیس غزلیں ہیں تو کمسنیت کا یہ عالم ہوگا کہ اگر شعراء کے نام چھپا دیئے جائیں تو ایسا لگے گا کہ کسی ایک ہی شاعر نے ساری غزلیں ایک ہی نشست میں کہہ ڈالی ہیں۔ نظموں کا معاملہ یہ ہوگا کہ چند ایک کو چھوڑ کر باقی تمام نظمیں دوسروں کے دسترخوان سے چرائی ہوئی ٹڈیاں ہوں گی۔ افسانے ہیں۔ سے شروع ہو کر ذات کی دھند کے اندھے سفر میں نہایت بے ربط اور واہیات قسم کی تجریدیت پر تان توڑتے ملیں گے۔ اور تبصروں میں یا تو سراسر بے ایمانی اور جھنجھلاہٹ ملے گی یا پھر دل سے نکلے ہوئے غبار کا فوارہ — یا پھر تعریف کا اتنا لمبا پل ملے گا کہ آپ توصیفی جملوں کے ساتھ چلتے چلتے خود ہی تھک کر بیٹھ جائیں گے۔ باقی رہ گئی بات تنقید کی تو آپ کو یہ اندازہ ہی نہیں ہو سکے گا کہ ہمارے خود ساختہ ناقد کے پاس اپنا تنقیدی شعور کتنا ہے۔ مگر اس بات کا اندازہ ضرور ہو جائے گا کہ غیر ملکی ناقدین کی انتقادی آراء سے اُس نے کتنے پُرفریب جملے گڑھ کر خود کو بڑا ناقد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

کسی بھی زبان کی تنقید حقیقت میں قارئین کی ذہنی تہذیب میں بے مثال رول ادا کرتی ہے۔ اگر ایک ناقد کی تنقید، تخلیق کی سرحدوں کو چھوتی ہے اور اگر اُس زبان کے ادب میں تخلیقی تنقید کا اچھا خاصا سرمایہ موجود ہے تو قارئین کے ذوق کی آبیاری اور صحت مندی کی گویا ضمانت مل جاتی ہے اور پھر کسی بھی ادبی دور میں باشعور اور باذوق قارئین کا مسئلہ اس قدر سنگین نہیں ہوتا۔ مگر آج کے قارئین کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ آج ایسے ناقدین کی سخت قلت ہے جو کسی بھی فن پارے کو ایک فن کار کی ذہنی اور شعوری تھرتھراہٹ کے ساتھ محسوس کر کے اُس کی خوبصورتی، بلندی، عظمت اور جمالیاتی پہلو کے رازہائے سربستہ سے لوگوں کو روشناس کرا سکیں۔ یہاں تو عالم یہ ہے کہ کسی بھی فن پارے کا عملی اور تجزیاتی مطالعہ تو کجا، سرسری جائزہ لیتے وقت بھی لوگ اپنا ناقدانہ منصب بھول جاتے ہیں اور غریب قاری کی کبھی صحیح فیصلے تک رسائی نہیں ہوتی۔

لہٰذا ایک قاری کی حیثیت سے میں نے بارہا محسوس کیا ہے کہ آج کی ادبی ہنگامہ آرائی میں اپنی رائے محفوظ رکھنا اشد ضروری ہے مگر اس کے باوجود شامت آ ہی جاتی ہے۔ لوگوں کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس مجموعۂ کلام پر اس تخلیق پر کھل کر رائے دی جائے۔ خاموشی وبالِ جان اور گفتگو موت کا سامان بن گئی ہے۔ یعنی گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل اس مصیبت میں میں ہی اکیلا گرفتار نہیں بلکہ اگر پورے ہندوستان کا سروے کیا جائے تو ایک اچھی خاصی تعداد ایسے قارئین کی نکل آئے گی جو فن کار یا کسی صنفِ ادب سے دلچسپی رکھنے کے باوجود آج کے ادبی اکھاڑے کے چاروں طرف خاموش تماشائی ہو کر رہ گئے ہیں۔

پورے ملک میں سنجیدہ، باشعور، اور باذوق قارئین کا فقدان نہیں ہے مگر اُن کے کیا مسائل ہیں۔ اس بات پر توجہ دینے کی زحمت کوئی مول لینا نہیں چاہتا۔ پرچوں کے مدیر صرف پرچہ بند ہو جانے کی

دھمکیاں دیتا جانتے ہیں۔ ادیب اور شاعر نے خود کو ذات کے خول کے اندر بند کیا ہے۔ اُن کے سامنے قارئین کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ظاہر ہے کہ قارئین کے وجود کو جب تک فن کار تسلیم نہیں کرتا مسئلے کا حل ممکن نہیں اور بہت ممکن ہے کہ یہ زبان اپنی چیستانی تخلیقات اور اَدب کے ساتھ صرف پرچوں میں سمٹ کر رہ جائے اور یہ پرچے اور رسالے بغیر کسی اعلان کے دم توڑ دیں۔

ایک سنجیدہ قاری کو اس سے سروکار نہیں کہ آج کا ادبی رجحان ترقی پسند تحریک کی توسیع ہے یا اپنے طور پر بالکل آزاد اور خود مختار رویہ۔ کیونکہ قاری کے سامنے تو صرف تخلیق ہوتی ہے اور اس تخلیق کے آئینے میں وہ عوامی آگہی، عوامی شعور، اپنے دکھ درد کی جھلک اور اجتماعی و ذاتی مسائل کا پرتو دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا مطالبہ ایک اچھی تخلیق سے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ فنکار نے کس حد تک وقت کی آواز کو افسانے، نظم اور غزل یا ادب کی دوسری اصناف میں مقید کرنے کی سعیٔ بلیغ کی ہے اور کس حد تک اس کے ذوق جمالیات کو اس فن پارے سے تسکین ملتی ہے۔ انبساط حاصل ہوتا ہے اور روح کو بالیدگی نصیب ہوتی ہے۔

حکیم منظور

۱۳۔ حکیم منزل، اخون صاحب (گوجوارہ)

سرینگر، کشمیر

ایک قاری کی حیثیت سے میرے کیا مسائل ہیں؟ اُن سے بحث کرنا یا اُن کی نشاندہی کرنا جتنا آسان ہے اُتنا ہی مشکل بھی ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ بحیثیت قاری میرا کوئی مسئلہ نہیں۔ مجھے جو کچھ پڑھنے کو ملتا ہے میں پڑھتا ہوں، جتنا سمجھ میں آتا ہے وہ سمجھتا ہوں اور جو سمجھ میں نہیں آتا اُسے نظر انداز کر دیتا ہوں۔ یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے کچھ مسائل کا احساس صرف اُس وقت ہوتا ہے جب مجھے وہ کچھ پڑھنے کو نہیں ملتا، جو میری پسند، میرے مطلب، میرے معیار اور میرے ذوق کے مطابق ہو۔ مفصل طور سے مسائل کا تعین کرنا میرے خیال میں اس بات کے فیصلے کے ساتھ وابستہ ہے کہ میں کس مزاج، معیار اور ذوق کا قاری ہوں؟ اگر میں ایک ایسا قاری ہوں جو ادب کا سنجیدہ مطالعہ کر کے اُسے سمجھنے اور اُس سے کچھ اخذ کرنے کا خواہش مند ہے تو میرے مسائل یقیناً اس قاری سے مختلف ہوں گے، جو مطالعۂ ادب کو وقت گذاری کا ایک ذریعہ خیال کرتا ہے۔ یا کام

اس وقت اردو ادب کے قارئین کی اقسام گنوانا نہیں، اپنے مسائل اجمالی طور پر بیان کرنا ہے۔

پچھلے کچھ برسوں کو زندگی کے ہر شعبے میں روایات اور مسلّمات کی شکست و ریخت کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ چونکہ ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے اس شکست و ریخت کی زد سے ادب بھی بچ نہیں سکا ہے۔ جہاں زندگی اور اس کے مسائل کی طرف بین الاقوامی طور پر ہمارے طرزِ فکر میں ایک بنیادی تبدیلی اور فرق نمودار ہوا، وہاں ادب میں بھی اس کے ردِّ عمل کے طور پر نئے اسالیب، نئے انداز اور نئے ذہن نے جنم لیا۔ موجودہ دور کی بڑھتی ہوئی ٹیکنوکریسی (TECHNOCRACY) اور مشینیت نے قوموں کے دائرے سے نکل کر افراد اور فرد کو بھی متاثر کیا ہے۔ نتیجتہً جن افراد کے ہاتھوں میں قلم تھا انہوں نے اس کرب اور درد کو صفحۂ قرطاس پر پھیلا دیا جو اِن افراد کو علی الخصوص اس دور نے تحفتاً عطا کئے۔ شاید یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ موجودہ دور کا ذہن جتنا کرب آلود اور اُلجھا ہوا ہے اُتنا کسی بھی زمانے کا ذہن نہیں رہا ہے۔ ذہن کی یہ اُلجھن اور کرب ہمارے پچھلے کئی برسوں کے تخلیق شدہ ادب کے بیشتر حصّے میں کسی نہ کسی صورت میں نمودار ہوئے ہیں۔ چونکہ ذہنوں کا یہ اُلجھاؤ اور کرب کم و بیش ہر ایک کو نصیب ہے، اس لئے اس میں ایک قاری اور ایک ادیب کے اُلجھاؤ اور کرب میں بہت زیادہ فرق نہیں ہو سکتا، لیکن اس کے باوجود جہاں اس ادب کا بیشتر حصّہ میں ایک موجودہ دور کا ذہن رکھنے والے قاری کی حیثیت سے اچھی طرح سمجھتا ہوں، وہیں کچھ حصّہ یقیناً ایسا رہ جاتا ہے جو میری سمجھ سے بالاتر نہیں بلکہ بعید بھی ہے (مثالیں دینا اصل مسئلے سے ہٹ کر تنقید کی طرف آنا ہوگا اس لئے میں اس سے گریز کرتا ہوں) ہو سکتا ہے کہ میرا ذہن اُس سرعت کے ساتھ بدلنے میں ناکام رہا ہو جس سرعت کے ساتھ ایسا ناقابلِ فہم ادب تخلیق کرنے والے قلم کاروں کا ذہن بدل گیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے قلم کار تقلیداً اور شعوری طور پر ایسا ادب تخلیق کر کے خود کو نمایاں کرتے ہوں۔ بہرحال اس مشینی دور میں جب کہ تصوّرِ وقت بھی اثر انداز ہوا ہے، ادبی معمّات حل کرنے میں وقت صرف کرنا بذاتِ خود ایک مسئلہ ہے، اور فی الوقت میرے لئے ایسے ادیب اور ایسا ادب دونوں ہی ایک مسئلہ ہیں۔ اسی طرح وہ ادب بھی میرا مسئلہ ہے جو زندگی کے جدید تصور اور اس کے موجودہ تقاضوں سے ناآشنا، فلسفہ و ارتقاء کے انکار کی حد تک قدامت زدہ ہے۔

میرا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ میں جس ادب کا متمنّی ہوں، یعنی ایسا ادب جو ناقابلِ فہم بھی نہیں اور قدامت زدہ بھی نہیں، وہ مجھے کہیں مجموعی صورت میں نہیں ملتا۔ موجودہ دور میں ادب بھی،

تجارتی سا ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لئے جتنے بھی رسائل ہیں وہ خریداری کے مسئلہ کے پیشِ نظر ہر قسم کی تخلیقات سے پُر ہوتے ہیں اور ان میں میرے ذوق اور معیار کا بہت کم مواد ملتا ہے۔ پستش بہ غایت پست اور بلندش بسیار بلند کے مذاق کا نمونہ بیشتر کتابیں بھی ہیں اور بحیثیت قاری کے "کیا کیا خضر نے سکندر سے" والی بات مجھ پر صادق آتی ہے کیوں کہ کوئی بھی رسالہ یا کتاب مکمل طور پر میری تشنگی بجھانے کا سامان بہم نہیں کرتی۔

ادبی رسائل اور کتابوں کی دستیابی کا مسئلہ بھی میرے لئے بہت اہم ہے۔ میرے اپنے اندازے کے مطابق ملک میں چھپنے والی ۹۰ فیصدی سے زائد کتابیں اور رسائل میرے یہاں ملتے ہی نہیں۔ نہ پبلشر ہی اپنے تجارتی اصولوں کے پیشِ نظر میرے یہاں کے بک اسٹالوں اور کتب فروشوں کو قابلِ توجہ سمجھتے ہیں اور نہ ایسے کتب فروش اور بک اسٹالوں کے مالکوں کو ہی اپنے تجارتی اصولوں کے پیشِ نظر اس طرف توجہ کرنے کی کوئی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ براہِ راست منگوانے میں پبلشرز کی بے اعتنائی اور ڈاک کی بے انتظامی کا خدشہ ہمیشہ لاحق رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ رسائل اور کتابوں کی عدم دستیابی ایک بہت بڑے مسئلے کی حیثیت میں مجھے درپیش ہے۔

موجودہ دور میں کتابوں اور رسائل کے گٹ اپ کی بات خاصی اہم ہو گئی ہے۔ ہمارے یہاں بیشتر کتابوں اور رسائل کا گٹ اپ کسی بھی معیار سے معیاری نہیں ہوتا ہے اور ایسی کتاب اور رسالہ کے مواد سے جانکاری حاصل کئے بغیر اُسے خریدنے کو جی نہیں کرتا۔ اچھی طباعت اور اچھی کتابت کی اہمیت شاید کسی تفسیر یا تشریح کی محتاج نہیں، مگر اسکے باوجود اکثر کتابوں اور رسالوں کی طباعت اور کتابت اتنی ناقص ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ بحیثیت قاری رسائل اور کتابوں کا غیر معیاری گٹ اپ اور ان کی ناقص کتابت اور طباعت بھی میرے مسائل میں شامل ہیں۔

ایک اور اور شاید سب سے بڑا مسئلہ کتابوں کی قیمتیں ہیں۔ رسائل کا ذکر میں اس لئے نہیں کرتا کہ وہ ایک ESTABLISHMENT کے تحت نکلتے ہیں اور اُن کے ذرائع اور اخراجات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، اُن کی قیمتوں کو ادب کے فروغ کے نام پر برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن کتابوں کے بارے میں یہ صورتِ حال ناقابلِ فہم ہے۔ پچھلے برسوں میں سو ڈیڑھ سو سے کم صفحات والی کتابوں کی قیمت بھی دس روپے رکھی گئی۔ پچھلے دنوں کسی صاحب نے اپنی کتاب کی قیمت ۵۰ روپے مقرر فرمائی۔ ظاہر ہے کہ اس امر کے باوجود کہ میں ایک صاحبِ ذوق قاری ہوں میرے لئے یہ کتاب ہزار خواہش کے باوجود خریدنا ناممکن ہے۔

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

بقیہ: مرکزی حکومت اور اُردو

ڈی اے وی پی:- ترقیاتی اسکیموں کے بارے میں مختلف کتابچے، فولڈر اور اشتہارات شائع کرتا ہے۔ یہ محکمہ اخبارات و رسائل کے لئے ایک نہایت اہم ذریعۂ آمدنی بھی ہے۔ کیونکہ یہ محکمہ مختلف وزارتوں کے اشتہارات و پوسٹر کی ڈیزائن بناتا ہے بلکہ اُن کو مختلف رسالوں اور اخباروں میں چھپواتا بھی ہے۔ غیر سرکاری اشتہار کمپنیاں محض اس بنا پر اشتہارات دیتی ہیں کہ کسی جریدے کے خریداروں کی تعداد کتنی ہے۔ لیکن ڈی اے وی پی اشتہارات کی تقسیم میں چھوٹے اور متوسط جریدوں کا خاص خیال رکھتا ہے اور چونکہ اُردو کے نوے فی صدی جرائد اسی نوعیت کے ہیں لہٰذا اُن کو خاص طور پر فائدہ پہنچتا ہے

آل انڈیا ریڈیو: آل انڈیا ریڈیو کے ۲۱ اسٹیشنوں سے اُردو میں پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ یہ اسٹیشن ہیں، سرینگر، جموں، جالندھر، دہلی، لکھنو، الہ آباد، پٹنہ، رانچی، جے پور، بنگلور، دھارواڑ، حیدرآباد، وجے واڑہ، بھوپال، اندور، بمبئی، کلکتہ، شملہ، متھرا، ناگپور اور لیہہ۔ ان کے علاوہ ریڈیو کی ایکسٹرنل سروس سے روزانہ ساڑھے نو گھنٹے کا اُردو پروگرام نشر ہوتا ہے جس سے جناب سلام مچھلی شہری صاحب وابستہ ہیں۔ دوردھ بھارتی سے بھی وقتاً فوقتاً اُردو پروگرام نشر ہوتے رہتے ہیں۔ اُردو نشریات کے خاص مراکز سری نگر، دہلی، حیدرآباد، لکھنو، پٹنہ، بھوپال اور جموں ہیں۔ دہلی سے روزانہ اُردو خبریں نشر ہوتی ہیں۔ جنہیں سرینگر، جموں، جالندھر، شملہ، لکھنو، پٹنہ، رانچی اور حیدرآباد سے ریلے کیا جاتا ہے۔

دہلی اسٹیشن سے ایک روزانہ پروگرام "اردو مجلس" کے نام سے دوردھ بھارتی کے میٹروں پر نشر ہوتا ہے۔ اس کے پروڈیوسر جناب رفعت سروش صاحب ہیں۔ ہیڈ کوارٹرس میں ایک عرصے تک جناب ساغر نظامی صاحب ڈپٹی چیف پروڈیوسر اُردو رہے۔ اب اس عہدے پر جناب کمال احمد صدیقی صاحب تعینات ہیں۔

آئندہ شمارے کے متوقع شرکاء

- قرۃ العین حیدر
- علی جواد زیدی
- ساغر نظامی
- جاں نثار اختر
- جگن ناتھ آزاد
- گوپی چند نارنگ
- ظہیر صدیقی
- شہریار
- سلام بن رزاق

اور دوسرے

حسینی شاہد
پرنسپل اُردو آرٹس شبینہ کالج، حمایت نگر، حیدرآباد

درسی کتابوں کا مسئلہ

ہم بنیادی مسائل پر کم توجہ دیتے اور فروعات پر زیادہ خیال آرائی کرتے ہیں۔ اُردو تحریک بھی اسی کوتاہی کا شکار ہے جب کبھی موقع ملتا ہے ہم حکومت پر نکتہ چینی سے نہیں چوکتے لیکن خود اپنا محاسبہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے اُردو کے تعلق سے غفلت برتی ہے اور نظم و نسق اس کا حق پامال کرتا رہا ہے لیکن ہم کب اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

اُردو نصاب اور درسی کتابوں کے مسئلہ ہی کو لیجئے۔ نامساعد حالات کے باوجود اس بارے میں بہت کچھ کیا جا سکتا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم نے اس مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُردو کے نصاب سے طالب علم کو وحشت اور درسی کتابوں سے نفرت محسوس ہونے لگی ہے۔ ہمارے مقتدر اداروں کو جھنجھوڑا جاتا ہے تو کوئی کمیٹی بنا دی جاتی ہے اور بس۔ کبھی کسی کانفرنس میں یہ مسئلہ زیر بحث آتا ہے۔ لیکن کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ کبھی اخبار اور رسائل میں مضامین اور اداریے شائع ہوتے ہیں لیکن ان میں جو تجویزیں پیش کی جاتی ہیں اُن کو روبہ عمل لانے کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو نصاب اور درسی کتابوں کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اگر اس مسئلہ کو ہمارے اہل علم، اساتذہ اور ادارے آج بھی درخور اعتنا نہ سمجھیں تو اُردو تعلیم کی تباہی یقینی ہے۔

اُردو کی درسی کتابیں تین طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو اُردو کو ایک مضمون اختیاری کی حیثیت سے پڑھانے کے لئے مرتب کی جاتی ہیں۔ دوسری وہ جو اُردو کو بحیثیت زبان پڑھانے کے لئے ہیں اور تیسری وہ جو اُردو ذریعۂ تعلیم کے طلبا کے لئے سائنس، اور سماجی علوم کی تعلیم کے لئے تصنیف، تالیف یا ترجمہ کی جاتی ہیں۔

پہلی شق کی کتابیں تو بُری بھلی مل جاتی ہیں لیکن دوسری اور تیسری شق سے تعلق رکھنے والی کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

اُردو ایک مضمون کی حیثیت سے ابتدائی درجوں سے لے کر یونیورسٹی سطح تک پڑھائی جاتی ہے۔ انٹرمیڈیٹ اور ڈگری کورس میں طلبہ علاقائی زبان یا زبان دوم کی حیثیت سے بھی اُردو لیتے ہیں۔ مدارس اور کالجوں سے ہٹ کر بھی اُردو پڑھنے والوں کا ایک گروہ ہے جو تعلیم بالغان کے تحت آتا ہے اور ان سب کی استعداد، نفسیات اور ضرورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ اس لئے ہر گروہ کی درسی کتابوں کی نوعیت بھی علیحدہ ہونی چاہئے۔

درسی کتابوں میں قاعدے کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے بھی پوشیدہ نہیں لیکن اُردو کے طالب علم کی بدقسمتی اور اُردو تعلیم کی کم مائیگی کا پورا پورا اندازہ اُردو قاعدے سے لگایا جا سکتا ہے۔ یوں تو بازار میں بیسیوں قاعدے مل جائیں گے لیکن ان میں ڈھنگ کا شاید ہی نظر آئے۔ اکثر قاعدوں کی کتابت ناقص، طباعت بُری، اور کاغذ اس قدر گھٹیا ہوتا ہے کہ بچہ اُن کی طرف دیکھنا تک گوارا نہیں کرتا۔ جن کی طباعت کتابت اور گٹ اپ نسبتاً بہتر ہوتا ہے وہ اپنے دقیانوسی طرز کی وجہ سے کارآمد نہیں ہوتے۔ ایسا قاعدہ آپ کو شاید ہی ملے گا جو صوری اور معنوی ہر دو اعتبار سے جدید معیار پر پورا اترتا ہو اور اور جس کو انگریزی زبان کے قاعدوں کے مقابل نہ سہی خود ہندوستان کی کسی اور زبان کے قاعدے کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے۔ اِدھر چند سال پہلے حکومت مہاراشٹرا کی طرف سے "اُردو بال بھارتی" کے نام سے ایک قاعدہ شائع ہوا تھا جو بہت اچھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس معیار کے دو ایک قاعدے اور مل جائیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ اُردو کے ادارے بالخصوص انجمن ترقی اُردو ہند اس طرف توجہ کرے اور ان قاعدوں کو بنیاد بنا کر یا اپنے طور پر جدید اصولوں کی روشنی میں کوئی ایسا قاعدہ مرتب اور شائع کرے جو دیدہ زیب اور خوبصورت بھی ہو اور ہماری بنیادی تعلیم کی ضرورتوں کو بھی بہ وجوہ احسن پورا کرے۔

قاعدے کے بعد ابتدائی اور پھر ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح کی درسی کتابوں کا مسئلہ آتا ہے۔ یہ مرحلے بہت اہم ہیں۔ درس و تدریس کے اصولوں، مقاصد اور طریق کار کی تفصیل میں گئے بغیر اس موقع پر صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ ابتدائی مدارج میں طالب علم کو زبان سکھانا اور اُس کے ذخیرہ الفاظ میں تدریجاً اضافہ کرنا مقصود ہوتا ہے یہاں تک کہ اس میں لکھنے پڑھنے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ اس لئے درسی کتابیں ایسی ہونی چاہئیں جن کا مقصد معلومات میں اضافہ کرنا نہیں۔ بلکہ سائنٹفک انداز میں زبان سکھانا ہو۔

ہمارے ہاں بچوں کے ادب کا وہ ذخیرہ نہیں ہے جو نصابی ضرورتوں کی تکمیل کر سکے اور ہم میں کوئی آزاد اور تمثیل میرٹھی بھی نہیں جو اس کمی کو خود سے پورا کر سکے۔ اس لئے یہ کام کسی ایک فرد سے لینے کی بجائے ایسے منتخب ماہرین سے لینا چاہئے جو بچوں کی نفسیات، ان کی ذہنی استعداد اور بدلے ہوئے لسانی اور سماجی ماحول سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ اور جن میں درس و تدریس کو دلچسپ اور شگفتہ بنانے کی صلاحیت بھی ہو۔ رائج درسی کتابوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے مرتب کرنے والوں میں اکثر وہ ہیں جو ان صلاحیتوں سے بڑی حد تک محروم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کتابوں سے بچوں کو نہ کسی قسم کی دلچسپی ہوتی ہے اور نہ وہ زبان سیکھنے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

ثانوی سطح پر زبان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ادب سے بھی روشناس کرایا جاتا ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ یہ مرحلہ ختم کرتے کرتے طالب علم کو زبان پر ایک حد تک قدرت اور ادب سے واقفیت پیدا ہو جائے گی۔ وہ آسانی کے ساتھ صحیح زبان میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کر سکے گا۔ اس لئے ثانوی سطح کی درسی کتابوں کے مرتبین پر دہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ایک تو زبان کی استعداد بڑھانے کی رفتار کو تیز کرنا اور دوسرے درجہ بدرجہ ادب سے متعارف کرانا۔ اس مرحلے پر زبان کے ساتھ ساتھ موضوع مواد، اور اسلوب کو بھی اہمیت حاصل ہوتی جاتی ہے۔ ابتدائی سطح کے مقابلے میں ثانوی اور اعلیٰ ثانوی کی درسی کتابوں کا مرتب کرنا آسان ہے۔ اس لئے کہ مطلوبہ مواد کی فراہمی مشکل نہیں۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ مرتبین اپنی سہل انگاری، کتابیں فراہم کرنے والے اداروں کی اجارہ داری یا محکمۂ تعلیم کی پالیسی کی وجہ سے ادھر کئی برسوں سے کوئی اچھا انتخاب پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ آپ کوئی سی درسی کتاب اٹھا لیجئے اور پوری کتاب آغاز سے خاتمے تک پڑھ جائیے، یہ اندازہ کرنا مشکل ہوگا کہ انتخاب کن اصولوں کے تحت اور کن مقاصد کے پیش نظر کیا گیا ہے یا وہ طلبا کی کن ضرورتوں کی تکمیل کرتا ہے۔ اس کوتاہی کی حسب ذیل وجوہ ہو سکتی ہیں۔

۱۔ درسی کتابیں کسی مقصد اور منصوبے کے تحت ترتیب نہیں دی جاتیں بلکہ فلموں کی طرح ایک فارمولے کے تحت مرتب کی جاتی ہیں۔

۲۔ مرتب تلاش جستجو اور انتخاب کی زحمت گوارا نہیں کرتا بلکہ پانچ سات پرانی نصابی کتابیں سامنے رکھ لیتا ہے۔ کہیں سے ایک نظم لے لی اور کہیں سے ایک مضمون، کسی مجموعے سے چند غزلیں نقل کر لیں اور کسی کتاب سے مثنوی اور مرثیہ۔ لیجئے کتاب تیار ہو گئی۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا۔

۳۔ بالعموم مرتبین نہ ان درجوں کا تدریسی تجربہ رکھتے ہیں اور نہ ان طلبہ کی استعداد، ضرورتوں اور نفسیات سے واقف ہوتے ہیں جن کے لئے وہ کتاب مرتب کرتے ہیں۔

۴۔ بدلے ہوئے حالات میں تعلیمی ضرورتوں اور طلبہ کی استعداد کو پیش نظر رکھنے کی بجائے مرتبین کو اپنی پسند اور اپنے معیار پر اصرار ہوتا ہے۔

آج اس بات کی ضرورت ہے کہ ابتدائی اور ثانوی جماعتوں کے نصاب کا ایک منصوبہ بنایا جائے۔ ابتدائی درجوں کی ضرورتیں اور مقاصد کچھ اور ہوتے ہیں اور ثانوی درجوں کے کچھ اور لیکن ان دونوں کے درمیان ربط ناگزیر ہے۔ اس لئے ان دونوں سطحوں کے مختلف درجوں کی درسی کتابوں کو ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں رکھا جا سکتا بلکہ ان کا ایک جامع منصوبے کے تحت مرتب کیا جانا ضروری ہے۔

اس منصوبے کی تیاری اور اس کے تحت کتابوں کی ترتیب ایک ایسی کمیٹی کے سپرد کی جانی چاہئے۔ جو ابتدائی سے لے کر یونی ورسٹی تک کے اساتذہ پر مشتمل ہو۔ اہم رول تو ابتدائی اور ثانوی مدارس کے اساتذہ کو انجام دینا ہوگا لیکن یونی ورسٹی کے اساتذہ کے علم اور جدید معلومات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یونی ورسٹی کے اساتذہ جب انٹرمیڈیٹ، بی اے اور ایم اے کا نصاب مشکیل دیں گے تو اس تجربے سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ ان کے سامنے مختلف مدارج کے طلبہ کی استعداد اور ان کے نصاب کی حقیقی اور واضح تصویر ہوگی۔ نتیجتاً مدارس اور کالج کے نصاب میں بھی ربط و تسلسل پیدا ہو جائے گا اور وہ خلیج پاٹی جا سکے گی۔ جو مختلف سطح کے نصابوں کے درمیان روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔

نصاب اور درسی کتابوں کی تیاری کے موقع پر کھل کر بحث ہونی چاہئے کہ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی کی منزل پر کس قسم کی نظم و نثر پڑھائی جائے کیا یہ ضروری ہے کہ طلبہ کو تمام نصاب اور اسالیب سے واقف کرایا جائے یا چند منتخب اصناف اور اسالیب پر اکتفا کی جا سکتی ہے۔ کیا قدیم اور جدید ادب کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ غزل کو کس مرحلے پر شریک نصاب کرنا چاہئے اور کس رنگ کی غزلیں منتخب کی جانی چاہئیں کیا سودا اور ذوق کے قصائد اور فسانۂ عجائب کی نثر کے انتخاب کی روایت آج بھی جاری رہنی چاہئے ــــ ان مسائل پر حقیقت پسندانہ اور معروضی نقطۂ نظر سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ لکیر پیٹنے سے کام نہیں چلے گا۔ معیار کی دہائی دینے اور طلبہ کی بدذوقی کا ماتم کرنے سے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ ہمیں طلبہ کے معیار کو بلند کرنے اور ان میں زبان و ادب کا شعور پیدا کرنے کے لئے

مفروضوں کی بجائے حقیقت کو رہنما بنانا چاہئے۔

سرسری مطالعے کی کتابوں کی حالت ٹکسٹ کے مقابلے میں اور زیادہ بُری ہے جس کی وجہ سے ان کتابوں کی حیثیت اُردو نصاب میں انگشت شمار کی ہو کر رہ گئی ہے حالانکہ ان کے ذریعہ ادب کا ذوق اور مطالعہ کا شوق پیدا کیا جا سکتا ہے، ذہن کی تعمیر اور سماجی شعور کی تربیت کی جا سکتی ہے، ادبیاتِ عالیہ سے واقفیت بہم پہنچائی جا سکتی ہے، قومیت کے احساس اور انسان دوستی کے جذبات کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔

ترقی یافتہ زبانوں میں طلبا کی عمر اور استعداد کے مطابق ادبیاتِ عالیہ کے خلاصے تیار کئے جاتے ہیں مگر اُردو میں اُن کا فقدان ہے۔ سرسری مطالعہ کے لئے ایسی کتابیں تیار کی جا سکتی ہیں۔

بڑی یونیورسٹی اور انٹرمیڈیٹ دراصل ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی درمیانی کڑی ہیں۔ اس لئے اس مرحلے کے لئے ایسی درسی کتابیں تیار کی جانی چاہئیں جو ایک طرف عبوری دور کے تقاضوں کی تکمیل کرتی ہوں تو دوسری طرف اگلی منزل کے لئے طلبا کو تیار کرنے میں مدد دیتی ہوں۔ اس مرحلے پر ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے اساتذہ میں مکمل تعاون ضروری ہے۔

بی اے کے لئے بالعموم درسی کتابیں مرتب نہیں جاتیں بلکہ مستقل تصانیف یا ان کے اجزا کو نصاب میں شامل کیا جاتا ہے مثلاً چند ہم عصر دنیا کی کہانی، تنقیدی مضامین کا کوئی مجموعہ، نذیر احمد کا کوئی ناول، کوئی ڈرامہ، گلزارِ نسیم یا سحر البیان، دیوان غالب کی کوئی ردیف، بانگ درا یا بالِ جبریل کا ایک حصہ، اس کے علاوہ تاریخ ادب اور عروض و بلاغت کے بعض جامعات میں ان کتابوں کے علاوہ نظم و نثر کا نمائندہ انتخاب بھی پڑھایا جاتا ہے۔ یہ طریقہ زیادہ مفید اور طلبہ کے لئے سہولت بخش ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر محمد حسن نے یونیورسٹی کے لئے اُردو نصاب کے جو خاکے پیش کئے ہیں ان کو بحث مباحثہ کے بعد قبول کیا جا سکتا ہے۔ مقامی ضروریات کے تحت ہر جامعہ اس میں ضروری ترمیم و اضافہ کر سکتی ہے۔

بی اے اور ایم اے میں جو کتابیں شریک نصاب ہیں (بالخصوص کلاسیکی ادب) ان کے مستند تنقیدی متن، کتابت و طباعت کی صحت کے ساتھ شائع ہونے چاہئیں۔ ہمارے ہاں اصولِ تنقید اور تاریخ ادب نصاب میں شامل ہے لیکن ان موضوعات پر مستند اور جامع کتابوں کا کال ہے۔ اس کمی کو جس قدر ممکن ہو سکے پورا ہونا چاہئے۔

زبان دوم کی درسی کتابیں ہمارے ذہنی دیوالیہ پن کا ثبوت ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اختیاری مضمون اور زبانِ دوم کا بنیادی فرق ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ یہی باعث ہے کہ اختیاری مضمون کے لئے جو درسی کتابیں رائج ہیں اکثر صدیوں میں انہیں کو اگلی جماعتوں میں زبانِ دوم کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے۔ کالج کی سطح پر زبان دوم کے طلبہ کو کم و بیش تمام اصنافِ سخن سے واقف کرانا ضروری سمجھا جاتا ہے اور انہیں قدیم و جدید شعرا کا اسی معیار کا کلام پڑھنا ہوتا ہے جو ادب کے طلبہ کو پڑھایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں چند سال پہلے تو ان پر ادبی تاریخ بھی مسلط کر دی گئی تھی جو مضمون اختیاری کے طلبا کے لئے بھی ٹیڑھی کھیر ہے۔

میرے خیال میں زبانِ دوم کی مروجہ تمام کتابوں کو نصاب سے خارج کر کے ان کی جگہ ایسی کتابیں رائج کی جانی چاہئیں جو زبان کی تعلیم کے لئے خاص طور پر مرتب کی گئی ہوں۔ ان کتابوں کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہئے کہ طلبا کو زبان پر قدرت پیدا ہو اور وہ آسانی اور کامیابی کے ساتھ اپنا مافی الضمیر ادا کر سکیں۔ انہیں ادبی زبان یا تخلیقی اسلوب کے مقابلے میں سائنٹفک زبان اور اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے بمناسب تو یہ ہوگا کہ کالج کی سطح پر آرٹس اور سائنس کے طلبا کے لئے الگ الگ درسی کتابیں مرتب کی جائیں۔ اگر ہمارے ماہرین کو اصرار ہو کہ زبانِ دوم کے طلبا کو ادب سے بھی آشنا ہونا چاہئے تو اچھی زبان کے نمونے اس مقصد کی تکمیل کر سکتے ہیں۔

وہ طلبا جو زبان دوم کی حیثیت سے اُردو لیتے ہیں ادب کا غیر ضروری بوجھ اُٹھانے اور فرسودہ روایتی معیار کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ کالجوں میں اُردو زبان دوم کی حیثیت سے پڑھنے والے طلبا کی تعداد برابر گرتی جا رہی ہے وہ بدیسی یا کلاسیکل زبان لے رہے ہیں۔ اس صورتِ حال پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے اور اس کا مداوا کرنے کی ضرورت ہے۔

اُردو درسی کتابوں کی دوسری شق کے تحت علومِ عمرانی، سائنس اور کامرس وغیرہ کی کتابیں آتی ہیں۔ ان کتابوں کا رواج سب سے زیادہ حیدرآباد میں رہا ہے اس لئے کہ یہیں ابتدائی سے لے کر یونیورسٹی سطح تک اُردو ذریعۂ تعلیم تھی۔ یہاں سائنس، طب اور انجینئرنگ جیسے مضامین بھی ایک مدت تک اُردو میں پڑھائے جاتے رہے ہیں۔ اس ضمن میں دارالترجمہ اور اس کے باہر سینکڑوں درسی اور غیر درسی کتابیں ترجمہ، تالیف یا تصنیف ہوئیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم کی تبدیلی کے بعد یہ کام ٹیکی حد تک رُک گیا۔

۱۹۶۲ء میں جامعہ عثمانیہ کا تجربہ چھوٹے پیمانے پر دوبارہ کیا گیا۔ اورنگ آرٹس کالج قائم ہوا۔ جہاں ہیومینیٹیز اور کامرس کی تعلیم اُردو میں ہوتی ہے۔ اُردو آرٹس کالج کے قیام سے کالج کی سطح پر اُردو ذریعۂ تعلیم کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ انوار العلوم اور ممتاز کالج نے بھی جو دراصل انگریزی ذریعۂ تعلیم کے کالج ہیں، اب اُردو ذریعۂ تعلیم کی متوازی

جماعتیں کھول دی ہیں۔ پچھلے سال لڑکیوں کا ایک ڈگری کالج بھی قائم ہو چکا ہے۔ گورنمنٹ اور خانگی انٹرمیڈیٹ کالج ان کے علاوہ ہیں۔ ان تمام کالجوں کے طلبا علوم عمرانی، سائنس اور کامرس کی درسی کتابوں سے محروم ہیں۔

ثانوی مدراس میں اُردو ذریعۂ تعلیم کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں پایا تھا۔ اس لئے مختلف مضامین کی بھلی بُری کتابیں مل جاتی ہیں۔ مہاراشٹر گجرات، میسور، بہار، مغربی بنگال، اور دہلی میں بھی اُردو ذریعۂ تعلیم کے ثانوی مدارس ہیں۔ یہاں کے طلبا بھی درسی کتب کی دشواریوں کا سامنا کر رہے ہوں گے۔

ترقی اُردو بورڈ سے توقع تھی کہ وہ اُردو ذریعۂ تعلیم کی اب بنیادی اور فوری ضرورتوں کی تکمیل کا منصوبہ بناتا لیکن افسوس ہے کہ اس نے اب تک اس سلسلے میں کوئی توجہ نہیں دی ہے جس طرح ملک بھر میں ثانوی مدارس اور ڈگری کالجوں کا جال پھیلائے بغیر اُردو یونیورسٹی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا اسی طرح ثانوی درجوں، انٹرمیڈیٹ اور ڈگری کورس کی نصابی کتابوں کی تیاری کے بغیر یونیورسٹی کی اعلیٰ سطح کی کتابوں کے تراجم (جن کی فوری ضرورت نہیں ہے) سے اُردو ذریعۂ تعلیم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

زیرِ بحث کتابوں کی تیاری کے سلسلے میں اصطلاحات کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں علمی اور سائنسی ادب کی روایت اُردو میں پرانی ہے۔ قدیم دلی کالج، شمس الامرا کے ادارے، سائنٹفک سوسائٹی اور بالخصوص دارالترجمہ جامعۂ عثمانیہ نے قابلِ قدر ذخیرہ چھوڑا ہے جس کو بنیاد بنا کر موجودہ ضرورتوں کی تکمیل کا منصوبہ بنایا جا سکتا ہے۔ دارالترجمہ کی اصطلاحوں پر یہ تنقید کی جاتی ہے کہ وہ بہت مشکل اور ادق ہیں۔ اصطلاحات کو آسان اور مشکل کے پیمانوں سے نہیں ناپا جاتا اچھی اصطلاح وہ ہے جو صحیح مفہوم ادا کرے، زبان کے مزاج کے مطابق ہو اور اس سے مشتقات بن سکتے ہوں۔ دارالترجمے کے ذخیرے میں ایسی اصطلاحوں کی کمی نہیں۔ جو اصطلاحیں اس معیار پر پوری نہیں اُترتیں اُنہیں رد کیا جا سکتا ہے۔ معترضین کو غالباً اس کا علم نہیں ہے کہ ایسی اصطلاحوں کو خود اہلِ حیدرآباد اسی دور میں رد کر چکے ہیں۔

مختصر یہ کہ دارالترجمے کے بعد پہلی بار اُردو بورڈ نے علوم عمرانی اور سائنسی کتابوں کے تالیف و ترجمے کا کام شروع کیا ہے تو اس کو ماضی کے تجربے اور موجودہ ذخیرے سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اگر معروف اور مروج اصطلاحوں کی جگہ نئی اصطلاحیں رائج کرنے کی کوشش کی گئی تو درسی کتابیں چیستاں بن کر رہ جائیں گی اور اُردو ذریعہ تعلیم بحران کا شکار ہو جائے گا۔

بقیہ: مصنف کے مسائل

اور مناسب و معقول داموں تک پڑھنے والوں کے پاس پہنچیں۔ صرف اسی صورت میں ہی مصنف کی آمدنی بڑھ سکتی ہے۔

ہمارے ملک میں جہاں غریبی عام ہے۔ سرکار زیادہ سے زیادہ تعداد میں تعلیمی ادارے اور کتب خانے قائم کرے تاکہ مصنف کی تخلیق آسانی اور کفایت سے عام لوگوں تک پہنچ سکے۔ پاکٹ بکس کا سلسلہ مصنف کی کاوشوں کو عوام تک پہنچانے میں خاصہ کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔

عوام کا رجوع معیاری کتابوں کی طرف کیسے کیا جائے، یہ بذاتِ خود ایک مسئلہ ہے اور اس کا تعلق ہماری تعلیمی پالیسی اور تعلیمی اداروں سے ہے۔ ایک مصنف کی طرح جب تک اُستاد کا اقتصادی رتبہ سماج میں بلند نہ ہوگا، تعلیمی ادارے اچھے اُستادوں سے محروم رہیں گے اور تعلیم کا معیار کبھی اُونچا نہ اُٹھ سکے گا۔ اگر تعلیم میں معیار کے بجائے تعداد کو ترجیح دی گئی تو عوام میں معیاری کتابوں کا ذوق کیوں کر پیدا ہو سکتا ہے۔

مصنف کے حقوق کے تحفظ کے لئے کاپی رائٹ ایکٹ ضرور موجود ہے لیکن کتنے لوگ اس ایکٹ سے واقف ہیں اور کتنے لوگ اس سلسلہ میں قانونی چارہ جوئی کرنے کی طاقت رکھتے ہیں؟ جہاں سماج کلیان کے ادارے کمزور طبقوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے قانونی سہولتیں مہیا کرنے کے لئے سوچ رہے ہیں وہاں اس بات کی بھی اتنی ہی شدید ضرورت ہے کہ مصنف کے حقوق کے تحفظ کے لئے بھی اس طرح کے کچھ قدم اُٹھائے جائیں۔

جب تک مصنف اقتصادی اُلجھنوں سے نجات نہیں پالیتا اور وہ دوئم یا سوئم درجے کا شہری رہتا ہے، وہ سماج کی ترقی میں لائق اعتنا حصہ ادا نہیں کر سکتا۔

بقیہ: اُردو اصطلاحات

موجودہ مرحلۂ اصطلاح سازی میں اگر یہ امر بھی ملحوظ رہے تو مناسب ہوگا کہ جو مادّے منتخب کئے جائیں وہ ممکنہ حد تک ہندوستان کی زبانوں اور خصوصاً آریائی زبانوں میں مشترک ہوں۔ اگر اس سمت میں سلیقے کے ساتھ قدم اُٹھایا گیا تو زبانوں کی گوناگونی کے باوجود اصطلاحات کے کُل ہند روپ کے لئے بنیادیں استوار ہو سکیں گی۔

شہباز حسین
پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی

ترجمہ کی اہمیت اور مسائل

ترجمہ بڑا مشکل کام ہے۔ یہ نگینہ جڑنے کا فن ہے جو بڑی مہارت اور ریاضت چاہتا ہے ایک زبان کے معانی اور مطالب کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنے کے لئے کہ اصل عبارت کی خوبی اور مطلب جوں کا توں باقی رہے دونوں زبانوں پر یکساں قدرت کی ضرورت ہوتی ہے جو عام طور پر کمیاب ہوتی ہے۔ ترجمے بہت ملتے ہیں۔ اچھے ترجمے خال خال ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو دو زبانیں جانتا ہے بزعم خود مترجم بن بیٹھتا ہے اور ایسے ایسے گل بوٹے کھلاتا ہے کہ ترجمے کی اہمیت اور افادیت مجروح ہو جاتی ہے اور ترجموں پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے۔

ذرائع آمد و رفت میں وسعت اور سرعت آجانے کی وجہ سے دنیا کی مختلف زبانیں بولنے والوں میں ارتباط و اختلاط روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اور ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ضرورتاً ایک دوسرے کی زبان سیکھنی پڑتی ہے۔ دورِ ملوکیت میں وہ افراد یا طبقے ہمیشہ ممتاز رہے جنہوں نے حاکموں کی زبان سیکھنے میں سبقت کی۔ حاکموں نے بھی محسوس کیا کہ امن و استحکام کے لئے صرف زور بازو ہی کافی نہیں ہے، دلوں کو بھی مسخر کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے محکوم قوموں کی زبان اور ثقافت سے بھی آشنائی ضروری ہے۔ اجنبیت اور مغائرت کو کم کرنے میں ترجموں کا بڑا ہاتھ رہا ہے

علم کی وسعت اور علمی اور سائنسی دریافتوں کی کثرت سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچانے میں ترجموں نے بڑی مدد کی ہے۔ یورپ کے نشاۃ ثانیہ میں عربی کے تراجم کا بھی ہاتھ ہے۔ ترجمہ وہ کنجی ہے جس کے ذریعہ علوم و فنون کے خزانے سب کے لئے کھل جاتے ہیں اسی لئے روز بروز ترجموں کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے اور ترجمے نے بھی تخلیق کا درجہ پالیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ترجمہ خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اس میں اصل کے تمام محاسن آ ہی نہیں سکتے۔ یہ بات مشرقی ترجمے کے لئے یا ان زبانوں کے لئے تو ٹھیک ہے جو ابھی اتنی ترقی یافتہ نہیں ہیں جو ہر قسم کے معانی و مطالب کے اظہار پر قادر ہوں مگر دنیا کی ترقی یافتہ زبانیں اب اس مرحلے پر پہنچ گئی ہیں کہ وہ کم از کم نثری تخلیقات کو بجنسہ دوسری زبانوں میں منتقل کر سکیں۔ کسی دوسری زبان سے براہ راست استفادہ کرنے والے ہمیشہ تھوڑی تعداد میں ہوتے ہیں۔ لہٰذا ترجمے کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی۔ کیونکہ کالیداس، عمر خیام، اقبال اور ٹیگور کی عظمت کا اعتراف ترجموں کی بدولت ہی ہوا ہے۔

مغلیہ دور میں سنسکرت سے فارسی میں کافی ترجمے ہوئے، انگریزوں کی آمد کے بعد انگریزی سے مقامی زبانوں میں ترجموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ فورٹ ولیم کالج میں انگریزی سے کسی کتاب کا ترجمہ اُردو میں نہیں ہوا لیکن عربی اور فارسی اور سنسکرت کے تراجم ضرور ہوئے۔ انگریزی سے اُردو میں ترجمہ شدہ پہلی کتاب انجمن شلر کا ترجمہ انجیل مقدس ہے جو ۱۷۴۸ء میں شائع ہوئی بعدہٗ مرزا فطرت نے ول ہنیر کی مدد سے ۱۸۰۵ء میں انجیل کے "عہد جدید" کا ترجمہ شائع کیا بعد میں اکا دُکا انفرادی کوششیں ہوتی رہیں۔ بعد میں امرا، اور نوابین نے جو جدید علوم کی اشاعت اور فروغ میں دلچسپی رکھتے تھے ترجموں کی سرپرستی کی جیسے حیدر آباد کے نواب فخر الدین خاں شمس الامراء کی کوششوں سے بعض رسالے شائع ہوئے۔ رسالہ مختصر جبر ثقیل، رسالہ کسورات اعشاریہ، رسالہ اسطرلاب کروی، کیمسٹری کا مختصر رسالہ شاہان اودھ نے بھی بعض کتابوں کے ترجمے کرائے اور مطبع سلطانی سے شائع کئے جیسے رسالہ ہیئت، رسالہ علوم طبعیہ، رسالہ قوت مقناطیس، رسالہ علم الحرارۃ، رسالہ علم المناظر وغیرہ لیکن ترجموں کی پہلی باضابطہ کوشش دہلی کالج میں ہوئی کیونکہ مغربی علوم کے پڑھانے میں سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ اُردو میں کتابیں دستیاب نہیں تھیں۔ لہٰذا "انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنہ ملکی" یا دیسی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی" قائم ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ جدید کتابوں کی تالیف اور ترجمے کے ذریعے ہندوستانی زبانوں کو ترقی دی جائے۔ انجمن نے ترجمے کے لئے جو قاعدے مقرر کئے تھے ان کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

۱۔ مترادف لفظ اُردو میں نہ ملے تو اصل لفظ استعمال کیا جائے۔

۲۔ سائنس کی کتابوں کا ترجمہ انگریزی سے ہوگا اس لئے انگریزی

الفاظ کا استعمال ناگزیر ہے۔

۳۔ ترجمہ لفظی نہ ہو بلکہ اس کا مفہوم اُردو میں ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔

اس ادارے میں بہت سی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔ غدر کے ہنگامہ میں یہ کالج بند ہوگیا اور پھر نہ کھلا۔ اس کے بعد دوسری قدرے منظم کوشش سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے تحت ہوئی۔ اور تاریخ، جغرافیہ، سائنس اور معاشیات کی متعدد کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ اس کے بعد کے زمانے میں انگریزی تعلیم کے عام ہو جانے کی وجہ سے بہت سے مترجم پیدا ہو گئے لیکن یہ تراجم زیادہ تر ناولوں، ڈراموں، کہانیوں کے تھے۔ ذریعۂ تعلیم انگریزی تھا اس لئے نصابی ضرورتوں کے لئے ملکی زبان میں علوم کی کتابوں کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔

دراصل اُردو میں ترجموں کی سب سے منظم اور باضابطہ کوشش جامعہ عثمانیہ کے قیام (۱۹۱۷ء) کے بعد شروع ہوئی۔ کیونکہ جامعہ عثمانیہ نے ذریعۂ تعلیم اُردو کو قرار دیا تھا جامعۂ عثمانیہ میں "سررشتہ تالیف و ترجمہ" قائم ہوا جس کے تحت ۵۰۰ کے قریب کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ یہ کتابیں آرٹس اور سائنس، انجینئرنگ اور میڈیسن تقریباً تمام جدید علوم پر حاوی تھیں۔ ہندوستان کی کسی زبان میں اعلیٰ تعلیم دینے کا یہ پہلا تجربہ تھا جو بحیثیت مجموعی کامیاب رہا۔

دارالترجمہ میں دو طرح کے رکن تھے۔ ایک وہ جو مستقل اس کے رکن تھے اور دوسرے وہ جو اجرت پر کام کرتے تھے۔ ترجمے کی تکمیل کے بعد کسی ماہر فن سے اس پر نظر ثانی کرائی جاتی اور پھر ادبی ناظر زبان و بیان کی اصلاح کے لحاظ سے نظر ثانی کرتے اور کتاب شائع ہو جاتی۔ ترجمہ کے دوران مترجمین ایسے الفاظ اور اصطلاحات کی فہرستیں متعلقہ مجالس وضع اصطلاحات میں بھیجتے رہتے تھے جن کے مترادف الفاظ اُردو میں نہیں تھے۔ اس مجلس کے اراکین میں علم کے ماہرین کے علاوہ عربی، فارسی، اُردو اور ہندی میں دستگاہ رکھنے والے بھی شامل ہوتے تھے جو زبان کی ادبی اور لسانی خصوصیات کو مدنظر رکھتے تھے اُردو کے دامن کو مالا مال کرنے میں دارالترجمہ نے بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔

ترجمہ کے سلسلہ میں سب سے پہلی مشکل اصطلاحات کے سلسلے میں پیش آتی ہے۔ یہ مشکل سائنسی علوم کے سلسلے میں زیادہ محسوس ہوتی ہے کیونکہ اصطلاح ایک معین معنی دیتی ہے اور اس کے لئے ایسا متبادل لفظ ہونا چاہئے اسی طرح مخصوص معنی دیتی ہو۔ مثلاً AGREEMENT یا TREATY کے لئے اُردو میں سمجھوتہ یا معاہدہ استعمال ہوتا ہے۔ یہ طے نہیں ہے کہ AGREEMENT کے لئے معاہدہ اور TREATY کے لئے سمجھوتہ ہی استعمال ہوگا۔ لہٰذا جس کا جو جی چاہتا ہے استعمال کر لیتا ہے۔ یہ سہولت سائنس میں نہیں ہے۔ اسی طرح قوانین، اور قانون کی کتابوں یا عدالتوں کے فیصلوں کے ترجموں کے لئے بھی مخصوص اور معین الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں بھی ترجمے ہوئے اصطلاحات سازی بھی ہوئی۔ دارالترجمہ حیدرآباد نے وسیع پیمانے پر اصطلاحات وضع کیں۔ مولانا وحیدالدین سلیم نے اپنی بیش بہا تصنیف "وضع اصطلاحات" مرتب کی اور پہلی بار اصطلاحات وضع کرنے کے اصول مدون کئے جو آج بھی اتنے ہی کارآمد ہیں۔

اصطلاحات سازی کے سلسلے میں بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کرنا چاہئے۔ ان کا کہنا ہے کہ انگریزی زبان کی اصطلاحوں کو تقریباً بین الاقوامی اصطلاحوں کا درجہ حاصل ہوگیا ہے لہٰذا ان کو جوں کا توں اپنا لینا چاہئے لیکن یہ صورت قابل عمل نہیں ہے۔ کیونکہ اصطلاحوں سے جو مشتقات بنتے ہیں اُن کو اُردو میں جوں کا توں اپنا لینے سے بڑی قباحت پیدا ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ اب اصطلاحوں کی اتنی کثرت ہوگئی ہے کہ اُردو میں اُن کے بے محابا استعمال سے عبارت بڑی عجیب و غریب ہو جائے گی۔ لہٰذا انہیں انگریزی اصطلاحوں کو اپنانا چاہئے۔ جو آسانی سے اُردو میں کھپ سکیں۔

ترجمے کے سلسلے میں بنیادی اور اولین شرط یہ ہے کہ جس زبان سے ترجمہ کرنا ہو اور جس زبان میں ترجمہ کرنا ہو دونوں پر قدرت حاصل ہو۔ صرف اسی حد تک نہیں کہ دونوں زبان کے مطالب سمجھ میں آجائیں بلکہ زبان کی ساخت، مزاج اور اس کے تہذیبی پس منظر سے بھی اچھی آگاہی ہو۔ عام طور پر اُردو میں جو ترجمے دیکھنے میں آتے ہیں وہ اڈھ کچرے سے ہوتے ہیں اور پڑھنے والا فوراً سمجھ جاتا ہے کہ عبارت ترجمہ کی ہوئی ہے کیوں کہ زبان اکھڑی اکھڑی سی ہوتی ہے اور جملوں کی ساخت بھی انگریزی جملوں کے مطابق ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ ترجمہ لفظ کا نہیں مفہوم کا کیا جاتا ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اگر کسی بات کو اپنی زبان میں کہئے تو کس طرح کہئے۔ ایسا انداز اپنانے سے ترجمے کے عیوب دور ہو جاتے ہیں۔ یوں تو ہر معاملے میں عقل سلیم کی ضرورت ہوتی ہے مگر مترجم کے لیے تو یہ شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔ عام طور پر ڈکشنری میں ایک لفظ کے کئی معنی دیئے ہوتے ہیں۔ اب سیاق و سباق کے مطابق مترجم صحیح لفظ

کا انتخاب کرتا ہے اس کے لئے استعداد اور لیاقت تو خیر ضروری ہے ہی مگر سمجھ داری کی بھی بڑی اہمیت ہے مثلاً ایک جگہ ایک ترجمہ یہ دیکھا۔

' I solemnly dedicate myself for the service of the nation.'

"میں انتساب سے قوم کی خدمت کا عہد کرتا ہوں"

اب Dedicate کے معنی انتساب کے بھی ہیں مگر یہاں اس کا محل استعمال نہیں ہوگا جنگ کے زمانہ میں ایک ترجمہ اس طرح کیا ہوا دیکھا کہ ہوا باز بحفاظت تمام طیارے کو واپس لے آیا حالانکہ اس کی نظر کمزور تھی" "نظر کمزور تھی" انگریزی کے ان الفاظ کا ترجمہ تھا۔ though the visibility was poor.'

عقل سلیم سے معلوم ہو جائے گا کہ کوئی ایسا شخص ہوا باز نہیں بن سکتا جس کی نظر کمزور ہو۔ بعض دفعہ سیاق کو صحیح نہیں سمجھنے سے ترجمہ غلط ہو جاتا ہے۔ مثلاً

A Muslim is required to perform Haj without causing distress to his family.'

مفہوم یہ ہے کہ کسی مسلمان پر حج اس وقت فرض ہے جب اس کے فریضۂ حج پر چلے جانے سے اس کے خاندان کے لوگ کسی طرح کی مالی مشکلات میں نہ پھنس جائیں مگر ایک مترجم نے اس کا ترجمہ یوں کیا تھا "خاندان کو تنگ کئے بغیر حج کو جا سکتا ہے" بعض دفعہ عبارت کو صحیح سمجھنے سے بالکل غلط ترجمہ ہو جاتا ہے۔ جیسے Hold fast to truth کا ترجمہ سچائی کے لئے پرت رکھنا" بعض دفعہ مترجم بالکل نااہل ہوتا ہے جیسے Outstanding Scientist کا ترجمہ باہر نکلے ہوئے سائنسداں یا Steel Plants فولاد کے پودے۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں

ترجمہ محض ایک زبان کے خیالات کو دوسری زبان میں پلٹ دینے کا نام نہیں ہے بلکہ خیالات اور احساسات کو اس ترتیب کے ساتھ منتقل کرنے کا نام ہے کہ مصنف نے کس جگہ پر زور دیا ہے۔ کہاں پر طنز ہے۔ کہاں پر محاورہ یا روزمرہ بیان ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ صحیح ہے کہ ترجمے میں اصل کی ساری خوبیاں نہیں پیدا کی جا سکتیں لیکن بہت سی خوبیاں ضرور سمو لی جا سکتی ہیں۔

اردو میں اچھے ترجموں کی کمی رہی ہے خصوصاً علمی اور سائنسی موضوعات کے اچھے ترجمے کمیاب ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ رہی ہے کہ اردو ذریعۂ تعلیم کبھی نہیں رہی۔ جب جامعہ عثمانیہ نے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا تو وہاں خاصی تعداد میں (۵ سو کے لگ بھگ) کتابوں کے ترجمے ہوئے اور اب ترقی اردو بورڈ کے ذریعہ تقریباً سو کتابیں ترجمہ کرائی جا رہی ہیں۔ اس سلسلے میں مترجمین کو جو مشکلات پیش آ رہی ہیں وہ وہی ہیں جن کا ذکر اوپر آ چکا یعنی اصطلاحات کی کمی، اچھی انگریزی، اردو ڈکشنری کی عدم موجودگی علیٰ

غزل

عارف نقشبندی ممبر پارلیمنٹ
۴۷، نارتھ ایونیو نئی دہلی

بن کر بگڑ رہا ہے پھر عشق کا فسانہ
تم کیوں بدل رہے ہو بدلا کرے زمانہ

کانٹے اُلجھ رہے ہیں دامن سے ہر قدم پر
کل تک تھا جن چمن میں پھولوں پہ آشیانہ

دیر و حرم میں بھٹکیں دُنیا کی خاک چھانیں
کافی ہے بندگی کو اک دل کا آستانہ

محدود دل نہ اپنی ہستی بیکراں کو
زنجیر پا بنے کیوں گلشن کہ آشیانہ

غنچے مٹا کے خود کو ہنستے ہیں پھول بن کر
آتا ہے مشکلوں سے انداز دلبرانہ

ذوق نظر ہی میرا زینت ہے دو جہاں کی
خون جگر ہے عارف رنگینیٔ فسانہ

صاحب کی ڈکشنری ۱۹۳۶ء میں تیار ہوئی تھی اس کے بعد سے لاکھوں الفاظ آ گئے ہیں یا الفاظ کے معنی اور استعمال بدل گئے ہیں۔ کسی اچھے نمونے کی کمی پھر اردو کی اپنی نارسائی۔

فی الحال ترقی اردو بورڈ وسیع پیمانے پر علمی اور سائنسی موضوعات پر تراجم کرا رہا ہے۔ اس سلسلے میں تقریباً ہر موضوع کے مترجمین کو جامعۂ عثمانیہ کے دارالترجمہ کی وضع کردہ قدیم اصطلاحات مہیا کر دی گئی ہیں لیکن گزشتہ بیس سال کے عرصے میں سائنس اور علوم نے اتنی ترقی کی ہے جتنی کہ پچھلے دو سو برس میں نہیں ہوئی تھی۔ اور نہ صرف اصطلاحوں میں بے انتہا اضافہ ہوا ہے بلکہ قدیم اصطلاحوں کے معنی تک بدل گئے ہیں لہٰذا عثمانیہ کی اصطلاحیں ہماری رہنما ثابت ہو سکتی ہیں اور ایک مثال کے طور پر کام دے سکتی ہیں لیکن ہمارے لئے مکتفی نہیں ہو سکتیں۔ ہمیں تو آج خود کنواں کھود کر پانی پینا ہے۔

ترجمہ ایک مستقل فن ہے جو بڑی ریاض چاہتا ہے۔ اخبار، ریڈیو اور اب تدریسی ضرورتوں کے تحت اردو ترجموں کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے۔ ایک دو یونیورسٹیوں میں ترجمے کے شعبے کھل گئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مزید یونیورسٹیوں میں یہ شعبے کھلیں۔ اردو بورڈ کی ترجمہ کردہ کتابوں اور اصطلاحوں سے اس کام میں بہت مدد ملے گی۔

میر حسن
بدیعہ روزانہ "سیاست" جواہر لال نہرو روڈ
حیدرآباد-۱

اُردو اصطلاحات
اہمیت اور مسائل

اب جب کہ اُردو کی فطری ترقی کی راہ سے رکاوٹیں دور ہو رہی ہیں۔ ملک کی مختلف ریاستوں میں مرکز کی ایما پر اُردو کی تعلیم اور اس کے علم و ادب کی نگہداشت اور توسیع کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں، اس زبان میں جدید سائنس اور علوم عمرانی سے متعلقہ معلومات کے ذخیرے میں اضافے کے لئے وسائل مہیا کئے جا رہے ہیں، مختلف مدارج کی درسی اور غیر درسی کتابیں تالیف و ترجمے کے ذریعہ مرتب کی جا رہی ہیں، نئے خیالات اور تصورات کے لئے موزوں الفاظ تلاش کرنے اور بنانے ہوں گے۔ اور جب ضرورت وضع اصطلاحات کے کام کو آگے بڑھانا ہوگا۔

یہ امر موجب طمانیت ہے کہ ترقی اُردو بورڈ کے تحت اصطلاح سازی کا کام باضابطہ اور پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ اس سے قبل راقم الحروف کو نشریات کے تعلق سے اصطلاح سازی کے سلسلے میں اُردو ذریعۂ تعلیم کی جامعہ عثمانیہ کے ماہرین فن و زبان کمیٹیوں میں شریک ہونے، ان کی بحثوں میں حصہ لینے اور وضع اصطلاحات کے کام میں حتی المقدور ہاتھ بٹانے کا موقع ملا تھا۔ اس دور میں ایک رجحان یہ تھا کہ اصطلاح سازی کا جو کام پہلے ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہو چکا ہو اُس پر نظر رکھی جائے اور اس سے مناسب حد تک استفادہ کیا جائے۔

سائنس اور دوسرے کارآمد مغربی علوم کی کتابوں کے اُردو میں ترجمے کا کام آج سے کوئی پونے دو سو سال قبل ہی شروع ہو چکا تھا اور اس طویل مدت میں مختلف علوم عمرانی اور سائنس کی جو کتابیں اردو میں ترجمے کے ذریعہ داخل ہو چکی ہیں اُن کی تعداد اس قدر کثیر ہے کہ اگر صرف اُن کے نام ہی گنائے جائیں تو ایک ضخیم رسالہ تیار ہو جائے۔ مغربی تصانیف و تالیفات کے اُردو تراجم کے قدیم مراکز کلکتہ (فورٹ ولیم کالج) حیدرآباد (آندھرا پردیش) (دواب شمس الامرا) دہلی کالج، دہلی، دارالترجمۂ شاہان اودھ، لکھنؤ اور سائنٹفک سوسائٹی (قائم کردہ سرسید احمد خاں) علی گڑھ تھے۔ بعد کے دور میں انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد دارالمصنفین اعظم گڑھ، دارالترجمۂ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد اور اُردو اکیڈمی، جامعہ ملیہ دہلی نے اس کام کو آگے بڑھایا۔

سائنس کے موضوع پر قدیم ترین تراجم میں "بحر سکمت" مولفہ پادری پرکنس شامل ہے جس کا سن ترجمہ ۱۷۹۸ء ہے۔ اس میں اسٹیم یعنی بھاپ سے بحث کی گئی ہے اور اس کے کارآمد خواص پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسٹیم کے لئے دُخان کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ اس میں استعمال شدہ چند اصطلاحیں 'نقطۂ جوش، نقطۂ جوش آب، نقطۂ انجماد وغیرہ ہیں۔ فیڈرز کے لئے 'ارزق' اور تھرمامیٹر کے لئے 'تابدرجہ نما' کی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ یہ کتاب لکھنؤ کے مطبع مسیحائی، میں چھپی تھی جس کا ایک نسخہ کتب خانہ جامعۂ عثمانیہ میں موجود ہے۔ ۱۸۱۱ء میں کپتان ٹامس روبک نے لغت جہاز رانی شائع کی جس میں جہاز رانی کی اصطلاحوں کے علاوہ ایسے الفاظ کا اُردو ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔ جو کمانداروں کے لئے میدان جنگ اور بارکوں میں کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ انگریزی سے اُردو ترجمے کے سلسلہ میں فورٹ ولیم کالج کے ارباب کا کام زیادہ تر انگریزی اُردو لغات کی اشاعت تک محدود رہا۔ اس زمانے میں اُردو ترجمے کا دوسرا اہم مرکز حیدرآباد دکن تھا۔ امیر کبیر نواب فخرالدین خاں شمس الامرا نے مدارس اور رصدگاہ جہاں نما کے علاوہ ایک دارالترجمہ بھی ۱۸۴۴ء میں قائم کیا تھا جس کی کتابیں ان کے سنگی چھاپے خانے میں چھپتی تھیں۔ اُردو میں مغربی علوم کی کتابوں کے تراجم اور تدریس کی ایسی منظم انفرادی کوشش شاید ہی کسی اور نے کی ہوگی۔ شمس الامرا کے سررشتۂ تالیف و ترجمہ سے شائع شدہ حسب ذیل کتابوں میں سے چند کتابیں حیدرآباد کے کتب خانوں میں دستیاب ہیں۔ "ستۂ شمسیہ"، جو رسالۂ علم جر ثقیل، رسالۂ علم ہیئت، 'رسالۂ علم آب' رسالۂ علم ہوا، رسالۂ علم انظار پر مشتمل ہے۔ اور جس کے آخر میں علم مقناطیس پر مقالہ بھی شامل ہے۔ شمس الامرا کی دوسری کتابیں، کیمسٹری کا مختصر رسالہ، رسالۂ مفتاح الافلاک، رسالۂ مختصر حیوانات مطلق، منتخب البصر (دُور نما) ہیں۔ اس مرکز میں ایسڈ (ACID) کا ترجمہ 'کھٹا' اور نائٹرک ایسڈ (NITRIC ACID) کا ترجمہ 'شورے کا کھٹا' ہیڈرو اسٹائکس (HYDROSTATICS) اور آپٹکس (OPTICS) کے

لئے علم آب اور علم انظار کی اصطلاحیں وضع کی گئی تھیں جس کے لئے نوابان اودھ کے دارالترجمے کے اراکین غلام محی الدین حیدر آبادی، میراماں دہلوی، مسٹر جونس میسیو تندوسی، ترن لال اور مسٹر جوزف تھے۔ بعض انگریزی اصطلاحوں کے لئے الفاظ اردو میں نہیں ملے تو اُن کو اُن کی اصلی شکل میں برقرار رکھا گیا ہے۔ شمس الامرا کے دارالترجمہ کی وضع کردہ چند اصطلاحیں یہ ہیں۔

چوسنے کا پمپ	SUCKING PUMP
زبردستی کا پمپ	FORCE PUMP
خلاں بیں	MICROSCOPE
موسمی پون	MONSOON
منعکس دوربیں	REFLECTING TELESCOPE
موازی شعاعیں	PARALLEL RAYS
انقباضی شعاعیں	CONVERGENT RAYS
انبساطی شعاعیں	DIVERGENT RAYS
موصل	CONDUCTOR

'تبدیلی پون'، 'آلہ تحلیل'، 'مدامی پون' جیسے الفاظ اور اصطلاحیں بھی استعمال کی گئی ہیں۔ چند کتابوں کے شروع میں اصطلاحات کی فہرست دی گئی ہے جن میں سے چند اصطلاحیں حسب ذیل ہیں۔

گندھک کا کھٹا	SULPHURIC ACID
کھاتے نمک کا کھٹا	MURAIC ACID (?)
ہلدی کے پتے کے رس میں بھگایا ہوا کاغذ	TURMERIC PAPER

سنتھیسس (SYNTHESIS) انیلیسس (ANALYSIS)، تھرمامیٹر (THERMOMETER) بونامیٹر (BAROMETER) جیسی بعض انگریزی اصطلاحیں بجنسہ استعمال کی گئی ہیں۔ اور بعض کا مطلب سمجھایا گیا ہے۔

اس عہد میں اُردو ترجمے کا کام لکھنؤ میں بھی ہوا۔ شاہان اودھ نے مغربی علوم و فنون کی بعض کتابوں کا ترجمہ کروایا جو مطبع سلطانی میں چھپ کر شائع ہوئیں۔ سید کمال الدین حیدر نے مغربی علوم کے ۱۹ رسالوں کا ترجمہ انگریزی سے اُردو میں کیا جس میں رسالہ ہیئت، رسالہ علم الہود، رسالہ علم الحرارت شامل ہیں۔

انیسویں صدی کے اواسط میں مغربی تصانیف کے اُردو تراجم کا ایک اہم دور شروع ہوا۔ اس دور سے قبل کی کوشش اس درجہ منظم اور وسیع پیمانے پر نہیں تھیں جتنی کہ دہلی کالج کی تھیں۔ اس کلیہ کے ارباب علم نے جنہیں ماسٹر رام چندر بھی شامل تھے۔ ترجمے کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے بعض اصول پہلی مرتبہ مرتب کئے جو یہ تھے کہ مترادف اُردو میں نہ ملے تو اصل لفظ استعمال کیا جائے۔ اُردو لفظ ملے تو وہی استعمال کیا جائے۔ سائنس کی کتابوں کا ترجمہ چونکہ انگریزی سے کیا جائے گا۔ اس لئے انگریزی الفاظ کا اُردو میں استعمال ناگزیر ہے۔ انگریزی جملے میں اگر کسی ایسے واقع کی طرف اشارہ ہو جس سے اہل ہند ناواقف ہوں تو مترجم کو چاہئے، کہ حاشئے یا متن میں مختصر طور پر اُس کی تشریح کر دے۔ ترجمہ لفظی نہ ہو بلکہ اُردو میں مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔ دہلی کالج کے مترجمین نے علم ہیئت، کیمسٹری، پولیٹیکل اکانومی، قانون مال، میکانیات، تاریخ عالم جغرافیہ طبعی، مقناطیس، جراحی، حرکیات و سکونیات، علم المناظر، حرارت، ہیڈرو اسٹاٹکس، علم برق اور طب سے متعلق کوئی ۳۰ کتابوں کا ترجمہ شائع کیا۔ رسالہ مقناطیس میں جو اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

قوت ور مقناطیس	STRONG MAGNET
مقناطیس کرنا	TO MAGNETISE
غرق و انحراف	DIP AND INCLINATION
جذب و انمدفاع	ATTRACTION AND REPULSION
ریشہ	FIBRE
تجربہ	EXPERIMENT

اس رسالے میں بیشتر اصطلاحات کا ترجمہ درج کیا گیا ہے صرف معدودے چند انگریزی الفاظ الیکٹریسٹی، کمپاس وغیرہ بجنسہ مستعمل ہوتے ہیں۔

سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی قائم شدہ ۱۸۶۳ء کو مغربی علوم اور سائنس کے تراجم اور اصطلاح سازی کے اعتبار سے کافی اہمیت حاصل ہے۔ اس سوسائٹی نے چھوٹی بڑی تقریباً چالیس کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کروائیں۔ اس کی مطبوعات زیادہ تر تاریخ، سوانح، جغرافیہ، سیاسیات اور معاشیات پر مشتمل ہیں۔ سوسائٹی نے اصطلاحات کے ترجمے میں سلیقے کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اُس کی وضع کردہ بعض اصطلاحیں یا تو اپنی اصلی حالت میں یا تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اُردو میں مستقل طور پر داخل ہوگئیں۔ رسالہ انتظام مدن "پولیٹیکل اکانومی POLITICAL ECONOMY کا ترجمہ ہے۔ ایلیمنٹز آف پولیٹیکل اکانومی (ELEMENTS OF POLITICAL ECONOMY) کا ترجمہ جو اس سوسائٹی کی جانب سے شائع ہوا۔ اس کا نام "اصول سیاست مدن" ہے اس مرکز میں وضع شدہ چند اصطلاحیں حسب ذیل ہیں۔

لوازم پیدائش	FACTORS OF PRODUCTION
پیدائش یا صنعت کاری	PRODUCTION
صرف	CONSUMPTION
مبادلہ	EXCHANGE

پیدا کرنے والی محنت	PRODUCTION LABOUR
غیر پیدا کرنے والی محنت	UNPRODUCTIVE LABOUR
داس المال	CAPITAL
عمل یہ اتفاق	CO-OPERATION
اشیائے احتیاجات	NECESSITIES
سامان عیش و کامرانی	LUXURIES

اُردو میں جدید علوم عمرانی اور سائنس کی کتابوں کے ترجمے کا وسیع پیمانے پر ضروری اہتمام کے ساتھ انتظام جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں کیا گیا۔ جامعہ عثمانیہ کی جنرل کمیٹی نے جس میں زبان اور علم کا صحیح مذاق اور مہارت رکھنے والے بزرگ شامل تھے۔ یہ اہم مسئلہ کثرت رائے سے طے کر دیا تھا کہ انگریزی اصطلاحیں بجنسہ یا کسی تغیر و تبدل کے ساتھ اُردو زبان میں نہ لی جائیں۔ بلکہ انگریزی علمی اصطلاحوں کے مقابلے میں اُردو اصطلاحیں وضع کی جائیں۔ کمیٹی نے یہ بھی طے کیا تھا کہ جو علمی اصطلاحیں وضع کی جائیں اُن کے لئے الفاظ عربی، فارسی اور ہندی سے بے تکلف لئے جائیں۔ ان ہدایات کی روشنی میں جامعہ کے ماہرین اصطلاح سازی کے لئے نئی راہیں نکالی گئیں اور پروفیسر وحیدالدین سلیم پانی پتی نے محنت و کاوش سے وضع اصطلاحات کے اصول مرتب کئے۔ نئے الفاظ کی تلاش اور وضع اصطلاحات کے اغراض کے لئے اُردو کے ذخیرۂ الفاظ کا جائزہ لیا گیا مفرد اور مرکب الفاظ اور تراکیب کی ساخت اور مشتقات کے اصولوں کی جانچ کی گئی۔ حسب ضرورت دوسری زبانوں کے الفاظ کا استعمال جائز قرار پایا لیکن شرط یہ تھی کہ فارسی، عربی یا ہندی جس زبان سے بھی مادّہ لیا جائے وہ اُردو میں آنے کے بعد اُردو ہو جائے گا۔ اور اس پر اُردو قواعد کی چھاپ لگ جائے گی۔ اپنی عہد آفریں تالیف "وضع اصطلاحات" میں پروفیسر وحیدالدین سلیم نے اصطلاح سازی کے اصول، امکانات اور دشواریوں پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ وضع اصطلاحات کے میدان کو وسیع کرنے کے لئے اس امر کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ بنیادی الفاظ گرامر اور دوسری خصوصیات کے اعتبار سے اُردو کا تعلق سنسکرت، ہندی، فارسی کی طرح آریائی خاندان السنہ سے ہے۔ اور اس خاندان السنہ سے تعلق کی بنا پر اس کا رشتہ انگریزی اور بعض دوسری مغربی زبانوں سے بھی جا ملتا ہے۔ نئے خیالات اور الفاظ کی تلاش اولاً خود اُردو ادب میں کی جانی چاہئے۔ یہ داخلی جائزہ مفید ثابت ہو سکتا ہے اور ممکن ہے موزوں الفاظ نئے خیالات اور اصطلاحوں کے لئے مل جائیں۔ دکنی ادب اور قدیم اُردو ادب ہندی سے قریب تر تھا جس میں سنسکرت کے الفاظ بھی مروج تھے اور مذہب و اخلاق سے متعلق ہندی اصطلاحیں اولیا، اللہ کی تحریروں میں بھی ملتی ہیں۔ یہ الفاظ بعد میں متروک ہو گئے مگر اب بہ شرط موزونیت اُنہیں پھر سے رائج کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اُردو کو آزاد ہندوستان میں ملک کی دوسری زبانوں کے دوش بدوش آگے بڑھنا ہے۔ پروفیسر سلیم اور اُن کے ہم نوا ہندی سے استفادے کے حامی تھے۔ اس بارے میں "وضع اصطلاحات" میں موصوف نے لکھا ہے۔

(اُردو کے لئے) ہندی بمنزلہ زمین کے ہے۔ اس زمین پر فارسی اور عربی کے پودے لگائے گئے ہیں۔ اسی تختے پر غیر زبانوں نے آکر گل کاری کی ہے۔ اگر یہ زمین نکال دی جائے تو پھر اُردو کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔ ہندی کو ہم اپنی زبان کے لئے اُم اللسان اور ہیولائے اوّل کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بغیر ہماری زبان کی کوئی ہستی نہیں ہے۔ اس کی مدد کے بغیر ہم ایک جملہ بھی نہیں بول سکتے۔"

یہ خیال درست ہے اور وضع اصطلاحات میں اس کو رہنما بنایا جا سکتا ہے۔ وضع اصطلاحات میں اُردو کے مفرد الفاظ، مرکبات، تراکیب، اور مشتقات کا جائزہ لیا گیا ہے اور الفاظ کی ساخت کے اعتبار سے آریائی زبانوں کے مشترکہ اصولوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اُردو میں مرکب امتزاجی اور مرکب ارتباطی کی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ جن کے نمونے پر نئی اصطلاحیں وضع کی جا سکتی ہیں۔ آریائی زبانوں کا ایک مشترک اصول سابقوں، لاحقوں، نیم سابقوں اور نیم لاحقوں کا استعمال ہے۔ جو مادّے کے آگے پیچھے اضافہ کئے جاتے ہیں اور جن کی بدولت نئے مفاہیم پیدا ہوتے ہیں۔ پروفیسر سلیم نے عملاً ثابت کر دکھایا ہے کہ اس اصول کے تحت فارسی، عربی اور ہندی کے مادّوں کو استعمال کر کے بے شمار تراکیب اور اصطلاحات وضع کی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر موصوف نے صرف ایک لفظ "برق" کے ساتھ سابقوں، لاحقوں، نیم سابقوں، نیم لاحقوں کا اضافہ کر کے (۳۰۰) سے زیادہ تراکیب اور اصطلاحات بنا ڈالیں۔ ایک اور اصول جو آریائی زبانوں میں مشترک ہے یہ ہے کہ ضرورت کے مطابق ہر لفظ سے فعل بنا لیا جائے جیسے انگریزی میں NATION سے NATURE - NATIONALISE سے NATURALISE۔ اسی طرح اُردو میں قوم سے قومانا یا قومیانا، برق سے برقانا، اُردو سے اُردوانا، ہندی سے ہندیانا، مقناطیس سے مقناطیسانا، ترشہ سے ترشانا، قلم سے قلمانا، مرکز سے مرکزانا، نمک سے نمکانا جیسے افعال بنائے جا سکتے ہیں۔

دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے مترجمین کار کے بارے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ترجمہ طلب اصطلاحات کا انتخاب بغائر یا گلاسری

سے نہیں کیا جاتا تھا۔ جامعہ کی نصابی مجلسیں اپنی اپنی ضروریات کی کتابوں کا انتخاب کرتی تھیں جو ترجمے کے لئے دارالترجمہ روانہ کی جاتی تھیں۔ ترجمے کے دوران مترجمین ایسے الفاظ اور اصطلاحات کی فہرستیں متعلقہ مجالس وضع اصطلاحات میں بھیجتے تھے جن کے ترادفات انہیں اردو میں نہ مل سکے ہوں۔ مجالس وضع اصطلاحات کا کام جدید علوم کی ضروریات کے مطابق اردو میں علمی اور فنی موزوں اور زرخیز اصطلاحیں یعنی ایسی اصطلاحیں وضع کرنا تھا جن سے مشتقات نکل سکیں۔ ان مجالس کے اراکین دو قسم کے ہوتے تھے۔ ایک وہ جو اس علم کے ماہر ہوں جس کا ترجمہ زیر غور تھا۔ اور دوسرے ایسے علما جو عربی فارسی اور اردو میں کامل دسترس رکھتے ہوں۔ ماہرین زبان کی حیثیت سے مجالس وضع اصطلاحات میں شرکت کرنے والوں میں نواب حضور یار جنگ نظم طباطبائی، علامہ عبداللہ عمادی، مولوی عبدالحق، مولانا عبدالہادی ندوی، رشید الدین سلیم پانی پتی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور شامل تھے۔ اصطلاحات کی صحت، مفہوم اور اردو کے لئے ان کے قابل قبول ہونے یا نہ ہونے کا اندازہ کالج کی جماعتوں میں تدریس کے دوران ایک حد تک ہو جاتا تھا۔

اصطلاح باہمی قرارداد اور آپس کی مفاہمت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور اس لحاظ سے کسی لفظ یا ترکیب کے جو معنے مقرر کئے جائیں وہی متعلقہ گروہ میں سمجھے جائیں گے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ اصطلاحی لفظ یا ترکیب میں متعلقہ تمام مفہوم موجود ہو۔ کل کے لئے جزو کے اصول کے تحت اس خاص علم سے تعلق رکھنے والوں کے لئے خفیف سا اشارہ کافی ہو سکتا ہے۔ اصطلاح کی ضرورت یوں پیش آتی ہے کہ اگر اصطلاحیں جو خیالات کے مجموعے کی جانب رہبری کرتی ہیں، استعمال نہ کی جائیں تو مطالب کے اظہار میں طوالت سے بچا نہیں جا سکتا۔ اس کی ایک مثال شمس الامرا کے دارالترجمے کی کتاب "رسالہ کیمسٹری" میں ملتی ہے، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اور جس میں ٹرمرک پیپر کا ترجمہ نہیں کیا گیا بلکہ مطلب سمجھانے کے لئے "ہلدی کے پتے کے رس میں بھگویا ہوا کاغذ" لکھا گیا ہے۔ یہ اصلاح متن میں بار بار آتی ہے اور ہر جگہ "ہلدی کے پتے کے رس میں بھگویا ہوا کاغذ" لکھا گیا ہے۔ اس طول لاطایل سے بچنے کے لئے اصطلاح سازی ضروری ہے۔ تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ ناموزوں اور بے ضرورت اصطلاحیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ جیسے آکسیجن (OXYGEN) کا ترجمہ مائین، ہائڈروجن (HYDROGEN) کا ترجمہ جمضین مقبول نہیں ہوا۔ ان ناموں کے ترجمے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں یہ تمام بجنسہ مستعمل ہیں۔ اصطلاح اور معمولی طرز اظہار میں فرق بھی ضروری ہے۔ مثال کے طور پر پچھلے صفحات میں اصطلاحات کا جو ترجمہ درج کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض صحیح معنے میں اصطلاحیں نہیں ہیں اور ان سے مشتقات بھی نہیں نکل سکتے۔ جیسے پیدا کرنے والی محنت"، "غیر پیدا کرنے والی محنت" اور اب ان کی بجائے "محنت پیدا آور" اور "محنت غیر پیدا آور" کی اصطلاحیں مروج ہیں۔ پولیٹیکل اکانومی (POLITICAL ECONOMY) کا ترجمہ ابتداً علم انتظام مدن کیا گیا۔ پھر اس کے لئے "علم سیاست مدن"، "علم الاقتصاد" اور "اقتصادیات" کی اصطلاحیں بنیں۔ اور بالآخر "معاشیات" کی اصطلاح مقبول ہوئی۔ ایسڈ (ACID) کا ترجمہ بھی ارتقا کی منزلیں طے کر کے کھٹے سے ترشہ اور بالآخر تیزاب بن گیا۔ تھرمامیٹر (THERMOMETER) کا ترجمہ ابتدا میں "تابدرجہ نما" تھا۔ اس کے بعد "مقیاس الحرارت"، "ہوا"، پھر حرارت پیما، اور بالآخر تپش پیما" لیکن تھرمامیٹر اپنی اصلی شکل میں زیادہ قابل قبول ثابت ہوا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ چیزوں کے نام کا ترجمہ ضروری نہیں جب تک یہ نام اردو کے لئے قطعاً ناقابل قبول نہ ہوں اور کثرت ہونت کے ساتھ زبان پر رواں نہ ہو سکے۔ اس سلسلے میں ٹرمرک پیپر کا ترجمہ بھی قابل ذکر ہے، جو ابتدا میں "ہلدی کے پتے کے رس میں بھگویا ہوا کاغذ" کیا گیا۔ پھر "ہلدی رس کاغذ"، ہوا۔ اور بالآخر جامعہ عثمانیہ میں "ہلدی کاغذ" ہو گیا۔

غرض وضع اصطلاحات سے متعلق مسائل بہت سے ہیں۔ لیکن ہندی، فارسی، عربی جس زبان سے بھی موزوں مفید اور گوش آشنا مادہ مل سکے لیا جا سکتا ہے۔ دقت زیادہ تر دو یا دو سے زیادہ لفظوں کے باہمی ربط کے معاملے میں پیش آتی ہے ضرورت ہے کہ ہندی اردو دوسری آریائی زبانوں اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مانوس اور موزوں الفاظ کے ساتھ عربی، فارسی جوڑ جائز سمجھا جائے۔ ان الفاظ کے ساتھ عربی، فارسی سابقے اور لاحقے بے تکلف استعمال کئے جائیں جس کی مثالیں اردو میں موجود ہیں۔ جیسے سمجھدار۔ بے کل، بے چین، اگالدان وغیرہ۔ جو اصلاحیں مروج ہیں ان کو برقرار رکھنے کا اہتمام بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو اس وقت تک جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں وہ بے کار ہو جائیں گی۔ ان سب سے بیشتر اصطلاحات کا پتہ دوسرے ذرائع کے علاوہ دارالترجمہ کی مطبوعات "فرہنگ اصطلاحات علمیہ" اور اصطلاحات پیشہ وراں" کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل ماہرین سائنس عمرانیات کی اردو تالیفات کی مدد سے چلایا جا سکتا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۴۱ پر)

انکم ٹیکس دہندگان!

محکمہ انکم ٹیکس کی طرف سے

ہر ٹیکس دہندگان کو الاٹ کیا گیا ہے تاکہ ادائیگیوں کے چالانوں، گوشواروں اور دوسری خط و کتابت کا صحیح ڈھنگ سے ریکارڈ رکھا جا سکے اور انھیں فائل کیا جا سکے۔

اگر غلطی سے آپ کو دو مستقل کھاتہ نمبر الاٹ ہو گئے ہیں یا کوئی بھی نمبر الاٹ نہیں کیا گیا، تو ازراہ کرم اپنے انکم ٹیکس افسر/کمشنر انکم ٹیکس سے کہیں کہ وہ آپ کے دوسرے نمبر کو منسوخ کر دیں یا کوئی نمبر الاٹ کریں۔

ازراہ کرم اپنے گوشواروں، چالانوں وغیرہ پر اپنے مستقل کھاتہ نمبر کا صحیح طور پر حوالہ دینا نہ بھولیں۔ اس سے جہاں آپ محکمے کی مدد کریں گے، وہاں محکمہ بھی آپ کی بہتر خدمت انجام دے سکے گا۔

جاری کردہ:-
ڈائریکٹوریٹ آف انسپکشن
(ریسرچ، سٹیٹسٹکس اینڈ پبلی کیشن)
نئی دہلی

davp 73/167

اکتوبر ۱۹۷۳ء ۶۰ پیسے

آجکل

ضمیمہ اُردو نمبر

VOL. 32 No. 3 AJKAL (MONTHLY) OCTOBER 1973
Published by the Director, Publications Division, Patiala House NEW DELHI-1
Printed by Indian Printing works, Rani Jhansi road, NEW DELHI-55
REGD. No. D 509

اگست ستمبر ۱۹۷۳ء ایک روپیہ

(7)

6/9/73

Osmania University Library
Hyderabad-500007. (A.P.)

آجکل

اُردو نمبر

۱۱ر جولائی ۱۹۷۳ء کو ہند سرکار نے پاکستانی جنگی قیدیوں میں سے ۴۳۸ پاکستانیوں کو جن میں ۱۷ افسر، ۲۲ جونیئر کمیشنڈ افسر، ۳۲۹ سپاہی اور ۷۰ شہری تھے، انسانی ہمدردی کے ناتے رہا کر کے پاکستان واپس بھیجا۔ یہ کارروائی بنگلہ دیش کی رضامندی سے کی گئی۔ تصویر میں ایک بیمار قیدی کو واگہ سرحدی ناکے سے پار کرایا جا رہا ہے۔

جمعہ ۲۰ر جولائی ۱۹۷۳ء کو پاکستانی جنگی قیدیوں کے چند عیال اور لواحقین کو بھی پاکستان واپس بھیج دیا گیا۔ تصویر میں یہ لوگ ایک خصوصی ٹرین سے واگہ سرحدی ناکے کے پاس اُتر رہے ہیں۔

اُردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

آج کل

نئی دہلی

ترتیب

اداریہ		۲
اُتر پردیش میں اُردو	ادارہ	۴
بہار میں اُردو	سہیل عظیم آبادی	۱۰
مہاراشٹر میں اُردو	عبدالحمید بوبیرے	۱۴
مدھیہ پردیش میں اُردو	قمر الحسن	۲۲
آندھرا پردیش میں اُردو	اختر حسن	۳۰
میسور میں اُردو	سلیم تمنائی	۳۸
مغربی بنگال میں اُردو	جاوید نہال	۴۴
تمل ناڈو میں اُردو	کاوش بدری	۵۰
راجستھان میں اُردو	ابوالفیض عثمانی	۵۸
گجرات میں اُردو	وارث علوی	۶۶
پنجاب، ہریانہ، ہماچل پردیش میں اُردو	نند کشور وکرم	۷۰
جموں وکشمیر میں اُردو	محمد یوسف ٹینگ	۷۸
دہلی میں اُردو	راج نرائن راز	۸۶

اُردو نمبر

سرورق :- جیون اڈلجہ

ایڈیٹر
مہدی عباس حسینی

(ٹیلیفون نمبر ۳۸۷۰۶۹)

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۳۲ — شمارہ ۲،۱

اگست ستمبر ۱۹۷۳ء
شراون بھادر۔ آشوین شک سمت ۱۸۹۵

سالانہ چندہ

ایک سال	:	۷ روپے
۲ سال	:	۱۲ روپے
۳ سال	:	۱۷ روپے

شائع کردہ

ڈائریکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آج کل (اُردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

ترسیل زر کا پتہ
منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

اداریہ

ہند میں اُردو کا مستقبل

اُردو دُنیا کی اُن چند زبانوں میں سے ہے جو ایک سے زیادہ ملکوں میں بولی اور سمجھی لکھی اور پڑھی جاتی ہیں۔ دُنیا میں سب سے زیادہ ایسے لوگ جن کی مادری زبان اُردو ہے ہند میں پائے جاتے ہیں۔ باقی ماندہ پاکستان میں اور بعض اُن ملکوں میں جہاں ہندوستانی یا پاکستانی پائے جاتے ہیں۔

اُردو ہند میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی اور گو کہ گزشتہ ربع صدی اس کے لئے سازگار ثابت نہیں ہوئی لیکن آج بھی اُردو دو کروڑ چھیاسی لاکھ سے زیادہ ہندوستانیوں کی مادری زبان ہے جبکہ پاکستان میں اُردو محض ۳۳ لاکھ لوگوں کی مادری زبان ہے۔ اُردو پاکستان کی سرکاری زبان ضرور ہے لیکن وہاں اس کی حیثیت ایک مہاجر کی سی ہے۔ ایک طرف تو عملاً سرکاری زبان انگریزی ہے۔ دوسرے پاکستان میں اُردو کے وجود کا واحد سبب یہ ہے کہ اس کا ایک ادبی سرمایہ ہے کیونکہ وہاں علاقائی زبانیں اتنے زور اور دم داعیئے کے ساتھ اُبھر رہی ہیں کہ جیسے ہی اُن کے پاس قابل لحاظ ادبی سرمایہ ہو جائے گا پاکستانیوں کو اُردو کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ لہٰذا پاکستان میں اُردو کا مستقبل مشتبہ ہے۔

"آج کل" کے اس شمارے میں شاید پہلی بار یہ کوشش کی گئی ہے کہ ہند کی ریاستوں میں اُردو کی صورتِ حال کا ایک صحیح جائزہ، بلا کم و کاست، محض حقائق اور اعداد و شمار کی روشنی میں پیش کیا جائے خود شناسی خود آگاہی کا پہلا درجہ ہے اور آگاہی عمل کا۔ آئندہ صفحات سے جو مجموعی صورتِ حال اخذ کی جا سکتی ہے وہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ بہار، آندھرا پردیش، میسور اور مہاراشٹر کے علاوہ اُردو میں ابتدائی تعلیم کا بندوبست دوسری ریاستوں میں تسلی بخش نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا اُردو داں والدین کے بچے دوسری علاقائی زبانیں پڑھنے لگے ہیں۔ پھر بھی مجموعی طور پر ملک میں اُردو اسکولوں، طلبا اور اساتذہ کی تعداد میں اضافے کا رجحان نمایاں ہے۔

۲۔ تقسیم ملک کے وقت جتنے اخبارات و رسائل اُردو میں شائع ہوتے تھے ان کی تعداد اور اشاعت میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اسی طرح پہلے کی بہ نسبت آج کتابیں بھی زیادہ شائع ہوتی ہیں۔ انکے موضوعات کا تنوع بڑھ گیا ہے۔ لیکن ایڈیشن چھوٹے ہو گئے ہیں۔ گو اس کی تلافی پیپر بیک ایڈیشنوں سے ہو جاتی ہے۔

۳۔ سرکاری اداروں میں اُردو کا استعمال جو چند ریاستوں میں کم اور بعض میں بالکل ختم ہو گیا تھا اب اس میں رفتہ رفتہ پھر اضافہ ہو رہا ہے۔

۴۔ ابتدائی تعلیم میں اُردو پڑھانے کا انتظام کم ہونے کے باعث اساتذہ کی تعداد میں کمی واقع ہو گئی تھی۔ لیکن اب یہ تعداد پھر بڑھ رہی ہے۔ لیکن اعلیٰ تعلیم میں طلبا اور اساتذہ کی تعداد آج ہمیشہ سے زیادہ ہے۔ فلمی اور صحافتی دنیا میں اُردو مصنفین، گیت کار اور صحافیوں کی بڑی مانگ ہے۔ مشاعروں کی اب بھی کمی نہیں اور شعراء کا معاوضہ بہت بڑھ گیا ہے۔

۵۔ درسی، علمی کتابوں کے تراجم کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اصطلاحات و لغت سازی کو فروغ مل رہا ہے۔ سائنسی اور تکنیکی موضوعات پر طبع زاد کتابیں بھی لکھوائی اور شائع کی جا رہی ہیں۔

۶۔ علاقائی زبانوں اور اُردو کے مابین تراجم جو تقسیم ملک کے وقت شاذ و نادر تھے اب بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ ہند میں اُردو کا بہترین تخلیقی ادب نہ صرف ترجمہ ہو چکا ہے بلکہ نہایت مقبول ہوا ہے۔ اس طرح اُردو داں طبقے کو بھی دیگر ہندوستانی زبانوں کے ادب سے واقفیت ہو گئی ہے۔ اس سے قومی یک جہتی کو فروغ ملا ہے۔

۷۔ جہاں تک شعراء و ادبا کی سرپرستی کا تعلق ہے، نہ صرف مرکز بلکہ متعدد ریاستوں کی طرف سے بھی انہیں انعام و اکرام سے نوازا جاتا ہے۔ پنشن دی جاتی ہے۔ کتابوں کی اشاعت کے لئے امداد دی جاتی ہے اور کتابیں خریدی جاتی ہیں۔ اتر پردیش اور بہار میں اُردو اکاڈمیاں قائم ہو چکی ہیں۔ اُردو اداروں مثلاً انجمن ترقی اُردو، مکتبہ جامعہ، دار المصنفین وغیرہ کو بھی امداد ملتی رہتی ہے۔ مرکز نے نہ صرف ایک ترقی اُردو بورڈ قائم کیا ہے۔ بلکہ ایک فروغ اُردو کمپنی بھی مقرر کی ہے جس کے سربراہ مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات، شری اندر کمار گجرال ہیں۔

مندرجہ بالا حقائق کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ اُردو کو نقصان پہنچانے والی قوتوں کا زور ختم ہو چکا ہے۔ اب فضا سازگار ہے اور حکومت پشت پر ہے سوال یہ ہے کہ کیا یہ مریض محض دوا کے بھروسے پر بیٹھا رہے گا یا کچھ قوتِ ارادی اور قوتِ عمل سے کام لے کر طبیب کے کام کو آسان کرے گا بلکہ اس کی ہر طرح سے مدد کرے گا؟

اُتر پردیش میں ہند کی ساری خلقیں اور قوتیں اُس کے سارے تضاد اور کمزوریوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ زبانیں ماحول اور تہذیب سے بنتی اور سنورتی ہیں۔ ایک مدت تک یہ گنگا اور جمنا کا دوآبہ، ملک کا زرخیز ترین حصہ تھا۔ یہیں آریوں کی سب سے بڑی آبادیاں قائم ہوئیں۔ یہیں اُن کا مذہب، تہذیب و تمدن نقطۂ کمال تک پہنچا۔ یہ نہ صرف وشنو کے اوتار، رام اور کرشن کی جنم بھومی ہے بلکہ اس میں شیو کی نگری وارانسی اور گوتم بدھ کی تبلیغ کا نقطۂ آغاز سارناتھ بھی پایا جاتا ہے۔ اس میں مغل تخیل، جذبے اور عمل کا شاہکار تاج محل پایا جاتا ہے۔ اسی میں ہندو مسلم تہذیب کا سنگم لکھنؤ موجود ہے۔ اُردو زبان کا آغاز پنجاب اور ہریانہ کے میدانوں میں ہوا۔ دکن نے اُسے ایک ادبی روپ دیا۔ دلی نے اُسے اُردوئے معلیٰ بنایا لیکن جب مغل سلطنت میں ضمحلال آنے لگا تو نوابین اودھ اور رام پور نے اُسے سہارا دیا اور لکھنؤ کے تہذیبی ماحول میں تو اُردو میں وہ جلا، حلاوت اور نفاست پیدا ہوئی کہ اودھ کی سلطنت کے مٹنے کے سو برس بعد آج بھی ملک کے ہر گوشے کے لوگ لکھنؤ کی زبان کا دم بھرتے ہیں۔ اُردو ہی نہیں ٹکسالی ہندی بھی اسی پردیش میں بولی جاتی ہے۔

پس منظر :- اُتر پردیش میں اُردو کی جڑیں بہت قدیم ہیں۔ امیر خسرو (۱۲۵۵ - ۱۳۲۵ء) جنہیں اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کا پہلا شاعر کہا جاتا ہے۔ ایٹہ ضلع کے ایک گاؤں پٹیالی میں پیدا ہوئے۔ خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی یہیں کچھوچھہ شریف میں دفن ہیں۔ آج اُردو کی قدیم ترین نثری کتاب، انہیں کا ایک رسالہ "اخلاق و تصوف" (تصنیف ۱۳۰۱ء) ہمارے پاس موجود ہے۔ ان کے بھی تاریخ اُردو ادب کے چند اہم ستون اس ریاست سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں محمد افضل جھنجھانوی (وفات ۱۶۲۵ء) جن کی اُردو کی مثنوی اور بارہ ماسہ موجود ہے اور چندربھان برہمن (پیدائش اکبرآباد، وفات ۱۶۶۲ء) جن کی ایک اُردو غزل اب بھی مشہور ہے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اٹھارویں صدی کے آواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں علاحسین تحسین اٹاوی (نوطرز مرصع ۱۷۹۸ء) اکرام علی (فورٹ ولیم کالج) رجب علی بیگ سرور، فقیر محمد خاں گویا، منشی عبدالکریم (مولف الف لیلہ اُردو) امانت لکھنوی، مولوی غلام امام شہید، خواجہ غلام غوث بے خبر، مولانا عبدالحق خیرآبادی، مولانا فضل حق خیرآبادی۔ سب اُتر پردیش کی خاک سے پیدا ہوئے۔

دراصل صرف پیدائش کو باعث تفاخر نہیں سمجھنا چاہئے۔ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ کوئی علاقہ یا مرکز کسی ادب کی نشو و نما کے لئے کس قدر موافق فضا بہم پہنچاتا ہے۔ اگر ہم اس معیار کو مدنظر رکھیں تو زوال دہلی کے بعد اُردو ادب کی ترویج و ترقی میں لکھنؤ، رام پور، علی گڑھ، الٰہ آباد اور اعظم گڑھ کی خدمات کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اگر برہمن، نظیر اور غالب آگرے میں پیدا ہوئے تو سرسید احمد، نذیر احمد، حالی اور وحیدالدین سلیم نے علی گڑھ میں بیٹھ کر علم و ادب کو مالا مال کیا۔ اسی طرح میر و سودا، مصحفی اور انشا، غالب، مومن اور داغ دلی والے ضرور تھے لیکن اُن کو سہارا لکھنؤ اور رام پور میں ملا۔ قصہ مختصر اگر ہم چند نام گنانا چاہیں، (زندہ ادباء کا ذکر بعد میں آئے گا) تو ایک زرّیں فہرست تیار ہو جائے گی جس میں نظیر، انیس، دبیر، آتش، ناسخ، نسیم، شوق، امیر، سلیم جان صاحب، اکبر، چکبست، حسرت، صفی، آرزو، عزیز، ظریف، ثاقب، ثاقل، اصغر، جگر، سیماب، نظر، سرور، رواں، تلم، روش، منور لکھنوی بہیں اور مجاز شعراء میں، سرشار، شرر، سجاد حسین، محمد علی، رسوا، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، قاضی عبدالغفار، پریم چند، علی عباس حسینی تخلیقی لکھنے والوں میں، اور شبلی، سید علی و سید حسن بلگرامی، عبدالستار صدیقی، سید سلیمان ندوی، رام بابو سکسینہ، نیاز فتحپوری، احتشام حسین، اختر علی تلہری، ضیا احمد بدایونی، ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ تحقیق، تنقید اور انشائیہ کے میدان میں اپنا سکہ ثبت کر چکے ہیں۔

اُتر پردیش کو یہ بھی شرف حاصل ہے کہ کل ہند ترقی پسند مصنفین کی تحریک نے اسی سرزمین میں جنم لیا۔ پہلی ترقی پسند مصنفین کانفرنس ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں منعقد ہوئی اور انجمن کے صدر پریم چند اور سکریٹری سجاد ظہیر چنے گئے۔ دوسری اور تیسری کل ہند کانفرنس بھی اُتر پردیش میں بہ مقام الٰہ آباد منعقد ہوئی۔ تحریک کے جنم داتاؤں میں سجاد ظہیر، پریم چند، ڈاکٹر عبدالعلیم، احمد علی (جو اس وقت الٰہ آباد میں پڑھاتے تھے) فراق گورکھپوری، ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر عابد حسین، احتشام حسین اور ڈاکٹر رشید جہاں کا نام پیش پیش ہے۔ تحریک کا ترجمان رسالہ "نیا ادب" سبط حسن، علی سردار جعفری، اور مجاز نے لکھنؤ سے نکالا۔ اور اس زمانے میں حیات اللہ انصاری کے ہفت روزہ "ہندوستان" نے بھی ترقی پسند لکھنے والوں کو بڑھاوا دیا۔

ان دونوں جریدوں میں لکھنے والوں میں بانیوں کے علاوہ حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، علی عباس حسینی، آنند نرائن ملا، علی سردار جعفری، مجاز، جاں نثار اختر، حیات اللہ انصاری، علی جواد زیدی، مسعود اختر جمال، اور سلام مچھلی شہری پیش پیش تھے۔

دوسرا مرکز:- اتر پردیش میں کئی طرح کے علم وفضل کے مراکز پائے جاتے ہیں۔ ایک تو دربار سے وابستہ یعنی اکبرآباد، لکھنؤ، رام پور وغیرہ، دوسرے دربار سے دور چھوٹے شہر اور قصبے جہاں علماء اور صوفیا کے گھرانے اور مدرسے تھے۔ مثلاً سہارن پور، مرادآباد، میرٹھ، بجنور، بدایوں، مارہرہ، نہٹور، بلگرام، جایس، سیتاپور، خیرآباد، اعظم گڑھ، چریاکوٹ، گورکھپور، فیض آباد، جونپور، مچھلی شہر، گوپامئو، غازی پور وغیرہ۔ تیسرے وہ شہر جہاں یونیورسٹیاں قائم ہیں ان میں علی گڑھ، الہ آباد، بنارس اور لکھنؤ نے اُردو ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔

علی گڑھ اُردو ادب کی ترویج و ترقی میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ سرسید نے اسی کو اپنے خیال و عمل کی آماجگاہ بنایا۔ ان کے ساتھیوں میں محسن الملک، چراغ علی، نذیر احمد، اور شبلی، اتر پردیش کے رہنے والے تھے۔ ان کے علاوہ حالی اور سلیم پانی پتی نے اپنی عمر کا بہترین کام علی گڑھ میں کیا۔ ان کے علاوہ محمد عوض، جوہر، شوکت علی، حفیظ علی بدایونی، عبدالرحمن بجنوری، حسرت موہانی، فانی بدایونی، عظمت اللہ خان، ظفر علی خاں، اقبال سہیل، سجاد حیدر یلدرم، سجاد انصاری، سلطان حیدر جوش، ظفر عمر، قاضی عبدالغفار، ضیاء احمد بدایونی، ڈاکٹر ذاکر حسین، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر عبدالعلیم، رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، معین احسن جذبی، مسعود حسین خاں، مختار الدین آرزو، اختر رائے پوری، اختر انصاری، سبط حسن، مجاز، علی سردار جعفری، عصمت چغتائی، شاہد لطیف، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، جاں نثار اختر، یاری علیگ، منٹو، خلیل الرحمن اعظمی، اسلوب احمد انصاری، منیب الرحمن اور ڈاکٹر محمد حسن بھی علی گڑھ سے کسی نہ کسی طور سے وابستہ رہے۔ یہ فہرست بھی جامع نہیں۔

اُردو زبان بولنے والوں کی تعداد

یہ بحث [illegible] اتر پردیش میں سیاسی اسباب کی بنا پر اُردو کو خواہ مخواہ [illegible] طرفین [illegible] کی سوتیلا شکنی کی گئی ہے لیکن اب بھی اُردو مادری زبان درج کرانے والوں کی تعداد ملک میں سب سے زیادہ اتر پردیش میں ہے۔ پہلی چند دہائیوں کے اعداد کو ملاحظہ ہو [illegible]

1951ء [illegible]

تینتالیس لاکھ چار سو پچیس اٹھہتر لاکھ اکیانوے ہزار سات سو چودہ بانوے لاکھ [illegible] اسی

مردم شماری کے سلسلے میں اُردو والوں کو مستقل شکایت رہی ہے کہ متعدد ریاستوں میں اُن کی تعداد صحیح نہیں درج ہوتی ہے۔ مرکزی محکمے کی غیر جانبداری میں کسی کو کلام نہیں لیکن ریاستوں میں مردم شماری کرنے والا عملہ مقامی ہوتا ہے اور یہ مقامی لوگ اگر کسی خاص زبان سے لگاؤ یا پرخاش رکھتے ہوں، تو ان پڑھ لوگ بالکل ان کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ چنانچہ 1961ء اور 1971ء کے اعداد سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اتر پردیش میں 1951ء میں زبان کا خانہ صحیح طور پر نہیں بھرا گیا۔ پھر 1971ء کے اعداد ہی کو لیجئے۔ کہا جاتا ہے کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اور جہاں تک اتر پردیش کا تعلق ہے۔ ایسا مسلمان مشکل سے ملے گا۔ جو اُردو کو اپنی مادری زبان نہ مانتا ہو۔ لیکن 1971ء میں ریاست میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد ۳۶،۷۷،۰۰۰ تھی: اور اُردو مادری زبان والوں کی تعداد صرف ۹۲،۷۳،۰۸۹۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ باقی چوالیس لاکھ سے زیادہ مسلمانوں نے کون سی مادری زبان درج کرائی یا ان کے خانے میں کون سی زبان لکھی گئی؟ واضح ہو کہ یہ تعداد 1951ء میں اُردو مادری زبان درج کرانے والوں کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہے۔ بہرحال اگر بانوے لاکھ کی تعداد ہی کو صحیح مان لیا جائے تو بھی یہ محض ان لوگوں کی تعداد ہے جو اُردو کو اپنی مادری زبان بتاتے ہیں۔ اتر پردیش میں اُردو بولنے اور سمجھنے والوں کی کل تعداد معلوم کرنا ہو تو اس میں نہ صرف ہندی بلکہ دیگر تمام زبانیں بولنے والوں کو یعنی ریاست کی پوری آبادی کو شامل کر لیجئے۔ کیوں کہ جہاں تک بول چال کا تعلق ہے اُردو اور ہندی میں کوئی فرق نہیں۔ اور اتر پردیش کا بچہ بچہ دونوں زبانیں بولتا اور سمجھتا ہے۔

تعلیمی سہولتیں:- اتر پردیش میں اُردو تعلیم کے بارے میں کس حد تک ترقی ہوئی ہے، اس کا اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی رپورٹ کے چند ارشادات نقل کئے جائیں۔ کمشنر نے اپنی رپورٹ میں جو 1971ء میں طبع ہوئی تھی، لکھا ہے کہ ریاستی سرکار نے ۷۰-1969ء کے لئے پرائمری اسکولوں میں تعلیمی سہولتوں کے طلبار کے لئے ایڈوانس رجسٹر رکھنے کے بارے میں [illegible] اضلاع کے بارے میں اعداد و شمار بھیجے ہیں۔ میں یہ کہ [illegible] پرائمری تعلیم کے مکمل اعداد و شمار ریاستی سرکار نے تاحال نہیں بھیجے [illegible] 1969ء کے اعداد و شمار [illegible] کیا کہ اتر پردیش [illegible] کی

تعداد جو پچھلے سال علی الترتیب ۲۶۸، ۲ اور ۲۶۳ تھی۔ ۶۹-۱۹۶۸ء میں گھٹ کر ۲۰۶۱ اور ۲۶۰ رہ گئی۔ اسی طرح اُردو پڑھنے والوں اور اساتذہ کی تعداد جو پچھلے سال علی الترتیب ۵۲۷، ۴۴، ۲ اور ۵۲، ۵۷ تھی ۶۹-۱۹۶۸ء میں گھٹ کر ۵۷، ۳۰، ۲ اور ۰۰۰ ۵ رہ گئی۔ جہاں تک ثانوی تعلیم کا تعلق ہے، صرف ۴۹ اضلاع کے لئے دونوں سالوں کے اعداد و شمار مہیا ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ گو ۶۹-۱۹۶۸ء میں اُردو پڑھانے والے اسکولوں اور اساتذہ کی تعداد پچھلے سال کے مقابلے میں علی الترتیب ۱۵۹۸ اور ۶۳۴ سے بڑھ کر ۶۸۱ اور ۸۰۲ ہوگئی۔ لیکن طلبا کی تعداد جو پچھلے سال ۹۸۴، ۳۹ تھی گھٹ کر ۸۲۶، ۹ ۳ رہ گئی۔

بعد کے تین سال یعنی ۷۰-۱۹۶۹ء، ۷۱-۱۹۷۰ء، ۷۲-۱۹۷۱ء کے بارے میں اعداد و شمار دستیاب نہیں۔ لیکن اُتر پردیش سوچنا وبھاگ کے ایک حالیہ کتابچے سے ۷۳-۱۹۷۲ء کے لئے حسب ذیل معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

	تعداد
اُردو (میڈیم) پرائمری اسکول	۲۲۰۰
اُردو (اختیاری) سکنڈری اسکول	۱۲۰۰
اُردو (میڈیم) سکنڈری اسکول	۳ (صرف علی گڑھ میں)
اُردو (اختیاری) گورنمنٹ ڈگری کالج	۱ (رام پور میں)
اُردو (اختیاری) یونیورسٹیوں میں	ریاست کی ساری یونیورسٹیاں
ہائی اسکول امتحان اُردو طلبا (اختیاری)	۹۳ ۲ء
انٹر امتحان اُردو طلبا (اختیاری)	۶۱ ۵ء

کتابچے سے ظاہر ہوتا ہے کہ "ریاست کے شہری علاقوں کے سرپرائمری اسکول میں آئندہ تعلیمی سال سے (جواب شروع ہو چکا ہے۔ ادارہ) اُردو پڑھانے کی تمام سہولتیں مہیا ہوں گی۔ اس مقصد کے لئے تقریباً چار ہزار اُردو ٹیچر مقرر کئے جائیں گے۔ اگر کسی پرائمری اسکول میں فی الحال اُردو پڑھنے والے طالب علم نہ ہوں گے تب بھی اس اسکول میں کم از کم ایک اُردو ٹیچر کا بندوبست کیا جائے گا۔"

کتابچے کے مطابق ریاست نے اُردو کی تعلیم اور اس کی دیکھ بھال کے لئے ڈپٹی ڈائریکٹر کی تقرری کی ہے۔ اس کے علاوہ ہر منطقے کے لئے ایک ڈپٹی انسپکٹر اُردو میڈیم اسکولوں اور ریاست بھر کے عربی مدرسوں کے لئے ایک انسپکٹر مقرر کیا جا چکا ہے۔ اُردو کے ٹیچروں کی تقرری کے لئے ۷۲-۱۹۷۲ء میں ۱۸ لاکھ روپے منظور کئے گئے تھے۔

"ابھی تک پہلے درجے سے لے کر پانچویں درجے تک ہی اُردو کی درسی کتابیں مہیا تھیں۔ موجودہ حکومت نے حکم دیا کہ جولائی ۱۹۷۲ء سے چھٹی ساتویں اور آٹھویں درجوں کے لئے بھی اُردو نصاب کی کتابوں کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، حساب، الجبرا غرض کہ پندرہ مضامین میں اُردو کی درسی کتابیں مہیا ہو جائیں۔ چنانچہ یہ کتابیں گزشتہ سال بازار میں آ گئی تھیں۔"

اخبارات و رسائل:- اُردو صحافت میں ہندوستان کے جن مراکز کو پیش قدمی کا شرف حاصل ہے، اُن میں سے ایک اُتر پردیش ہے۔ اُردو کا پہلا اخبار جام جہاں نما ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔ اس کے تقریباً ۱۵ برس بعد یعنی ۱۸۳۷ء میں مرزا پور سے پہلا ماہانہ اخبار "خیر خواہ ہند" جاری ہوا۔ ریاست کے پہلے ہفتہ وار "اسعد الاخبار" (آگرہ ۔ ۱۸۴۷ء) کی اشاعت کے بعد متعدد دوسرے شہروں، بنارس، بریلی، میرٹھ، علی گڑھ، لکھنؤ وغیرہ سے سہ روزہ، ہفتہ وار، پندرہ روزہ اور ماہانہ اخبارات و رسائل کی اشاعت کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ تاہم دنیائے صحافت میں اس ریاست کی دھوم لکھنؤ سے اجرا شدہ منشی نول کشور کے "اودھ اخبار" (۱۸۵۹ء) اخبار "سین ٹیفک سوسائٹی" (۱۸۶۸ء) "تہذیب الاخلاق" (۱۸۷۰ء) اور منشی سجاد حسین کے مزاحیہ اخبار "اودھ پنچ" (۱۸۷۷ء) سے ہی ہے۔

دنیائے ادب میں اُتر پردیش کا نام منشی نوبت رائے نظر کے خدنگ نظر" لکھنؤ) منشی دیانرائن نگم کے "زمانہ" (کانپور) اور مولانا نیاز فتح پوری کے "نگار" (لکھنؤ) سے اونچا ہوا۔

ماضی کی طرح یہ خطہ، اخبارات، اخبار نویسوں اور صحافیوں کا اہم مرکز ہے۔ رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کی رپورٹ (۱۹۷۲ء) کے مطابق اس وقت اُتر پردیش سے ۱۸ روزنامے، ۴ سہ روزے، ۸۷ ہفتہ وار، ۱۹ پندرہ روزے، ۱۶۸ ماہنامے اور دیگر اخبارات و رسائل شائع ہوتے ہیں۔

جہاں تک روزناموں کا تعلق ہے۔ ۱۸ میں سے صرف چار اخبار ایسے ہیں جو آزادی کے پہلے سے نکل رہے ہیں۔ باقی سبھی روزناموں کا اجرا مختلف وقتوں میں مختلف مقصدوں سے عمل میں آیا ہے۔ اس وقت قومی آواز"، "پیغام"، "قومی جنگ" اور "سیاست جدید" اُتر پردیش کے مقبول روزنامے ہیں۔ "قومی آواز" (لکھنؤ ۱۹۴۵ء) کے موجودہ ایڈیٹر جناب عشرت علی صدیقی ہیں۔ ان سے پہلے مشہور ادیب و صحافی حیات اللہ انصاری اس اخبار کے ایڈیٹر رہے ہیں۔ یہ اخبار لگ بھگ ۹ ہزار شائع ہوتا ہے۔ جناب وحید الدین کی ادارت میں کانپور سے نکلنے والا اخبار "پیغام" بھی ۱۹۴۵ء میں جاری ہی

ہوا تھا۔ یہ اخبار بھی تقریباً ۹ ہزار شائع ہوتا ہے۔ مذکورہ اخبارات ہی جیسا مقبول روزنامہ "قومی جنگ" (رامپور۔ ۱۹۶۷ء) ہے۔ اس کے ایڈیٹر جناب ہاشم رضا عابدی الہ آبادی ہیں۔ روزنامہ "سیاست جدید" کانپور سے شائع ہوتا ہے اس کے ایڈیٹر جناب غفران زاہدی ہیں۔ دوسرے روزانہ اخبارات "آزاد" (بنارس) "جدت" (مرادآباد) "ناظم (رامپور) "صبح وشام" (رامپور) وغیرہ ہیں۔

ریاست سے چار سہ روزہ اخبار نکلتے ہیں۔ ان میں سے "مدینہ" (بجنور) سب سے پرانا ہے۔ یہ ۱۹۱۲ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے موجودہ ایڈیٹر سعید اختر صاحب ہیں۔ اس کی تعداد اشاعت تقریباً دو ہزار ہے۔

اُتر پردیش سے اس وقت ۸۷ ہفتہ وار اخبار شائع ہوتے ہیں۔ ان میں صرف دس ہفتہ وار ایسے ہیں۔ جو آزادی کے قبل سے شائع ہو رہے ہیں۔ باقی سبھی بعد میں جاری ہوئے۔ ریاست کا سب سے پرانا ہفتہ وار اخبار "مخبر عالم" (مرادآباد) ہے۔ یہ ۱۹۰۳ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے ایڈیٹر مظہر رضوی صاحب ہیں۔ ۱۹۰۳ء ہی میں بدایوں سے ہفتہ وار "ترجمان القرآن" جاری ہوا تھا۔ ریاست کا ایک کثیر الاشاعت ہفتہ وار "انصاری دنیا" (مرادآباد) ہے۔ اسرار حسین صاحب کی ایڈیٹری میں نکلنے والا یہ اخبار تقریباً آٹھ ہزار شائع ہوتا ہے۔ باقی سبھی ہفتہ وار اخبارات کی تعداد اشاعت دو ہزار سے کم ہے۔ علمی ادبی حلقوں میں "ہماری زبان" (علی گڑھ) "صدق جدید" (لکھنو) خاصے مقبول ہیں۔ "ہماری زبان" کے ایڈیٹر اُردو کے مشہور نقاد جناب آل احمد سرور ہیں۔ "صدق جدید" کے ایڈیٹر اُردو کے بزرگ نقاد، صحافی اور ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی ہیں۔ شیعہ قوم کا ترجمان ہفتہ وار "سرفراز" لکھنؤ سے مصطفےٰ حسن رضوی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔

اُتر پردیش سے شائع ہونے والے ماہناموں میں علمی، ادبی، مذہبی جاسوسی غرض کہ ہر نوع کے رسائل شامل ہیں۔ "الواعظ" (لکھنو۔ ۱۹۱۴ء) "معارف" (اعظم گڑھ۔ ۱۹۱۵ء) اور حریم (لکھنو۔ ۱۹۳۱ء) ہی شاید تین ماہنامے ہیں جو آزادی سے قبل سے نکل رہے ہیں۔ "معارف" علمی ادبی رسالہ ہے۔ ریاست کے دوسرے علمی ادبی رسالے "نیا دور" (لکھنو ۱۹۵۱ء) کتاب (لکھنو ۱۹۶۲ء) اور "شب خون" (الہ آباد ۱۹۶۶ء) ہیں۔ "نیا دور" محکمہ اطلاعات اُتر پردیش کا رسالہ ہے۔ اس کے ایڈیٹر جناب خورشید احمد ہیں۔ "کتاب" کے ایڈیٹر جناب شمیم الدین ہیں اور اس کی مجلس مشاورت میں جناب حیات اللہ انصاری، عابد سہیل، سہیل عظیم آبادی اور ڈاکٹر قمر رئیس شامل ہیں۔ "شب خون" محترمہ عتیلہ شاہین کی ادارت میں نکلتا ہے۔ جناب شمس الرحمان فاروقی اور محمود ہاشمی اس رسالے کی مجلس مشاورت میں ہیں۔ مذکورہ نیز ریاست کے دوسرے علمی ادبی رسائل میں کسی کی بھی تعداد اشاعت دو ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔

ریاست سے مذہبی رسالے ایک بڑی تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی تعداد اشاعت بھی خاصی ہے۔ ان میں "تجلی" (دیوبند) "الحسنات" (رامپور) اور "دارالعلوم" (دیوبند) "الفرقان" (لکھنو) "انوار الاسلام" (وارانسی) "الحضرت" (بریلی) اور دوسرے کئی رسالے شامل ہیں۔ ماہنامہ "تجلی" (دیوبند) کی تعداد اشاعت آٹھ ہزار سے زیادہ ہے۔ "کلیان" (لکھنؤ) "نور" (رامپور) اور "ثانی" (لکھنو) بچوں کے ماہنامے ہیں۔ ماہنامہ "نور" چار ہزار سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر جناب محمد عبدالحئی ہیں۔ "حریم" (لکھنو) اور رضوان (لکھنو) عورتوں کے رسائل ہیں۔ جاسوسی اور رومانی نوعیت کے رسائل "نکہت" "رومانی دنیا" "تاریخی داستان" اور "طلسمی دنیا" ہیں۔ یہ سبھی رسالے الہ آباد سے جناب سید عباس حسینی کی ادارت میں شائع ہوتے ہیں۔ ماہنامہ "شاہکار" شاید اُردو کا پہلا ادبی ڈائجسٹ ہے۔ پہلے یہ الہ آباد سے نکلتا تھا اب وارانسی سے شائع ہوتا ہے۔ اُتر پردیش سے شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کی مجموعی تعداد ۱۹۸ ہے۔ اس اعتبار سے اُتر پردیش ہندوستان بھر میں چوتھے نمبر پر آتا ہے۔

علمی ادبی سرگرمیاں :۔ اُتر پردیش کے متعدد شاعروں اور ادیبوں کا ذکر اس مضمون کے شروع میں آچکا ہے، دیگر ادباء و شعراء کے نام کسی تخصیص، تقدیم یا تاخیر کے بغیر حسب ذیل ہیں۔

آنند نرائن ملا، مسعود حسن رضوی ادیب، نورالحسن ہاشمی، سالک لکھنوی، صباح الدین عمر، خورشید احمد، حیات اللہ انصاری، عشرت علی صدیقی، بیگم سلطانہ حیات، منظر لکھنوی، منظر سلیم، حسن شہیر، احمد جمال پاشا، وجاہت سندیلوی، عبدالاحد خاں خلیل، امین سلونوی، حیات لکھنوی، حیات وارثی، عابد سہیل، نیر مسعود، شجاعت علی سندیلوی، شبیہ الحسن نونہروی، رام لال، شاہنواز قریشی، انیس اشفاق، وقار ناصری، احمد ابراہیم علوی، مرزا کاظم سلیمان عباسی، رضا عباس جعفری، ملک زادہ منظور احمد، عبدالقوی شمس علوی، نور بجنوری، پیام مچھوری، فراق گورکھپوری، اعجاز حسین،

(بقیہ صفحہ 91 پر)

ی مرح اُردو کتابیں فراہم کرتی ہے لیکن کالج میں آتے ہی لڑکوں کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کسی مضمون کی کتابیں اُردو میں نہیں ملتیں۔ لڑکے انگریزی یا ہندی کی مدد سے پڑھتے ہیں۔ لیکن امتحان میں جواب اُردو رسم الخط میں لکھتے ہیں۔

بہار میں اس وقت چھ یونیورسٹیاں ہیں۔ پٹنہ یونیورسٹی، بہار یونیورسٹی مظفرپور، بھاگلپور یونیورسٹی، رانچی یونیورسٹی اور متھلا یونیورسٹی، متھلا یونیورسٹی بہار یونیورسٹی، بھاگلپور اور بہار یونیورسٹی کے علاقوں سے حصے الگ کرکے بنائی گئی ہے۔ ان ساری یونیورسٹیوں میں اُردو امتحان کا انتظام ہے۔ پٹنہ، بہار، مظفرپور، دربھنگہ میں ایم اے تک اُردو پڑھائی جاتی ہے۔ باقی تین یونیورسٹیوں میں تعلیم کا انتظام تو نہیں لیکن امتحان دینے کی اجازت ہے اور اس کا یقین ہے کہ جلد ہی ساری یونیورسٹیوں میں اُردو تعلیم کا انتظام ہوجائے گا۔ ان یونیورسٹیوں میں طلبا کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔

ان کے علاوہ بہار میں دینی مدرسوں کی بہت بڑی تعداد ہے جن کا ذریعۂ تعلیم عام طور پر اُردو ہی ہے۔ دینی مدرسوں کے علاوہ مکاتب کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ ان میں ایسے مکتب بھی شامل ہیں جن کو کوئی سرکاری امداد نہیں ملتی۔ گاؤں والے خود اُن کی کفالت کرتے ہیں۔

اُردو اخبارات و رسائل

بہار میں اُردو صحافت کی روایت ایک صدی سے زیادہ اپنے پرانی ہے۔ بہار سے پہلا نور الانوار آرہ سے جولائی ۱۸۵۳ء میں جاری ہوا تھا اس کے علاوہ اُردو صحافت کی تاریخوں میں دس روزہ پٹنہ ہرکارہ (۱۸۵۵ء) اخبار بہار (ستمبر ۱۸۵۶ء) وکیل رپوٹ گیا (ستمبر ۱۸۵۶ء) مژدۂ علم" (پٹنہ ۔ ۱۸۷۸ء) ماہانہ انجمن مذاکرہ علمیہ (۱۸۷۴ء) اور بعض دوسرے اخبارات و رسائل کا پتہ چلتا ہے۔

اس وقت بہار سے سات روزنامے شائع ہوتے ہیں روزنامہ صدائے بہار کا سب سے پرانا اخبار ہے۔ یہ ۱۹۴۲ء میں پٹنہ سے جاری ہوا تھا۔ بھی روزنامے آزادی کے بعد شائع ہونا شروع ہوئے ہیں۔

روزنامہ صدائے عام کے ایڈیٹر سید رضی حیدر ہیں۔ اس کی اشاعت ۱۰ ہزار ہے۔ روزانہ سنگم" پٹنہ کے ایڈیٹر جناب غلام سرور ہیں اخبار اپنی تعداد اشاعت گیارہ ہزار سے زیادہ بتاتا ہے۔ ایک اور اہم اخبار ساتھی ہے ۱۹۴۹ء میں پٹنہ ہی سے شائع ہونے والے اس اخبار کے

ریجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کی حالیہ (۱۹۷۱ء) رپورٹ میں اس کی اشاعت چار ہزار تسلیم کی گئی ہے (ادارہ)

ایڈیٹر جناب خالد رشید ہیں۔ یہ نو ہزار شائع ہوتا ہے۔

۱۹۷۰ء کے بعد شائع ہونے والے روزنامے" صداقت" "پیغام نہرو" "راہ رو" اور طاؤس" ہیں۔

بہار سے شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبارات کی تعداد بیس کے لگ بھگ ہے۔ "روشنی" (پٹنہ) بہار کا سب سے پرانا ہفتہ وار اخبار ہے۔ یہ ۱۹۵۷ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے موجودہ ایڈیٹر ایس۔ ایم۔ رحیم شمیم صاحب ہیں۔ دوسرے اہم ہفتہ وار اخبار "آدرش" (گیا) آغاز" (پٹنہ) ہمارا نعرہ" (پٹنہ) "امروز ہند" (پٹنہ) "مشعل" (پٹنہ) مورچہ (گیا) ہیں۔

بہار سے متعدد ماہانہ رسائل بھی شائع ہوتے ہیں۔ ان میں صبح نو" "سہیل" اور "آہنگ" قابل ذکر ہیں۔ "صبح نو" پٹنہ سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے مدیر و مالک و فاضل پوری ہیں۔ "سہیل" گیا سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر محمد ادریس صاحب ہیں۔ "آہنگ" بھی گیا سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر کلام حیدری ہیں۔ پٹنہ سے شائع ہونے والا رسالہ "مسرت" پوری ریاست میں بچوں کا واحد رسالہ ہے۔ ریاست میں عورتوں کا واحد ماہنامہ زیور ہے یہ پٹنہ سے نکلتا ہے۔ اس کے مدیر رضوان احمد بارہ بنکوی ہیں۔ مذکورہ نیز دیگر بھی ماہانہ رسالے ۱۹۶۰ء کے بعد سے شائع ہونا شروع ہوئے ہیں۔

علمی ادبی سرگرمیاں

قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد، اختر اورینوی جیسے برگزیدہ ادیبوں کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اِدھر نئے لکھنے والوں میں ڈاکٹر وہاب اشرفی، ڈاکٹر لطف الرحمٰن، ڈاکٹر شمیم احمد، ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی، انور عظیم، غیاث احمد گدی، کلام حیدری، یوسف اختر، سلطان اختر، مظہر امام، ظہیر صدیقی، حسن نعیم، پرکاش فکری، وہاب دانش، شکیب ایاز، سید شمیم احمد، ایاس احمد گدی، شمس فریدی، احمد یوسف، شاہدہ یوسف، سید ادیب مختار احمد، ناوک حمزہ پوری، ظہیر تیازی، اسلم آزاد، رضوان احمد، شمیم چوراوی، علیم اللہ حالی، شوکت حیات، سن مظفرپوری، شفیع مشہدی، تاج انور، شمول احمد سلمی، جاوید نرگس کی تخلیقات ملک کے ممتاز رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

قاضی عبدالودود صاحب کی نگرانی میں ادارۂ تحقیقات اردو نے قابل قدر کتابیں شائع کی ہیں۔ کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں کلچرل اکادمی (گیا) بھی قابل ذکر ہے۔ مذکورہ اکادمی نے متعدد کتابیں شائع کی ہیں۔

سید احمد شمیم اور شمس فریدی نے نئی نظموں کا ایک اچھا انتخاب "گلوب" بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ بیش شعرا اور ادیبوں نے اپنی کتابیں

بہار میں اُردو زبان و ادب کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کسی دوسری جگہ میں۔ ہر چند کہ اس کی کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی لیکن حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد یحییٰ منیری سے ایک نسخہ منسوب ہے جو انھوں نے کسی کو دانتوں کی تکلیف کے لئے بتایا تھا۔ اسے ہم بہار میں اُردو کی ابتدائی شکل کہہ سکتے ہیں۔ حضرت مخدوم الملک حضرت امیر خسرو کے ہم عصر بڑے عالم دین تھے۔ فردوسی سلسلہ کو انھوں نے بہت وسعت دی۔ منجن کا وہ نسخہ یہ ہے۔

نون مرچ مجیٹھ بے آوے — نیلا تھوتھا آگ جلاوے
لودھ پٹھانی کتھ پیا پریا — پیس پاس کے منجن کریا
منجن کر کے پان چبیا — دانت کے پیڑا کبھی نہ آیا

مرزا عبدالقادر بیدل سے بھی اُردو کا ایک شعر منسوب ہے جس کا ایک مصرع ہے ع

پٹنہ نگری چھوڑ کر بیدل چلے بدیس

بیدل فارسی کے شاعر تھے اور ان کا زمانہ بہت پہلے کا ہے۔ اسے بھی چھوڑیئے۔ میر کے عہد میں شیخ غلام علی راسخ جیسا قادر الکلام شاعر عظیم آباد میں موجود تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ بہار میں اُردو کا پہلا شاعر کون تھا۔ لیکن شیخ غلام علی راسخ صاحب دیوان اور قادر الکلام شاعر تھے۔ انہیں میر سے عقیدت تھی۔ ایک روایت ہے کہ وہ جوش عقیدت میں میر سے ملنے کے لئے گئے لیکن میر صاحب نے اپنی روایتی نازک مزاجی کے مطابق ملنے سے انکار کر دیا۔ راسخ نے پرچے پر ایک شعر لکھا اور ملازمہ کے حوالے کر دیا۔ شعر پڑھتے ہی میر اُن سے ملنے کے لئے باہر آگئے۔ وہ شعر یہ ہے۔

خاک ہوں پر تو تیا ہوں چشم مہر و ماہ کا
آنکھ والے رتبہ جانیں مجھ غبار راہ کا

راسخ نے اپنے اشعار میں میر کی ذات سے اپنی عقیدت کا اظہار بھی کیا ہے لیکن یہ شعر بھی انہیں کا ہے۔

نظیری اور شفائی کا ہے بدل راسخ
یہ اس کا فخر نہیں کہ نظیر میر ہوا

پٹنہ سے چار میل پچھم قصبہ پھلواری شریف صوفیوں کا مسکن اور شعر و ادب کا مرکز رہا ہے۔ وہاں بہت سے شعرا پیدا ہوئے۔ سجاد اور فرد کا نام بھلایا نہیں جا سکتا۔ شہر عظیم آباد میں فدوی اور جوش، منیر شریف میں غالب کے شاگرد صوفی منیری سے لے کر شاد عظیم آبادی تک شاعروں کا ایک کارواں نظر آتا ہے۔ ایسا کارواں جو بڑھتا ہی گیا۔ مرزا یاس چنگیزی جو لکھنؤ میں یگانہ بنکر رہے اور علامہ جمیل مظہری دونوں بہاری ہیں۔

جہاں تک اُردو نثر کا تعلق ہے بہار میں صوفیائے کرام نے اپنے معتقدین کو پند و نصیحت کے لئے اسے استعمال کیا۔ صوفی منیری کی "راحت روح" اس کی بڑی مثال ہے۔ شاد عظیم آبادی نے اپنا ناول "صورت الخیال" لکھا اور "نوائے وطن" کے نام سے بہار کی تاریخ۔ نواب امداد امام اثر نے اپنے دیوان کے علاوہ نثر میں کئی اور کتابیں لکھیں جن میں کاشف الحقائق کو بڑی شہرت ملی۔ علی سجاد عظیم آبادی نے "محل خانہ" جیسا اور سیدۃ النسا صاحبہ نے "اصلاح النسا" جیسا ناول لکھا۔ ان کے بعد مولانا سلیمان ندوی، نواب نصیر حسین خیال اور آج قاضی عبدالودود جیسے محقق، کلیم الدین احمد جیسے نقاد، اختر اورینوی جیسے افسانہ نگار[1] موجود

اُردو بولنے والوں کی تعداد

یہ تعداد ۱۹۵۱ء میں ۶۴۳۷ ۔ ۲۶۴ ۔ ۱۹۶۱ء میں ۱۴۱۴۹۲۴۵ ۔ ۱۹۷۱ء میں ۴۹۹۳۲۸۴ تھی۔ ایک بات خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ۱۹۵۱ء میں زبان کے خانے میں اُردو کا نام موجود ہے لیکن ۱۹۶۱ء اور ۱۹۷۱ء میں اُردو کا لفظ ہٹا کر ہندوستانی کا لفظ رکھا گیا ہے۔ ایسے لوگ جن کی مادری زبان اُردو تو نہیں لیکن جو اپنے گھر سے باہر اُردو بولتے اور اپنا سارا حساب کھاتے میں لکھتے ہیں، کم و بیش پندرہ لاکھ ہیں۔ یہ بیشتر پنجابی ہیں جو ملک کی تقسیم سے پہلے اپنے کاروبار کے سلسلے میں یہاں رہتے تھے اور تقسیم کے بعد بے ہو کر یہاں آباد ہو گئے ہیں۔

اُردو شہروں اور قصبوں کے علاوہ دیہاتوں میں بھی لاکھوں گھروں بولی جاتی ہے۔ بھوجپوری، مگہی، میتھلی اور دوسری بولیوں کے علاقوں میں ایسے گھرانے موجود ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ غرض یہ زبان سارے بہار میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس طرح اُردو بولنے اور سمجھنے والوں کی کروڑ تک پہنچ جاتی ہے۔

تعلیمی سہولتیں

بہار میں اُردو پڑھنے والے طلبا کے لئے ہر سطح پر تعلیمی سہولتیں ہیں۔ مثلاً میونسپل بورڈوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے تحت اُردو کے پرائمری اور مڈل اسکول قائم ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد اتنی نہیں کہ ہونی چاہیئے۔ ثانوی اسکولوں میں لڑکوں کو ہر مضمون اُردو میں پڑھنے کی اجازت ہے۔ یہی حال کالجوں کا ہے۔ طالب علموں کو ہر مضمون پڑھنے اور بی۔ اے تک اُردو میں سوالوں کے جواب دینے کا حق ہے۔ البتہ چند مشکلیں بھی ہیں۔ مثلاً ہائی اسکولوں تک تو ٹکسٹ بک

---

[1] مصنف نے ازرہ انکسار اپنا نام نہیں گنوایا۔ لیکن بحیثیت افسانہ نگار اُردو ادب میں ان کا مقام محفوظ ہے۔

اُردو کے سلسلے میں اس اختلاف کا اب بھی تصفیہ نہیں ہو پایا کہ اُردو کا جنم کس سرزمین پر ہوا۔ لیکن مہاراشٹر کا یہ دعویٰ غلط نہ ہوگا کہ اُردو کا دوسرا وطن مہاراشٹر ہے۔ ولی اور سراج دکنی، میاں دادا خاں سیاح اور لچھمی نرائن شفیق، حضرت شاہ شریف اور شاہ تراب چشتی نے اس سرزمین پر اُردو کو ایک نقشِ جاوداں بنا دیا۔

اگر دلی لکھنؤ یا پنجاب کو اُردو کی سرپرستی پر ناز ہے تو مہاراشٹر کو بھی یہ فخر حاصل ہے۔ مہاراشٹر میں اُردو کی صحیح معنوں میں ترقی، اس کی اشاعت اور مقبولِ عام بنانے کا سہرا خصوصاً دکن کوکن اور مہاراشٹر کے دیگر اضلاع میں بسنے والے مقامی باشندوں کے سر ہے۔ خوجہ، میمن، بوہرہ اور کوکنی قوم کے بزرگوں نے اس ضمن میں ہمیشہ دلچسپی لی اور انہیں کی کوششوں سے اُردو کے کاز کو تقویت پہنچی۔ دکن اور کوکن کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے۔

ان بزرگوں میں صحافی، شعراء و ادباء بھی ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ یہ تاجر طبقے سے تعلق رکھتے تھے اس لئے بیشتر اصحاب رئیس شہر تھے۔ انہوں نے اُردو مدرسوں، اُردو اسکولوں، کالجوں اور دیگر اُردو اداروں کی امداد میں دلچسپی لی۔

کوکنی[1] قوم کے ایک بزرگ علامہ شیخ احمد جیتیکر اُردو اور عربی میں کلام کہتے تھے۔ ان کے مضامین اور کلام مصر کے عربی اخبارات میں شائع ہوتے تھے۔ منشی محمد ابراہیم مقبہ کوکنی قوم کے ایک معزز رکن تھے۔ حکومت نے انہیں میر منشی مقرر کیا تھا۔ آپ کے "تعلیم نامے" کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے جسے یوپی اور پنجاب کے تعلیمی نصاب میں شامل کیا گیا تھا۔ ان کے صاحبزادے محمد احسن مقبہ اُردو، فارسی، اور عربی زبان میں فاضل اور شاعر بھی تھے۔ احسن تخلص تھا۔ دیوان احسن اور غزلیات احسن کے نام سے ان کے دو دیوان شائع ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے بزرگ قاضی غلام قاسم مہری تھے۔ قاسم تخلص تھا۔ اردو اور فارسی میں کلام کہتے تھے۔ عروس المجالس کے نام سے رسول اللہ کی سیرت پر ایک مثنوی لکھی ہے۔ اسی خاندان کے ایک اور شاعر اور مصنف قاضی غلام علی مہری بھی تھے۔ کوکنی قوم کی ایک مخیر ہستی ناخدا محمد علی روگھے[2] نے جامع مسجد بمبئی میں ایک مدرسہ، مدرسۂ محمدیہ کے نام سے جاری کیا۔ موصوف متعدد جہازوں کے مالک تھے۔ اس لئے لقب ناوخدا پڑ گیا۔ مدرسۂ محمدیہ آج محمدیہ ہائی اسکول کے نام سے جاری ہے۔ ۱۸۴۷ء میں "محمدی" کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کیا تھا۔[3] مولوی محمد یونس ہیندادے صاحب دیوان تھے۔ جلیل تخلص تھا۔ خمخانۂ ازل کے نام سے ان کا دیوان مشہور ہے۔ مولوی محمد یوسف کھٹکھٹے اُردو کے علاوہ عربی و فارسی زبانوں کے ماہر تھے۔ یوسف تخلص تھا۔ مولوی صاحب کا نادر مخطوطات و مطبوعات پر مشتمل ایک کتب خانہ تھا جو آج کھٹکھٹے کلیکشن (KHA COLLECTIO KHATAY) کے نام سے بمبئی یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ تنگیکر، قور، جیتیکر، مہایمکر (خطیب) خاندانوں نے قابلِ قدر ورثہ قومی ملی و مذہبی صورت میں اُردو زبان میں یادگار کے طور پر چھوڑا ہے۔ اس قوم میں دیگر شعراء ادباء میں فاروق، شوق، معنی، سیفی، ناظر، محمود، یوسف، سالک، بدر، فرحت، اور احمد قابلِ ذکر ہیں۔

اُردو کا ایک اور سرپرست خاندان جو سلیمانی بوہیر سے تعلق رکھتا ہے، طیب جی خاندان ہے۔ بمبئی میں تعلیمی سرگرمیوں میں اس خاندان نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ طیب جی بھائی میاں نے اپنی سوانح اُردو زبان میں لکھی ہے، جسے ان کے نواسے آصف فیضی نے ترتیب و تدوین کے بعد شائع کیا ہے۔ اس خاندان کے ایک اور چشم و چراغ بدرالدین طیب جی تھے۔ علی گڑھ کالج کے امدادی کاموں میں پیش پیش رہے۔ بمبئی میں انجمن اسلام کے قیام میں دلچسپی لیتے تھے اور انڈین نیشنل کانگریس کے صدر ہوئے۔ اسی خاندان میں امیر النساء بیگم، ہرہائی نیس نازلی بیگم، زہرہ بیگم فیضی، عطیہ بیگم فیضی جیسی روشن خیال خواتین نے اُردو کی سرپرستی کی۔

اُردو کے خدمت گذاروں میں وہ بھی ہیں جو نہ عالم تھے، نہ شاعر نہ ادیب، لیکن جنہوں نے زبان و تہذیب کی روایات کو برقرار رکھنے کے لئے اُردو کے اداروں کو ایک نئی زندگی دی۔

سیٹھ جان محمد قاسم خوجہ قوم کے ایک مخیر بزرگ تھے۔ بیشتر اُردو کے اداروں کی امداد کیا کرتے۔ جان محمد قاسم کمرشل ہائی اسکول انہیں کے نام سے موسوم ہے جو انجمن اسلام کے تحت آج بھی جاری ہے۔ بیگ محمد اسمٰعیل میمن قوم کے ایک اور بزرگ تھے۔ بیشتر اداروں کو ان کی سرپرستی حاصل رہی۔ موصوف کے نام سے موسوم بیگ محمد اُردو ہائی اسکول آج بھی جاری ہے۔ حاجی محمد صابو صدیق میمن قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے نام سے کئی ٹرسٹ جاری ہیں۔ تعلیمی و سماجی میدان میں یہ ٹرسٹ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ صابو صدیق ہائی اسکول اور پالی ٹیکنک اُردو طلباء کے لئے اس بزرگ ہستی کا قابلِ قدر تحفہ ہے جو انجمن اسلام کے تحت جاری ہے۔

تاریخ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد ناانصافی ہوگی اگر ہم اپنے ساتھی

---

[1] خطبۂ صدارت و انتخاب شاعرہ عبدالحمید بوہیرے

[2] مختصر تذکرۂ قوم کوکنی۔ عبدالحمید بوہیرے [3] اختر شہنشاہی

قافلہ والوں کو بھول جائیں جنہوں نے اسی سرزمین پر اُردو کے لئے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ مولوی عبدالحق۔ پنڈت سدرشن، سرشار سیلانی، علامہ آرزو لکھنوی، پہزاد لکھنوی، رئیس احمد جعفری، حافظ علی بہادر خاں، قطب الدین صدیقی، بدر جلالی، نذیر احمد خجندی، مولانا شوکت علی، محمد علی جوہر، جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، شکیل بدایونی، علامہ احمد الشبلی، علامہ شرف زیدی، میرزا ادیب، سعادت حسن منٹو، ضیاء الدین احمد برنی، سید عبداللہ بریلوی، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پرنسپل بدل الرحمٰن، دیوان شرر، عبدالغنی چودھری، آغا حشر شیرازی، عبدالرحیم ڈمٹکر، قاضی کبیرالدین، عمر سدبانی، حاجی محمد چھوٹانی، سردار انور، ڈاکٹر شیخ عبدالحق، علامہ محوی صدیقی لکھنوی، آغا خلش کاشمیری، عبدالحمید انصاری، ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی، عبداللہ ناصر نکہت شاہجہاں پوری، مدن موہن کالیہ، قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے کچھ ساتھی راہی ملک عدم ہوئے۔ کچھ پاکستان چلے گئے، کچھ دوسری ریاستوں یا غیر ملک کو چلے گئے۔

بمبئی کے علاوہ اُردو کے دوسرے مرکز دھولیہ، اورنگ آباد، مالیگاؤں، جلگاؤں، ناندیڑ، بھیمڑی، پونہ اور جالنا ہیں۔ اُردو کے خدمت گزاروں میں یہاں کی ملی جلی آبادی میں کوئی حیدرآباد یا، رامپور کا ہے۔ یا مقامی باشندہ ہے یا لکھنؤ یا بھوپال سے آیا ہوا ہے یا اعظم گڑھ سے تعلق رکھتا ہے یا سری نگر، الہ آباد، لدھیانہ، امرتسر، جالندھر کا ہے، یہی وجہ ہے کہ مہاراشٹر اور خصوصاً بمبئی تمام صوبوں اور شہروں میں اس لحاظ سے بھی ایک امتیازی حیثیت کا مالک ہے۔

اُردو بولنے والوں کی تعداد

مردم شماری کی رپورٹ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مہاراشٹر میں اُردو بولنے والوں کی تعداد ہر بیس سال پر تقریباً دوگنی ہوجاتی ہے۔ جو اُردو کے حق میں فالِ نیک ہے۔ ذیل میں دیئے گئے اعداد و شمار چونکا دینے والے ہیں۔

سال	اُردو بحیثیت مادری زبان	وہ جن کی مادری زبان اُردو نہیں لیکن بولتے، لکھتے، پڑھتے ہیں۔
۱۹۵۱ء	۲۰،۸۰،۷۴۲	تعداد[1] حاصل نہ ہوسکی
۱۹۶۱ء	۲۷،۲۵،۶۸۹	۸۹،۷۶۳
۱۹۷۱ء	۳۶،۶۱،۸۹۸	تعداد[2] حاصل نہ ہوسکی

مہاراشٹر میں مراٹھی کے بعد ملک کی اس سب سے بڑی سیکولر زبان کے جاننے والے زیادہ تر مسلم پنجابی سکھ اور ہندو اور کایستھ حضرات ہیں۔ اس طرح مہاراشٹر میں اُردو بولنے، لکھنے پڑھنے اور سمجھنے والوں کی تعداد مذکورہ اعداد و شمار سے کہیں زیادہ بیٹھتی ہے۔

تعلیمی سہولتیں

ریاست میں محکمۂ تعلیم حکومت مہاراشٹر کی جانب سے اور بمبئی عظمیٰ کے لئے میونسپل کارپوریشن کے محکمۂ تعلیم کے تحت اُردو اسکولوں (پرائمری اور سیکنڈری) اور اُردو ٹیچرز ٹریننگ کالجوں کی ایک بڑی تعداد اس بات کا ثبوت ہے کہ اُردو ذریعۂ تعلیم کے لئے یہاں کافی سہولتیں حاصل ہیں۔

۱۹۴۷ء میں صرف ایک لاکھ بچے اُردو تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ۱۹۶۰ء میں یہ تعداد دو لاکھ ۳۰ ہزار ہوئی۔ ۱۹۷۰ء میں تین لاکھ ۲۱ ہزار طلباء پرائمری اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ اور امسال پرائمری اسکول کے ان طلباء کی تعداد تقریباً چار لاکھ ہوجائے گی۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہاں ابتدائی اور ثانوی مدارس کے طلباء کے لئے معقول سہولتیں فراہم ہیں یہاں کے تعلیمی خاکے میں ابتدائی (پرائمری) اور ثانوی (سیکنڈری) اسکول شامل ہیں۔ مڈل اسکول اب نہیں رہے۔ جماعت اوّل تا ہفتم کا درجہ ابتدائی ہے اور جماعت ہشتم تا یازدہم ثانوی درجات ہیں۔ حال ہی میں حکومت مہاراشٹر نے S.S.C. (میٹرک) دسویں جماعت کو قرار دیا ہے۔ اس طرح ایک تعلیمی سال (ACADEMIC YEAR) کم ہوگیا

ریاستی سرکار کا محکمۂ تعلیم

ریاستی حکومت کے محکمۂ تعلیم کے تحت اُردو ذریعۂ تعلیم کے کئی ثانوی و ابتدائی مدارس جاری ہیں تفصیل حسب ذیل ہے۔

سال	تعداد اُردو اسکول (ابتدائی)	تعداد طلباء (ثانوی)	تعداد اساتذہ (ابتدائی)	(ثانوی)	(ابتدائی)	(ثانوی)
۱۹۶۱ء	۱۴۳۰	۱۰۷	۲،۲۱،۰۰۷	۲۳،۹۲۶	(تعداد دستیاب نہ ہوئی)	
۱۹۷۱ء	۱۸۲۰	۲۵۰	۳،۱۷،۷۰۶	۶۱،۹۰۰	۸۹۰۱	۲۲۶۷

---

[1] ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ میں اس کالم کے تحت چونکہ کوئی انتظام نہ تھا۔ اس لئے تعداد حاصل نہ ہوسکی۔

[2] حالیہ مردم شماری کی چونکہ تفصیلی رپورٹ ابھی تیار نہیں ہوئی، اس لئے یہ بھی تعداد نہ مل سکی۔

کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اُردو

مہاراشٹر کی چھ یونیورسٹیوں میں سے پانچ یونیورسٹیوں کے تحت کئی کالجوں میں اُردو پڑھائی جاتی ہے۔ اکثر کالجوں میں اُردو بحیثیت ایک مضمون پڑھائی جاتی ہے۔ بہت کم کالجوں میں اُردو اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ طلبا اور اساتذہ کی مکمل تعداد نہ مل سکی۔

بمبئی یونیورسٹی کے دس کالجوں، ناگپور یونیورسٹی کے آٹھ کالجوں، شیواجی یونیورسٹی کے چار کالجوں، مراٹھواڑا یونیورسٹی کے آٹھ کالجوں اور پونہ یونیورسٹی سے ملحق گیارہ کالجوں میں اُردو پڑھائی جاتی ہے۔ ان کالجوں کی مجموعی تعداد ۴۱ ہے۔

اُردو اخبارات و رسائل

بمبئی شروع سے صحافت و ادب کا ایک خاص مرکز رہا ہے مختلف کتابوں میں رسالہ "بامداد" (۱۸۵۹ء) ہفتہ وار "لطیف الاخبار" (۱۸۶۴ء) "کشف الاخبار" (۱۸۷۲ء) "اخبار جام جہاں نما" (۱۸۸۱ء) "اخبار خادم ہند" (۱۸۸۳ء) اور ان کے علاوہ بمبئی سے نکلنے والے دوسرے متعدد اخبار و رسائل کا ذکر ملتا ہے۔ گویا اس خطے میں صحافت کی تاریخ ایک صدی سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ اس روایت نے گزشتہ پچیس برسوں میں خوب فروغ پایا ہے۔

(رجسٹرار آف نیوز پیپرس)

اُردو اخبارات و رسائل

رجسٹرار آف نیوز پیپرس کے جائزہ کے مطابق اُردو اخبارات و رسائل کے ۴ سب سے بڑے مراکز اتر پردیش (۱۹۸)، دہلی (۱۶۷)، پنجاب (۱۳۷)، اور آندھرا پردیش (۱۲۹) ہیں جموں و کشمیر اور مہاراشٹر میں یہ تعداد (۹۱) مساوی ہے۔ لیکن اس جائزے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مہاراشٹر میں اُردو صحافت میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔

سال	روزنامے	ہفت روزہ	پندرہ روزہ	ماہنامے	سہ ماہی	ششماہی	سالنامے	مجموعی تعداد	کل تعداد اشاعت
۱۹۵۶ء	۱۰	۱۵		۱۳	—	۵	—	۴۳	—
۱۹۶۱ء	۹	۲۱	۳	۱۸	۲	—	—	۵۳	—
۱۹۷۱ء	۱۰	۴۷	۱۰	۱۶	۳	۲	۳	۹۱	ایک لاکھ چھ ہزار

۱۹۷۱ء کے بعد اُردو پریس میں ایک حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ تقریباً ۴۷ نئے پرچوں کی اجرائی نے اُردو پریس کی طاقت کو اور مضبوط کیا ہے۔ اس طرح اب مہاراشٹر ۱۹۷۱ء کی رپورٹ کے بعد پنجاب اور آندھرا پردیش کے اُردو پریس کے برابر ہو جائے گا۔

مہاراشٹر کا سب سے کثیر الاشاعت روزنامہ "انقلاب" (بمبئی) ہے۔ یہ ۱۹۳۸ء میں جاری ہوا تھا۔ آفسیٹ پر شائع ہونے والے اس اخبار کی تعداد اشاعت ۱۷۴۹۱ ہے۔ اس کے ایڈیٹر جناب خلش جعفری ہیں۔ دوسرا اہم روزنامہ اُردو ٹائمز (بمبئی) ہے۔ یہ ۱۹۶۱ء میں جاری ہوا تھا۔ جناب شہریار عابدی کی ادارت میں نکلنے والے اس اخبار کی اشاعت ۶۶۹۰ ہے۔ دوسرے روزنامے "جمہوریت" "آج" "ہندوستان" اور "زبان خلق" ہیں۔ ہفتہ وار اخبارات میں بلٹز (اُردو) سرفہرست آتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر جناب حسن کمال ہیں۔ اس کی اشاعت ۱۸۸۰۴ ہے۔ فلمی رسالوں میں "کہکشاں" قابل ذکر ہے۔ یہ ہفتہ وار رسالہ شمیم زبیری صاحب کی ادارت میں نکلتا اور ۵۵۴۹ اشاعت ہے

ادبی رسائل میں ماہنامہ "شاعر" سب سے پرانا ہے۔ یہ ابتداً ۱۹۳۰ء میں آگرے سے شائع ہوا تھا۔ اس کے مدیر جناب اعجاز صدیقی ہیں۔ دوسرا ادبی رسالہ "صبح امید" ہے۔ اسکی اشاعت لگ بھگ ۵ ہزار ہے اس کے ایڈیٹر عبدالحمید لوبیرے ہیں۔ ملک کے ادبی علمی تحقیقی رسائل میں سہ ماہی نوائے ادب (بمبئی) بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے مدیر جناب عبدالرزاق قریشی ہیں۔

علمی، ادبی سرگرمیاں

سائنس کے اس دور میں اختر شماری آسان ہے لیکن اُردو کے قلم کاروں کی صحیح تعداد معلوم کرنا کارے دارد۔ دہلی، لکھنؤ اور پنجاب کی طرح ہمارے یہاں بھی ایک اچھی خاصی فوج ان قلم کاروں کی ہے۔ ان میں شاعر بھی ہیں، ادیب بھی، نقاد بھی، مصنف بھی، صحافی، مترجمین، دانشور غرض اُردو کی ہر جہت سے خدمت کرنے والے شامل ہیں۔ اُردو کے ان سالاروں اور علمبرداروں میں خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، سردار جعفری، ڈاکٹر صفدر آہ، پرتو لکھنوی، کالی داس گپتا رضا، دیوی سنگھ چوہان، میتو مادھو راؤ پگڑی، سکندر علی

وجد، اعجاز صدیقی، اختر الایمان، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، علی رضا، آغا جانی کشمیری، کیفی اعظمی، حامد الانصاری غازی، ادیب مالی گانوی، شہاب مالیر کوٹلوی، ڈاکٹر نامی، ڈاکٹر ظ انصاری، معین الدین حارث، خواجہ عبدالغفور، جوگندر پال، مہندر ناتھ، ڈاکٹر نظام الدین گوریکر، شبیر احمد راہی، ڈاکٹر عالی جعفری، سی ایل کاوش، خلش جعفری، شہریار عابدی، ابراہیم فطرت، غلام احمد خاں آرزو، راجندر سنگھ بیدی، خشونت سنگھ، ملک راج آنند، پرنسپل اے اے منشی، شہاب الدین دسنوی، قاضی سلیم آصف فیضی، سلطانہ آصف فیضی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، سلمیٰ صدیقی، واجدہ تبسم، ڈاکٹر میمونہ دلوی، ڈاکٹر عبدالستار دلوی، شمس کنول، ندا فاضلی، قیصر عثمانی، عزیز قیسی، یوسف ناظم، ممتاز راشد، عتیق اللہ، بشر نواز، باقر مہدی، سریندر پرکاش، احمد نسیم مینانگری، جمیل مرصع پوری، عبداللہ پرکاباعی، بدیع الزماں خاور، یونس اگاسکر، رضا الجبار، رائے ہریش چندر دکھی جالنوی، اثر فاروقی، قمر کوکنی، شرف کمالی، قیصر رتناگیروی، لطفی رضوانی، اسمٰعیل پرکار، عارف سیمابی، معین ادیبی، سرشار منیری، شباب مینائی، مہر، اور ضیاء ہانی شامل ہیں۔

ادبی سرگرمیوں کے ضمن میں یہاں صحیح معنوں میں مشاعروں اور شب غزل جیسے پروگراموں کے لئے فضا سازگار رہتی ہے۔ شاذ ہی سمپوزیم کانفرنس یا سنجیدہ علمی ادبی نشستوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ کبھی کبھار انجمن ترقی اردو کی ریاست میں شاخیں جلسے، مشاعرے یا ادبی نشستیں منعقد کرتی رہتی ہیں۔ چند تعلیمی ادارے بھی یہ کام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ افراد بھی ہیں جو نجی طور پر اردو کی ترقی و اشاعت کے لئے مساعی کر رہے ہیں۔

تاہم مہاراشٹر اردو کتابوں کی نشر و اشاعت میں دیگر صوبوں کے مقابلے میں بہت پیچھے رہا ہے۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۱ء تک کے دوران صرف ۳۳۲ کتابیں چھپی تھیں۔ ان کتابوں میں زیادہ تر نصابی، مذہبی یا غیر معیاری ہوتی ہیں۔ علمی، ادبی، تنقیدی یا اعلیٰ تخلیقات اچھے پبلشر نہ ہونے کے سبب نہیں چھپتیں۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں لیتھو، آفسیٹ یا اردو ٹائپ پریسوں اور اچھے خوشنویسوں کی تعداد دہلی و لکھنؤ کی طرح نہیں ہے۔ اردو کے بڑے پبلشنگ ادارے زیادہ تر دہلی و لکھنؤ میں ہیں۔

ادبی انجمنیں

ادبی انجمنوں کا مہاراشٹر میں ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ بیشتر انجمنیں یا ادارے زیادہ تر مذہبی یا تعلیمی خدمات ہی انجام دیتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ماہانہ ادبی نشستوں کا انعقاد کرتے ہیں۔ اردو کے سلسلے میں اعلیٰ پیمانے پر بہت ہی کام ہوا ہے۔ انجمن ترقی اردو، اردو ادب عالیہ، بزم خیال، بزم شعراء، بزم نسواں، اردو سرکل سرسنگار سمسد، ادبی سنگم، یوپیا اسٹوڈنٹ سرکل، اپٹا جیسے ادارے اردو کی خدمت مختلف نظریہ کے تحت کر رہے ہیں۔ قصر الادب، بزم عزیزی، بزم ناسخ، آئینۂ ادب، بزم آرزو، انجمن ترقی پسند۔ مصنفین بھی علمی ادبی خدمات میں مصروف ہیں۔ ان اداروں کی اپنی کوئی مطبوعات نہیں۔ وقتاً فوقتاً جشن کے موقعوں پر شائع کئے جانے والے سووینیروں کی ادبی حیثیت نہیں ہو سکتی۔

ریاست کی جانب سے بھی اشاعت و ترقی کے لئے کوئی امداد نہیں کی جاتی۔ اسی طرح غیر سرکاری اداروں کا بھی یہی حال ہے۔ حال ہی میں بمبئی کے ایک دو شعراء کے مجموعۂ کلام بینکوں کے دیئے گئے قرض پر شائع ہوئے ہیں۔ اس طریقۂ کار کو مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔

اہم کتب خانے

مہاراشٹر میں اردو لائبریریوں کی بڑی تعداد ہے۔ جن میں نادر و نایاب مخطوطات و مطبوعات کا ذخیرہ ہے۔ اسی طرح ذاتی تصرف میں بھی بیشتر نایاب کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ تشنگان علم و ادب ان کتب خانوں سے مستفیض ہوتے رہتے ہیں۔

ڈائرکٹر آف لائبریریز کے تحت اُن لائبریریوں کو گرانٹ ملتی ہے جو حکومت کی منظور شدہ ہوتی ہیں۔ اہم کتب خانے حسب ذیل ہیں۔

مسلم لائبریری ناگپور، مسلم لائبریری، مومن پورہ، ناگپور، انجمن ظل اسلام لائبریری کامٹی، مسلم لائبریری بھنڈارہ، مولانا آزاد لائبریری، ملکاپور ضلع بلڈانہ، مسلم لائبریری سماڑ، اردو لائبریری ایولہ، اردو لائبریری مالیگاؤں، احرار لائبریری مالیگاؤں، انصار لائبریری مالیگاؤں، قومی لائبریری۔ مالیگاؤں، کریمی لائبریری بمبئی، کتب خانۂ نقشبندیہ بالاپور برار وغیرہ۔

اس کے علاوہ جامع مسجد لائبریری میں تقریباً دو ہزار کتابیں ہیں۔ انجمن اسلام بمبئی کے ریسرچ سینٹر میں اردو کتب اور رسائل تقریباً ۱۵ ہزار ہیں۔ مہاتما گاندھی لائبریری بمبئی میں اردو کی تقریباً ۲۰ ہزار کتابیں ہیں۔ سوبانی ریڈنگ روم اور متعلقہ گشتی کتب خانہ

مدھیہ پردیش اپنے رقبہ کے لحاظ سے ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ہے۔ اس ریاست کی تشکیل ۱۹۵۶ء میں عمل میں آئی۔ اس میں وسط ہند کا قریباً سارا علاقہ جس میں مدھیہ بھارت اور بھوپال شامل تھے اور ان کے علاوہ وندھیہ کے علاقوں کو چھوڑ کر پورے مہاکوشل اور وندھیہ پردیش کو آپس میں ملا کر اس وسیع و عریض صوبہ کی تشکیل کی گئی۔ مدھیہ بھارت کی مختلف ریاستوں میں آزادی سے قبل اُردو کا چلن عام تھا۔ ان میں گوالیار، جاورہ، وغیرہ اہم ہیں۔ ان کے علاوہ بھوپال کی مسلم ریاست تھی جس کی گزشتہ ایک صدی سے اُردو سرکاری زبان تھی۔ دلّی اور لکھنؤ کے اُردو مراکز کی طرح بھوپال کا اپنا ایک اسکول تھا۔ دوسرے اُردو ادب کی تخلیق و تشکیل کے لحاظ سے اسے ایک قسم کی قدامت بھی حاصل تھی۔ بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی مرحوم یہاں شعر و سخن کے نمونے اٹھارویں صدی کے ابتدائی حصہ ہی میں مل جاتے ہیں۔" اس سلسلے میں قاضی محمد صالح کی مثنوی "اخلاق حسنہ" کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا جو ۱۷۰۷ء کی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ قاضی محمد معظم نے "تفسیرِ ہندی" تحریر فرمائی جس کا زمانہ تحریر ۱۷۲۰ء ہے۔

بھوپال کے حکمراں ہمیشہ اُردو کی ترویج و ترقی کیلئے کوشاں رہے۔ نواب سکندر جہاں بیگم نے ۱۸۵۹ء میں فارسی کی جگہ اُردو کو سرکاری زبان قرار دیا۔ ان حکمرانوں میں سے کچھ صاحبِ دیوان شاعر بھی تھے۔ یہی حال یہاں کی بیگمات کا بھی تھا۔ نواب شاہ جہاں بیگم کے دور (۱۸۶۸ء تا ۱۹۰۱ء) میں علماء و فضلاء کے اجتماع اور علمی و ادبی سرگرمیوں کو دیکھ کر مولانا اسلم جے پوری "بے اختیار یہ لکھنے پر مجبور ہوگئے کہ "یہ (بھوپال) اس دور کا بغداد الہند ہے۔"

علم و ادب کی سرپرستی کا یہ سلسلہ نوابی دور ختم ہونے کے بعد بھی جاری رہا۔ سلیم حامد رضوی مرحوم اور ایم عرفان مرحوم کی تحقیقی کتب کی اشاعت نواب بیگم مہرتاج ساجدہ سلطان صاحبہ کے عطیہ کی رہینِ منت تھی۔ شملہ دیوتی بھی اپنی معارف نوازی کیلئے ممتاز رہی ہے۔ کرنل یمین الملک نواب زادہ رشید الظفر خاں مرحوم ہمیشہ شعراء و ادباء کی سرپرستی فرماتے رہے۔ جگر مرحوم کو ۱۰۰ روپیہ ماہانہ کا منصب عطا کرنے کے علاوہ "شعلۂ طور" کی پہلی اشاعت آپ ہی کی توجہ و مالی معاونت کا نتیجہ تھی۔

غالب کے متعدد شاگرد بھوپال آکر بسے اور خوب نام کمایا۔ ان میں مولانا عباس رفعت کا نام بے حد اہم ہے۔ بعد میں بھی یہ سرزمین ممتاز اہلِ قلم حضرات کے قدم لیتی رہی یہاں میں علامہ اقبال، نیاز فتحپوری، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، قطر خیر آبادی، سر راس مسعود، علامہ سلیمان ندوی وغیرہ اہم ہیں۔ نیز یہاں کے ممتاز شاعروں اور ادیبوں میں مولانا برکت اللہ، عبدالرزاق الہ ابادی، ملا رموزی، مہر گوالیاری، سراج میر خاں سحر، معشوق علی خاں جوہر، بخشی کنج بہاری لال، محمد میاں شہید، سہا مجددی، ذکی وارثی، علامہ یوسف تپھری کی ادبی فتوحات کا ذکر ناگزیر ہے۔

اُردو کی ترقی کا یہ سلسلہ ۱۹۵۰ء تک جاری رہا۔ لیکن چیف کمشنری راج شروع ہوتے ہی اُردو کی سرکاری حیثیت ختم کر دی گئی۔

بھوپال کے علاوہ مدھیہ پردیش کے دوسرے علاقے جن میں اُردو کا سکہ چل رہا تھا گوالیار، برہان پور جبلپور، کھنڈوہ، اجین، جاورہ، اندور، دھار، سیونی سرونج، ساگر وغیرہ تھے۔ برہان پور اُردو کے ایک مرکز کی حیثیت سے مہاکوشل میں ممتاز رہا۔ شیخ شاہ محمد بن فضل اللہ خانوادے نے وہاں اُردو کی شمع روشن کی اور اس سرزمین نے مفتی خیر اللہ صدیقی جیسے شخص کو پیدا کیا جس کے بارے میں رستم علی سرہندی نے "جامع الفضل والکمال، شاعر جادو بیاں" تحریر کیا ہے۔ آپ بعد میں برہان پور سے مندسور (مدھیہ بھارت) چلے گئے۔ وہاں سے اجین تشریف لائے اور مفتی کے عہدے پر سرفراز ہوئے۔ اور پھر بھوپال چلے آئے۔ آپ نے ایک مثنوی "فقہ ہندی" نظم کی جس کا سن تحریر ۱۷۳۸ء ہے۔

گوالیار میں شیخ محمد غوث گوالیاری کا خاندان علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھا۔ شاہ مبارک آبروؔ، خان آرزو اور اصغر علی اصغرؔ اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے ان تینوں نے ۱۷۶۹ء میں گوالیار سے ہجرت کی۔ آبروؔ اور آرزوؔ نے دلّی کو منتخب کیا۔ جب کہ اصغرؔ بھوپال چلے آئے۔ مولف "آثار الشعراء" نے اصغرؔ کو "اُردو ہندی فارسی کا نامی گرامی شاعر" تحریر کیا ہے۔ مگر ترکِ مکانی میں آپ کی اکثر تصانیف تلف ہوگئیں۔ اور آپ کو وہ مقام و شہرت نہ مل سکی جو آبروؔ اور آرزوؔ نے پائی۔

گوالیار کو امیر علی امیرؔ گوالیاری کا وطن ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔ آپ نے چالیس برس شعر و سخن کی وادی میں گزارے۔ آپ کی قلمی بیاض ۱۷۸۵ء سے ۱۸۲۵ء تک کے کلام پر مشتمل ہے۔ آپ ۱۷۹۵ء میں بھوپال تشریف لائے تھے۔

دوسروں کے برعکس شاہ غلیمن ۱۸۱۵ء میں دلّی سے گوالیار آئے۔ یہ وہی حضرت شاہ غلیمن ہیں جن کے بارے مرزا غالب نے ایک خط میں یہ لکھا تھا: "بخدا۔ ایمان سے کہتا ہوں کہ زبان سرسری یعنی اُردو حقائق الٰہی کے معارف کی اس سے زیادہ متحمل نہیں ہو سکتی جتنے حضور نے اس میں سموئے ہیں۔"

اسی طرح مدھیہ پردیش کے دوسرے شہروں میں بھی اُردو کے باکمال مصنفوں اور شاعروں نے اپنی اہمیت اور اپنی زبان کی ہمہ گیری کو ثابت کیا جیسے بلاسپور (مہاکوشل) میں بابو جگن ناتھ پرشاد فیض (گلزار فیض: ۱۹۱۲ء) کا مطبوعہ کلام ملا جانا یا سروج۔ پہلے یہ علاقہ ریاست ٹونک راجستھان کا حصہ تھا) میں احمد مرتضیٰ نظر (آثار مالوہ، کا تاریخی کتاب تحریر کرنا، ہمارے اس دعوے کی تصدیق کرتا ہے۔ کم و بیش یہی صورت حال دو سے مقامات پر بھی نظر آتی ہے۔

مادری زبان ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق مدھیہ پردیش میں نو لاکھ اٹھاسی ہزار دو سو پچھتر (۹،۸۸،۲۷۵) افراد کی مادری زبان اُردو تھی۔ ۱۹۶۱ء میں یہ تعداد سات لاکھ چالیس ہزار اٹھانوے (۷،۴۰،۰۹۸) تھی۔ ۱۹۵۱ء میں تین لاکھ اڑسٹھ ہزار دو سو تینتیس (۳،۶۸،۲۳۳) اور ۱۹۴۱ء میں سات لاکھ اکیاون

ہزار سات سو پچھتر (۵،۷۷۵) یعنی تقسیم ملک سے مدھیہ پردیش کی اُردو آبادی میں جو کمی واقع ہوگئی تھی اس کا ازالہ مع اضافہ ہو چکا ہے۔

تعلیمی سہولتیں

تعلیمی میدان میں مدھیہ پردیش میں اُردو کے چلن کا جائزہ بعض لحاظ سے حیرت ناک اور بعض لحاظ سے دلچسپ حقائق کا مظہر ہے۔ سرکاری پرائمری اور مڈل اسکولوں میں ایک سے زیادہ وجوہ سے اُردو تعلیم کی راہ میں رکاوٹیں حائل رہیں۔ جب کہ مدھیہ پردیش کے مختلف علاقوں میں بڑی تعداد میں اُردو میڈیم کے پرائیویٹ اسکول کھولے گئے۔ اس کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ گزشتہ سال سے قبل بھوپال، جسے مدھیہ پردیش میں اُردو کا دل کہا جائے تو غلط نہ ہوگا، میں اُردو میڈیم کا کوئی بھی پرائمری یا مڈل اسکول نہ تھا۔ حالاں اُردو کے مطالبہ کو کئی سال بعد کچھ برس درخور اعتنا سمجھا گیا اور ۸ اُردو مڈیم کے پرائمری اسکول کھولے گئے۔ اس کے برعکس ہائر سیکنڈری اسکولوں اور کالجوں میں اُردو پڑھنے والوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایک محتاط اندازہ کے مطابق ۹۰ ہائر سیکنڈری اسکولوں میں اُردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ حالانکہ اُردو میڈیم کا کوئی سرکاری ہائر سیکنڈری اسکول نہیں ہے، البتہ صوبہ کے متعدد بڑے شہروں میں اُردو میڈیم کے پرائیوٹ ہائر سیکنڈری اسکول ہیں۔ جن کو سرکار سے گرانٹ ملتی ہے۔

ایم پی بورڈ آف ہائر سیکنڈری ایجوکیشن نے گیارہویں درجہ تک اُردو میڈیم کے استعمال کی اجازت دی ہوئی ہے اور وہ ان امیدواروں کے لئے پرچے بھی اُردو رسم الخط میں شائع کرتا ہے۔ بورڈ کے انٹرمیڈیٹ مراسلاتی کورس میں اُردو بھی شامل ہے اور ایک جونیر ٹیوٹر اس شعبہ کا سربراہ ہے۔

اس وقت مدھیہ پردیش میں یونیورسٹیوں کی تعداد ۸ ہے۔ ان میں سے کسی میں اُردو میڈیم میں جوابات لکھنے کی سہولت نہیں ہے۔ ان کا میڈیم انگریزی اور ہندی ہے۔ لیکن تمام یونیورسٹیوں میں اُردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے اور ہر سال اُردو طلبا کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سن	تعداد کالج	تعداد یونیورسٹی	بی اے تک تعلیم	ایم اے تک تعلیم	تعداد طلبا بی اے	تعداد طلبا ایم اے
۱۹۶۱ء	۴	۲	۴	-	۱۰۰	اوسطاً —
۱۹۶۱ء	۹	۳	۹	۱	۴۰۰	۱۴ اوسطاً
۱۹۷۱ء	رکارڈ پر نہیں	۸	۲۴	۵	۹۰۰	۴۲

اُردو اخبارات و رسائل

مدھیہ پردیش میں اُردو اخبارات کی تاریخ پوری ایک صدی پر محیط ہے۔ پہلا ہفت روزہ "عمدۃ الاخبار" بھوپال سے ۲۴۔ مارچ ۱۸۷۱ء کو جاری ہوا اس کے مدیر حکیم اصغر حسین تھے۔ ہوشنگ آباد کو اس صوبہ کا دوسرا ہفت روزہ "موج نربدا" شائع کرنے کا فخر حاصل ہے اس کے مدیر منشی عبدالکریم اوج تھے۔ اور یہ ۱۸۸۴ء میں جاری ہوا۔ مدھیہ پردیش میں بھوپال کو اُردو رسائل و اخبارات کی جنم بھومی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں ماہ ناموں میں "مہر منیر" (مدیر عبدالعزیز اعجاز رقم: ۱۸۹۶ء) "ظل السلطان" (مدیران۔ امین زبیری و یوسف قیصر: ۱۹۱۵ء) "نگار" (نیاز فتح پوری: ۱۹۲۲ء) "ندیم" (مولانا سعید رزمی: ۱۹۲۳ء) "محسن الملک" (حامد سعید خاں حامد: ۱۹۲۴ء) "افکار" (صہبا لکھنوی۔ رشدی حکیم قمر الحسن۔ ۱۹۴۵ء) "جادہ" (کوثر چاندپوری۔ ۱۹۵۰ء) پندرہ روزہ جرائد میں "الحجاب" (یوسف قیصر ۱۹۱۱ء) "صبح وطن ثانی" (قدوس صہبائی شاکر علی خاں (۱۹۳۶ء) ہفت روزہ جرائد میں "بانو" (مدیرہ: خاتون ارشد ۱۹۳۳ء) "آواز" مولانا سعید رزمی: ۱۹۳۴ء) "صبح وطن" (شاکر علی خاں۔ ۱۹۳۴ء) "بھوپال پنچ" (بھگوان دیال نشاط و عمران انصاری: ۱۹۳۵ء) "شاہکار" (نشاط وجی۔ ایم نعمی ۱۹۴۵ء) "نیا بھوپال" (نعمی و پریم سرن ستو: ۱۹۴۶ء) "منزل" (ایم عرفان: ۱۹۴۷ء) "ترجمان" (جوہر قریشی و قمیر جمالی ۱۹۵۰ء) "نیا ساتھی" (کے این پردھان۔ یوسف قریشی ۱۹۴۹ء)

بھوپال کے علاوہ "اخلاق" کے نام سے عبدالغفار خاں نے گوالیار سے ایک پرچہ نکالا جو مختلف مقامات سے ۳۶ سال تک نکلتا رہا اور اپنے مدیر کے ترک مکانی کے ساتھ مقام اشاعت بدلتا رہا۔ آخر بھوپال میں جب خانصاحب کا انتقال ہوا تو پرچہ بھی بند ہوگیا۔

اجین میں ۱۹۴۲ء میں "آفتاب مالوہ" کے نام سے ایک ماہ نامہ شائع ہوا مگر زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔ یہی صورت حال دوسرے ماہ ناموں اور پرچوں کی بھی رہی کہ وہ شعلۂ مستعجل کی طرح چند ماہ یا ایک دو سال جاری رہے اور بند ہوگئے۔ مدھیہ پردیش کی سرزمین جرائد کے اجراء کے معاملہ میں جتنی زرخیز رہی انھیں مستقل جاری رکھنے کے معاملے میں اتنی ہی سنگلاخ ثابت ہوئی ہے۔ ۱۸۷۱ء سے لے کر ۱۹۵۱ء تک قریباً ۱۵۰ جرائد و اخبارات یہاں سے جاری ہوئے۔ ۱۹۵۱ء اور ۱۹۷۱ء کے درمیان جو اخبارات و رسائل شائع ہوئے ان کی مجموعی تعداد کافی حوصلہ افزا رہی صرف ندیم"، افکار" اب بھی جاری ہیں۔ "الحرار" (روزنامہ) بنیا اضافہ ہے۔ باقی سب نئے ہیں اور پرانے بند ہو چکے ہیں۔

مدھیہ پردیش کا پہلا روزنامہ "رہبر وطن" ۱۴۔ اگست ۱۹۳۸ء میں محمود الحسن صدیقی کی ادارت میں شائع ہوا۔ "ندیم" اپنی صافتی عمر کی ۳۵ بہاریں دیکھ چکا ہے۔ اس کے مدیر اعلیٰ حکیم سید قمر الحسن اور مدیر قمر اشفاق ہیں۔ یہ اپنا سلور جوبلی نمبر شائع کر چکا ہے۔ رشدی و عارف صاحبان نے ۱۹۵۰ء میں "افکار"

یونیورسٹی، کرناٹک یونیورسٹی اور بنگلور یونیورسٹی۔ ان تینوں یونیورسٹیوں میں اُردو کے شعبے ہیں۔ اُردو زبان و ادب بطور ایک مضمون کے پڑھا جاسکتا ہے۔ نیز سائنس اور آرٹس میں طلباء II ڈگری تک بحیثیت ثانوی زبان کے اُردو زبان و ادب پڑھتے ہیں۔

میسور یونیورسٹی اور کرناٹک یونیورسٹی میں اُردو کے شعبے ہیں۔ یہاں اُردو میں ایم۔اے کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ تعلیمی سال سے بنگلور یونیورسٹی میں بھی اُردو کی چیئر قائم ہوگئی ہے۔

جہاں تک پرائمری اسکولوں، معلموں اور مادری زبان یعنی اُردو میں تعلیم پانے والے طلباء کا تعلق ہے، ان کے اعداد و شمار حسب ذیل ہیں:[1]

سال	اسکول	طلباء	معلم
۱۹۶۷-۶۸	۲٬۵۴۱	۲٬۴۵۳۳	۷٬۰۲۸
۱۹۶۸-۶۹	۲٬۵۶۰	۲٬۸۴۷۰۳	۷٬۰۹۶
۱۹۶۹-۷۰	۲٬۵۸۶	۲٬۹۳۰۸۵	۷٬۳۱۸

مندرجہ بالا گوشوارے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف اُردو کے ذریعہ تعلیم دینے والے پرائمری اسکولوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ بلکہ ان میں استاد اور طلباء کی تعداد بھی بتدریج بڑھ رہی ہے۔

یہی صورتِ حال ثانوی درجات میں تعلیم کی ہے۔ اعداد و شمار حسب ذیل ہیں

سال	اسکول	طلباء
	جہاں اُردو ذریعہ تعلیم ہے۔	
۱۹۶۷-۶۸	۲۶	۹٬۳۶۶
۱۹۶۸-۶۹	۳۱	۱۰٬۵۸۲
۱۹۶۹-۷۰	۳۴	۱۲٬۴۷۲

تاہم مذکورہ عرصہ میں اُردو بحیثیت ایک زبان پڑھنے والے طلباء کی تعداد میں کمی واقع ہوئی ہے۔ ۱۹۶۷-۶۸ میں ان کی تعداد ۱۷٬۴۰۳ تھی، جبکہ اگلے برس یہ صرف ۱۰٬۵۷۴ رہ گئی۔ ۱۹۶۹-۷۰ء میں ایسے طلباء کی تعداد میں مزید کمی ہوئی اور یہ گھٹ کر صرف ۴۰٬۸۴ رہ گئی۔ اس کمی کے باوجود اُردو کے معلموں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ ان کی تعداد ۱۹۶۷-۶۸ میں ۶۴۹، ۱۹۶۸-۶۹ء میں ۶۵۶ اور ۱۹۶۹-۷۰ میں ۶۷۲ تھی۔

[1] لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی بارہویں رپورٹ۔

اخبار و رسائل

عہد رجاگاں میں کئی ایک اچھے اخبار اور رسائل شائع ہوئے۔ ان کی عمریں بھی نظر لگنے والی ہوتی تھیں۔ سلطان ٹیپو کے "فوجی اخبار" سے قطع نظر قاسم الاخبار" میسور کا پہلا اخبار ہے جو ۱۸۶۱ء میں نکلا۔ اس کے علاوہ "احسن الاخبار" کاس اخبار، "بادِ صبا"، "گستر"، "ایڈورڈ گزٹ" (مدیر غلام محمد شوکت) "منشورِ محمدی" (محمد حنیف) "میسور الاخبار" (حافظ سید محمد) سلطان الاخبار" (قادر بادشاہ) "محافظ بنگلور (عبدالمجیب) "تیرِ اعظم" (سید شاہ عبدالقدوس) بنگلور اخبار" (محمد حسین و واحد علی) تعلیم (عبدالحق تحقیق) "اخبار مصلح" (عبدالحی سبزواری) "رسالہ دل سوز" (قادر شریف صابر) "ترغیب" (عبدالحفیظ آرام) "نصرت" (محمد عبداللہ نصرت) "صبح بہار" (محمد علی آزاد) نگارستانِ خیال" (دلی) "جارج گزٹ" (برق) شاہ راہِ ترقی" "ترغیب" "رسالہ نسواں" (مدیر آرام) "دیوار" "اور سبل" (مزاحیہ) اخبار "ہلال" "علم و عمل" "پیکرِ خیال" "مذاقِ عروض" "ترانہ" "آفتاب" "شمع سخن" "قول" "درخشاں" "کوثر" "جلوہ سخن" "روزی روزگار" "درِ یتیم" وغیرہ مشہور رسائل و اخبار تھے۔ ان کی مجموعی تعداد ستر اسی تک پہنچ جاتی ہے۔

اس وقت[2] ریاستِ میسور سے چھ روزنامے شائع ہوتے ہیں۔ "الکلام" ریاست کا سب سے پرانا روزنامہ ہے جو ۱۹۲۴ء میں جاری ہوا تھا۔ جناب ایس۔ جی محی الدین کی ادارت میں بنگلور سے شائع ہونے والے اس اخبار کی تعدادِ اشاعت دو ہزار ہے۔ ریاست کا سب سے کثیر الاشاعت روزنامہ "آزاد" ہے۔ اس کے ایڈیٹر عبدالہادی رفعت صاحب ہیں۔ یہ ۸۲۱۹ شائع ہوتا ہے۔ دو دوسرے اہم روزنامے "پاسبان" (بنگلور) اور "سالار" بنگلور ہیں۔ پاسبان کے مدیر جناب کے۔ ایم عظیم آتش ہیں۔ اس کی تعدادِ اشاعت ۵۲۰۰ ہے۔ روزنامہ "سالار" کے ایڈیٹر محمود ایاز ہیں۔ یہ اخبار روزانہ ۲۶۴۹ شائع ہوتا ہے۔

پریس رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کی رپورٹ برائے ۱۹۷۱ء کے مطابق ریاستِ میسور سے آٹھ ہفتہ وار اخبار شائع ہوتے ہیں۔ "نشیمن" ریاستِ میسور بلکہ سارے ملک کا سب سے کثیر الاشاعت ہفتہ وار ہے۔ یہ بنگلور سے شائع ہوتا ہے۔ اس کی تعدادِ اشاعت ۴۸۲۷۹ ہے۔ اس کے مدیر اسما اسد ہیں۔

[2] اخبارات کی تعدادِ اشاعت پریس رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا رپورٹ برائے ۱۹۷۱ء (ص ۶۰۳) پر مبنی ہے۔

دیگر اہم ہفتہ وار "کارواں" (بنگلور) اور "کوثر" (بنگلور) ہیں۔ "کوثر" کے مدیر جناب خلیل بیباک ہیں۔ اس کی تعداد اشاعت ۲۲۲۰ ہے۔ ہفتہ وار "کارواں" کے مدیر جناب کے۔ ایم عظیم آتش ہیں۔ یہ ۱۰۲۵۲ شائع ہوتا ہے۔ ان ہفتہ واروں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ سارے کے سارے آزادی کے بعد شائع ہونا شروع ہوئے تھے۔

ادبی رسائل کے لئے مقامی فضا کچھ زیادہ سازگار نہیں، تاہم میسور کو ماضی میں "نیا دور" (صمد شاہین اور ممتاز شیریں) اور حال میں سہ ماہی سوغات (مدیر محمود ایاز) شائع کرنے کا فخر و امتیاز حاصل ہے۔ سہ ماہی "سوغات" ایک عرصہ بند رہنے کے بعد حال میں پھر جاری ہوا ہے اور اس کے دو شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ اپنے ابتدائی دور میں "سوغات" نے جدید نظم نمبر دو حصوں میں شائع کیا تھا۔ اردو میں نظم جدید کی آبیاری میں اپنے اس یادگار نمبر کی بدولت "سوغات" کو اوّلیت حاصل ہے۔

علمی ادبی سرگرمیاں انیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتدا سے حالات بدل گئے۔ انگریزی کا عام چلن ہو گیا۔ آزادی کی جنگ شروع ہوئی۔ زبان اردو کا تحفظ تمدن و ثقافت کا مسئلہ بن گیا۔ اس دور نے کئی اچھے مورخ، نقاد، صحافی، ادیب و شاعر پیدا کئے۔

محمود خاں محمود (مورخ "سلطنت خداداد"، تاریخ جنوبی ہند، صحیفۂ ٹیپو، حیدر علی، فیصلہ کن جنگیں، تاج وغیرہ) نفیس تلمیذ جلیل مانک پوری، نذیر حسین، گردش، خاکی، محمد خاں، ڈاکٹر حبیب النسا، ڈاکٹر آمنہ خاتون، سہیل محمد شاہین، ممتاز شیریں، شاہ ابوالحسن، سید شاہ اسد پیراں قادری، محمود ایاز، ہادی رفعت، نعیم اقبال، تابش، محمود سعید ایم۔ اے قادر، ضمیر، عاقل شاہی، شاہد شعلہ، میمونہ تسنیم، نسیر، عصمت عذرا شہاب، مجمل، حنیف کلیم، سراج ادیبی، میر نور حسین، سلیم مینائی، فضا کوثری، سید غوث محی الدین، ڈاکٹر عبدالغفار، شکیل، پروفیسر سید نذیر احمد، احمد اللہ، آغا محمد سروش، امین بیباک، سالک، خلیل سیمابی، امامی، سید مبارز الدین رفعت، سلیمان خطیب، طیب انصاری، راہی قریشی، حمید الماس، قیوم صادق بیگانہ، مبشر، رئیس مینائی، عصری وغیرہ۔

آزادیٔ ہند کے بعد بعض ناموں کا اضافہ ہوا ہے۔ ان میں قابل ذکر حسینی سرور، میر محمود حسین، ہاشم علی، خلیل خاور، اقبال فرید، ضامن، گوہر، میر عظیم الدین، ضیا، اقبال قادری، مائل، منصور، صلاح الدین۔ م۔ ن سعید، شکیل مظہری، خلیل مامون، رفیق احمد عزیز، شید ار ومانی، کشور کولاری، نشاط اکبر، جبار جمیل، مشتاق احمد خاں، عادل ادیب، نیاز احمد، شوق بنگلوری، حمید سہروردی، اکرام باگ، شبیر باگ کے نام ہیں۔

ریاست میسور میں مقامی طور پر سینکڑوں انجمنیں ہیں جو اپنے طور پر اردو کی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ لیکن میری نظر میں آمامی صاحب کی انجمن ترقی اردو بنگلور، مجلس ادب بنگلور، اور انجمن اشاعت اردو میسور ہمیشہ سرگرم عمل رہی۔ مجلس ادب اور انجمن اشاعت اردو کو اس بات کا فخر ہے کہ انہوں نے بیسیوں نئے شاعروں اور ادیبوں کو پیدا کیا اور انہیں ابھارا۔ ان اداروں کی نیک نامی اور شہرت میں حضرت سید نذیر احمد (علیگ) پرنسپل ایوننگ کالج میسور یونیورسٹی، رکن سنڈیکیٹ و سینٹ، صدر رفاہ المسلمین ایجوکیشنل سوسائٹی میسور اور انجمن اشاعت اردو میسور، جناب منظور احمد معتمد مجلس ادب، اور جناب آمامی معتمد انجمن ترقی اردو بنگلور جیسے مخلص کارکنوں کا بڑا دخل رہا ہے۔

اردو کو ہر دل عزیز بنانے میں۔ محرم کا عشرۂ غم، شولہ یا شوبالہ کی تقریبوں نے بھی بڑا کام کیا ہے۔ مرثیہ خوانی و سوز خوانی نے اردو مرثیے، مزاحیہ فقروں و ترکیبوں کو جنم دیا۔ شعری مقابلے اور مناظرے کی مجلسیں آج بھی باقی ہیں۔ ان میں لسان کمر، نور یاں ناریاں، علوی، سفلی وغیرہ جماعتیں مشہور ہیں۔

محفل مشاعرہ خاصے کی چیز ہے۔ مقامی مشاعروں کے علاوہ کل ہند مشاعرے بھی منعقد ہوتے ہیں۔ انجمن امامیہ اس معاملہ میں پیش پیش ہے۔ ہندوستان کے اکثر شعرا یہاں کے مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔

مطبوعات پریس کی آسانیاں ہمارے یہاں ضرور ہیں لیکن کوئی اشاعت گھر نہیں۔ ہر ادیب و شاعر اپنے خرچ سے اپنی تصنیف چھاپے یہ ذرا مشکل ہے۔ ویسے چھپنے کی آرزو کس کو نہیں ہوتی۔ نکاسی کا معاملہ بھی ٹیڑھا ہے۔ اس کے باوجود کچھ ہمت کر ہی جاتے ہیں۔ ڈاکٹر حبیب النسا بیگم "ریاست میسور میں اردو کی نشو و نما"، "جواہر ادب"، "غالب"، ڈاکٹر آمنہ خاتون "لطائف السعادت"، "میسور میں اردو"، "دکنی اردو"، ایم اے قادر "ادب کے نئے دھارے"، محبوب بڑائی "ہم کہاں کے دانا ہیں"، ارشد قاسمی "بہار مجسم"، "مجلس ادب" "جنوبی ہند کا بہترین ادب"، سید ابوتراب عطائی، "دکھنی لغت"، میر محمود حسین "نسیم میسوری"، "مقالات محمود"، مغز مرغوب، ہاشم علی، قیوم صادق "اردو کا مذہبی ورثہ" و وجہی، وغیرہ نے ہمت

سے کام لیا اور یہ قابل تعریف ہیں۔ طیب انصاری "ادراک معانی" قدیر "ذرعنا" اور راہی قریشی "صحرا کا سفر" کی کتابیں بھی ولاپیلشنگ حیدرآباد اور "مشورہ" بک ڈپو سے چھپی ہیں۔ سید مبارز الدین رفعت ریاست میسور کے کثیر التصانیف بزرگ ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ریاست کے مقبول شاعر محمود ایاز اور مشہور افسانہ نگار نعیم اقبال کا کلام اور افسانے کتابی صورت میں شائع ہوں۔

ریاستی حکومت کتابیں تو ضرور خریدتی ہے۔ لیکن اُردو مصنفوں اور شاعروں کی سرپرستی نہیں کرتی۔ انعام واکرام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود موجودہ حکومت سے میں مایوس نہیں پُرامید ہوں۔

ریاست میسور میں کتب خانوں کی واقعی کمی ہے۔ کتب خانے صدر انجمن بنگلور مسلم لائبریری بنگلور کے علاوہ راقم کو کسی اچھے کتب خانے کا پتہ نہیں۔ حیدرآباد کے جو اضلاع مثلاً گلبرگہ، بیجاپور، بیدر وغیرہ کرناٹک کے نقشے کی زینت بن گئے ہیں ممکن ہے وہاں کوئی اچھا کتب خانہ ہو۔ یونیورسٹی کے کتب خانے میں اُردو کی اچھی معیاری کتابوں کے ساتھ گھٹیا کتابیں بھی مل جاتی ہیں۔ پبلک لائبریری میں اُردو کتابیں نظر سے غائب ہوتی جارہی ہیں۔ سرکاری اورنٹل لائبریری میں مخطوطات کا ایک خاصہ ذخیرہ جمع ہے۔ جس میں راقم کے کتب خانے کی بھی کئی اہم قلمی کتابیں ہیں۔ کالج کے دانشور، لکچرار اور طلبا کے علاوہ اہل ذوق اس سے فائدہ یا استفادہ نہیں اُٹھا سکتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اہل علم و ذوق کے لئے یہ پابندی سرے سے اُٹھا دی جائے۔

ریاست میسور میں اُردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کے لئے سب سے فعال انجمن مجلس ادب بنگلور ہے۔ اس کے صدر جناب محمود سعید، جنرل سکریٹری محمد منظور احمد ہیں۔ دیگر سرگرم اراکان جناب علی حفیظ، ضیاء کرناٹکی اور م۔ ن۔ سعید ہیں۔ مجلس ادب اُردو کتابوں کی اشاعت کا کام کرنا چاہتی ہے۔ ایسا اسکول کھولنا چاہتی ہے جہاں غیر اُردو داں لوگوں کو اُردو پڑھائی جا سکے۔ اُردو کی ترویج و ترقی اور اس کے تحفظ کے لئے ایک دوسرا سرگرم ادیب وشاعر محمود ایاز ہے۔

سرکاری دفاتر اور اُردو ریاستی سرکار کے کسی دفتر میں بھی اُردو میں کام کاج نہیں ہوتا۔ البتہ محکمۂ اطلاعات میں ایک مختصر سا شعبہ اُردو کا ہے۔ جو گاہے گاہے اُردو اخبارات کو خبریں وغیرہ اُردو میں بھیجتا ہے اخبارات کو ریاستی سرکار کے اشتہارات بھی اُردو ہی میں جاری کئے جاتے ہیں۔

ریاست میسور میں کوئی سرکاری یا نیم سرکاری ادارہ یا اکیڈیمی ایسی نہیں جو اُردو زبان وادب کے فروغ کے لئے کسی طرح سے معاون بنتی ہو۔

ریاست میں اُردو کی ترویج واشاعت کے لئے تجاویز

(۱) موجودہ تعلیمی نظام کو برقرار رکھتے ہوئے حکومت کو چاہیے کہ سرکاری اور پرائیویٹ ہائی اسکولوں میں اُردو داں طلباء وطالبات کو مادری زبان کی حیثیت سے اُردو پڑھنے کی ہر ممکن سہولت مہیا کی جائے۔

۲۔ کالجوں میں جہاں کنڑی، انگریزی اور سنسکرت وغیرہ کے ڈپلومہ کورسس رکھے گئے ہیں وہاں اُردو ڈپلومہ کا بھی انتظام کیا جائے۔

۳۔ قومی یک جہتی کی خاطر ریاست کی اکثریت اور اقلیت ایک دوسرے کی زبان کو اختیار کرے۔

۴۔ ریاستی سرکار اُردو کے ادبی اداروں اور کتب خانوں کی مالی امداد کرے اور اُردو کی معیاری تصانیف پر انعام واکرام کے ساتھ اچھے ادیبوں اور شاعروں کے مضامین نثر ونظم کو کتابی صورت میں چھاپنے کے لئے قرضہ بھی دے۔

۵۔ ریاست کی اہم خبریں جہاں صوبائی زبان میں شائع ہوتی ہیں وہاں اقلیتی زبان (اُردو) میں بھی شائع ہوں۔

۶۔ دفتر میں کنڑی کے ساتھ اُردو میں بھی درخواستیں قبول کی جائیں اور اُسی زبان میں ان کا جواب بھی دیا جائے۔

۷۔ رسالہ "آندھرا پردیش" اور رسالہ "نیا دور" کی طرح ریاست میسور بھی ایک سرکاری جریدہ شائع ہو۔

۸۔ اُردو داں صرف حکومت پر تکیہ کر نہ بیٹھ رہیں بلکہ اس کا ہاتھ بٹائیں اور اپنے خلوص، محنت اور طاقت پر بھروسہ کریں

●●

ظفر انجگانوی

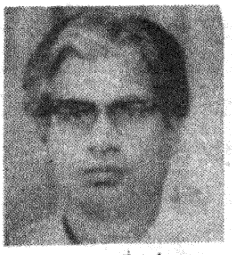

علقمہ شبلی

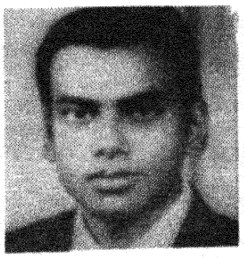

ایم اے نصر

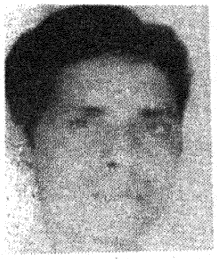

شانتی رنجن بھٹا چاریہ

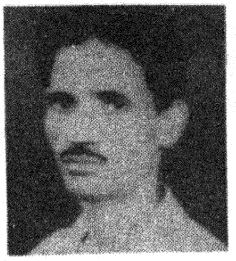

عبدالرؤف

ایم اے حمید

مضطر حیدری

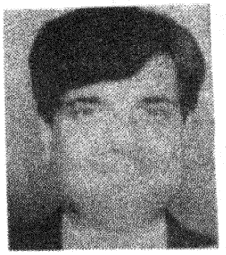

نصر غزالی

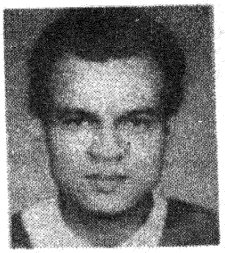

قیصر شمیم

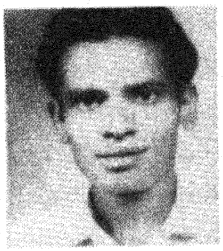

مشتاق احمد

مغربی بنگال میں اُردو

جاوید نہال

سترھویں صدی میں اُردو اپنی ابتدائی شکل میں بنگال میں بھی موجود تھی۔ یوروپین سیاح ٹبری اپنے سفرنامے "مشرقی ہندوستان کا سفر ۱۶۵۵ء" میں رقمطراز ہے کہ:

"عدالتی زبان فارسی ہے لیکن عام بول چال کی زبان ہندوستانی اور بنگلہ ہے۔ مگر اب تک ہندوستانی کے لئے کوئی مناسب رسم الخط منتخب نہ ہو سکا۔"

یوروپین سیاح کے اس بیان سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ سترہویں صدی میں اُردو بولی کی حیثیت سے بنگال میں رائج ہو چکی تھی۔ مگر قطع و برید کے عمل سے گزر کر یہاں یہ بولی اٹھارہویں صدی کی ساتویں آٹھویں دہائی میں زبان کا درجہ حاصل کر سکی۔

اُردو میں نثری ادب کی تخلیق بھی پہلے فورٹ ولیم کالج میں ہوئی۔ جو جولائی ۱۸۰۰ء میں قائم ہوا تھا۔ پروفیسر جان بارتھوک گل کرسٹ اُردو کا پرستار اور محسن تھا، انتظام سلطنت کی بہتری کی غرض سے ہی سہی، اس نے فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی، بھاکا اور بنگلہ کے شعبے قائم کئے۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے نامور ادیبوں اور جید عالموں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ کالج کے ان باتنخواہ منشیوں نے اُردو نثر کی تدریس کی۔ جہاں داستان اور افسانوی ادب کی تخلیق ہوئی (میرامن دلی والے کی "باغ و بہار"، حیدر بخش حیدری کی "توتا کہانی" اور "قصہ حاتم طائی"، نہال چند لاہوری کی "مذہب عشق"، اور کاظم علی جوان کی "شکنتلا ناٹک" جیسی داستانیں عوام میں بے حد مقبول ہوئیں) وہاں کالج کے منشیوں نے بیسیوں مفید کتابیں جن میں تاریخ اور تذکرے بھی شامل تھے۔ تالیف کیں۔ بہادر علی حسینی ("اخلاق ہندی") حیدری۔ میرامن، میر شیر علی افسوس، خلیل علی خاں اشک ("داستان امیر حمزہ" وغیرہ، کاظم علی جوان، مظہر علی خاں ولا ("بیتال پچیسی" وغیرہ) اور للو لال جی کوی جیسی اہم ادبی شخصیتیں نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ اُردو نثر کا عالیشان قصر ان ہی منشیوں کی رکھی ہوئی بنیاد پر کھڑا ہے۔

گو کہ اُردو نثر کا باضابطہ چلن فورٹ ولیم کالج سے ہوا، لیکن صوفیائے کرام کی مساعی کی وجہ سے اٹھارہویں صدی ہی میں اُردو جہانگیر نگر (ڈھاکہ) تک پھیل چکی تھی۔ اور مرشد آباد اُردو کا ایک اہم مرکز بن چکا تھا اور نواب مخلص، قدرت اللہ قدرت، ماشاء اللہ خاں مصدر، انشاء اللہ خاں انشاء، اور جودت کی شاعری کی شہرت بنگال سے نکل کر ہندوستان میں پھیل چکی تھی۔ بعد میں واجد علی شاہ اختر کی جلاوطنی اور مٹیا برج میں مستقل قیام کے باعث مٹیا برج بھی ایک مرکز بنا۔

۱۹ویں صدی کے ادیبوں اور شاعروں نے جو ادبی متاع میراث کے طور پر چھوڑی۔ اُسے ان کے جانشینوں نے محفوظ رکھا۔ اور اس میں تھوڑا بہت اضافہ ہی کیا اور آج بھی اضافہ کر رہے ہیں۔

اُردو بولنے والوں کی تعداد

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا۔ آبادی نے نقل مکانی کی۔ نتیجے میں بنگال کی ۱۶ لاکھ کی اُردو آبادی گھٹ کر چار پانچ لاکھ رہ گئی؛ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق بنگال میں ایسے لوگوں کی تعداد ۵،۴،۷،۷،۴ تھی، جن کی مادری زبان اُردو تھی۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق اُردو آبادی ۸،۳۲،۸۴۷ تھی، جبکہ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کی تازہ ترین اطلاع کے مطابق اُردو کی آبادی ۹ لاکھ ۵۰ ہزار ہے۔ یہ صحیح تعداد نہیں ہے۔ کیونکہ غیر سرکاری جائزے کے مطابق مغربی بنگال میں اُردو دانوں کی تعداد سولہ لاکھ سے کم نہیں۔ اور ایسے لوگوں کی تعداد جو اُردو لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ مگر بولتے ہیں۔ کم سے کم چھ لاکھ ہے۔ گویا اس وقت مغربی بنگال میں اُردو دانوں کی تعداد بائیس لاکھ ہے۔ تین کروڑ کی آبادی کی ریاست میں اردو بولنے والوں کی یہ تعداد خاصی کہی جائے گی۔ ہندی بولنے والوں کی تعداد بھی مردم شماری کی اطلاعات کے مطابق ۲۴ لاکھ ہے۔

تعلیمی سہولتیں:- حکومت مغربی بنگال نے تعلیم کی ہر سطح پر اُردو کو سہولتیں دینے کی بساط بھر کوشش کی ہے اور بعض بنیادی شکایات کے باوجود اُردو طبقہ بہت حد تک مطمئن ہے۔

پرائمری اسکول:- ریاست میں لگ بھگ ڈیڑھ سو ایسے پرائمری اسکول ہیں۔ جہاں ذریعہ تعلیم اُردو ہے۔ کارپوریشن (کلکتہ) کے کم سے کم ۴۲ پرائمری اسکولوں میں اُردو ذریعہ تعلیم ہے۔ اور دو سرکاری مڈل اسکولوں میں بھی ذریعہ تعلیم اُردو ہے۔

ہائی اسکول: صرف دو ہائی اسکول ایسے ہیں جہاں بنگلہ کے علاوہ ذریعۂ تعلیم اُردو بھی ہے۔ ایک مدرسۂ عالیہ کلکتہ اور دوسرا نواب بہادر انسٹی ٹیوشن آف مرشد آباد۔ ۲۵ سرکاری نیم سرکاری اور غیر سرکاری اُردو اسکولوں میں بھی اُردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔ سرکاری گرلز اسکول میں صرف سخاوت میموریل گرلز ہائر سکنڈری اسکول میں اُردو تعلیم کا بندوبست ہے، لیکن معقول نہیں اور ذریعۂ تعلیم میسر نہ ہونے کے باعث اُردو خواں طالبات کے داخلے میں دشواریاں ہوتی ہیں۔

ریاست میں ۱۴ سرکاری اور نجی کالجوں میں اُردو کی پڑھائی کا بندوبست ہے۔ سرکاری کالجوں میں سب سے اہم **مولانا آزاد کالج** ہے۔ جہاں اُردو آنرز کلاس تک پڑھائی جاتی ہے۔ یہاں ۱۹۶۶ء تک اُردو، فارسی، اور عربی کا ایک شعبہ تھا۔ ۱۹۶۷ء میں اُردو شعبہ کو الگ حیثیت دیدی گئی۔ اس وقت کالج میں اُردو طلبہ کی تعداد ۱۷۵ ہے۔

لیڈی برابورن کالج: طالبات کے سرکاری کالج لیڈی برابورن کالج میں اُردو کی تعلیم باضابطہ دی جاتی ہے۔ ۱۹۷۱ء میں اس کالج میں اُردو آنرز کا شعبہ کھولا گیا ہے۔ پہلے سال آنرز طلبہ کی تعداد چار تھی۔ ۱۹۷۲ء میں یہ تعداد بارہ ہوگئی ہے۔

پریسیڈنسی کالج: سب سے اہم اور مشہور و معروف سرکاری کالج ہے۔ آزادی کے قبل اُردو کا مکمل شعبہ تھا اور آنرز کی پڑھائی ہوتی تھی لیکن آزادی کے بعد اُردو شعبہ بند کر دیا گیا۔ چند برسوں تک پری یونی ورسٹی سطح تک اُردو پڑھائی جاتی تھی۔ مگر دو برسوں سے وہ بھی ختم ہوگئی۔

ہوگلی محسن کالج کا الحاق بردوان یونیورسٹی سے ہے۔ آزادی کے بعد فارسی، عربی اور اُردو کے شعبے ۱۹۵۶ء تک بند رہے مگر صنعتی علاقوں کے اُردو والوں کے شدید مطالبے پر اُردو شعبہ کی پھر ۱۹۵۷ء میں تجدید ہوئی۔ ۱۹۷۰ء میں اُردو آنرز کا شعبہ بھی کھول دیا گیا۔

ریاست میں دس غیر سرکاری کالج ہیں جہاں اُردو کی پڑھائی کا بندوبست ہے۔ لیکن سہولتیں طلبا کو کم میسر ہیں۔ کیونکہ ان کالجوں میں اساتذہ کی بہت کمی ہے۔ مشن اسکولوں اور کالجوں میں اُردو پڑھائی ختم کر دی گئی ہے۔

یونی ورسٹیاں:۔ مغربی بنگال میں چھ یونی ورسٹیاں ہیں، لیکن صرف کلکتہ یونی ورسٹی میں اُردو کا شعبہ ہے، جو جدید ہندوستانی زبانوں (بنگلہ وغیرہ) کے ساتھ منسلک ہے۔ اور ڈوگل وقتی اور دو جز وقتی لیکچرار ہیں۔ ۱۹۶۱ء سے طلبہ کی تعداد اوسطاً پندرہ ہے۔ امسال تیس طلبا و طالبات نے ایم اے کے امتحان میں حصہ لیا۔

اخبارات و رسائل: اُردو صحافت نے بھی بنگال ہی میں جنم لیا۔ پہلا اخبار "جام جہاں نما" (۱۸۲۲ء) تھا۔ اور پھر "دارالسلطنت" وغیرہ انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں شائع ہوئے۔ فی الحال اُردو روزناموں کی تعداد سات ہے۔ ۱۹۵۱ء میں پانچ تھی، ۱۹۶۱ء میں چھ ہوگئی، اور اب سات ہے۔ صبح کے روزنامے چار ہیں، شام کے تین۔ اس وقت اُردو کا سب سے مقبول اخبار "آزاد ہند" ہے۔ یہ اخبار مشہور و معروف صحافی اور مولانا آزاد کے ساتھی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے جاری کیا تھا۔ آج کل اُن کے صاحبزادے احمد سعید ملیح آبادی اس کے مدیر ہیں۔

روزنامہ "عصر جدید" آزادی کے قبل مسلم لیگ کا نیم سرکاری آرگن تھا۔ ۱۹۵۰ء میں عصر جدید کی ملکیت بدلنے سے پالیسی بدل گئی اور یہ بھی قوم پرست اخبار ہوگیا۔

"روزنامہ ہند" ۱۹۲۹ء میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں جاری ہوا تھا۔ اب رئیس الدین فریدی روزنامہ ہند کے مدیر ہیں۔

شام کے تین اخبارات نکل رہے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں سالک لکھنوی کے اشتراک و تعاون سے ابراہیم ہوش نے "آبشار" نکالا، جو محنت کش طبقہ کی ترجمانی کا دعویٰ کرتا ہے۔ "غازی" کا اجراء ۱۹۶۵ء میں ہوا۔ اس کے مدیر وقار مشرقی ایم اے (علیگ) ہیں۔ "امروز" ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا، اقبال اکرامی اس کے مدیر ہیں۔

ہفتہ وار:۔ مغربی بنگال سے شائع ہونے والے اُردو ہفتہ وار اخباروں کی تعداد آٹھ ہے۔

"آزاد ہند" جو ۱۹۶۶ء سے جاوید حسن کی زیر ادارت شائع ہو رہا ہے۔ اس کی اشاعت پانچ ہزار سے اوپر بتائی جاتی ہے۔ "کسان مزدور" ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ مدیر جناب محمد امین ہیں۔

مقبول ترین اخبار روزنامہ "آزاد ہند" کا سنڈے ایڈیشن "اُجالا" ہے۔ اس کی اشاعت ۱۱ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ مدیر احمد سعید ملیح آبادی ہیں۔ دیگر ہفت روزوں کے علاوہ "بخشیات" "علم و کیلی" (۱۹۵۸ء) اور "عکاس" (۱۹۶۲ء) بھی شائع ہو رہے ہیں۔

پندرہ روزہ:۔ ہماری ریاست میں پانچ پندرہ روزے شائع ہوئے جن میں سے صرف دو اب بھی جاری ہیں۔ "تحریک ملت" (مدیر عبدالعزیز ایم اے نصر اور کمال جعفری کے اشتراک و تعاون سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ اور حکومت مغربی بنگال کے محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ کی جانب سے 'مغربی بنگال' ۱۹۵۴ء سے اب تک جاری ہے۔

ماہنامے ۱۹۵۱ء سے اب تک کوئی پندرہ ماہنامے شائع ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں ایک ادبی اور فلمی ماہنامہ "معاون" مدیر مظہر امام اعوان مقیم پٹنہ شائع ہوا۔ سوز سکندر پوری نے ماہنامہ "سوز" ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔ "عبرت"، "ساز" اور کئی دوسرے ماہنامے شائع ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں "حسن و صحت" شائع ہوا۔ جو آج بھی جاری ہے۔ اس میں طب و حکمت سے متعلق پر از معلومات مضامین شائع ہوتے ہیں۔ "آفاق"

(۱۹۵۷) اور "فیشن" ۱۹۵۳ء بھی عوام کی بے توجہی کا شکار ہو گئے۔ بنگال میں ہندوستان کا پہلا ڈائجسٹ "فانوس" (مدیر عطاء الرحمٰن شاد) ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ ایک سال بعد جواں سال صحافی نظام الحسینی نے "روح ادب ڈائجسٹ" شائع کیا۔ یہ دونوں ڈائجسٹ "ہما" اور "شبستاں" کی اشاعت کے بعد بند ہو گئے۔

۱۹۷۰ء میں جدید ادبی رجحان نے اس ریاست کے شعراء اردو ادب کو بھی متاثر کیا۔ ظفر اوگانوی نے ۱۹۷۱ء میں "اقدار" اور نوجوان شاعر کامل اختر نے "آیات" شائع کیا۔ یہ دونوں رسالے بھی جو جدید قدروں کے ترجمان تھے جلد بند ہو گئے۔ فی الحال دو ماہنامے "سبدگل" (مدیر ولی صدیقی سلطان پوری) اور "شہود" (مدیر شہود عالم آفاقی) شائع ہو رہے ہیں۔ اور ایک بچوں کا رسالہ "غنچہ" (دو ماہی) بھی نکلتا ہے۔

ادبی سرگرمیاں

مغربی بنگال میں مرحوم علامہ وحشت کے بعد پرویز شاہدی اردو کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ اُن کے کلام کے دو مجموعے "رقصِ حیات" (۱۹۵۴ء) اور "تثلیث حیات" (۱۹۶۸ء) میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ وہ عظیم ترقی پسند فن کار تھے۔

شاکر کلکتوی، غواص قریشی، پروفیسر عباس علی خاں بے خود، رضا مظہری، جرم محمد آبادی پرانے غزل گو شاعر ہیں۔ نئے کہنے والوں میں حلقہ شبلی کا نام سرفہرست ہے۔ شبلی ترقی پسند شاعر ہیں لیکن عصری تقاضوں اور جدید رجحان کی خوبیوں سے بے پروا نہیں۔ مضطر حیدری کا شمار بھی ایسے شاعروں میں ہوتا ہے جو وقت کے تقاضوں سے باخبر ہیں ان کا مجموعۂ کلام "جام جم" ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔

ابراہیم ہوش کا تعلق "دبستان آرزو" سے ہے ۱۹۶۹ء میں اُن کی شاعری نے ایک کروٹ بدلی اور ترقی پسند قدریں اور زندگی کے توانا مسائل اُن کی شاعری کے موضوع بنے۔

قیصر شمیم، ہوڑہ کے ترقی پسند شاعر ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "ساعتوں کا سمندر" اُردو اور ہندی رسم الخط میں ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ رونق نعیم، رانی گنج کے مقبول ترقی پسند شاعر ہیں۔ جواب جدید شاعری کرتے ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "دائرہ در دائرہ" ۱۹۷۲ء میں ہندی اور اُردو رسم الخط میں شائع ہو چکا ہے۔

اعزاز افضل، ترقی پسند شاعر ہیں۔

جواں مرگ وکیل اختر، ترقی پسند شاعر تھے۔ افسوس ہے کہ موت کی آندھی نے ان کی شمع حیات ۳۵ سال میں گل کر دی۔

نصر غزالی، سہیل اختر، وحید عرشی، فاروق شفق، خالق عبداللہ، سعید قدرت، حبیب ہاشمی، شمیم انور اور احسن شفیق افقِ ادب پر جدید شاعر کی صورت میں ابھرے، اور جدید شاعری کو سجانے سنوارنے میں مصروف عمل ہیں۔

ان شاعروں کے علاوہ اقبال کرشن، شمس الزماں شمس، شہود عالم آفاقی، راز عظیم، معصوم شرقی اور کمال جعفری اُبھرتے ہوئے شاعر ہیں شاعرات میں رابعہ سلطانہ ناشاد، اور صالحہ بیگم محفی، (مرحومہ) قابلِ ذکر ہیں۔ ناشاد کے دو مجموعۂ کلام "ناسور" اور "طوفان غم" شائع ہو چکے ہیں۔

نثر نگار:۔ مغربی بنگال میں نثر نگار خال خال ملتے ہیں۔ تحقیق کا میدان بہت وسیع ہے، مگر بنگال کے نثر نگاروں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ "بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات"، انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" کی اشاعت سے نئے پود کے ادیبوں کو تحقیق سے کچھ دلچسپی پیدا ہوئی۔ اور مشتاق احمد نے بیسویں صدی میں مغربی بنگال کے اردو شعراء ۱۹۷۲ء میں شائع کیا۔ ۴۰۸ صفحات کا یہ تذکرہ ۱۸۲ شاعروں کے ذکر کے باوجود ابھی تشنہ ہے۔

کلکتہ کے نثر نگاروں میں بلند ترین مقام مشہور و معروف ادیب لطیف الدین احمد اکبر آبادی کا ہے۔ جو ل احمد کے نام ہی سے جانے جاتے ہیں — کلکتہ میں پچیس سالہ دورانِ قیام میں ل احمد صاحب نے کئی اچھی تخلیقات اردو ادب کو دیں۔ جن میں کہانیوں کے تین مجموعے "دن رات" "صبح و شام"، اور "ملاحظاتِ نفسی" شامل ہیں۔ ان کی کتابیں "روسی فکر اور منکر" اور "نقد ادب" بہت مشہور ہیں ۸۰ سال عمر ہونے پر بھی ل احمد کا قلم ادب کی خدمت کرنے سے نہیں تھکا ہے۔

پروفیسر شاہ مقبول احمد اور سالک لکھنوی کا بزرگ ادیبوں میں شمار ہوتا ہے۔ شاعر کے ساتھ ساتھ سالک ادیب بھی ہیں۔ طنزیہ مضامین خوب لکھتے ہیں۔

پروفیسر عبدالرؤف (شعبہ اردو کلکتہ یونیورسٹی) بھی شاعر و ادیب ہیں۔ امریکی شاعر والٹ وھٹ مین WALT WAITMAN کی ۲۱ نظموں کا ترجمہ "والٹ وھٹ مین کی ۲۱ نظمیں" (۱۹۶۹ء) کے نام سے شائع کر چکے ہیں۔ اُن کے علمی، ادبی اور تحقیقی مقالے برابر شائع ہوتے ہیں۔ انہوں نے سید مظہر الحق عرف پیارے شاہ صاحب کی کتاب "اسرار تصوف" کو تالیف اور شائع کیا اور آج کل مرشد آباد کے مشہور شاعر نواب مخلص

لہ اس سے بھی قدیم اردو ڈائجسٹ "شاہکار" ہے جو سترہ برس سے جاری ہے یہ پہلے الہ آباد اور اب وارانسی سے شائع ہوتا ہے۔ (ادارہ)

کے دیوان کے نسخہ کو ترتیب دے رہے ہیں۔

شانتی رنجن بھٹا چارجی اُردو کے واحد بنگالی ادیب ہیں۔ اُن کی مطبوعہ کتابوں میں "بنگالی ہندوؤں کی اُردو خدمات" بنگال میں اپنی نوعیت کا پہلا تذکرہ ہے۔ اُن کی "تاریخ بنگلہ ادب" انجمن ترقی اُردو (ہند) نے شائع کی ہے۔ اُن کی کتابوں میں ایک افسانوں کا مجموعہ بھی شامل ہے۔

لطیف الرحمٰن "نساخ سے وحشت تک" کی اشاعت کے بعد ادبی دنیا میں مشہور ہوئے۔ جو چار شعراء نساخ، شمس اور وحشت کی زندگی اور شاعری کا مفصل تذکرہ ہے۔ اُن کی تازہ ترین کتاب "غالب اور اس کے معترضین" (۱۹۷۳ء) میں غالب کی فارسی شاعری کا جائزہ ہے۔ اور غالب کے معترضین کے اعتراضات کو رد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دیگر تصنیفات "تجلیاتِ فارسی" کیف و اضطراب" (کلام کا مجموعہ) وغیرہ ہیں۔ ایم اے نصر، اور حشم الرمضان ابھرتے ہوئے ادیب ہیں جنہوں نے اُردو ادب کو کئی عمدہ مقالات دیئے ہیں۔ اقبال کرشن کے ادبی و تنقیدی مضامین "شب خون" کتاب اور دوسرے رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں۔ ایم اے حمید لکھنوی نے بھی چند اچھے ادبی مضامین لکھے ہیں۔

بنگال نے کئی اچھے افسانہ نگار اردو ادب کو دیئے۔ ۱۹۵۰ء تک یونس احمر بنگال کے مشہور افسانہ نگار تھے۔ ان کے علاوہ نشاط الایمان، احمد سعدی اور راقم الحروف نے افسانے لکھے اس وقت نشاط الایمان (ل احمد کو چھوڑ کر) سب سے پرانے افسانہ نگار ہیں۔ اُن کے افسانوں کا مجموعہ "لیل و نہار" ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ جدید افسانہ نگاروں میں سب سے کامیاب ظفر اوگانوی ہیں۔ ڈاکٹر ظفر اوگانوی نے تحقیقی اور تنقیدی مقالے بھی سپردِ قلم کئے ہیں۔ "صفیر بلگرامی کی حیات، شاعری اور تنقید" پر اُن کا تحقیقی مقالہ ہے۔

ظفر اوگانوی کے علاوہ سجاد نظر، انیس رفیع، فیروز عابد، عابد ضمیر، امر امیری، مشتاق اعظمی، شاہد منصور علی، وغیرہ ابھرتے ہوئے، افسانہ نگار ہیں۔ ایم اے نصر کی ادبی زندگی بھی افسانہ سے شروع ہوئی، مگر بعد میں وہ ادبی اور تحقیقی کام میں لگ گئے۔

ادبی انجمنیں:- مغربی بنگال میں تیس ادبی انجمنیں ہیں جو ریاست میں اُردو کے فروغ کے لئے کام کر رہی ہیں۔ ان میں سب سے پرانی ادبی انجمن "انجمن ترقی اُردو (ہند)" شاخ مغربی بنگال اور علامہ وحشت کی قائم کردہ "انجمن احباب" ہیں اول الذکر غالب صدی تقریب منانے کے بعد کچھ بے عمل سی ہوگئی ہے۔ اردو رائٹرز ایسوسی ایشن کلکتہ کے بنیادی مقاصد میں معیاری اور مفید کتابوں کی اشاعت ہے۔ سخن زار بھی ادبی انجمن ہے جو جشنِ لال احمد منانے کے پروگرام کی کوشش میں مصروف ہے۔ "بزم لوح و قلم" کی علمی و ادبی کاوشیں بھی قابلِ ستائش ہیں۔ امسال سے اُس نے پرویز شاہدی ایوارڈ کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ پہلا پرویز ایوارڈ اس سال حضرت لال احمد اکبر آبادی کو ملا ہے۔ ادارہ فروغ اُردو، شب پور ہوڑہ، اُردو اکادیمی، اُردو لٹریری سوسائٹی خضر پور، بزم شاکری، بزم خواص، رائٹرس ایسوسی ایشن (ہوڑہ) بزم شہود (بیلگچھیا) اُردو اکادیمی تانتی بگان، مرکز فکر و فن، اور دوسری ادبی انجمنیں، اُردو کے فروغ کے لئے کوشاں ہیں۔

کتب خانے:- مغربی بنگال میں سینکڑوں چھوٹے بڑے کتب خانے ہیں مگر ایسے کتب خانوں کی تعداد، جہاں اُردو کتابوں کا ذخیرہ ہے، بیس پچیس سے زیادہ نہیں۔ ان میں سب سے اہم کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی ہے۔ جہاں اُردو کے قدیم و نادر خطی نسخوں اور مطبوعات کا ذخیرہ ہے، نیشنل لائبریری کلکتہ کا اُردو شعبہ بوہارسکشن کہلاتا ہے جس میں کئی ہزار مخطوطات اور مطبوعہ کتابوں کا ذخیرہ ہے ہر موضوع پر اُردو کی کتابیں مل سکتی ہیں۔ شاہی کتب خانہ مرشد آباد میں میر انیس کے مراثی کے کئی نادر خطی نسخے ہیں۔ اس میں دس ہزار اُردو فارسی اور عربی کی کتابیں ہیں مگر اُن کی حفاظت نہیں ہو رہی ہے اور بہت سی نایاب مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کو دیمکیں چاٹ گئی ہیں۔ شاہی کتب خانہ قومی سرمایہ ہے، جس کی حفاظت قومی ذمہ داری ہے۔ محمد علی لائبریری، مولانا آزاد کالج کلکتہ اور ہوگلی محسن کالج کے کتب خانوں میں اُردو کا بڑا ذخیرہ ہے۔ ان اہم کتب خانوں کے علاوہ کلکتہ، متیا برج، آسنسول اور رانی گنج وغیرہ میں ایسے کتب خانے ہیں۔ جہاں معیاری کتابوں کا ذخیرہ مل جاتا ہے۔

سرکاری امداد:- ریاستی حکومت کی طرف سے اُردو کی تحقیقی تنقیدی اور علمی و ادبی کتابوں کی اشاعت کے لئے کسی نوعیت کی امداد نہیں ملتی۔ انعاموں کا بھی رواج نہیں ہے۔ کسی بھی سرکاری دفتر میں اُردو میں کلی یا جزوی طور پر کام نہیں ہوتا۔ ریاستی محکمہ اطلاعات و تعلقاتِ عامّہ کی جانب سے پندرہ روزہ "مغربی بنگال" شائع ہوتا ہے۔ اور اُردو میں مقامی خبریں بھی اخبارات کو فراہم کی جاتی ہیں۔ (مرکزی محکمہ اطلاعات و تعلقاتِ عامّہ کی جانب

لہ اس کتب خانے میں ملک کی ہر مطبوعہ کتاب کا ایک نسخہ مفت بھیجنا قانوناً ضروری ہے۔ لیکن اُردو ناشر اس کی پابندی نہیں کرتے (ادارہ)

سے بھی اُردو میں خبریں اور معلوماتی فیچر مہیا کئے جاتے ہیں)۔

ادیبوں، شاعروں اور ثقافتی اداروں کے علاوہ ایسی شخصیتیں بھی ہیں جو اپنی بساط کے مطابق اُردو کی ترویج و اشاعت کے لئے کام کر رہی ہیں۔ ان میں ڈاکٹر عطا کریم برق (صدر شعبۂ عربی و فارسی کلکتہ یونیورسٹی) ایم اے مجید (سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند شاخ مغربی بنگال، سریندر کمار بھاج (پبلسٹی سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند شاخ مغربی بنگال) ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑا (کلکتہ یونیورسٹی) وسیم الحق ایم اے وغیرہ کلکتہ یونیورسٹی میں الگ شعبہ کے قیام، کتابوں کی اشاعت کے لئے سرمایہ کی فراہمی اور مشاعرے وغیرہ کرا کے اُردو کو غیر اُردو داں طبقے میں مقبول بنانے کے لئے کوشاں ہیں۔

فروغ کی تجاویز: (۱) بنگالی علمی و ادبی حلقہ اُردو سے عقیدت و محبت رکھتا ہے اس لئے اُردو کتابوں کو بنگلہ کے قالب میں ڈھالنے کی ضرورت ہے، دیوان غالب کا بنگلہ میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے (۲) بنگال میں شائع ہونے والی اردو مطبوعات پر حوصلہ افزائی کے لئے انعامات دیئے جائیں (۳) ادیبوں اور شاعروں کی مالی معاونت کی جائے (۴) اُردو اکادیمی کے قیام کے لئے اقدام کئے جائیں (۵) مطبوعات کی اشاعت کا معقول انتظام ہو (۶) پرائمری سطح سے اعلیٰ سطح تک اُردو کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے۔ اور اُردو اساتذہ کا تقرر کیا جائے۔ (۷) آل انڈیا ریڈیو کلکتہ میں اُردو کا الگ شعبہ قائم کیا جائے۔ ●●

بقیہ: تامل ناڈو میں اُردو

۶۔ تامل ناڈو ریاست کے جن علاقوں میں اُردو بولنے والوں کی قابل لحاظ تعداد ہے۔ وہاں فہرست رائے دہندگان اُردو میں بھی شائع کر دی جائے۔

۷۔ اُردو مدارس طلباء کی تعداد کی بناء پر نہیں بلکہ اُردو بولنے والی آبادی کے تناسب کو مدنظر رکھ کر کھولے جائیں اور مناسب سے اساتذہ کا تقرر کیا جائے پرائیویٹ ہائی اسکولوں اور کالجوں میں ایسے اُردو اساتذہ کا تقرر ہی لازمی قرار دیا جائے جن کے پاس اردو کی ڈگری ہو۔ اُردو زبان و ادب کی فہرستیں اُردو ادیبوں کے مشوروں سے مرتب کرائی جائیں۔ ٹیکسٹ بک کمیٹی میں ایسے اراکین بھی لئے جائیں، جن کا اردو ادب میں کوئی مقام ہو۔

۸۔ سرکاری لائبریریوں میں اردو کتابوں کے لئے موزوں رقم فراہم کرائی جائے تاکہ یہ لائبریریاں اُردو کی تازہ اور جدید تصنیفات حاصل کر سکیں۔

بقیہ: بہار میں اُردو

بہار میں کچھ لوگ ہیں جو انفرادی طور پر اُردو کی ترقی اور اشاعت کی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ ان میں قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد، غلام سرور، بے تاب صدیقی، کلام حیدری، احمد فاطمی، شمس الہدیٰ آستانوی، شاہد رام نگری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مصنفین کی امداد و سرپرستی

پہلے تو بہار سرکار مصنفوں کو کوئی انعام نہیں دیتی تھی۔ لیکن شری ڈی کے بروا نے اپنی گورنری کے زمانے میں دس لاکھ سے ایک خاص فنڈ مصنفوں اور فنکاروں کی امداد کے لئے قائم کیا تھا۔ اس فنڈ سے کچھ لوگوں کو ماہانہ وظیفے مل رہے ہیں اور کچھ لوگوں کو یک مشت امداد بھی ملی ہے لیکن اعلیٰ تصنیفات پر حکومت کوئی انعام نہیں دیتی۔ اور نہ کسی کو کوئی اعزاز دیا گیا ہے۔

سرکاری دفاتر اور اُردو

سرکاری دفتروں سے اُردو کو انگریزوں کے عہد حکومت ہی میں دیس نکالا مل گیا تھا۔ مسٹر پولس مرحوم نے اپنی وزارت میں پٹنہ کمشنری میں اُردو کے سرکاری دفتروں میں استعمال کی اجازت دے دی تھی۔ لیکن کانگریس حکومت نے اسے بعد میں منسوخ کر دیا تھا۔ رجسٹری آفس کے علاوہ اور کسی دفتر میں اُردو کا استعمال نہیں ہے۔

محکمۂ تعلقات عامہ سے ایک پندرہ روزہ اُردو اخبار "بہار کی خبریں" شائع ہوتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر ہوش عظیم آبادی ہیں۔ اس محکمہ سے اخباروں کو اُردو میں خبریں بھی بھیجی جاتی ہیں۔ شری ڈی کے بروا نے اپنی گورنری کے زمانہ میں اردو اکیڈیمی قائم کی تھی۔ لیکن ایک سال سے زیادہ گزر جانے پر بھی اُردو اکیڈیمی نے چند اُردو مصنفوں اور شاعروں کو پانچ پانچ سو روپئے کی امداد دینے یا چند نشستوں کے انعقاد کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ مسٹر بروا نے اکیڈیمی کے قیام کے ساتھ تین لاکھ کے فنڈ کا اعلان بھی کیا تھا لیکن ۱۹۷۲ء میں اکیڈیمی کو صرف پچاس ہزار روپے کے لگ بھگ رقم ملی تھی۔ اس رقم سے اکیڈیمی کوئی مفید کام نہیں لے سکی۔

تجاویز

اُردو کی ترویج و اشاعت کے لئے سب سے پہلی ضرورت تو ابتدائی اُردو اسکولوں کی ہے۔ دوسری ضرورت کالج کی سطح کی کتابیں شائع کرنے کے لئے ایک اشاعتی ادارے کے قیام کی۔ لیکن سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اُردو زبان کو ملکی قانون میں دستوری تحفظ حاصل ہو۔ ●●

صلاح الدین پاشہ برقؔ

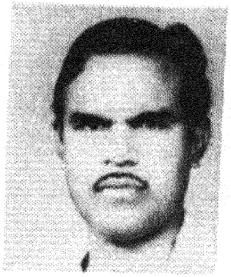

ایس ایم حیات پاشہ

حسرت سہروردی

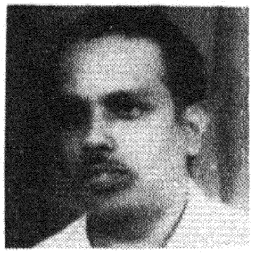

دانش فرازی

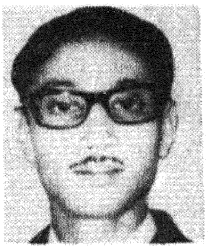

علیم صبا نویدی

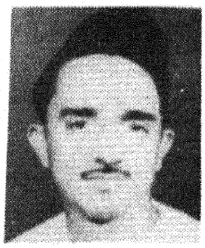

حیات مدراسی

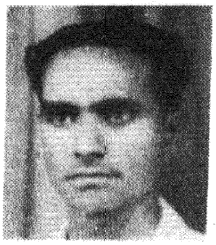

نورس خیامی

راز امتیاز

تمل ناڈو میں اُردو

کاوش بدری

تمل ناڈو کے ارباب فن نے ہر دور میں اپنے گلہائے فکر سے دامن اردو کو رشک فردوس بنایا ہے۔ مگر وقت کے نامعلوم نے انہیں اپنے اسلاف کے ادبی کارناموں سے اس قدر دور کر دیا ہے کہ آج اردو کے بیشتر نقاد اور ادیب حیرت سے پوچھتے ہیں کہ مدراس میں بھی اردو ہے؟

تمل ناڈو میں اردو روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ دکن کے دوسرے علاقوں کی۔ قطب شاہی دور سے یہاں آہستہ آہستہ اردو کا رواج شروع ہوا اور یہاں کی شاندار ادبی روایت ولی دکنی کے دور سے ملتی ہے جن کے معاصر ولی ویلوری تھے۔ موصوف کی دو ضخیم مثنویاں مشہور ہیں۔ ایک میں رتن سین اور پدمنی کا فسانہ مذکور ہے۔ دوسری میں واقعات کربلا ہیں۔ آخرالذکر کتاب کا نام "روضتہ الشہدا" ہے جو عالمگیر کی وفات کے دو سال بعد ۱۱۱۹ھ میں تصنیف ہوئی۔ یہ تصنیف غلطی سے ولی دکنی کی تصنیف مشہور ہو گئی تھی۔

اردو یا اس دور میں دکھنی کہلائی جانے والی زبان کو ادبی تخلیقات کے لئے سب سے پہلے استعمال کرنے والے مولانا مولوی باقر آگاہ ویلوری تھے۔ مولانا آگاہ کی بہت سی تصانیف، عربی، فارسی اور ہندی یا دکھنی اردو میں موجود ہیں۔

نواب کرناٹک غلام غوث خاں بہادر المتخلص بہ اعظم نے جو ایک صاحب طرز ادیب، جلیل القدر نقاد اور شیریں مقال شاعر تھے، ایک بزم مشاعرہ مدراس میں قائم کی تھی جس میں مدراس کے بڑے بڑے لائق و فائق ارباب سخن شامل ہوتے تھے۔

اعظم کے دور میں منشی حبیب اللہ ذکا مدراسی نے بحیثیت نقاد و شاعر مرزا غالب سے اپنا ادبی اور علمی لوہا منوایا تھا۔ ذکا کے ایک شعری دنثری مجموعہ "خلش و خماش" پر غالب کی تقریظ شامل ہے۔ غالب نے ذکا کو اپنے شاگرد سے زیادہ اپنا عزیز جان دوست بلکہ اس سے زیادہ اپنا ہم پلہ شاعر گردانا ہے۔

ذکا سے زیادہ اردو شاعری میں علی الخصوص صنف غزل میں شریف مدراسی نے غالب کے دوش بدوش اردو کی صالح روایت کو جدت و ندرت کے ساتھ ملحوظ رکھا۔

دیوان غالب کے جواب میں شریف مدراسی نے غالب کی تمام زمینوں میں ہم قافیہ و ہم ردیف غزلیں کہیں اور پورا کلام کتابی شکل میں شائع ہو کر مقبول ہوا۔ اس طرح غالب کے دیوان کا دوسرا جواب خود شریف ہی کے ایک ہونہار اور باکمال شاگرد نواب رؤوف احمد خاں ترقو (مصنف مثنوی حرز جاں) نے غالب کی ہر زمین میں غزلیں کہہ کر دیں۔ ترقو کا یہ دیوان بھی شائع ہو کر مقبول ہوا۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک کا زمانہ تمل ناڈو کی ادبی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں کے چند اہم ترین علاقوں کے ادبی کردار کا سرسری جائزہ لئے بغیر یہاں کی ادبی تاریخ واضح طور پر سامنے نہیں آسکتی۔

ترپاتور (شمال آرکاٹ) حضرت حکیم آسی ترپاتوری اور اتیم نے صنف غزل کے چودہ طبق روشن کئے۔

وانمباڑی میں گنڈو عبدالقادر شاکر وانمباڑی (مصنف "چندر بدن مہیار") بادشاہ انمبا ای، گھائل، فانی، اکبر اور مولانا عبدالباری حاوی تھے۔

آمبور میں منظور صدیقی، ماہر، ساغر، مقبول، روحی، فہیم اور قدیر نے غزل کی روایت کو بڑے دل آویز پیرائے میں باقی رکھا۔ (فہیم و لانا ناطق گلاوٹھوی کے حلقہ تلامذہ سے وابستہ تھے)

عمر آباد (نزد آمبور) دیکھنے میں یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے مگر کاکا گھرانے کا قائم کردہ مدرسہ جامعہ دارالسلام عمر آباد ایک عظیم عربی، فارسی اور اردو کالج کا مرتبہ رکھتا ہے۔ جہاں مولانا شاکر ناطقی (مرحوم) نے پرنسپل اور شیخ الادب کی حیثیت سے جنوبی ہند میں تقریباً وہی کام سر انجام دیا جو اعظم گڑھ میں شبلی نے کیا تھا۔

مولانا شاکر کے جریدے "مصحف" میں اعلیٰ شاعری اور نقد و نظر کے نمونے شامل ہوتے تھے۔

پیرنامبٹ میں علمی و ادبی مذاق پیدا کرنے میں این ایم انور (ایم اے ایل ٹی، ایم پی) حضرت مولانا محمد اسماعیل، محمد اسمٰعیل رفیعی اور نثار بھارتی کی خدمات بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

ویلور میں کئی نامی شعراء پیدا ہوئے جن میں سکیم ویلوری، قاسم ویلوری، مولانا امانی (پرنسپل منبع الانوار کالج لال پیٹ) مولانا صوفی کمالی ویلوری قابل ذکر ہیں۔ مولانا کمالی ویلوری کی افتاد طبع اور شعر کہنے کا انداز نظیر اکبر آبادی سے ملتا جلتا ہے۔

میل وشارم میں جناب الیس ایم جمیل نے بحیثیت صدر انجمن ترقی اردو اپنے رفیق کار اے احمد پادشاہ ایم اے (مالک کتاب گھر) کو ساتھ لے کر کئی عظیم الشان ادبی اجلاس اور مشاعرے منعقد کئے اور حضرت محوی صدیقی لکھنوی کو بہ اصرار میل وشارم مدعو کر کے برسوں اپنے پاس مہمان رکھا۔ حضرت محوی کے دوران قیام میل وشارم میں بڑی سازگار ادبی فضا نے جنم لیا۔

مدورا میں مولوی غلام حسین دلیل (امریکن مشن کالج مدورا) کی برکت

سے تملناڈو میں جدید فکری شاعری کا آغاز ہوا۔ اور وتیل کی معرکتہ الآرا طویل نظم "کائنات" اور "تحفۂ درویش" پر رشید احمد صدیقی اور حضرت مجنوں لکھنوی وغیرہم نے بہترین خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ترچناپلی صوبہ مدراس کا ایک اہم ترین علاقہ ہے جہاں علمی اور ادبی روایت کے جدید و قدیم نقوش کو اُجاگر کرنے میں نظر قلندر، مخلص، حسرت سہروردی ایم اے ایم ایس (پروفیسر اردو جمال محمد کالج ترچی) نے مؤثر اقدامات کئے ہیں۔ ترچناپلی میں آج سے ایک صدی پہلے بھی مرغوب، فرحت، مہر اور محترمہ عاجزہ وغیرہم نے شعری و ادبی فضا تخلیق کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا تھا۔

۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۰ء تک کی دہائی مدراس میں علمی و ادبی تاریخ میں نشاۃ الثانیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ قدیم دور میں مدرسۂ اعظم میں مولانا بحر العلوم فرنگی محلی کی علمی و ادبی خدمات کے بعد جدید دور میں گورنمنٹ آرٹس کالج (مرحوم محمڈن کالج) مدراس نے تملناڈو میں تقریباً وہی رول ادا کیا جو علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی نے ادا کیا ہے۔ اس کالج کے پرنسپل یا پائے اردو جنوبی ہند ڈاکٹر محمد عبدالحق (ڈی فل اکسن) تھے۔

ڈاکٹر حق کے ایک دوست اور مخیر تاجر مرحوم جناب حاجی جمال محمد اوتر بہادر نے ایک "مجلس خطبات اسلامیہ" کی بنیاد ڈالی جس کا عظیم مقصد یہ تھا کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو مذہب کے سائنسی، ثقافتی اور تاریخی پہلوؤں سے روشناس کرایا جائے۔ اس سلسلہ میں یہ ضروری سمجھا گیا کہ عالم و فاضل اصحاب کو مدراس مدعو کیا جائے، اُن سے مختلف تقاریر کرائی جائیں اور ان تقاریر کو کتابی صورت میں شائع بھی کیا جائے چنانچہ سب سے پہلے علامہ سید سلیمان ندوی کو مدعو کیا گیا جن کی تقاریر کا ترجمہ "خطبات مدراس" کے نام سے شائع ہوا۔ جنوری ۱۹۲۹ء میں علامہ سر محمد اقبال اسی سلسلہ میں مدراس تشریف فرما ہوئے اور اُن کی تقاریر کا مجموعہ بہ زبان انگریزی RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM کے نام سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر عبدالحق، شمس العلماء عبدالجبار اور مولانا رحیم احمد فاروقی وغیرہ کی ادارت میں ایک ماہنامہ "سفینہ" نکلتا تھا جس میں ہندوستان کے تقریباً تمام اکابرین علم و فن کی تخلیقات تعارف کے ساتھ شائع ہوتی تھیں۔

۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء کی دہائی تملناڈو کی ادبی، علمی اور شعری تاریخ میں ایک نئے باب کی شروعات ہے۔ ترقی پسند تحریک جب پورے ہندوستان میں عروج پر تھی تو اس وقت یہاں تملناڈو میں اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا کیونکہ اس وقت یہاں روایت کی جڑیں بہت سخت تھیں۔ شریف، شاطر، وتیل، پروفیسر غلام محی الدین اثر، حکیم آسی تریاتوری، کمالی ویلوری مولانا شاکر ناطقی اور مولانا رحیم احمد فاروقی آزاد کی وجہ سے فکری شاعری کا آغاز ہوئے چند ہی برس گزرے تھے۔ لیکن جب ترقی پسند تحریک ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں کمزور پڑنے لگی تو اس وقت تملناڈو کے چند ادیبوں اور شاعروں نے اُسے اپنایا۔ جن میں سب سے پہلے کاکا عبدالوہاب عظیم آبموری اور دانش فرازی شمالی آرکاٹ میں اور اس کے بعد مدراس میں ادیب بھارتی (مرحوم) راز امتیاز، حسرت سہروردی، فرحت کیفی اور کاوش بدری نے ترقی پسند رجحانات کو عام کیا۔ اسی گروپ نے بعد میں جدیدیت کی ترویج کی اور بعض نئے لکھنے والوں کو بھی دریافت کیا جن میں حضرت آتم کرنولی ساحل رشید اور عزیز تمنائی ہیں۔ اُن کے بعد ایڈوکیٹ صلاح الدین برق (معتمد حلقہ) ارباب ذوق (مدراس) حسن فیاض، فیاض حسین (ایڈوکیٹ) علی اکبر علیم صبا نویدی اور وہاب نازش وغیرہ کی بہت ہمت افزائی کی گئی۔

۱۹۵۹ء میں کاوش بدری اور حسرت سہروردی کی مشترکہ کوشش سے "مرکز ادب" کی بنیاد پڑی، جس کا مقصد یہ تھا کہ تملناڈو کے نمائندہ شاعر و ادیب کے منتخب فن پاروں کی کتابیں سیریز کی شکل میں شائع کی جائیں۔ اور ایک مجموعہ تملناڈو کے چند گنے چنے شاعروں کی غزلوں پر مشتمل "رنگ برنگ" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے بعد راز امتیاز اور کاوش بدری نے "مجلس مصنفین" کی بنیاد رکھی جس کے جنرل سکریٹری راز امتیاز کی جدوجہد سے تملناڈو میں جدید شعور کی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ مجلس کے تحت دانش فرازی کے قطعات کا مجموعہ "رگ سنگ" منظر عام پر آیا تو اس موقعہ پر صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے کاوش بدری کے نام ایک طویل خط میں جماعت سازی پر یوں اظہار رائے کیا

"مجھے شاعروں کے جتھے بنانا اچھا نہیں لگتا کہ یہ ترقی پسند ہے، یہ روایت پسند، یہ کچھ ہے وہ کچھ۔ سچ تو یہ ہے کہ "ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے"۔ شاعر کا اصل سرمایہ تو اس کے اپنے قلب و ذہن کی واردات ہیں۔ چاہے اُن کے محرک ذاتی، شخصی اسباب ہوں چاہے سماجی حالات، چاہے غم عشق ہو چاہے غم روزگار یا غم جاناں ہو یا غم دوراں! اور غم ہی پر کیا موقوف ہے کوئی دل کشا مسرت ہو کوئی جانفزا رنگ، کوئی

امید کوئی دیوانہ مگر ہو اپنا اور سچا اور وہ اس کیفیت کو سلیقہ سے دوسروں تک منتقل کر سکے۔ اور دوسروں پر اپنی کیفیت طاری کر سکے، انہیں اس کا شریک بنالے۔ "روایت پرست" اگر سنی سنائی روایتوں کے سہارے کام نکالتا ہے۔ جو اس کی جزو روح نہیں ہیں۔ (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) تو وہ نقالی کرتا ہے۔ شاعری نہیں۔ "ترقی پسند" اگر "ترقی اور انقلاب" کے مانگے ہوئے تصورات اور الفاظ اور نعرے لے کر اُدھار مال سے اپنی شاعری کا کاروبار چلاتا ہے (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) اور ان تصورات و افکار نے اس کے وجود داخلی کو ہیجو لے نہیں دیئے ہیں، جلایا تپایا نہیں ہے تو وہ نہ شاعر ہے نہ ترقی پسند۔

برزبانش گفتگو با مستعار۔ در دل او آرزو با مستعار!

"چونکہ اس طرح سوچتا ہوں اس لئے ہمیشہ چوکس رہتا ہوں کہ ان رائج الوقت تقسیموں اور اکھاڑ پچھاڑ بندیوں کو تسلیم کر کے اپنے دل و دماغ اور شاعر کے درمیانی راستے میں غیر ضروری رکاوٹیں تو نہیں پیدا کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھی اُردو زبان و ادب کے ذریعہ سچے شعر و ادب کی خدمت انجام دیتے رہیں گے۔"

اُردو بولنے والوں کی تعداد :۔ تمل ناڈو میں جہاں کی آبادی ۴ کروڑ کی ہے، جن میں تقریباً چار کروڑ عوام کی مادری زبان خالص تمل ہے۔ وہاں ۷ لاکھ ۵۹ ہزار ۶ سو نے اپنی مادری زبان اُردو لکھوائی ہے۔ اگر ایمان کی پوچھئے تو پندرہ لاکھ مسلمانوں کی مادری زبان اُردو ہوگی۔ ایسے لوگوں کی تعداد جن کی مادری زبان اُردو نہیں ہے لیکن جو اُردو بولتے ہیں، تقریباً ایک کروڑ سے زائد ہوگی۔ ان لوگوں میں تقریباً چالیس لاکھ لوگ اردو بولتے، لکھتے اور پڑھتے ہوں گے۔ مردم شماری کے دوران سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ ماں باپ نے بے خیالی میں اور بعض اُردو دشمن عناصر نے عمداً اُردو کی بجائے مادری زبان تمل لکھوادی ہے۔ شمالی آرکاٹ کے مسلمان بخوبی اُردو بول سکتے ہیں۔ گو پرانی روایات کے پیش نظر آپس میں (بوڑھے اور بوڑھیاں) تمل زبان ہی میں زیادہ گفتگو کرتے ہیں۔ مگر بچوں اور بچیوں کی طرف ان کا روئے سخن اُردو میں ہوتا ہے۔

آج تمل ناڈو میں ذیل کے تین علاقوں کی علاقائی زبان اُردو قرار دی گئی۔ مدراس ڈسٹرکٹ، نارتھ آرکاٹ ڈسٹرکٹ اور ترچناپلی ڈسٹرکٹ۔ ۱۹۵۱ء میں اُردو بولنے والوں کی تعداد تملناڈو میں ۶۸۱۶۲۶ تھی۔ اور ۱۹۶۱ء میں تقریباً ۱۵۵۳۶۱ تھی (یہ شمول ہندوستانی اور تو تو جو اُردو ہی کی ذیلی بولیاں ہیں) ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق اُردو مادری زبان والوں کی تعداد ۷۰۹۶۵۷ تھی۔ مگر اب اس کی رفتار ترقی رُک سی گئی ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ڈی ایم کے وزارت نے سہ لسانی فارمولے کو ختم کر کے دو لسانی فارمولہ رائج کر دیا ہے جس کے نفاذ سے اقلیتوں کے غریب طبقے کو اپنی مادری زبان میں تحصیل علم سے زیادہ ملازمتوں کی فکر لاحق ہوگئی ہے اور انہوں نے لامحالہ اُردو مدارس کو خیرباد کہتے ہوئے تمل مدرسوں میں داخلہ لینا شروع کر دیا جس کی وجہ سے درجنوں اُردو بوائز اینڈ گرلس ایلیمنٹری اور ہائی اسکولوں میں جہاں ہزاروں طلبا اُردو زبان پڑھتے تھے وہاں سو پچاس سے بھی کم طلبا نظر آنے لگے۔ اساتذۂ اُردو کا کام بھی اتنا گھٹ گیا کہ بعض لوگوں کی ملازمتیں بھی خطرے میں پڑ گئیں۔ تین تین کلاسوں کو ملا کر مجبوراً ایک کلاس بنانا پڑا۔ کو ئمبتور کے ایک ہائی اسکول کے اُردو منشی کو کام نہ ہونے کی وجہ سے چپراسی بنا دیا گیا۔ مگر بعد میں غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلہ میں عظیم الشان مشاعرہ منعقد کرنے پر چند بارسوخ افسروں اور ایک منسٹر کی سفارش سے ان کو دوبارہ منشی کی پوسٹ پر بحال کیا گیا۔ وہ دن دور نہیں جب ان استادوں کو کارپوریشن کے دفتروں میں کلرک بنا دیا جائے گا یا برطرف کر دیا جائے گا۔

دو لسانی فارمولہ کے تحت سرکاری مدارس میں پارٹ I میں علاقائی زبان یا مادری زبان سکھائی جاتی ہے۔ اور پارٹ II میں انگریزی یا کوئی غیر ملکی زبان (عربی و فارسی بھی شامل ہے) لیکن موجودہ سیاسی پالیسی اور معاشی حالات کچھ ایسے تلخ ہیں کہ وہ طلبا جن کی مادری زبان اُردو ہے، پارٹ I کے تحت اپنی مادری زبان اردو کی بجائے تمل پڑھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اور پارٹ II میں عربی فارسی کی بجائے لامحالہ بین الاقوامی زبان انگریزی کو ترجیح دینے لگے ہیں۔

تمل ناڈو کی ڈی ایم کے سرکار کے اس دو لسانی فارمولے کے خلاف سب سے پہلے آواز اٹھانے والا ادارہ مجلس مصنفین اُردو تمل ناڈو تھا۔

تعلیمی سہولتیں ریاست میں اب بھی کثیر تعداد میں میونسپل اور سرکاری ابتدائی، مڈل اور ثانوی اسکول ہیں جہاں اردو ذریعۂ تعلیم ہے۔ متعدد نجی ایلیمنٹری اور ہائی اسکول ہیں جہاں اردو ذریعۂ تعلیم ہے۔ ان کے علاوہ عربی فارسی اور اردو کے مدارس بھی موجود ہیں جو کروڑوں روپیوں کی وقف شدہ جائداد سے چلتے ہیں۔ مدراس سٹی میں کارپوریشن کے تحت بیس اردو ایلیمنٹری اسکولوں میں پانچویں درجے تک اردو اور انگریزی میں اسباق پڑھائے جاتے ہیں۔ تمل زبان ضمناً یہاں پڑھائی جاتی ہے۔ کارپوریشن اردو گرلس اسکول مدراس میں تقریباً انیس ہیں جہاں اردو ذریعۂ تعلیم ہے۔ مذکورہ چالیس اسکولوں میں آٹھویں درجے تک طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ کارپوریشن کی طرف سے ایک ہی ہائی اسکول ہے جہاں اردو ذریعۂ تعلیم ہے۔ مدراس سٹی میں صرف ایک ہی

گورنمنٹ ٹریننگ ایلیمنٹری اینڈ ہائی اسکول فار اردو بوائز ہے جہاں اردو ذریعۂ تعلیم ہے۔ ترچناپلی میں اسی قسم کا جونیئر ٹریننگ اسکول فار اردو گرلس تھا، بند ہو چکا ہے۔ مدراس میں صرف دو گورنمنٹ ہائی اسکول فار گرلس میں اردو ذریعۂ تعلیم ہے۔ مدراس سٹی میں کئی پرائیویٹ ہائی اسکول فار بوائز ہیں جہاں اردو ذریعۂ تعلیم ہے جن میں مدرسۂ مرتضویہ، مسلم ہائی اسکول (سی عبدالحکیم ٹرسٹ) اور یتیم خانہ وغیرہم قابلِ ذکر ہیں۔

مدراس کے مختلف علاقوں میں متعدد اسکول ہیں جہاں اردو ذریعۂ تعلیم ہے۔ ان میں اسلامیہ ہائی اسکول، وانمباڑی، مدرسۂ اعظم مدراس، اسلامیہ ہائی اسکول پیرزامبٹ، سی عبدالحکیم ہائی اسکول میل وشارم، مدرسۂ اشاعت الحسنات عرف چیاپا مدرسۂ نسواں آمبور، مدرسۂ مظہر العلوم ہائی اسکول اور مدرسۂ دینیات آمبور قابلِ ذکر ہیں۔

تملناڈ میں سات اہم ترین اردو عربی اور

اردو عربی، فارسی مدارس فارسی مدارس قائم ہیں جو تقریباً ایک سو سال سے علمی و ادبی خدمات سرانجام دے رہے ہیں جہاں بیرونی ممالک کے طلبا بھی اکتسابِ نور کرتے ہیں۔ ان مدارس میں بیشتر اساتذہ اعلیٰ شعری مذاق ہی نہیں رکھتے بلکہ ان میں چند اچھے ادیب اور شاعر بھی ہیں۔ یہ مدرسے منشی فاضل ادیب فاضل، مولوی اور افضل العلماء کی سند دیتے ہیں۔ ان میں دو چار مدرسوں کو ماہانہ تقریباً چالیس ہزار روپیوں کی آمدنی ہے اور ان میں طلبا کے مفت قیام اور کھانے پینے کا باقاعدہ انتظام ہے۔ طلبا پانچ یا سات سال کا کورس ختم کر کے یہاں سے فارغ ہوتے ہیں۔ ہر مدرسہ میں تقریباً تین چار سو طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان مدارس میں مدرسۂ جامعۂ دارالسلام عمرآباد، مدرسۂ باقیات الصالحات عربک کالج ویلور، مدرسۂ لطیفیہ المعروف بہ حضرت مکانی ویلور، جمالیہ عربک کالج مدراس، مدرسۂ محمدی المعروف بہ دیوان صاحب باغ مدراس، مدرسۂ منبع الانوار لال پیٹ، جامعۂ انوار العلوم ترچناپلی مشہور ہیں۔

تمل ناڈ میں تین یونیورسٹیاں ہیں۔ مدراس

یونیورسٹی اور کالج یونیورسٹی، مدورا یونیورسٹی جو ابھی حال میں قائم ہوئی ہے اور انا ملے یونیورسٹی۔ ان تینوں یونیورسٹیوں میں اردو موجود ہے۔ مدورا یونیورسٹی میں ہنوز اردو کا پروفیسر نہیں ہے۔ مدراس یونیورسٹی میں عربی فارسی اور اردو کا مشترکہ پروفیسر ہے۔ انا ملے یونیورسٹی میں اردو اور ہندی کا مشترکہ پروفیسر ہے۔ مشترکہ پروفیسر ہونے کی وجہ سے مذکورہ یونیورسٹیوں میں اردو کو زیادہ فروغ پانے کا موقع نہیں ملتا۔ اگر ان تینوں زبانوں کے علیحدہ علیحدہ شعبے قائم ہو جائیں تو ہر زبان میں تحقیقی کام کرنے کا موقع فراہم ہو سکتا ہے۔ ابھی تک مذکورہ یونیورسٹیوں میں ایم اے اردو کا درجہ نہیں۔ البتہ مدراس یونیورسٹی میں عربی ایم اے کا الحاق ہے۔ حضرت محوی کے زمانے میں اردو زبان و ادب پر بہت کام ہوا۔ کئی کتابیں اردو سے متعلق یونیورسٹی کے ذریعہ شائع ہوئیں۔ مولانا محمد یوسف کوکن کا تقرر جب شعبۂ عربی و فارسی کے لئے ہوا تو حضرت محوی کے تعاون سے کئی نایاب عربی اور اردو مخطوطات کو اردو زبان میں محفوظ کر لیا گیا اور انہیں کتابی شکل دی گئی۔ مدراس یونی ورسٹی میں تقریباً دس سالوں سے ایم لٹ یا پی ایچ ڈی (اردو) کے لئے کسی نے اپنا نام درج نہیں کرایا۔ صرف نظر قلندر حسرت سہروردی نے ۱۹۶۰ء میں بزبان اُردو ایم لٹ کیا ہے موصوف کو پی ایچ ڈی کرنے کا موقع مدراس یونی ورسٹی سے اس لئے نہیں مل رہا ہے کہ صدر شعبہ پی ایچ ڈی نہیں ہیں۔ مدراس یونی ورسٹی کے اُردو ڈپارٹمنٹ میں کوئی لکچرر اُردو زبان و ادب میں ڈگری یافتہ نہیں ہے۔ عربی اور فارسی کے سند یافتہ لوگوں سے اُردو کا کام لیا جا رہا ہے۔

یہاں کے کالج ذیل میں تمل ناڈ کے ان کالجوں کے نام درج ہیں جہاں اُردو زبان پارٹ I کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے (۱) ایس آئی ٹی کالج فار وومن مدراس جس کے بانی اور سرپرست جسٹس بشیر احمد سعید ہیں۔ (۲) کوئین میریز کالج فار وومن شہر مدراس کا قدیم تاریخی ادارہ ہے (۳) گورنمنٹ آرٹس کالج مدراس (مرحوم محمڈن کالج) (۵) پریسیڈنسی کالج۔ مدراس (۶) نیو کالج مدراس۔ یہ مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کے تحت چلنے والا عظیم ادارہ ہے۔ یہاں ایسے اساتذہ کی خاصی تعداد ہے جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ اس کالج میں اسلامک سیمینری قائم ہے اور ٹی عبدالواحد ایجوکیشنل ٹرسٹ کی جانب سے ایکسٹینشن لکچرز کا انتظام بھی ہے۔ جس کے تحت مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا سعید اکبرآبادی وغیرہ تشریف لا چکے ہیں۔ اس کالج کے آل انڈیا مشاعرے بھی مشہور ہیں۔ کالج میں چار ہزار سے زیادہ طلبا ہیں۔ اُردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے اس کالج میں پروفیسر حامد صدیقی اور پروفیسر سید عباس صاحب کی مساعی جمیلہ سے ادارۂ ترقی اُردو بھی قائم ہے (۷) جمال محمد کالج ترچناپلی میں تقریباً تین ہزار سے زیادہ طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ تقریباً ۱۵۰ لکچرر ایسے ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ پروفیسر حسرت سہروردی ایم لٹ صدر شعبۂ اُردو ہیں (۸) مقید شاہ وقف بورڈ کالج مدورا (۹) اسلامیہ کالج وانمباڑی (۱۰) مظہر العلوم کالج آمبور (۱۱) گورنمنٹ آرٹس کالج کڈلور (۱۲) گورنمنٹ آرٹس کالج ویلور (۱۳) سی عبدالحکیم کالج میل وشارم۔ ان تیرہ کالجوں میں تقریباً سترہ ہزار طلبا سے زیادہ

تعلیم حاصل کرتے ہیں جن میں تقریباً ۵ پانچ ہزار سے زیادہ طلبا کی مادری زبان اُردو ہے جو یو پی اور ڈگری کلاسوں میں اُردو کو پارٹ آ کی حیثیت سے پڑھتے ہیں۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ مدراس یونیورسٹی میں اُردو ایم اے نہ ہونے کی وجہ سے ان کالجوں کے لئے اُردو اساتذہ کا ملنا دشوار ہے۔

اُردو اخبارات و رسائل:- تمل ناڈو میں صرف دو اُردو روزنامے ہیں۔ ایک روزنامہ "مسلمان" ہے جو ۱۹۲۷ء سے باقاعدہ جاری ہے۔ جس کے مدیر عبداللطیف فاروقی ہیں۔ جنگ آزادی کے دوران موصوف کی سیاسی خدمات کے صلے میں مرکزی حکومت نے حال ہی میں دو سو روپیوں کے وظیفہ سے نوازا ہے۔ اس روزنامے کی اشاعت تقریباً پانچ ہزار ہے۔ دوسرا روزنامہ "اتحاد" ہے جو تقریباً ایک سو سال سے ہفتہ وار کی شکل میں جاری تھا۔ حال ہی میں یہ ہفتہ وار روزنامہ بن گیا ہے۔ اس کی اشاعت تقریباً دو ہزار ہے۔ ۱۹۵۱ء کی دہائی میں یہاں بے شمار ہفتہ وار نکلے، جن میں "شرر"، "مشیر"، "فانوس"، "افکار"، "آزاد"، "مزدور"، "زندگی"، "آزاد نوجوان"، "سرکار"، "زمانہ"، "اتحاد"، وغیرہ ہیں۔ ۱۹۶۱ء کی دہائی میں، "پیام جنوب"، "سفیر ہند" (پندرہ روزہ) "امام"، "پاکیزہ"، "سنجمہ"، "ہم نشین"، "اتحاد"، "قلم دیش"، "ہم سفر"، "تمل ناڈو ٹائمز"، "مبین"، "مسلم رپورٹ"، "رفیق ملت" وغیرہ تھے۔ ۱۹۷۱ء میں مذکورہ ہفتہ واروں میں صرف "مبین"، "تمل ناڈو ٹائمز"، "رفیق ملت"، "مسلم رپورٹ" اور "آزاد نوجوان" ہی باقی رہ گئے ہیں۔ "مبین" اور "تمل ناڈو ٹائمز" ہی ان پانچوں ہفتہ واروں میں باقاعدہ جاری ہیں۔ ان ہفتہ واروں کی تعداد اشاعت ایک ہزار ہے۔ ماہناموں میں ۱۹۵۱ء کی دہائی میں "پیغام"، "فلستان"، "مشعل"، "فن کار" اور "منزل" نکلتے رہے۔ ۱۹۶۱ء کی دہائی میں "جل ترنگ"، "آب و تاب"، اور "ساون" نکلے۔ ان ماہناموں کی اشاعت بھی تقریباً ایک ہزار تھی۔ دائمنا ڈی سے ایک اُردو ڈائجسٹ "خاکا" اجرا اسی ماہ سے ہوا ہے جس کے مدیر ملک العزیز ہیں۔ مذکورہ بالا کالج اور پرائیوٹ مدارس سے بڑے شاندار سالنامے نکلتے ہیں۔ ان سالناموں میں "جمالی"، "اللطیف"، "دارالسلام"، "سفیر"، "آئینہ ایام"، اور "الباقیات" قابل ذکر ہیں۔

تمل ناڈو میں تقریباً ڈھائی سو شعراء ہیں۔

علمی و ادبی سرگرمیاں:- جن کی ایک خاصی تعداد مقامی مشاعروں میں حصہ لیتی ہے۔ جنوب اور خصوصاً مدراس سے نکلنے والے مقامی رسائل میں بھی ان میں سے بعض لوگ چھپتے ہیں۔ ان میں بعض شعراء صرف تمل ناڈو کے اُردو ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں بلکہ ان میں سے چند ملک بھر میں مشہور ہیں۔ جن کی شعری و نثری تخلیقات ہندوپاک کے جدید و قدیم معیاری رسائل میں شائع ہوتی ہیں۔ ان میں بعض لوگوں کی شعری تخلیقات مجموعوں کی شکل میں شائع ہو چکی ہیں جن پر قدآور نقادوں اور شاعروں کے تبصرے متعدد رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔

فہرست شہرائے جدید:- تمل ناڈو کے جدید شعراء میں دانش فراز، فرحت کیفی، عزیز تمنائی، حسرت سہروردی، ساحل رشید، ادیب بھارتی (مرحوم)، کمالی دیلوری، راجی صدیقی، آتم کرنولی، عبدمدراسی، بدر جمالی، نورس خیامی، ہلالی جہانگیر، تمنا یوسفی، حیات مدراسی، حسن فیاض، اور علیم صبا نویدی قابل ذکر ہیں۔ ان شعراء میں دانش فراز کے تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نورس خیامی کا شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے عزیز تمنائی کے سانٹوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے کاوش بدری کی ایک طویل مثنوی اور مسدس کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ حسرت سہروردی کا عظیم تمل شاعر ترووتور کی منظوم تمل تصنیف "کرل" کا اُردو ترجمہ ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ حسرت سہروردی کا زیر اشاعت شعری مجموعہ "لوئے گل نالۂ دل" ہے۔ اسمٰعیل رفیعی نے ٹی ایس ایلیٹ کی چند نظموں کے منظوم تراجم کئے ہیں جن میں "چند شب خون" (ماہنامہ الہ آباد) میں شائع ہو چکے ہیں۔ "عصری ادب" کے ایک شمارہ میں ڈاکٹر محمد حسن نے راز امتیاز کا مناسب تعارف کرایا ہے جدید صنف ترائیلے میں فرحت کیفی کے تقریباً دو سو ترائیلوں کا مجموعہ زیر اشاعت ہے۔ مذکورہ شعراء میں چند کی جدید غزلوں اور جدید نظموں کے مجموعے زیر طبع ہیں۔

افسانہ نگار:- یہاں پچھلے دو تین برسوں میں کئی جدید افسانہ نگار اور شاعر اُبھرے ہیں۔ افسانہ نگاروں میں ایس ایم حیات بادشاہ، ادیب بھارتی، راز امتیاز، علی اکبر آمبوری، مہر طاعت علیم صبا نویدی، حسن فیاض، فضل جاوید، انور ربانی، رشید مدراسی (ایڈوکیٹ)، صلاح الدین پاشہ برق (معتمد حلقۂ ارباب ذوق) فیاض حسینی (ایڈوکیٹ) قابل ذکر ہیں۔ صلاح الدین برق جنوب میں خلیل جبران کے بارے میں حرف آخر مانے جاتے ہیں۔ موصوف کے کئی منظوم اور نثری تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ مذکورہ افسانہ نگاروں میں علی اکبر، علیم صبا نویدی، حسن فیاض، فضل جاوید، رشید مدراسی کے افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ حسرت سہروردی، اور ایس ایم حیات بادشاہ نے شاہکار تمل افسانوں کے ترجمے کئے ہیں۔

نثر نگار: نثر نگاروں میں پروفیسر محمد یوسف کوکن عمری، پروفیسر فضل اللہ، سید محمد یوشع، حمزہ حسینی، راز امتیاز، اسمٰعیل رفیعی، دانش فرازی، حسرت سہروردی۔ اور کاوش بدری قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر کوکن کی متعدد تحقیقی و تاریخی و ادبی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ حمزہ حسینی، پروفیسر فضل اللہ اور محمد یوشع کی کتابیں بھی تاریخی و ادبی موضوعات پر شائع ہو چکی ہیں۔

تنقید نگار: تنقیدی مقالات لکھنے والوں میں اسمٰعیل رفیعی، راز امتیاز، دانش فرازی، اور کاوش بدری ہیں۔

ادبی انجمنیں تملناڈو میں ان گنت اردو ادبی انجمنیں ہیں تملناڈو میں "مجلس مصنفین اردو" کے ذریعے یہاں پر تنقیدی شعور عام ہوا۔ اور جدید نظم اور جدید غزل کی طرف جھکاؤ پیدا ہوا۔ مذکورہ مجلس کے جنرل سکریٹری راز امتیاز اور ناظم نشر و اشاعت راقم الحروف ہیں۔ اس مجلس کے تحت تین منظوم تصنیفات شائع ہو چکی ہیں۔ "حلقۂ اربابِ ذوق جدید افسانہ نگاروں اور شاعروں کی انجمن ہے جس کے معتمد صلاح الدین برق ہیں اور راقم الحروف اور راز امتیاز وائس پریذیڈنٹ ہیں۔" اے جے اردو سیمینار" نے مدراس میں کئی عظیم الشان کل ہند مشاعرے منعقد کئے۔ اس ادارے سے پروفیسر عبدالوہاب بخاری اور پروفیسر حیدر علی خاں حیدر وابستہ ہیں۔ "اردو ایسوسی ایشن" کے ذریعہ مخصوص نشستوں کا اہتمام ہوتا ہے اس کے جنرل سیکریٹری راجی صدیقی ہیں۔ مذکورہ انجمنوں کے علاوہ شہر مدراس میں "اردو انجمن" BLOCHING LITERARY SOCIETY "بزم شبگونہ" "تمل ناڈو پبلیکیشن" "فردوس ادب" "حلقۂ ادب" "محفل ادب" "کرسنٹ سوسائٹی" "بزم راغب" "بزم سخن" "انجمن شعرائے اہل بیت" وغیرہ موجود ہیں۔ پنجابی ایسوسی ایشن مدراس کی جانب سے کل ہند بیجا کے پر عظیم الشان مشاعرے ہوتے ہیں۔ ان مشاعروں کے ذریعہ لاکھوں روپوں کا سرمایہ اکٹھا ہوا جو پنجابی اسکول کے لئے صرف کیا جاتا ہے جس میں اردو کی بجائے ہندی پڑھائی جاتی ہے۔

کتب خانے تمل ناڈو میں متعدد اہم کتب خانے ہیں۔ مولانا محمد غوث شرف الملک مرحوم کے ورثا کے یہاں جو مدراس ویلان صاحب کے باغ میں مقیم ہیں، علوم و فنون کی عربی فارسی اور اردو کتابوں کا ایک انوکھا اور بے مثال ذخیرہ موجود ہے یہاں بھی میں حیدرآباد اور دوسرے مقامات کو چھوڑ کر صرف مدراس کی کتابوں کو شمار کرنا شروع کیا گیا ہے تاحال ۲۹۴۷۱ کتابیں شمار ہوئی ہیں۔ ان میں پندرہ ہزار سے زیادہ کتابیں قلمی ہیں۔ یہ "امانتی لائبریری" کے نام سے موسوم ہے۔ اس طرح مدرسۂ جامعۂ دارالسلام عمرآباد، مدرسۂ باقیات الصالحات، مدرسہ لطیفیہ (حضرت مکانی ویلور) مدرسۂ مظہر العلوم ہائی اسکول آمبور میں ہزاروں کتابیں عربی فارسی اور اردو کی موجود ہیں۔ کتب خانۂ عام اہل اسلام مدراس میں بھی بڑی نایاب کتابیں موجود ہیں (لاگ بھاگ تیس ہزار)۔ ہزاروں روپوں کی آمدنی ہر ماہ اس لائبریری کو حاصل ہے مگر عرصۂ دراز سے ایک نئی کتاب بھی نظر نہیں آتی۔ فہرست میں بہت ساری نایاب کتابوں کے نام درج ہیں جو الماریوں سے غائب ہیں۔ خصوصاً ریکارڈ آفس مدراس میں ہزاروں کتابیں عربی فارسی اور اردو کی محفوظ ہیں۔ مگر مدراس یونی ورسٹی لائبریری میں جدید کتابوں کا فقدان ہے۔ تملناڈو کے مختلف اضلاع میں ان گنت لائبریریاں ہیں۔ جہاں کم و بیش کئی چار لاکھ اردو کی کتابیں ہوں گی۔ جمال محمد کالج ترچناپلی اور فلاح ملت فیڈریشن آمبور میں قدیم و جدید کتب کا ایک انبار موجود ہے۔ گورنمنٹ اورینٹل سنسکرت لائبریری مدراس میں بھی اردو کی بڑی نایاب کتابیں ہیں۔

ریاستی سرکار کی جانب سے اردو کی سرپرستی نہ کبھی تھی نہ اب ہے۔ یہاں نہ کسی کو اعلیٰ اردو تصنیفات پر کوئی انعام ملتا ہے اور نہ کسی کو کوئی اعزازیہ ہی نصیب ہوا ہے۔ حالانکہ تمل زبان کے بعد یہاں ریاست بھر میں کثیر تعداد میں بولی جانے والی زبان اردو ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ آل انڈیا ریڈیو مدراس میں جہاں ہندی، تلگو، ملیالم وغیرہ کے شعبے موجود ہیں۔ اردو کا نام و نشان تک نہیں۔ اس کے برعکس وجے واڑہ (اے پی) میں تملناڈو سے بھی بڑے ۵۰ کم اردو بولنے والے ہیں مگر وہاں کے ریڈیو اسٹیشن سے "نورس" کے نام سے علمی ادبی و شعری پروگرام براڈ کاسٹ ہوتا رہتا ہے۔ یہاں کے کسی محکمے میں جزوی یا کلی طور پر اردو میں کام کاج نہیں ہوتا۔ خود مدراس یونی ورسٹی میں اردو سے زیادہ عربی اور فارسی پر کام ہو رہا ہے۔ یہاں ریاست کی جانب سے کوئی رسالہ اردو میں نہیں نکلتا۔ یہاں اردو اکاڈمی کا وجود نہیں ہے اور انجمن ترقی اردو کی شاخ بھی کبھی کبھی بند ہو گئی۔

کیرلہ میں اردو تملناڈو میں اردو کی رفتار کا جائزہ لینے کے بعد مختصراً کیرلہ میں اردو کی پوزیشن پر روشنی ڈالنا نہایت ضروری ہے۔ چونکہ مدراس سے پہلے عربوں کے قدم کیرلہ میں پہنچے تھے اور وہاں کی زبان ملیالم کے عربی زبان سے سنجوگ ہونے سے یقیناً ایک ایسی زبان نے جنم لیا گیا۔ جو قریب قریب اردو سے ملتی جلتی رہی ہوگی۔ اگر اس زبان کو وہاں پہنچنے کا موقع شروع سے ملا ہوتا تو

آج اُردو کا معیار وہاں تمام ریاستوں سے بلند رہا ہوتا۔ کیرلہ کے باشندوں کی مادری زبان ملیالم ہے۔ اُردو یہاں بیرونی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ مسلمان جن کی مادری زبان اُردو ہے پٹھانی کہلاتے ہیں۔ ان لوگوں کی تعداد بھی آٹے میں نمک کے مترادف ہے۔ عربی چونکہ مسلمانوں کی مذہبی اور مقبول زبان ہے اس لئے بڑے یا اس سے زیادہ ملیالی مسلمان طلباء عربی زبان کو سیکنڈ لینگویج کی حیثیت سے پڑھنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ کیرلہ کے مختلف علاقوں میں جملہ سات [illegible] اسکول ایسے ہیں جن میں سیکنڈ لینگویج کی حیثیت سے اُردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔ ایک دو طالب علم بھولے بھٹکے مسافر کی طرح اُردو کی طرف بھی آنکلتے ہیں اُردو لینے میں ایک زبردست رکاوٹ اور دشواری یہ ہے کہ پری ڈگری PRE-DEGREE کورس ختم کرکے ڈگری کورس میں انہیں اُردو کو خیرباد کہہ کر دوسری زبان بدلنی پڑتی ہے۔ اس لئے طلباء کالج میں داخلہ لیتے وقت اُردو سے اجتناب کرتے ہیں۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے فوری کارروائی کی ضرورت تھی۔ لہٰذا محمد حسین شاکر ایم اے صدر شعبۂ اُردو گورنمنٹ برنن کالج تلچیری (کیرلہ) نے ڈائرکٹر آف کولجیٹ ایجوکیشن کے نام درخواست بھیجی کہ ڈگری کورس میں اُردو کو داخل کیا جائے پھر عمائدین کیرلہ کے چند لوگوں سے جو اُردو کے بہی خواہ تھے مدد حاصل کی۔ بالآخر ۱۹۵۰ء سے اُردو کو ڈگری کورس میں داخل کر دیا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں لسانی بنیاد پر جب صوبوں کی تقسیم ہوئی اور ملابار کو صوبۂ مدراس سے الگ کرکے کیرالہ میں ضم کر دیا گیا۔ تو کیرلہ کی جانب سے اُردو کے امتحان کا انتظام بھی نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ متعدد مقامات پر مدارس میں اُردو ختم ہوگئی۔ ۱۹۵۷ء میں پبلک اور مختلف انجمنوں اور اداروں کی جانب سے حکومت کیرلہ کی خدمت میں کئی محضر بھیجے گئے اور اُن میں اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ جس طرح عربی سنسکرت اور دیگر زبانوں میں اساتذہ کی فراہمی کا انتظام ہوتا ہے۔ اسی طرح اُردو LOWER اور HIGHER میں بھی اُردو اساتذہ کی فراہمی کا انتظام ہو۔ تقریباً تیرہ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد حکومت کیرلہ نے ۱۹۷۱ء سے اُردو LOWER اور HIGHER امتحانات منعقد کرنے کا اعلان کر دیا اور تقریباً دو سالوں سے یہ دونوں امتحانات ہونے لگے ہیں۔ کیرالہ یونی ورسٹی سے یہ درخواست بھی کی گئی کہ افضل العلماء اور دوسرے امتحانات کی طرح اُردو کے ادیب فاضل امتحانات کا انتظام بھی کیا جائے تاکہ اعلیٰ ثانوی مدارس میں اُردو پروفیسروں کی فراہمی کا مسئلہ حل ہو سکے۔ خدا خدا کرکے ۱۹۶۶ء سے ادیب فاضل کے امتحانات کی اجازت مل گئی۔ ۱۹۵۷ء سے بی اے میں اُردو شامل ہو جانے کے بعد اُردو کے بہی خواہوں کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ حکومت اس زبان کو مضمون اختیاری کی حیثیت سے بھی پڑھانے کا انتظام کرے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بھی کامیابی حاصل ہوگئی۔ اور ۱۹۶۸ء سے گورنمنٹ برنن کالج میں اُردو بھی مضمون اختیاری کی حیثیت سے پڑھائی جا رہی ہے ۷۴-۱۹۷۳ء کے تعلیمی سال سے گورنمنٹ نے برنن کالج میں اُردو پوسٹ گریجویٹ کورس جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کورس کے الحاق کے لئے کالی کٹ یونی ورسٹی سے درخواست کی گئی ہے۔ اُردو زبان و ادب کو کیرلہ میں نئی زندگی عطا کرنے والی شخصیت پروفیسر محمد حسین شاکر ایم اے کی ہے۔ جن کی مساعی جمیلہ کا یہ نتیجہ ہے کہ کیرلہ میں طلباء کو اُردو سے کافی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ موصوف کی کوشش سے عنقریب کیرلہ میں آل انڈیا اُردو کانفرنس کا انعقاد بھی عمل میں آنے والا ہے۔

تجاویز:

۱۔ ریاستی حکومت اور ساہتیہ اکاڈمی کی ریاستی شاخ کی جانب سے تمل ناڈو اور کیرلہ کے معیاری اُردو ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں پر انعامات، وظیفے اور دوسرے ایوارڈ دیئے جائیں۔

۲۔ تمل ناڈو اور کیرلہ کی یونی ورسٹیوں میں شعبۂ اُردو قائم کیا جائے۔ مدراس یونی ورسٹی میں تاحال عربی، فارسی اور اُردو کا ایک ہی مشترکہ شعبہ ہے لہٰذا تینوں شعبوں کو علیحدہ کرکے ان کے لئے علیحدہ علیحدہ صدر شعبہ مقرر کئے جائیں۔

۳۔ آل انڈیا ریڈیو مدراس، ترچناپلی وغیرہ سے روزانہ مقامی خبریں، دیہاتیوں اور کسانوں کے خصوصی پروگرام اُردو میں بھی نشر کرائے جائیں۔ ہفتہ وار اُردو ادبی پروگرام کا آغاز کرکے اس کے وقت میں مزید توسیع کرائی جائے۔

۴۔ تمل ناڈو محکمۂ اطلاعات کی جانب سے ایک ماہنامہ اُردو میں شائع کرایا جائے جیسے ہریانہ، یوپی، آندھرا وغیرہ میں ہو رہا ہے اور اُردو اخباروں کے لئے ریاستی خبروں کو اُردو میں ترجمہ کرکے فراہم کیا جائے۔

۵۔ دونوں ریاستی حکومتوں کا جو کلچرل ڈپارٹمنٹ ہے اس میں ابتک اُردو اقلیت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس ڈپارٹمنٹ کی جانب سے کرائے جانے والے ثقافتی پروگراموں میں اُردو والوں کو بھی شریک کیا جائے۔

(بقیہ صفحہ ۴۹ پر)

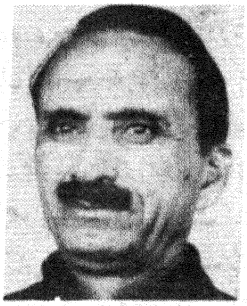

بسمل سعیدی

منظور الحسن برکاتی

محمد علی زیدی

محمور سعیدی

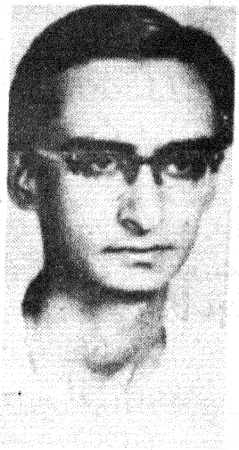

احتشام اختر

کلیم الدین تجلی عثمانی

ممتاز راشد

دل ایوبی

محمد عثمان عارف بیکانیری

راہی شاہجہانی

راجستھان میں اُردو

ابوالفیض عثمانی

راجستھان میں مغلیہ حکومت کے زوال کے زمانے تک اگرچہ اُردو کو عام مقبولیت حاصل نہیں ہوئی تھی تاہم اس کی ترقی کے لئے زمین ہموار ہو چکی تھی چنانچہ اٹھارویں صدی عیسوی میں راجپوتانہ کی مختلف ریاستوں کے حکمرانوں نے سلاطینِ مغلیہ سے اپنے مراسم ختم کر کے انگریزوں کے ساتھ تعلقات قائم کئے اور آہستہ آہستہ انہوں نے باقاعدہ انگریزی حکومت سے عہد و پیمان کئے[1] اس کے نتیجہ ملازمت اور تلاشِ معاش کے سلسلے میں اہلِ علم و فضل یہاں پہنچنے لگے۔ اس کے علاوہ دہلی کی تباہی اور رات دن کی لوٹ مار سے پریشان ہو کر بہت سے اربابِ علم و فن وطن کو خیرباد کہہ کر اس خطے میں بھی پہنچے چنانچہ میر تقی میر اور ان کے صاحبزادے میر فیض علی تقریباً گیارہ سال نواحِ بھرت پور میں رہے[2] میر کے ایک شاگرد مرزا اکبر علی بیگ گل جو صاحبِ دیوان تھے اور چند دوسرے شعرا نے جے پور کو مسکن بنایا[3] گل کا جے پور ہی میں انتقال ہوا[4] اسی زمانہ میں حکیم دان دی سلوا فطرت (۱۸۰۲ء تا ۱۸۴۵ء)[5] اور خیراتی خاں دلسوز شاگردِ شاہ نصیر دہلوی[6] جے پور پہنچ چکے تھے۔ اسی طرح الور میں خواجہ بدرالدین خاں امان مترجم "بوستانِ خیال" اور اُن کے صاحبزادے خواجہ قمرالدین خاں راقم تلمیذِ مرزا غالب[7]، اجمیر میں مخزن الشعرا میر نظام الدین ممنون[8] بھرت پور میں دیوان جانی، بہاری لال راضی مصنفِ "تعریفِ بیانِ فارسی" ۱۸۴۰ء (وغیرہ) اور ٹونک میں حکیم الہند مولانا برکات احمد، مولانا نظام الدین مانک پوری اور مولانا فضل اللہ، مولانا حیدر علی امیہوری اور منشی بساون لال شاداں (مصنفِ امیر نامہ) وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس طرح جے پور، اجمیر، ٹونک، الور، بھرت پور اور بیکانیر وغیرہ میں ۱۸۵۷ء سے اُردو کے شعر اور ادب کی موجودگی کی وجہ سے شعر و ادب اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور بلاتفریقِ مذہب و ملت اہلِ علم چمنِ اردو کی آبیاری کر رہے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ریاستوں کے دفاتر میں بھی کہیں کہیں اُردو کا استعمال کیا جانے لگا۔ چنانچہ ریاستِ جے پور کی قدیم ترین سرکاری اردو تحریر ۱۸۲۵ء کی پائی جاتی ہے[9]

۱۸۳۲ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگریزی حکومت نے اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا تو دیسی ریاستوں کے حکمرانوں نے بھی ان کی پیروی میں باقاعدہ طور پر اپنے دفاتر میں اُردو کا استعمال جاری کرایا اور اپنی ریاستوں کے قوانین اردو میں شائع کرائے۔ مثال کے طور پر ریاست جے پور کا "مجموعہ قوانینِ عدالت دیوانی و فوجداری" اسی ریاست کے مطبع میں ۱۸۴۳ء میں شائع ہوا تھا[10] اسی طرح مہاراجہ بلونت سنگھ ۱۸۵۳ء تا ۱۹۲۵ء کے عہد سے ریاستِ بھرتپور کے دفاتر میں اُردو کا استعمال شروع ہوا اور اسی زمانے میں ریاست الور اور ریاست مارواڑ میں بھی اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوا[11] اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہونے کی وجہ سے اس کی ترقی اور نشوونما پر خوشگوار اثر پڑا۔ مختلف ریاستوں میں سرکاری سطح پر اُردو کے پریس قائم کئے گئے جن میں عام طور پر ریاست کے قوانین وغیرہ شائع کئے جاتے تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد دہلی، لکھنؤ اور دیگر مقامات کے بہت سے اربابِ علم و فضل مختلف ریاستوں میں پہنچے جن میں الور، جے پور، ٹونک، بھرت پور، کوٹہ، جھالاواڑ، جودھپور، بیکانیر اور اجمیر کمشنری کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ والیانِ ریاست نے ان کو نوازا کر نہ صرف فکرِ معاش سے آزاد کر دیا بلکہ ان کو اپنے درباروں سے وابستہ کرنے میں فخر بھی محسوس کیا۔ ذہنی سکون حاصل ہونے پر ان حضرات نے اپنے فضل و کمال کے جوہر دکھائے اور دہلی، لکھنؤ کی ادبی فضاؤں کی جھلک دیسی ریاستوں میں نظر آنے لگی۔

جے پور ہی میں ۱۸۷۰ء میں مولانا سلیم الدین تسلیم کے زیرِ صدارت بزمِ ادب کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی گئی۔ اس کے زیرِ اہتمام ہر ماہ پابندی کے ساتھ طرحی مشاعرے منعقد کئے جاتے تھے۔ اس بزم کے ۱۸۷۲ء سے ۱۸۷۴ء تک کے پچیس مشاعروں کا گلدستہ "فرحت الشعرا" منشی کندن منشی نے مرتب کیا تھا[12] جے پور کے مشاعروں کا یہ پہلا مجموعہ کہا جا سکتا ہے[13] اسی قسم کی ادبی انجمنیں ٹونک اور اجمیر میں بھی قائم کی گئیں[14] مذکورہ شدہ مختلف مقامات پر اس قسم کی انجمنیں قائم کی جانے لگیں۔ جے پور میں علمی و ادبی چرچے

---

[1] تفصیل کے لئے انجمن ترقی اردو جلد چہارم (متعلقہ راجپوتانہ) ملاحظہ فرمایئے۔
[2] ذکرِ میر ص ۹
[3] دیوان گل کا اصل نسخہ (قلمی) کتب خانہ شاغل جے پور میں محفوظ ہے۔
[4] تذکرۂ شعرائے جے پور ص ۲۲۵
[5] یورپین اور انڈو یورپین شعرائے فارسی و اردو ص ۱۵۵
[6] سخنِ شعرا مرتبہ عبدالغفور نساخ ۱۹۶۳ء ص ۱۶۲
[7] مخزنہ جاوید جلد سوم ص ۳۵۵
[8] دلی کا دبستانِ شاعری ص ۲۶۶
[9] ماہنامہ "زمانہ" کانپور ستمبر ۱۹۴۳ء ص ۲۶۳
[10] ایک نسخہ راقم کے پاس موجود ہے۔
[11] روداد اردو سیمینار جودھپور ص ۱۱۷ [12] تذکرہ شعرائے جے پور ص ۶
[13] اصل مخطوطہ کتب خانہ شاغل جے پور میں محفوظ ہے۔

اتنے بڑھ گئے تھے کہ مولانا عبدالحق نے لکھا ہے کہ لوگ جے پور کو چھوٹی دلی کہا کرتے تھے لیکن یہی حال خاص طور پر ٹونک اور الور کا تھا۔ اسی زمانے کے الور کے ایک شاعر بیدلال شہرت نے ایک شعر کہا تھا ؎

شور ہے شعر و سخن کا ہر طرف ان دنوں الور جہان آباد ہے

اسی طرح تقریباً ہر مقام پر جہاں اردو کا رواج رہا نہ صرف باہر سے آئے ہوئے بلکہ بے شمار مقامی حضرات نے راجستھان میں اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں اپنی تخلیقات کے ذریعہ نمایاں حصہ لیا شعر و ادب کی محفلیں منعقد کیں۔ ادب، فلسفہ، مذہب، طب، نجوم، معاشرت، معاشیات، اقتصادیات، عمرانیات، تاریخ، تذکرہ، سوانح، افسانہ، ناول، ڈرامہ، سفرنامہ وغیرہ غرض ہر موضوع پر بے شمار کتابیں تصنیف و تالیف اور ترجمہ کیں۔ اخبار جاری کئے۔ پریس قائم ہوئے۔

۱۹۴۷ء کے بعد عام سیاسی اور سماجی حالات، معاشی بحران اور ذہنی انتشار و معاشرتی افتراق نے اُردو ادب کو بھی متاثر کیا خصوصاً اس لئے کہ بیشتر حضرات کسی نہ کسی حیثیت سے والیانِ ریاست سے وابستہ تھے۔ اور ریاستوں کا خاتمہ یقینی تھا۔ چنانچہ راجستھان کی تشکیل کے وقت یہاں کی ادبی فضا پر تاریکی کی گھٹا چھائی ہوئی تھی بیشتر اہلِ علم ترکِ وطن کر چکے تھے۔ ادبی محفلیں سونی پڑی تھیں مگر یہ کیفیت بہت زیادہ عرصہ تک نہیں رہی۔ کچھ ذہنی سکون ملنے کے بعد اہلِ علم و ادب نے ادھر توجہ شروع کی۔ کچھ باہر آنے والے تارکینِ وطن نے شعر و سخن کے ساتھ دلچسپی کا اظہار کیا اور آہستہ آہستہ علمی و ادبی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا خصوصاً ۱۹۵۳ء میں انجمنِ ترقی اُردو جے پور اور ۱۹۵۶ء میں انجمنِ ترقی اُردو راجستھان کے قیام کے بعد اس خطہ میں اردو زبان و ادب کی ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

اُردو بولنے والوں کی تعداد

(جن کی مادری زبان اردو ہے)

۱۹۵۱ء	۱,۵۶,۱۶۰
۱۹۶۱ء	۵,۰۹,۶۵۴
۱۹۷۱ء	۶,۵۰,۹۴۷

یہ اعداد و شمار مردم شماری کی سرکاری رپورٹس کے مطابق ہیں لیکن ان کی صحت قابلِ اعتراض ہے۔ مثال کے طور پر مسلمانوں کی زبان اُردو مانی جاتی ہے اگر اسی مسئلہ کی رو سے دیکھا جائے تو ۱۹۵۱ء کی رپورٹ کے مطابق اُن کی تعداد ۹,۴۹,۳۵۸ تھی جبکہ اردو بولنے والوں کی تعداد ۱,۵۶,۱۶۰ بتائی گئی ہے۔ یہ تعداد اُن افراد کی ہے جن کی مادری زبان اردو مانی گئی ہے۔ ایسے افراد جو بحیثیت ثانوی زبان اردو بولتے ہیں اُن کی تعداد یقیناً اس سے کہیں زیادہ ہے۔

تعلیمی سہولتیں

اردو تعلیم کی روایت اس خطے میں بڑی پرانی ہے۔ وسطِ انیسویں صدی سے یہاں کے مدارس میں اردو تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ دینی مکتبوں میں تو اردو کی تعلیم دی ہی جاتی تھی۔ سرکاری سطح پر بھی انتظام شروع ہوا۔ چنانچہ ۱۸۴۵ء میں جے پور میں اورینٹل کالج قائم کیا گیا جس میں اردو کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ٹونک میں دارالعلوم خلیلیہ قائم کیا گیا۔ اس سے قبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے قائم شدہ اجمیر کے مدرسہ میں ۱۸۳۶ء سے اُردو کی تعلیم کا انتظام تھا۔ ریاستی راجستھان میں ۱۹۵۶ء سے قبل اُردو تعلیم باقاعدہ طور پر شروع ہو چکی تھی۔

قیامِ راجستھان کے بعد اگرچہ اس صوبہ میں ایم اے کی سطح تک اردو کی تعلیم نہیں تھی۔ پرائمری درجوں سے بی اے تک مختلف مقامات پر برائے نام اردو قائم رہ گئی تھی۔ طالب علموں کی تعداد اس قدر گھٹ چکی تھی کہ سرکاری رپورٹس میں بھی ان کا پتہ نہیں چلتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۵۶ء میں انجمنِ ترقی اُردو راجستھان کے قیام کے بعد حکومت کی توجہ اس جانب مبذول کرائی گئی اور اس کے بعد مختلف رپورٹس میں اُردو کا ذکر کیا جانے لگا۔ چنانچہ جہاں ۱۹۵۱ء تک اردو پڑھنے والے طلبہ اور ایسے مدارس اور اداروں کی تعداد کا پتہ نہیں چلتا جن میں اردو پڑھائی جاتی تھی وہاں ۱۹۶۱ء آتے آتے اعداد و شمار کے کچھ نقائص سامنے آئے چنانچہ تقریباً ۶۰ پرائمری اسکولوں، ۲۰ ہائی اسکولوں اور ۵ کالجوں میں اردو تعلیم کا انتظام تھا۔ کالجوں میں مجموعی حیثیت سے تقریباً ۷۰۰ طالب علم اردو پڑھتے تھے۔ ان مدارس میں اُردو بحیثیت ایک مضمون یا ثانوی زبان پڑھائی جاتی تھی۔ مادری زبان کی حیثیت سے اردو میں تعلیم کا انتظام نہ تھا۔ بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن راجستھان کی جانب سے ہائی اسکول، سیکنڈری اسکول کے امتحانات میں جوابات اردو میں لکھنے کی رعایت ضرور تھی مگر اس کا استعمال برائے نام تھا۔

البتہ تقریباً ہر ضلع میں دینی تعلیم کے مدارس تھے جن میں اردو پڑھائی جاتی تھی خصوصاً جامعۂ اردو علی گڑھ کے امتحانات کو خاصی مقبولیت حاصل تھی۔ ۱۹۶۱ء میں ۱۷ مقامات پر اس کے مرکز قائم تھے بعض جگہ باقاعدہ تعلیم کا انتظام تھا۔ اُن میں شبینہ اردو کالج جے پور، دارالعلوم

؎ جائزۂ زبان اردو

خلیلیہ ٹونک اور قمر اردو کالج نوا (ضلع جھنجھنوں) قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۶۱ء کے بعد جو سرکاری رپورٹس شائع ہوئیں ان میں چند رپورٹس سے ماخوذ اعداد و شمار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۶۱ء اور ۱۹۷۱ء کے درمیان یہاں اردو پڑھنے والے طلبہ کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا۔

کمشنر لسانی اقلیات کے مطابق (آٹھویں رپورٹ ۶۵-۱۹۶۱ء (ص ۵۳) ۶۴-۱۹۶۳ء میں بحیثیت مادری زبان اردو میں تعلیم کی سہولت نہیں تھی ۶۵-۱۹۶۴ء میں ۵ اُردو میڈیم اسکول تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حقیقت میں ۶۵-۱۹۶۴ء سے مادری زبان کی حیثیت سے اُردو میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔

راجستھان سرکار کے "بھاشا و بھاگ" کی رپورٹ بابت ۷۱-۱۹۷۰ء (ص ۱۴) کے مطابق ۱۹۶۶ء سے بھاشا و بھاگ کے ذریعہ لسانی اقلیتوں کی سہولتوں کا انتظام کیا جانے لگا۔

کمشنر لسانی اقلیات کی گیارھویں رپورٹ (ص ۵۸) کے مطابق ۱۹۶۵ء میں ریاستی حکومت نے گجراتی، پنجابی، سندھی اور اردو کے ذریعہ تعلیم دینے کے احکامات جاری کئے۔ یہ بھی تجویز مدِنظر رکھی گئی کہ کم از کم ہر ضلع میں مادری زبان سے متعلق ایک گورنمنٹ ہائر سکنڈری ہو بشرطیکہ وہاں اس زبان کی چھٹی جماعت سے نویں جماعت تک ۶۰ طلبہ یا چھٹی جماعت میں کم از کم ۱۵ طلبہ ہوں۔ ۱۹۶۶ء میں لسانیاتی اقلیتی طلبہ کا ایک رجسٹر بھی مدارس میں کھولنے کا حکم جاری کیا گیا۔ اس رپورٹ کے ضمیمہ ۷ اور ۸ کے مطابق اس ریاست میں اردو تعلیم کی کیفیت یہ تھی:-

	مدارس کی تعداد	طلبہ کی تعداد جنکی مادری زبان اردو تھی	اساتذہ کی تعداد جو اُردو پڑھا سکتے تھے
پرائمری تعلیم ۶۷-۱۹۶۶ء	۴۰	۵،۳۰۳	۱۳۷
" ۶۸-۱۹۶۷ء	۳۱	۴،۵۵۲	۱۵۷
سیکنڈری تعلیم ۶۷-۱۹۶۶ء	۲۴	۲،۷۲۵	۷۹
" ۶۸-۱۹۶۷ء	۲۱	۲،۲۹۶	۳۶

کمشنر مذکور کی بارھویں رپورٹ جولائی ۱۹۶۹ء لغایت جون ۱۹۷۰ء کے مطابق (ص ۴۱) جن پرائمری مدارس میں اردو کے ذریعہ تعلیم دیجاتی تھی ان کی تعداد سابقہ سال کے مقابلہ میں ۳۹ سے گھٹ کر ۳۳ رہ گئی اور اساتذہ کی تعداد ۱۷۷ سے کم ہو کر ۱۲۵ رہ گئی۔ طلبہ کی تعداد ۵،۴۸۳ سے بڑھ ۵،۵۴۷ ہو گئی۔

ثانوی تعلیم کے سلسلہ میں رپورٹ میں درج ہے کہ ۶۹-۱۹۶۸ء میں تین اردو میڈیم اسکول تھے جن میں ۱۹۴ طلبہ کو تعلیم دی جاتی تھی۔ جبکہ سابقہ سال میں ایسا کوئی اسکول نہ تھا جو طلبہ عشرت ایک مضمون اردو پڑھتے تھے انکی تعداد ۲،۲۹۰ سے بڑھ کر ۲،۷۷۴ ہو گئی اور مجموعی حیثیت سے اساتذہ کی تعداد ۲۶ سے بڑھ کر ۴۶ ہو گئی۔

بھاشا و بھاگ کی ۷۲-۱۹۷۱ء کی رپورٹ کے مطابق (ص ۱۹) طلبہ، مدرسین اور مدارس کی تعداد حسب ذیل تھی:-

اُردو مادری زبان کے ذریعہ تعلیم	مدارس	طلبہ	مدرسین
ابتدائی تعلیم	۴۳	۰،۵۱۷	۱۳۰
ثانوی تعلیم	۱۲	۲،۴۸۳	۶۰

ان کے علاوہ سات کالجوں میں بی اے کی سطح تک اردو پڑھائی جاتی تھی جن کا تعلق راجستھان یونیورسٹی، جے پور اور اودے پور یونیورسٹی سے تھا۔

تازہ ترین اعداد و شمار جو حکومت کی جانب سے ۱۷ مئی ۱۹۷۳ء کو گجرال کمیٹی کے سامنے پیش کئے گئے ہیں اُن کی رو سے سابقہ سال ۷۳-۱۹۷۲ء کی تعلیمی کیفیت حسب ذیل ہے:-

	مدارس	طلبہ
پرائمری اسکول	۱۸۲	۷،۵۱۵
مڈل اسکول	۱۴۵	۴،۴۸۲
سکنڈری اسکول	۱۸	۴۴۸

ان میں ۴۳ پرائمری اسکولوں میں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ گذشتہ سال اودے پور یونیورسٹی میں ایم۔اے (اردو) کی تعلیم شروع کی گئی۔ اس سال اعلان کیا گیا ہے کہ ۷۴-۱۹۷۳ء کے سشن سے راجستھان یونیورسٹی جے پور میں بھی اُردو میں ایم اے کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔

اس رپورٹ میں کالجوں کی تعداد نہیں بتائی گئی ہے۔ تاہم اس وقت اودے پور یونیورسٹی اور راجستھان یونیورسٹی سے ملحقہ کل سات کالجوں میں بی۔اے کی سطح تک اور اودے پور میں ایم۔اے تک اُردو پڑھائی جاتی ہے صرف راجستھان یونیورسٹی جے پور کے مختلف امتحانات میں (بی۔اے سہ سالہ کورس) ریگولر اور پرائیویٹ امیدواروں کی تعداد یہ تھی۔

	فرسٹ ایر	سیکنڈ ایر	فائنل ایر	کُل
۱۹۷۲ء	۸۵	۵۹	۳۹	۱۸۱
۱۹۷۳ء	۹۶	۷۳	۴۴	۲۱۳

مئی ۱۹۷۲ء میں حکومت نے لسانی اقلیات سے متعلق ایک انسپکٹر کا تقرر کیا ہے جو خصوصاً تعلیمی امکانات کے اجرا کی دیکھ بھال کرے گا

نیز بھاشا وبھاگ کے سپرد لسانی اقلیات کا کام کیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ آئندہ سال سے ۲۵۰ پرائمری اسکول صوبے میں کھولے جائیں گے۔ اردو میں نصاب کی کتابیں شائع کی جائیں گی۔ اردو کے اساتذہ کی ٹریننگ اور ان کی تعیناتی کا انتظام کیا جائے گا۔ ریجنل کالج آف ایجوکیشن اجمیر میں ۱۹۷۳ء سے اردو کو بھی نصاب میں شامل کیا جا چکا ہے۔

اردو اخبارات و رسائل

صحافت کے اعتبار سے راجستھان میں کوئی نمایاں کام نہیں ہوا۔ تاہم اس خطے میں صحافت کی روایت بڑی پرانی ہے۔ اس خطے سے پہلا ہفتہ وار "مظہر اردو" بھرت پور سے ۱۸۵۱ء میں، پہلا ماہنامہ "البیان" جے پور سے ۱۸۸۷ء میں اور پہلا سہ ماہی "شاعری کی کایا پلٹ" ۱۹۱۴ء میں جھالاواڑ سے شائع ہوا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں اور بیسویں صدی کے پہلے ربع میں مختلف مقامات سے مختلف اوقات میں متعدد اخبار و رسائل شائع ہوتے رہے۔

قیام راجستھان کے بعد ۱۹۴۸ء میں کوٹہ سے منشی للتا پرشاد شاد نے "الشاد" کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا تھا جو ۱۹۵۰ء میں بند ہو گیا۔ اس کے بعد غالباً ۱۹۵۱ء میں جے پور سے روزانہ اخبار "خبر" جاری کیا گیا۔ انجمن ترقی اردو جے پور کے قیام کے بعد ۱۹۵۵ء میں جے پور سے اخبار "نئی روشنی" مولانا احترام الدین احمد شاغل کی ادارت میں جاری ہوا۔ یہ اخبار پابندی کے ساتھ کئی سال تک جاری رہا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد سے اب تک راجستھان سے حسب ذیل اخبار جاری ہوئے۔ ان میں سب سے زیادہ عرصہ تک جاری رہنے والا اخبار پندرہ روزہ "بشارت" جے پور ہے جس کے مدیر کلیم الدین تجلی عثمانی ہیں۔ یہ اخبار ۱۵ نومبر ۱۹۶۶ء میں جاری ہوا تھا اور اب تک پابندی کے ساتھ چھپ رہا ہے۔ اس میں سیاسی خبروں پر بے لاگ اور غیر جانبدار تبصرے ہوتے ہیں۔ ملکی اور بین الاقوامی حالات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے سیاسی خبروں پر تبصرے کے علاوہ اس کا ایک حصہ ادبی بھی ہوتا ہے جس میں راجستھان کے قدیم و جدید شعراء کا تعارف، کلام اور ادبی جھلکیاں ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ "بدلا ہوا زمانہ" ہفت روزہ اخبار قابل ذکر ہے جو فصاحت علی شہابی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ یہ اخبار جنوری ۱۹۷۱ء میں جاری کیا گیا تھا اور پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس میں سیاسی خبریں اور ادبی مواد ہوتا ہے۔

ماہناموں میں پابندی کے شائع ہونے والا جریدہ "سلطان الہند" ہے یہ ماہنامہ صولت حسین خاں دیوان درگاہ اجمیر کی سرپرستی میں ۱۹۶۷ء سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس میں تصوف اور مذہب سے متعلق کافی معلومات افزا مضامین شائع ہوتے ہیں۔ "ندیم" ہفت روزہ اخبار ہنومان سنگھل اور قیصر رشید کی ادارت میں جاری ہوا جو ابھی چھپ رہا ہے۔ ایک ماہنامہ "گلزار حمید" غلام احمد کلیم گذشتہ دو سال سے جھنجھنوں سے شائع کر رہے ہیں۔

علمی و ادبی سرگرمیاں

راجستھان کے ادیبوں، مصنفوں اور شاعروں کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے یقیناً ۵۰۰ سے زائد تعداد ہوگی۔ اس لئے کہ ۱۹۷۱ء میں راقم نے ایک بار راجستھان کے شعراء و ادبا کی فہرست مرتب کرنے کی کوشش کی تھی۔ نامکمل فہرست میں اس وقت حیات ۲۵۰ سے زائد حضرات کے نام شامل ہو چکے تھے۔ "تذکرہ شعرائے جے پور" مصنفہ مولانا احترام الدین احمد شاغل، "تذکرہ شعرائے جودھپور" سحاب سخن" مصنفہ شرف الدین یکتا، "تذکرہ دامان باغبان" (جس میں ایسے شعرا کا ذکر ہے جو سرکاری مدارس میں اساتذہ ہیں) "راجستھان کے موجودہ اردو شاعر" مرتبہ پروفیسر پریم شنکر سریواستو۔ راقم الحروف کا تحقیقی مقالہ اور جے پور، اودے پور اور ٹونک میں منعقدہ کل ہند مشاعروں اور سمپوزیم و سیمینار وغیرہ کی مطبوعہ رپورٹس کے مطالعہ سے مندرجہ بالا قول کی صداقت ہوتی ہے۔ سربرآوردہ شاعروں اور ادیبوں میں سے صرف چند حضرات کے نام ذیل میں درج کئے جاتے ہیں یہ وہ حضرات ہیں جن کے کلام کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں یا انکی تصانیف و مضامین و مقالات شائع ہوتے رہتے ہیں۔

۱۔ الحاج مولانا احترام الدین شاغل (مرحوم) راجستھان کے شعراء و ادبا اور اردو کی بقا اور ترقی و ترجیح کے لئے کام کرنے والوں میں حضرت شاغل مرحوم کا نام سرفہرست نظر آتا ہے۔ انہی کی کوششوں سے ۱۹۵۳ء میں انجمن ترقی اردو جے پور اور ۱۹۵۶ء میں صوبائی انجمن قائم ہوئی۔ موصوف نے اخبار "نئی روشنی" کی ادارت کے علاوہ تقریباً ۳۵ کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ ان میں سے ۲۰ کتابیں شائع بھی ہو چکی ہیں۔ ان میں سے "تذکرہ شعرائے جے پور"، "گلدستۂ بلاغت" اور "دیوان شاغل" حصہ اول خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۲۔ الحاج مولانا ایوب خاں صاحب قمر واحدی۔ قمر صاحب نہ صرف صاحب دیوان استاد شاعر بلکہ اردو کے ایک بے لوث خدمتگار ہیں۔ آپ ۱۹۵۰ء سے اردو کالج جے پور میں بحیثیت پرنسپل اعزازی خدمت انجام دے رہے ہیں

۳۔ مولانا سید منظور الحسن برکاتی۔ راجستھان کی قدیم ترین اسلامی

درسگاہ "دارالعلوم خلیلیہ" ٹونک میں ادبیات اُردو کے استاد مولانا منظورالحسن صاحب برکاتی کا نام اجتھان کی ادبی دنیا میں خاص مقام رکھتا ہے۔ آپ کا خاص میدان نثر ہے۔ ملک کے مشہور جرائد میں آپ کے مضامین اکثر چھپتے رہتے ہیں کئی مطبوعہ کتابیں بھی ہیں۔ اُن میں سے "ٹونک کی عیدیں" (۱۹۶۵ء) "تاجدار مدینہ" (۱۹۶۷ء) "ٹونک کے جشن عید میلادالنبی" (۱۹۶۵ء) "لبل سعیدی اپنے وطن میں" (۱۹۶۶ء) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

غلام معین الدین مفتون

ضلع کوٹہ بوندی اور جھالاواڑ کو ادبی سرگرمیوں سے واقف کرانے والے جناب مفتون کو ٹوی کو اجتھان کی ادبی دنیا میں خاص مقام حاصل ہے آپ نہ صرف خوشگو شاعر بلکہ نثرنگار بھی ہیں۔

مولانا عبدالرحیم سالک عزیزی

خوشگو شاعر اور نثرنگار ہیں۔ "سلکِ گوہر" کے نام سے ایک مجموعہ کلام ۱۹۶۷ء میں شائع ہوچکا ہے۔ آپ کی جدوجہد سے ضلع سیکر، چورو اور جھنجھنوں جیسے ریگزار میں چمنِ اُردو کی آبیاری ہو رہی ہے۔ وہاں انجمن ترقی اُردو صحیح معنی میں سرگرم عمل ہے۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ آپ کی کوششوں سے جس قدر اُردو کے مدارس ضلع جھنجھنوں میں قائم ہیں، اجتھان کے کسی دوسرے ضلع میں اس کی اس زمانہ میں مثال نظر نہیں آتی۔ آپ ہی کی کوششوں سے قصبہ نوا میں قمر اُردو کالج قائم ہوا جو جامعہ اُردو کے امتحانات کا ایک بہترین مرکز ہے۔

پروفیسر ہریم شنکر سریواستو

شعبۂ انگریزی گورنمنٹ کالج ہیکانیر کے صدر ہیں مگر اردو سے بے انتہا دلچسپی رکھتے ہیں۔ انجمن ترقی اُردو کے نائب صدر بھی رہے اور "نخلستان" سہ ماہی رسالے کے ایڈیٹر بھی۔ شاعر بھی ہیں نثرنگار بھی۔ آپ کی سب سے اہم تصنیف "اجتھان کے موجودہ اردو شاعر" ساہتہ اکیڈمی اجتھان نے ہندی رسم خط میں ۱۹۶۹ء میں شائع کی تھی۔

سید فضل متین متین

فضل متین صاحب اجمیر کے ادیبوں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں سہ ماہی رسالہ "نخلستان" کے مرتبہ دو سال تک معاون مدیر رہے۔ آپ نے "تذکرۂ شعرائے اجمیر" مرتب کیا ہے جو ابھی زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوا۔

نفاست علی خاں راہی شہابی

اجتھان کے نوجوان شعرا میں راہی شہابی کو جو ملک گیر شہرت اور مقبولیت حاصل ہے وہ اُن کی فطری صلاحیتوں کی دلیل ہے آپ محکمہ تعلقات عامہ اجتھان میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی گزیٹڈ پوسٹ پر فائز ہیں۔ آپ کی قومی نظموں کا مجموعۂ کلام "میرا وطن" ہندی رسم الخط میں طبع ہوکر کانگریس کے جے پور میں منعقدہ سالانہ اجلاس کے موقع پر اندرا گاندھی کو پیش کیا گیا تھا۔ اجتھان کے سرکاری مشاعرے عام طور پر راہی صاحب کے زیر اہتمام منعقد ہوتے ہیں۔

کلیم الدین تجلی عثمانی

اخبار "بشارت" جے پور کے ایڈیٹر نوجوان شاعر تجلی عثمانی صحافت کے علاوہ ڈرامہ نگاری کے میدان میں مقبولیت حاصل کرچکے ہیں۔ انجمن ترقی اُردو اجتھان کے جنرل سکریٹری ہیں۔

ممتاز شکیب

شکیب شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔

مختار الرحمن راہی

افسانہ نگار کی حیثیت سے کافی مقبولیت حاصل کرچکے ہیں۔

صاحبزادہ شوکت علی خاں ایم۔اے

شعبۂ تحقیقات علوم شرقیہ اجتھان کی ٹونک شاخ کے انچارج ہیں ان کے مختلف تحقیقی مضامین مختلف رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔

مولانا محمد عمران خاں صاحب بی اے

اردو عربی اور فارسی کے منتخب عالم ہیں۔ مشاہیر علمائے ٹونک پر ایک ضخیم کتاب مرتب کرچکے ہیں جو ابھی طبع نہیں ہوئی۔ ڈسٹرکٹ لائبریری ٹونک میں ملازم ہیں۔

صاحبزادہ حامد رشید خاں

گورنمنٹ سکنڈری اسکول علی گڑھ ضلع ٹونک میں ہیڈ ماسٹر ہیں شاعر بھی ہیں اور ڈرامہ نگار بھی۔ ان کا ایک ناول بھی چھپ چکا ہے۔

اجتھان کے دوسرے معروف اور صاحب دیوان شعرا میں

دل ایوبی ٹونکی، بسمل سعیدی، چندر بھاری لال ماتھر صبا، شرف الدین یکتا گوپال کرشن محن جے پوری، پارسا کوثری، اتم چند چندن، بیدل بیکانیری، دین محمد مشتاق بیکانیری، روی بھاردواج جودھپوری، مرزا حامد ٹونکی، عارف بیکانیری، عقیل شاداب، نائب اودے پوری، منصور چوردی، ظفر غوری، مخمور سعیدی اور ممتاز راشد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بسمل سعیدی، مخمور سعیدی اور ممتاز راشد ملک گیر شہرت کے حامل ہیں۔

قیام راجستھان کے بعد اس خطہ کے شعرا و ادبا کی مجموعی حیثیت سے تقریباً سو کتابیں شائع ہوئیں۔ ان میں بیشتر شعری مجموعے ہیں۔ چند تذکرے کچھ افسانے اور چند کتابیں ادب، سیر اور درسیات سے متعلق ہیں۔ چند ادبی جلسوں اور مشاعروں کی روداد یں ہیں۔

ادبی انجمنیں

یوں تو مختلف مقامات پر ادبی انجمنیں قائم ہیں مگر انجمن ترقی اُردو راجستھان جے پور باعمل ہے اور اس سے ملحقہ ۵۶ شاخیں مختلف مقامات پر قائم ہیں۔ انجمن مذکور نے سرکاری احکامات اور قوانین پر عمل کرانے کی کوشش کی ہے۔ اعلیٰ سطح پر ادبی اجتماعات قائم کئے، سرکاری مدارس میں اردو تعلیم کا انتظام کرانے کی پوری کوشش کی اور کامیابی بھی حاصل کی۔ جامعۂ اردو کے امتحانات کو راجستھان یونیورسٹی اور حکومت راجستھان سے تسلیم کرایا۔ گورنمنٹ کالج کوٹہ میں اُردو جاری کرانے کے سلسلہ میں نمایاں کوشش کی انجمن ہی کی کوشش کی بنا پر حال ہی میں حکومت راجستھان نے راجستھان یونیورسٹی میں آئندہ سال سے اُردو میں ایم۔ اے کے درجات کھولنے کا اعلان کیا ہے۔

انجمن مذکور نے راجستھان کے ایک باکمال خوش نویس منشی رامچند رنظر کو ان کے فنِ خطاطی کے اعتراف میں کل راجستھان اردو کنونشن ۱۹۶۵ء کے موقع پر "جواہر رقم" کا خطاب اور طلائی تمغہ دیا تھا۔

انجمن ترقی اردو کے علاوہ "انجمن شعر و ادب" جے پور، "انجمن کاروان فکر" جے پور، "انجمن تعمیر اُردو" ٹونک وغیرہ بھی قائم ہیں مگر انکا دائرۂ عمل مشاعروں کی حد تک محدود ہے۔ ان کے علاوہ مدارس اور کالجوں میں بھی چند ادبی انجمنیں موجود ہیں۔ ان میں "بزم ادب" گورنمنٹ کالج ٹونک قابل ذکر ہے۔ جو ۱۹۶۶ء سے مستقل طور پر کالج میں ادبی جلسے منعقد کراتی ہے

اشاعت و ترقی کے لئے ملنے والی امداد

راجستھان میں ساہتیہ اکیڈمی کے علاوہ کوئی ادارہ یا حکومت اردو کی اشاعت و ترقی کے لئے کوئی امداد نہیں دیتی اور ساہتیہ اکیڈمی کا دائرہ نہایت محدود ہے۔ ہر سال چند شعرا کو بہت معمولی رقم دیجاتی ہے۔ مثال کے طور پر گذشتہ سال کل ایک ہزار روپیہ کی رقم پانچ تصانیف پر امداد کے لئے منظور کی گئی تھی۔ ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے ہر سال ایک اُردو کانفرنس یا سمپوزیم منعقد کرنے کے لئے ڈیڑھ ہزار روپیہ کی رقم دیئے جانے کی ایک روایت قائم ہے۔

اہم کتب خانے

راجستھان کے ضلعی صدر مقامات پر ڈسٹرکٹ لائبریریاں اور کچھ میونسپل بورڈ کی لائبریریاں ہیں جہاں اردو کی کتابیں موجود ہیں۔

سب سے اہم قلمی کتب کا ذخیرہ، اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک ہے، جہاں چار ہزار کے قریب عربی، فارسی اور اردو کے مخطوطات ہیں۔ مدارس، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی لائبریریوں میں بھی اُردو کتابیں موجود ہیں اور جہاں اُردو پڑھائی جاتی ہے وہاں کتابوں کے بجٹ میں سے رقم بھی دیجاتی ہے

ایک غیر معروف سرکاری کتب خانہ محکمہ اوقاف سے متعلق جامع مسجد بھرت پور میں ہے۔ اسی طرح ایک نیم سرکاری کتب خانہ فتح پور شیخاوالی میں ہے۔ بعض میونسپلیوں خصوصاً الور میونسپلٹی میں نادر اور نایاب مخطوطات کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ مجموعی حیثیت سے سرکاری اور نیم سرکاری تقریباً پچاس کتب خانے موجود ہیں جہاں ہزارہا کتابیں الماریوں کی زینت بنی ہوئی ہیں —— مہاراجہ پبلک لائبریری جے پور میں کئی ہزار اُردو کتابیں ہیں۔

راجستھان میں کچھ قدیم نجی کتب خانے بھی ہیں جہاں قدیم کتب کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ان میں "کتب خانہ شاملی" جے پور، کتب خانہ مولانا عمران ٹونک، کتب خانہ فضل مبین صاحب اجمیر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بعض حضرات کے پاس کتابوں کے خاصے بڑے ذخیرے ہیں۔ مثلاً مفتون کوٹوی، مولانا قاضی الاسلام صاحب و مولانا سید منظور الحسن صاحب برکاتی ٹونکی حکیم سلیم الدین خانصاحب مرحوم جے پور، ماسٹر ثروت حسین زیدی صاحب جے پور، ڈاکٹر احمد یار خاں صاحب جے پور، حکیم سید یحییٰ خاں صاحب ٹونک وغیرہ۔ اس سلسلہ میں انجمن ترقی اُردو راجستھان کی جانب سے نو تعمیر شدہ انجمن کی عمارت میں قائم "مہاراجہ جے سنگھ اردو ریڈنگ روم" جے پور کا نام بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی طرح مکرانہ میں "مولانا آزاد لائبریری" اور جودھپور میں "مولانا آزاد لائبریری"، "میجر اقبال لائبریری" چوڑو کا نام بھی آتا ہے۔ اس قسم کے کتب خانوں کی تعداد بھی ۲۰ کے قریب ہے

ایسے افراد جو نجی طور پر اردو کی ترقی و اشاعت کیلئے مساعی کر رہے ہیں،

ان میں سے بعض افراد کا ذکر بحیثیت ادیب و شاعر مندرجہ بالا صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے حضرات انجمن ترقی اردو کے اراکین کی حیثیت سے اُردو کی ترقی و اشاعت کے لئے اس خطہ میں کوشاں ہیں بعض حضرات تصنیف و تالیف اور صحافت سے متعلق ہیں بعض حضرات ملا معاوضہ جامعہ کے امتحانات کیلئے طلبہ کو پڑھاتے ہیں ایسے چند حضرات کے نام یہ ہیں :

جے پور میں : فصاحت علی خاں شہابی (ایڈیٹر "بدلا ہوا زمانہ" جے پور) اوتار نرائن صاحب بہادر، صدر انجمن ترقی اردو راجستھان) ڈاکٹر محمد حبیب صاحب (سکریٹری انجمن تعلیم المسلمین جے پور) ڈاکٹر محمد علی صاحب زیدی (صدر شعبۂ اردو راجستھان کالج جے پور) ——— جودھپور میں : لیاقت اللہ خانصاحب (صدر اردو بورڈ ساہتیہ اکیڈیمی راجستھان)، ماسٹر عبدالقیوم صاحب (مہتمم مرکز جامعہ اردو علی گڑھ جودھپور) ——— بیکانیر میں : نثار احمد صاحب صمدانی (مہتمم مرکز جامعہ علی گڑھ جودھپور) ——— چورو میں : ہدایت علیخانصاحب ——— کوٹہ میں : سلطان احمد صاحب (سکریٹری انجمن ترقی اردو کوٹہ، ظفر غوری صاحب ——— ڈولی میں : حکیم علاؤالدین خانصاحب ——— جھالاواڑ میں : عبدالسلام بیگ شفیق ——— اودے پور میں خلیل تنویر، شاہد عزیز، عابد علی ادیب، ڈاکٹر ثاقب رضوی (صدر شعبۂ اردو اودے پور یونیورسٹی) ——— جھنجھنوں میں : غلام احمد کلیم ——— سیکر میں : ماسٹر خورشید علی صاحب ——— چورو میں : یاور صاحب، سکریٹری انجمن ترقی اردو ——— الور میں : دیش راج یکتا صاحب سابق صدر انجمن ترقی اُردو الور)

سرکاری دفاتر میں اردو

کسی بھی محکمہ میں جزوی یا کلی طور پر اُردو میں کام نہیں ہوتا محکمہ اطلاعات یا تعلقات عامہ میں اردو سے متعلق کوئی باقاعدہ جداگانہ شعبہ نہیں ہے۔ محکمہ تعلقات عامہ کی جانب سے کبھی کبھی مشاعرے ضرور منعقد کئے جاتے ہیں۔ محکمہ مذکور کی جانب سے ایک کتاب بعنوان "ترقی پذیر راجستھان" ہندی سے اردو میں ترجمہ کرا کے ۱۹۶۴ء میں شائع کی گئی۔ یہ ترجمہ راقم الحروف نے کیا تھا۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۸ء سے ہر سال خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے عرس کے موقع پر ایک مختصر کتابچہ محکمہ مذکور کی جانب سے اردو میں شائع کرا کے زائرین میں مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایسے کل پانچ کتابچے اب تک شائع ہوئے ہیں۔

راجستھان میں کوئی اُردو اکیڈمی جداگانہ نہیں ہے۔ البتہ ساہتیہ اکیڈیمی راجستھان کے دائرۂ عمل میں اُردو بھی شامل ہے۔ ساہتیہ اکیڈیمی شعرا و ادبا کو مالی امداد دیتی ہے۔ اس نے چند اردو سمپوزیم کے لئے بھی روپیہ دیا ہے اور حسب ذیل کتب اردو کے نام پر ہندی رسم الخط میں شائع کی ہیں :

(۱) "راجستھان کے موجودہ اُردو شاعر" (مرتبہ پریم شنکر سریواستوا ۲) "قلم کی تلواریں" (مرتبہ ابوالفیض عثمانی ۳) صبا گرنتھاولی (کلیات صبا) (مرتبہ صبا جے پوری)

ان کے علاوہ "کلیات مائل"، "کلام متین"، "کرنیں" (کلام قہر) اور مضامین مفتون کو ٹوی، اُردو رسم الخط میں طباعت کے لئے منظور کر کے پریس میں بھیجے گئے۔ ساہتیہ اکیڈیمی کا سہ ماہی اردو رسالہ "نخلستان" ۱۹۶۶ء میں جاری ہوا تھا۔ اب تک آٹھ سال میں غالباً آٹھ ہی نمبر شائع ہوئے ہیں۔

ترقی کے لئے تجاویز

(۱) سرکاری احکامات پر سختی سے عمل کرایا جائے اور اسکی نگرانی کیلئے ذمہ دار افسر اور اس کے ساتھ عملہ مقرر کیا جائے۔

(۲) اُردو زبان کی تعلیم کیلئے خصوصی طور پر انتظامات کئے جائیں ضرورت کے مطابق مدارس میں اردو کی تعلیم کا انتظام اور اساتذہ کا تقرر کیا جائے۔ مادری زبان کے ذریعہ تعلیم دینے والے اداروں کی جانب توجہ کی جائے۔

(۳) سرکاری احکامات، خبریں اور ضروری قوانین اردو میں بھی شائع کئے جائیں۔

(۴) سرکاری پریس میں اردو طباعت کا انتظام ہو اور سرکار کی جانب سے اردو اخبار یا رسالہ جاری کیا جائے۔ نیز سرکاری گزٹ میں اردو کو بھی شامل کیا جائے۔

(۵) پرائمری اور سکنڈری درجوں کے اردو نصاب کی کتابیں سرکار کی جانب سے شائع کرائی جائیں۔

(۶) ریاست میں اردو اکیڈیمی قائم کی جائے اور اسکے بجٹ کے لئے معقول رقم دیجائے۔ ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی، انعامات، کتابوں کی اشاعت، وظائف، ادبی اجتماعات وغیرہ کا کام اُردو اکیڈیمی کے سپرد ہو۔ سرکار کی جانب سے اوباوشعرا کی سرپرستی کی جائے۔ نیز تصانیف پر انعامات دیئے جائیں۔

(۷) اعلیٰ تعلیم کے لئے کالجوں میں انتظام کیا جائے اور راجستھان یونیورسٹی میں اُردو ایم اے کی سطح تک پڑھائی کی جائے۔ نیز ادبی تحقیقات کا شعبہ قائم کیا جائے۔

(۸) اورینٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک کو مرکزی حیثیت دی جائے اور ایسے مخطوطات جو مختلف جگہ بیکار پڑے ہیں ان کو وہاں پہنچایا جائے اس کا کیٹلاگ شائع کیا جائے اور اس کے ذخیرہ میں اضافہ کے لئے بجٹ مقرر کیا جائے۔

(۹) آل انڈیا ریڈیو جے پور میں اُردو کا شعبہ جداگانہ قائم کیا جائے۔

(۱۰) بس اسٹینڈ، ریلوے اسٹیشن اور عام مقامات پر جہاں حکومت کی جانب سے بورڈ لگائے جاتے ہیں اُن پر اردو میں بھی لکھا جائے۔

(۱۱) انجمن ترقی اُردو راجستھان کی جانب سے گجرال کمیٹی کے سامنے جو میمورنڈم ۱۷ مئی ۱۹۷۳ء کو پیش کیا گیا ہے۔ اس پر عمل کرایا جائے۔

●●

گجرات میں اُردو

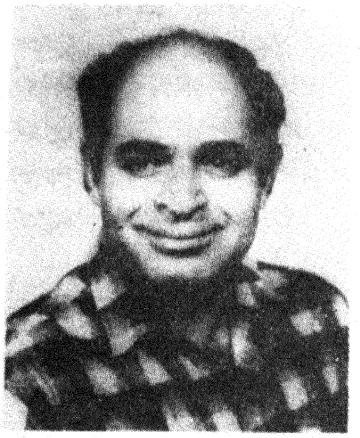

وارث علوی

محمد علوی

عادل منصوری

جمیل کلیمی

رشید افروز

گجرات کی سرزمین گنجینۂ معنی ہی نہیں بلکہ مدفن اہلِ دل بھی ہے، اور یہاں علمائے کبار کے پہلو بہ پہلو بڑے بڑے اولیا اللہ بھی عدم کی نیند سو رہے ہیں۔ اُردو زبان کے ابتدائی کلمات انہی بزرگانِ دین کے مقدس لبوں سے ادا ہوئے ہیں چنانچہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے پوتے حضرت قطب عالم کے متعلق مشہور ہے کہ ایک روز آپ پچھلی رات کو اُٹھ کر باہر نکلے تو کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔ آپ کے منہ سے اس وقت یہ کلمہ نکلا: "لوہ ہے یا لکڑ یا پتھر یا کیا۔ ہے"۔ اسی طرح حضرت قطب عالم کے فرزند یا خلیفہ حضرت شاہ عالم کے اقوال و ملفوظات میں جو جمعات شاہی میں محفوظ ہیں، ہندی اور عجراتی کے بہت سے فقرے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثلاً "ابے چھوکرا، بے ادبی بگذار و گستاخی مکن" اور خاص طور پر "پڑھ ڈوکرے" والا فقرہ تو بہت مشہور ہے

گجرات کی قدیم اُردو کو جسے اہلِ گجرات، گجری کے نام سے پکارتے تھے، چند نمونے دستیاب ہوئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ گجرات میں اُردو کا استعمال بھی ادبی طور پر ہونے لگا تھا۔ اس سلسلے میں تین نام بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ شیخ بہاء الدین باجن (وفات ۱۵۱۶ء) شیخ خوب محمد چشتی (وفات ۱۶۱۴ء) اور شاہ علی جیو گام دھنی (وفات ۱۵۶۵ء)۔ بہاء الدین باجن فارسی اور ہندی دونوں میں شعر کہتے تھے۔

شاہ علی جیو گام دھنی کے کلام کا مجموعہ "جواہر اسرار اللہ" مصنفِ "مرآۃ احمدی" کے نزدیک دیوانِ مغربی کے ہم پایہ ہے۔ انہوں نے اظہارِ عشق میں ہندی شعراء کا اسلوب اپنایا ہے۔ شیخ خوب محمد خوب چشتی کی سب سے مشہور کتاب "خوب ترنگ" ہے جس میں صوفیانہ اصطلاحات میں تصوف کے مطالب و مقامات کا بیان ہے۔ مثنوی کی زبان کو عربی اور فارسی آمیز گجراتی کہا گیا ہے۔

سیکولر شاعری میں گجرات میں پہلا نام امین کا ملتا ہے جن کا انتقال اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں ہوا۔ انہوں نے گوجری زبان میں یوسف زلیخا کی داستان منظوم کی ہے جو کافی ضخیم ہے۔ امین نام کا ایک اور شاعر بھی محمود شاہ ثانی کے ندیمانِ خاص سے تھا! اور اس نے بہرام گور اور حسن بانو کے حسن و عشق کا فسانہ نظم کرنا شروع کیا تھا، لیکن مکمل نہ کر سکا۔ دولت نامی ایک دوسرے شاعر نے اُسے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ ان قدیم شعراء کے بعد گجرات میں ولی کا نام آتا ہے۔ ولی اور عزلت کے بعد تا زمانہ حال گجرات میں کوئی ایسا شاعر نہیں گزرا جس نے اُردو شاعری کی مرکزی روایت میں اپنا مقام پیدا کیا ہو۔ محمد علوی جو ولی ہی کے خاندان سے ہیں پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ولی کے بعد گجرات کے باہر اُردو کے اہم مراکز سے دادِ سخن وصول کی ہے۔

مادری زبان

مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق گجرات کے وہ لوگ جنھوں نے اپنی مادری زبان اُردو لکھوائی ہے ان کی تعداد حسب ذیل ہے۔

۱۹۵۱	۳۹۶٬۹۲
۱۹۶۱	۵۹۴٬۵۳۸
۱۹۷۱	۵۸۱٬۵۰۸

اس رپورٹ سے ظاہر ہے کہ اُردو بولنے والوں کی تعداد آبادی کے تناسب سے ۱۹۵۱ء کی بہ نسبت ۱۹۶۱ء میں بڑھی ہے۔ لیکن ۱۹۷۱ء میں گھٹی ہے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نظر نہیں آتی کہ یا تو لوگوں نے مادری زبان لکھوانے میں یا مردم شماری کے عاملوں نے صحیح اندراجات بھرنے میں بے پروائی سے کام لیا ہے۔ دیہاتوں اور شہروں میں مسلمانوں کے وہ فرقے جن کی مادری زبان گجراتی، کچھی یا مارواڑی ہے اُردو بولنے والے مسلمانوں کے ساتھ اُردو ہی میں بات چیت کرتے ہیں۔ اس طرح گجرات کا مسلمان عام طور پر دولسانی واقع ہوا ہے۔ جہاں تک بول چال کی زبان کا تعلق ہے وہ یکساں آسانی اور روانی کے ساتھ گجراتی اور اُردو بولتا ہے۔ دور دراز کے دیہاتوں میں بھی علمائے دین کے وعظ شستہ اُردو میں ہوتے ہیں۔

گجرات میں اُردو اور اُردو کی تعلیم کی طرف حکومت کی طرف سے کسی جانبداری کا رویہ اختیار نہیں کیا گیا۔ البتہ وہ نجی ہائی اسکول جہاں گجراتی کی تعلیم ہوتی ہے اُن میں اُردو اور فارسی کی طرف کوئی ہمدردانہ رویہ بھی اپنایا نہیں گیا۔ بہت سے ایسے علاقوں کے ہائی اسکول جہاں مسلمانوں کی تعداد معتدبہ تھی اور جہاں آزادی تک اُردو اور فارسی کی تعلیم کا معقول انتظام تھا، ان میں سے آہستہ آہستہ اُردو اور فارسی دونوں کو ختم کر دیا گیا۔ یہی رویہ مشن اسکولوں نے بھی اپنایا۔ اب ان اسکولوں میں مسلمان بچے اُردو اور فارسی کے بجائے گجراتی اور سنسکرت پڑھتے ہیں۔ گجرات میں اُردو کی طرف اُردو والوں کا رویہ بھی نہایت افسوسناک اور عبرت ناک رہا ہے۔

آزادی ملتے ہی گجرات کے مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ گجرات میں اُردو ذریعۂ تعلیم کی اب ضرورت نہیں رہی اور اگر طالب علم ہائی اسکول میں تمام مضامین اُردو میں پڑھتا ہے تو یونی ورسٹی کی اعلیٰ تعلیم میں بس کا میڈیم اب گجراتی بن چکا تھا، اسے دشواریاں پیش آئیں گی اب صورت حال یہ ہے کہ بچہ اپنی ابتدائی تعلیم یعنی پہلی سے لے کر ساتویں جماعت تک کی تعلیم اُردو میڈیم میں لیتا ہے اور آٹھویں جماعت سے گیارھویں جماعت تک تمام مضامین گجراتی میں پڑھتا ہے۔ پڑھے لکھے اور متمول مسلمان اپنے بچوں کو ابتدا ہی سے گجراتی یا انگریزی اسکولوں میں داخل کرا دیتے ہیں۔

گجرات میں اُردو میڈیم کا کوئی ہائی اسکول نہیں ہے۔ البتہ پرائمری اسکول تمام ریاست میں پھیلے ہوئے ہیں کثیر لسانی اقلیات[1] کے مطابق ۶۸-۱۹۶۷ء میں اُردو کے پرائمری اسکولوں کی تعداد گجرات میں ۱۳۳ تھی جن میں ۱۰۳۸۰ بچے تعلیم پاتے تھے۔ احمد آباد میں ایک سے چار جماعتوں تک اُردو اسکولوں کی تعداد ۴۹ ہے جن میں ۱۳۸۴۵ بچے تعلیم پاتے ہیں۔ پانچ سے سات جماعتوں والے اسکولوں کی تعداد ۲۹ ہے جن میں ۹۸۶۶ بچے تعلیم پاتے ہیں۔ اس طرح صرف احمد آباد میں ۷۸ اسکول ہیں۔ اور ان میں ۲۳۷۱۱ بچے پڑھتے ہیں۔ ساتویں جماعت کے بعد یہ بچے مڈل اسکول میں جاتے ہیں جہاں اُردو صرف ایک مضمون کے طور پر انہیں پڑھائی جاتی ہے اور باقی مضامین گجراتی کے ذریعے پڑھائے جاتے ہیں۔ ایسے اسکول جو اُردو کو صرف ایک مضمون کے طور پر پڑھاتے ہیں عموماً مسلمان ٹرسٹوں ہی کے قائم کیے ہوئے ہیں مثلاً انجمن اسلام ہائی اسکول احمد آباد، اینگلو عربیک ہائی اسکول سورت، مدرسہ ہائی اسکول بڑودہ۔ ایسے اسکولوں کی تعداد ریاست میں سات آٹھ سے زیادہ نہیں ہے۔

جہاں تک یونی ورسٹی کی تعلیم کا تعلق ہے پورے گجرات میں صرف ایک کالج یعنی گجرات کالج احمد آباد میں اُردو کے ڈگری کورس کا انتظام ہے۔ پوسٹ گریجویٹ کی تعلیم کا انتظام بھی صرف گجرات یونی ورسٹی میں ہے لیکن ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ یونی ورسٹی میں فارسی کا ریڈر تو ہے لیکن اُردو کا لکچرر تک نہیں۔ ایم اے کی کلاسیں صرف گجرات کالج میں ہوتی ہیں اور نصاب مختلف کالجوں کے مختلف پروفیسروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ گجرات میں اُردو کی طرف طالب علموں کا رجحان ہمیشہ کم رہا ہے۔ اُردو اسپیشل میں طالب علموں کی تعداد ایک دو سے زیادہ کبھی بڑھی نہیں۔ یہی حال ایم اے کا رہا ہے۔ کالجوں میں پری یونی ورسٹی میں اُردو ایک اختیاری مضمون کے طور پر ہے۔ پوری گجرات یونی ورسٹی میں اُردو بطور ایک اختیاری مضمون لینے والوں کی تعداد ہر سال پچاس ساٹھ سے زیادہ نہیں ہوتی۔

گجرات میں پانچ یونی ورسٹیاں ہیں۔ لیکن سوائے گجرات یونی ورسٹی

---

[1] لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی حالیہ (بارھویں) رپورٹ کے مطابق ریاست گجرات میں ۶۸-۱۹۶۷ء میں ایسے ثانوی اسکولوں کی تعداد دس تھی جہاں ذریعۂ تعلیم اُردو تھی۔ ان اسکولوں میں تعلیم پانے والے بچوں کی تعداد ۱۴۰۱ اور استادوں کی تعداد ۲۵ تھی۔

کے اُردو کے ڈگری کورس کا انتظام کہیں نہیں۔ البتہ دوسری یونی ورسٹیوں میں پری آرٹس اور کہیں کہیں فرسٹ ایر اور سکنڈ ایر بی اے میں اُردو اختیاری اور ثانوی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ گجرات یونی ورسٹی سے ۵۱ کالج ملحق ہیں۔ ان میں سات یا آٹھ کالجوں میں اُردو اختیاری مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ عموماً ایک ہی اُستاد اُردو اور فارسی پڑھاتا ہے۔ بہت سے کالجوں میں فارسی ہے لیکن اُردو نہیں، اور فارسی کا اُستاد بھی اکثر پارٹ ٹائم ہوتا ہے۔ سابقہ گجرات یونی ورسٹی کے ۲۲ کالجوں میں سے صرف ایک یا دو کالجوں میں اور سورا شٹر یونی ورسٹی کے ۴۵ کالجوں میں سے صرف ایک کالج میں اُردو پڑھانے کا انتظام ہے۔

اخبارات ورسائل: گجرات میں اُردو اخبارات اور رسائل کی کوئی تاریخ نہیں۔ یہاں سے کبھی کوئی ایسا اخبار یا رسالہ نہیں نکلا جو کسی بھی اعتبار سے اہم اور وقیع قرار دیا جائے۔ کسی زمانے میں مولانا حبیب الرحمٰن غزنوی نے روزنامہ "پیغام" نکالا تھا جو مشکل سے سال دو سال زندہ رہا اور ختم ہو گیا۔ اسی طرح ایک ہفتہ وار اخبار "آزاد" کا بھی پتہ چلتا ہے جو خدا داد خاں وحشی کی ادارت میں آج سے تیس سال پہلے نکلا تھا، اور چند اشاعتوں کے بعد ختم ہو گیا۔ یہی حال رسالوں کا ہے۔ بہت چھان بین کرنے کے بعد بزرگوں کی زبانی اتنا جاننے کو ملا ہے کہ ساٹھ ستر سال پہلے احمد آباد اور پالن پور سے ایک دو ایسے رسالے نکلتے تھے جن میں مقامی شعراء کا کلام چھپتا تھا۔ یہ رسالے بھی مشکل سے سال بھر جیتے ہوں گے۔ گویا اخبارات اور رسالوں کے معاملے میں گجرات بالکل صفر ہے۔

یہاں اُردو کا کوئی چھاپہ خانہ نہیں۔ اُردو کے ہینڈ بل اور پوسٹر تک بمبئی کے پریس میں چھپوانے پڑتے ہیں۔ نو جیون پریس، گجرات یونی ورسٹی پریس اور ایک دو پرائیویٹ پریسوں میں اُردو ٹائپ کا انتظام ہے لیکن اس کا استعمال امتحان کے پرچوں اور یونی ورسٹی کی اُردو فارسی کی ایک دو نصاب کی کتابوں تک محدود ہے۔

گجرات میں ادبی اور علمی کام کرنے والوں کا قحط ہے سوائے مرحوم قاضی اختر جوناگڈھی، مرحوم حبیب الرحمٰن غزنوی، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اور سید اکبر علی ترمذی کے ایک بھی ایسا نام نہیں جس نے اُردو کی علمی، تحقیقی اور ادبی دُنیا کو اپنا عطیہ پیش کیا ہو۔

مرحوم قاضی اختر جوناگڈھی ایک قابلِ قدر علمی اور ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ ولی پر ان کی تحقیقات کی بڑی اہمیت ہے۔ اسلامی تہذیب پر بھی انہوں نے پُرمغز مقالے لکھے ہیں۔ اقبال کی بلیو گرافی پر اُن کی کتاب اقبالیات میں ایک اضافہ ہے۔ وہ شاعر بھی تھے اور "لمعاتِ اختر" کے نام سے ان کا ایک مجموعۂ کلام بھی شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے بھی ولی پر گراں مایہ تحقیقاتی کام کیا ہے۔ "ولی گجراتی" کے علاوہ ان کی دوسری اہم تصنیف "اُردو غزل سے ولی تک" اہلِ علم کی نظروں میں وقیع مقام پا چکی ہے۔ مرحوم مولانا حبیب الرحمٰن غزنوی نے بہت سے مضامین لکھے ہیں۔ لیکن افسوس کہ وہ رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ اور کتابی صورت میں ابھی تک اُن کی شیرازہ بندی نہیں ہو سکی۔ سید اکبر علی ترمذی صاحب نے غالب کے چند نادر خطوط پر انگریزی اور اُردو میں ایک اہم کتاب پیش کی ہے۔ اکبر علی ترمذی، ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی اور ڈاکٹر احمد حسین قریشی مرحوم پروفیسر ابراہیم ڈار کے ہونہار شاگرد ہیں اور ان تینوں میں علمی ذوق اور تحقیقی لگن پیدا کرنے میں ڈار صاحب کا بڑا حصہ تھا۔ ضیاء الدین ڈیسائی آثارِ قدیمہ میں، اکبر علی ترمذی محکمۂ مخطوطات میں اور ڈاکٹر قریشی بطور فارسی کے پروفیسر کے گجرات کالج احمد آباد میں کام کر رہے ہیں۔ ان حضرات کی دلچسپی کا موضوع اُردو سے زیادہ تاریخ اور ہندوستان کا فارسی ادب رہا ہے لیکن چونکہ اُردو سے بھی اُن کا تعلق رہا ہے اس لیے اُن کا ذکر ضروری تھا۔

مظہر الحق علوی اب تک چالیس پچاس ناولوں کے ترجمے کر چکے ہیں۔ بچوں کی بے شمار کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ انگریزی ناولوں کے ساتھ ساتھ اب وہ گجراتی کے اہم ناولوں کا بھی اُردو میں ترجمہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہوں نے گجراتی کے مشہور ناول نگار جھویر چند مگھانی کے ایک ناول سے کیا ہے۔

گجرات میں اُردو شاعری کی کبھی کمی نہیں رہی۔ عظیم الشان مشاعرے ہمیشہ برپا ہوتے رہے اور چھوٹی موٹی شعری نشستوں کی بھی کافی گرم بازاری رہی ہے۔ اُردو والے چاہے اور کچھ کریں یا نہ کریں ایک تخلص رکھ کر غزلیں ضرور کہتے ہیں۔ گجرات کے سرحلاقے میں دو چار اور بعض علاقوں میں تو بیسیوں کی تعداد میں غزل گو شاعر مل جائیں گے۔ گجرات میں مشاعروں اور ادبی کانفرنسوں کی ہمیشہ دھوم رہی ہے اور اُن کی بدولت گجرات کے لوگ اُردو کے نامور شعراء اور ادباء سے واقف ہوتے رہتے ہیں۔

گجرات کے بزرگ شاعروں میں مرحوم فخر الدین فخر احمد آبادی اور مرحوم کلیم احمد آبادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ کلیم صاحب کا مجموعۂ کلام "متاعِ کلیم" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ فخر صاحب کا ایک مجموعہ "میخانۂ غوث" کے نام سے چھپ چکا ہے لیکن ان کا بہت سا کلام ہنوز زیورِ

طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔ گجرات کے جن دیگر شعرا کے مجموعے ابھی تک شائع ہو چکے ہیں اُن کے نام ذیل میں درج ہیں۔

حزیں قریشی "بہشتِ خیال"۔ جمال قریشی "جمالِ کربلا" جمیل کلیمی "لفظوں کا سفر"۔ خلش بڑودوی "قطارِ شیشہ" امام الدین رسوا "صحبتیات"۔ محمد علوی "خالی مکان" اور "آخری دن کی تلاش"۔

گجرات کے ایک مشاق غزل گو شاعر مرحوم رنجی صاحب کا مجموعہ "کائنات" کے عنوان سے زیرِ طبع ہے۔ اسی طرح احمد آباد کے ایک گوشہ نشین شاعر مرحوم کامل صاحب کا مجموعہ بھی طباعت کی آخری منزلوں میں ہے۔

محمد علوی اور عادل منصوری مقامی حدود سے آگے نکل کر اُردو شاعری کی مرکزی روایت میں اپنا مقام پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ جدید اُردو شاعری میں ان دونوں نے جو نام پیدا کیا وہ گجرات کے باعثِ فخر ہے۔

آزادی کے بعد کی ایک دلچسپ ادبی خاصیت ادیب کی دولسانیت ہے۔ عادل منصوری اُردو اور گجراتی دونوں میں یکساں دسترس رکھتے ہیں۔ اُردو میں ان کا مجموعہ کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا لیکن گجراتی میں اُن کے دو شعری مجموعے اور دو ڈراموں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ گجراتی غزل کو نیا موڑ دینے میں عادل کی غزلوں کا بڑا حصہ ہے۔ اُن کے ڈرامے زیادہ تر ایبسرڈ ٹائپ کے ہیں اور کافی مقبول ہیں۔ راقم الحروف بھی اُردو میں تنقیدیں اور گجراتی میں ڈرامے لکھتا ہے۔ ڈراموں کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے اور دوسرا زیرِ ترتیب ہے۔ دولسانی ادیبوں میں شیخ آدم آبو والا کا نام بھی قابلِ ذکر ہے وہ گجراتی کے ایک مقبول شاعر ہیں اور اُردو میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اُن کی نظموں کا ایک مجموعہ "اپنے اک خواب کو دفنا کے ابھی آیا ہوں" کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ شیخ آدم آبو والا پندرہ بیس سال سے جرمنی میں مقیم ہیں۔ اس عرصے میں ان زبانوں کا شعری مزاج بدل گیا جن میں وہ تخلیقِ شعر کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی آواز بہت دُور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

جہاں تک تنقید کا تعلق ہے راقم الحروف کے بے سروپا مضامین کے علاوہ اس شعبے میں گجرات کا عطیہ صفر کے برابر ہے۔

سنجیدہ ادبی مذاق کی عدم موجودگی میں ہر قسم کی ادبی سرگرمیاں محض وقتی اُبال ہوتی ہیں۔ گجرات میں اُردو کی ادبی انجمنوں کی کمی نہیں ہے ہر شہر میں کم از کم دو تین انجمنیں تو مل ہی جائیں گی۔ احمد آباد میں تو انجمنوں کی تعداد پندرہ بیس تک پہنچتی ہے۔ ان انجمنوں کا واحد کام مشاعرے برپا کرنا ہے۔

۱۹۴۶ء میں احمد آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی تھی۔ اور راقم الحروف ہی اس کا سکریٹری تھا۔ اس انجمن نے بڑے شاندار مشاعرے اور کانفرنسیں کیں۔ احمد آباد کا مزدور طبقہ ترقی پسند ادب کا بڑا سرپرست تھا۔ مشاعروں میں بڑی تعداد میں مزدور شریک ہوتے اور داد و تحسین دیتے۔ اُردو کے مقتدر رسالے "ادبِ لطیف" "سویرا" "نقوش"، "نیا ادب"، مزدور علاقوں میں اور ٹریڈ یونین لائبریریوں میں گشت کرتے اور چاروں طرف ایک ہموار ادبی فضا پیدا کرتے ترقی پسند تحریک نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عوام اعلیٰ ادب کی سرپرستی کر سکتے ہیں۔ تحریک کے خاتمے کے ساتھ عوام کا اعلیٰ ادب سے رشتہ بھی ختم ہو گیا اور گو مزدور علاقوں میں آج بھی بہت سی ادبی انجمنیں قائم ہیں اور شاندار مشاعرے ہوتے ہیں، لیکن نہ تو لوگ ادبی رسالوں میں دلچسپی لیتے ہیں نہ ادبی کتابوں میں۔ ٹریڈ یونین لائبریریوں کا حال بھی پتلا ہے اور ان علاقوں میں وہ ادبی فضا درہم برہم ہو چکی ہے جو ترقی پسند تحریک نے کسی زمانے میں قائم کی تھی۔ حال ہی میں ترقی پسند انجمن کی از سرِ نو تنظیم کی گئی ہے اور وہ اپنا کام آہستہ آہستہ آگے بڑھا رہی ہے۔

گجرات میں انجمن ترقی اُردو بھی قائم ہے لیکن بے جان اور بے عمل ہے۔ فی الحال گجرات میں کوئی ایسی ادبی انجمن، اکاڈمی یا تحقیقی ادارہ نہیں جو علمی اور ادبی کام کرتا ہو۔ مطبوعات شائع کرتا ہو، یا ریسرچ کے کام کی حوصلہ افزائی کرتا ہو۔ گجرات میں پانچ یونیورسٹیاں ہیں کہیں میں نہ تو اُردو کا تحقیقی کام ہوتا ہے نہ وہاں سے کسی موضوع پر اُردو کی کوئی کتاب شائع ہوتی ہے۔ اگر کتابوں کی اشاعت کا اوسط نکالا جائے تو فی برس ایک کتاب بھی نہیں آتی۔ ایسی صورت میں سرکاری یا نیم سرکاری اداروں سے ملنے والی امداد کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

گجرات میں ریاستی حکومت کی طرف سے مصنفوں کی سرپرستی کا کوئی انتظام نہیں۔ آج تک ریاستی سرکار نے کسی اُردو کتاب کی اشاعت میں مالی امداد نہیں دی۔ نہ کوئی انعام یا اعزاز دیا۔

یہاں پر یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ اس معاملے میں اُردو والوں نے سرکار کو حقیقی صورتِ حال سے واقف کرانے اور اپنے حقوق منوانے کے لئے کیا کوششیں کی ہیں۔ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے

(بقیہ صفحہ ۸۵ پر)

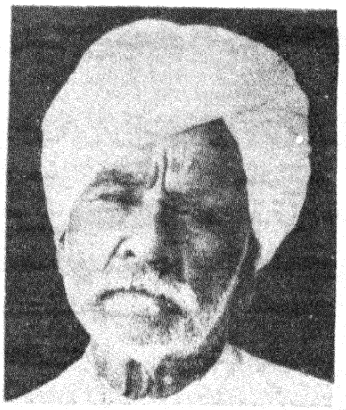

جوشؔ ملسیانی

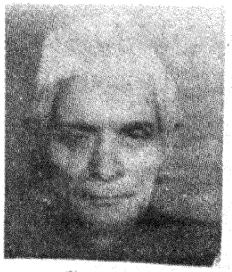

میلا رام وفاؔ

ست پرکاش سنگرؔ

روشنؔ پٹیالوی

شبابؔ للت

شرون کمار ورما

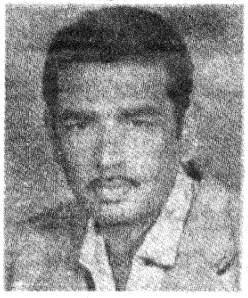

پریم وار برٹنی

بلبیر راٹھی

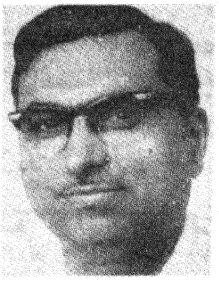

مہیشؔ پٹیالوی

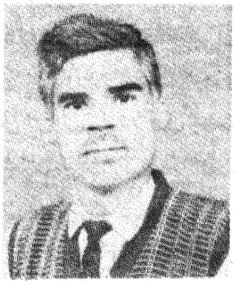

مصورؔ سبزواری

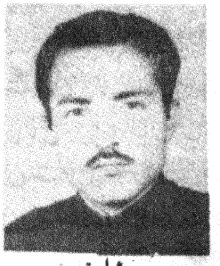

نریش

عاقلؔ لاہوری

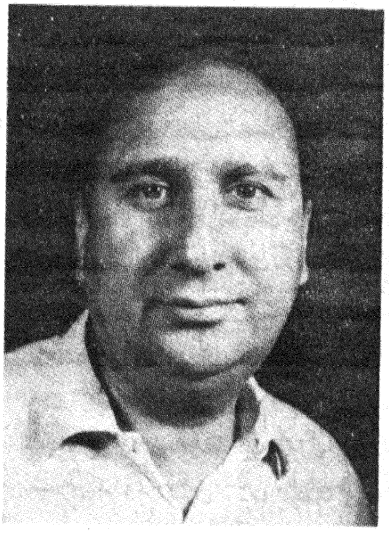

پنجاب، ہریانہ، ہماچل پردیش میں اُردو

نند کشور وکرم

پروفیسر محمود شیرانی کے قول کے مطابق اُردو کا گھر پنجاب ہے۔ اُردو کی ابتدائی شکل دکنی کی پنجابی سے مماثلت اس امر کا بین ثبوت ہے۔ گو یہ امر بعض محققین کے نزدیک متنازعہ فیہ ہے تاہم اس سے انکار مشکل ہوگا کہ پنجاب کا ابتدا ہی سے اُردو سے ایک گہرا تعلق رہا ہے اور یہ کہ اہلِ پنجاب نے تاریخِ ادب میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ اُردو کبھی کسی علاقے، صوبے، شہر یا فرقے کی زبان نہیں رہی اور اس کی ترقی و ترویج میں برصغیر کے تمام فرقوں، مذہبوں اور علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے تاہم ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد پنجاب میں اُردو کو ترقی و فروغ کے غیر معمولی مواقع نصیب ہوئے اور لاہور اُردو کا ایک اہم مرکز بن گیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد جب ملک پر انگریزوں کا تسلط ہوگیا۔ اور اُردو کے مسلمہ مراکز دہلی اور لکھنؤ کے عوام انگریزوں کے انتقام کا شکار ہوئے تو اکثر اہلِ قلم ان مراکز سے ہجرت کر کے ہندوستان کے دیگر محفوظ مقامات میں گوشہ نشین و پناہ گزین ہوئے۔ اس تباہی و بربادی کے خونیں دور میں "آبِ حیات" کے مصنف مولانا محمد حسین آزاد بھی مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے بالآخر لاہور پہنچے۔ اُن کی آمد سے لاہور کی علمی اور ادبی زندگی میں بہار سی آگئی اور پھر اُن کی اور مولانا الطاف حسین حالی کی کوششوں سے پنجاب میں "علمی انجمن" کی سرگرمیوں کا آغاز ہوا، اور پنجاب میں اُردو بڑی تیزی سے ترقی کے مراحل طے کرنے لگی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں پنجاب سے علامہ اقبال ایسی عظیم المرتبت شخصیت کا ظہور ہوا جن کی حیات آفریں فلسفیانہ شاعری نے نہ صرف اُردو زبان و ادب کو بلکہ پنجاب کو بھی بلند مرتبہ عطا کیا۔ اقبال سے پیشتر پنجاب سے تعلق رکھنے والی ایک نامور ہستی مولانا حالی کی تھی جنہوں نے اپنی شاعری اور "مقدمۂ شعر و شاعری" سے ایک نئی طرح ڈالی اور شعر و ادب کو ایک نئی سمت اور انداز سے روشناس کرایا۔ غالباً غالب کے بعد اقبال ہی ایسے عالی مرتبت اُردو شاعر تھے جن کی شہرت حدودِ ہندوستان سے نکل کر غیر ممالک میں بھی پھیلی۔ حفیظ جالندھری نے شاہنامۂ اسلام لکھ کر صرف پنجاب میں ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستان میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی تھی۔

وہ زمانہ قومی بیداری کا تھا۔ ملک جدوجہدِ آزادی میں انگریزی اقتدار سے نبرد آزماں تھا۔ لالہ لاجپت رائے اور مولانا ظفر علی خاں کی سیاسی تحریر و تقریر نے ملک میں سیاسی بیداری پیدا کی۔ اور پھر بتدریج پنجاب کی اُردو سرگرمیوں میں اضافہ ہونے لگا۔ لاہور اُردو کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ بیرونِ پنجاب کے متعدد شاعروں اور ادیبوں نے بھی لاہور ہی کو اپنا مرکز و وطن بنا لیا۔

اگرچہ ۱۸۵۷ء سے پیشتر پنجاب میں "شملہ اخبار"، "چشمۂ فیض"، "سیالکوٹ"، "کوہ نور"، "دریائے نور"، "لاہور گزٹ"، "ریاضِ نور" وغیرہ اخبارات شائع ہوتے تھے لیکن دنیائے صحافت میں اس کی دھوم تب مچی جب ۱۸۸۷ء میں لاہور سے "پیسہ اخبار" کا اجرا ہوا۔ اس اخبار کے بعد لاہور سے بہت سے اخبارات منظرِ عام پر آنے لگے۔ یہاں تک کہ جب ملک کی تقسیم ہوئی تو لگ بھگ بیس روزنامے پنجاب سے شائع ہو رہے تھے۔ ان میں سے کچھ اخبارات ایسے تھے جنہیں ملک گیر شہرت و مقبولیت حاصل تھی اور پنجاب کی سیاست میں بھی غیر معمولی اثر و اقتدار حاصل تھا۔ لاہور سے اُن دنوں "پرتاپ"، "ملاپ"، "زمیندار"، "امروز"، "احسان"، "نوائے وقت"، "شہباز"، "جے ہند"، "منشور"، "رنجیت"، "بندے ماترم"، "اجیت"، "پربھات"، "آزاد" اور "ویر بھارت" شائع ہوتے تھے۔ اُن کے علاوہ ایک روزنامہ "شمس" ملتان سے اور "الفضل" قادیان سے شائع ہوتا تھا۔ ان روزناموں کے علاوہ ایک سو سے زائد رسائل شائع ہوتے تھے، جن میں سے ادبی دنیا، ادبِ لطیف، ہمایوں، "کہکشاں"، "عالمگیر"، "شاہکار"، "کارواں"، "پریت لڑی"، "تہذیبِ نسواں" اور "رہنمائے تعلیم" ایسے بلند پایہ ادبی و تعلیمی جریدے شامل تھے۔ غالباً اتنے بلند پایہ ادبی جریدے لاہور کے علاوہ کسی شہر سے تو کجا کسی صوبے سے بھی شائع نہیں ہوتے تھے۔ ان رسائل کے علاوہ بیسویں صدی، "مست قلندر"، "لطفِ شباب"، "نرالا" اور "مستانہ جوگی" ایسے لگ بھگ دو درجن ماہنامے بھی اہلِ اُردو کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

تقسیمِ ملک سے پیشتر لاہور میں درجنوں اشاعتی ادارے اور ادبی انجمنیں تھیں اور یہ شہر ادب کی ہر تحریک میں پیش پیش تھا۔ یہاں اشاعتی اداروں میں دارالاشاعت، مکتبہ اُردو، مکتبہ جدید، مکتبہ ادبی دنیا، نراین دت سہگل اینڈ سنز، عطر چند کپور اینڈ سنز، تاج کمپنی، ادبی مرکز، لاجپت رائے اینڈ سنز، گلاب سنگھ اینڈ سنز اور ادبی انجمنوں میں انجمنِ اُردو پنجاب، انجمنِ ترقی پسند مصنفین، حلقۂ اربابِ ذوق، مجلسِ اربابِ علم اور حلقۂ نیازمندانِ لاہور خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

افسانہ نویسی کا دور شروع ہوا تو پنجاب سے اتنے مشہور و

معروف افسانہ نگار منظرِ عام پر آئے جتنے کسی اور صوبے کو نصیب نہ ہوئے۔ مہاشہ صدرشن، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، اُپندر ناتھ اشک، خواجہ احمد عباس، ممتاز مفتی، غلام عباس، منشی راج رہبر، دیویندر ستیارتھی، ناہید عالم، ایم اسلم، حجاب امتیاز علی، بلونت سنگھ سب پنجاب کی ہی دین ہیں۔

اسی طرح تلوک چند محروم، جوش ملسیانی، فیض احمد فیض، قتیل شفائی، احمد راہی، اعجاز بٹالوی، اختر شیرانی، ساحر لدھیانوی، احمد ریاض، قیوم نظر، طفیل ہوشیارپوری، یوسف ظفر، الطاف مشہدی، حفیظ ہوشیارپوری، ن۔م۔ راشد، عبدالمجید بھٹی، قدم، مجید لاہوری، ظہیر کاشمیری، احسان دانش، میراجی، ہری چند اختر، کوپال متل، عابد علی عابد، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد اور دوسرے ممتاز شعراء کا تعلق بھی اسی خطۂ زرخیز سے ہے۔ ان کے علاوہ سر عبدالقادر، حافظ محمود شیرانی، مولانا تاجور نجیب آبادی، پطرس بخاری، ڈاکٹر تاثیر، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، میاں بشیرالدین، صلاح الدین احمد، چراغ حسن حسرت، سید عبداللہ، وقار انبالوی، عزیز احمد، حمید اختر، امتیاز علی تاج، عاشق بٹالوی، شورش کاشمیری، باری علیگ، کنہیالال کپور ایسے ملک گیر شہرت کے مالک ادیبوں اور صحافیوں کی سرگرمیوں کا مرکز بھی لاہور ہی تھا۔

آزادیٔ وطن کے بعد ملک کی ایک بہت بڑی آبادی کے ساتھ ساتھ ادباء و شعراء کو بھی ہجرت کرنا پڑی۔ لاہور کے بہت سے روزنامے اور جریدے جو ہندوؤں کی ملکیت تھے، دہلی یا جالندھر سے شائع ہونے لگے۔ خوشتر گرامی کے بیسویں صدی کے علاوہ "شیرِ پنجاب" مستانہ جوگی جیتا "مست قلندر" پارس، "نرالا" اور "ویر بھارت" دہلی کو اپنا مرکز بنایا لیکن روزانہ "پرتاپ" "ملاپ" "ہند سماچار" اور روزنامہ "پربھات" اور "ادراجیت" جالندھر سے شائع ہونے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ہی عرصہ میں جالندھر مشرقی پنجاب میں اخبارات و رسائل کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ لیکن اسکولوں میں اُردو پڑھنے والوں کی تعداد تدریج کم ہونے لگی ایک وجہ یہ بھی کہ ایک تو اُردو جاننے والوں کی اکثریت مغربی پاکستان میں ہجرت کر گئی۔ دوم مشرقی پنجاب میں ہندی اور پنجابی کے تنازعہ کی وجہ سے صوبے کی از سرِ نو تشکیل وقوع پذیر ہوئی جس کے باعث پہلے سے تقسیم شدہ اس صوبے کو دو چھوٹی چھوٹی ریاستوں پنجاب، ہریانہ میں تقسیم کر دیا گیا اول الذکر کی زبان پنجابی اور آخر الذکر کی ہندی قرار پائی۔ مختصراً یہ کہ آزادی کے بعد بچا کھچا مشرقی پنجاب اب پنجاب ہریانہ اور ہماچل پردیش میں بٹ گیا۔

اُردو بولنے والوں کی تعداد: تقسیم سے پیشتر پنجاب میں اُردو مادری زبان والوں کی تعداد کافی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس میں کمی ہوتی گئی۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں پنجاب میں ۲۷۵۵۶۶۰ کی مادری زبان اُردو تھی لیکن آئندہ دس برس میں سات اضلاع ہریانہ میں چلے جانے سے اُردو مادری زبان والوں کی تعداد میں غیر معمولی کمی واقع ہوئی۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۲۵۵۱۰۶۰ افراد کی آبادی میں سے صرف ۲۹۰۰۳ افراد کی مادری زبان اُردو تھی۔ بہرحال موجودہ پنجاب میں اُردو، لکھ، بول اور پڑھ سکنے والوں کی تعداد اتنی کم نہیں جتنی کہ مردم شماری کی رپورٹ سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں سے شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کی تعداد اشاعت کے پیشِ نظر یہ قیاس بے جا نہ ہوگا کہ یہاں اُردو داں لوگوں کی تعداد ۲۰ لاکھ سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ۴۰ سال سے زائد عمر کے تعلیم یافتہ اور نیم خواندہ افراد کی اکثریت اُردو لکھ پڑھ اور بول سکتی ہے۔

تعلیمی سہولتیں: نئی نسل کا اُردو پڑھنے لکھنے کی جانب کوئی رجحان نہیں اور ریاست میں اُردو کی تعلیم و تدریس نہ ہونے کے برابر ہے۔ لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی بارہویں رپورٹ کے مطابق ریاست میں ۱۹۶۷-۶۸ء میں اُردو کے کُل دو پرائمری اسکول اور دو ثانوی اسکول تھے۔ ان اسکولوں میں اُردو کے ذریعہ تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد بالترتیب ۱۹۲۷ اور ۴۲۸ تھی۔ ان اسکولوں میں معلموں کی مجموعی تعداد ۳۶ تھی۔

تاہم اب ریاستی حکومت اس طرف سنجیدگی سے توجہ دے رہی ہے۔ اس نے اُردو کی ترقی و فروغ پر پانچ لاکھ روپیہ سالانہ خرچ کرنے کا پروگرام مرتب کیا ہے۔ اس پروگرام کے تحت ریاست میں اُردو کے چار اسکول کھولے جائیں گے اور سہ لسانی فارمولے پر عمل کرتے ہوئے وہاں تمام اسکولوں میں اُردو کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔

پنجاب یونی ورسٹی اور ریاست کے کئی کالجوں میں اُردو تعلیم و تدریس کا انتظام ہے۔ اس کے علاوہ پنجابی یونی ورسٹی پٹیالہ سے صرف ایم اے اُردو کے امتحانات دینے کا ہی انتظام نہیں بلکہ یہاں کے شعبۂ البشریاتی لسانیات کے زیرِ اہتمام اُردو سیمینار منعقد کئے

جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک سیمینار پچھلے دنوں مذکورہ بالا شعبے نے منعقد کیا تھا جس میں پروفیسر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر عبدالغفار شکیل، ڈاکٹر منہاج دُوا، اقتدار حسین، مرزا خلیل احمد بیگ اور نصیر احمد خاں نے حصہ لیا اور مقالے پڑھے۔ اس سیمینار میں ایک تجویز پاس کی گئی کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے تعاون و اشتراک سے پنجابی یونیورسٹی میں ایک ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کا مقصد اُردو پنجابی کا باہمی تحقیقی مطالعہ ہو۔

اُردو اخبارات و رسائل

اس صوبے میں اُردو روزناموں کی تعداد (پندرہ) سوائے اُتر پردیش کے دوسری تمام ریاستوں سے زیادہ ہے لیکن جہاں تک تعدادِ اشاعت کا سوال ہے۔ اُتر پردیش بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پنجاب کے کثیرالاشاعت روزنامے "ہند سماچار" کی تعدادِ اشاعت ۱۲۰۰۰ ہے جبکہ اتر پردیش کے تمام اُردو روزناموں کی مجموعی تعدادِ اشاعت لگ بھگ ۳۸ ہزار ہے۔ حالانکہ وہاں تقریباً ۹۲ لاکھ افراد کی مادری زبان اُردو ہے اور پنجاب میں صرف ۲۹ ہزار کی۔

مہاشہ کرشن کا "پرتاپ" پنجاب کا سب سے پرانا روزنامہ ہے۔ یہ دہلی اور جالندھر سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے جالندھر ایڈیشن کی تعدادِ اشاعت ۱۷۵۷۶ ہے۔ شری ویریندر اس کے ایڈیٹر ہیں۔ اور اس کا سنِ اجرا ۱۹۱۹ء ہے۔ مہاشہ خوشحال چند خورسند نے روزانہ "ملاپ" کا اجرا ۱۳ اپریل ۱۹۲۳ء کو لاہور میں کیا تھا۔ یہ اخبار اب بیک وقت دہلی، حیدرآباد اور جالندھر سے شائع ہوتا ہے۔ روزانہ ملاپ جالندھر کے مدیر مشہور کانگرسی رہنما اور صحافی شری یش ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں جالندھر سے روزانہ "پردیپ" کا اجرا ہوا۔ جو ریاست کے کثیرالاشاعت اخبارات میں سے ہے

ان کے علاوہ جالندھر سے "پربھات"، "جے ہند" اور "جالندھر رپورٹر" لدھیانہ سے چھ روزنامے "صداقت" "سماج"، "بھارت درپن" "گوتم" "رجحان" "ترجمان" اور امرتسر سے صرف ایک روزانہ اخبار "فلائنگ میل" شائع ہوتا ہے۔ ان سبھی اخبارات کی تعدادِ اشاعت ایک ہزار سے تین ہزار کے درمیان ہے۔

اخبارات کی تعدادِ اشاعت کے لحاظ سے بھی پنجاب دوسرے نمبر پر ہے۔ اُردو روزناموں کی مجموعی تعدادِ اشاعت ۳۷۶۰۰۰ ہے اور پنجاب کے اخبارات کی مجموعی تعدادِ اشاعت ۹۳۰۰۰۰ ہے یعنی کُل تعدادِ اشاعت کی ایک چوتھائی۔

[1] پندرہ روزناموں کے علاوہ یہاں سے ۶۷ ہفتہ وار، ۳۰ پندرہ روزہ اور ۲۸ ماہانہ رسائل شائع ہوتے ہیں۔ ریاست کا سب سے پرانا ہفتہ وار آریہ گزٹ جالندھر (۱۸۸۵ء) گزشتہ ۸۸ برس سے جاری ہے۔ بھائی پرمانند مرحوم کا "ہندو" بھی یہاں کا ایک پرانا ہفتہ وار ہے جو ۱۹۲۲ء سے برابر شائع ہو رہا ہے۔ پندرہ روزہ "سناتن دھرم پرچارک" کا سنِ اجرا ۱۹۰۱ء اور "بھجرنگ" کا سنِ اجرا ۱۹۰۵ء ہے۔ یہ جریدے مذہبی ہیں۔ ان کی اشاعت بڑی محدود ہے۔

تقسیم کے بعد فکر تونسوی اور محمود جالندھری نے جالندھر سے رسالہ "نقوش" کا اجرا کیا جو اعلیٰ معیار کے ادبی پرچے تھے۔ اسی طرح تاجور سامری کی زیرِ ادارت "جن میت" اشاعت پذیر ہوا۔ لیکن ان ادبی پرچوں کو زیادہ عرصہ زندہ رہنا نصیب نہ ہوا۔ بہرحال ۱۹۵۳ء میں "پگڈنڈی" (امرتسر) ۱۹۵۴ء میں "پرواز" (لدھیانہ) ۱۹۵۹ء میں "نگارش" (امرتسر) ۱۹۶۶ء میں "جاں نثار" (امرتسر) ایسے ادبی پرچوں کا اجرا ہوا۔ لیکن ان میں سے کسی کو بھی ملک گیر شہرت حاصل نہیں ہو سکی۔ ان کی تعدادِ اشاعت محدود ہے اور یہ بے قاعدگی کا شکار ہیں۔

علمی ادبی سرگرمیاں:- ریاست میں اُردو ادبا و شعرا اتنی زیادہ تعداد میں ہیں کہ اُن کا شمار ایک مسئلہ ہے۔ بہرحال اندازہ ہے کہ معروف و مستند ادیبوں اور شاعروں کی تعداد لگ بھگ دو اڑھائی سو ہو گی۔ ریاست میں اکثر مشاعرے، سیمینار اور ادبی اجلاس منعقد ہوتے رہتے ہیں۔

اُردو کے معمّر اور مشہور شاعر جوش ملسیانی کا تعلق بھی اسی خطۂ زرخیز سے ہے۔ آپ اُستاد داغ کے آخری بقیدِ حیات شاگرد ہیں اور خود آپ کے ان گنت شاگرد برصغیر ہند و پاک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ آپ کی متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ حکومتِ پنجاب سے ایوارڈ ملنے کے علاوہ انہیں مرکزی حکومت نے پدم شری سے نوازا ہے۔

اسی طرح برہم دت قاصر بھی پنجاب ہی کے ایک بزرگ ادیب و شاعر ہیں جن کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ہند سرکار نے پدم شری کا اعزاز عطا کیا ہے۔ ایک درجن سے زائد کتابوں کے اس مصنف کا تلمیذ فیروز الدین طغرائی ہے ہے۔ قاصر صاحب کو کئی ادبی انعامات مل چکے ہیں۔

---

[1] پریس اِن انڈیا، وزارتِ اطلاعات و نشریات۔ نئی دہلی

میلا رام وفا یہاں کے ایک برگزیدہ شاعر و صحافی ہیں۔ ان کی شاعری کی تعریف و توصیف پنجاب کے کئی عالموں اور ادیبوں نے کی ہے۔ وہ پنجاب کے راج کوی ہیں۔

جواں مرگ شاعر نریش کمار شاد پنجاب کے مشہور شاعر و صحافی درد نکودری (جو عرصہ سے لاپتہ میں) کے فرزند ارجمند تھے۔ شاد نے قلیل عرصہ میں ملک گیر شہرت حاصل کر لی تھی اور متعدد کتابیں تصنیف کی تھیں ـــــ نیز افسانہ نگار شرون کمار ورما بھی پنجاب کے ہی رہنے والے ہیں۔

ان کے علاوہ رتن پنڈوروی، اودے سنگھ شائق، اختر رضوانی، ساحر کپورتھلوی، ساحر سیالکوٹی، نانک چند ناز، پورن سنگھ ہنر، ست پرکاش سنگھ، قیس جالندھری، کرپال سنگھ بیدار، سورج تنویر، رشی پٹیالوی، مدن راہی، ڈاکٹر نریش، کرشن ادیب آزاد گلاٹی، مہیش پٹیالوی، پریم کمار نظر، پریم وار برٹنی، ساحر سنامی، گنگا دھر تسنیم، ہربھگوان شاد، روشن پٹیالوی، برق ہوشیارپوری، اختر بھنگالوی، بسمل امرتسری، رام ناتھ اسیر، سیاح سنامی، رام رتن مضطر، ہما ہرنالوی، بنواری لال نسیم، وفا پٹیالوی، افضل نکودری سرشار سیلانی، سادھو سنگھ ہمدرد، نسیم نورمحلی، متر نکودری، کلیم کرت پوری، اخگر فیروزپوری، نیر امرتسری، کمال کرتارپوری، ساگر نکودری، شوق جالندھری، روشن نکودری طپش، رام ناتھ رشک بشن داس زار، اوم پرکاش عارف، درگا داس قاصر، ہربنس لال مجرم وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

بہت سے ممتاز و نامور ادبا و شعراء ایسے ہیں جن کا تعلق پنجاب سے ہے۔ لیکن جو تقسیم کے بعد ملازمت یا روزگار کی وجہ سے پنجاب سے باہر مختلف مقامات پر سکونت پذیر ہیں۔ جیسے مالک رام، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، ساحر لدھیانوی، جگن ناتھ آزاد، عرش ملسیانی، گوپال متل، امرت لال عشرت، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، فکر تونسوی، مخمور جالندھری، رعنا جگی، اپندر ناتھ اشک، دیویندر ستیارتھی، بلونت سنگھ، ہنسراج رہبر، پرکاش پنڈت، چرخ چنیوٹی اکمل جالندھری، رنبیر، جمنا داس اختر، ساحر ہوشیارپوری، ضیا فتح آبادی طالب چکوالی، ظفر ادیب، افسر آذری، قمر جلال آبادی، دوارکا داس شعلہ، ہیرا لال چوپڑہ، وغیرہ اسی طرح دیویندر اسر، سریندر پرکاش، خزاں چند بسیم، منموہن تلخ، کرشن موہن، بلراج کومل، بلراج میرا، جوگندر پال، رام لال، راج نرائن راز، کمار پاشی بانی، وشوا ناتھ درد، جو تقسیم کے بعد اردو ادب میں معروف ہوئے پنجاب سے ہی متعلق ہیں۔

کتابوں کی اشاعت پنجاب کتابوں کی اشاعت کے معاملے میں بے حد پسماندہ ہے۔ پنجاب میں اردو کی بہت کم کتابیں شائع ہوتی ہیں اور ان میں بہت کم اعلیٰ معیار کی ہوتی ہیں۔ کوئی بڑا اردو ناشر نہ ہونے کی وجہ سے خالص ادبی قسم کی کتب مصنفین کو خود اپنی گرہ سے چھپوانا پڑتی ہیں یا پھر پنجاب کے باہر کسی ناشر یا ادارے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

ادبی انجمنیں: ریاست میں کئی ادبی انجمنیں قائم ہیں جن کے تحت اجلاس اور مشاعروں کا انعقاد ہوتا رہتا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد فکر تونسوی، مخمور جالندھری، تاجور سامری، بلراج کومل، شرر فتح پوری، بھاگ سنگھ عاجز وغیرہ نے پنجاب میں کچھ عرصہ تک انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیاں جاری رکھیں لیکن بعد ازاں وہ انجمن ختم ہو گئی۔

اس وقت ریاست میں انجمن ترقی اردو پنجاب خصوصاً قابل ذکر ہے جس کی وجہ سے محسوس ہوتا ہے کہ ریاست میں ابھی اردو کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ اسی انجمن کی سفارشات و تجاویز پر ریاست میں ایک گیارہ رکنی اردو کمیٹی کا تقرر ہوا ہے۔ جس کے صدر وزیر تعلیم سردار امراؤ سنگھ اور کنوینر ڈائرکٹر محکمہ السنہ ہیں۔ اس کمیٹی کے پانچ رکن انجمن نے اور باقی ریاستی حکومت نے نامزد کئے ہیں۔ یہ کمیٹی گیان سنگھ راڑیوالہ، اودے سنگھ شائق، نوبہار صابر، سورج تنویر، محمد کفایت اللہ، پورن سنگھ ہنر، رام لال بھنڈاری موہن لال سنگھی، پیارے لال رتن، مہر چند کوثر، اور رشی پٹیالوی پر مشتمل ہے۔

انجمن ترقی اردو پنجاب کا مطالبہ ہے کہ پنجاب کے محکمہ السنہ میں اردو کا ایک شعبہ قائم کیا جائے، اردو اہل قلم کی امداد و اعانت کی جائے۔ نیز انہیں ان کی تخلیقات پر انعامات و اعزازات عطا کئے جائیں۔ محکمہ تعلقات عامہ میں ایک شعبہ اردو کا قیام عمل میں آئے، اور محکمہ تعلیم کے تحت اردو تعلیم و تدریس کے لئے شبانہ مرکز قائم کئے جائیں۔

انجمن ترقی اردو پنجاب کے علاوہ اور بھی کئی ادبی ادارے ہیں جو اردو کی ترقی و ترویج میں بڑی گرمجوشی سے حصہ لے رہے ہیں۔ اردو پریشد چنڈی گڑھ بھی اس خطے میں اردو کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دے رہی ہے۔ ڈاکٹر نریش پریشد کے سکریٹری ہیں۔ پریشد نے اردو زبان کو مقبول و ہر دلعزیز بنانے کے لئے اردو کی

کلاسوں کا اہتمام بھی کیا ہے۔

انعامات واعزازات: ریاستی سرکار اُردو ادیبوں کو اکثر انعامات واعزازات سے نوازتی رہتی ہے۔ ہندی اور پنجابی کے ساتھ ساتھ اُردو شاعروں کو بھی "راج کوی" کا اعزاز بخشا گیا ہے۔

اعزازات کے علاوہ اُردو ادیبوں کو انعامات دینے میں بھی ریاستی حکومت پیش پیش ہے۔ کئی شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات پر انعامات دیئے جا چکے ہیں۔ مرحوم ملوک چند محروم اور نریش کمار شاد کے علاوہ برہم دت قاصر کو ان کی کئی تصنیفات پر انعامات ملے ہیں۔ عرش ملسیانی، کرپال سنگھ بیدار، میلا رام وفا، آزاد گلاٹی، شباب للت، پورن سنگھ ہنر کو بھی اعزازات و انعامات مل چکے ہیں۔ علاوہ بریں مرکزی حکومت سے جوش ملسیانی، قیس جالندھری اختر رضوانی، اور پورن سنگھ ہنر کو ماہانہ پنشن یا مالی امداد دی گئی۔

محکمۂ تعلقات عامہ: محکمہ اطلاعات عامّہ کی جانب سے پہلے اُردو میں ماہنامہ "پاسبان" شائع ہوتا تھا لیکن اب کچھ عرصہ سے بند ہے۔ موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر توقع ہے کہ حکومتِ پنجاب اس کا دوبارہ اجرا کرے گی جس سے صرف اُردو کی خدمت ہی انجام نہیں پائے گی بلکہ بیرونِ پنجاب رہنے والا اُردو داں طبقہ بھی پنجاب کی سرگرمیوں سے روشناس ہو سکے گا۔

ھریانہ: زبان کی بنیاد پر پنجاب کی ازسرِ نو تشکیل ہوئی اور یکم نومبر ۱۹۶۶ء کو پنجاب کے ہندی بولنے والے سات اضلاع پر مشتمل ایک الگ ریاست ہریانہ بنا دی گئی۔ اس پردیش کی آبادی ۱۰،۳۶،۸۰۸ ہے۔ درحقیقت یہ وہ علاقہ ہے جہاں ہریانی بولی بولی جاتی ہے جس کا اُردو سے گہرا رشتہ ہے اور جس نے قدیم اُردو کی نشو و نما میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر محمود شیرانی نے "دکنی زبان کی جن خصوصیات کی توضیح پنجابی سے کی ہے غالباً وہ یہی زبان ہریانی ہے اور اسی سے اُردو زبان نکلی ہے۔

بہر حال اُردو چاہے پنجاب یا ہریانہ میں پیدا ہوئی ہو چاہے دکن یا دہلی میں لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کی ترقی اور نشو و نما میں بہت سی ریاستوں نے حصہ لیا ہے۔ جن میں ہریانہ بھی پیش پیش ہے۔ یہاں ہمیشہ بڑی تعداد میں اُردو جاننے والے لوگ موجود رہے ہیں۔

اُردو زبان بولنے والوں کی تعداد

۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہریانہ میں ۱۹۵۸۳۶ افراد نے اپنی مادری زبان اُردو لکھوائی ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر گوڑگاؤں اور انبالہ ضلع میں ہیں لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ یہاں صرف دو لاکھ کے قریب ہی افراد اُردو جاننے بولنے والے ہیں۔

تعلیمی سہولتیں: اگرچہ یہاں اُردو تعلیم کا تمام اسکولوں میں بندوبست نہیں اور بہت کم طلبا اُردو میں داخلہ لیتے ہیں تاہم اگر کسی اسکول میں چالیس یا کسی جماعت میں دس طالب علم اُردو پڑھنے کے خواہاں ہوں تو وہاں اُن کے لئے اُردو اُستاد کا انتظام کر دیا جاتا ہے۔ لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی رپورٹ کے مطابق ۶۸-۱۹۶۷ء میں دو ثانوی اسکولوں میں صرف ۵۲۵ طلبا تعلیم پا رہے تھے۔ صوبے میں صرف ایک یونی ورسٹی کورو کشیتر ہے لیکن وہاں اُردو تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں

اخبارات ورسائل — چونکہ یہ پردیش پہلے پنجاب کا ہی ایک حصہ تھا اور جالندھر اخبارات کا مرکز تھا۔ لہٰذا اب بھی اس کی ضرورتیں جالندھر یا دہلی کے روزنامے ہی پوری کرتے ہیں۔ یہاں سے کوئی روزنامہ شائع نہیں ہوتا۔

ریاست[1] سے ۲۱ ہفتہ وار، سات پندرہ روزہ اور نو ماہانہ جرائد شائع ہوتے ہیں۔ ریاست کا سب سے پرانا ہفتہ وار "جاٹ گزٹ" ہے جو ۱۹۱۶ء سے شائع ہو رہا ہے۔ اسی طرح کرنال سے شائع ہونے والا ہفت روزہ "امرت" ۱۹۳۷ء سے علاقے کی نمایندگی کر رہا ہے۔ ان کے علاوہ "انبالہ سندیش"، "انبالہ ٹائمز"، "ارمان ہریانہ"، "بھارت پتر"، "دیپ سندیش"، "درست گفتار"، "ہریانہ تلک"، "جن بھومی"، "جگت نیتر"، "میوگزٹ"، "پیغام" (سونی پت)، "پبلک اوپینین"، "روشن شعلہ"، "تحقیقات" اور "ناقین" ہفتہ وار شائع ہوتے ہیں۔ پندرہ روزہ "نگر پالیکا"، "پورنیما"، "پرشارتھی گزٹ"، "وائس آف ایمپلائز"، "نئے فکر"، "آریہ"، "کانٹریکٹر ڈیوز"، "مست بادل"، "سماج واد" کے علاوہ "امر ہریانہ"، "دولت کی پارش"، "ارادے"، "خوشدل"، "نرالا جوگی"، "نرمان پنجاب"، "نظارے"، "قوم پرست" اور "شہید" یہاں سے چھپنے والے ماہانہ جریدے ہیں۔

---

[1] پریس اِن انڈیا ۱۹۷۱ء وزارت اطلاعات و نشریات، نئی دہلی

ادبا و شعرا: ہریانہ کو ہی یہ شرف حاصل ہے کہ مولانا حالی ایسی اُردو کی قد آور شخصیت اسی ریاست کے شہر پانی پت میں پیدا ہوئی جس نے اُردو شاعری میں ایک نئی طرح ڈالی اور "مقدمہ شعر و شاعری"، "حیاتِ سعدی"، "یادگارِ غالب" اور "حیاتِ جاوید" لکھ کر اُردو نثر نگاری میں ایک نئی راہ نکالی۔ پھر وحید الدین سلیم پانی پتی ایسے اُردو محقق، زبان دان، اور صحافی کا تعلق بھی اسی شہر سے ہے۔ وقار انبالوی کا بھی تقسیم سے پیشتر یہی وطن تھا۔ خواجہ غلام الثقلین، خواجہ غلام السیدین، صالحہ عابد حسین اور خواجہ احمد عباس کا تعلق بھی اسی خطے سے ہے۔

گو یہ ریاست بہت چھوٹی ہو گئی ہے تاہم یہاں شعرا و ادبا کی کمی نہیں اور اب بھی یہاں خاصی تعداد میں اُردو ادیب اور شاعر موجود ہیں، جیمنی سرشار، طالب پانی پتی، کشمیری لال ذاکر، تمنا انبالوی، خیدا انبالوی، بمل کرشن اشک، امیر چند بہار، پورن کمار موش، شرر فتح پوری، زخمی حصاری، ن۔ ن۔ نجمی، منوہر لال منوہر، پریم حصاری آتش بہادلپوری، عابد عالمی، بلبیر راٹھی، مظلوم کیتھلوی خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ مصور سبزواری کا اگرچہ ہریانہ وطن نہیں، تاہم روزگار کے سلسلے میں وہ ایک عرصے سے ہریانہ میں سکونت پذیر ہیں۔

حضرت آفتاب پانی پتی بھی یہاں کے ایک بزرگ ممتاز شاعر تھے اور ہریانہ کے قیام کے بعد صوبائی حکومت نے انہیں راج کوی کا اعزاز دیا تھا چند برس ہوئے اُن کا انتقال ہو گیا۔

ادبی انجمنیں ہریانہ کی ادبی سرگرمیوں میں انجمن ترقی اُردو ایک اہم رول ادا کر رہی ہے۔ ریاست میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان تسلیم کرانے کے سلسلے میں اس کے جنرل سیکریٹری اوم پرکاش ملک اور سیکریٹری عکیم اجمل خاں تگ و دو کر رہے ہیں۔ انجمن کا مطالبہ ہے کہ چونکہ اُردو ہریانہ کی بول چال کی زبان ہے اور اسے وسیع پیمانے پر استعمال کیا جاتا ہے، لہٰذا اس کی ترقی اور فروغ کے لئے لسانی محکمے میں ایک الگ شعبہ قائم کیا جائے جیسا کہ پنجاب میں ہے۔

اُردو کلب رہتک، بزم ادب انبالہ، حلقہ ارباب اُردو گوڑگاؤں اور دیگر کئی انجمنیں ریاست میں اُردو سرگرمیوں کا مرکز ہیں۔ اور ان کی بدولت اردو ادبا و شعرا کا اجتماع اور مشاعروں وغیرہ کا اہتمام ہوتا رہتا ہے۔

کتابوں کی اشاعت: جہاں تک اُردو کتب کی اشاعت کا تعلق ہے، یہاں سے اُردو کتابیں زیادہ تعداد میں شائع نہیں ہوتیں کیونکہ یہاں عمدہ معیار کی کتابت و طباعت کا تسلی بخش انتظام نہیں۔ لہٰذا یہاں کے ادبا و شعرا اپنی تخلیقات اکثر نجی طور پر دہلی سے یا کسی اور بیرونی ادارے کی وساطت سے چھپواتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں مصور سبزواری کا شعری مجموعہ "مانجھی دھیرے چل" منظر عام پر آیا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں امیر چند بہار کی رباعیات کا مجموعہ "نسیم بہار" اشاعت پذیر ہوا۔ جو اس سے پیشتر انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ "نسیم مغرب" کے نام سے پیش کر چکے تھے۔ اسی برس رانا گنوری نے کالی داس کے شاہکار "میگھ دوت" کا ترجمہ شائع کیا۔ ابھی حال میں جدید شاعر بمل کرشن اشک کا دوسرا شعری مجموعہ "آئینہ اور پرچھائیں" منظر عام پر آیا ہے۔ اس سے پہلے اشک کی تصنیف "دکھ کے پھول" شائع ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں بلبیر راٹھی کا مجموعہ کلام "قطرہ قطرہ" شرر فتحپوری کا "کاروان سحر" اور عابد عالمی کا مجموعہ کلام "دائرہ" شائع ہو چکا ہے۔

انعامات و اعزازات

اگرچہ اُردو کو ابھی تک ریاست میں دوسری زبان کا درجہ حاصل نہیں۔ تاہم ریاستی حکومت اُردو ادبا و شعرا کی انعامات و اعزازات سے حوصلہ افزائی کرتی رہتی ہے۔ اس نے اس زبان کے ادیبوں اور شاعروں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ جب آفتاب پانی پتی کا انتقال ہوا تو حکومت نے جیمنی سرشار کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں راج کوی بنایا۔

اعلیٰ تصنیفات پر بھی اکثر انعامات دیئے جاتے ہیں۔ نوبہار صابر کے مجموعہ کلام "کارواں خیالوں کے" پر حکومت نے ایک ہزار روپے کا پہلا انعام عطا کیا تھا۔ اسی طرح ۱۹۷۲ء میں عابد عالمی کی تصنیف "دائرہ" اور دیپ دیروولوی کی کتاب "طلاق" پر پانچ پانچ سو روپے کے انعامات دیئے گئے۔ علاوہ بریں ظفر ادیب کی تنقیدی کتاب "ہم عصروں پر غالب کا اثر" پر ایک ہزار کا انعام مرحمت کیا گیا۔ ان کے علاوہ ہریانہ سرکار نے اُردو کے جن ادیبوں اور شاعروں کو انعامات دیئے۔ اُن میں کشمیری لال ذاکر، خواجہ احمد عباس، بمل کرشن اشک اور بلبیر راٹھی بھی شامل ہیں۔

ریاست کی سرکاری زبان ہندی ہونے کی وجہ سے اب تمام دفتری کارروائی ہندی میں ہوتی ہے لیکن چونکہ پرانا ریکارڈ اُردو میں ہے۔ لہٰذا اُردو جاننے والے عملے کی بڑی ضرورت پڑتی ہے۔

محکمہ اطلاعات عامہ: محکمہ اطلاعات عامہ کو بھی اُردو کی اہمیت و افادیت کا احساس ہو گیا ہے اور چونکہ ریاست میں ایک بڑی تعداد میں لوگ اُردو جاننے والے ہیں۔ لہٰذا انہیں ریاست کے ترقیاتی پروگرام سے روشناس کرانے کے لئے "تعمیر ہریانہ" کا اجرا کیا گیا ہے۔ جس کے مدیر سکھ دیو راج شرما ہیں۔

ہماچل پردیش

۱۵ اپریل ۱۹۴۸ء کو پنجاب کی ۳۱ پہاڑی ریاستوں کو ملا کر ہماچل پردیش کی تشکیل کی گئی۔ اس ریاست کی آبادی ۳۴،۶۰،۴۳۴ ہے اور اکثریت کی زبان ہندی اور پہاڑی ہے۔

اردو بولنے والوں کی تعداد مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۶۱ء میں ریاست میں صرف ۶۲۷۱ افراد کی مادری زبان اردو تھی لیکن ۱۹۷۱ میں یہ تعداد بڑھ کر ۱۰۱۲۱ ہو گئی۔ اگرچہ اب بھی بہت کم لوگوں کی مادری زبان اردو ہے، تاہم یہاں کی اچھی خاصی آبادی اردو دان ہے۔ ریاستی سرکار نے اس زبان کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ سہ لسانی فارمولے کے تحت یہاں کے اسکولوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ لیکن پڑھنے والوں کی تعداد معمولی ہے۔

اخبارات و رسائل:۔ جہاں تک اخبارات و رسائل کا تعلق ہے ہریانہ کی طرح یہاں سے بھی کوئی روزنامہ شائع نہیں ہوتا، اور اس کی ضرورت بھی پنجاب سے شائع ہونے والے اخبارات ہی پوری کرتے ہیں۔ حالانکہ پنجاب کا دوسرا اردو اخبار "شملہ اخبار" اسی ریاست کی راجدھانی شملہ سے ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اب یہاں سے صرف نو جریدے شائع ہوتے ہیں لیکن ان میں سے کسی کو بھی ملک گیر شہرت حاصل نہیں اور سبھی مقامی نوعیت کے ہیں۔ یہ سبھی کانگڑہ اور دھرم شالہ سے شائع ہوتے ہیں۔ اب توقع ہے شملہ سے ایک سہ ماہی "شناخت" منظر عام پر آئے گا۔ ریاست کا سب سے پرانا ہفتہ وار "ڈوگرہ سندیش" ہے جو ۱۹۴۸ء سے شائع ہو رہا ہے۔ سب سے کثیر الاشاعت ہفت روزہ "کیلاش" ہے جس کی تعداد اشاعت ۳،۶۹۲ ہے۔ ان کے علاوہ ریاست سے ہفتہ وار "ہمارا ہماچل" "کانگڑہ سماچار" "للکار" اور "لوک راج" — دو پندرہ روزے "ہماچل سپر بھات" اور "پہاڑی دنیا" نیز ایک ماہنامہ "برق ہماچل" شائع ہوتے ہیں۔

ادباء و شعراء:۔ گو اس ریاست میں اردو کو پنجاب اور ہریانہ کی نسبت زیادہ تعلیمی سہولتیں حاصل ہیں، پھر بھی ان دو ریاستوں کی نسبت یہاں پر اردو ادیبوں اور شاعروں کی تعداد کم ہے۔ یہاں کے ادباء و شعراء میں لال چند پرارتھی، چاند کلوی، کرشن کمار طور، کاہن سنگھ جمالی، عاقل لاہوری، احسن رضوی، رتن سنگھ ہمیش، ضیا صدیقی، ساغر پالمپوری، سریش چند شوق، طلعت عرفانی، راجندر ناتھ رہبر، ساغر گپت، ارمان شہاب، پریم نکھرولوی قابل ذکر ہیں۔

ادبی سرگرمیاں ریاست میں بزم ادب ہماچل اردو سرگرمیوں کا واحد مرکز ہے جس کے تحت شملہ میں مشاعرے اور اجلاس منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن آزادی سے پیشتر کی شملہ کی سرگرمیوں کے مقابلے میں یہ سب ہیچ ہیں کیونکہ پہلے شملہ میں ایسے یادگاری اور تاریخی مشاعرے منعقد ہوتے تھے جنہیں اہل اردو آج بھی فراموش نہیں کر سکے۔

کتابوں کی اشاعت:۔ اردو کتب کی اشاعت کی رفتار بھی غیر تسلی بخش ہے۔ یہاں سے بہت کم کتابیں اشاعت پذیر ہوتی ہیں اور ان میں بھی اچھی اور قابل ذکر کتابیں کم ہوتی ہیں۔ چونکہ ریاست میں عمدہ لیتھو پریس اور کتابت کا اہتمام نہیں لہٰذا عام طور پر کتابیں دہلی، جالندھر وغیرہ سے شائع ہوتی ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں راجندر ناتھ رہبر کی شعری تصنیف "کلس" اور گزشتہ برس دھرم پال عاقل لاہوری کا شعری مجموعہ "خون جگر" منظر عام پر آیا۔

انعامات و اعزازات ریاستی حکومت اردو کی ترقی و ترویج اور ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی میں تھوڑی بہت دلچسپی رکھتی ہے۔ ابھی حال میں بزم ادب ہماچل پردیش کو سہ ماہی "شناخت" شائع کرنے کے لئے مالی امداد دی گئی ہے۔ اور آئندہ مزید مالی امداد دینے کا بھی وعدہ کیا گیا ہے۔

محکمہ اطلاعات عامہ ریاست میں محکمہ تعلقات عامہ کی جانب سے اردو کی جانب کوئی توجہ نہیں دی جا رہی اور نہ ہی کوئی خبرنامہ یا رسالہ اردو میں شائع کیا جاتا ہے۔

فروغ کے لئے تجاویز:۔ پنجاب، ہریانہ اور ہماچل میں اردو کی ترقی و فروغ کے لئے لازمی ہے کہ:۔

۱۔ سہ لسانی فارمولے کے تحت تمام اسکولوں میں اردو کی تعلیم لازمی قرار دی جائے اور دفتروں میں ملازمت کے لئے امیدوار کے واسطے مڈل اسکول تک اردو امتحان پاس کرنے کی شرط عائد کی جائے۔

۲۔ اردو اساتذہ کے لئے ٹریننگ اسکول قائم کئے جائیں۔

۳۔ اعلیٰ معیار کی نصابی کتابوں کی اشاعت کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے اور ان کے لئے مالی امداد بھی دی جائے۔

۴۔ اردو ادیبوں اور شاعروں کو اعزازات، انعامات اور وظائف دیئے جائیں، نیز انہیں اپنی کتابیں شائع کرنے کے لئے مالی امداد بھی دی جائے۔

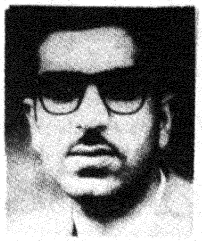

حامدی کاشمیری

نند لال وتال

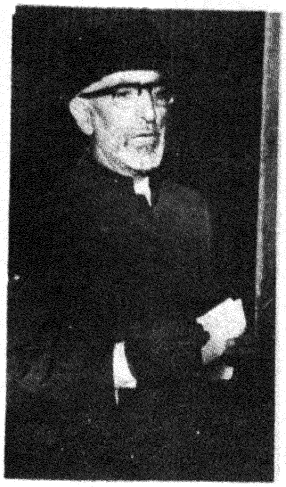

غلام رسول نازکی

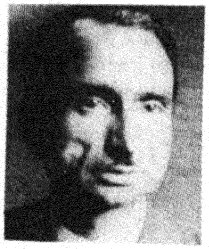

اختر محی الدین

رسا جاودانی

علی محمد لون

موہن یاور

شکیل الرحمٰن

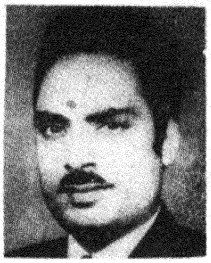

حکیم منظور

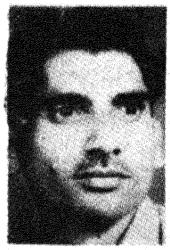

عرش صہبائی

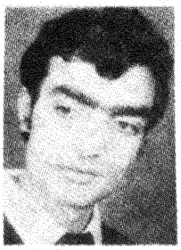

رفیق راز

عابد منا وری

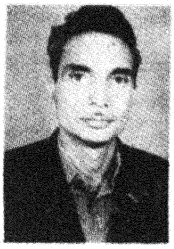

تیج بہادر بھان

نور شاہ

شجاع سلطان

جموں و کشمیر میں اُردو

محمد یوسف ٹینگ

مہاراجہ گلاب سنگھ نے ۱۸۴۶ء میں کشمیر کو خرید کے جموں و کشمیر کی متحدہ ریاست کی بنیاد ڈالدی۔ اس سے قبل ہمیں کشمیر میں اُردو کے چلن کے متعلق کوئی تفصیلی حوالے تو نہیں ملتے۔ لیکن مختلف شواہد کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ اُردو ہمسایہ پنجاب سے یہاں پہونچ چکی تھی۔ افغان عہد کے فارسی شاعر دیارام کاچرو خوشدل (ولادت ۱۷۴۴ء) کا یہ اُردو شعر ملاحظہ ہو: ع

آ گئے تھے مثلِ شبنم سیرِ گلشن کر چلے
باغبان تو دیکھ لے اپنا چمن ہم گھر چلے

جدید کشمیری زبان کے اولین استاد محمود گامی (وفات: ۱۸۵۵ء) کے کشمیری کلام میں بیٹھ اُردو کے ایسے مصرعے بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔

سُنو فریاد میری ہے خدایا

یا

اُسی کو چارہ مانگو وقت مشکل

کشمیر میں اُردو کے چلن کے متعلق ایک انگریز افسر فریڈرک ڈریو نے اپنی کتاب میں کچھ دلچسپ اشارے کئے ہیں۔ یہ شخص ۱۸۶۲ء میں ریاست میں طبقات الارض کے ماہر کی حیثیت سے آیا تھا۔ اس نے مہاراجہ کے دربار کی زبان کے متعلق لکھا ہے:

"ہندوستان سے آنے والے ملازم لوگ بلاشبہ ہندوستانی (اُردو) بولتے ہیں اور مقامی لوگ اسے سمجھ لیتے ہیں۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے جانشین رنبیر سنگھ کا ذاتی محافظ دستہ رام پور کے روہیلوں پر مشتمل تھا، جو اُردو بولتے تھے۔ شاہی دربار کی شان دوبالا کرنے کے لئے لکھنؤ اور دہلی سے نقیب بھی ملازم رکھے گئے تھے۔ جو دربار کو اپنی گونجدار آواز سے پُروقار بناتے تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستان سے مختلف طائفے اور اہل نشاط بھی جموں و کشمیر جاتے تھے اور انکی گائی ہوئی غزلیں فوراً مقبول ہو جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ بیرون ریاست سے کچھ سیاح سیلانی بھی کشمیر آتے تھے۔ چنانچہ ہرگوپال خستہ نے لکھا ہے کہ بازار میں عام کشمیری اُن سے اُردو میں آسانی کے ساتھ بات چیت کر سکتے تھے۔

اُردو انیسویں صدی کے آخر میں کشمیر دربار میں کس قدر اہمیت حاصل کر چکی تھی اُس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جموں دربار نے اُردو کے مشہور انشا پرداز شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کو کشمیر آکر یہاں کی تاریخ لکھنے کی دعوت دی تھی۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ ۱۸۸۵ء میں تخت نشین ہوئے۔ تو انھوں نے فارسی اور انگریزی کو ترک کر کے اُردو کو سرکاری زبان بنا دیا۔

موجودہ صدی کی کروٹ پر اُردو ریاست میں اپنا سکہ بٹھا چکی تھی۔

مولانا شبلی نعمانی ۱۸۹۹ء میں کشمیر آئے اور وہاں اپنے کشمیری دوست سعدالدین سعد کے یہاں ٹھہرے۔ یہ سعد اُردو کے بہت اچھے شاعر تھے اور ان کا کلام سر عبدالقادر کے شہرۂ آفاق رسالے "مخزن" میں شائع ہوتا رہتا تھا۔ اسی طرح ہرگوپال خستہ نے ریاست کی پہلی اُردو تاریخ "گلدستۂ کشمیر" ۱۸۸۳ء میں شائع کی اور کشمیر کی مشہور ترین لوک کہانی "ھی مال" کا منظوم اُردو ترجمہ بھی شائع کیا تھا۔ اُردو کے خوشگو شاعر خوشی محمد ناظر دربار کشمیر کے نہایت اہم رکن تھے۔ چنانچہ انھوں نے سرینگر میں "مفرح القلوب" کے نام سے صاحبانِ ذوق کا ایک حلقہ ترتیب دیا جس کے اراکین میں منشی سراج الدین اور صادق علی صادق کافی مشہور تھے۔ یہ دائرہ سرینگر کے خوب صورت ترین باغات اور جھیل ڈل کی لہروں پر تیرتے ہوئے شکاروں میں اُردو کے مشاعرے منعقد کراتا تھا اور اس نے کشمیر میں اُردو کا ذوق عام کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اسی زمانے میں اور اس کے بعد وقفے وقفے سے محمد حسین عارف۔ برجموہن دتاتریہ کیفی۔ نواب جعفر علی خاں اثر، خلیفہ عبدالحکیم خواجہ غلام السیدین۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر۔ حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض جیسے چوٹی کے اُردو ادیب اور شاعر ریاست میں آئے اور اُردو کی آبیاری میں معاونت کی۔

ہائی کورٹ کے جج پنڈت بھاگرام نے اس صدی کی دوسری دہائی میں دربار کی منظوری سے حکم صادر کیا کہ جموں و کشمیر کی عدالتوں میں فارسی کی بجائے اُردو میں کام کاج کئے جائیں۔ اسی زمانے میں محکمۂ مال میں بھی اُردو کو کام کاج کی زبان بنانے کا حکم صادر ہوا۔ ۱۹۳۱ء میں جب کشمیر میں تحریکِ آزادی شروع ہوئی تو اُردو اس تحریک کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بنی اور لاہور میں چھپنے والا اخبار کشمیریوں کی ترجمانی اُردو میں ہی کرتا تھا۔ تحریک کے اکثر نعرے اُردو میں بلند ہوتے تھے اور تحریک کے بانی شیخ محمد عبداللہ اپنی تقریروں کا آغاز عموماً ڈاکٹر اقبال کی قومی نظموں سے کرتے تھے۔ خود شیخ صاحب نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ کشمیر میں آزادی کی جوت جلانے میں اِن نظموں سے بڑی مدد ملی۔ اگرچہ شیخ صاحب کی ترنم ریز آواز بھی اِن کی تاثیر کی ایک وجہ تھی۔

کشمیر میں اُردو کی تدریس کے لئے ۱۹۴۰ء کا سال تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سال حکومت نے سیدین کمیٹی کی سفارشات منظور کرتے ہوئے ریاست کے سکولوں کے لئے آسان اُردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا، لیکن اِسے فارسی یا دیوناگری کسی بھی رسم الخط میں لکھنے پڑھنے کی آزادی دیدی۔ اسی سال تمام سکولوں اور کالجوں میں اُردو سکھانے کے لئے خاص اساتذہ تعینات کئے گئے اور کم و بیش یہی پالیسی آج تک رائج ہے۔ کشمیر میں اُردو کی تاریخ کے سلسلے میں ۱۹۵۶ء کا سال بھی نہایت اہم ہے۔ اسی سال ریاست جموں و کشمیر کی پہلی آزاد آئین ساز اسمبلی نے جو آئین منظور کیا۔ اس میں دفعہ

۱۹۴۵ کے تحت اُردو کو ریاست کی سرکاری زبان قرار دیا گیا

اُردو بولنے والوں کی تعداد

اُردو ریاست میں ایک محدود طبقے کی مادری زبان ہے۔ صرف ان لوگوں کی جو دہلی یا یو۔پی اور پنجاب سے یہاں تجارت یا ملازمت کے سلسلے میں آئے اور یہیں بس گئے۔ چونکہ ریاست میں ۱۹۵۱ء میں کوئی مردم شماری نہیں ہوئی۔ اِس لئے ہمیں ابتدائی اعداد و شمار کے لئے ۱۹۳۱ء کی مردم شماری رپورٹ کا سہارا لینا پڑیگا۔ اِس رپورٹ میں، ہندی اور اُردو کے بولنے والوں کیلئے مشترکہ عنوان قائم کرکے اِن کی تعداد درج کی گئی ہے۔ اس کے مطابق ہندوستانی ساری ریاست میں ۱۷۸۵۲۸ (ایک لاکھ اٹھتر ہزار پانچسو اٹھائیس) لوگوں کی مادری زبان درج کی گئی ہے۔ جموں اور کشمیر کے صوبوں میں ان کی تقسیم یوں بتائی گئی ہے۔

جموں ۔ ۱۶۷۳۶۸

کشمیر ۔ ۱۰۶۲۱

۱۹۵۱ء میں چونکہ ریاست میں مُردم شماری نہیں ہوئی۔ اِس لئے اب ۱۹۶۱ء کے اعداد و شمار کا جائزہ لینا مناسب رہیگا۔ اس رپورٹ میں زبانوں کے گوشوارے میں جن لوگوں کی مادری زبان اُردو بتائی گئی ہے۔ اُن کی تعداد کل ۱۲۴۴۵ (بارہ ہزار چارسو پینتالیس) ہے ریاست کی کل آبادی ۳۵۶۰۹۷۶ درج ہے۔ اور ہندی بولنے والوں کی تعداد ۲۲۳۲۳ (بائیس ہزار تین سو تیئیس) بتائی گئی ہے۔ جب کہ ہندوستانی بولنے والوں کی تعداد گھٹ کر صرف ۶ (چھ) رہ گئی ہے۔ لیکن یہ صورتِ حال کا صحیح آئینہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس مردم شماری کے نقائص پر اس کی اشاعت کے ساتھ ہی کشمیر کے اخباروں میں کافی لے دے ہوئی تھی۔ بہرحال ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ریاست جموں و کشمیر میں ۱۲۷۴۰۴ افراد کی مادری زبان اُردو ہے۔ لیکن مادری زبان نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُردو کشمیر اور جموں میں وسیع پیمانے پر پڑھی لکھی اور سمجھی نہیں جاتی۔

یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ریاست کی آبادی کا پچاس سے ساٹھ فی صدی حصّہ یہ زبان یا تو لکھتا ہے، یا بولتا ہے یا سمجھتا ہے۔

تعلیمی سہولتیں

ریاست میں ہائی اسکول تک اُردو ذریعہ تعلیم ہے۔ لہٰذا کم از کم نظریاتی حد تک یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو طالب علم اِن سکولوں میں پڑھتے ہیں وہ اُردو سے واقف ہیں۔ اِس سلسلے میں وزارتِ تعلیم کے مہیا کردہ اعداد و شمار یوں ہیں

(اعداد و شمار لاکھوں میں)

	ابتدائی سکولوں	مڈل	ہائی/ہائر
۵۰-۵۱	۰٫۷۸	۰٫۲۰	۰٫۲۲
۷۱-۷۲	۴٫۳۵	۱٫۲۱	۰٫۷۲

کالجوں میں چونکہ اُردو ایک الگ مضمون کی حیثیت سے (اختیاری مضمون) پڑھائی جاتی ہے۔ لہٰذا وہاں اُردو پڑھنے والے طلبار کا صحیح شمار آسان ہے۔ ریاست میں دو یونیورسٹیاں قائم ہیں (۱) کشمیر یونیورسٹی اور (۲) جموں یونیورسٹی۔ کشمیر یونیورسٹی کے متعلقہ کالجوں میں اُردو کے طلبار کی تعداد کا گوشوارہ ۱۹۷۳ء کے تعلیمی سال کے لئے رجسٹرار کے دفتر سے یوں دیا گیا ہے

بی۔یو۔سی ۔ ۲۲۹۰ ۔ بی۔اے (حصّہ اول) ۱۳۳۸ ۔ بی اے (فائنل) ۱۵۰۱

اورینیورسٹی میں شعبہ اُردو میں زیرِ تعلیم طلبار کی تعداد یوں ہے۔

ایم۔اے (پریوس) ۵۷ ۔ ایم اے (فائنل) ۲۲۔

پی۔ایچ۔ڈی سے پہلے کا کورس ۵

پی۔ایچ ڈی (زیرِ تکمیل) ۶

جموں یونیورسٹی میں مختلف مدارج کے طلبار کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

بی۔اے۔ سال اول	۲۴۳
بی۔اے۔ سال دوم	۲۱۷
بی اے۔ سال سوم	۲۰۰
ایم اے۔ سال اول	۲۵
ایم۔اے۔ سال دوم	۱۶
پی۔ایچ۔ڈی (زیرِ تکمیل)	۸

اُردو اخبارات و رسائل

ریاست میں اُردو کا پہلا اخبار "بدیا بلاس" ۱۸۸۳ء میں شائع ہوا، جس میں اُردو کے علاوہ ہندی کا حصّہ بھی شامل ہوتا تھا۔ یہ سرکاری اخبار تھا۔ لیکن جب سالگرام سالک، محمد دین فوق وغیرہ نے کشمیر سے اخبار نکالنے کی اجازت چاہی۔ تو انھیں مایوسی ہوئی۔ آخرکار ۲۴ جون ۱۹۲۴ء کو لالہ ملک راج صراف جموں سے اُردو کا پہلا روزنامہ "رنبیر" جاری کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اِس وقت صورت یہ ہے کہ جموں سے کل چھ روزانہ اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ جن میں اُردو کے روزنامے چار ہیں (۱) عمارت (۲) قومی آواز (۳) سندیش (۴) اُجالا۔

جموں سے شائع ہونے والے ہفتہ وار اُردو اخبارات کی تعداد چالیس ہے۔ اس کے علاوہ اُردو میں تین پندرہ روزہ اخبار بھی شائع ہوتے ہیں۔

سرینگر سے اس وقت نو روزنامے شائع ہوتے ہیں۔ جو سب کے سب

اُردو زبان میں چھپتے ہیں۔ اِن کی تفصیل یوں ہے۔

(۱) آفتاب (۲) سرینگر ٹائمز (۳) ہمدرد (۴) خدمت (۵) زمیندار (۶) چنار (۷) وُلر (۸) نوجیون (۹) سنسار۔

سرینگر سے اس کے علاوہ ۲۵ ہفتہ وار شائع ہوتے ہیں۔ جن میں سے ۲۴۔ اُردو میں ہی شائع ہوتے ہیں۔ اِس کے علاوہ سرینگر سے ہی تین ماہانہ اُردو رسالے اور ایک دو ماہی اُردو رسالہ شائع[1] ہوتا ہے۔

ریاست کے تقریباً تمام کالج بھی اپنے جریدے نکالتے ہیں جن میں اُردو کا حصّہ نہ صرف شامل ہوتا ہے۔ بلکہ اکثر صورتوں میں باقی دوسرے حصوں پر بھاری ہوتا ہے[2]۔ ریاست کے کچھ ممتاز اخبارات حسبِ ذیل ہیں!

۱۔ "آفتاب"۔ سرینگر سے روزانہ شائع ہوتا ہے۔ خواجہ ثناء اللہ بٹ اِس کے مُدیر ہیں۔ یہ ریاست کا واحد اخبار ہے جو آفیسٹ پر چھپتا ہے۔ روزانہ اخبارات میں اس کی توقیر بہت زیادہ ہے۔

۲۔ "سرینگر ٹائمز"۔ سرینگر سے روزانہ شائع ہوتا ہے۔ صوفی غلام محمد اس کے مُدیر ہیں۔ اپنے برجستہ کارٹونوں کی وجہ سے مشہور ہے۔

۳۔ "آئینہ" اس کے مُدیر پارلیمنٹ کے ممبر شمیم احمد شمیم ہیں۔ یہ ہفتہ وار ریاست سے باہر کے اُردو حلقوں میں بھی پڑھا جاتا ہے۔

۴۔ "خدمت" یہ وادی میں چھپنے والا سب سے قدیم روزانہ اخبار ہے۔ اور برسرِ اقتدار جماعت کانگریس کا ترجمان ہے۔ ریاست کے ایک کہنہ مشق صحافی پنڈت نندلال واتل اس کے مدیر ہیں۔

۵۔ "سندیش" جموں کا سب سے پرانا اور سب سے زیادہ چھپنے والا روزانہ اخبار۔ مسٹر نذیر حسین سمنانی ممبر لیجسلیٹو کونسل اِس کے مدیر ہیں۔

۶۔ "چاند"۔ یہ ہفتہ وار جموں سے سالہا سال سے شائع ہو رہا ہے یہ ریاست کے اخبارات میں سب سے زیادہ ضخیم ہوتا ہے۔ اسکے مُدیر دیوان نرسنگھ داس نرگس اُردو کے ایک کہنہ مشق قلم کار اور جموں کے مورّخ ہیں۔

۷۔ "رفتار"۔ یہ ہفتہ وار جموں سے اُردو کے معروف کہانی کار موہن باور کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ اپنے خوب صورت گیٹ اپ کی وجہ سے پسند کیا جاتا ہے۔

۸۔ "ہمدرد"۔ سرینگر سے خواجہ غلام رسول عارف کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ یہ اخبار اپنی میانہ روی کی وجہ سے پسند کیا جاتا ہے۔

۹۔ "اذان"۔ یہ ہفتہ وار جماعت اِسلامی (کشمیر) کا ترجمان ہے۔ جماعت کے امیر پیر سعد الدین اس کے مُدیر ہیں۔

۱۰۔ "شیرازہ"۔ یہ ریاست کی زبانوں، فن اور تمدن سے متعلق اکادمی کا ادبی اور تحقیقی رسالہ ہے۔ راقم الحروف اسکا مدیر ہے۔ ہر دو ماہ کے بعد شائع ہوتا ہے۔

علمی و ادبی سرگرمیاں

ریاست میں اُردو کے ادیبوں کی فہرست بہت طویل ہے لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ پچھلے بیس برس کے عرصے میں تخلیقی ادب پیدا کرنے والے سرکردہ ادیبوں کا رُجحان اُردو زبان کی بجائے کشمیری اور ڈوگری کی طرف زیادہ ہوگیا ہے۔ چنانچہ کشمیر کے سربرآوردہ ترین ادیب دینا ناتھ نادم، رحمان راہی۔ میر غلام رسول نازکی۔ اختر محی الدین۔ محمد امین کامل وغیرہ بیس برس پہلے اُردو میں ہی لکھتے تھے۔ لیکن آج ان کی توجہ کا اصل مرکز کشمیری زبان ہے۔ اس کی وجہ کچھ تو علاقائی قومیت کا ابھرتا ہوا احساس ہے اور کسی حد تک یہ بھی کہ اُردو کے وسیع میدان میں کشمیری لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔ لیکن اِس کے باوجود اِس وقت بھی جموں و کشمیر میں اُردو کے شاعروں، نثر نگاروں اور صحافیوں کی تعداد بلا مبالغہ سو اور ڈیڑھ سو کے درمیان ہے۔

کشمیر کے اُردو شاعروں میں شہ زور کاشمیری، مکتب سیماب کی آخری یادگاروں میں سے ایک ہیں اور اپنے رنگ کے نہایت پختہ مشق شاعر ہیں۔ میر غلام رسول نازکی اُردو قطعات کا مجموعہ "دیدۂ تر" بہت پہلے شائع ہو چکا ہے۔ نازکی فارسی اور عربی کے جیّد عالم ہیں۔ اور ان کے نثری مضامین میں ان کے تبحّر علمی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ عبد القدوس رسا جاودانی (بھدرواہ) اُردو کے کلاسیکی رنگ میں اچھی غزل کہتے ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام "نیرنگ غزل" شائع ہو کر دادِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ ڈاکٹر حبیب اللہ حامدی کاشمیری شاعر۔ نقاد۔ ڈرامہ نگار، افسانہ نویس اور ناول نگار بھی ہیں۔ اُن کی تنقیدی کتاب "غالب کے تخلیقی سرچشمے" جدید اُردو ادب کے تنقیدی سرمائے میں ایک اہم اِضافہ ہے۔ حامدی صاحب کی زیرِ ترتیب کتاب جدید ہیئت کے موضوع پر ہے۔ موہن یاور کے افسانوں کے کئی مجموعے جن میں "سیاہ تاج محل" اور "وسکی کی بوتل" شامل ہیں، ان کے ہلکے پھلکے اندازِ نگارش کے لئے داد حاصل کر چکے ہیں۔ قاضی غلام محمد کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ ریاضی سے منسلک ہیں۔ اُن کے مزاحیہ کلام کا مجموعہ "حرفِ شیریں" اُردو کے مزاحیہ ادب میں ایک خوشگوار اِضافہ قرار دیا گیا ہے۔ شمیم احمد شمیم کا آئینہ، اُردو

---

[1] نیوز پیپر ڈائریکٹری (۱۹۷۳ء) نظامتِ اطلاعات حکومت جموں و کشمیر سرینگر۔ اب اس میں "علم و دانش" نامی ایک اور سہ ماہی رسالے کا اضافہ ہوگیا ہے۔

[2] ان میں سری پرتاپ کالج کا "پرتاپ" اور امر سنگھ کالج کا "لالہ رُخ" نہایت اعلیٰ روایت کے حامل ہیں اور ڈاکٹر تاثیر جیسی شخصیات اِن سے وابستہ رہ چکی ہیں۔

صحافت میں اپنا مقام بنا چکا ہے۔ آفتاب کے مدیر ثناء اللہ بٹ کا روزانہ فکاہی کالم خضر سوچتا ہے "ولر کے کنارے" اپنے رنگ کی انتہائی دلچسپ اور ہر دل عزیز تحریر ہوتی ہے۔ اردو کے نوخیز ادیبوں میں تیج بہادر بھان۔ نور شاہ (افسانہ، ناول نگار) حکیم منظور۔ محمد یسین۔ رفیق راز۔ شجاع سلطان (شاعر) شامل ہیں۔ ان کے علاوہ عرش صہبائی، میکش کاشمیری، شوریدہ کاشمیری، سلطان الحق شہیدی۔ عابد مناوری۔ قیصر قلندر (شاعر) علی محمد لون (ڈرامہ نویس) کلدیپ رعنا۔ ریاض پنجابی اور بشیر شاہ (افسانہ نگار) بھی اردو ادب میں خوشگوار اضافے کر رہے ہیں۔ بیرون ریاست کے ادبا میں ڈاکٹر گیان چند جین (صدر شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی) ڈاکٹر محمد حسن (صدر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی) ڈاکٹر شکیل الرحمان، جگن ناتھ آزاد، کمال احمد صدیقی کشمیر میں اردو ادب کو فروغ دینے میں اہم حصہ ادا کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے چند ہی برسوں میں تحقیقی میدان میں اپنا مقام بنا لیا ہے اور ان کا مرتبہ "کلیات میر" زیر طبع ہے۔

ریاست میں ہر سال پچاس سے ساٹھ اور بعض اوقات ایک سو تک اردو کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ان میں سے کچھ تو مجموعۂ کلام ہوتے ہیں۔ کچھ تاریخ اور سوانح سے متعلق ہوتی ہیں۔ اور کچھ سیاسی اور عصری مسائل سے متعلق مختلف مکتب ہائے فکر کی ترجمان ہوتی ہیں۔

ریاست میں خالص اردو کے لئے اس وقت کوئی جماعت سرگرم نہیں ہے۔ اگرچہ شمیم احمد شمیم انجمن ترقی اردو (ہند) کی مجلس عاملہ کے رکن ہیں۔ لیکن انھوں نے ابھی تک ریاست میں اس انجمن کی شاخ قائم کرنے کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں کی ہے۔ تاہم کشمیر کی سب سے بڑی تنظیم "کشمیر کلچرل آرگنائزیشن" اردو کی ترویج کے لئے مناسب کام کر رہی ہے۔ اس انجمن کی طرف سے کشمیر کے روحانی پیشوا شیخ نورالدین نورانیؒ کے شش صد سالہ جشن کے سلسلے میں خاص مقالات کو اردو میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ جشن اقبال منانے کی بھی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ کل ہند بزم شعراء اور تلاش ادب کی انجمنیں بھی اچھی کارگذاری کرتی ہیں اور محفلوں کا انعقاد کرتی رہتی ہیں۔

ریاست میں اردو کا سب سے بڑا اشاعتی ادارہ یہاں کی کلچرل اکادمی ہے۔ اگرچہ یہ شکایت عام ہے کہ اکادمی اردو کی طرف پوری توجہ نہیں کرتی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ریاست میں اس ادارے سے زیادہ اردو کے لئے اور کوئی ادارہ خدمت انجام نہیں دے رہا ہے۔ اکادمی ہر سال ریاست کے اردو ادیبوں کی منتخب تخلیقات پر مشتمل انتھالوجی "ہمارا ادب" شائع کرتی ہے۔ اکادمی سے دو ماہی "شیرازہ" بھی شائع ہوتا ہے۔ اور اس میں لکھنے والوں کو معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اکادمی اردو کشمیری فرہنگ مرتب کر رہی ہے جس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اکادمی کی طرف سے ریاست میں اردو کی بہترین کتابوں پر ہر سال ایک ہزار روپے کا پہلا اور سات سو روپے کا دوسرا انعام پیش ہوتا ہے۔ اب تک ۲۲ کتابوں پر انعامات دیئے جا چکے ہیں۔ اکادمی اردو میں کتابیں چھاپنے والے مصنفین کی مالی اعانت بھی کرتی ہے۔ اس کی مالی اعانت سے اب تک اسّی کے قریب اردو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

اس کے علاوہ یونیورسٹی کا اردو شعبہ "ادبیات" نام کا رسالہ نکالتا ہے یونیورسٹی اردو میں توسیعی تقریروں وغیرہ کا اہتمام بھی کرتی ہے۔ اس سال جموں میں محکمۂ صنعت کے اہتمام سے اردو ادب کے سلسلے میں ایک کل ہند سیمینار منعقد ہوا جس میں کرشن چندر۔ خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری، عصمت چغتائی۔ ظ۔ انصاری، واجدہ تبسم وغیرہ نے شرکت کی۔ کلچرل اکادمی اور ریڈیو کشمیر کی طرف سے سال میں تین چار کل ہند مشاعرے بھی منعقد ہوتے ہیں۔

کتب خانے

ریاست میں اگرچہ اردو کے کتب خانے الگ حیثیت میں کام نہیں کرتے، لیکن یہاں کے بڑے بڑے کتب خانوں میں اردو کتب و رسائل کا نہایت عمدہ ذخیرہ موجود رہتا ہے۔ کشمیر یونیورسٹی کا کتب خانہ حال میں قائم ہوا ہے لیکن یہاں اردو کتابوں کی تعداد پندرہ ہزار سے تجاوز کر چکی ہے اور ان میں اردو کی بہترین مطبوعات شامل ہیں۔ سری پرتاپ پبلک لائبریری کی پینتیس ہزار کتابوں میں پندرہ ہزار کے قریب اردو کتابیں موجود ہیں۔ اور اس کا فیض سب سے زیادہ عام ہے۔ محکمہ تحقیقات علمیہ کی لائبریری اگرچہ کمیت کے لحاظ سے مختصر ہے، لیکن کیفیت میں اس کا جواب نہیں ہے اور اردو کے کچھ نادر قلمی نسخے یہاں پر موجود ہیں[1]۔ اسی طرح کلچرل اکادمی کے کتب خانے میں اب اردو کے نادر قلمی نسخوں کی اچھی تعداد شامل ہے جن میں خوش نویسی کے مرقعوں کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ غیر سرکاری اداروں میں جامعۂ مدینۃ العلوم (حضرت بل) میں اردو کی کتابوں اور خاص طور پر مذہبی لٹریچر کا نہایت عمدہ ذخیرہ موجود ہے۔ یہ ادارہ اوقاف اسلامیہ کی نگرانی میں ہے اور اس کو ایک شاندار عمارت میں منتقل کرنے اور زیادہ ہمہ گیر بنانے کے لئے ایک کمیٹی سے سفارشات مرتب کرنے کو کہا گیا ہے۔

---

[1] اس لائبریری میں کل کتابوں کی تعداد سترہ ہزار ہے جن میں مخطوطات کی بیش قیمت دولت شامل ہے۔ یہاں پر اردو کے ساٹھ مخطوطات محفوظ ہیں جن میں سے بیشتر اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔

مرکزی جماعت اسلامی کا کتب خانہ بھی اُردو کتابوں کے ایک بہت اچھے ذخیرہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں قرآنی علوم حدیث فقہ اور دوسرے اسلامی علوم سے متعلق اہم کتابیں موجود ہیں۔

کشمیر میں اُردو کی توسیع کے لئے کام کرنے والے صاحبِ عزم لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ شمیم احمد شمیم کا ذکر ہو چکا ہے۔ انھوں نے ملک کے سب سے اونچے ایوان پارلیمنٹ میں اُردو کا مقدمہ وقتاً فوقتاً نہایت قابلیت اور جرأت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ خواجہ ثناء اللہ بٹ اور صوفی غلام محمد اُردو کو ریاست میں اپنا جائز مقام دلانے کے وقتاً فوقتاً اپنے بااثر اخبارات میں آواز بلند کرتے رہتے ہیں بیگم ساجدہ نسیم احمد ریاست کی ناظم تعلیمات اور کل ہند ترقی اُردو بورڈ کی رکن ہیں۔ وہ نہ صرف خود اُردو کی اچھی ادیبہ ہیں۔ بلکہ اُردو کے کاز کیلئے ہر فورم اور ہر مرحلے پر مستعد رہتی ہیں۔ محکمۂ تحقیقات علمیہ کے ناظم فدا محمد حسنین بھی اُردو کے پُرجوش حمایتیوں میں سے ہیں۔ اسی طرح قاری سیف الدین ممبر اسمبلی۔ عبدالرشید کابلی ممبر اسمبلی۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری ڈاکٹر اکبر حیدری۔ محمد امین مدبر چنانہ۔ جگن ناتھ آزاد۔ حکیم منظور۔ نرسنگھ داس نرگس موہن یاور بھی کشمیر میں اُردو کے فروغ کیلئے اپنی اپنی بساط کے مطابق قابلِ قدر کام کر رہے ہیں۔ پیر محمد افضل نوری تحریک آزادی کی تاریخ اُردو میں قسط وار لکھ رہے ہیں جو کافی مقبول ہو رہی ہے۔

ریاستی حکومت اُردو کے فروغ کیلئے زیادہ تر کلچرل اکادمی پر اکتفا کرتی ہے۔ اگرچہ اکادمی ایک خود اختیار ادارہ ہے لیکن اس کی رقوم تمام و کمال حکومت کے خزانے سے آتی ہیں۔ خود حکومت اُردو کے لئے کوئی انعامی مقابلہ نہیں کراتی۔ کلچرل اکادمی ریاست کا واحد ادارہ ہے جو اُردو کتابوں پر انعامات دیتا ہے۔ اب تک ۲۲ کتابوں پر ان کے مصنفین کو انعامات دیئے جا چکے ہیں۔ ریاست سے باہر کے کچھ علمی اداروں کو جن کا اُردو کی ترویج سے تعلق ہے۔ امداد دی جاتی ہے ان میں مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس کو کچھ سال قبل دس ہزار روپیہ کی امداد دی گئی جس کی مدد سے اس نے اُردو کے مشاہیر شعرا کے کلام کا انتخابی سلسلۂ مطبوعات شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ اُردو کے کچھ ادیبوں کے لواحقین کو بھی امداد دی جاتی ہے چنانچہ اس سلسلے میں نریش کمار شاد۔ روش صدیقی۔ ہری چند اختر وغیرہ شعراء کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اس سال حکومت نے ہفتۂ اقبال منانے کے لئے جموں و کشمیر یونیورسٹی کو آٹھ ہزار روپے کی گرانٹ بھی عطا کی۔ اس سے قبل غالب کی صد سالہ سالگرہ کا جشن منانے کے لئے بھی سرکاری سطح پر ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی۔ جس کو ایک خاصی رقم اخراجات کے لئے دی گئی تھی۔

سرکاری دفاتر اور اُردو

اگرچہ آئین کے مطابق ریاست میں ہر محکمے میں اُردو میں کام کاج ہونا چاہیئے لیکن عملاً صورت یہ نہیں ہے۔ محکمۂ اطلاعات کی پریس ریلیزز عام طور پر انگریزی میں شائع ہوتی ہیں۔ اور اخبارات کی شکایت یہ ہے کہ انہیں اگر اُردو کا کوئی پریس نوٹ ملتا بھی ہے تو تاخیر سے پہونچتا ہے۔ محکمہ اطلاعات میں پہلے اُردو کا ایک ماہنامہ تعمیر بھی شائع ہوتا تھا۔ جسے نامعلوم اسباب کی بنا پر بند کر دیا گیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں حکومت ہند کا مقامی پریس انفارمیشن بیورو تقریباً اپنی ساری کارروائی اُردو میں ہی انجام دیتا ہے۔

ریاست کی قانون ساز اسمبلی میں کام کاج زیادہ تر اُردو میں ہوتا ہے۔ اور خاص طور پر مباحث اسی زبان میں ہوتے ہیں۔ اس سال گورنر نے اپنا خطبہ بھی اُردو میں پڑھا۔ اسمبلی اپنی سالانہ روئداد انگریزی کے علاوہ اُردو میں بھی پابندی سے شائع کرتی ہے۔ عدلیہ اور محکمہ مال میں بھی اُردو کا چلن جاری ہے۔ اگرچہ جموں ڈویژن میں اب اس سلسلے میں کچھ پیچیدگیاں پیدا ہونے لگی ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ باقی سبھی محکموں میں اُردو کا چلن محدود ہے۔ خاص طور سکریٹریٹ اور اس کے ذیلی دفاتر میں اُردو بالکل ناپید ہے اور اور اسی لئے اس کے سرکاری زبان ہونے کے بارے میں کبھی کبھی شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں۔

چند تجاویز

کشمیر میں اُردو کی ترقی اور بقاء کا مسئلہ اس زبان کے کل ہند مستقبل سے وابستہ ہے۔ اگر دہلی۔ لکھنؤ۔ حیدرآباد وغیرہ میں جہاں اُردو کی جڑیں واقع ہیں، یہ زبان زوال پذیر ہوتی ہے، تو کشمیر میں جہاں اس کی شاخیں واقع ہیں، اُسے مرجھانے سے بچایا نہیں جا سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ملک میں اور خاص طور پر ان حصوں میں جہاں کے عوام کی یہ مادری زبان ہے اُردو کو اس کا جائز مقام دیا جائے۔

ریاست میں اُردو کے ادب کا ذوق اور اس کی طرف دانشور حلقے کو متوجہ کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اُردو کے کل ہند ادارے۔ مرکزہ رسائل مرکزہ نقاد وغیرہ کشمیر کے اُردو لکھنے والوں کے بارے میں بے نیازی کا رویہ نہ اختیار کریں۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ انجمن ترقی اُردو (ہند) نے کشمیر میں اُردو اور اُردو ادیبوں کے مسائل کی طرف کوئی توجہ نہیں کی ہے۔ انجمن کی سینکڑوں کتابوں میں نہ تو کشمیر کے بارے میں ہی کوئی کتاب شائع کی گئی ہے اور نہ ہی کسی کشمیری ادیب کی اُردو کتاب کو انجمن

کی طرف سے شائع کرنے کا امتیاز بخشا گیا ہے۔ آج کل (اُردو) واحد غیر ریاستی رسالہ ہے، جس نے کشمیر کے اُردو ادیبوں کی تخلیقات کی اشاعت میں دلچسپی دکھائی ہے۔[1]

اسی طرح آل انڈیا ریڈیو کی اُردو سروس اور اُردو مجلس میں نہایت ہی شاذ و نادر ہی کشمیری ادیب کی کوئی تخلیق نشر کی جاتی ہے۔

اُردو اُصولی طور پر ریاست میں ذریعۂ تعلیم تو ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ وزارت تعلیم ہائی اسکولوں تک ٹیچر بھرتی کرتے وقت پہلے اس بات کو یقینی بنالے کہ وہ اُردو رسم الخط سے واقف ہیں اور دوسرے یہ کہ واقعی سکولوں میں اُردو کو اس کے منظور شدہ رسم الخط میں ہی پڑھایا جاتا ہے۔

اُردو کیلئے اچھی درسی کتابوں کی دستیابی ایک مسئلہ ہے۔ خاص طور پر معلومات عامہ (جنرل نالیج) سائنس، ریاضی اور اسی قسم کے مضامین میں۔ اکثر صورتوں میں جب بچوں اور استادوں کو اُردو میں اس قسم کی کتابیں نہیں ملتیں تو وہ انگریزی یا ہندی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس کا تدارک اُردو میں بہتر اور بالتصویر درسی کتابوں کی طباعت سے ہوسکتا ہے اور اُمید ہے کہ ترقی اُردو بورڈ اس سلسلے میں اپنی ذمہ داریاں نبھائے گا۔

اسی طرح اُردو اصولی طور پر دفتروں کی زبان تو ہے لیکن عملی طور پر یہ دفتروں کے ایک فی صدی سے زیادہ کام کے لئے استعمال نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں گوال کمیٹی کے سامنے تجویز پیش ہوئی تھی کہ وزیر اعلیٰ کے سکریٹریٹ میں ایک اعلیٰ سطح کے افسر کی آسامی وجود میں لائی جائے جس کا کام یہ ہو کہ وہ دفاتر میں اُردو کے استعمال کے بارے میں ہدایات دے اور ان کی تعمیل کی نگرانی کرے۔

دفاتر میں اُردو کے استعمال اور ترویج میں ایک بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ابھی تک اُردو ٹائپ رائٹر آسان نہیں بنایا جاسکا ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ اُردو کے مرکزی ادارے ایک ایسا ٹائپ رائٹر اختراع کرنے کی طرف توجہ دیں۔ اس کے بعد مقامی کلرکوں کو اس کے استعمال کی تربیت دی جاسکتی ہے۔ یہ بڑی حد تک دفاتر کا مسئلہ حل کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔

محکمۂ اطلاعات کے لئے اُردو میں کام کاج کرنا اشد ضروری ہے۔ اس محکمے میں انگریزی کی بجائے اُردو میں اشاعت کو اولین ترجیح دی جانی چاہئے اور اُردو پریس ریلیز، کتابچے وغیرہ شائع کرنے کو لازمی بنادیا جانا چاہئے۔ محکمہ میں اُردو کا ایک الگ شعبہ منظم ہونا چاہئے جس میں اعلیٰ صلاحیت کے ایڈیٹر، مترجم، مصور اور خوش نویس بھرتی کئے جائیں۔ ماہنامہ "تعمیر" کی تجدید بھی ضروری ہے۔

ریاست میں اُردو اخبارات کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کی اپیل ایک چھوٹے سے علاقے تک محدود ہے جو بڑے بڑے سرمایہ کاروں اور کارخانوں سے تقریباً خالی ہے۔ لہٰذا انہیں نفع بخش اشتہارات نہیں ملتے۔ ضرورت یہ ہے کہ مرکزی وزارت اطلاعات و نشریات ان چھوٹے اخبارات کو پروان چڑھانے کے لئے انہیں زیادہ اشتہارات دے۔ اور مقامی معاملات میں ان میں شائع شدہ مراسلوں اور آرا کو زیادہ سنجیدگی سے وزن و وقار عطا کرے۔

اُردو اخبارات کو عموماً اور اُردو لکھنے والوں کو ریاست میں اب ایک اور مسئلے کا سامنا ہو رہا ہے۔ یہاں اچھے خوش نویسوں کا فقدان ہے۔ مقامی کلچرل اکادمی نے کچھ عرصہ پہلے خوشنویسی کے لئے ایک تربیتی کورس منعقد کیا تھا اور لکھنؤ کے بعض ماہر فن خوشنویسوں کے علاوہ کشمیر کے کچھ پرانے سال خوشنویسوں سے تیس چالیس نوجوانوں کو تین چار مہینے تک اس فن میں تربیت دلوائی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ اچھے کاتب میدان میں آگئے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اکادمی فن خوش نویسی کا ایک سکول شروع کرے۔ جو اُردو کی کل ہند ضرورت کو بھی پورا کرسکتا ہے۔ اسی طرح ریاست میں ابھی تک لیتھو ہی سے طباعت کا کام ہوتا ہے لیکن یہاں کے کارکنوں کو سنگ سازی کی کوئی مہارت نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مقامی طور اُردو کی چھپائی بھدی اور بدنما ہوتی ہے بہتر ہوتا اگر حکومت تمام مطابع کے لئے یہ لازمی قرار دے کہ وہ تربیت یافتہ سنگ ساز ملازم رکھیں۔

ریڈیو کشمیر سے اُردو میں اگرچہ کچھ پروگرام نشر ہوتے ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ان میں ریاست کے واقعی اچھے اُردو ادیبوں کو شاذ ہی شامل کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اسٹیشن میں اس وقت اُردو کے پروڈیوسر کا عہدہ خالی پڑا ہوا ہے۔

کشمیر میں اُردو کو جائز مقام دلانے اور اس کی ترویج کا کام انجام دینے کیلئے مقامی اُردو ادیبوں کی ذمہ داریاں بھی کچھ کم نہیں ہیں اور ان کے مسائل اور جذباتی کیفیت سے قطع نظر انھوں نے یہ ذمہ داریاں انجام دینے میں زیادہ سرگرمی بھی نہیں دکھائی ہے۔ اگر ریاست میں اُردو کی کوئی ترجمان تنظیم ہوتی تو حکومت کی کوتاہیوں پر بھی گرفت کرسکتی تھی اور مختلف اداروں کو بھی جواب دہ بنا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ ریاستی اور مرکزی ادارے ایسی تنظیموں کو جو گرانٹ دے رہے ہیں ان سے بھی یہ تنظیم فائدہ اٹھا کر اُردو کا کاز آگے بڑھا سکتی تھی۔ مزید برآں یہ تنظیم کشمیر کے اُردو ادیبوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بن سکتی تھی۔ اس مسئلہ میں سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ انجمن ترقی اُردو (ہند) ریاست میں اپنی شاخ منظم کرنے کی طرف توجہ دے۔

●●

---

[1] آجکل میں وقتاً فوقتاً کشمیری نظموں کے اُردو تراجم بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آجکل نے جنوری ۱۹۶۹ء اور فروری ۱۹۷۰ء میں کشمیر سے متعلق خصوصی شمارے بھی شائع کئے ہیں۔ (ادارہ)

اُردو دہلی اور اُس کے نواح میں بولی جانے والی کھڑی بولی سے نکلی ہے۔ اور دہلی ہی اس اُردوئے معلّٰی کا گھر ہے۔ ممکن ہے بعض ماہرین لسانیات کے نزدیک یہ امر نزاعی ہو، لیکن اس حقیقت سے انکار مشکل ہوگا کہ اُردو ادب کی ابتدا، نشو ونما اور بلوغ کی تاریخ کی بیشتر کڑیاں دہلی ہی سے منسلک ہیں۔ طوطیٔ ہند حضرت امیر خسرو دہلوی (تیرھویں صدی عیسوی) اُردو کے پہلے شاعر ہی نہیں بلکہ انہیں اس کے مخترع کا مرتبہ بھی حاصل ہے۔ ان کی پہیلیاں، مکرنیاں، انملیاں اور دوہرے آج بھی مشہور ہیں۔ حضرت امیر خسرو اور دہلی کے قدیم شعرائے اُردو کے درمیان تین صدیوں کا فصل ہے۔ یہ وہ عرصہ ہے، جس میں زبان نیز شعر و ادب کا مرکز دکن رہا۔ ولی دکنی کے کلام کی اشاعت سے مرکزِ شاعری دہلی کو منتقل ہوگیا۔ ولی کا سادہ، صاف اور فصیح کلام قدیم شعرائے دہلی کے لئے نمونہ بنا۔ شاہ حاتم (۱۶۹۹ء تا ۱۷۹۲ء) خان آرزو (۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۶ء) شاہ مبارک آبرو (متوفی ۱۷۵۰ء) سید محمد شاکر ناجی، شیخ شرف الدین مضمون (متوفی ۱۷۴۵ء) نے ولی کے تتبع سے شاعری کی۔ اس دور کے دوسرے شعراء جان جاناں، مصطفےٰ خاں یک رنگ، میر عبدالحیٔ تاباں، اشرف علی فغاں وغیرہ ہیں۔ اسی دور ارتقا نے دیکھا کہ دکنی کے اثرات دھیرے دھیرے کم اور پھر ختم ہو رہے ہیں۔ زبان صاف ہو رہی ہے۔ فارسی ترکیبیں اور خیالات شاعری میں جگہ پا رہے ہیں۔

تدریجی ترقی کا ایک اور مرحلہ سر ہوا۔ مطلع ادب پر میر تقی میر اور سودا نمودار ہوئے۔ ان شعراء نے شاعری کو درجۂ اعتبار بخشا۔ زبان و بیان کو وسعت دی۔ اسے حسن ادا، جدت خیال، حلاوت زبان اور قدرتِ الفاظ سے روشناس کرایا۔ ان کے ہم عصر مرزا مظہر جانِ جاناں، میر درد، سوز، یقین، حاتم، بیان، قدرت، ضیا اور دوسرے شعراء تھے۔ اس عرصے میں نئی نئی تشبیہوں، صنائع بدائع اور استعاروں نے اشعار میں راہ پائی۔ غزل اور قصیدے کا سکہ رواں ہوا۔

اُردو شاعری کا ایک دوسرا دور انشا و مصحفی کے ساتھ شروع ہوا۔ اس دور میں شاعری معاملہ بندی بنی۔ ریختہ ریختی ہوئی۔ غزل کے ساتھ مثنوی اور قصیدے کا چلن عام رہا۔ گاہ گاہ ذوق، غالب، مومن اور ظفر سے موسوم اور متمیز ہے نیز انتہائی سیاسی و سماجی انتشار کا ہے۔ شعرائے دہلی نے فرخ آباد، عظیم آباد، مرشد آباد، حیدر آباد کا رُخ کیا۔ تاہم انیسویں صدی کے اواخر سے ۱۹۴۷ء تک دلی جن دوسرے نامور شعرا اور ادبا کا مرکز و مسکن رہا۔ ان میں داغ دہلوی، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، نیر مومن دہلوی، پیارے لال آشوب، سرسید احمد خاں، مولوی سید احمد، لالہ سری رام، جوہر، مومن و تاثر، یگانہ، جوالا پرشاد برق، بیخود دہلوی، سائل دہلوی، محمود دہلوی، آغا شاعر قزلباش، حسن نظامی، پنڈت لبھورام وغیرہ شامل ہیں۔

اُردو بولنے والوں کی تعداد

۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں اُردو، ہندی اور پنجابی سبھی کو ہندوستانی کا نام دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں سے کسی بھی زبان کے بولنے والوں کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو سکی۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق دہلی میں اُردو مادری زبان والوں کی تعداد ۵۲۲۴۰ تھی، جو کل آبادی کا ۵٫۶ فیصدی ہے۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق اردو مادری زبان والوں کی تعداد اضافہ کے بعد ۲۷٫۳ ہو گئی تھی جو دہلی کی کل آبادی یعنی ۴۰٬۶۶٬۰۰۰ کا ۵٫۰ فیصدی ہے۔ لیکن مرکزی نظم و نسق والے علاقے دہلی میں اردو بول، لکھ اور پڑھ سکنے والوں کی تعداد مذکورہ تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ اس علاقہ میں پنجابیوں کی آبادی کافی ہے اور پنجابی بالعموم اُردو لکھ پڑھ اور بول سکتے ہیں۔

تعلیمی سہولتیں

اس وقت دہلی میں پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں کا میڈیم ہندی، اُردو، بنگالی، پنجابی وغیرہ ہے۔ لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی بارھویں رپورٹ (برائے جولائی ۱۹۶۹ء تا جون ۱۹۷۰ء) کے مطابق دہلی میں ۶۸-۱۹۶۷ء میں بارہ پرائمری اسکول ایسے تھے جن میں بچوں کو اُن کی مادری زبان یعنی اردو میں تعلیم دی جا رہی تھی۔ اُس برس ان اسکولوں میں زیر تعلیم طلبا کی تعداد ۶۱۰۴ اور معلموں کی تعداد ۲۶۷ تھی۔ ۶۹-۱۹۶۸ء میں اسکولوں کی تعداد حسب سابق رہی جبکہ طلبا اور معلموں کی تعداد اضافے کے بعد بالترتیب ۶۲۷۴ اور ۲۶۹ ہو گئی۔

اسی طرح اضافے کی صورت ہمیں سیکنڈری اسکولوں میں دکھائی دیتی ہے۔ ۶۸-۱۹۶۷ء اور ۶۹-۱۹۶۸ء میں مادری زبان اُردو کے ذریعے تعلیم دینے والے اسکول ۹ تھے۔

۶۸-۱۹۶۷ء میں، ان اسکولوں میں اُردو کے ذریعے تعلیم پانے والے بچوں کی تعداد ۸۲۵۴ تھی جو اضافے کے بعد ۶۹-۱۹۶۸ء میں ۹۶۴۹ ہو گئی۔ ان اسکولوں میں، ۶۸-۱۹۶۷ء میں اُردو بحیثیت ایک مضمون پڑھنے والے طالب علموں کی تعداد ۵۴۲۱ تھی۔ ۶۹-۱۹۶۸ء میں ۶۵۲۱ طالب علم بحیثیت ایک مضمون کے اُردو پڑھ رہے تھے۔ ان اسکولوں میں معلموں کی تعداد ۱۶۱ تھی جبکہ گزشتہ برس ۱۵۷ معلم ان اسکولوں میں پڑھا رہے تھے۔

دہلی یونیورسٹی کے پندرہ کالجوں میں اردو بی۔ اے تک بحیثیت

ایک مضمون پڑھائی جاتی ہے۔ دہلی کالج اور کروڑی مل کالج میں اُردو آنرز کا انتظام بھی ہے۔ بی اے اور بی اے آنرز کے اُردو طالب علموں کی مجموعی تعداد تقریباً دو سو ہے۔ ایم اے کے داخلے دہلی کالج اور پوسٹ گریجویٹ ایوننگ کالج میں ہوتے ہیں اس برس یعنی ۷۴-۱۹۷۳ء میں ایم اے اُردو کے طالب علموں کی تعداد ۷۵ ہے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (اردو) کے طلبا دہلی یونیورسٹی میں براہ راست داخلہ لیتے ہیں۔ اس وقت مختلف موضوعات پر اندازاً پچاس اسکالر کام کر رہے ہیں۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ایم لٹ، مخطوطہ شناسی، اُردو میں سرٹیفکٹ اور ڈپلومہ کورسوں کا بھی انتظام ہے۔ اس برس (۷۴-۱۹۷۳ء) ان کورسوں میں ۷۵ طالب علم ہیں۔[1]

ڈاکٹر ظہیر صدیقی
صدر شعبۂ اُردو
دہلی یونیورسٹی

اردو اخبارات و رسائل

دہلی ہندوستان کا دل ہی نہیں اس کا دماغ بھی ہے۔ یہاں اردو صحافت کی روایت بھی بڑی پرانی ہے۔ مولانا محمد باقر کے ہفتہ وار "دہلی اُردو اخبار" (۱۸۳۶ء) اور ماسٹر رام چندر کے ماہانہ و پندرہ روزہ "فوائد الناظرین" سے لے کر عہد حاضر تک دہلی اردو صحافت کا ایک مرکز رہا ہے تاہم آزادی کے بعد پنجاب سے اخبارات اور اخبار نویسوں کی ہجرت کے بعد یہاں صحافت کو خصوصی فروغ حاصل ہوا ہے۔

پریس رجسٹرار کی حالیہ رپورٹ (۱۹۷۱) کے مطابق ۱۹۷۰ء میں دہلی سے ۹ روزانہ اخبار شائع ہوتے تھے۔ "وطن" (۱۹۳۰ء) کو چھوڑ کر بقیہ یہ سبھی اخبار آزادی کے بعد دہلی سے شائع ہونا شروع ہوئے ہیں۔ روزانہ "ملاپ" جس کے ایڈیٹر جناب رنبیر ہیں دلی کا کثیر الاشاعت روزنامہ ہے۔ اس کی اشاعت ۳۰ ہزار سے زیادہ ہے۔ یہ دہلی کے علاوہ جالندھر و حیدرآباد سے شائع ہوتا ہے۔ ایک دوسرا کثیر الاشاعت روزنامہ "پرتاپ" ہے۔ دہلی کے علاوہ یہ جالندھر سے بھی نکلتا ہے۔ "پرتاپ" دہلی کے ایڈیٹر جناب نریندر ہیں۔ یہ لگ بھگ تیس ہزار شائع ہوتا ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کا ترجمان روزانہ "الجمعیۃ" کے ایڈیٹر مولانا محمد عثمان فارقلیط ہیں۔ یہ ۴،۷۵۰ شائع ہوتا ہے۔ جماعت اسلامی کے اخبار "دعوت" کی تعداد اشاعت ۶۶۳۱ ہے۔ اس کے ایڈیٹر محمد مسلم صاحب ہیں۔ یہ ۱۹۵۳ء میں جاری ہوا تھا۔ دوسرے روزانہ اخبار "ملک و ملت" (مدیر سید انیس الرحمٰن تعداد اشاعت ۸،۵۱۶) "تیج" (ایڈیٹر وشو بندھو گپتا و دھرم پال گپتا وفا تعداد اشاعت ۴،۷۳۵) "سویرا" (ایڈیٹر جمنا داس اختر تعداد اشاعت ۲،۷۸) اور "وطن" (ایڈیٹر شو نرائن بھٹناگر، تعداد اشاعت: ۱۹۹۶) ہیں۔

پریس رجسٹرار کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۷۰ء میں ۳۱ ہفتہ وار اخبار شائع ہوتے تھے۔ ابتداءً لاہور سے نکلنے اور آزادی کے بعد دہلی سے شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبارات "شیر پنجاب" (ایڈیٹر سودیش بہادر سنگھ) اور "اتالیق" (ایڈیٹر ہنس راج وہرہ۔ تعداد اشاعت ۶۰۰۰) سے قطع نظر ہفتہ وار اخبار "الجمعیۃ" دہلی سے شائع ہونے والا سب سے پرانا ہفتہ وار ہے۔ یہ ۱۹۱۵ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے ایڈیٹر مولانا محمد عثمان فارقلیط ہیں۔ اس کی تعداد اشاعت ۶۰۱۱ ہے۔ ایسا دوسرا ہفتہ وار ریفارمر (۱۹۲۶ء) ہے۔ اس کے ایڈیٹر جناب امرناتھ ہیں۔ یہ تین ہزار شائع ہوتا ہے۔ دہلی کے دوسرے اہم ہفتہ وار "ایشیا" (ایڈیٹر میر مشتاق احمد) "پیام مشرق" "حیات" (ایڈیٹر اسد جعفری) "پرچم ہند" (ایڈیٹر: سید انیس الرحمٰن) اور فلمی رسالہ "چترا" (ایڈیٹر دھرم ویر) ہیں۔ نظامت تعلقات عامہ وزارت دفاع کا "سینک سماچار" اور وزارت اطلاعات و نشریات کا دیواری اخبار "اپنا دیش" بھی قابل ذکر ہفتہ وار ہیں۔ دہلی کے ہفتہ وار اخبارات میں قابل ذکر اضافہ "نئی دنیا" کا ہوا ہے۔ یہ اخبار مولانا عبدالوحید صدیقی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔

اس وقت دہلی سے سولہ پندرہ روزہ اخبار شائع ہوتے ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو کے رسالہ "آواز" سے قطع نظر باقی سبھی پندرہ روزہ اخبار آزادی کے بعد سے شائع ہونا شروع ہوئے ہیں۔ ان اخبارات کی تعداد اشاعت بڑی محدود ہے۔ ان میں "ہمدرد"، "ندائے اتحاد"، "پیڈم"، "ہند سندیش" وغیرہم قابل ذکر ہیں۔ مولانا عبدالوحید صدیقی کا پندرہ اخبار "واقعات" اب ماہانہ شائع ہونے لگا ہے۔ یہ ڈائجسٹ ہے۔ دہلی سے شائع ہونے والے دوسرے اہم ڈائجسٹ "شبستان" (ایڈیٹر یونس دہلوی) "ہما" (ایڈیٹر عبدالوحید صدیقی) "ہدیٰ" ایڈیٹر (ایم۔ اے صدیقی) "محراب" (ایڈیٹر ایس ایس اشرف) "مدینہ ڈائجسٹ" (ایڈیٹر این حسن) ہیں۔ یہ سبھی ڈائجسٹ ماہانہ ہیں۔ ان کے

---

[1] ایک اطلاع کے مطابق اس وقت دہلی میں اُردو میڈیم پرائمری، مڈل اور سیکنڈری اسکولوں کی تعداد بالترتیب ۵۰، ۱۰ اور ۴ سے زیادہ ہے۔
ان کے علاوہ کچھ اسکول ایسے بھی ہیں جہاں اردو بحیثیت مضمون پڑھائی جاتی ہے۔ ان اعداد و شمار کے پیش نظر یہ بات بہ سہولت کہی جا سکتی ہے کہ اُردو کے تعلق سے تعلیمی سہولتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ (ادارہ)

[2] پریس رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کی رپورٹ (۱۹۷۲ء) کے مطابق ۱۹۷۱ء میں دہلی سے ۱۰ روزانہ، ۴۲ ہفتہ وار، ۱۸ پندرہ روزہ اخبار، ۸۸ ماہانہ، ۷ سہ ماہی رسالے شائع ہوتے تھے۔

علاوہ دہلی سے لگ بھگ ستر ماہانہ رسائل شائع ہوتے ہیں۔ فلمی رسالوں میں شمع (ایڈیٹر یونس دہلوی) اور "روبی" (ایڈیٹر رحمان نیّر) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ماہنامہ شمع دہلی ہی کا نہیں، ہندوستان کا سب سے کثیر الاشاعت ماہنامہ ہے۔ شمع ۱۹۳۹ء سے برابر شائع ہو رہا ہے۔ اس کی تعداد اشاعت ۸۰،۴۴۱ ہے۔

دہلی سے شائع ہونے والے ادبی رسائل میں "بیسویں صدی"، "تحریک" "آج کل" سرِفہرست ہیں۔ بیسویں صدی خوشتر گرامی کی ادارت میں ۱۹۳۷ء سے شائع ہو رہا ہے۔ تحریک کا ادارہ تحریر گوپال متل، پریم گوپال متل اور مخمور سعیدی پر مشتمل ہے۔ "آج کل" وزارت اطلاعات و نشریات کا رسالہ ہے۔ یہ رسالہ اپنے اچھے ادبی معیار اور اعلیٰ خصوصی نمبروں کے لئے عمدہ کتابت و طباعت کے لئے مشہور ہے۔ اس کے ایڈیٹر جناب مہدی عباس حسینی ہیں۔ ماہانہ رسائل میں عورتوں کا ماہنامہ "بانو" (ایڈیٹر زینت کوثر) اور بچوں کے رسالے "کھلونا" (ایڈیٹر الیاس دہلوی) اور "پیامِ تعلیم" (ایڈیٹر محمد حسین حسّان ندوی) ہیں۔ مذہبی رسالوں میں "آستانہ"، "مولوی"، "منادی" "ہدیٰ"، "مدینہ ڈائجسٹ" "اوم" پیش پیش ہیں۔ دہلی سے شائع ہونے والے ماہانہ رسائل میں اِدھر ایک اضافہ ہوا ہے اور وہ رسالہ ہے سیکولر ڈیموکریسی۔ یہ رسالہ ڈاکٹر خلیق انجم کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ تحقیقی رسائل میں سہ ماہی "تحریر" (ایڈیٹر مالک رام) اور "اردوئے معلیٰ" سرِفہرست ہیں۔ تعلیمی اداروں کے رسالوں میں خاص مقام رکھتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر جناب ضیاء الحسن فاروقی ہیں۔ یہ رسالہ ۱۹۶۰ء سے برابر شائع ہو رہا ہے۔

علمی ادبی سرگرمیاں

کوئی ادبی رسالہ اٹھائیے، کوئی انتخاب دیکھئے۔ ہندوستان کے کسی شہر کسی گوشے میں ہونے والے مشاعرے کی روداد پڑھیئے، دہلی کے متعدد ادیبوں، شاعروں، محققین اور نقادوں کے نام سرِفہرست نظر آئیں گے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ دہلی جو ہندوستان بھر سے آئے ہوئے شعراء اور ادیبوں کا مسکن ہے، ادبی طور پر بڑا فعال مرکز ہے۔

دہلی کے شاعروں، ادیبوں، افسانہ نگاروں کی صحیح تعداد کا صحیح صحیح اندازہ دشوار ہے لیکن جب ہم دہلی کے ادیبوں پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ملک میں دہلی ہی اُردو ادیبوں اور شاعروں کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہی نہیں، ان میں سے بیشتر ادب میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں کسی تخصیص یا تقدیم و تاخیر کو ملحوظ خاطر رکھے بغیر دہلی کے ادیب و شاعر حسب ذیل ہیں۔

ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب، مالک رام، ایم ایم بیگ، ضیاء الحسن فاروقی، ڈاکٹر سلامت اللہ، عبداللطیف اعظمی، ڈاکٹر تنویر احمد، ڈاکٹر محمد عمر، ڈاکٹر انور صدیقی، عنوان چشتی، قیصر زیدی، اجمل اجملی، انور عظیم، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر شمیم نکہت، شاہدہ غفران زیدی، ڈاکٹر اسلم پرویز، شہاب جعفری، سید ضمیر حسن، راجندر ناتھ شیدا، جاوید وششٹ، ڈاکٹر کامل قریشی، رشید حسن خاں، آنند نرائن مُلّا، ڈاکٹر منوہر سہائے انور، گوپی ناتھ امن، ساغر نظامی، سید علی جواد زیدی، گربچن چندن شہریار پرواز، گوپال متل، بہار برنی، عمیق حنفی، سلام مچھلی شہری، رفعت سروش، کمال احمد صدیقی، زبیر رضوی، محمود ہاشمی، نثار احمد فاروقی، شہباز حسین، پریم ناتھ در، صالحہ عابد حسین، رضیہ سجاد ظہیر، م۔م راجندر، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد، غلام ربانی تاباں، ساحر ہوشیارپوری، درشن سنگھ دگل، گلزار دہلوی، خار دہلوی، ذکیہ سلطانہ نیّر، ممتاز مرزا، حمیدہ سلطان، مشیر جھنجھانوی، رام کرشن مضطر، کرشن موہن، کرشن مراری، بسمل شاہجہانپوری، رعنا جگی، حسن نعیم، دیوندر ستیارتھی، فکر تونسوی، مخمور جالندھری، ہنس راج رہبر، تاجور سامری، سنتوش صحرائی، ظفر ادیب، اظہار اثر، سلامت علی مہدی، سید سجاد ظہیر، ریوتی سرن شرما، شاہد ماہلی، عتیق احمد صدیقی، حیات اللہ انصاری، بلراج کومل، کمار پاشی، مخمور سعیدی، بانی، دوارکا داس شعلہ، کیلاش ماہر، محسن زیدی، صغیر احمد صوفی، افسر آذری، بلراج مین را، چندر پرکاش شاد، پریم پال اشک، کوثر چاندپوری، بسمل سعیدی، طالب چکوالی، ضیا فتح آبادی، خزان چند نسیم، طالب دہلوی، انور صابری، شمیم کرہانی، اثر دہلوی، فیاض رفعت، ستیش بترا، قمر احسن، دیویندر اسر، وشوا ناتھ درد، سکندر علی وجد، حبیب تنویر، بلراج حیرت، رام پرکاش راہی، سمت پرکاش شوق، مہیش چندر نقش، نقش صحرائی، عزیز وارثی، صغریٰ مہدی، راج نراین راز۔

دہلی ہمیشہ سے اردو کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ یہ سرگرمیاں بڑی متنوع اور گوناگوں ہوتی ہیں۔ کتابوں کی عالمی نمائش اور ایشیائی مصنفین کی کانفرنس سے لے کر محلہ جاتی انجمنوں کی ادبی نشستیں اس سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ دہلی میں مشاعرے بڑے پایہ کے ہوتے ہیں۔ دہلی میں مشاعروں کا آغاز شروع سال میں ہو جاتا ہے۔ اولیت یوم جمہوریہ کے مشاعرے کو حاصل ہے۔ یہ مشاعرہ ہر برس ۲۶ جنوری کے آس پاس منعقد ہوتا ہے اس میں ہندوستان بھر سے اُردو کے ممتاز شعرا کو مدعو کیا جاتا ہے۔ اس مشاعرے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس [illegible] بھی خاطر خواہ نمایندگی [illegible]

اس مشاعرے کی اہمیت بھی خصوصی ہے۔ اس میں نہ صرف ہندوستان کے مشہور و اہم خوش گو اور خوش گلو شعراء شریک ہوتے ہیں بلکہ ماضی قریب تک پاکستان کے ممتاز شعراء فیض، قتیل شفائی، سید محمد جعفری، عدم، زہرہ نگاہ، سحاب قزلباش وغیرہ شریک ہوتے رہے ہندوستانی شعراء میں فراق گورکھپوری، علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، غلام ربانی تاباں، شمیم کرہانی، جگن ناتھ آزاد، عرش ملسیانی، ساغر نظامی، مخمور سعیدی، نشور واحدی، بشیر بدر، شاذ تمکنت، کیفی اعظمی، نازش پرتاب گڑھی وغیرہ اکثر اس مشاعرے کی رونق بڑھاتے ہیں۔

دیگر مشہور مشاعروں میں چیمسفورڈ کلب کا مشاعرہ ہوتا ہے۔ ہفتہ وار ریجنٹ کے ایڈیٹر دھرمپال گپتا وقتاً فوقتاً ہر برس ایک شاندار مشاعرہ برپا کرتے ہیں۔ وسط سال یعنی اگست میں یوم آزادی کا مشاعرہ ہوتا ہے۔ جس میں بیرونجات کے شعراء کے علاوہ مقامی شعراء کو بھی مدعو کیا جاتا ہے چند مہینے قبل یہاں کل ہند مزاحیہ مشاعرہ بھی منعقد ہوا تھا۔ دہلی میں اپنی نوعیت یہ پہلا مشاعرہ تھا۔ بعض سرکاری محکمے بھی مشاعرے منعقد کرتے ہیں۔ بیشتر مقامی کالجوں کے سالانہ مشاعرے بھی ہوتے ہیں چھوٹی بڑی سطح پر ادبی جلسوں کا رواج عام ہے۔ کتابوں کی رسم اجراء کی تقریبیں بھی آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ ایسی تقریبوں کا انعقاد متعلقہ افراد اور ادبی انجمنیں کرتی ہیں۔ ممتاز ادیبوں کی ادبی خدمات کے اعتراف میں جلسے ہوتے ہیں اور ایسے موقعوں پر اُن سے متعلق مضامین کے مجموعے پیش کئے جاتے ہیں۔ ایسے مجموعوں میں "نذر ذاکر"، "نذر عرشی" اور "ارمغان مالک" وغیرہم خاص طور پر لائق ذکر ہیں دہلی میں شعراء کے جشن منانے اور انہیں استقبالیہ دینے کا رواج بھی عام ہے۔

زیادہ سنجیدہ علمی سرگرمیاں، مذاکرے و خطبات کا اہتمام دلّی یونیورسٹی کا شعبۂ اُردو اور جامعہ ملیہ کرتے ہیں۔ ادھر ایک اہم سیمینار انجمن ترقی پسند مصنفین نے "ادب اور عصری آگہی" کے موضوع پر منعقد کرایا تھا۔ اس میں مقامی شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ لکھنؤ اور بعض دوسرے شہروں کے ادیب اور شاعر بھی شریک ہوئے تھے۔

ادبی سرگرمیوں کے اہم مراکز غالب اکیڈمی، ایوان غالب، دلی یونیورسٹی وغیرہم خاص ہیں۔

کتابوں کی رسم اجرا کی تقریبات کا سرسری ذکر اوپر آچکا ہے۔ ایسے میں اشاعتی اداروں کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کے کسی ایک شہر میں اتنے فعال اشاعتی ادارے نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض چھوٹے پیمانے پر بڑے پیمانے پر بڑے پیمانے پر کام کرنے والے [illegible] ہزار ہیں۔ اس کے

۱۹۷۲-۷۳ء میں مکتبہ جامعہ نے ۴۵۷ کتابیں شائع کیں۔

دوسرے اہم اشاعتی ادارے، نیشنل بک ٹرسٹ، ترقی اُردو بورڈ، تعلیمی تحقیق کی قومی کونسل ساہتیہ اکاڈمی پبلی کیشنز ڈویژن ہیں یہ بھی سرکاری ادارے ہیں نیشنل بک ٹرسٹ نے سال گزشتہ میں لگ بھگ ۱۶ ادبی کتابیں اردو میں شائع کی ہیں۔ ترقی اُردو بورڈ کا دائرہ کار بیشتر علمی ہے۔ اس بورڈ نے پچھلے سال مختلف موضوعات پر چھ کتابیں شائع کیں۔ ان میں بچوں کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ تعلیمی تحقیق کی قومی کونسل (این سی آر ٹی) نصابی کتب شائع کرتی ہے۔ پچھلے سال اس کونسل نے ایسی چار کتابیں شائع کی ہیں۔ پی۔ کے پبلی کیشنز کا قیام حال ہی عمل میں آیا ہے۔ تاہم اس ادارے نے سال گزشتہ میں لگ بھگ بیس کتابیں شائع کی ہیں۔ اس کا خاص دائرہ کار نوجوان شعراء اور ادیبوں کی کتابوں کی اشاعت ہے

نیشنل اکیڈمی نے سال گزشتہ میں سات کتابیں شائع کیں۔ چھوٹے پیمانے پر کام کرنے والے اشاعت گھروں میں مکتبۂ شاہراہ، ایشیا پبلشرز، دیہاتی پستک بھنڈار، رشیدیہ کتب خانہ، آزاد کتاب گھر، ادارۂ اشاعت دینیات ہیں۔ یہ اشاعت گھر علمی، ادبی، تحقیقی، سیاسی اور مذہبی موضوعات پر کتابیں شائع کرتے ہیں۔ سٹار پبلی کیشنز اور ہند پاکٹ بکس، صرف پاکٹ بکس شائع کرتے ہیں۔ ان سب اشاعتی اداروں کی کل مطبوعات کو یکجا کریں تو اوسط ایک سو کتب فی سال سے کم نہ بیٹھے گا۔

ادھر کتابوں کی اشاعتی رفتار میں کچھ مزید تیزی آئی ہے۔

دہلی میں ادبی انجمنیں بے شمار ہیں۔ تاہم انجمن ترقی اُردو، انجمن تعمیر اُردو علمی مجلس، انجمن عروج ادب دہلی، رائٹرز ایسوسی ایشن وغیرہم زیادہ فعال ہیں انجمن ترقی اردو، شاید دہلی کی واحد ادبی انجمن ہے جسے مقامی حکومت سے سالانہ مالی امداد ملتی ہے۔

کتابوں وغیرہ کی اشاعت کے لئے مقامی نظم و نسق کوئی امداد نہیں دیتا البتہ بعض اہم کتابوں کی اشاعت کے لئے مرکزی وزارت تعلیم کچھ امداد دے دیتی ہے۔

دہلی میں ایسی کوئی لائبریری نہیں جو صرف اردو کی ہو۔ البتہ بعض لائبریریوں میں اُردو کے سیکشن ہیں۔ دہلی یونیورسٹی، جامعہ اور کالجوں کے علاوہ دہلی پبلک لائبریری، ہارڈنگ لائبریری وغیرہ میں اردو کے باقاعدہ سیکشن ہیں۔ نذیر یہ لائبریری میں اگرچہ اب نئی کتابیں نہیں خریدی جاتیں لیکن وہاں اُردو کی پرانی کتابوں کا بہت قیمتی ذخیرہ موجود ہے۔

مذکورہ بالا ادبی انجمنیں اور اشاعتی ادارے کسی نہ کسی طرح اُردو کی ترقی و اشاعت کے لئے سرگرم کار رہتے ہیں۔ تاہم بعض اصحاب ایسے بھی ہیں، جو [illegible] خاموشی سے، اپنے طور پر، گو چھوٹے پیمانے پر سہی، اُردو کی خدمت انجام

(بقیہ صفحہ ۹۳ پر)

بقیہ: اُتر پردیش میں اُردو

کلیم عرفی، اوپندر ناتھ اشک، عقیل احمد، حامد حسین حامد، عطیہ نشاط، مسیح الزماں، شمس الرحمٰن فاروقی، رئیس فراز، فرخ جعفری، مرغوب حسن، اجمل اجملی، تنویر سامانی، نصر قریشی، نظام صدیقی، ل احمد اکبر آبادی، مجنوں گورکھپوری، ساغر نظامی، علی سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی، اختر الایمان، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، مقصوم رضا راہی، یکل اُتساہی، کمال امروہی، مسعود حسین خاں، محمد حسن، نذیر احمد، نسیم قریشی، پرتو لکھنوی، قمر رئیس، اکبر حیدری، الہام پرویز، شارب ردولوی، شمیم نکہت، قمر احسن، حمدون عثمانی، جعفر عباس، جعفر عسکری، حرمت الاکرام، شوکت پردیسی، محمد حسن شاہد، وامق جونپوری، ابرار اعظمی، نثار اعظمی، فضا ابن فیضی، علی جواد زیدی، شمیم کرہانی، فضل امام رضوی، حکم چند نیر، نذیر بنارسی، محمود احمد سنر، امرت لال عشرت، محمود الٰہی، سلام سندیلوی، مصطفےٰ کمال، زیڈ ایچ قاضی، احمر لاری، موسیٰ مجروح، ایم کوٹھیاوی راہی، مولانا عبدالماجد دریابادی، خمار بارہ بنکوی، نشور واحدی، زیب فوری، کمال جائسی، محمد احمد رمز، ناظر الحسینی، فنا نظامی، قیصر حسین قیصر، رشید احمد صدیقی، نازش پرتاب گڈھی، تشنہ کانپوری، مصطفےٰ حسین اثر، آل احمد سرور، اسلوب احمد انصاری، خورشید الاسلام، منیب الرحمٰن، معین احسن جذبی، جلیل اثر، اعظمی، شہریار، ساجدہ زیدی، اختر انصاری، زاہدہ زیدی، وحید اختر، شمیم حنفی، بشیر بدر، صلاح الدین پرویز، غلام مرتضیٰ راہی، امتیاز علی عرشی، راجندر ناتھ شیدا، زیدی جعفر رضا، نازش انصاری، فیاض قمت، قاضی عبدالستار، مسعود علی ذوقی، وارث کرمانی، ہادی مصطفےٰ آبادی، عروج زیدی، جگر بریلوی، حامد اللہ افسر، اختر بستوی، رشید حسن خاں، ذکی کاکوروی، نورتقی نور، حفیظ میرٹھی، شاکر تسلیم، انوار رضوی، اقبال عمر، ایاز جھانسوی، تاباں جھانسوی، ذکا صدیقی، علی حماد عباسی، ڈاکٹر صفدر آہ، علیم مسرور، افگار مشتاق رحیم آبادی، عمر انصاری، شمیم انہونوی، انوار الحسن، مسرور جہاں، ضیا عظیم آبادی، عبدالقیوم، عطیہ پروین، حبیبہ بانو، خدیجہ رحمٰن، انجمہ اخلاق، انجمہ شہریار، کانظم علی خاں، محمد انصار اللہ نظر، امام مرتضیٰ تقوی، مشیر الحق، اخلاق حسین عارف، شارب لکھنوی، جلیل نجیب آبادی، میاں محمد ذوقی، ہندی گورکھپوری، عبدالنور بیگ، شمس فرخ آبادی، کملا پتی سہائے بلگرامی، ثمر بسوانی، شاعر فتح پوری، شہنشاہ مرزا مصطفےٰ حسن رضوی، بنجامن نامی نادری، حیدر علی جعفر،

صدیقی، اقبال مجید، چودھری محمد نعیم، مرتضیٰ حسین بلگرامی وغیرہ

اتنی بڑی اُردو آبادی اور شاعروں، ادیبوں، صحافیوں اور رسائل کی اتنی بڑی تعداد کے پیش نظر، ادبی تقافتی محاذ پر خاطر خواہ سرگرمیوں کا ہونا اغلب و ناگزیر ہے۔ یہاں کے ہر چھوٹے بڑے قصبے اور شہر میں شاعر، ادیب اور ادبی انجمنیں ہیں۔ تاہم اس ریاست میں اُردو سرگرمیوں کے بعض بڑے مرکز علی گڑھ، لکھنو، بنارس، الہ آباد، رامپور، اعظم گڑھ وغیرہ ہیں۔ یہی علم و فن، تعلیم اور نشر و اشاعت کے بڑے مرکز بھی ہیں۔ اُردو شاعروں اور ادیبوں کی بڑی اکثریت ان شہروں میں قیام پذیر ہے۔ بیشتر اخبارات و رسائل انہی مراکز سے شائع ہوتے ہیں۔ مرکزی انجمن ترقی اُردو کا صدر دفتر یہیں ہے۔

اُتر پردیش کے بیشتر مقامات پر انجمن کی شاخیں قائم ہیں۔ ریاست میں انجمن گو تعلیمی محاذ پر زیادہ سرگرم ہے، تاہم یہ اور دیگر انجمنیں ادبی و تخلیقی سرگرمیوں کی برابر محرک و معاون بنتی ہیں۔ چھوٹے بڑے مشاعرے ہوتے ہیں۔ "شب افسانہ" کا انعقاد ہوتا ہے۔ تنقیدی پروگرام ہوتے ہیں۔ زیادہ سنجیدہ علمی ادبی سرگرمیاں مذاکرے اور خطبات علی گڑھ، لکھنؤ، الہ آباد وغیرہ کا حصہ ہیں۔ اس ضمن میں علی گڑھ یونی ورسٹی کا شعبۂ اُردو خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ یہ علمی سرگرمیوں کی آماجگاہ ہے۔ یہاں ہر سال علمی ادبی موضوعات پر مذاکرے ہوتے ہیں۔ حالیہ مذاکرہ اقبال پر تھا۔ مذاکروں کے انعقاد کے سلسلے میں اُتر پردیش اُردو اکاڈمی بھی لائق ذکر ہے۔ اکاڈمی جلد ہی ایک نمائش بھی منعقد کرنے والی ہے جس میں اُردو ہندی تحریرات، تصویروں اور گوشواروں وغیرہ سے اُردو کی تاریخ نمایاں کی جائے گی اور واضح کیا جائے گا کہ اُردو نے اپنی پیدائش سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کی تحریک آزادی اور قومی یک جہتی کے جذبات کو تقویت دینے میں کتنا اہم حصہ لیا ہے۔

اکاڈمی لائبریریوں اور دارالمطالعات کو کتابوں اور رسائل کی خرید کے لئے عطیات دے کر بھی علمی ادبی سرگرمیوں کو فروغ دے رہی ہے

یونی ورسٹیوں کے شعبہ ہائے اُردو، انجمن ترقی اُردو اور اُردو اکاڈمی کے علاوہ دیگر بے شمار انجمنیں بھی علمی و ادبی فضا کو برقرار رکھنے کے سلسلے میں مذ[illegible] فروغ [illegible]

یہی تو وقت ہے
مغربی بنگال کی سیر کا

ٹورسٹ بیورو
اپنی قیام گاہوں میں
آپ کا خیر مقدم کرتا ہے

کیا آپ واقعی کسی بھی پہاڑی جگہ کی سیر کو نکل رہے ہیں؟ یا پھر سمندر کے کنارے جانے کا ارادہ ہے یا کہیں اور فرصت کے دن گذارنا چاہتے ہیں؟ دارجلنگ، کالیمپونگ، ڈوگھا، ڈائمنڈ ہاربر، مالدہ، مرشدآباد، شانتی نکیتن، درگاپور یا دشنو پور جہاں بھی جائیں آپ کے قیام کے لئے آرام دہ اور کفایتی ٹورسٹ لاج موجود ہیں۔ شانتی نکیتن، سنہال نزد دارجلنگ اور ڈوگھا میں آپ کو مسافر خانے بھی ملیں گے۔ سنہال میں پوری فیملی کے لئے کمرہ دستیاب ہے۔ صرف دن بھر کی چھٹی گذارنی ہو تو ڈائمنڈ ہاربر کے لاج میں قیام کیجئے۔

ٹکزی ٹورسٹ لاج۔ دارجلنگ

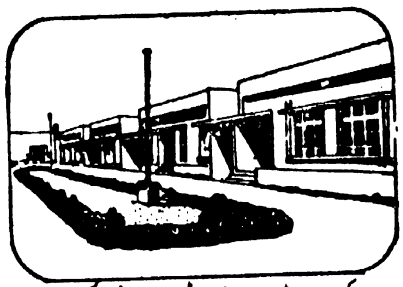

ٹکزی ٹورسٹ کاٹیج۔ شانتی نکیتن

ٹورسٹ لاج۔ کالیمپونگ

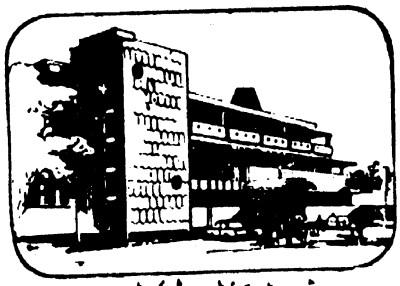

ٹورسٹ۔ ڈائمنڈ ہاربر

رابطہ پیدا کیجئے:

ٹورسٹ بیورو
حکومت مغربی بنگال
۳/۲ بنائے بادل وینیش باغ
(ڈلہوزی اسکوائر) ایسٹ، کلکتہ ۱
۲۲-

سرکاری دفاتر اور اُردو:-

اُتر پردیش سرکار کے بہت سے محکموں میں اُردو کا چلن ہے۔ فوجداری، دیوانی اور مال کی عدالتوں میں درخواستیں اور شکایات فارسی رسم الخط میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ عدالتوں کی طرح رجسٹری کے دفتروں میں بھی اُردو زبان میں دستاویزیں داخل کی جاسکتی ہیں۔ سرکاری گزٹ کے خلاصے بھی اُردو رسم الخط میں شائع کئے جاتے ہیں۔ اہم قوانین، قواعد اور سرکاری اعلانات وغیرہ کے خلاصے بھی اُردو میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جن ضلعوں اور تحصیلوں میں اُردو بولنے والوں کی آبادی ۱۵ فی صد یا اس سے زائد ہے۔ وہاں رائے دہندگان کی فہرستیں بھی اُردو میں شائع کی جاتی ہیں۔

محکمہ اطلاعات اُتر پردیش کی طرف سے اُردو اخبارات کو خبریں اور سرکاری اعلانات اُردو میں بھیجے جاتے ہیں۔ محکمہ اطلاعات ایک اُردو ماہنامہ "نیا دور" شائع کرتا ہے اس میں شائع ہونے والے مضامین نظم و نثر کا معقول معاوضہ دیا جاتا ہے۔

اُردو کی ترویج و اشاعت کے لئے تجاویز:-

(۱) سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت اپنی اعلان کردہ پالیسیوں کو من و عن عملی شکل دے اور تعلیم کے شعبے میں بھرپور مساعی سے کام لے۔

(۲) حکومت کو بچوں کی کتابوں کے انعامی مقابلے کرانے چاہئیں

(۳) اُردو اکاڈمی کو فیاضی اور دوسری کتب کے ساتھ بچوں کے ادب کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔ معلوماتی نیز سائنسی موضوعات پر کتابیں تصنیف کرانی چاہئیں۔ بچوں کے مصنفوں کو زیادہ تعداد میں انعام دینے چاہئیں۔ بچوں کے لئے جن کتابوں کی اشاعت کے لئے اکاڈمی امداد دے۔ ان کی اعلیٰ طباعت پر زور دیا جانا چاہئے۔

(۴) حکومت اُتر پردیش کو بچوں کے لئے ایک اچھا پندرہ روزہ اخبار اور اکاڈمی کو ایک اعلیٰ معیار کا ماہنامہ جاری کرنا چاہئے۔

(۵) سرکاری ملازمت کے لئے اُردو کی واقفیت لازمی قرار دینی چاہئے۔

(۶) اُردو مادری زبان والوں کے لئے ابتدائی ہندی اور ہندی مادری زبان والوں کے لئے ابتدائی اُردو کی تعلیم لازمی قرار دینا چاہیئے۔

(۷) سرکاری گزٹ، قوانین اور اعلانات محض اُردو رسم الخط میں نہیں اُردو زبان میں شائع ہونے چاہئیں۔ اور اس کام کے لئے آندھرا پردیش کی طرح ایک شعبہ ترجمہ قائم ہونا چاہئے۔

بقیہ: دہلی میں اردو

دیتے رہتے ہیں۔ ایسے ایک صاحب خلیل عباس عباسی ہیں۔ موصوف نے اُردو کا ایسا قاعدہ تیار کیا ہے جس سے بچے ڈیڑھ دو ماہ کی قلیل مدت میں اُردو پڑھنے لکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

امداد

دہلی کا انتظامیہ اُردو کی ترقی اور فروغ کے لئے کسی قسم کی کوئی مدد نہیں دیتا۔ (انجمن ترقی اردو کو جو مدد ملتی ہے اس کا ذکر کیا جا چکا ہے) کتابوں کی اشاعت کے لئے کسی قسم کی مالی امداد نہیں دی جاتی لیکن کچھ ہی عرصہ ہوا کہ "ساہتیہ اکیڈمی" کے انداز پر ساہتیہ کلا کیندر کا قیام عمل میں آیا ہے جس نے ڈاکٹر عابد حسین کی ایک کتاب پر گیارہ سو روپے کا انعام بھی دیا ہے۔ حال ہی میں اُتر پردیش کی اردو اکیڈمی سے انعامات پانے والے مصنفین میں مالک رام، گوپال متل، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، وڈاکٹر خلیق انجم، شمیم کرہانی، کرشن موہن، رہانی، کمار پاشی مخمور سعیدی، بسمل سعیدی، ڈاکٹر شارب ردولوی اور دوسرے شامل ہیں۔

مقامی حکومت اُردو کے لئے کوئی انعامی مقابلے نہیں کراتی تاہم دہلی کے دارالخلافہ ہونے سے انہیں مرکزی سرکار کی مختلف وزارتوں اور محکموں کی طرف سے ہونے والے انعامی مقابلوں میں اُردو مصنفین شریک ہو سکتے ہیں۔ وزارت تعلیم، تعلیمی تحقیق کی قومی کونسل اور فیلی پلاننگ و اجتماعی ترقی کے محکمہ جات تصنیف کے جو مقابلے علاقائی زبانوں میں کراتے ہیں اُن میں اُردو بھی شامل رہتی ہے۔ گزشتہ عرصے میں دہلی کے جن ادیبوں نے ان میں اور یونسکو کے مقابلوں میں انعام پائے ہیں۔ اُن میں صفدر عباس، کشور سلطان، اندر جیت لال، نند کشور وکرم اور دوسرے شامل ہیں۔

۱۹۵۵ء تک دہلی کی میونسپل کارپوریشن اور دوسرے دفتروں میں کام انگریزی اور اردو میں ہوتا تھا۔ عدالتوں میں بھی اردو کا رواج تھا۔ ۱۹۵۶ء میں ہندی کو دہلی کی سرکاری زبان تسلیم کرلئے جانے کے بعد دفتروں میں آہستہ آہستہ اُردو کا استعمال تقریباً ختم ہو گیا۔ اگرچہ دہلی کے انتظامیہ کے بیان کے مطابق تمام سرکاری دفاتر اردو میں درخواستیں قبول کرتے ہیں مقامی حکومت کا محکمہ تعلقات عامہ اردو میں بھی خبرنامے، نیز اخبارات و رسائل کو اردو میں اشتہار جاری کرتا ہے۔ یوم جمہوریہ کے مشاعرے کا اہتمام بھی یہی محکمہ کرتا ہے

تجاویز مقامی حکومت کو اُردو کی ترقی و فروغ کی تدابیر اور اقدامات کرنے نیز مقامی ضرورتوں کے مطابق اُردو میڈیم والے مزید اسکول کھولنے چاہئیں۔

سرکاری دفتروں میں اُردو

دہلی میں کام اُردو

اُتر پردیش میں اُردو کی تیز رفتار ترقی

موجودہ ریاستی حکومت کی جانب سے زبردست سہولتیں

اُردو جیسے دستورِ ہند میں ایک قومی زبان کا درجہ حاصل ہے، ہمارے ملک، خاص طور سے ہماری ریاست اُتر پردیش کی ایک اہم اور مقبول زبان ہے۔ یہ کسی فرقے یا مذہب کی زبان نہیں۔ اس کے چمن کی آبیاری میں سب برابر کے شریک اور حصے دار ہیں۔ اُتر پردیش کی موجودہ ریاستی حکومت نے اسکے پھلنے پھولنے اور اسکی ترقی و توسیع کے لئے متعدد اہم اور دور رس اقدامات کیے ہیں:۔

پرائمری سطح پر

- جولائی ۱۹۷۳ء سے ریاست کے تمام شہری علاقوں کے ہر پرائمری اسکول میں اُردو پڑھنے کی سہولت
- اس مقصد کے لئے تقریباً چار ہزار اُردو ٹیچروں کا تقرری کا فیصلہ
- اگر کسی پرائمری اسکول میں فی الحال اُردو پڑھنے والے بچے نہ بھی ہوں تب بھی اُس اسکول میں کم سے کم ایک اُردو ٹیچر کا انتظام ہوگا
- تمام تسلیم شدہ اُردو میڈیم اسکولوں اور مکتبوں کو مالی امداد دینے کا بندوبست۔
- ٹریننگ اسکولوں میں اُردو کی استعداد رکھنے والے امیدواروں کو داخلے میں سہولت۔
- اُردو کے ٹرینڈ ٹیچر نہ ملنے پر اُن ٹرینڈ اُردو ٹیچروں کی تقرری کا فیصلہ
- کوئی اَن ٹرینڈ اُردو ٹیچر اُوپر کے احکامات کے بغیر ملازمت سے علاحدہ نہیں کیا جائے گا۔
- ٹیچروں کو اُردو پڑھنے کی جانب زیادہ سے زیادہ متوجہ کرنے کے لئے ترغیبی الاؤنس جاری رکھنے کا فیصلہ
- نئے اُردو میڈیم اسکول قائم کرنے کی کوششوں کی یقین دہانی۔

ثانوی سطح پر

- جونیر اور ہائر سیکنڈری اسکولوں میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اُردو پڑھنے کا بندوبست۔
- ہر گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اُردو کی تعلیم کے لئے ایک اُردو ٹیچر کی تقرری۔
- تسلیم شدہ ہائر سکنڈری اسکولوں میں بھی سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو کی تعلیم کا بندوبست کئے جانے کے احکامات۔
- حسنہ ہائی اسکول تک تمام کتابیں اُردو میں دستیاب۔

ڈپٹی ڈائرکٹر (اُردو)

- اُردو کی تعلیم، اس کی دیکھ بھال اور ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے ڈپٹی ڈائرکٹر (اُردو) کی تقرّری

ڈگری سطح پر

- اعلیٰ سطح پر بھی اُردو کی تعلیم کا بندوبست۔
- بجنور، میرٹھ، سہارنپور، مظفر نگر، پیلی بھیت، بریلی، مراد آباد، رامپور وغیرہ کے ضلعوں میں ایک ایک ڈگری کالج کو ڈگری کلاسوں میں اُردو پڑھانے کے لئے آئندہ تعلیمی سال سے مالی امداد دینے کا فیصلہ۔
- یونیورسٹیوں کے علاوہ اُن سے الحاق شدہ ڈگری کالجوں میں بھی اُردو کی تعلیم کی سہولت مہیّا کرنیکے لئے کارروائی۔
- تمام گورنمنٹ کالجوں میں گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کی سطح پر اُردو کی تعلیم کا بندوبست۔

اُردو اکاڈمی

- اُردو زبان کے تحفظ اور اُردو ادب کی ترقی کے لئے ملک بھر میں سب سے پہلے ریاست اُتّر پردیش میں اُردو اکاڈمی کا قیام۔
- اکاڈمی کے قیام سے ریاست میں اُردو زبان و ادب کا مستقبل روشن۔
- اُردو ادیبوں، شاعروں، لائبریریوں اور مطالعہ گھروں کو اکاڈمی کی جانب سے اب تک پانچ لاکھ روپیے کے انعامات و مالی امداد۔

عدالتوں اور سرکاری کاموں میں اُردو کے لئے سہولت

- تمام ضلع افسران کو اُردو میں لکھی ہوئی درخواستیں قبول کرنے کے سخت احکامات
- ان احکامات کی خلاف ورزی کرنے والے افسران کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی
- دیوانی ملازمتوں کے لئے اُردو کا امتحان بھی پاس کرنا ضروری۔
- اہم قوانین، قواعد اور سرکاری اعلانات اور فہرست رائے دہندگان کی اُردو میں بھی اشاعت
- ہندی کی طرح اُردو اخبارات کو بھی سہولتیں

اُردو ہماری، آپ کی، سب کی زبان ہے
اس کی خدمت کرنا اور ترقی دینا ہمارا فریضہ ہے

محکمۂ اطلاعات، اتّر پردیش کی جانب سے جاری کیا گیا

اُتر پردیش کے تقریباً ہر بڑے شہر میں اُردو کے ناشر موجود لکھنؤ میں نسیم بک ڈپو، ادارۂ فروغ اُردو، کتابستان، دانش محل، مکتبہ دین و ادب، نصرت پبلشرز الہ آباد میں شب خون کتاب گھر، کتابستان، مکتبۂ جاوید، نکہت پبلشرز اور ادارۂ انیس اُردو، اعظم گڑھ میں دارالمصنفین شبلی اکاڈمی، مطبع معارف اور ندوۃ المصنفین، علی گڑھ میں انجمن ترقی اُردو، سرسید بک ڈپو، امروہہ میں بک کارنر، دانش کدہ، رام پور میں انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز وغیرہ۔

کتابوں کی اشاعت کا سب سے بڑا مرکز لکھنؤ ہے۔ لکھنؤ سے ہر برس پچاس ساٹھ کتابیں، مختلف موضوعات پر شائع ہوتی ہیں جبکہ باقی دوسرے سبھی مرکز، کل ملا کر اتنی کتابیں شائع نہیں کر پاتے۔ ایک اندازے کے مطابق اتر پردیش میں ہر برس اوسطاً سو کتابیں شائع ہوتی ہیں۔

یونی ورسٹیوں اور کالجوں کی لائبریریوں کے علاوہ ریاست کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں لائبریریاں موجود ہیں۔ ان میں لکھنؤ کی امیرالدولہ پبلک لائبریری اور یونی ورسٹی (ٹیگور) لائبریری، علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری اور رامپور کی رضا لائبریری اُردو کے محققین کے لئے ایک نعمت ہیں۔ ان میں بھی موخرالذکر لائبریری بڑی قدر و قیمت کی حامل ہے۔

اُردو کی ترقی اور ترویج و اشاعت کے ضمن میں جناب آل احمد سرور، جناب آنند نرائن مُلّا بیگم حامدہ حبیب اللہ، جناب صباح الدین عمر قاضی محمد عدیل عباسی کے اسمائے گرامی سرفہرست آتے ہیں۔

ریاستی سرکار کی امداد: حکومت اُتر پردیش اور اُردو اکاڈمی مصنفین کی امداد و سرپرستی کرتی ہے اور کتابوں کی اشاعت کے لئے مالی امداد دیتی ہے۔ مثلاً اُردو اکاڈمی نے گزشتہ عرصے میں ۲۳ مصنفین کو اُن کے مسودات کی اشاعت کے لئے بیس ہزار روپے سے زیادہ کے عطیات دیئے ہیں۔ اکاڈمی کی امداد سے شائع ہونے والی کتابوں میں فضا ابن فیضی کا مجموعۂ کلام "سفینۂ زرگل" اور ایاز بلگرامی کا مجموعہ "جنبش لب" شامل ہیں۔

کتابوں کی اشاعت کے لئے امداد کے علاوہ اعلیٰ تصنیفات پر حکومت اتر پردیش کا محکمۂ تعلیم اور اتر پردیش اکاڈمی انعامات بھی دیتے ہیں۔ محکمۂ تعلیم کی طرف سے اُردو کی معیاری کتاب پر دیا جانے والا سب سے بڑا انعام "غالب انعام" کے نام سے موسوم ہے۔ دوسرے اور تیسرے انعامات بالترتیب "اکبر الہ آبادی" اور "بسمل" انعامات کہلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ متفرق انعامات بھی دیئے جاتے ہیں۔ محکمہ تعلیم نے ۱۹۷۱ء میں شائع شدہ گیارہ معیاری کتابوں پر انعامات دیئے۔ اتر پردیش اُردو اکاڈمی نے یکم جنوری ۱۹۶۹ء سے ۳۰ نومبر ۱۹۷۱ء تک عرصہ میں شائع ہوئی۔ معیاری کتابوں پر ۹۵ ممتاز اُردو ادیبوں اور شاعروں کو ستانوے ہزار پانچ سو پچاس روپے اور یکم دسمبر ۱۹۷۱ء سے ۳۱ دسمبر ۱۹۷۲ء تک شائع ہوئی اُردو کتابوں کے ستر مصنفین کو ۶۰ ہزار روپے کے انعامات دیئے گئے۔ ان میں سے ۲۹ مصنفین اُتر پردیش کے ہیں۔ سرفہرست ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی (اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک - دو ہزار روپے) ڈاکٹر وحید اختر (فلسفہ اور ادبی تنقید - دو ہزار روپے) اور ساجدہ زیدی (آتش سیال - ایک ہزار روپے) ہیں۔ حکومت اُتر پردیش اور اُتر پردیش اُردو اکاڈمی لائبریریوں کو کتابوں کی خرید کے لئے عطیات دیتی ہے۔ مارچ ۱۹۷۳ء کے آخر تک اُردو اکاڈمی نے ۱۷۴ کتب خانوں کو اٹھانوے ہزار سے زیادہ رقم دینا منظور کی تھی۔

اُردو اکاڈمی معمر اور بیمار ادیبوں اور شاعروں کی امداد بھی کرتی ہے۔ اکاڈمی نے اس وقت تک ایسے بیس افراد کو نو ہزار چار سو روپے کی رقوم دی ہیں۔ اس کے علاوہ اکاڈمی چار ادیبوں اور شاعروں کو مستقل [illegible] ہے۔

(سلسلہ کے لئے دیکھئے صفحہ ۹۳)

آئندہ شمارے میں
(ضمیمہ اُردو نمبر)

مصنف کے مسائل قرۃ العین حیدر۔ ظ انصاری۔ جوگندر پال حامدی کاشمیری۔ مجتبیٰ حسین۔ ستیش بترا۔ ضیا فتح آبادی

مدیر کے مسائل اعجاز صدیقی۔ عابد سہیل۔ یوسف ٹینگ۔ احمد سعید ملیح آبادی مالک رام

ناشر کے مسائل
محمد حسین شمس علوی (ادارۂ فروغ اُردو۔ لکھنؤ)
دیانند ورما (پنجابی پستک بھنڈار۔ دلی)
عابد علی خاں (ادبی ٹرسٹ۔ حیدرآباد)

قاری کے مسائل دیویندر اسر وہاب دانش حکیم منظور

اصطلاحات سازی: میر حسن
[illegible]: شہباز حسین
حسن شاہد

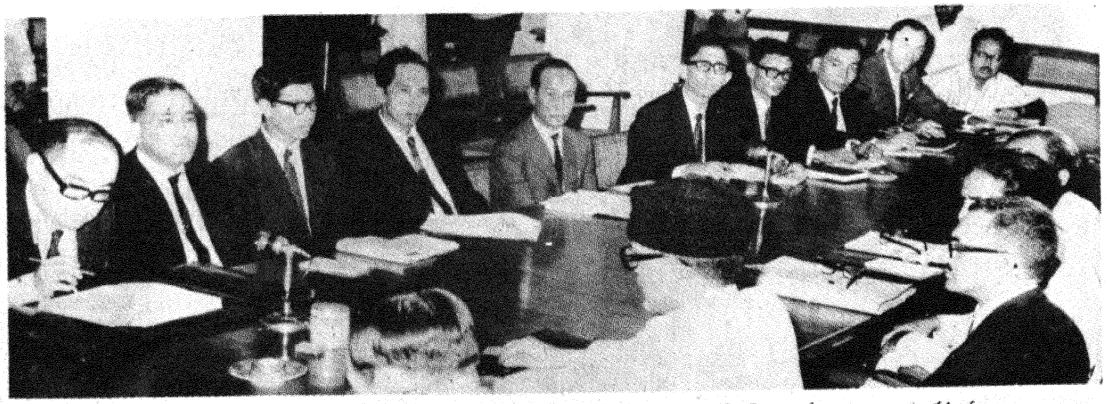

جولائی میں نئی دہلی میں ہند اور برما کے مابین تجارتی بات چیت ہوئی۔ برمی وفد کے سربراہ ڈاکٹر فی ای تھے اور ہند کے وفد کے سربراہ مرکزی وزارتِ صنعتی ترقی میں نائب وزیر شری زیڈ آر انصاری (ٹوپی پہنے ہوئے)

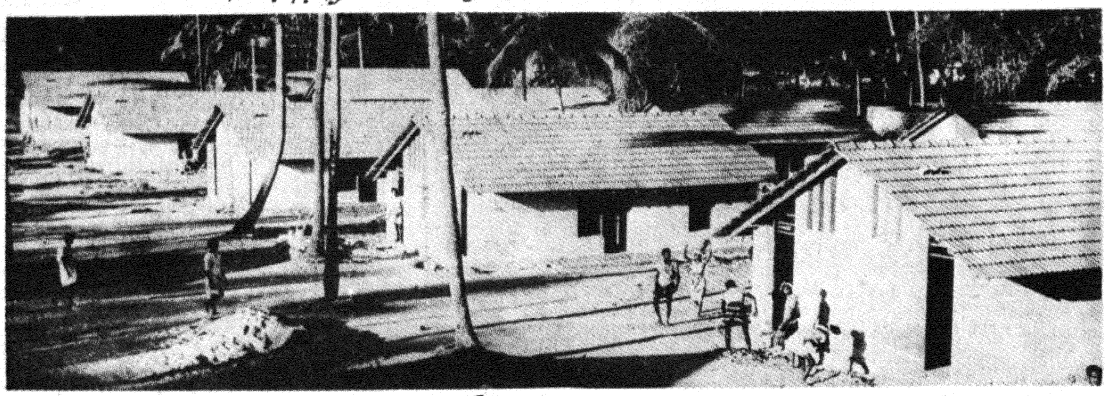

کیرالا میں سرکار بے زمین کھیت مزدوروں کے لیے دیہی علاقوں میں ایک لاکھ مکان بنا رہی ہے۔ ارناکلم ضلع میں ایسے چند مکانات کا منظر

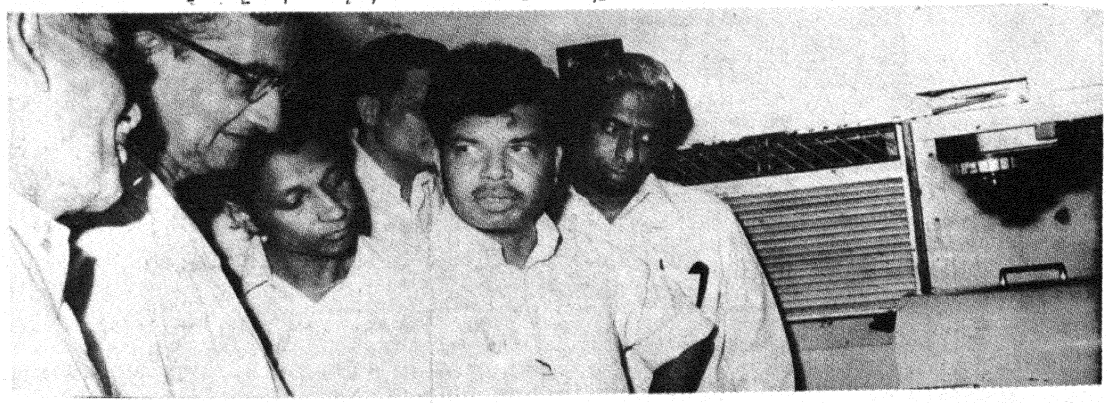

جولائی میں وزارتِ اطلاعات و نشریات کے نائب وزیر شری دھرم بیر سہنا نے وزارت کے فوٹو ڈویژن میں روٹری مشین کا افتتاح کیا جو ایک گھنٹے میں ایک ہزار فوٹو تیار کر سکتی ہے۔ شری دھ... ڈویژن کے ڈائریکٹر شری کاسی ناتھ ہیلا۔

AUGUST—SEPTEMBER 19...
NEW DELHI-11001
DELHI-55
REGD. No. D 50...

اگست ستمبر ۷۲ء ایک روپیہ

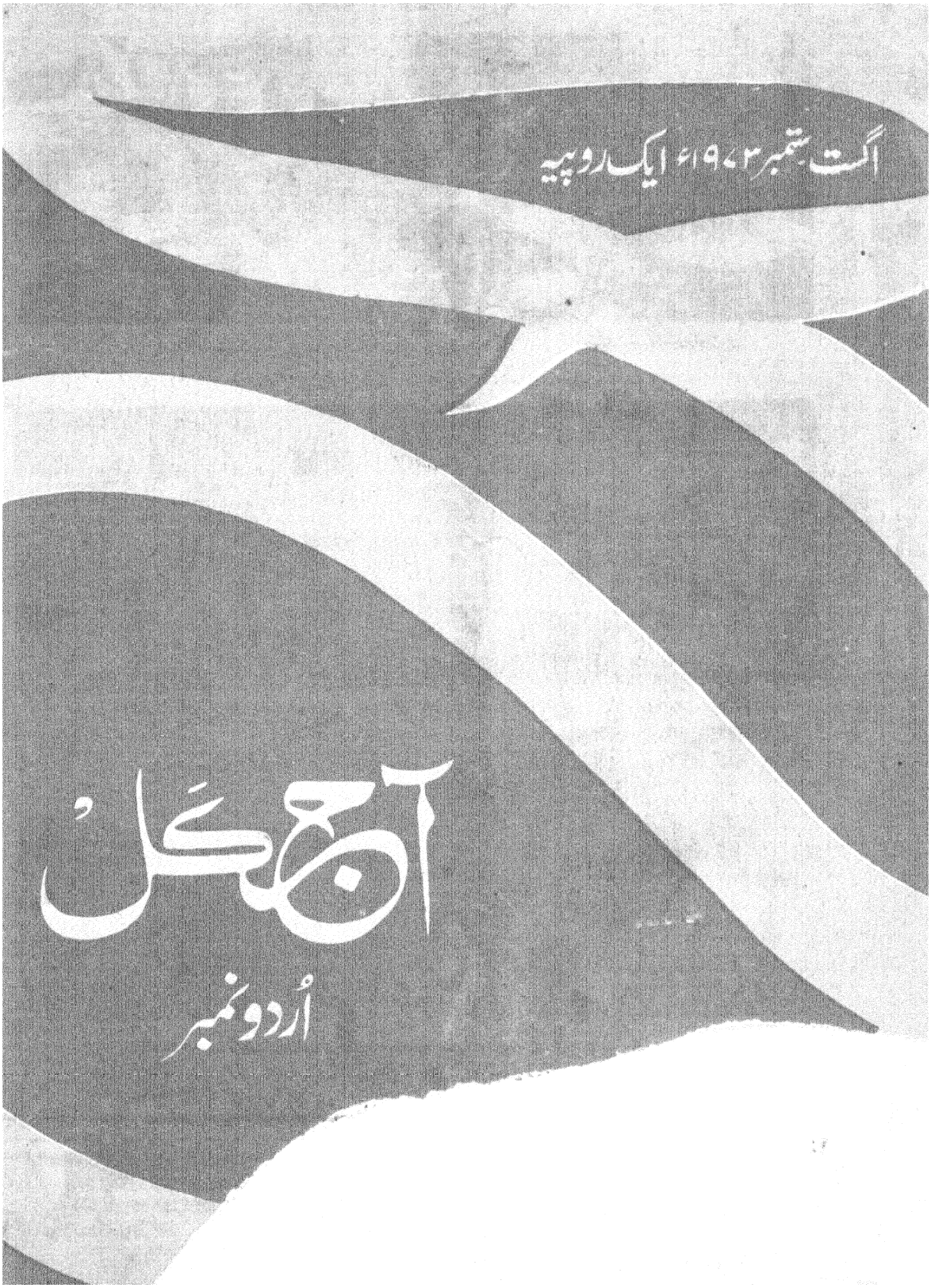

آج کل

جنوری ۱۹۷۳ء

۶۰ پیسے

قرۃ العین حیدر، پروفیسر محمد مجیب
علی جواد زیدی، وحید اختر
اقبال متین، شہباز حسین

Lalla 22.1.73

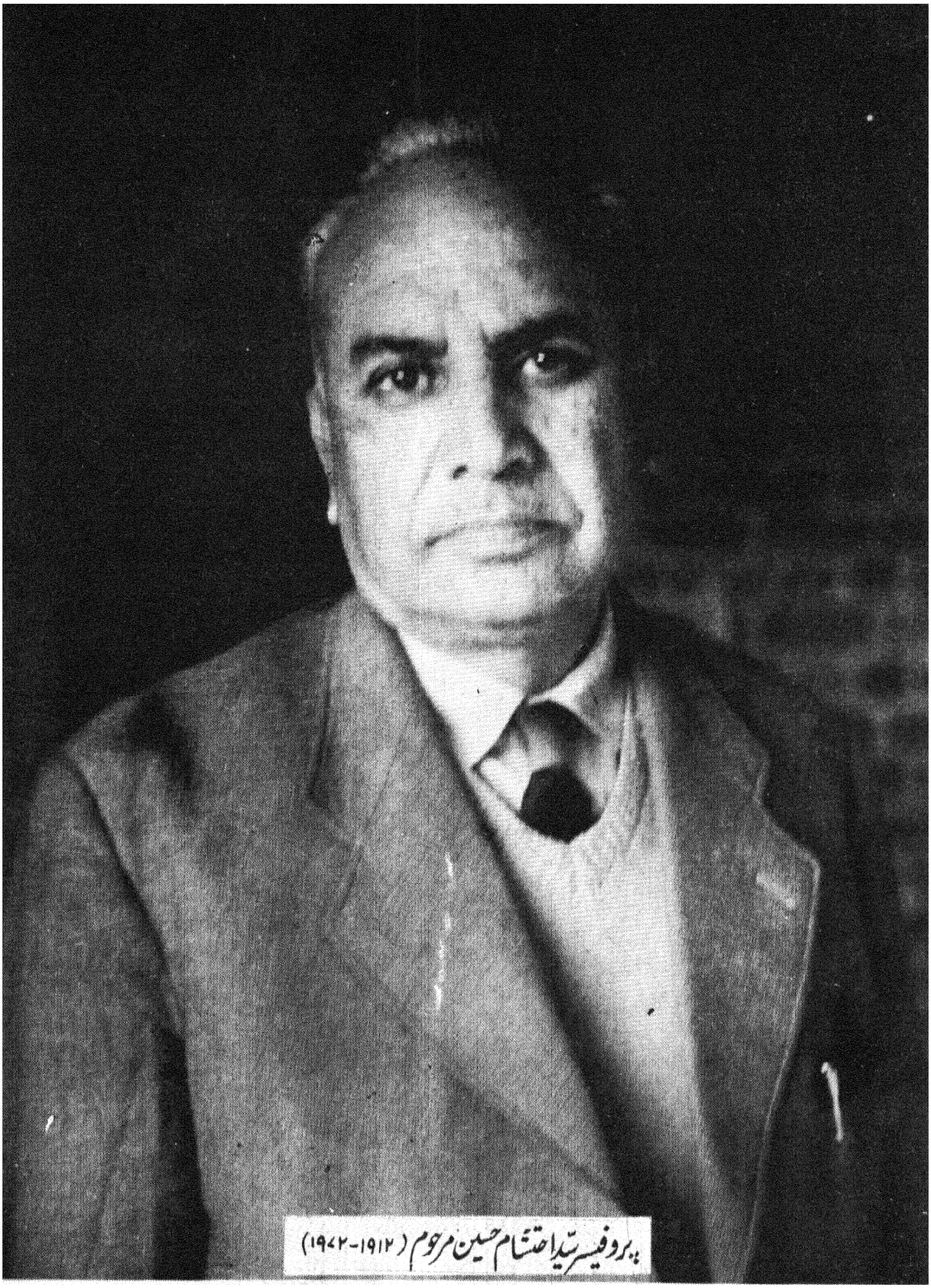

پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم (۱۹۱۲-۱۹۷۲)

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

آج کل

نئی دہلی

ایڈیٹر
مہدی عباس حسینی
(ٹیلیفون ۳۸۷۰۶۹)

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جنوری ۱۹۷۳ء
پوش ماگھ شک سمہ ۱۸۹۴

سالانہ چندہ
ایک سال : ۷ روپے
۲ سال : ۱۲ روپے
۳ سال : ۱۷ روپے

سرورق : جیون اڈلجہ

مطابع کردہ
ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱

ترتیب

اداریہ		۲
کارِ جہاں دراز ہے (مسلسل)	قرۃ العین حیدر	۳
غزل	نازش پرتاپ گڈھی	۷
گمگشتگی (نظم) اور غزل	وحید اختر	۸
ہند میں اُردو۔ آزادی کے بعد	شہباز حسین	۹
فروغِ اُردو کمیٹی (انٹرویو)	علی جواد زیدی	۱۴
ترقیٔ اُردو بورڈ (انٹرویو)	پروفیسر محمد مجیب	۱۵
مداری (کہانی)	اقبال متین	۱۷
انقلابِ آزادی اور اُردو شعراء	محی الدین ہاشمی	۲۱
قومی شاعر۔ اقبال سہیل	فضل امام رضوی	۲۹
یحییٰ اعظمی	شعیب اعظمی	۳۱
رام پرساد بسمل	افغان اللہ خاں	۳۴
غزل	ذکیہ انجم	۳۶
اقدامِ قتل (کہانی)	قمر احسن	۳۷
متاعِ یک عمر (نظم)	عزیز جاوید	۳۹
راجا رام موہن رائے اور اردو	شانتی رنجن بھٹا چاریہ	۴۰
غزلیات	پریم واربرٹنی۔ وشوانا تھ درد، مجیب بستوی۔ جعفر عسکری	۴۳
نئی کتابیں	مخمور سعیدی	۴۴

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :
ایڈیٹر "آج کل" (اُردو) پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱

ادارہ

پروفیسر احتشام حسین

یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کو پروفیسر احتشام حسین کا انتقال ہوگیا۔ احتشام صاحب اردو ادب میں سائنسی تنقید کے بانی، اپنی تحریر میں نہایت غیر جذباتی اور اپنی زندگی میں سراسر جذبہ تھے۔ اور شاید اسی لئے وہ نہ صرف ایک عظیم ناقد تھے بلکہ ایک اچھے انسان بھی۔ اپنی سوانح شخصیت اور اندازِ فکر کے بارے میں وہ "ساحل اور سمندر" میں فرماتے ہیں:

"۱۹۳۰ء میں تعلیم کیلئے میں الہ آباد پہنچا۔ الہ آباد اس وقت انگریزی حکومت کے خلاف تحریک سول نافرمانی کا مرکز تھا۔ میں بھی فطری طور پر قومی آزادی کے جذبے سے معمور ہوگیا یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران میں میں نے لکھنا شروع کیا۔ افسانے، ڈرامے، نظمیں، تنقیدی مقالات، علمی مضامین، سب کچھ۔ پڑھنے کا یہ حال کہ کبھی کسی خاص ترتیب یا خیال سے نہیں پڑھتا تھا۔ لیکن ادب، تاریخ، فلسفہ، سیاست، نفسیات اور جنسیات سبھی سے دلچسپی لیتا تھا تاکہ میں زندگی کے مسائل کو پوری طرح سمجھ سکوں۔ آخر کار میرا سارا وقت تنقید سے دلچسپی لینے اور تنقیدی مضامین لکھنے میں صرف ہونے لگا۔ ۱۹۳۶ء میں میرے خیالات ایک نئے سانچے میں ڈھلنے لگے۔"

اس نئے سانچے کی تفصیل یہ ہے۔

"میرا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ کسی ملک اور قوم کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی جڑیں اس کے سماجی نظام میں پیوست ہوتی ہیں اور ان کو اس سے الگ کر کے دیکھنا کبھی صحیح نتائج تک نہیں پہنچا سکتا۔ میں نے اپنی تمام تحریروں میں یہ بات ظاہر کی ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ ایسا آئینہ نہیں جس میں صرف زندگی کے ٹھہرے ہوئے نقش دیکھے جائیں بلکہ ادب متحرک بن کر ہمیں زندگی کے اعلیٰ مقاصد تک پہنچانے اور انہیں حاصل کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ انسان کی فطرت میں بدی نہیں ہے بلکہ حالات اسے ایسا بناتے ہیں اور اگر ہم تمام قوموں کو مطمئن اور آسودہ حال زندگی بسر کرنے کا موقع دیں تو دنیا سے جنگوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ انسان دوستی پر مبنی بین الاقوامیت، جو ہر ملک اور قوم کو برابری کا درجہ دینا قبول کرتی ہے اور ہر قوم کی شخصیت کو برقرار رکھنا چاہتی ہے، ہماری اصل منزل ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ دائمی امن قائم ہوسکتا ہے اور انسان ترقی کی جانب بڑھ سکتا ہے۔ دنیا کے اچھے انسان اور اچھے ادیب اسی جانب رہنمائی کرتے رہے ہیں۔"

اُردو کے بارے میں احتشام صاحب نے فرمایا:

"میں جس زبان میں لکھتا ہوں وہ اُردو ہے جسے ابھی بیسویں صدی کی ابتدا تک ملک کی عام زبان کی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن حالات اس قدر تیزی سے بدلے ہیں اور فرقہ وارانہ سیاست نے وہ ابتری پھیلائی ہے کہ ہندوستان میں اس کی زندگی مشکل ہو رہی ہے تاہم یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس میں اعلیٰ ادب موجود ہے اور اب بھی پیدا ہو رہا ہے۔ اور میں اس کی حیثیت منوانے کی کوشش کرتا رہوں گا۔"

یہ اقتباسات نہ صرف احتشام صاحب کی شخصیت کے عکاس ہیں۔ بلکہ ان کے طرزِ تحریر کا بھی اچھا نمونہ ہیں۔ جس کی جڑیں سرسید احمد اور حالی کے سیدھے، سچے، کھرے، مدلل اور معرا اسلوب سے ملتی ہیں۔ یہ طرز شاید ان لوگوں کو ملتفت نہ کرے گا جو محمد حسین آزاد اور نذیر احمد کی نشیلی اور چٹخارے دار زبان کے دلدادہ ہیں لیکن دراصل یہی کامیاب ترسیل و ابلاغ کی زبان ہے اور اسی طرز سے جو مشکل خیالات کو آسان لفظوں میں واضح کرتا ہے اُردو نثر کا مستقبل وابستہ ہے۔

احتشام صاحب محض قلم کے بادشاہ نہیں تھے۔ وہ اردو اور انگریزی دونوں میں ایک کامیاب مقرر اور اپنے استاد ڈاکٹر سید اعجاز حسین کی طرح ایک مثالی معلم تھے۔ انہوں نے لکھنؤ اور الہ آباد کے ہزاروں طالب علموں کو جن میں ڈاکٹر محمد حسن سے لے کر راقم الحروف تک شامل تھے اپنی مثال سے یہ سکھایا کہ تعلیم کا مقصد امتحان پاس کرنا یا ڈگریاں جمع کرنا نہیں بلکہ ذہن کی کشادگی، ذوق کی تربیت، کیرکٹر کی تشکیل اور نتیجتاً ایک اچھا شہری بنانا ہے۔ احتشام صاحب نے کبھی یہ فکر نہیں کی کہ وہ پی ایچ ڈی یا ڈی لٹ کرلیں لیکن وہ پڑھتے سوچتے اور لکھتے رہے۔ دوسروں کو پی ایچ ڈی بناتے رہے۔ انہوں نے کوئی ایک درجن بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں جو تاریخ ادب میں ان کے اعلیٰ مقام کی ضامن ہیں۔

قرۃ العین حیدر
آشیانہ، نوروجی گمبوڈیا روڈ، بمبئی ۲۹

کارِ جہاں دراز ہے

باب ۷
غدر ۱۸۵۷ء

مزاج دہر تباہ ہو چکا۔ رات کے آسمان پر سرخ مریخ دہک کے انگارہ ہو گیا۔ روزانہ دونوں وقت ملتے ایک دمدار تارہ خلقت کو نظر آتا ہے۔ گاؤں گاؤں چپاتی بٹی۔ راتوں کے سناٹے میں ایک پُراسرار فقیر بھیانک آواز میں صدا لگاتا پھرتا تھا۔

منکہ میر احمد علی ترمذی ابن حضرت اخوند امام بخش ترمذی مہتوری میرٹھ چھاؤنی میں تعینات تھا۔ جب کمان افسر نے حکم دانتوں سے کارتوس کاٹنے کا دیا، سپاہیوں نے انکار کیا۔ بغاوت شروع ہوئی۔ کچھ دیر بعد اتفاقیہ توپخانے کا خلاصی لین میں سے گزرا اور بولا آج پریڈ کے میدان میں نہ ٹھہرنا، ہمیں حکم ملا ہے کہ باغیوں کو توپ سے اڑا دیں۔

دوسرے روز ایک صوبیدار نے انگریز افسر سے چغلی کی۔ فلاں فلاں مفسدین ہیں ان کو قید کیجئے۔ کمان افسر نے ستر سواروں کو جیل خانے میں ڈالا۔ بعد ازاں ان کو میدان میں لائے پابجولاں بازار میں سے گزارا۔ بالاخانوں پر سے ارباب نشاط نے غیرت دلائی کہ چوڑیاں پہن لو۔

دوسرے دن ۱۵ ماہ رمضان مبارک بعد نماز ظہر اس رسالے کے پاہی مسلح ہو کر چھاؤنی پہنچے بنگلوں میں آگ لگائی۔ شدید نقصان جان و مال اہل فرنگ ہوا۔

ہم بھی اس معرکے میں شریک تھے کیونکہ دین خطرے میں تھا۔

آدھی رات کو دلی مارچ کیا۔ ۱۶ تاریخ ماہ رمضان مطابق ۱۱ مئی ہمارے ایک سوار نے سمن برج کے جھروکے کے نیچے پہنچ کر میر فتح علی خاں داروغۂ تخت شاہی سے بات کرنا چاہی۔ میر صاحب اس وقت کنار رجمنا خضری دروازے کے سامنے نماز پڑھتے تھے۔ سلام پھیر کے انہوں نے استفسار کیا: "کیا کام ہے؟" سوار نے کہا "فوج لایا ہوں۔ فوراً جہاں پناہ سے عرض کیجئے کہ ہم نے صاحبان کو میرٹھ میں قتل کیا اب اسی ارادے سے دلی آئے ہیں۔"

بعد اس کے جو کچھ ہوا سارے عالم کو معلوم ہے۔

ہم اس معرکے میں جا بجا لڑے۔ باڑھ بندوق کی گراب توپ کا ہر سو پڑنے لگا۔ ہم نے اپنے مورث اعلیٰ کے فرزند ملک ابراہیم نشانچی لشکر شہاب الدین محمد غوری کو یاد کیا اور نعرۂ تکبیر اور نعرۂ حیدری بلند کر کے دشمنوں پر جا پڑے۔ متعدد فرنگیوں کو تلوار کے گھاٹ اتارا۔

بہت جلد غدر سارے دوآبے میں پھیلا۔ خاص ہمارے وطن قصبہ نہٹور ضلع بجنور میں ایک خفیہ جماعت قائم ہوئی یہ بارہ ٹوپی والے کہلائے۔ ان میں سید کرامت حسین، سید الطاف حسین، سید عنایت حسین، میراں امتیاز علی اور نواب رحمت خان وغیرہ شامل تھے انہوں نے سرکاری چوکیوں پر شبخون مارے۔ سارے ضلع میں باغیوں نے مورچے کھڑے کئے اور توپ کو آگ دی۔ تفصیل جنگ بجنور کی جو ہمارے برادر بزرگ بندے علی صاحب تحصیلدار کے دوست سید احمد دہلوی نے کہ اس وقت بجنور میں صدر امین تھے، رقم کی ہے، حالات چشم دید بیان کئے ہیں۔ واقعات صحیح ہیں لیکن انداز بیان میں رویے کا فرق ہے۔ سید موصوف روشن دماغ عالم فاضل انسان ہیں۔ قوم کا شدید درد دل میں رکھتے ہیں۔ خیال ان کا یہ ہے کہ اس دور نکبت ادبار میں حکومت انگلیشیہ سے وفاداری مسلم قوم کے حق میں عین مناسب ہے۔

جس وقت ہنگامے کا بجنور میں آغاز ہوا صاحب لوگ حسب معمول اپنی میم صاحبان اور بابا لوگ کو نینی تال اور کوہ منصوری بھیجنے والے تھے کہ یہ شہر انہوں نے کوہ ہمالہ کی چوٹیوں پر بطرز قصبہ جات ملک اسکاٹ لینڈ آباد کئے ہیں۔ سول لائنز بجنور میں صرف بیس عدد انگریز موجود تھا مسٹر الگزنڈر شیکسپیر کلکٹر ضلع، جارج پامر جنٹ مجسٹریٹ، ڈاکٹر رینٹ سول سرجن۔ جانسن صاحب، مرفی صاحب وغیرہ۔ نیٹو افسروں میں بابو

لہ میر احمد علی "ترک سواران راجہ گراس رائے" میں شامل ہو گئے تھے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ راجہ کون تھا اور اس کی ریاست کا کیا نام تھا۔ ف ح

کالی چرن انگریزی نویس کلکٹری ڈاکٹر تارا چند سین اسسٹنٹ سرجن اور ہمارے سید احمد دہلوی صدر امین۔

سید موصوف فرماتے ہیں: "میرٹھ میں فساد اور نمک حرامی دسویں مئی ۱۸۵۷ء کو ہوئی اس کی خبر گیارہویں تاریخ تک بجنور پہنچی بارہویں تاریخ کو یہ خبر مشہور ہوئی اور پے در پے اس کے آثار نمودار ہوتے گئے۔ یعنی کنارِ گنگا جنار اہ لٹنے لگی اور آمد و رفت مسافروں کی بند ہوگئی۔ ۱۸ مئی کو ایک کمپنی تلنگوں کی جو سہارن پور سے مراد آباد جاتی تھی بجنور پہنچی۔ ۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کو مراد آباد کا جیل خانہ ٹوٹا۔

"قیدی جیل سے نکل آئے۔ سب کے منہ دریا کی طرف تھے اور بھاگے جاتے تھے۔ کلکٹر خزانے پر آیا۔ مجھ صدر امین نے اپنے ہاتھ سے ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ کنویں میں ڈال دیا۔

"ہزار ہا گوجر گنگا وار اور گنگا پار کے لوٹ مار مچاتے پھر رہے تھے۔ اسی روز شام کو نامحمود خاں[1] مع ساٹھ ستر پٹھان بندوقچی کے بجنور پہنچا۔ اس رات بجنور میں بڑا اندیشہ رہا۔ جناب شیکسپیر صاحب دام اقبالہ اور جناب مسٹر جارج پامر جو اخلاق و عنایت ہمارے حال پر فرماتے تھے ان اخلاقوں اور عنایتوں نے ہمارے دل میں ایسی محبت ان صاحبوں کی ڈالی تھی کہ محبت کے سبب ان صاحبوں کی نسبت جو وہم دل میں آتا تھا برا ہی برا دکھائی دیتا تھا۔"

تلنگے اب نگینے سے دھام پور پہنچے۔ وہاں ہرسکھ رائے لوھیا کے ہاں اس دن برات تھی۔ اس نے برات کا کھانا اور بہت اچھی اچھی مٹھائی تلنگوں کو دی۔ اس لئے انہوں نے وہاں کچھ فساد نہیں کیا اور مراد آباد چلے گئے۔ گوجر، جاٹوں، بیواتیوں اور بنجاروں کی شورش کے سبب ضلع میں زیادہ تر غدر رہا۔ اور بجنور پر بھی ڈاکہ آنا مشہور تھا۔

"جو رئیسانِ ضلع حکومت کی کمک کو بلائے گئے تھے۔ ان میں سے چودھری رندھیر سنگھ رئیس بلدور اور چودھری پرتاپ سنگھ رئیس تاجپور مع سپاہیوں کے احاطہ کوٹھی کلکٹر صاحب میں مقیم ہوگئے۔ دیہات لٹتے رہے۔ متعلقہ پرگنوں پر ڈاکے پڑے۔ باغیوں نے جگہ جگہ لام باندھے۔ ۲ جون کو کپتان گف صاحب مع سواروں کے میرٹھ سے خزانہ لینے آئے۔ اور پچاس ہزار روپیہ کنویں سے نکالا۔ سوار کم تھے اور ڈاکے والوں کے غول کے غول جمع تھے۔ مگر صاحب موصوف بہ کمال بہادری خزانہ ہاتھیوں پر لدوا کر براہ گھاٹ دآرا نگر میرٹھ چلے گئے۔ ۳۱ مئی تک سب اضلاع روہیل کھنڈ بگڑ چکے تھے۔"

اس پُرخطر وقت میں سید احمد رات رات بھر کلکٹر ضلع کی کوٹھی پر پہرہ دیتے۔ کرسی پر بیٹھے رہتے یا ٹہلتے۔ ان کے سمجھانے بجھانے سے باغیوں نے انگریزوں کو زندہ چھوڑ دیا۔

"اب اس وقت اور کوئی مصلحت نہ تھی بجز اس کے کہ ضلع کمبخت نامحمود خاں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جاوے"۔ ۷ جون کی رات کو سارے صاحب میم لوگ مع سواروں کے ہاتھیوں پر سوار ہوکر میرٹھ روانہ ہوگئے۔ "سمجھو اس بات کو کہ وہ سب نمک حرام پرانے سوار گنگا کے کنارے پر سے نامحمود خاں کے پاس بھاگ آئے۔ نئے سوار رڑکی تک ساتھ رہے۔ وہاں پہنچ کر بگڑ گئے۔"

نواب محمود خاں نے صبح ہوتے ہوتے "خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم نواب محمود خاں کا" کی منادی پٹوادی اور ضلع کا بندوبست شروع کیا۔ انہوں نے سید احمد اور دوسرے دیسی افسروں سے کہا کہ وہ حسب سابق اپنے فرائض انجام دیتے رہیں۔ سید احمد کو آزاد حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دی اور جاگیر پیش کی مگر سید موصوف نے انکار کر دیا اور نواب سے کہا "خدا کی قسم نواب میں صرف تمہاری خیر خواہی کے لئے کہتا ہوں کہ تم اس ارادے کو دل سے نکال دو۔ حکام انگریزی کی عمل داری نہیں جائے گی۔"

اسی وقت منیر خاں جہادی نے نگینے سے بجنور پہنچ کر انگریزوں کو شہر سے زندہ نکل جانے کے جرم میں سید احمد خاں کو واجب القتل ٹھہرایا۔ پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر مدارس پر الزام لگایا کہ "عیسائی مکتب ہر جگہ بٹھاتا پھرتا تھا۔" منیر خاں نے سید احمد سے درمسئلہ جہاد بحث مباحثہ کیا پھر دلی چلا گیا۔

جون کے مہینے میں بریلی کی باغی فوج کی کمان صوبیدار بخت خان نے سنبھالی۔ حافظ رحمت خاں کے بوڑھے پوتے خان بہادر خاں کو بہادر شاہ ظفر کی طرف سے صوبہ کمپیٹر کا والیسرائے مقرر کیا گیا۔ بہادر خاں نے راجپوتوں کا تعاون حاصل کیا۔ شوبھا رام بینا حکومت کا دیوان مقرر ہوا۔

اب انگریزوں نے پٹھانوں اور راجپوتوں کی آزاد مشترکہ حکومت ختم کروانے کے لئے ہندو بغاوت کا انتظام کیا اور پچاس ہزار روپیہ اس مقصد کے لئے کپتان گوڈائی کو دیا گیا۔ وہ ناکام رہا۔ مگر بجنور میں انگریز کے وفادار ہندو چودھری نواب محمود خاں کے خلاف صف آرا ہوگئے۔

سید احمد خاں لکھتے ہیں:۔

"غلغلہ ہوا کہ بہادر خان نے فرمان حکومت ملک کیتھار کا بادشاہ دہلی سے حاصل کیا۔ نامحمود خاں کو بڑا تردد ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ ملک کیتھار میں

---

[1] نواب نجیب الدولہ کے پڑپوتے نواب محمود خاں

ضلع بجنور بھی شمار میں آجائے چنانچہ عرضی بادشاہ کو بھیجی۔"

ادھر شیر کوٹ کے زمیندار نواب مارے خاں اور احمد اللہ خاں شیر کوٹ کے سب سے مالدار آسامی چودھری امراؤ سنگھ سے مطالبہ ادائیگی مال گزاری کا کیا۔ ۲۷ جولائی کو توپ میگزین شیر کوٹ پہنچ گئے۔ عمدہ خاں فرمان شاہی لیکر بجنور آئے کہ "فدوی خاص لائق العنایت والاحسان امیر الدولہ ضیا الملک محمد محمود خاں بہادر مظفر جنگ" انگریزوں سے چھینا ہوا مال خزانہ فوراً دلی بھجوا دیں!

اس طرف احمد اللہ خاں نے امراؤ سنگھ سے روپیہ لے کر اپنا مطالبہ ایک لاکھ کا کر دیا۔ اب باقاعدہ جنگ شروع ہوئی۔ احمد اللہ خاں نے حویلی پر توپ لگا دی۔ مارے خاں اور دوسروں نے حویلی لوٹی۔ بہت سے ہندو مارے گئے۔ امراؤ سنگھ نکل بھاگے۔ گڑھی فتح ہوئی، سارے چودھریوں نے مل کر احمد اللہ سے گڑھی چھیننے کا ارادہ کیا۔ دھام پور میں چودھری صاحبان توپیں لے کر جمع ہوتے۔ "دیہہ بدیہہ گنواری بگل یعنی ڈھول واسطے جمع ہونے اور لام بندی بجنے لگا۔"

سید احمد خاں صحیح فرماتے ہیں کہ اب تک بجنور میں تنازع عداوت یا مذہبی تکرار نہ تھی۔ چودھریوں کے ہاں مسلمان اور ہم مسلمان زمینداروں کے ہاں ہندو ملازم تھے۔ مگر اب باقاعدہ ہندو اور مسلم ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ شیر کوٹ کا مندر مسمار ہوا۔ کئی مسجدیں شہید ہوئیں۔ افواہ پھیلی کہ احمد اللہ خاں نے محمدی جھنڈا کھڑا کیا ہے۔

شیر کوٹ کی دوسری لڑائی میں احمد اللہ کی سپاہ مغلوب ہوئی۔ اس کے بعد بلدور کے چودھریوں نے بجنور پر چڑھائی کر دی۔ نواب محمود خاں کو بھاگ کر نجیب آباد جانا پڑا۔ چودھریوں نے کلکٹر کی کوٹھی پر قبضہ کر لیا۔ جس میں اس وقت تک نواب محمود خاں فروکش تھے۔ گنواروں نے خوب سول لائنز کی کوٹھیاں لوٹیں۔

اب ڈونڈی پٹی "خلق خدا کی ملک بادشاہ کا حکم چودھری نین سنگھ بجنور والے اور بلدور کے چودھریوں کا" ہندو مسلمانوں نے ایک دوسرے کے محلے لوٹنے شروع کئے۔

"مذہبی عداوت کا جو بیج شیر کوٹ میں بویا گیا تھا۔ بہت بلند ہو گیا۔ چودھری نین سنگھ اور جودھ سنگھ اس بات کے درپے تھے کہ ہندو مسلمانوں کی تکرار نہ بڑھے۔ مگر وہ گنوار چودھریوں کی حیثیت کیا سمجھتے تھے۔"

نواب محمود خاں نے پھر بجنور پر فوج کشی کا بندوبست کیا۔ "دو دفعہ غلغلہ پڑا کہ نواب چڑھ آیا۔ چودھری جودھ سنگھ جو کنوئیں میں سے روپیہ تلاش کرنے کو بیٹھے تھے۔ ایسے بے اوسان گھر پہنچے کہ سب کی جان ہوا ہو گئی۔" سید احمد خاں، سید تراب علی اور پنڈت رادھا کشن جو اب تک اپنے اپنے مکانوں میں دروازے بند کئے بیٹھے تھے۔ ان کو یقین ہو گیا کہ نواب ان کی جان نہیں بخشے گا۔ چنانچہ یہ تینوں چودھری نین سنگھ کے آدمیوں کے ساتھ بلدور پہنچے اور وہاں سے انہوں نے اور چودھری صاحبان بلدور نے میرٹھ عرضیاں بھیجیں کہ فوج انگریزی بجنور بھیجی جائے۔ وہاں سے مسٹر ولسن جج و اسپیشل کمشنر کا جو خط آیا وہ قابل غور ہے۔

"رفعت و عوالی مرتبت گرامی قدر چودھری امراؤ سنگھ سلمہ الرحمن۔ اس قدر ظلم یعنی غارت گری جان و مال و قتل عزیزان تمہارا پٹھان لوگ نہ کرتے تو تم سب رؤسا ہنود یک دل ہو کر کیوں ان کو نکالتے۔ اب تم سب ہنود نے اتفاق کر کے اس ظالم نواب کو نکال دیا۔ اب بفضل خدا سب تکالیف تمہاری جلد رفع ہو جاتی ہیں۔ شیکسپیر صاحب بھی پہاڑ سے بلا لئے گئے ہیں اور ہم تھوڑی فوج معتبر لے کر عنقریب آویں گے۔ حال لگانے توپ کا آپ کے مکان پر بہ نسبت بھانجہ نواب ظالم جو آپ نے لکھا ہے۔ سو اہل ہند جنہوں نے توپ نہیں دیکھی۔ وہ توپ سے بہت ڈرتے ہیں۔ اگر یہ پٹھان لوگ تم اہل ہنود پر توپ لگا دیں تو یہ تدبیر کرنی چاہیے کہ ——" وغیرہ وغیرہ۔

سید احمد خاں اور محمد رحمت خاں ڈپٹی کلکٹر بلدور سے بجنور آئے اور ضلع کا انتظام بحکم ولسن صاحب اپنے ہاتھ میں لیا۔ "جب ضلع ہمارے سپرد ہوا میری رائے یہ تھی کہ پرانے الفاظ منادی کے یعنی خلق خدا کی ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا" بدلے جاویں اور پکارا جاوے کہ ملک ملکہ وکٹوریہ شاہ لندن کا۔ تاکہ عوام الناس بغیر شک کے یہ بات سمجھیں کہ درحقیقت ملک کس کا ہے اور ہمارا بادشاہ کون ہے۔ لیکن بلا اجازت حکام، اس باب میں رائے دینی دوسرے وقت پر موقوف رکھی۔"

محمد رحمت خاں و۔ سید احمد خاں نے ۶ اگست کی رپورٹ میں مسٹر جارج پامر کو مطلع کیا کہ سوا پرگنہ نجیب آباد سب طرف امن ہے قصبہ نہٹور اور سیوہارہ وغیرہ میں کچھ لوگ بہ ارادۂ فساد جمع ہوئے تھے ان کو متفرق کرنے کے لئے تدبیریں کی گئی ہیں۔" محمود خاں جنگ کی تیاری میں مصروف تھے کہ محرم آگیا جس میں مزید فساد ہونا لازمی تھا۔ سکھ جتھے مظفر نگر پہنچنے والی تھی۔

نگینے میں بشنوئیوں اور مسلمانوں میں جنگ ہوئی۔ احمد اللہ خاں نے

لہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت بخاری کا متعقد فرقہ۔ مخدوم کی جہم پیر کے نام سے پرستش کرتا ہے۔

یکم محرم، ۲۲ اگست توپ نکالی۔ محمدی جھنڈا کھڑا کیا۔ نگینہ پہنچ کر بشنوئی سرائے پر توپ لگادی۔ بشنوئی مکان جلا دیئے گئے۔ سید تراب علی تحصیلدار کے قتل کا حکم دیا مگر چونکہ سب پٹھان سید کا قتل برا سمجھتے تھے۔ اس لئے ان کی جان بخشی ہوگئی۔ ۲۶ اگست کو احمد اللہ خاں، مارڈے خاں وغیرہ نے بلدور پر چڑھائی کے ارادے سے نہٹور کوچ کیا۔ ۲۷ کو چودھری رندھیر سنگھ وغیرہ نقارہ بجاتے، نشان اڑاتے، توپ اور جزائیل کے ساتھ مقابلے کو روانہ ہوئے۔ نہٹور سے احمد اللہ خاں کا لشکر چلا۔ بالآن ندی پر مقابلہ ہوا۔ چودھری صاحبان پسپا ہو کر بلدور میں داخل ہوئے جہاں خندق کھدی تھی۔ دمدمہ بنا تھا۔ "یہ توپیں لارڈ لیک نے نواب احمد بخش والیٔ فیروز پور جھرکہ کو دی تھیں اور چودھریوں نے نیلام شمس الدین خاں کے وقت خرید لی تھیں۔" اب نواب کی توپ نے گولہ باری شروع کی۔ بلدور میں زبردست آگ لگی۔ اس کے بعد احمد اللہ خاں بجنور آ گئے۔

احمد اللہ اور مارڈے خاں کا ارادہ تھا، کہ بلدور فتح کر کے تاجپور پر چڑھائی ہوگی۔ نہٹور میں منادی ہوگئی تھی کہ بلدور اور تاجپور کی لوٹ معاف ہے۔ دوسرے روز بلدور میں قتل عام ہوا —— سارا بلدور جل گیا۔ "پھونس کا نام بلدور سے جاتا رہا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی چڑیا ایک پھونس کا تنکا اپنا گھونسلہ بنانے کو قرض مانگتی تو بھی نہ ملتا۔"

اس وقت سید احمد دہلوی اور سید تراب علی بلدور میں چودھریوں کی حویلی کے اندر پناہ گزیں تھے۔ ۲۹ کی رات بدقت تمام پیادہ پا وہاں سے نکلے اور باغیوں کی یورش جھیلتے موت کے منہ سے بچتے میرٹھ پہنچے۔ ۳۰ اگست کو احمد اللہ خاں نے بلدور پر حملہ کر دیا۔ لیکن جب گڑھی فتح نہ کر سکے تو نہٹور پہنچے۔ یکم ستمبر کو نہٹور سے بجنور کوچ کیا۔

بلدور کے دوسرے معرکے کے بعد تمام ضلع پر نواب محمود خاں کا تسلط قائم ہوگیا۔ کچہری کی نئی مہریں بنیں جن پر "واللہ ملک السموات" بڑھایا گیا۔ سنہ عیسوی کے بجائے سنہ ہجری اور ضلع بجنور کے بجائے حکومت نجیب آباد لکھا گیا۔ نواب کے معتمد سعد اللہ خاں تحصیلدار نگینہ نواب کی طرف سے چودھریوں سے صلح صفائی کرنے کی غرض سے نہٹور گئے۔ مگر چودھریوں نے صلح نہ کی۔ ۱۸ ستمبر کو بلدور کے چودھری نواب سے پھر لڑے۔ اور پھر ہار گئے۔ اب سعد اللہ خاں نے ان کو لکھا، غور فرمائیے کہ قدیم وضعداری اور اخلاق کا کیا عالم ہے:

"چودھری صاحب مشفق و مہربان دوستان سلمہٗ اللہ تعالیٰ بعد سلام شوق واضح ہو خط تمہارا پہنچا۔ حال دریافت ہوا۔ ہم کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے ایام کچھ بُرے آگئے ہیں۔ ورنہ ہرگز تم سے ایسی بات ظہور میں نہ آتی کہ تم مجھ سے اندیشہ کرتے ہو۔ اور میں تم کو اپنے فرزند سے کمتر نہیں جانتا جبکہ تم میرے کہنے سے باہر ہو تو پھر کیا علاج کروں۔ چاہئے کہ بلا اندیشہ تم میرے پاس نگینہ چلے آؤ۔ اور اگر ایسی ہی لیت ولعل میں رہو گے خراب اور برباد ہو جاؤ گے۔ جب تم مجھ کو اپنا مربی جانتے ہو تو پھر کیا خوف ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

صلح صفائی کی اس کوشش کے بعد نواب محمود خاں کا بڑا بیٹا غضنفر علی خاں مع مارڈے خاں لشکر کے نہٹور روانہ ہوا تاکہ اگر چودھری صاحبان حاضر نہ ہوں تو بلدور بھر تباہ کر دیا جائے۔ اب نہٹور کے لیکھ راج سنگھ وغیرہ کے ذریعے چودھری رندھیر سنگھ کو پیغام بھیجا گیا۔ اور وہ نہٹور آنے پر راضی ہوئے۔ ۲۵ ستمبر کو انہوں نے نہٹور میں نواب غضنفر علی خاں سے ملاقات کی، ایک پیش قبض اور پچاس روپے گزرانے۔ غضنفر علی خاں نے ایک دوشالہ بطور خلعت دیا۔ پھر چودھری امراؤ سنگھ بھی نجیب آباد گئے۔ نواب محمود خاں کو اشرفیاں نذر کیں۔ نواب نے دوشالہ عطا کیا۔

چودھری امراؤ سنگھ شیر کوٹ سے نجیب آباد روانہ ہوئے ہیں کہ غضنفر علی خاں اور مارڈے خاں نے دوبارہ ہندوؤں کا قتل عام شروع کر دیا۔ بلدور پر حملہ کیا گیا۔ بلدور کی تیسری لڑائی میں گڑھی فتح ہوگئی۔ ۲ نومبر کو احمد اللہ خاں کا لشکر حویلی میں داخل ہوا۔ چودھری رندھیر سنگھ کو گرفتار کر کے نجیب آباد لے گئے۔ چودھریوں کے مکانات جلا دیئے گئے۔ بلدور میں اُلو بولنے لگا۔

۲ نومبر کو بلدور روانگی کے وقت نواب مارڈے خاں نے چودھری پرتاپ سنگھ رئیس تاجپور کو خط لکھا

"چودھری صاحب مشفق و مہربان کرم فرمائے۔ بہرحال نیاز منداں چودھری پرتاپ سنگھ سلمہٗ اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام مشوق اینکہ ارادہ لشکر اینجانب بطرف تاجپور است۔ کہ آں صاحب تدبیر رسد وغیرہ سازند چناں نشود کہ بہ کسے رنج تکلیف مردمان لشکر را شود۔ باقی خیریت است

فقط رقیمہ الشوق

مارڈے خاں از مقام چاندپور"

یہ پروانہ ملتے ہی بے چارہ چودھری ڈر کر گڑھ مکتیشر چلا گیا۔

اب احمد اللہ خاں تحصیلدار ان ضلع کے نام پروانہ جاری کیا جو معافیات عہد انگریزی میں ضبط ہو کر جمع مقرر ہوگئی ہیں۔ وارثان کو معاف و بحال رکھی جائیں گی۔

۱۶ فروری ۱۸۵۸ء کو شیکسپیئر و آمر صاحبان رڑکی پہنچے۔ چودھریان ضلع بجنور نے جو گنگا پار پناہ گزین ہو چکے تھے۔ ان سے رڑکی جا کر

ملاقات کی۔ رڑکی میں انگریز سرکار روہیلکھنڈ پر حملے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ ادھر بجنور میں غضنفر علی خاں اور مارڈے خاں کے مابین نئی مقبوضات کی ملکیت کے بارے میں جھگڑے شروع ہو گئے۔

فتح لکھنؤ کے بعد سر کولن کیمپ بل نے فوج روہیلکھنڈ بھیجی۔ بریگیڈیر جونسز کی قیادت میں گورا اور سکھ فوج نے ۱۴ اپریل کو گنگا پار کر کے نواب محمود خاں کے لشکر کو شکست دی۔ نواب کے سپاہی منتشر ہو کر جنگلوں میں جا چھپے۔ جب انگریزی فوج مالن ندی پر پہنچی تو نواب کی طرف سے تین توپ کی آواز آئی مگر نجیب آباد خالی ہو چکا تھا۔ شہر میں آگ لگا دی گئی۔ سید احمد خاں لکھتے ہیں: "نہایت افسوس ہے کہ ہمارے حکام کو اس طرح سے شہر کا جلانا منظور نہ تھا۔ شاید اتفاقیہ آگ لگی۔"

نواب محمود خاں کا محل بارود سے اڑا دیا گیا۔ ۲۳ کو نواب کے بھائی جلال الدین خاں اور عبداللہ خاں کو بحکم جنرل جونسز گولی ماردی گئی۔ مارڈے خاں، احمد اللہ خاں، وسیل سنگھ گوجر اور دوسرے باغیوں نے آخری مورچہ نگینہ میں لگایا۔ اس میں بھی سرکار کو فتح و نصرت حاصل ہوئی۔ شیکسپیر و بیٹمر صاحبان مع تو پہائے غنیمت نگینہ بفتح و فیروزی بجنور میں داخل ہوئے۔ پھر انگریزی لشکر نے مراد آباد کوچ کیا۔ ۲۶ تاریخ کے سید احمد نے کچہری صدر امینی کھول دی۔ انتظام ضلع حیرت انگیز سرعت سے درست ہو گیا۔ جنگل کی راہیں صاف ہو گئیں، تجارت جاری ہو گئی۔

گیارہ ماہ تک روہیلکھنڈ آزاد رہا۔ جب مئی ۱۸۵۸ء میں انگریزی افواج چاروں طرف سے روہیلکھنڈ میں داخل ہوئیں۔ اس وقت خان بہادر خاں کے غازیوں اور ہائی لینڈرز کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ ادھر سے فیض آباد کے مولوی احمد اللہ، شہزادہ فیروز بخت اور ملکہ حضرت محل کی افواج نے شاہجہاں پور پر حملہ کیا مگر بریگیڈیر جونسز ظفر مند رہا۔ مولوی احمد اللہ شہید ہوئے۔ نواب محمود خاں کو کالے پانی کی سزا ہوئی۔ مگر انہوں نے جیل میں انتقال کیا۔ بوڑھے خان بہادر خاں بریلی میں تختہ دار پر چڑھے۔ فرخ سیر کا نواسہ فیروز بخت مراد آباد میں حسرتناک حال فاقے کرتا فقیروں کے بھیس میں لڑتا پھرا۔ آخر شکست کھا کر ایران چلا گیا اور سنتے ہیں وہاں سے زار روس کی عملداری میں پناہ لی۔ میں میر احمد علی یہ سب واقعات دہراتا ہوں تو دل خون ہوتا ہے۔

ہم اس جنگ میں کیوں ناکام رہے؟ مراد آباد برطانیہ کے وفادار نواب رامپور کے زیر اثر تھا۔ بجنور میں ہندو مسلم خانہ جنگی ہوئی۔ (گو سارے ہنود انگریز کے حمایتی نہ تھے۔ بجنور کے راجپوت باغیوں میں ہمارے رائے بھوپ سنگھ پیش پیش تھے) بغاوت کے بیشتر قائدین کے ذاتی مقاصد جداگانہ تھے۔ کچھ اپنا تاج و تخت واپس حاصل کرنا چاہتے تھے۔ کوئی آپس میں متفق نہ تھا۔ ادبار نے عقلیں سب کی زائل کر دی تھیں۔ جنگ حمقا، با دانایان فرنگ۔

آپس کی پھوٹ ہندوستان کا پرانا خاصا ہے۔ اس پھوٹ نے اس سرزمین فردوس نشان کو ہمیشہ تباہ و برباد کیا۔

کجاست فکر حکیمے درائے برہمنے؟

(مسلسل)

تابش پرتاب گڈھی
(بیتھر، ضلع پرتاب گڈھ (اتر پردیش)

یادوں کے چراغ

وقت آیا ہے تو میں ہوں مری تنہائی ہے: شہر میں اور نہ ہزاروں سے شناسائی ہے
میرے رستے میں عجب منزل غم آئی ہے: زندگی اپنی وفاؤں سے بھی شرمائی ہے
سینہ و دل کی اک اک چوٹ ابھر آئی ہے: ہے تنہائی کہ چلتی ہوئی پروائی ہے
میں ڈراتا ہوں سوکھے ہوئے پتے کی طرح: دشت احساس سے وہ تیز ہوا آئی ہے
مجھ میں گم ہے مرے ماحول کا ہنگامہ بھی: مژدہ اے درد! کہ تنہائی ہی تنہائی ہے
تلخیٔ عہد گزشتہ سے بچا کر نظریں: یاد احباب دبے پاؤں چلی آئی ہے
اجنبی شہر میں لگتی ہے نئی چیز مجھے: ورنہ تنہائی سے مدت کی شناسائی ہے
چارہ گر آئے تو یہ سوچنے لگتا ہوں میں: یہ بھی شاید مرے زخموں کا تماشائی ہے
آنے والا نہ ہو کوئی بھی مگر چونک پڑوں: سادگی مری کیا سخت سزا پائی ہے
کہہ رہا ہوں در و دیوار سے دکھ سکھ اپنا: مجھ کو بے رحمیٔ حالات کہاں لائی ہے
تلخیٔ، شدت احساس بھلا ہو تیرا: اب مرے واسطے محفل ہے نہ تنہائی ہے
سخت نالاں ہوں خیالات کی یکسوئی سے: دل میں ہر لمحے کی تصویر اتر آئی ہے
دل کی آواز بھی اب دل سے ہم آہنگ نہیں: میری قسمت میں عجب طرح کی تنہائی ہے
جہاں رہتا بھی ہوں اور جس سے برگشتہ بھی: رات رہ رہ کے اسی شہر کی یاد آئی ہے
میرے خوابوں سے کہو اب مرا پیچھا چھوڑیں: دھوپ دیواروں سے آنگن میں اتر آئی ہے
تو انہیں عام سے اشعار سمجھ کر نہ گزر: ان میں پوشیدہ مری روح کی گہرائی ہے

دن میں جاگ اٹھتے ہیں یادوں کے چراغ اے تابشؔ
یہ بھی ماحول کا انداز مسیحائی ہے

ف اپنے شہر پرتاب گڈھ کی طرف اشارہ ہے

وحید اختر
آنند بھون، سول لائنز علی گڑھ (یوپی)

گم گشتگی

غزل

میں تنہا ہوں انسانوں کے اس جنگل میں
چہرہ چہرہ کھوج رہا ہوں
وہ آنکھیں، وہ عارض و لب، وہ خال و خط
کھوئے ہیں کہاں
کون پتہ ان کا دے گا
جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے
وہ دشنام طراز ہیں، جان کے بھی انجان بنے
پھرتے ہیں
اپنے غم میں مصلحتوں کے ہاتھوں مجبور و معذور
اُس کا پتہ اس کی خیریت جان کے بھی انجان سے ہیں
اُس کے عارض و لب میں کوئی رنگ نہیں اب،
دیکھ چکے ہیں
پھر بھی مجھ سے رنگ کی باتیں کرتے ہیں

کون کسی کا دکھ سہتا ہے، کون کسی کو اپناتا ہے
میں نے اسے چاہا تھا، لیکن
آج میں اس سے ہو کے جدا شکوہ سنج تنہائی ہوں
نشۂ غم میں بھول چکا ہوں
وہ ہو دُور مگر اس کا غم دُور نہیں ہے

کاش مجھے کوئی سمجھا دے
یہ میرا غم ہے، اس کا غم کس نے سمجھا

میں نے اس کے لفظوں میں اپنے ہی معانی
ڈھونڈے ہیں
میں نے اپنے لفظوں سے اس کے چہرے کو
ڈھانپ دیا ہے
میں نے غزلوں نظموں میں اس کا وہ پیکر ڈھالا ہے
جو میرا اپنا پیکر ہے
اور وہ مجھ سے یہ کہتی ہے
"تم نے مجھ کو یاد کیا ہوتا تو میں آ بھی جاتی
تم تو اپنی شخصیت کو کھوج رہے تھے۔
تم تو اپنی ہی تکمیل کے خواہاں تھے
تم نے مجھے چاہا بھی نہیں، پایا بھی نہیں،
ڈھونڈا بھی نہیں
تم نے مجھے کھویا بھی نہیں
تم نے خود کو چاہا تھا، ڈھونڈا تھا، خود کو
پایا تھا۔
اور اب اپنے غم کے ہاتھوں خود کو بھی کھوتے جاتے ہو"

میں تنہا ہوں انسانوں کے اس جنگل میں
خود میں اپنے ساتھ نہیں ہوں

عشق میں خود کو کھویا ہم نے، خود کو کبھی نہ پانے کو
خواب تمنا دیکھا تھا، خوابوں کا بوجھ اٹھانے کو

اب ہم دونوں لمحۂ دید کے شکوہ سنج برابر ہیں
کتنے چاؤ سے وہ نظریں اٹھی تھیں مجھے اپنانے کو

لاکھ تمناؤں کا میلا راکھ کے ڈھیر لگا جاتا ہے
ایک تمنا بہت ہے صدیوں دل کی آگ جلانے کو

اُن کی شکل ہے لمحۂ پراں، ٹھہر گئی تو ٹھہر گئی
آنکھ سے اوجھل ہو کے تشنہ خواب ہے نیند اڑانے کو

اک گُل افسردہ نے دامن تھاما، بھولے غنچوں کو
ہم تو ہمرہ موج صبا آئے تھے پھول کھلانے کو

سختیٔ دوراں کی راہوں میں اک اک ساتھی چھوٹ گیا
ہم تن تنہا دشت جنوں میں رہ گئے خاک اڑانے کو

دلبر دل زدگاں سے پہلے دل کی بات سمجھ لیتے ہیں
ہیں کتنے نادان وحید اُن کو تھے چلے سمجھانے کو

ریاستیں	اعداد و شمار
آندھرا پردیش	۳,۲۹۹,۸۵۴
آسام	۶,۳۲۵
بہار	۴,۹۹۳,۲۸۴
گجرات	۵۸۱,۵۰۱
ہریانہ	۱۹۵,۸۳۶
ہماچل پردیش	۱۰۱۲۱
جموں و کشمیر	۱۲,۷۴۰
کیرالہ	۱۱,۳۷۴
مدھیہ پردیش	۹۸۸,۲۷۵
مہاراشٹر	۳,۶۶۱,۸۹۸
منی پور	۳۱۱
میگھالیہ	۱,۴۱۰
میسور	۲,۶۳۶,۶۸۸
ناگالینڈ	۲۵۲
اڑیسہ	۲۸۶,۵۴۱
پنجاب	۲۹,۰۰۳
راجستھان	۶۵۰,۹۴۷
تامل ناڈو	۷۵۹,۶۰۷
تری پورہ	۶۷
اتر پردیش	۹,۲۷۳,۰۸۹
مغربی بنگال	۹۵۰,۳۶۳

مرکزی نظم و نسق والے علاقے

جزائر انڈیمان و نکوبار	۲,۴۸۸
اروناچل پردیش	۳۳۰
چنڈی گڑھ	۱,۷۰۳
دادر اور نگر حویلی	۱۳۴
دہلی	۲۳۱,۱۲۷
گوا، دمن اور دیو	۱۹,۲۰۵
لکادیپ، منی کوے اور امین دیوی جزائر	۳۲
پانڈی چری	۳,۳۶۲

کل : ۲۸,۶۰۷,۸۷۴

یہ تعداد اُن لوگوں کی ہے جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ اس کے علاوہ لاکھوں کی تعداد میں ایسے لوگ ہیں جن کی مادری زبان تو علاقائی زبان ہے مگر جو اُردو بولتے لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے اعداد زبان بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے ابھی ان میں شائع ہوئے ہیں۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق یہ تعداد ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ تھی۔

ان کروڑوں افراد میں ہندو، مسلمان، سکھ، اور عیسائی سبھی شامل ہیں۔ اتنی بڑی آبادی کے لئے رسائل و اخبارات کے علاوہ بے شمار کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں۔ ماہنامہ آج کل (دہلی) کے اُردو نمبر (اگست ۱۹۶۸ء) کے مطابق "۱۹۴۷ء کے بعد اُردو میں لگ بھگ دس ہزار کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں نظموں اور غزلوں کے مجموعے، افسانے، ناول، ڈرامے، تحقیق و تنقید، مذہبی اور بچوں کی کتابیں اور درسی کتابیں بھی شامل ہیں۔ اس طرح ہر روز اُردو کی دو کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ملک میں خواندگی کے اوسط (۳۳ فی صدی) کے پیش نظر یہ تعداد حوصلہ افزا کہی جا سکتی ہے۔"

کتب خانے

ہندوستان میں اُردو کی بڑی بڑی لائبریریاں قائم ہیں۔ خدا بخش لائبریری (پٹنہ) اور گورنمنٹ اُردو لائبریری (پٹنہ) میں اُردو کے نوادر جمع ہیں۔ مولانا آزاد لائبریری (علی گڑھ)، رضا لائبریری رام پور اور سالار جنگ میوزیم (حیدرآباد) بھی اُردو کے قدیم و جدید ادب کے بیش بہا ذخیرے سے مالا مال ہے۔ حکومت ہند کے ایک اندازے کے مطابق اس وقت ملک میں چھوٹی بڑی ۲۸ ہزار لائبریریاں ہیں جن میں صرف اردو کی ۳ ہزار لائبریریاں ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بقیہ لائبریریوں میں اُردو کی کتابیں نہیں ہیں۔

اُردو ملک کے کروڑوں افراد کی زبان ہے۔ ملک کی بے شمار ادبی اور ثقافتی انجمنیں، مکتب اور مدرسے، اسکول اور کالج، رسائل و اخبارات اپنے طور پر اُردو کی ترویج و اشاعت میں لگے ہوئے ہیں۔ ملک کے دستور نے ہر اقلیت کو اُس کا حق دیا ہے کہ وہ اپنے تعلیمی اور مذہبی ادارے قائم کرے اور چلائے۔ حکومت ہر طرح اُس کو امداد دے گی۔

مندرجہ بالا کوششوں سے قطع نظر حکومت ہند اور مختلف ریاستوں نے اُردو کی ترویج و ترقی کے لئے کیا کیا اقدامات کئے ہیں، ان کا اجمالی ذکر بھی ضروری ہے۔

حکومت ہند: دستور کے آٹھویں شیڈول میں تمام علاقائی زبانوں کو شامل کیا گیا ہے۔ ہر ریاست کی علاقائی زبان جیسے گجراتی، مراٹھی، بنگالی، ملیالم، کنڑ وغیرہ کے ساتھ ساتھ اس شیڈول میں اُردو بھی شامل ہے۔ اس طرح دستوری طور پر اُردو کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اپنے متعدد اعلانات کے ذریعہ

حکومت ہند نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اردو ملک کی ایک قومی اور علاقائی زبان ہے جو کسی ایک علاقے کی بجائے ملک کے بڑے حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ حکومت اردو کی ترقی کے لئے وہ تمام اقدامات کرے گی جو وہ ہندوستان کی دوسری قومی زبانوں کے لئے کرتی ہے چونکہ دستور کے مطابق تعلیم ریاستوں کے دائرہ کار میں ہے، لہٰذا حکومت ہند وقتاً فوقتاً ریاستی حکومتوں کی توجہ اردو والوں کے مسائل کی طرف مبذول کراتی رہتی ہے اور خود بھی ایسے اقدامات کرتی ہے جن سے اس زبان کو بڑھاوا ملے۔

ترقی اردو بورڈ: ۱۹۶۹ء میں حکومت ہند کی وزارت تعلیم نے ایک کروڑ روپے کے سرمائے سے ایک ترقی اردو بورڈ قائم کیا ہے۔ اور بی اے، بی ایس سی کی نصاب کی کتابوں کے ترجمے کا کام اس کے سپرد کیا ہے۔ اس بورڈ نے تقریباً چھ سو کتابوں کا انتخاب کیا ہے جو ترجمے اور تالیف کے لئے ماہرین کے سپرد کر دی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تقریباً ایک لاکھ علمی اور سائنسی اصطلاحوں کا بھی اردو میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بورڈ ایک انگریزی اردو لغت اور ایک اردو اردو لغت ۵ جلدوں میں، ایک قاموس (انسائیکلو پیڈیا) اور ایک بیلیوگرافی بھی شائع کرے گا۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ بڑی تعداد میں درسی اور نصابی کتابیں تیار ہو جائیں، تاکہ یونیورسٹی کی سطح پر اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جا سکے۔ اس وقت تک بورڈ کی ۷۰ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ۱۲ کتابیں پریس جا چکی ہیں۔ اصطلاح سازی کا تقریباً آدھا کام مکمل ہو چکا ہے۔ ان کاموں کے لئے مختلف علوم کے ماہرین کی کمیٹیاں مقرر کی گئی ہیں۔ اس طرح علمی اور سائنسی سطح پر اردو کے فروغ کے امکانات بڑے روشن ہو گئے ہیں۔

ترقی اردو بورڈ اسکول کی درسی کتابیں اور بچوں کی معلوماتی کتابیں بھی بڑی تعداد میں شائع کر رہا ہے۔ اردو کی تعلیم سے متعلق تمام مسائل کا جائزہ لینے کے لئے حکومت ہند نے حال میں ایک اردو کمیٹی مقرر کی ہے جس کے چیرمین مرکز کے ریاستی وزیر برائے اطلاعات و نشریات جناب اندر کمار گجرال اور جوائنٹ سکریٹری اردو کے مشہور ادیب علی جواد زیدی صاحب ہیں۔

نیشنل بک ٹرسٹ: حکومت کا قائم کردہ ایک دوسرا ادارہ نیشنل بک ٹرسٹ بھی بڑی تعداد میں اردو کتابیں شائع کر رہا ہے چنانچہ ترقی اردو بورڈ کی کتابیں شائع کرنے کا کام بھی اسے سونپا گیا ہے۔ یہ ادارہ ملک کی تمام علاقائی زبانوں میں کتابیں شائع کرتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ہمارے مختلف لسانی علاقوں کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع ملے۔ وہ ایک دوسرے کو زیادہ سمجھ سکیں اور ملک میں قومی یکجہتی پیدا ہو۔ یہ ادارہ منافع کے لئے کتابیں شائع نہیں کرتا لہٰذا قیمت بڑی واجبی ہوتی ہے۔ اس ادارے کے تحت بچوں کے لئے بڑی دلکش اور معلوماتی کتابیں شائع ہوتی ہیں جن میں اردو کی بہت سی کتابیں ہیں۔

ساہتیہ اکادمی: ہندوستانی زبانوں کو فروغ دینے، مختلف زبانوں کے ادیبوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لانے اور ان کی تخلیقات کو ایک دوسرے سے روشناس کرانے میں حکومت ہند کا یہ ادارہ بڑی گراں قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ ہر سال ہر زبان کی سب سے اچھی اور عمدہ تصنیف پر ۵ ہزار کا گراں قدر انعام دیا جاتا ہے۔ اردو میں اب تک یہ انعام ظفر حسین خاں، ڈاکٹر عابد حسین، خواجہ احمد فاروقی، جگر مرادآبادی، سید مسعود حسن رضوی، فراق گورکھپوری، امتیاز علی عرشی، اختر الایمان، خواجہ غلام السیدین، آنند نرائن ملا، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، مخدوم محی الدین، حیات اللہ انصاری اور رشید احمد صدیقی (۱۹۷۱ء) کو دیا جا چکا ہے۔

یہ ادارہ ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں کلاسیکی ادب کے تراجم بھی شائع کرتا ہے۔ اردو میں بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں۔

دیگر انعامات: بچوں اور نوخواندہ افراد کے لئے کتابیں لکھوانے کے لئے ہر سال انعامی مقابلے منعقد کئے جاتے ہیں۔ وزارت تعلیم کے ذریعے یونسکو کے تحت ہر دو سال پر اور وزارت اجتماعی ترقی اور امداد باہمی اور وزارت تعلیم کی طرف سے ہر سال ایک انعامی مقابلہ ہوتا ہے جس میں دیئے ہوئے موضوعات پر کتابیں لکھوائی جاتی ہیں مصنفوں کو ایک ایک ہزار روپے کا انعام دیا جاتا ہے اور کتاب کی کافی جلدیں حکومت خرید لیتی ہے۔

مالی امداد: اس کے علاوہ حکومت ہند متعدد علمی و ادبی اداروں کو مالی امداد دیتی رہتی ہے۔ جن اداروں کو امداد ملتی ہے۔ ان میں اسلامک کلچرل بورڈ حیدرآباد، ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، حیدرآباد، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ اور انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ شامل ہیں۔ انجمن ترقی اردو کو نئی دہلی میں اردو گھر کی تعمیر کے لئے ۴ لاکھ روپے کا عطیہ دیا گیا ہے غالب صدی تقریبات (۱۹۶۹ء) کے موقع پر حکومت ہند نے گراں قدر عطیات دیئے۔ لاکھوں روپے سے تعمیر کردہ "ایوان غالب" نئی دہلی، غالب جیسے شاعر کی شایان شان یادگار ہے۔ اس میں ایک لائبریری اور آڈیٹوریم بھی ہے۔

وظیفے: حکومت ہند اُن ممتاز ادبا اور شعرا کو وظیفے بھی دیتی ہے جو ضرورت مند ہیں۔ اب تک ڈیڑھ سو ادبا و شعرا کو وظیفے دیئے گئے ہیں، جن میں جگر مرادآبادی

(مرحوم) جوش ملیسانی، تلوک چند محروم (مرحوم) یگانہ چنگیزی (مرحوم) قاضی عبدالغفار (مرحوم) رئوس صدیقی (مرحوم) سراج لکھنوی (مرحوم) دیوان سنگھ مفتوں، عبدالماجد دریا بادی، اعجاز صدیقی، بسمل سعیدی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

وزارتِ اطلاعات و نشریاتِ حکومتِ ہند

(۱) آل انڈیا ریڈیو: اس وزارت کے تحت کام کرنے والے متعدد اداروں نے اُردو کی ترویج و ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کی ایکسٹرنل سروس سے روزانہ نو گھنٹے اُردو میں پروگرام نشر ہوتا ہے اس کے علاوہ دوسری سروسز سے بھی اُردو کے پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ تقریباً تمام اہم اسٹیشنوں سے اُردو کے پروگرام بڑی باقاعدگی سے نشر ہوتے ہیں۔ اُردو کے اُدباء و شعراء کو عوام سے روشناس کرانے میں ریڈیو نے بڑا کام کیا ہے۔ اُردو میں خبریں اور تبصرے اُردو جاننے والوں کو حالاتِ حاضرہ سے باخبر رکھتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو میں ایک ایکٹ کے ڈراموں کا آغاز اور فروغ آل انڈیا ریڈیو کا ہی مرہونِ منت ہے۔ بڑے بڑے کل ہند مشاعرے ریڈیو کے ذریعہ ہی ملک کے گوشے گوشے میں سننے والوں تک اُن کے محبوب شعراء کی آواز پہنچاتے ہیں۔ اُردو کو غیر اُردو والوں میں مقبول بنانے میں بھی ریڈیو کا حصہ کچھ کم نہیں۔

(۲) پریس انفارمیشن بیورو: اس ادارے کی طرف سے خبریں، تبصرے، خصوصی فیچر وغیرہ اردو اخبارات اور رسائل کو مفت مہیا کئے جاتے ہیں۔ اس طرح وہ چھوٹے اخبارات جو ترجمے اور بلاک وغیرہ پر خرچ نہیں کر سکتے، انہیں پی۔ آئی۔ بی سے فراہم کردہ مواد سے بڑی مدد ملتی ہے۔

(۳) ڈی اے وی پی: یہ ادارہ اخبارات کو حکومت کے اشتہار فراہم کرتا ہے حکومتِ ہند کی یہ واضح پالیسی ہے کہ چھوٹے اخبارات کو زیادہ تعداد میں اشتہار فراہم کئے جائیں۔ اس طرح یہ ادارہ اُردو کے چھوٹے اخبارات کو اشتہار فراہم کر کے انہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں مدد دیتا ہے۔

۴۔ پبلیکیشنز ڈویژن: یہ ادارہ معلوماتی کتابوں کے علاوہ ایسے موضوعات پر کتابیں شائع کرتا ہے جس سے مفاہمت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی میں مدد ملے۔ بچوں کے لئے بھی کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔ اُردو کا مشہور و مقبول ماہنامہ "آج کل" بھی اسی ادارہ کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔

۵۔ فلمز ڈویژن: یہ ادارہ سرزبان میں ڈوکومنٹری اور نیوز ریل تیار کرتا ہے، جن میں اُردو بھی شامل ہے۔ ہر ہفتہ ایک نیوز ریل تیار کی جاتی ہے۔

ریاستی حکومتیں یوپی اور بہار میں اُردو اکادمیاں قائم ہوئی ہیں جو اُردو کی کتابوں پر انعامات، مصنفوں کو مالی امداد اور کتابوں کی اشاعت میں امداد دیتی ہیں۔ یوپی اکادمی ایک اُردو یونیورسٹی کے قیام پر بھی غور کر رہی ہے۔ بعض دوسری ریاستیں بھی مثلاً کشمیر، پنجاب، مہاراشٹر، ہریانہ وغیرہ اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کو انعام دیتی ہیں۔

متعدد ریاستی حکومتیں اُردو کے رسائل شائع کرتی ہیں۔ حکومتِ بہار کی طرف سے پندرہ روزہ "بہار کی خبریں"، "حکومت اُتر پردیش کی طرف سے "نیا دور" (ماہنامہ) حکومت آندھرا پردیش کی طرف سے "آندھرا پردیش" (ماہنامہ) اور جموں و کشمیر کی طرف سے دوماہی "شیرازہ" شائع ہوتا ہے۔

جموں و کشمیر: اس ریاست کی سرکاری زبان اُردو ہے اور پرائمری سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم مفت ہے۔ ریاست کی کلچرل اکادمی کے تحت اُردو کی بہت سی گراں قدر کتابیں شائع ہوئی ہیں اور متعدد اُدباء و شعراء کو انعامات سے نوازا گیا ہے۔ ادیب و شاعر قوم کا سرمایۂ افتخار ہیں اور اُن کی مدد اور سرپرستی حکومت کا فریضہ ہے۔

اس طرح مرکزی حکومت کے ساتھ ساتھ ریاستی حکومتیں بھی اُردو کی ترقی اور بقا کے لئے کوشاں ہیں کیونکہ اُردو ہمارا قومی سرمایہ ہے۔ یہ ہماری ایک نہایت اہم قومی زبان ہے، جس نے آزادی کی جدوجہد کے زمانے میں لاکھوں دلوں کو گرمایا ہے۔ اس زبان میں ہندی کی مٹھاس اور لوچ ہے، فارسی کی شیرینی اور عربی کا زور۔ یہ کروڑوں ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں کے آپسی میل ملاپ اور بھائی چارہ کی علامت ہے۔ اس میں گیتا بھی ہے، قرآن بھی ہے، انجیل بھی ہے اور گرو گرنتھ صاحب بھی۔ اس زبان کی ساخت اور مزاج سیکولر ہے۔ اُردو کا شاعر و ادیب کبھی ماضی پرست اور احیاء پسند نہیں رہا۔ اس نے شریعت سے زیادہ طریقت کا ساتھ دیا ہے۔ تصوف اُردو شاعری کا محبوب موضوع رہا ہے۔ جدید خیالات و افکار کو ہندوستان میں روشناس کرانے میں اُردو نے بڑا قابلِ قدر حصہ لیا۔ راجہ رام موہن رائے کی اصلاحی کوششیں ہوں یا سرسید احمد کی، مولانا ابوالکلام آزاد کی شعلہ بیانی ہو یا عطاء اللہ شاہ بخاری کی آتش نوائی، چکبست کا ہوم رول کا نعرہ ہو یا جوش کا نعرۂ انقلاب، یہ سب اُردو کی دین ہے۔

اُردو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور یہیں پھل پھول رہی ہے۔ اس کا مستقبل بڑا روشن اور تابناک ہے۔

جواب طلب اُمور کے لئے مناسب سائز کا
لفافہ اور ڈاک ٹکٹ ضرور بھیجیں۔

فروغِ اُردو کمیٹی

(علی جواد زیدی سے انٹرویو)

زیدی صاحب : مرکزی حکومت نے اُردو کو فروغ دینے کے سلسلے میں ایک کمیٹی کی تشکیل کا فیصلہ کیوں کیا ؟

آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ حکومت کی یہ مسلّمہ پالیسی رہی ہے کہ آئینِ ہند میں مندرج ہر اہم زبان کو خاطر خواہ ترقی کے مواقع فراہم کئے جائیں اس سلسلے میں اردو کی ترقی و توسیع کے مسائل بھی برابر زیرِ غور آتے رہے ہیں۔ ریاستی اور مرکزی حکومتوں نے مختلف اقدامات کئے ہیں۔ لیکن زبانیں متحرک اکائیاں ہیں اور ان کے مسائل بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اُردو بولنے والے طول و عرض ملک میں پھیلے ہوئے ہیں ان کے کچھ مسئلے تو مشترک ہیں لیکن کچھ مقامی اور علاقائی بھی ہیں۔ ان تمام مسئلوں پر ابھی تک جامع طور سے نگاہ نہیں ڈالی گئی تاکہ مسئلے کے تمام پہلو ابھر کر سامنے آجائیں اور ان کی روشنی میں فیصلے کئے جا سکیں۔ ویسے ریاستوں کی لسانی تنظیم کے ساتھ مختلف علاقوں میں لسانی اقلیتوں کے جو مسائل ابھرے ہیں اُن پر غور و خوض کرنے کے لئے اور ترقیات کے ازالے کے لئے اقلیتی زبانوں کے مرکزی کمشنر کا ادارہ قائم کیا جا چکا ہے اور کمشنر کی سالانہ رپورٹ پارلیمنٹ میں بھی پیش کی جاتی ہے اور اس پر بڑا مدلل بحث و مباحثہ ہوتا ہے۔ ان میں اُردو کے مسائل بھی وقتاً فوقتاً زیرِ غور آتے رہتے ہیں۔ اس اعلیٰ اختیارات والی کمیٹی کے قیام سے موجودہ اور سابقہ اعداد و شمار اور حالات و کوائف کی روشنی میں پورا مسئلہ زیرِ غور آئے گا اور تعلیمی، صحافتی، ادبی اور انتظامی سطحوں میں فروغِ اُردو کے امکانات و اسباب پر عمیق نگاہ سے غور و خوض کر کے حکومت کے سامنے سفارشات کی جا سکیں گی۔ کمیٹی مشہور ادیبوں، تعلیمی ماہرین، صحافیوں کے علاوہ وزراء اور اعلیٰ حکام پر مشتمل ہے تاکہ ملک کے ارباب تعلیم و صحافت و ثقافت سے تبادلہ خیال کر کے جن نتائج پر پہنچے گی وہ یقیناً اُردو کے فروغ کے ضامن ہوں گے۔

کمیٹی کا طریق کار کیا ہے ؟

کمیٹی اول تو مختلف ریاستوں میں جا کر وزرائے اعلیٰ، متعلقہ افسران اُردو اداروں، ادیبوں، صحافیوں، ماہرینِ تعلیم، سیاسی لیڈروں اور عام لوگوں سے گفتگو کرتی ہے اور اُن کے خیالات و مطالبات معلوم کرتی ہے۔

ابھی تک یہ کمیٹی چھ جگہوں پر جا کر کوئی دو سو حضرات کو انٹرویو کر چکی ہے علاوہ اس کے کمیٹی نے رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے اشتہارات بھی شائع کئے، جن کے جواب میں اب تک کوئی دو سو شکایت نامے، میمورینڈم اور تجویزیں موصول ہو چکی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہم نے ریاستی حکومتوں اور تعلیمی اداروں سے متعلقہ اعداد و شمار بھی مانگے ہیں تاکہ اُردو کی ترقی و تنزل کا جائزہ لیا جا سکے۔ پھر لسانی اقلیتوں کے مرکزی کمشنر کی تا حال شائع شدہ بارہ رپورٹوں کا تجزیہ بھی کیا جا رہا ہے۔ ہم نے تعلیمی، ادبی، صحافتی اور انتظامی امور کے لئے چار سب کمیٹیاں بھی قائم کی ہیں۔ ان کمیٹیوں نے اپنے موضوعات سے متعلق مزید اشخاص کو انٹرویو کیا ہے۔ سب کمیٹیاں پہلے ابتدائی مواد تیار کریں گی جن پر پوری کمیٹی غور کرے گی صحافتی اور ادبی کمیٹیاں اپنے مسودات مکمل کر چکی ہیں۔ تعلیمی کمیٹی نے بھی ایک جزوی مسودہ تیار کر لیا ہے۔ اس ابتدائی مواد اور زبانی شہادتوں اور مطالبات کی روشنی میں کمیٹی اپنی رپورٹ اور سفارشات تیار کرے گی

کمیٹی کن مرکزوں کا دورہ کر چکی ہے اور کہاں کہاں جانے والی ہے ؟

ابھی تک کمیٹی کے ۲۰ اجلاس دہلی میں اور دیگر اجلاس بمبئی، حیدرآباد، سری نگر، اور لکھنؤ میں ہو چکے ہیں۔ ابھی پٹنہ، چنڈی گڑھ اور بھوپال جانے کا خیال ہے۔

ابھی تک کیا صورت حال واضح ہوئی ہے ؟

میں اس بارے میں ابھی تک کچھ کہنے کا مجاز نہیں۔

اس رپورٹ کا انجام کیا ہوگا ؟

آپ تو ابھی سے انجام کی باتیں کرنے لگے جبکہ کمیٹی کو ملک کے ہر گوشے سے مزید مطالبات موصول ہو رہے ہیں کہ ہم بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں اس لئے

رپورٹ تیار ہوگی رپورٹ میں واضح اور اہم سفارشیں ہوں گی چونکہ کمیٹی ذی اثر افراد پر مشتمل ہے۔ اور متعلقہ حکومتوں سے گفتگو کی جا چکی ہے اس لئے یہ توقع ہے کہ اس کی سفارشات پر تیزی سے عمل ہو سکے گا اور فروغِ اُردو کی نئی صورتیں نکل سکیں گی تاکہ یہ زبان دوسری اہم زبانوں کے شانہ بشانہ ترقی کر سکے۔

ترقی اُردو بورڈ

(پروفیسر محمد مجیب سے انٹرویو)

مجیب صاحب۔ ترقی اُردو بورڈ کیوں اور کب قائم کیا گیا؟

حکومت ہند ایک عرصہ سے غور کر رہی تھی کہ ملک کی مختلف زبانوں کو کس طرح ترقی دی جائے تاکہ وہ یونیورسٹی کی سطح پر ذریعہ تعلیم بن سکیں اور جدید علوم و فنون کی کتابیں علاقائی زبانوں میں دستیاب ہو سکیں۔ چنانچہ حکومت ہند نے ہر علاقائی زبان کی ترقی کے لئے ایک کروڑ کی رقم مخصوص کی۔ دیگر زبانوں کی ترقی کے لئے یہ روپیہ متعلقہ ریاستوں کو دیا گیا۔ پھر اُردو کا سوال اٹھا۔ حکومت جموں و کشمیر سے رجوع کیا گیا کیوں کہ اُردو وہاں کی سرکاری زبان ہے لیکن بعض دشواریوں کے پیش نظر حکومت جموں و کشمیر نے معذوری ظاہر کی لہٰذا ۲۳ اپریل ۱۹۶۹ء کو ڈاکٹر راؤ نے جو اس وقت وزیر تعلیم تھے، اُردو علاقوں کے دس چانسلروں، شعبۂ اُردو کے سربراہوں اور اُردو کے ممتاز افراد کی ایک میٹنگ بلائی۔ ان حضرات نے یہ مشورہ دیا کہ خود مرکز میں یہ ترقی اُردو بورڈ قائم کیا جائے۔

بورڈ کی سرگرمیاں کیا ہیں؟

یہ بورڈ پرائمری سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک کی کتابیں ترجمہ کرا رہا ہے یا کھوا رہا ہے اب تک مختلف علوم و فنون کی ۵۰۸ کتابیں مترجمین اور مصنفین کو دی جا چکی ہیں۔ ان میں نصابی کتابوں کے علاوہ ایسی کتابیں بھی شامل ہیں جو اُردو کے عام قاری کے لئے ہوں گی۔ بچوں کے لئے بھی بہت سی مفید اور معلوماتی کتابیں لکھیں یا ترجمہ کی جا رہی ہیں۔ ان کے علاوہ پانچ جلدوں میں ایک اُردو اُردو لغت اور ایک جامع انگریزی اُردو لغت بھی تیار کیا جائیگا۔ یہ کام انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ کے سپرد کیا گیا ہے اس کے علاوہ ایک ببلیوگرافی بھی تیار ہوگی۔ جس میں اردو کی تمام شائع شدہ کتابوں کا ذکر ہوگا۔ علاوہ ازیں ایک اُردو انسائیکلو پیڈیا تیار ہو رہا ہے۔ جو حیدرآباد کا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ تیار کرا رہا ہے

کیا لغت کے حروف مختلف صاحبوں کو بانٹ دیئے جائیں گے؟

یہ فیصلہ جنرل ایڈیٹر کرے گا۔ جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے۔ شروع سے کوئی ۲۶ پینل بنا دیئے گئے ہیں جو مختلف مضامین کے بارے میں یہ طے کرتے ہیں کہ کون کون سی کتابیں ترجمہ ہونی چاہئیں۔ مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ یہ پینل بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک لاکھ فنی اصطلاحوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ جن کے اُردو مبادل تیار کئے جا رہے ہیں۔ اب تک ۵ ہزار اصطلاحوں کو اردو کا جامہ پہنایا جا چکا ہے۔ امید ہے یہ کام ۱۹۷۴ء کے آخیر تک مکمل ہو جائے گا کیونکہ اصطلاحات وضع کرنے والی کمیٹیاں اپنا کام سرگرمی سے کر رہی ہیں۔

اب تک ۶ کتابیں تین بچوں کے لئے چھپوا اور خرگوش از ڈاکٹر ذاکر حسین، ہم سب کے باپو۔ سلطانہ آصف فیضی اور ہمارا جسم۔ محمد اکرام اور تین دیگر کتابیں تاریخ فلسفۂ اسلام۔ ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین۔ تاریخ تمدن ہند از پروفیسر محمد مجیب اور ہمارا قدیم سرمایہ از سخی حسن نقوی شائع ہو چکی ہیں۔ بارہ کتابیں پریس میں ہیں اور جلد ہی شائع ہو جائیں گی۔

معلوم ہوا ہے کہ بورڈ نے ان ترجموں کی اشاعت کا کام نیشنل بک ٹرسٹ کو دیدیا ہے۔ کیا مکتبہ جامعہ، مسلم یونیورسٹی پریس یا ایسا کوئی ادارہ انجام نہیں دے سکتا تھا؟

ہاں یہ سوال پہلے بھی اٹھا تھا۔ دراصل کام بہت بڑا ہے۔ لہٰذا یہ کام نہ صرف نیشنل بک ٹرسٹ بلکہ نیشنل کاؤنسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اور چلڈرنس بک ٹرسٹ کو بھی دیا گیا ہے۔ سرکاری طور پر براہ راست اشاعت میں کئی طرح کی دشواریاں تھیں۔ اس کے باوجود ہم دوسرے ناشروں سے رابطہ پیدا کر رہے ہیں اور ساتھ ہی موضوعات کی کمی کتابیں ٹائپ میں شائع کرانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ضروری اقدامات کئے جا رہے ہیں۔

کیا بورڈ کے سامنے کوئی ٹائم ٹیبل ہے کہ یہ کام کب تک ختم ہو جانے چاہئیں۔ میرا اشارہ انسائیکلو پیڈیا اور ڈکشنری کی طرف ہے۔

دیکھئے جہاں تک ترجموں کا تعلق ہے کسی حد تک ایک ٹائم ٹیبل رکھا جا سکتا ہے۔ اور رکھا گیا بھی ہے لیکن ڈکشنری اور انسائیکلو پیڈیا کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے یہ کام پانچ برسوں میں ختم ہو جائے ممکن ہے نہ ختم ہو سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم یہ ایک کروڑ روپے خرچ نہ کر سکیں کیونکہ جب تک کام سے تشفی نہ ہو روپیہ کیسے خرچ کیا جا سکتا ہے۔

کیا بورڈ کو اور حکومت ہند کو یہ یقین اور اعتماد ہے کہ مستقبل میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو کے طالب علم برابر داخل ہوتے رہیں گے۔ اور ان کتابوں کا فائدہ اٹھاتے رہیں گے؟

دراصل ہمیں اس سوال میں نہیں پڑنا چاہئے کیونکہ یہ تو اس قسم کی بحث ہوگی کہ پہلے طالب علم نہیں لہٰذا کتابیں کیوں لکھی جائیں اور چونکہ کتابیں نہیں لہٰذا طالب علم پڑھیں تو کیسے پڑھیں۔ ہمیں یقین ہے کہ مستقبل میں صرف اُردو کے طالب علم ہوں گے۔ بلکہ ان کے علاوہ اور بھی اُردو داں ہوں گے جو ان کتابوں کا فائدہ اٹھائیں گے۔ دراصل ان موضوعات پر اُردو میں کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اگر کتابیں ہوں گی تو ضرور اُن کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ مجھے یاد ہے کہ مکتبہ جامعہ نے اب سے بہت پہلے ڈاکٹر عابد حسین کی ایک کتاب "نفسیات نوعِ انسان" شائع کی تھی جو بہت شوق سے پڑھی گئی۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا اہم مقصد یہ ہے کہ اُردو داں طبقہ جدید علوم اور فنون سے واقف ہو۔ اُردو میں علمی کتابیں کمیاب ہیں اور اس وقت اُردو جاننے والے بڑی تعداد میں سارے ہندوستان میں موجود ہیں۔

کیا یہ کتابیں تمام تر تکنیکی موضوعات پر ہیں؟

نہیں، ان میں تاریخ و فلسفہ کی کتابیں بھی ہیں اور نفسیات اور اقتصادیات اور سائنس کی بھی۔ مجھے تو یہ بھی یقین ہے کہ اگر ہماری کتابیں اچھی ہوں گی تو ہندی داں طبقہ بھی ان کو پڑھے گا۔ کیونکہ اُردو اور ہندی بہت قریبی زبانیں ہیں، صرف رسم خط کا فرق ہے

ترقی اُردو بورڈ اور ایسے کام کرنے والے دوسرے اداروں کے درمیان کیا تعلقات ہوں گے مثلاً نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اکیڈمی

ساہتیہ اکیڈمی تو صرف ادبی کتابیں چھاپتی ہے اور نیشنل بک ٹرسٹ قومی اہمیت کی کتابیں۔ ہمارا میدان دوسرا ہے۔ پھر بھی یہ کوشش کی جائے گی جو کام ایک ادارہ کر رہا ہے یا کر چکا ہے، وہ دوسرا ادارہ نہ کرے۔

کیا ترقی اُردو بورڈ اور اُردو کمیٹی کے قیام کے پیش نظر آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ حکومت بہرحال اُردو کو اُس کا جائز مقام دلانے کی کوشش کر رہی ہے؟

مجھے حکومت سے شکایت نہیں۔ گلہ تو اپنوں سے ہے۔ اُردو داں طبقوں سے جو اُردو کی طرف سے غفلت برتتے رہے ہیں۔

••

اُردو مطبوعات کی نمائش

ترقی اُردو بورڈ، وزارت تعلیم، حکومت ہند کی طرف سے فروری ۱۹۷۳ء میں اُردو کی مطبوعات کی ایک نمائش کا انعقاد کیا جا رہا ہے۔ اس نمائش میں ایسی مطبوعات شامل کی جائیں گی جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد شائع ہوئی ہیں۔

مصنفین و ناشرین سے گزارش ہے کہ اپنی مطبوعات کی ایک ایک جلد مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال کریں۔ مرسلہ کتابیں نمائش کے بعد واپس کر دی جائیں گی۔ اگر کوئی کتاب واپس نہ ہو سکی تو اس کی قیمت ادا کر دی جائے گی۔

شہباز حسین

پرنسپل پبلی کیشنز آفیسر (اُردو) ترقی اُردو بورڈ
سنٹرل ہندی ڈائرکٹوریٹ (منسٹری آف ایجوکیشن)
ویسٹ بلاک ۷۔ راما کرشنا پورم۔ نئی دہلی ۲۲

DAVP 72/470

اقبال متین
۲۳-۲-۳۸۷ مغل پورہ
حیدرآباد (آندھرا پردیش)

مداری

اگر وہ مجھے پیچھے سے پکار لیتا — ابا
تو بھی کیا میں پل بھر کو اس کے لئے ٹھہر سکتا تھا؟
آنسو مٹی میں گرے کہ دامن میں جذب ہو۔ "پلکوں سے چھوٹنے کے بعد
نہ کنکر ہے نہ موتی۔"

کیسی کیسی راحتیں تج کر عمر کی کشتی میں ڈولتے ہم کتنی مسافتیں طے کر لیتے ہیں۔ نہ پلٹ کر دیکھنے کی فرصت ہے نہ یاد ہی کر لینے کا یارا۔

آج کوئی دامن پکڑ کر پوچھتا بھی تو نہیں جو شرم سے گردن جھک جائے اور کہتے سمے میں گردن اٹھا کر چلتا ہوں۔ سر افراز سربلند۔ لیکن سچ پوچھو تو ہم کہاں کہاں جا کر اس بیسوا زندگی سے مصالحت کر لیتے ہیں۔

راحت کی عمر ہوگی چودہ برس۔ بالی سی عمر گڑیاں کھیلنے کے دن۔ کچھ سوچے بغیر نیند کے آغوش میں اپنا آپا تج دینے کی راحتیں اور یہ لڑکی مجھے عمر کی اس منزل پر ملی جہاں ابھی ابھی میری مسیں بھیگی تھیں اور اس کے لئے درخت پر چڑھ کر کچے شہتوتوں سے اس کا دامن بھر دینا میرے لئے فخر کی بات ہوتا۔

اللہ یہ کچی کچی املیاں۔ راحت کا جی میرے ہوتے بھلا یوں ترس سکتا تھا۔

پتھر اٹھا کر درخت پر دے مارا اور لدی املیاں میں نے اس کے قدموں میں بکھیر دیں۔

اور ہم نے کتنی ہی کچر کچر چبا کر تھوک ڈالیں۔

برسات سے جل تھل ہوتے ہوئے میدان میں ایک دوسرے کو چھونے اور پکڑنے کے لئے بھاگنا اور پھر ایک دوسرے کی دسترس سے بچنے کے لئے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں اتر جانا — پانی کے چھینٹے اڑا کر کھیلنا اور پھر غور غور سے ایک دوسرے کے گیلے کپڑوں میں سے جھلکتے ہوئے بدن کو جھانکنا۔

پھر ہاتھ بڑھا کر اس کی لمبی لمبی گھنی سیاہ اور بھیگی زلفوں کو اپنے ہاتھ پر لپیٹ لینا۔

وہ گر رہی تھی اور جب میں نے اس کو پہلی بار سنبھالا تھا تو جسم کے کتنے ہی خطوط کتنے ہی زاویئے، کتنے ہی قوسیں میری آنکھوں میں بس کر رہ گئی تھیں۔

سنبھلنے کے لئے مجھ سے چمٹی ہوئی جب وہ کنارے تک پہنچی تو گویا وہ بھی بہت دور نکل آئی تھی۔ میں بھی بہت دور اسے لے آیا تھا اور اب میں اسے راحت کے بجائے رات پکارنے لگا تھا۔

اب میں اس کی گڑیوں کے گھروندوں تک جا پہنچا تھا۔ اس کی ان پٹاریوں تک جا پہنچا تھا جن میں جانے کیا الم غلم وہ سو سو جتن سے چھپائے رکھتی تھی۔

پھر جیسے سب کو چھوڑ کر اس نے گھروندوں میں . . . . مجھے بسا لیا۔ ان پٹاریوں میں مجھے چھپا لیا۔

کرکٹ کا بلا گھما کر جب میں نے گیند پر بہت زور سے ہٹ لگائی تو یہ گیند مٹی کے اس گھروندے کو توڑ کر نکل گئی مجبور راحت نے بڑے چاؤ سے بنایا تھا۔

لیکن اس نے کوئی پروا نہیں کی نہ ہی میرا دل دکھا۔

میں ڈر کر اس کے قریب گیا۔ گیند کو میں نے پرے پھینک دیا تو ہم دونوں مل کر دوسرا گھروندا بنانے میں منہمک ہو گئے۔

گھروندے بناتے بناتے، مجھے ان میں بساتے، پٹاریوں میں پہلے میرے تحفے پھر جیسے خود مجھے چھپاتے، میری چوری گیند کے پیچھے بھاگ بھاگ کر ہلکان ہوتے، جب وہ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں اتر گئی تو میں نے گرا کر سنبھالتے ہوئے کنارے پر لا کر اس سے پوچھا ایک بالکل نیا کھیل کھیلو گی۔

اور وہ شرمائی۔

پھر میں نے زیادہ چاؤ سے شہتوت اس کے دامن میں بکھیر دیئے۔

کچی کچی املیوں کی پونگیں اس کے منہ میں ٹھونسیں تو اس نے زیادہ مزے لے لے کر کچر کچر چبا ڈالیں۔ ہم نے یہ نیا کھیل جاری رکھا۔ اس کی آنکھوں کے راستہ میں اس کے دل میں اترتا گیا۔ پھر اس کے بدن ہی کا ایک حصہ ہو کر رہ گیا۔ کہتے ہیں حوا آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی تھی۔

اپنی چھوٹی سی عمر کے مختصر سی پونجی لے کر وہ جتنی تیزی سے میری زندگی میں

داخل ہوئی اتنی ہی تیزی سے اپنا سب کچھ مجھ پر نچھاور کر کے مجھ سے جدا بھی ہو گئی۔

جب وہ اپنا سب کچھ مجھ پر لٹا رہی تھی، اُس وقت نہ ہی میں نے جنم جنم کے لئے اس کا ہو رہنے کی قسمیں کھائیں، نہ اس کا ہاتھ تھام کر اس کو یقین دلایا کہ اب اسی طرح اس کے قدم بہ قدم زندگی کا سفر پورا کر لوں گا۔

ہمارے بنگلے کے پیچھے ایک عالیشان محل تھا جس کے احاطے میں ایک خوبصورت سا چمن تھا جو اپنی رعنائی آہستہ آہستہ کھو رہا تھا۔ اس محل کے ایک حصے میں راحت اور اس کی ماں رہتے تھے۔ بنگلے کا تین چوتھائی حصہ مقفل تھا احاطے کے باغ میں جو بیرونی کمرے بنے ہوئے تھے اُن میں ایک مالی ایک مالن اور اس کے بچے رہتے تھے۔ چمن کی دیکھ بھال اور راحت اور اس کی ماں کے احکام کی تعمیل ان کے ذمہ تھی۔ اُس کی ماں اسی بڑے گھرانے کی پروردہ تھی۔ گھر کی بیگم صاحبہ کو خوش کرنا — اپنی الٹی سیدھی باتوں سے ان کا دل بہلانا۔ اُداس ہوں تو ہنسانا۔ ہنس رہی ہوں تو قہقہے لگوانا۔ قہقہے لگا چکیں تو عمر بھر خوش رہنے کی دعائیں مانگنا۔ بس یہی کبھی اس کے فرائض تھے لیکن اب وہ بیگم صاحبہ رہ گئی تھیں، نہ ان کو ہنسانے کے جتن کرنے والے۔ راحت کی ماں بھی اپنی دی ہوئی دعاؤں میں تاثیر ڈھونڈتی رہ گئی اور آہستہ آہستہ جاگیریں ضبط ہو گئیں۔

راحت کی ماں نے بھی اچھے دن دیکھے تھے ان کے میاں صاحب کے مصاحب تھے اور یہ تھیں بیگم صاحبہ کی منہ چڑھی۔ راحت کے ابا کو اللہ کو پیارے ہوئے کوئی تین سال ہو گئے تھے۔ صاحب اور بیگم صاحبہ کے وہ دن نہ رہے تھے کہ انہیں خوش رہنے کی دعائیں دی جا سکتیں۔

راحت کی ماں کو ماہ بماہ پنشن برابر ملتی تھی۔ جاگیرات کی ضبطی کے بعد حکومت نے ان وظائف کو یک لخت مسدود نہیں کیا تھا جو پہلے ہی سے منظور تھے سو انہیں ماہ بماہ پنشن مل جاتی۔ اس کے علاوہ ضلع بھر میں راحت ہیر آئیل بہت مرغوب ہو گیا تھا۔ راحت کی ماں نے اپنی لاڈلی ہی کے نام سے جب یہ چھوٹا سا کاروبار شروع کیا تو اسے کافی منافع ہوا۔ اور واقعی ضلع بھر میں راحت ہیر آئیل گھر گھر میں تھا۔ ہمارے گھر نہ صرف امی وہی لگاتی تھیں بلکہ تحفے کے طور پر ہمارے چند رشتہ داروں کو جب انہوں نے شیشیاں شہر بھجوائیں تو پھر ہر ماہ بھجوانے کا انتظام بھی انہیں کرنا پڑا۔

راحت کی ماں کہتی تھیں کہ شیشیوں کے لیبل پر جس لڑکی کی تصویر ہے، وہ راحت ہی کی ہے۔

یہ دعویٰ نہ کبھی میری سمجھ میں آیا، نہ ہی میں نے کبھی اس کو سمجھنے کی کوشش کی۔

ہیر آئیل کی تصویر میں اگر کوئی چیز راحت سے مشابہہ تھی تو بس وہی لمبی لمبی زلفیں تھیں۔ چہرہ تو بالکل جدا تھا۔ اچھی خاصی بھرپور عورت کا لیکن مجھے ان تصویروں سے بھلا لینا دینا ہی کیا تھا۔ میں تو راحت کی ان لمبی لمبی گھنی زلفوں میں منہ چھپا کر جو راحت ہیر آئیل سے معطر رہتیں، اس سے کہا کرتا

"تم خدا کے لئے یہ تیل مت لگایا کرو رات۔ تمہاری زلفوں میں جب منہ چھپاتا ہوں تو تمہارا یہ تیل میرے گالوں پر میرے سارے چہرے پر لگ جاتا ہے۔ سوچو تو بھلا اگر میرے چہرے پر یہ لمبے لمبے بال اُگ آئیں — پھر تو تم ہی ڈر کر میرے قریب نہیں آؤ گی تب میں کیسا اکیلا اکیلا پھروں گا — بن رات کا چندا کہیں بھایا ہے" اور اس کی زلفوں میں منہ چھپا کر میں بچھ بن بن کر اسے ڈراتا۔ گدگداتا اور وہ اپنے لمبے لمبے بالوں سے میرے دونوں ہاتھ ملا کر انہیں زنجیر کر دیتی۔

کیسے کیسے کھیل اس مختصر مدت میں ہم نے رچا ڈالے۔ اپنا دامن پھیلائے وہ میرے ساتھ ساتھ چلتی رہی اور میں نے بغیچے کے سب ہی شاداب اور رنگین پھول توڑ ڈالے اور اس کا دامن بھر دیا۔ ان پھولوں کا اس نے جب ہار بنا کر مجھے پہنانا چاہا تو میں نے جھپٹ کر اس سے ہار چھین لیا اور اس کی لمبی سیاہ راتوں جیسی زلفوں میں گوندکر جیسے ستارے ٹانک دیئے۔

پھر انہی سیاہ راتوں میں چھپ چھپ کر انہیں ستاروں کی چھاؤں میں میں کتنی ہی بار اس کا ہو ہو گیا اور وہ میری — ایک دن اس نے سر جھکا کر مجھ سے کہا۔

"مجھے اُبکائیاں سی آتی ہیں۔ میرا جی اوبتا رہتا ہے۔ مجھے وہ کچی املیاں توڑ دو نا۔" اس سے پہلے کہ میں پتھر لے کر لدے ہوئے املی کے درخت پر دے مارتا۔ میں نے راحت کا کرتا اٹھا کر اس کے پیٹ کو سہلایا۔ پھر جھک کر چٹا چٹ پیٹ کو چومنے لگا۔

اس نے حیران ہو کر پوچھا — "یہ کیا کرتے ہو؟"

میں نے خوشی خوشی اس کی آنکھوں میں اترتے ہوئے کہا "اس میں میرا بچہ ہے پگلی۔"

اس کی آنکھیں پل بھر کو جگنوؤں کی طرح چمک اٹھیں۔ پھر صرف اس کی زلفوں کی سیاہ رات رہ گئی اور آنکھوں کے جگنوں جانے کہاں جا بسے۔

میں ابھی خوش ہی تھا کہ وہ اس قدر اُداس ہو گئی۔

میرے سینے پر سر رکھ کر جب وہ سسکنے لگی تو سسکتے سسکتے اس نے پوچھا — "اب کیا ہو گا"

اور میں سوچنے لگا واقعی اب کیا ہو گا۔ میں تو اس قدر خوش ہو رہا تھا راحت کی آنکھوں میں بھی جگنو چمک اٹھے تھے۔ لیکن شاید یہ کوئی خوش ہونے کی بات ہی نہ تھی۔

میں نے اس کو دلاسا دیا۔ جھوٹ موٹ تسلیاں دیں۔ بہلایا منایا اور جب وہ کچھ مسکرا سکی تو اس کو گدگدا کر ہنسایا اور اپنی محبتیں جھوم جھوم کر

اس پر نچھاور کیں۔

میں سمجھ گیا تھا کہ میں اور راحت اب کچھ اور دنوں تک ایک دوسرے کے نشے میں چور نہ رہ سکیں گے۔ اب نہ میں اس کا دامن شہوت سے بھر سکوں گا نہ چمن کے شاداب پھولوں سے اب نہ ڈھیر سی املیاں اس کے حکم پر مجھے توڑ لانا ہے نہ وہ اب میری بانہوں میں جھومتی ہوئی انہیں کچر کچر چبا کر تھوکتی رہے گی۔

پانی برسا کرے گا، میدان میں جل تھل ہوں گے۔ سوکھے ڈبرے پھر سے بھر جائیں گے۔ سرپالی دور دور تک مخمل کی طرح بچھی رہے گی۔ بنولیاں پکیں گی۔ خالی جھولا اس گھنے نیم کے پیڑ پر ہوا سے ہلکورے کھاتا رہ جائے گا۔ مینڈک سرشام ٹرٹر کرنے لگیں گے۔ میں اکیلا گھر سے نکلوں گا تو راحت قدم قدم پر راستہ روکے گی۔ ہنستی دوڑتی۔ اچھلتی بھاگتی مجھ سے چمٹتی میری بانہوں میں جھولتی۔ میرے دونوں ہاتھوں کو اپنی زلفوں سے زنجیر کرتی، قہقہے لگاتی۔ پھر وہ ایک دم ٹھٹک کر رک جائے گی۔ پھر اس کی آنکھوں میں جگنو دم بھر کو بھٹکیں گے۔ پھر وہ گردن جھکا کر اداس ہو جائے گی۔ پھر وہ سسکنے لگے گی۔ میں اپنے تصورات کی دنیا میں اس کو کب تک اٹھائے اٹھائے پھروں گا۔ ایک دن، دو دن پھر میں بھی شہر چلا جاؤں گا۔

دو دن گزر گئے، راحت نہیں آئی۔ جب میں سرشام اپنے مخصوص راستوں سے ہو کر اس کے گھر پہنچا تو اس کے باغیچے کے پھول رو رہے تھے۔ کانٹے ہنس رہے تھے۔ عمارت کے اس حصے میں جہاں وہ رہتی تھی، مالن دیا جلا کر رکھ رہی تھی۔ مالی نے مجھے بتایا راحت بی بی بہت بیمار ہو گئی تھی۔ اس کی ماں بہت پریشان تھی اس کو علاج کے لئے شہر لے گئے ہیں۔

میں لوٹنے لگا تو راحت جیسے کرتہ اٹھائے اپنا ننگا پیٹ میرے سامنے لئے کھڑی تھی۔

"اس کو چوموا اس میں تمہارا بچہ ہے۔"

راحت کی ماں امی کی بڑی چہیتی تھی۔ اس کی خوش طبعی، اس کے آداب و تمیز، اس کے رکھ رکھاؤ کی امی دلدادہ تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے امی سے کچھ نہ کچھ ضرور کہا ہوگا۔ میں نے کرید کرید کر امی سے پوچھنا چاہا۔ لیکن انہیں تو اس کا بھی علم نہ تھا کہ راحت اور اس کی ماں شہر چلے گئے ہیں۔ بمشکل آٹھ دن گزرے ہوں گے کہ راحت کی شادی کے دعوت نامے ہمیں ملے۔ امی نے ٹیلیگرام کے ذریعے راحت کی امی کو مبارکباد دی اور انہیں نیک تمنائیں بھیجیں۔

میں چپکے سے اس کے باغیچے میں پہونچ کر بہت سا وقت وہاں گزار آیا۔

کالج کھل گئے، تو میں بھی داخلہ لینے کے لئے شہر چلا گیا کیونکہ ہائی اسکول میں پاس کر چکا تھا۔

کچھ ہی دن بعد ابا کا تبادلہ اس ضلع سے ہو گیا اور اس طرح راحت سے ملنے، اسے دیکھنے، اس سے صرف ایک بار بات کر لینے کی تمنا بھی پوری نہ ہو سکی اور اس سے پہلے کہ یہ تمنا حسرت بن کر دل میں جاگزیں ہو جاتی، اپنی موت آپ مر گئی اور وہ بھی اس طرح کہ مجھے کچھ پتہ نہ چلا۔

میں رات کو بھول بھال گیا۔ عمر کی اس منزل میں جبکہ کالی راتیں جگمگاتے دنوں سے زیادہ پیاری ہوتی تھیں میں راحت کی سیاہ زلفوں میں اپنے ہاتھوں کو کب تک زنجیر رکھ سکتا تھا۔ کالج کے دن رات ہما ہمی، چہل پہل، گہما گہمی۔

ہاں ایک ننھی سی یاد تھی جو دل کے کسی تاریک گوشے میں چھپ کر سہمی سمٹی بیٹھ گئی تھی۔ لرزاں لرزاں، ہراساں ہراساں۔ سپیرے کی پٹاری میں چھپی ایسی ناگن کی مانند جس کا زہر چھین لیا گیا ہو۔ پھن کھول کر سر نکال لیتا تو آئے، پر دس کر تڑپانا اب میں نہیں۔

اور یہ بے ضرر ناگن کبھی کبھی اپنا پھن پٹاری سے باہر اس وقت نکال لیتی ہے جب میرے خاندان میں کسی کو پہلوٹھی کا بچہ ہوتا ہے۔ اور پھر خود ہی اپنا سر اندر کر کے چھپ رہتی ہے اور وقت اس پٹاری کا منہ پل بھر میں ڈھنک دیتا۔ راحت مجھے اس وقت بھی یاد نہیں آئی جب میں نے اپنی دلہن کا گھونگھٹ الٹا۔ میں تو پلکیں جھپکا کر جو دھوپ کی اس چاندنی کا ہو رہا تھا جو میرے اطراف پھیل گئی تھی۔

ایک دن جب میری بیوی نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ کر نیچی نیچی نظروں سے مجھے بتایا کہ جی اچھا نہیں ہے، وہ مضمحل مضمحل سی ہے۔ اسے ابکائیاں سی آتی ہیں۔ تو جھٹ کسی لڑکی نے کرتا پیٹ پر سے اٹھا کر مجھ سے کہا "اسے چوموا اس میں تمہارا بچہ ہے۔"

مجھے راحت سے جدا ہونے کے بعد پہلی بار ایسا محسوس ہوا کہ مداری کی پٹاری میں چھپی ہوئی بے ضرر ناگن کچھ اس طرح لہرا کر میرے سامنے آئی ہے کہ مجھے ڈس لے گی۔ پتہ نہیں کس نے اس کو اس کا زہر لوٹا دیا تھا۔

میں نے اپنی بیوی کے گال چوم لئے۔ اس کا پیٹ نہ چوم سکا۔

تب میں نے اس ناگن کا سر کچل دینا چاہا۔ لیکن وہ بہت تیزی سے اپنی پٹاری میں جا چھپی۔ جب میں نے پہلی بار اپنے ننھے کو چوما تو اس ناگن نے لہرا کر پھر ایک بار سر نکالنے کی کوشش کی لیکن میں نے پٹاری کا منہ مضبوطی سے بند کر دیا۔

پھر آہستہ آہستہ یہ ناگن مر گئی اور میں بھول گیا کہ کوئی خالی پٹاری میں نے اپنے دلمیں چھپا رکھی ہے۔

آج بھرے میلے میں جب میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ گھوم رہا تھا تو کسی عورت نے مجھے سلام کیا۔ کچھ ہی دور پر وہ کسی دکان پر کھڑی اپنے بچوں کو کھلونے دلا رہی تھی۔ میری بیوی کسی سہیلی سے جو اسے ابھی ابھی ملی تھی بڑی پیاری پیاری باتیں کرنے میں مگن تھی۔ آیا میرے بچوں کو

پاس ہی کی ایک دکان سے کھلونے دلا رہی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے پھر اس عورت کی طرف دیکھا جو مجھی کو دیکھ رہی تھی۔

کسی اضطراب کا اظہار کئے بغیر خراماں خراماں جب میں اس کے قریب پہنچا تو کوئی مانوس سا چہرہ اپنی چھب دکھلا کر سامنے آتے آتے چھپ گیا پھر کسی لڑکی نے اپنا دامن پھیلا کر آہستہ سے کہا اسے بچے پیار شہتوتوں سے بھر دو اور جب میں نے دامن بھر دیا تو اس نے سارے شہتوت میرے قدموں میں ڈال دیئے اور اپنی سیاہ لمبی رات جیسی زلفوں سے میرے دونوں ہاتھ ملا کر زنجیر کر لئے۔ "اوہ۔! راحت"

وہ میرے پہچان لینے سے خوش ہو گئی۔

"لیکن رات تمہاری زلفیں ۔" بے اختیار میری زبان سے نکلا

اس نے دھیرج سے کہا۔ "بے چاند کے کالی رات بھیانک لگتی تھی مجھے"۔ وہ راحت ہیرا ٹیل کے لیبل کی اس بھرپور عورت سے بہت مشابہ ہو گئی تھی جس کو کبھی اس کی ماں راحت ہی کی تصویر کہا کرتی تھی اور آج اس کی وہی سیاہ زلفیں نہ رہی تھیں جو اس تصویر سے کبھی اس کی وجہ مشابہت تھیں

میں نے حال احوال پوچھا۔

اس نے کوئی شکایت نہیں کی۔

پاس کھڑے ہوئے ساتھ آٹھ سالہ بچے کی باہیں بچے کو میرے مقابل کرتے ہوئے پوچھا۔ "اس کو پہچانتے ہیں آپ ؟"

البم میں محفوظ اپنے بچپن کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی جسے دیکھ کر میری بیوی نے کہا تھا "اس وقت بھی تم اتنے ہی شریر رہتے ہو گے جتنے آج ہو۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور بس اس کو دیکھتا رہ گیا۔ راحت نے پھر پوچھا۔ "نہیں پہچانا آپ نے ؟"

میں نے کہا "یہ تو میں ہوں رات"

تو اس نے نظریں جھکا لیں اور بچے کو جھکا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "انہیں سلام کرو۔ ننھا سا سر خم ہوا۔ ننھا سا ہاتھ پیشانی تک اٹھا۔ اور میں نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی

میری بیوی اپنی سہیلی سے رخصت ہو کر میرے پاس آ گئی تھی۔ میں نے راحت کا تعارف اس سے کرایا۔ "ابا کے زمانۂ ملازمت میں یہ اور ہم ایک ضلع پر تھے۔ امی میں اور ان کی والدہ میں بڑا بہنا پا تھا۔"

دونوں جانب سے ہاتھ اٹھے۔

میری نظریں خود ہی اس بچے پر اٹھتی رہیں۔

میری بیوی نے بھی جب اس کو دیکھا تو اس کی نظریں اسی کے چہرے پر جم کر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ اس نے بڑی خاص نظروں سے مجھ کو دیکھا۔ پھر بچے کو دیکھ کر قریب کرتے ہوئے کہنے لگی۔ "کتنا پیارا سا ہے"

میں نے اس کی باتوں سے بوکھلاتے ہوئے کہا "چلو چلیں اب۔"

جب ہم جدا ہونے لگے تو میں نے راحت پر بس اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال لی۔ اس سے نظریں چار نہ کر سکا اور نہ بچے ہی کو دیکھا۔

جب ہم آگے بڑھ گئے تو میں نے کسی نہ کسی بہانے پلٹ کر بچے کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ مجھے نظر نہ آیا۔ اور ایسے میں اگر وہ مجھے پیچھے سے پکار لیتا "آتا۔" تو بھی کیا میں پل بھر کو اس کے لئے ٹھہر سکتا تھا ؟

راحت کی آنکھیں لیکن میرے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں۔

میری بیوی نے کہا۔ وہ بچہ واقعی کتنا پیارا ہے۔ آپ کے بچپن کی وہ شریر سی تصویر ہے نا۔ ہو بہو اسی طرح۔"

"اچھا ؟" ۔۔۔ میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے غور نہیں کیا۔ تم نے وہیں بتایا ہوتا۔"

وہ ہنس پڑی۔ کہنے لگی "بھلا ایسی بات میں وہاں کیسے کہہ سکتی"

مجھے یوں لگا جیسے میری بیوی میرے دل میں چھپی ہوئی بند پٹاری کھول رہی ہے اور میں جھپٹ کر اس کا ہاتھ تھام رہا ہوں کہ اس میں ناگن ہے ڈس لے گی۔

لیکن پٹاری کھلی تو خالی تھی۔

اس میلے میں، اس چہل پہل میں، اس گہما گہمی میں کوئی بھی تو نہیں تھا جو میری خاموش پکار سنتا کہ میں خالی پٹاریوں کا مداری ہوں کوئی ہے جو میرا تماشا دیکھے۔

آئندہ شمارے کے چند متوقع مضامین

کارِ جہاں دراز ہے۔ قرۃ العین حیدر

غالبیات :۔ قاضی عبدالودود ۔ مالک رام ۔ محمد حسن ۔ اسلوب احمد انصاری ۔ خلیق انجم ۔ نظ۔ انصاری ۔ تارا چرن رستوگی ۔ نریش

مضامین :۔ مسعود حسن رضوی ادیب ۔
منشار الرحمٰن خاں منشا ۔
سمیع الحق ۔

فنانے :۔ رعنیہ سجاد ظہیر ۔ صالحہ عابد حسین ۔ اختر محی الدین

نظم و غزل :۔ حرمت الاکرام ۔ سعادت نظیر ۔ محمد عثمان عارف

نقش بندی ۔ اسماء سعیدی

محی الدین ہاشمی
گولڈن جبلی ریسرچ سینٹر
سیڈنہم کالج بمبئی - ۲۰

انقلابِ آزادی اور اُردو شعرار

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے اردو شاعری حسن و عشق، اخلاقیات ارسماجیات وغیرہ کے میدان میں خاصی ترقی کر چکی تھی۔ متقدمین میں ولی اور راج اور متوسطین میں میر، سودا، درد، نظیر اور ذوق جیسے مختلف اصناف ن کے بادشاہوں کا ظہور ہو چکا تھا۔ اگرچہ اس وقت تک چند شعراء نے سوخت، تشبیب، قصائد، ہجویات اور شہر آشوب میں حکمران وقت پر ماروں، کنایوں میں اور بعض اوقات کھلم کھلا بھی تنقید کی تھی لیکن بالعموم اردو عری ہنوز سیاست سے بے بہرہ تھی۔ چند شعراء ایسے تھے جنہیں اٹھارویں ری کے ثلث آخری میں انگریزوں کی بدنیتی کا اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ یہ ھ چکے تھے کہ ملکی حکمراں اب کٹھ پتلی بن کر رہ گئے ہیں اور انگریزوں مکمل اجارہ داری ہندوستان کی معیشت کے ساتھ ساتھ سیاست پر ی قائم ہو چکی ہے۔ ذیل کے اشعار سے ان باتوں کی تصدیق ہوتی ہے ؎

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی
(مصحفی)

اسی سے سمجھو رہا سلطنت میں کیا رتبا
ہو جبکہ محل سراؤں میں گوروں کا پہرا
نہ شاہ ہے نہ وزیر، اب فرنگی ہیں مختار
(فخر آشوب۔ شاہ کمال الدین کمال)

جنگ آزادی سیاست کے ساتھ ساتھ اردو شاعری میں بھی انقلا کا باعث ہوئی۔ ذیل میں چند شعراء کی کاوشوں کا علی الترتیب کیا جا رہا ہے تاکہ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے جبر و تسلط اور ہندوستانیوں کی ان کے خلاف بڑھتی ہوئی نفرت کا بھی اندازہ ہو سکے۔

واجد علی شاہ اختر تو اب اودھ لکھنؤ سے نکالے جانے پر فرماتے ہیں:

شب اندوہ میں رو رو کے بسر کرتے ہیں
دن کو کس رنج و تردد میں بسر کرتے ہیں
نالہ و آہ غرض آٹھ پہر کرتے ہیں
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

گردشِ چرخ نے یہ بات بھی سنوائی ہے
اپنے مالک کو یہ نوکر کہے سودائی ہے
اب تو درپیش ہمیں بادیہ پیمائی ہے
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

خاک سے پاک کیا جس کو وہی ہے دشمن
بعد مُردن نہ ملے اُس کو خدا چاہے کفن
اسی مردود کے باعث سے چھٹا اپنا وطن
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

سارے اب شہر سے ہوتا ہے یہ اختر رخصت
آگے بس اب نہیں کہنے کی ہے مجھ کو فرصت
ہو نہ برباد مرے ملک کی یارب خلقت
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

اس کے بعد مثنوی حزن اختر میں انھوں نے قید و بند کی تمام تفصیلات کا ذکر کیا ہے۔ درجہ سوم کے انگریزی عہدہ داروں کی بداخلاقیاں اور بد زبانیاں بھی اس مثنوی میں مرقوم ہیں۔

بہادر شاہ ظفر نے اپنی مشہور نظم 'بیان درد' میں دلی کی خستہ حالی کا تذکرہ کیا ہے ؎

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے
یہ رعایا ہند تبہ ہوئی، کہوں کیا کیا ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے
سبھی جا وہ ماتم سخت ہے، کہوں کیسی گردشِ سخت ہے
نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہے، نہ وہ شاہ ہے نہ دیار ہے

اس عہد سرسید، محمد حسین آزاد اور حالی کا دور آتا ہے جس میں اول الذکر دونوں اشخاص نے عموماً تمام اہل ہند کو اور حالی نے بالخصوص مسلمانوں کو جگانے کی کوشش کی۔ آزاد نے نظم کو اور سرسید نے نثر کو اس مقصد کے لئے اپنایا۔ ساتھ ہی ساتھ ان دونوں نے اتحاد ملت کو بڑی اہمیت دی۔ ان کا خیال تھا اور صحیح خیال تھا کہ حب وطن میں کسی بھی مذہب کا پیرو دوسرے مذہب کے پیرو سے پیچھے نہ تھا۔ اگرچہ حالی و آزاد دونوں ہی سرکاری خطاب یافتہ یعنی شمس العلماء تھے لیکن حب وطن ان کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا۔ گو انگریزوں کی Divide And Rule کی پالیسی سے حالی بھی قدرے متاثر ہو گئے تھے لیکن آزاد کا حب وطن مذہب اور جغرافیائی حدود کا پابند نہ تھا۔ آزاد کی یہ تلقین تھی کہ وطن کی خاطر اپنی جان کو بھی بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ غالباً یہ شدید جذبہ ان کو ورثے میں ملا تھا۔ کیونکہ ان کے والد مولوی محمد باقر کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے کے جرم میں گولی مار دی گئی تھی۔

۹ مئی ۱۸۵۷ء کو ہندوستانی سپاہیوں نے سب سے پہلے میرٹھ میں بغاوت کی اور یہی جنگ آزادی کی ابتدا تھی۔ جیسے ہی میرٹھ میں غدر کی خبر پھیلی، پورے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف آگ بھڑک اٹھی۔ خوش بختی کی بات یہ تھی کہ اس وقت ہندوستان میں مکمل فرقہ وارانہ یکجہتی پائی جاتی تھی۔ غالباً اس کا سبب یہ تھا کہ تمام ہندوستانیوں کے پاس سب سے اہم مسئلہ انگریزوں سے نجات حاصل کرنا تھا۔ ہندوستانی ہر انگریز کو اپنا دشمن اور ہر ہندوستانی کو برادر عزیز سمجھتے تھے۔

فیض آباد میں جب مولوی احمد اللہ شاہ کو گرفتار کر کے سولی پر چڑھانے کے لئے لیجانے لگے تو صوبہ دار دلیپ سنگھ نے تمام انگریزی افسروں کو قید کر کے نہ صرف احمد اللہ شاہ کو آزاد کیا بلکہ فیض آباد کی بھی آزادی کا اعلان کر دیا۔

محمد حسین آزاد نے دلی اخبار میں اپنی مشہور نظم "فتح افواج مشرق" شائع کروادی۔ اس کے چند چیدہ اشعار اس طرح ہیں۔

ہے کل کا ابھی ذکر کہ جو قوم نصاریٰ
تھی صاحب اقبال و جہاں بخش و جہاندار
کام آئے نہ علم و ہنر و حکمت و خطرت
پورب کے تلنگوں نے لیا سب کو دبا مار
حکام نصاریٰ کا بدیں دانش و بینش
مٹ جائے نشان خلق میں اس طرح سے یکبار

آزاد نے "حب وطن" میں مختلف ممالک کی مثالیں دے کر یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ وطن کی محبت کا جذبہ نہایت ہی اعلیٰ ہے۔ اس کے آخری حصے میں انہوں نے خود انگریزوں کی مثال دی ہے کہ ایک انگریز کی حب الوطنی نے ہی تمام ہندوستان کو ان کا غلام بنا دیا۔ آخر میں انہوں نے حب الوطن کے فوائد بھی بیان کئے ہیں ؎

اے آفتاب حب وطن! تو کدھر ہے آج
تو ہے کدھر کہ کچھ نہیں آتا نظر ہے آج
تجھ بن سب اہل درد ہیں دل مردہ ہو رہے
اور دل کے شوق سینوں میں افسردہ ہو رہے
حب وطن کی مہر کا ہے قحط سال کیوں
حیران ہوں آج کل ہے پڑا اس کا کال کیوں
بن تیرے ملک ہند کے گھر بے چراغ ہیں
جلتے عوض چراغوں کے سینوں میں داغ ہیں
کب تک شب سیاہ میں عالم تباہ ہو
اے آفتاب! ادھر بھی کرم کی نگاہ ہو
تا ہو وطن میں اپنے زر و مال کا وفور
اور ملکت میں دولت و اقبال کا وفور

غالب نے بھی "گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا" لکھا۔ لیکن کوئی خاص پیغام عمل پیش نہیں کیا۔

داغ نے بھی غدر دہلی اور شہر آشوب لکھا ہے، یہ دونوں نظمیں یا مرثیے زبان و ادب کے شہ پارے ہیں لیکن ان میں بھی کوئی پیغام عمل نہیں پایا جاتا

میر! غدر میں جن رہنمایان ملت کو گرفتار کر کے قتل یا حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی تھی ان میں اثر صہبائی اور میر شکوہ آبادی کے نام بھی شامل ہیں۔ ویسے تو میر ایک قصیدہ گو شاعر تھے اور ان کی تمام نظمیں اور غزلیں قصیدوں کی طرح طویل ہوا کرتی تھیں لیکن مصائب و آلام نے ان کے اشعار میں بے انتہا کرب پیدا کر دیا ہے۔ میر کا دیوان نایاب ہے لیکن ایک نسخہ رام پور ٹرسٹ لائبریری میں محفوظ رہ گیا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

نکل کر ہند سے آنا ہوا جب اس جزیرے میں
اسیروں کی سیہ بختی سے کالا ہو گیا پانی
پڑے ہیں ٹھوکروں میں کاسۂ سر بادشاہوں کے
الٰہی روئے کس کا سر پکڑ کر تاج سلطانی
(فریاد زندانی)

کالے پانی سے ہونے ہیں رخصت ؛ اشک شادی ہیں آنکھوں سے جاری
ہے ارادہ کہ فکر شعر کریں ؛ تاکہ ہو دور رنج بے کاری
بسکہ بہوں رہا ہوں زنداں میں ؛ بھولی قصر سخن کی معماری

ذیل میں چند ایسے شعراء کے منتخب اشعار پیش کئے جا رہے ہیں جو نسبتاً غیر معروف ہیں لیکن ان میں سے ہر شاعر نے اپنی حد تک کوشش کی ہے کہ قوم کو اس وقت کے ابتر حالات سے آگاہ کرے اور اتحاد ملت اور بہتر اقدامات کی دعوت دے۔ زبان دانی یا شعریت کے اعتبار سے اس مضمون میں مندرج اشعار اساتذۂ فن کے شاہکاروں کے مقابلے میں پیش نہیں کئے جا سکتے لیکن معنویت مطالب، انداز فکر اور جرأت اظہار کے لحاظ سے یہ چیزیں قابل قدر ہیں۔ زمانہ امن میں امن کے گیت گانا یا حکمرانوں کی تعریف کرنا بہت آسان ہے۔ لیکن مقتدر حاکم کے سامنے اس کے ظلم کے خلاف آواز اٹھانا نہایت ہی جرأت مندانہ کارنامہ ہے۔ شعرائے اردو قابل صد ہزار داد و تحسین ہیں کہ ظلم کے خلاف اپنا نعرہ بلند کرنے میں وہ کبھی کسی سے پیچھے نہ رہے:

ہر ایک شہر کا پیر اور جوان قتل ہوا
ہر اک قبیلہ و ہر خاندان قتل ہوا
ہر ایک اہل زباں خوش بیان قتل ہوا
غرض خلاصہ یہ ہے اک جہان قتل ہوا

گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں
(ہنگامۂ دار و گیر: مسدس ظہیر دہلوی)

حالی جدید شاعری کے اولین معماروں میں ہیں۔ وہ ایک اچھے نقاد اور اعلیٰ شاعر اور معلم الاخلاق تھے۔ سرسید کے ساتھ نے ان کے دل میں بھی قومی درد کو ابھارا۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ حب وطن اور قوم کی دیرینہ عظمت کا مظہر ہے۔

اے وطن! اے مرے بہشت بریں:
کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا
وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
کیا زمانے کو تو عزیز نہیں
اے وطن تو تو ایسی چیز نہیں
(حالی۔ مثنوی حب وطن)

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

لیکے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں ایسا کھرا دانہ ہرگز
(دہلیٔ مرحوم — حالی)

حالی کا زمانہ باغیانہ شاعری کا دور تھا۔ حالی کے ہم عصر اور ہم خیال شعراء میں اسمٰعیل میرٹھی اور اکبر الہ آبادی تھے۔ جو حالی ہی کی طرح ملازم سرکار تھے۔ ان کے علاوہ شبلی نعمانی بھی تھے جنہوں نے ملازمت ترک دی تھی۔ یہ تمام شعراء ایک دوسرے سے متاثر تھے۔ ان شعراء کی دلیری و جرأت اس لئے بھی قابل ذکر ہے کہ یہ حضرات کسی نہ کسی اعتبار سے ملازمت سرکار سے منسلک تھے۔

اسمٰعیل میرٹھی اور حالی قدرے نرم خو تھے لیکن حب وطن اور مخالفت انگریز میں وہ دوسروں سے کم نہ تھے۔ انہوں نے "انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی" کا تقابل کیا اور "اتحاد" کی اہمیت بتائی۔ انہوں نے ایک ایسے زمانے کا یقینی تصور پیش کیا جس میں حالات از سر نو بہتر ہوں گے۔ یہ لوگ اگرچہ سرکار سے منسلک تھے لیکن ان کے ذہن آزاد تھے۔ انہوں نے ملک و ملت کو کورانہ انگریز پرستی کے خطرناک نتائج سے بھی آگاہ کیا تھا۔

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر ؛ تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر
جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی بے ضرر ہو ؛ بھلا اس محل سے جہاں کچھ خطر ہو
(آزادی غنیمت ہے — اسمٰعیل میرٹھی)

علامہ شبلی ایک مشہور عالم، مصنف اور شاعر تھے۔ انہوں نے مختلف ممالک کی سیر بھی کی تھی۔ دیگر ممالک کی سیاست و حکومت سے وہ خوب واقف تھے۔ علامہ شبلی آزادی سے کم کسی بھی تجویز کو انگریزوں کی ایک نئی چال سمجھتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے مسلم لیگ، ہوم رول، سلف گورنمنٹ غرض ہر نئی تجویز کا مضحکہ اڑایا ہے۔ علامہ شبلی کا مطمح نظر محض یہ تھا کہ انگریزوں کی غلامی سے مکمل نجات حاصل ہو:

ہے جنوں خیز یہ ہنگامۂ عبرت کیسا ؛ قوم کا حال ہے غفلت کی بدولت کیسا
ہے عجب سیر اگر دیدۂ بینا دیکھے ؛ دیکھنا ہو جسے عبرت کا تماشا دیکھے

غوں غاں ہے کچھ مباحث ملکی نہیں ہیں یہ
اک طفل ہے سیاست ہندوستاں ابھی

علامہ شبلی نے ایک تمثیلی نظم "پہلی جنگ عظیم اور ہندوستانی" لکھی ہے جس میں اختصار، حسن بیان اور سادگی کے علاوہ عبرت آمیز درس بھی ہے۔ اس نظم میں ایک جرمن ایک ہندوستانی سے کہتا ہے کہ اگرچہ برطانیہ

فوج دس لاکھ ہے لیکن ہمارے لئے فرانس اور برطانیہ کو فتح کرنا دشوار نہیں ہے اس کے جواب میں ہندوستانی کہتا ہے کہ تعداد کے اعتبار سے ہم ہندوستانی کروڑوں ہیں اس لئے ناقابلِ شکست ہیں۔ اس تعلّی پر اس جرمن کا جواب علامہ شبلی کی زبانی سنیئے۔

سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور ؛ پھر وہ کہا جو لائقِ اظہار بھی نہیں
اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا ؛ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

درگا سہائے سرورؔ جہاں آبادی کا کلام غالبؔ و اقبالؔ کے کلام سے متاثر ہے۔ غالبؔ کا اثر ان کی عشقیہ شاعری پر اور اقبالؔ کا اثر ان کی سیاسی نظموں پر واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ سرورؔ انگریزی ادب سے بھی خاصی واقفیت رکھتے تھے اسی لئے ان کی قومی و وطنی نظموں میں انگریزی تقلید کا اثر نمایاں ہے۔ سرورؔ کی دو نظموں "عروسِ حبِّ وطن" اور "گلزارِ وطن" میں حسنِ بیان کے ساتھ ساتھ جذبات کی شدت بھی پائی جاتی ہے۔

تقسیم بنگال کے بارے میں فرماتے ہیں۔

کرزن بیداد خو، اہلِ پولس، حکامِ وقت
تو ہوا اف اف نہ کس کس کی جفاؤں کا شکار
کرکے دو ٹکڑے کلیجے کے ترے یہ آہ کون
چلدیا تجھ کو تڑپتا چھوڑ کر بیگانہ وار
آہ اے بنگال! آلام و مصائب کے شکار
آہ اے کرزن کی پالیسی کے صید بے قرار

اکبرالہ آبادی شاعر بھی تھے اور ایک عظیم مصلح قوم بھی۔ حکومتِ انگریزی کے ایک اعلیٰ عہدے پر رہنے کے باوجود انہیں حکومت و انگریز دونوں سے ہی شدید نفرت رہی۔ قوم کی خستہ حالی اور عمومی پستی کو دیکھ کر اکبرؔ محض اس کے ماتم پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ لائحہ عمل بھی پیش کرتے ہیں چونکہ وہ وقت ایسا تھا کہ قوم کی عقلیں ماؤف ہوچکی تھیں۔ اسی لئے اکبرؔ نے اصلاحِ اُمت کے لئے طنزیہ یا مزاحیہ انداز اختیار کیا۔ حالات کے مناسبت سے ان کا یہ طریقۂ کار نہایت ہی کامیاب تھا:

بہت ہی عمدہ ہے اے ہمنشیں برٹش راج
کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہے
جو چاہے کھول دے دروازۂ عدالت کو
کہ تیل بیچ میں ہے ڈھیلی اس کی چول بھی ہے
چمک دمک کی وہ چیزیں ہیں ہر طرف پھیلی
کہ محو دید ہے خاطر اگر ملول بھی ہے

جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبرؔ
تو ہرج کیا ہے جو ساتھ اس کے ڈیم فول بھی ہے

مولانا حسرت موہانی ماضی قریب کے کہنہ مشق شاعروں میں سے تھے آپ کا تعلق برسوں کانگریس سے رہا۔ انگریزوں نے انہیں حبسِ دوام کی سزا دے کر انڈمان بھیج دیا تھا۔ ان کا شمار آزادی کے معماروں میں ہوتا ہے۔ انگریزوں سے انہیں سخت نفرت تھی۔ مولانا کو انڈمان میں چکی پیسنے کی کڑی سزا دی گئی تھی۔ اتنی تکالیف کے باوجود مولانا نے اپنے حالاتِ زندگی کو بڑے ہی دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی
جو چاہے سزا دے لو تم اور بھی کھل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو، کی ہو جو شکایت بھی
اے شوق کی بیباکی وہ کیا تری خواہش تھی
جس پر انہیں غصہ ہے انکار بھی حیرت بھی
ہر چند ہے دل شیدا حریتِ کامل کا
منظور دعا لیکن ہے قید محبت بھی

رسم وفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے
حبِ وطن محوِ خواب دیکھئے کب تک رہے
تا بہ کجا ہو دراز سلسلہ ہائے فریب
ضبط کی لوگوں میں تاب، دیکھئے کب تک رہے
پردۂ اصلاح میں کوشش تخریب کا
خلقِ خدا پر عذاب، دیکھئے کب تک رہے
دولتِ ہندوستاں قبضۂ اغیار میں
بے عدد و بے حساب، دیکھئے کب تک رہے
حسرتِ آزاد پر جورِ غلامانِ وقت
از رہِ بغض و عتاب، دیکھئے کب تک رہے

پنڈت برج نرائن چکبست نے سوز و گداز، حریت اور وطن کی محبت کے مضامین بڑے ہی حسین انداز میں بیان کئے ہیں۔ چکبست کو قومی شاعر بھی کہا جاتا ہے بیسویں صدی کے اوائل میں ان کی ملاقات دادا بھائی نوروجی اور گوپال کرشن گوکھلے سے ہوئی۔ اس وقت قومی تحریک عام ہوچکی تھی چکبست بھی اس تحریک سے متاثر تھے۔ اور ان کی مشہور نظم "خاک ہند" کا ہر بند حبِّ وطن سے معمور ہے:

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جبیں سے نور حسن ازل عیاں ہے
الفدرے زیب و زینت کیا اوج و شاں ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

اے صور حب قومی اس خواب سے جگا دے
بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے
اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

حب وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

چکبست نے ایک اور نظم ہوم رول کی مانگ اور اس کی حمایت میں بھی لکھی ہے اس مسدس کے بند اس بیت پر ختم ہوتے ہیں۔

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

مولانا ظفر علی خاں قومی شاعری کے دوسرے برج مستحکم تھے مولانا جوش و خروش، طنز و حاضر جوابی اور ولولہ انگیزی میں چکبست سے بہت آگے تھے۔ چکبست نے پچھلی تاریخ یاد دلا کر قوم کو ابھارنے کی کوشش کی اور مولانا نے حال کے واقعات کو سامنے رکھ کر قوم کو اپنا چولا بدلنے پر مجبور کیا۔ حسرت کی طرح ظفر علی خاں کو بھی جرم سیاست میں قید فرنگ برداشت کرنی پڑی۔ پنجاب کے مارشل لاء کا مولانا نے اس طرح تذکرہ کیا ہے۔

حلومت جن دنوں پنجاب میں تھی مارشل لاء کی
تو قابل دید کے تھی اوڈوائر کی غضب ناکی
ہمارے بازوؤں کی دھجیاں اڑتی تھیں گردوں پر
ہمارے ٹانگ کے قصے خبر لاتے تھے جوزا کی
یہ صورت تھی ہماری خواہ ہندو خواہ مسلم تھے
یہ حالت تھی جناب جارج پنجم کی رعایا کی

"پٹیل کا پیغام" جذبات سے پر ایک نظم ہے جس میں گاندھی جی کو بھی خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔

بجھائی جاتی ہے گاندھی کی لگائی ہوئی آگ
کوئی اردن سے یہ کہدو کہ نہ اس آگ سے کھیل

ڈیڑھ سو سال سے انگریز حکمراں رہا
اب ہم اس اونٹ کی خود ہاتھ میں تھامیں گے نکیل

"انقلاب ہند" نامی ایک دوسری نظم کا تو ہر شعر منتخب معلوم ہوتا ہے:

کر رہا ہے قصر آزادی کی بنیاد استوار
فطرت طفل و زن پیر و جواں کا انقلاب
صبر والے چھا رہے ہیں جبر کی تعلیم پر
ہو گیا فرسودہ شمشیر و سناں کا انقلاب

تلوک چند محروم نے چکبست کی "خاک ہند" پر تضمین لکھی، جلیان والا باغ کے حادثے سے متاثر ہو کر "شکوہ صیاد" لکھا اور ایک نظم "مقابلہ مت بھول، ظفر کے انداز میں لکھی ہے۔

یہ نہیں ہے شان وفا صنم، کہ کریں ہم جوش مقابلہ
تری سختیوں سے کریں گے ہم، بخدا نمو ش مقابلہ

ایک مخمس "پھول برساؤ شہیدان وطن کی خاک پر" بھی لکھا ہے۔ اس کا آخری بند اس طرح ہے۔

دیکھ لینا خون ناحق رنگ اک دن لائے گا
خود غرض ظالم کئے پر اپنے خود پچھتائے گا
راہ پر دور زماں آخر کبھی تو آئے گا
آسماں اس خاک کی تقدیر کو چمکائے گا

پھول برساؤ شہیدان وطن کی خاک پر

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اردو شاعری پر طاری شدہ یاسیت اور قنوطیت کو دور کر کے اردو شاعری کو حیات نو بخشی ہے۔ اقبال نہ صرف ایک شاعر تھے بلکہ ایک سیاسی مفکر، مبصر، ناقد، مصلح قوم اور بہت کچھ ..... سلطنت مغلیہ کے زوال تک اردو شاعری کی دنیا عشق و عاشقی تک محدود تھی۔ غدر کے بعد اردو شاعری محض ذریعۂ ماتم بن کر رہ گئی تھی علامہ اقبال وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ملت کو جھنجھوڑ کر اس کا ماضی یاد دلایا، پھر اس پر حال کو روشن کیا اس کے بعد بھی بیدار نہ ہونے والی قوموں کو ان کے بھیانک مستقبل سے آگاہ کیا اور بیدار ہو جانے والی قوموں کے لئے شاندار مستقبل کی نوید مسرت سنائی۔ اقبال اپنی قوم سے

بھی مایوس نہیں ہوئے۔ ان کے لئے محض وطن کی حدود میں بند ہونا ممکن تھا نہ مناسب۔ ان کی ابتدائی دور کی شاعری جو وطن پر مرکوز ہے وہ کسی بھی صف اول کی قومی شاعری سے کم نہیں۔ اس مختصر سے دور اول میں اقبال نے

جو زبان استعمال کی ہے وہ نہایت ہی شیریں و شگفتہ ہے۔
ترانۂ ہندی، بچوں کا گیت، ہمالہ، نیا شوالہ ان نظموں کا ہر شعر ملک و قوم کی محبت میں ڈوبا ہوا ہے

ان کے علاوہ 'تصویرِ درد'، 'جذبۂ حریت'، 'شعاعِ اُمید'، وغیرہا اقبال کی مشہور نظمیں ہیں جن میں انہوں نے ملت کو غنودگی سے بیدار کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے

دکھا دوں گا میں اے ہندوستاں رنگ و فا سب کو
کہ اپنی زندگی کو تجھ پہ قرباں کر کے چھوڑوں گا

اقبال نے "جلیاں والا باغ" پر بھی لکھا ہے گو اس میں چار ہی مصرعے ہیں۔ لیکن ہر مصرع خوب ہے

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ باغ
غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

مولانا محمد علی جوہر ہندوستان کی ان مایہ ناز ہستیوں میں سے ہیں جنہوں نے ہندوستان کی آزادی کی خاطر اپنی جان و مال کو قربان کر دیا مولانا ایک سیاسی لیڈر تھے۔ اسی لئے لازماً ان کی شاعری میں ہر جگہ سیاست کا رنگ جھلکتا ہے۔ مولانا کی ہستی پر ان کا وطن، اور ان کی قوم قیامت تک فخر کرے گی۔ یہی وہ مولانا ہیں جنہوں نے جیل سے رہائی پر اپنا استقبال کرنے والے جلوس سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔ "میں جیل سے واپسی کا ٹکٹ لے کر آیا ہوں"

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی
ہوسِ زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی
حد ہے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانا!
اب بھی احساس ہو اس کا تو ابھرنا ہے یہی
نقدِ جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر
کام کرنے کا یہی ہے تمہیں کرنا ہے یہی

سرکش نہیں، باغی نہیں، غدار نہیں ہم
پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہے
یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہوگی
پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہے

نہیں پالا پڑا قاتل تجھے ہم سخت جانوں سے
ذرا ہم بھی تو دیکھیں تیری جلاد ی کہاں تک ہے
تجھے ہے قوت بازو پہ غرّہ صبر پر ہم کو
لگا دے زور تو سارا تری طاقت جہاں تک ہے

احمق پھپھوندوی ان عظیم شعراء کرام کے درمیان ایک ایسا شاعر ہے جس کی شاعری سیدھی سادی اور عوام کے دلوں پر اچھا اثر ڈالتی ہے۔

یہ قتل و خوں یہ جنگ و جدل، یہ جور و ستم یہ بغض و حسد
باقی ہی رہیں گے ملک میں سب، باقی ہے اگر راج انگریزی
ہر سو ہے بپا ہنگامۂ خوں، ہر سمت ہے ڈھیر اک لاشوں کا
اڈوائر و ڈائر کے دم سے قائم ہے نشانِ چنگیزی
شدھی ہے کہیں تبلیغ کہیں ناقوس کہیں تکبیر کہیں
یہ پیچ نہ ہوں تو مشکل ہے دم بھر کے لئے راج انگریزی

ہند کا آزاد ہو جانا کوئی آساں نہیں
دیکھنا تم کو ابھی کیا کیا دکھایا جائے گا
انتہائی بربریت سے لیا جائے گا کام
بند کر کے تم کو جیلوں میں سڑایا جائے گا
گرم لوہے سے تمہارے جسم داغے جائیں گے
تم کو کوڑے مار کر اُلّو بنایا جائے گا
جائدادیں سب تمہاری ضبط کر لی جائیں گی
بال بچوں پر تمہارے ظلم ڈھایا جائے گا
باوجود اس کے بھی تم قائم رہے ضد پر اگر
بے تامل تم کو پھانسی پر چڑھایا جائے گا
اس طرح بھی تم اگر لائے نہ ابرو پر شکن
سر تمہارے پاؤں پر آخر جھکایا جائے گا

شبیر حسن خاں جوش وہ شاعرِ انقلاب ہے جس نے آزادی، انقلاب اور انگریزوں کے تسلط پر بہت کچھ لکھا ہے اور بسا اوقات حکومت کے لئے درشت لہجہ کا بھی استعمال کیا ہے۔

قسم اس روح کی جو عرش کو رفعت سکھاتی ہے
کہ راتوں کو مرے کانوں میں یہ آواز آتی ہے
"اٹھو، چونکو، بڑھو، منہ ہاتھ دھو، اور آنکھ مل ڈالو
ہوائے انقلاب آنے کو ہے ہندوستاں والو"

"شکست زنداں کا خواب" ان کی مشہور نظموں میں سے ہے۔ اس کا ہر شعر نقل کرنے کے قابل ہے:

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے، گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
کیا ان کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھی دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں!

جوشؔ کی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب" بہت مشہور ہوئی اس نظم میں انگریزوں کے ورود سے لے کر جلیاں والا باغ کے حادثے تک کے تمام واقعات کو واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء خواہ کتنا ہی برا کیوں نہ ہو۔ ہماری آزادی کی راہ میں اسے ایک منزل کی حیثیت حاصل ہے اس ایکٹ کے پاس ہونے کے بعد ہی مختلف صوبوں میں کانگرس کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام بھی انہی دنوں ہوا۔ اس انجمن سے متعلق بیشتر شعراء مارکسی تعلیمات سے متاثر تھے ان میں مجازؔ، مخدومؔ، جذبیؔ، جعفریؔ، شمیم کرہانی، سلام مچھلی شہری، جاں نثار اخترؔ، فیضؔ، ن۔م راشدؔ، میراجیؔ خاص مقام رکھتے ہیں۔

ان شاعروں نے معاشی، معاشرتی اور ثقافتی تصورات کے پس منظر میں آزادی کے نغمے گائے۔ ملاحظہ ہو:

بدل دی نوجوان ہند نے تقدیر زنداں کی
مجاہد کی نظر سے کٹ گئی زنجیر زنداں کی
کہو ہندوستاں کی جے ـــــ کہو ہندوستاں کی جے
(آزادیٔ وطن ـ مخدومؔ)

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز (تسلی ـ فیضؔ)

ماں تو نہیں اس جنگ کی حامی
قتل ہوں جس میں ہند کے نامی
پر نہیں اٹھتا بارِ غلامی
گرتی ہوں اٹھ کے سنبھال
جاگ مرے نو عمر سپاہی! جاگ بھی میرے لال
(جگاوا ـ شمیم کرہانی)

نئی تعمیر تیرے ہاتھ میں ہے ؛ تری تقدیر تیرے ہاتھ میں ہے
بڑھے جانا، نہ ہرگز ہچکچانا ؛ مسافر راستے میں رک نہ جانا
(منزلیں ـــــ علی جواد زیدی)

مری صدا ہے گل شمع شام آزادی
سنا رہا ہوں دلوں کو پیام آزادی
لہو وطن کے شہیدوں کا رنگ لایا ہے
اچھل رہا ہے زمانے میں نام آزادی
ہمارے سینے میں شعلے بھڑک رہے ہیں فراقؔ
ہماری سانس سے روشن ہے نام آزادی
(آزادی ـ فراقؔ)

جھکا وہ فرق آسماں، اٹھی وہ تیغ بے نیام
ہم اپنے ملک و قوم کو، رکھیں گے کیا سدا غلام
جوانیوں کا سرد اس قدر ابھی لہو نہیں!
(ابھی نہیں ـــ جاں نثار اخترؔ)

مجھے نفرت نہیں ہے عشقیہ اشعار سے لیکن
ابھی ان کو غلام آباد میں میں گا نہیں سکتا
مجھے نفرت نہیں ہے حسن جنت زار سے لیکن
ابھی دوزخ میں اس جنت سے دل بہلا نہیں سکتا
ابھی ہندوستاں کو آتشیں نغمے سنانے دو
ابھی چنگاریوں سے اک گل رنگیں بنانے دو
(غزل ـ سلام مچھلی شہری)

اٹھتی ہے نقاب رخ لیلائے حقیقت
تاریکیٔ اوہام کہن کل نہ رہے گی
پر ہول فضا حسرت صد شام غریباں
یہ کیفیت صبح وطن کل نہ رہے گی
(بشارت ـــ سکندر علی وجدؔ)

اجرت اشتہار

	ایک ماہ	چار ماہ سے زائد
پورا صفحہ	۲۵ روپے	۱۰۰ روپے
آدھا صفحہ	۶۵ روپے	۵۵ روپے
چوتھائی صفحہ	۳۵ روپے	۳۰ روپے

پشت کے لئے ۵۰ فی صد زائد
سرورق صفحہ ۲ اور ۳ کے لئے ۲۵ فی صد زائد
تفصیلات کے لئے:۔ پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱

عورتوں کے لئے ایک نیا موقع

ایک نئی بچت اسکیم، جس کا افتتاح برد ھان منتری شریمتی اندرا گاندھی نے یکم اپریل کو کیا تھا، آپ کو ایک عمدہ جز وقتی کام مہیا کرتی ہے۔ "مہلا پردھان کشیتر بچت یوجنا" نامی اس اسکیم کے ذریعہ آپ

- اپنے کنبے کی آمدنی بڑھا سکتی ہیں۔
- اپنے فالتو وقت کا سود مند استعمال کر سکتی ہیں۔
- سماجی میل جول کا دائرہ وسیع کر سکتی ہیں۔
- قومی خدمت انجام دے سکتی ہیں۔

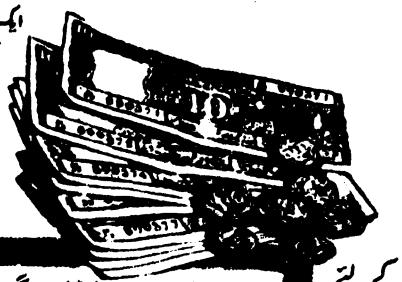

اس طرح آپ جتنی رقم اکٹھی کریں گی اس پر آپ کو ۵ فیصدی کمیشن ملے گا۔

ملک بھر کے شہروں اور بڑے بڑے قصبوں میں مہلا بچت پردھان کی ضرورت ہے۔

تفصیلات کے لئے حسب ذیل پتہ پر لکھئے:

نیشنل سیونگز کمشنر
پوسٹ بکس ۸۸
ناگپور

مہلا بچت پردھان کی حیثیت میں آپ کا کام ہوگا

اپنے علاقے کی گھریلو عورتوں سے ملنا
انھیں اپنی آمدنی بچانے پر آمادہ کرنا
ہر مہینے ان کی بچت کی رقم اکٹھی کرنا
اور انھیں ڈاکخانہ میں جمع کرا دینا۔

فضل امام رضوی
شعبہ اردو، گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور (یوپی)

قومی شاعر
اقبال سہیل

جدید تحقیق و تلاش نے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ اردو شاعری شروع سے ہی جذبۂ وطنیت سے سرشار رہی ہے۔ اقبال احمد سہیل نے بھی اس سلسلہ میں اپنے پیش رو شعراء کی تقلید کی ہے لیکن تقلیدی عناصر کے ماسوا ان کے یہاں جو کنایات و اشارات، سیاسی شعور اور ارضی معنویت ملتی ہے وہ جوہر اور حسرت جیسے باکمال شعراء وطن کے کلام میں بھی نہیں ملتی۔ جوہر و حسرت نے جس سیاسی شعور کی داغ بیل ڈالی تھی، اس کے نقوش زیادہ واضح نہیں تھے، لیکن سہیل میں انتہائی جامعیت اور تفکر کے ساتھ سیاسی شعور سے بھرپور شعری رجحانات پائے جاتے ہیں۔

سیاسی شعور کی پختگی اور فکر و نظر کی گیرائی پیدا کرنے میں سہیل کے خاندانی پس منظر اور ماحول کا بھی ہاتھ رہا ہے۔ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کے باہمت اور بہادر سپاہی کنور سنگھ کو جو صوبۂ بہار کے مشہور باغی تھے، جب انگریزوں کے مقابلے میں ناکامی ہوئی اور ان کی جان پر بن آئی تو سہیل کے مورثِ اعلیٰ حسن خاں نے اس پروانۂ آزادی کو باعزت طور پر پناہ دی اور عرصۂ دراز تک وہ اس خاندان کے مہمان کی حیثیت سے مقیم رہے۔ یہی نہیں بلکہ سہیل کے پردادا ضیاء الدین خاں کے چھوٹے بھائی پیر علی خاں سرکار اودھ میں فوجی ملازم تھے اور ایک بھائی حکومت برطانیہ کی فوج میں بھی افسر تھے۔ لیکن جب مادرِ ہند کے لائق فرزندوں نے دلیری سے کام لے کر ترانۂ حریت گایا تو سہیل کے اجداد بھی جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہو کر جنگ آزادی میں انتہائی جوش و خروش کے ساتھ شریک ہو گئے اور بڑے ہی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

سہیل کے جدِ آزادی علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں حسرت موہانی کے فیضِ صحبت اور بھی تقویت پہنچی۔ گو کہ حسرت سے سہیل کے تعلقات کی ابتدا ۱۹۱۰ء میں ہو چکی تھی مگر یہ رسمی کہنی علی گڑھ میں یہ رسمی تعلقات حقیقی طور پر استوار ہو گئے کیونکہ نظریاتی اعتبار سے بھی دونوں میں کافی طور پر مماثلت پائی جاتی تھی۔ اور سہیل بھی حسرت ہی کی طرح ولولہ حریت، جوش و ہمت اور انگریز دشمنی میں مشہور ہوئے۔

سہیل کا جذبۂ وطنیت اس قدر پاکیزہ اور منفرد تھا کہ وہ کسی ہیرو پرستی کے قائل نہ تھے۔ اسی لئے وہ کسی دنیاوی شخصیت سے غلط طریقہ پر متاثر نہیں ہوئے، جس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کی شاعری رئیس شہر کی قصیدہ خوانی کی علت سے محفوظ رہ گئی۔ جناب افتخار اعظمی نے "افکارِ سہیل" میں سہیل کا یہ قول نقل کیا ہے:

"میں کسی پیکر کو نہیں پوجتا، بلکہ اُن روحانی اور اخلاقی اوصاف کے آگے سر جھکا دیتا ہوں، جو قدرت نے ایک شخص کو ودیعت کئے ہیں"۔

سہیل نے فرقہ پرستی کی بھڑکتی ہوئی آگ میں ہندو مسلم اتحاد کی پرجوش دعوت دی ہے۔ اپنی غزلوں میں انگریزوں کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" پالیسی کو انہوں نے انتہائی رمزیت اور تہہ داری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو ؎

خدا سمجھے بتِ سحر آفریں سے: گریباں کو لڑایا آستیں سے

ان کا یقین تھا کہ مستحکم اتحاد اور پائیدار ارتباط تہذیبی لین دین سے قائم کیا جا سکتا ہے:

مل جل کے برنگ شیر و شکر دونوں کے نکھرتے ہیں جوہر
دریاؤں کے سنگم سے بڑھ کر تہذیب کا سنگم ہوتا ہے

سہیل کے ہم عصروں میں چند لوگ جاگیرداری ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے تھے اور نتیجے کے طور انگریزوں کو آقا و مولا سمجھ کر ان کی نظرِ عنایت پر جی رہے تھے۔ سہیل جیسا خوددار شاعر اس طرح کی غلامانہ پست ذہنیت کے بارے میں کہتا ہے:

ننگ ہے بے عمل قبولِ بہشت: یہ تو صدقہ ہوا صلہ نہ ہوا
عشق اور حسن سے سوالِ کرم: یہ تو غیرت کا اقتضا نہ ہوا

سہیل جس زمانے میں اسمبلی کے ممبر تھے اس وقت ایوان کی لمبی لمبی تقاریر سن کر اوب جاتے تھے کیونکہ ان کا نظریۂ حیات عمل پیہم تھا اور اسی پختہ اعتقاد نے انہیں ایک باعمل شاعر بنا دیا۔ چنانچہ وہ تقریر کے بجائے عمل کی ترغیب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

جہاں میں عمل کی عملداریاں ہیں: سخن پروری کا زمانہ نہیں
پھر موجِ زندگی میں نہیں شورشِ عمل: پھر کوئی سنگِ راہ مقابل نہیں رہا

حاصلِ سعی ہے سرگشتہ و حیراں ہونا
یعنی ہر گام پہ منزل کا گریزاں ہونا

جوانو! یہ صدائیں آ رہی ہیں آبشاروں سے
چٹانیں چُور ہو جائیں جو ہو عزمِ سفر پیدا

اہلِ وطن کو سعیِ پیہم اور عمل کی راہ دکھانے کے بعد سہیل تعمیرِ ہستی کا راز بھی بتلاتے ہیں ؎

اپنی ہستی کی آپ کر تعمیر
وہ بھی کیا بندہ جو خدا نہ ہوا

سہیل کی وطن پروری مذہب کی طرح سچی اور پکی تھی اُن کا اعلان تھا کہ عہدِ غلامی میں نماز جیسی خلوصِ نیت والی عبادت بھی رائیگاں ہو جاتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں جن سے اُن کے اس جذبے کی تصدیق ہو جاتی ہے:

غلامی میں وفا بے سُود سجدہ رائیگاں میرا
نہ خُود میری جبیں میری نہ اُن کا آستاں میرا
خیال اُن کے سخن میرا، زباں ان کی دہن میرا
بہار اُن کی، چمن میرا، گل اُن کے گلستاں میرا

قفس میں دیتے ہو کیا طعنِ سُست پروازی
فضا کھلی ہوئی ہوتی تو امتحاں ہوتا

قیدِ غلامی و حیات ننگِ کائنات
لعنتِ بندگی کے ساتھ صورتِ زندگی نہ دیکھ

لیکن یہ قیدِ غلامی ننگِ حیات و کائنات ہے۔ سہیل کو کم ہمتی اور پست حوصلگی سے دور رکھتی ہے کیونکہ ان کا یقین سعیِ پیہم اور عمل باہم میں ہے۔ وہ پرچمِ آزادی کو ہمیشہ سربلند رکھنے کی تعلیم دیتے ہیں۔

یہ گردن دوش پر ہے پرچمِ ملت ہے ہاتھوں میں
یہ ہمت دے مجھے کہ یہ کبھی جھکنے نہ دوں یارب

سہیل کا ایمان تھا کہ اگر اہلِ ملک کے دل، دردِ وطن سے آشنا ہو جائیں تو اغیار ہم پر حکمرانی نہیں کر سکتے۔ اُن کی نظم "صدائے سروش" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دلِ قوم درد آشنائے وطن ہو
تو کیوں غیر فرماں روائے وطن ہو

جیوں تو کلاہِ وطن زیبِ سر ہو
مروں تو کفن میں ردائے وطن ہو

وہی سر ہے جو قوم پر ہو تصدق
وہی جان ہے جو فدائے وطن ہو

اٹھو لے کے قومی علم نوجوانو
تمہیں نخلِ بستاں سرائے وطن ہو

سہیل نے اپنی نظموں میں ملک کے نوجوانوں سے زیادہ امیدوں کی وابستگی ظاہر کی ہے۔ نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

زندگی کا راز یہ ہے اے عزیزانِ وطن
جان جائے پر نہ جائے حرمتِ شانِ وطن

غیر اگر دے گنجِ قاروں تو بھی پھیلاؤ نہ ہاتھ
چاہئے اتنی تو غیرت اے گدایانِ وطن

غیر کے آگے سرِ اہلِ وفا جھکتا نہیں!
ہاں جھکا سکتا ہے اس کو بارِ احسانِ وطن

ننگ ہیں وہ عالمِ انسانیت کے واسطے
مل کے غیروں سے کریں جو وجہِ حرمانِ وطن

اُٹھ پڑے اب تو مجاہد جنگِ حق کے واسطے
سرفدائے قوم و ملت، دل ہے قربانِ وطن

سہیل تقسیمِ ہند کے بھی خلاف تھے وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ جو آزادی زبردست قربانیوں اور عظیم مشترکہ کاوشوں سے عالمِ وجود میں آئی ہے اُس کا شیرازہ مُفاد پرستی اور عارضی اقتدار کے لئے منتشر ہو جائے۔ وہ کہتے ہیں:

مل جُل کے کرو تعمیرِ وطن ایسا نہ ہو طعنے دیں دشمن
ساجھے کی پکائی تھی ہنڈیا چوراہے پہ آخر پھوٹ گئی

درحقیقت سہیل ایک سچے محبِ وطن شاعر تھے ان کے آبا و اجداد نے ملک و قوم کی خدمت بزورِ شمشیر کی تھی۔ سہیل نے نوکِ قلم سے شمشیر و سناں کا کام لیا تھا

خصوصی رعایت

آج کل کے سالانہ چندے میں رعایت سے فائدہ اُٹھائیے

۲ سال کے لئے ۱۲ روپے یا ۱۸ شلنگ یا ۲٫۷۵ ڈالر

۳ سال کے لئے ۱۰ روپے یا ۲۵ شلنگ ۶ پینس یا ۳٫۵۰ ڈالر

شعیب اعظمی
ٹیلہ ہاؤس۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

یحییٰ اعظمی

یحییٰ اعظمی اعظم گڑھ کے شمال مغربی سمت میں بسے ہوئے ایک قصبے جہاراج گنج میں ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی ضیاء اللہ صاحب مڈل اسکول میں صدر مدرس تھے۔ فارسی کا بہترین ذوق رکھتے تھے اور اپنی زبان دانی کے لئے سارے ضلع میں مشہور تھے۔

یحییٰ اعظمی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد کے سایۂ عاطفت میں حاصل کی اور بالکل شروع میں ہی فارسی میں اچھی استعداد پیدا کر لی۔ ان کی درسی کتابوں میں گلستاں، بوستاں، انوار سہیلی اور قرآن السعدین شامل تھیں۔ مشرقی علوم کی تحصیل کے بعد انہوں نے شہر جاکر انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیا مگر صحت کی خرابی اور نامساعد حالات نے اس خواہش کو پورا نہ ہونے دیا۔ مجبوراً وہ معاش کی بیڑیوں میں پڑ کر مڈل اسکول میں مدرس ہو گئے۔ اسی زمانے میں پورے ضلع میں تحریک خلافت کا زور ہوا اور ضلع کے سیکڑوں محبان وطن کی مانند یحییٰ اعظمی نے بھی اسکول کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور تحریک کے مختلف پروگراموں میں شریک ہونے لگے۔ اسی شرکت کی بدولت وہ شہر میں آ گئے، اور اپنے دو مخلص کرم فرماؤں مولانا اقبال احمد خاں سہیل اور حکیم محمد اسحاق کی وساطت سے دارالمصنفین میں ان کی آمد و رفت ہو گئی اور علامہ شبلی سے عقیدت کی بدولت اور علمی شغف کی بناء پر وہ شبلی اکیڈمی میں ۱۹۲۵ء میں ملازم ہو گئے۔ یہاں آکر مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی کی سرپرستی میں ایک طرف تو ان کے ذوق شعر و ادب کو جلا ملی اور دوسری جانب اس ادارے کی مرکزی حیثیت نے ملک کے بیشتر رہنماؤں اور اہل علم سے فیضیاب ہونے کا موقع دیا۔

ان کی شخصیت کی خصوصیات نے یہیں نشوونما پائی۔ یہاں رہ کر انہوں نے پہلے اعلیٰ قابلیت اور پھر انٹر کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ اگرچہ اس ادارہ میں ان کا کام حساب کتاب کا رکھنا تھا مگر ان کا مشغلہ شعر و شاعری تھا۔ ۱۹۳۱ء میں ان کی پہلی نظم "معارف" میں شائع ہوئی۔ اور اس وقت سے لے کر ۱۹۷۲ء تک ان کی شاعری کا سلسلہ بے پناہ موضوعات اور عنوانات پر جاری رہا۔ دارالمصنفین میں رہ کر انہوں نے بڑی صاف نفیس اور قابل رشک حد تک نفاست کی زندگی گزاری۔ ۱۹۵۰ء میں ان کی شاعرانہ خدمات کی بدولت حکومت ہند نے ان کے لئے قومی وظیفہ کی منظوری دی جو تاحیات قائم رہا۔ ۲۲ فروری ۱۹۷۳ء کو ایک ہفتہ کی بیماری میں داعی اجل کو لبیک کہا اور شہر کے عام قبرستان میں محو خواب ہیں۔

ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہوئے جن میں صرف انتخاب تھا پہلا مجموعہ نوائے حیات ۱۹۴۶ء میں عالی پبلشنگ ہاؤس سے شائع ہوا اور پھر اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۰ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔ اگرچہ دونوں کی اشاعت میں چار سال کا فاصلہ تھا مگر دونوں نسخوں میں کافی تبدیلی کر دی گئی تھی۔

اس مجموعہ کی دوسری اشاعت اور مقبولیت کے بعد آزاد ہندوستان کا ایک نیا رنگ ابھرا تھا اور شاعر نے بھی اپنے خیالات و جذبات کو ایک نیا آہنگ دیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۶۹ء میں ان کا دوسرا انتخاب "نوائے عصر" کے نام سے شائع ہوا جس کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

> اس کی بیشتر نظمیں آزاد ہندوستان اور عصر حاضر سے متعلق اور ملک کی تعمیری کوششوں اور اس کے شاندار مظاہر کی آئینہ دار ہیں۔ ان نظموں میں میں نے مستقبل کے ہندوستان کے تصور اور ملک کے خشک تعمیری اور ترقیاتی مسائل و مظاہر کو شعر و ادب کی زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور مجھے مسرت ہے کہ یہ ملک کے مشہور علمی اور ادبی رسائل میں شائع ہو کر سند قبول حاصل کر چکی ہیں۔

یحییٰ اعظمی کی زبان و دل کی آواز ایک ہی تھی۔ ان کا سینہ مادر وطن کے احترام سے پُر تھا۔ لہٰذا انہوں نے جس آہنگ وطن کے گیت گائے ہیں وہ اوروں سے مختلف ہے۔ ملاحظہ ہوں ایک شعر کے دو بند:

تجھ پہ صدقے اے وطن عالم تمام
کس قدر پیاری ہیں تیری صبح و شام
تیرے پھولوں سے معطر ہیں مشام
خوش نما ہے تیرے دریا کا خرام
اے وطن تجھ کو ہزاروں آفریں

صبح تیری روشن و خندہ جبیں
شام تیری رشکِ زلفِ عنبریں
چاندنی راتیں از سر تا پا حسیں
شاعروں کے واسطے وجد آفریں
اے وطن تجھ کو ہزاروں آفریں

۱۹۳۷ء میں آزادی کی دیوی نے اپنی ہلکی سی جھلک دکھائی، صوبوں میں قومی وزارتیں بنیں اور شاعر کا قلم وجد میں آگیا۔

عروسِ ملک مژدہ پھر ترا عہدِ شباب آیا
مبارک خاکِ پاکِ ہند دورِ انقلاب آیا
فضائے ہند ہے پُر شور آزادی کے نغموں سے
کہ مطرب لے کے پھر اس بزم میں چنگ و رباب آیا
بپا آواز آرہی ہے خاکِ گلگونِ پشاور سے
شہیدانِ وطن کے خون کا یوم الحساب آیا
نہ پوچھو شہرِ ستلج کے خاکستر کی اب عظمت
کہ اک اک ذرہ اس کا رشکِ صد آفتاب آیا
نکل آ جلد اے مہرِ سعادت بطنِ گیتی سے
کہ اب اس دور ظلمت کا لبِ بام آفتاب آیا

مگر یہ تاریکی ابھی چھٹنے نہ پائی تھی سحرِ آزادی کو کچھ اور انتظار تھا۔ وزارتیں ٹوٹ گئیں لیکن ۱۹۴۲ء کے ہنگاموں کے بعد بالآخر طلوعِ سحر ہو ہی گیا اور شاعر یحییٰ اعظمی نے پھر اسی جوش و خروش سے اس کا استقبال کیا۔ "صبحِ آزادی کا طلوع" عنوان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہیں اک سحر تازہ کے آثار ہویدا
ہونے کو ہے اب ظلمتِ گیتی کا ازالہ
پڑنے کو ہے جمہوریتِ ہند کی بنیاد
مایوانِ حکومت کی بنا ہے تہ و بالا
انگریز کی قسمت میں ہے اب ہند سے جانا
افرنگ کو ہے دیکھنا اب دیس نکالا
لہرائے گا آزادی کشور کا پھریرا
اب ساحلِ مدراس سے تا کوہِ ہمالا

جنگِ آزادی کا یہ پرچم ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کا پیغام بن کر آیا شاعر نے اسی پرچم کو ان الفاظ میں سلامی دی۔

رخِ مادرِ وطن کا جس نے ہے پھر سنوارا
مشرق کو جس نے بخشا ہے اوج پھر دوبارا
ہر نقشِ زندگی کا جس نے ہے پھر ابھارا
ہر سو بہا دیا ہے جس نے خوشی کا دھارا
اے دوستو یہی ہے وہ پرچمِ دلِ آرا
قومی نشاں ہمارا قومی نشاں ہمارا

اس پرچم کا مقصد اب اور زیادہ ہو گیا تھا "امن عالم اور تحفظ ایشیا" اس کا نیا کام تھا چنانچہ شاعر اس مقصد کی نشاندہی ذیل کے اشعار میں کرتا ہے

دنیا کے اور جھنڈے ہیں جنگ کی نشانی
اور اپنا یہ ترنگا ہے صلح کی کہانی
ہے خطِ سبز اس کا تمہیدِ جوانی
اور رنگِ زعفرانی پیغامِ شادمانی
صبحِ طربِ سفیدی سے اس کی آشکارا
قومی نشاں ہمارا قومی نشاں ہمارا

یحییٰ اعظمی نے ان تمام موضوعات پر قلم اٹھایا جو وطن کی سیاسی، سماجی تمدنی، اخلاقی، معاشی اور مذہبی زندگی کا جزو تھے۔ سیاسی رہنماؤں میں ملک کے ہر طبقہ اور مذہب کے لوگ شریک تھے۔ تحریکِ خلافت کے زمانے میں متحدہ پلیٹ فارم پر آنے والے تمام اکابرین سے متعلق انہوں نے اشعار لکھے۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ظفر علی خاں۔ بی اماں اور عالم اسلام کے ہمدرد رہنماؤں کو انہوں نے اپنی شاعری کا عنوان بنایا۔ وہ خود تحریک کے حامیوں میں تھے۔ جلسوں میں شرکت کرتے۔ آزادیٔ وطن کے سربراہ مہاتما گاندھی کا ایثار نفس، جذبہ آزادی اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے بے مثال قربانی کا جذبہ شاعر کو متاثر کئے بغیر نہ رہا۔ تقسیم کے نتیجہ میں فساد کی بھیانک آگ پھیلی تو گاندھی جی نوا کھالی چل پڑے۔ شاعر نے "مسلمانوں کا محسنِ اعظم" کے عنوان سے نظم لکھی جس کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

ہے اس دنیا کے ذرہ ذرہ پر تیرا کرم گاندھی
غنیمت ہے جہانِ عصر نو میں تیرا دم گاندھی
نہ بھولے گی تجھے انسانیت اے محترم گاندھی
کہاں قسمت کہ آنکھیں چوم لیں تیرے کرم گاندھی
کہ تو نے چہرۂ غمگیں پہ یتیموں کے سنوارے ہیں
انہیں سنگین دی ہے جو غم و حسرت کے مارے ہیں

اور پھر جب اپنے ہی وطن کی ایک فرد نے مہاتما گاندھی کی جان لے لی تو شاعر کا دل روئے بغیر نہ رہ سکا اور اس طرح مرثیہ خواں ہوا۔

بزمِ دعا ہے دیر سے سونی پڑی ہوئی
روحانیت کا انجمن آرا نہیں رہا
اس بیسویں صدی میں مثالِ گوشن و بدھ
جس نے زمانہ اپنا گذارا نہیں رہا

دُھن کو ٹیکتا ہوا سرتا قدم جہاد
تھا جو مصافِ حق میں صف آرا نہیں رہا
وہ جس کی رام دھن میں تھے وحدت کے زمزمے
وہ جس کو حق کا نام تھا پیارا نہیں رہا

گاندھی جی کے بعد وطن کے مایۂ ناز فرزند جواہر لال تھے۔ یحییٰ اعظمی وطن کے اس بے مثال لال کے شیدائی تھے۔ شاعر نے "زندہ باد جواہر لال" کے عنوان سے اپنی عقیدت ان اشعار میں ظاہر کی۔

اے آبروئے ہند کی تصویر زندہ باد ؛ بازوئے قوم و ملک کی شمشیر زندہ باد
خاکِ وطن سے پھر نہ اٹھے گا ترا جواب ؛ ہندوستان کے سب سے بڑے بیر زندہ باد
تخریب کے ہجوم میں اس عزم و شان سے ؛ ترا جہاد و کوششِ تعمیر زندہ باد
قائم تجھی سے ہند میں ہے شانِ بزم و رزم ؛ اے سرفروش و صاحبِ تدبیر زندہ باد

گاندھی نہیں تو ان کے مظاہر ابھی تو ہیں
کیا غم ہمیں کہ زندہ جواہر ابھی تو ہیں

اور جب اس بطلِ جلیل کی آنکھیں بند ہوئیں تو شاعر بے اختیار رو پڑا جذبۂ دل نے یوں ماتم کیا:

افسوس کہ رخصت ہوا اب بزمِ وطن سے ؛ جمہور کا وہ رہبرِ محبوب دلِ آرام
تیار نہ تھی اس خرید کے لئے قوم ؛ ہم اور سنیں آہ تری موت کا پیغام
تا زیست رہا جس کو شغف آہ گلوں سے ؛ شعلوں سے ہے وابستہ وہ بالائے گل اندام
ہے صبحِ وطن آج ترے غم میں سیہ پوش
آتی ہے نظر شامِ وطن شعلہ در آغوش ۶۴ء

یحییٰ اعظمی نے اُن تمام مسلم رہنماؤں کی شان میں نظمیں لکھیں جو بے دریغ جنگِ آزادی میں شریک تھے، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، آصف علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حفظ الرحمان اور رفیع احمد قدوائی ان کے سیاسی زعماء میں تھے۔ ان لوگوں میں مولانا ابوالکلام آزاد سیاسی حیثیت سے ان کے پیر و مرشد تھے۔ مولانا پر اُن کی اَن گنت نظمیں مل سکتی ہیں۔ "ملتِ اسلام کا مفکرِ اعظم" کے عنوان سے اُن کی ایک طویل نظم کے چند اشعار پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں:

کرتا ہے اوجِ سلطنت اُس کے قدم کا استلام ؛ آنکھ جو ہو تو دیکھئے مرتبۂ ابوالکلام
اُس کی فراست آج ہے بحث و نظر سے ماوریٰ ؛ ہاتھ میں جس کے ہے سپرد مجلسِ قوم کی زمام
خاکِ وطن سے آج تک حق تو یہ ہے نہیں اٹھا ؛ ایسا ادیبِ حق نگار ایسا خطیبِ خوش کلام
وہ ہے رحیم ممتحن جانیں گے اُس کی شان کیا ؛ سرخوشیٔ نشاط میں گزری ہوں جن کی صبح و شام
نورِ ہدیٰ سے بے نصیب حکمتِ دیں سے بے خبر ؛ جان سکیں گے آہ کیا مرتبۂ ابوالکلام
روزِ ازل سے ہر نفس جس کا ہے حریت نواز
اس کو سمجھ سکے گی خاک پستیٔ فطرتِ غلام

دارالمصنفین ایسی مرکزی جگہ تھی جہاں قوم کے سیاسی اور مذہبی رہنما اکثر و بیشتر آتے رہے۔ محققین، ماہرینِ تعلیم اور اہلِ ذوق یہاں آتے اور یہاں کے لوگ اس کا استقبال کرتے۔ انہیں آنے والوں میں ذاکر حسین صاحب کی شخصیت بھی تھی۔ یوں تو وہ بارہا تشریف لائے تھے مگر نائب صدارت کے دور میں دارالمصنفین کی گولڈن جوبلی کی تقریب کی آمد پر شاعر نے اپنے ممدوح کی مناسب مدح کی:

تری ذاتِ گرامی ہے وہ سنگم قوم و ملت کا ؛ ہے قائم اعتبار دجلہ و گنگ و جمن تجھ سے
تری ہستی ہے لعلِ شب چراغِ محفلِ ملت ؛ ہے خاکِ ہند مالا مال اے بھارت رتن تجھ سے
ترے مقدم سے سر بر آسماں ہے منزلِ شبلی ؛ فروزاں جلوۂ رخ سے ہے ساری محفلِ شبلی

وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی جب مشرقی اضلاع کے دورے پر گئیں تو اپنے دادا موتی لال نہرو اور باپ جواہر لال نہرو کی روایت باقی رکھتے ہوئے شبلی منزل میں بھی تشریف لائیں۔ یحییٰ اعظمی نے بھی اس موقع پر اپنی روایت برقرار رکھی اور اندرا جی کے وہ تمام محاسن گنائے جو انہوں نے تھوڑی سی مدت میں حاصل کر لئے تھے:

بجا ہے گر ہے خرم آج اعظم گڑھ کا ویرانہ ؛ ہے آنا آپ کا گویا جواہر لال کا آنا
ملا سب کو نویدِ کامرانی کا ہے پروانہ ؛ چمک اٹھے نہ کیوں کر علم و دانش کا یہ کاشانہ
کہ ہے اب آپ کے فیضِ قدم سے یہ چمن تازہ ؛ خود آ کر آپ نے کی باپ کی رسمِ کہن تازہ

ان پچاس برسوں میں ملک و قوم سے متعلق کم ایسے واقعات ہوں گے جن پر یحییٰ اعظمی نے صدقِ دلی سے نہ لکھا ہو۔ اُن کے کلام کی زیادہ مثالیں صرف وطن اُس کے زعماء خصوصی سے متعلق پیش کی گئی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ شاعر نے اور اصنافِ سخن اور دیگر موضوعات کو نظر انداز کر دیا۔ اُن کے مجموعوں میں غزل کے خوبصورت اشعار بھی ہیں اور منظر نگاری اور قدرتی شاعری کے بہترین نمونے بھی ملیں گے۔

ابھی حالیہ جنگ میں ہندوستان کی پوزیشن سے متعلق انہوں نے متعدد نظمیں لکھیں جس میں ہندوستانی فوج اور سپہ سالاروں کی بے مثال جانبازی کی داد دی ہے اور ملک و قوم کی باگ ڈور سنبھالنے والی وزیرِ اعظم اندرا گاندھی سے متعلق ذیل کا قطعہ لکھا جو ابھی تک شائع نہ ہو سکا۔

فتح مندی کی نویدِ ابدی تجھ کو ملی ؛ تیرے قدموں پہ جھکا لشکرِ جرارِ غنیم
کارنامہ یہ نہیں ترے جواں مردوں کا ؛ اندرا تری فراست کی ہے یہ فتحِ عظیم
ترے کردار کی ملتی نہیں دنیا میں نظیر ؛ ہے جو تاریخ میں بے مثل ترا عزمِ صمیم
کیوں نہ لے فخر سے اب ملک کا بچہ بچہ
نام نامی ترا اے ہند کی خاتونِ زعیم

یحییٰ اعظمی نے اپنے ادب کو زندگی سے الگ نہیں سمجھا۔ چنانچہ وطن دوستی اُن کی شاعری کا اول و آخر مقصد تھا۔ یوں تو ہزاروں شاعر آزادی کے پرستار ہوئے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ مگر یحییٰ اعظمی کی مثال کم ملے گی۔ اور ان کا کلام تاریخِ آزادی میں ایک ممتاز مقام کا مستحق رہے گا۔

افغان اللہ خاں
ریسرچ فیلو شعبہ اُردو گورکھپور یونیورسٹی گورکھپور۔ (یو پی)

رام پرساد بسمل

ہندوستان کی جنگ آزادی کے شہیدوں میں رام پرساد بسمل ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ کاکوری ڈکیتی کیس میں ماخوذ ہوئے تھے۔ اور انھیں دار و رسن کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ پھانسی کی کوٹھری کے اندر موت کے سائے میں انہوں نے اپنی سوانح عمری لکھی۔ اسے انہوں نے ایک جیل کے وارڈر کے ہاتھ گورکھپور کے مشہور کانگریسی رہنما اور ہندی اخبار "سودیش" کے ایڈیٹر شری دسرتھ پرساد دیویدی کے پاس بھجوا دیا۔ پوری سوانح عمری تین قسطوں میں باہر آئی۔ آخری قسط بسمل کے پھانسی پانے کے ایک دن پہلے باہر آئی تھی۔ دیویدی جی نے ان کاغذات کو گنیش شنکر ودیارتھی کے پاس بھیج دیا۔ اور انھیں کے زیر اہتمام کاکوری کا شہید کے عنوان سے یہ سوانح عمری شائع ہوئی۔ شائع ہوتے ہی انگریزی سرکار نے اُسے ضبط کر لیا۔ اتفاق سے اس کا ایک نسخہ شری جھابرمل شرما کے کتب خانے میں محفوظ رہ گیا۔ اسی کی مدد سے شری بنارسی داس چترویدی نے "امر شہید" کے نام سے اپنے مقدمے کے ساتھ اسے دوبارہ شائع کیا۔ یہاں اسی سوانح عمری کی مدد سے رام پرساد بسمل کے حالات پیش کئے جاتے ہیں۔

رام پرساد کا آبائی وطن تو ماردھا تھا جو گوالیار میں چمبل ندی کے کنارے واقع ہے۔ لیکن ان کے بزرگ ترک وطن کر کے شاہجہاں پور میں آباد ہو گئے۔ وہ لکھتے ہیں "میرے دادا شری نرائن لال جی کا جنم یہیں تو ماردھا میں ہوا تھا۔ وہ خاندانی جھگڑے اور بھابھی کی بداخلاقی سے پریشان ہو کر پیدائشی مقام کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے۔ آخر میں اپنی بیوی اور دو لڑکوں کے ساتھ شاہجہاں پور پہنچے۔ انھیں دونوں لڑکوں میں بڑے لڑکے شری مرلی دھر جی میرے والد تھے۔" شاہجہاں پور میں ان کے خاندان کو بڑے بڑے دن دیکھنے پڑے۔ اُن کے والد میونسپلٹی میں ۱۵ روپے پر ملازم ہو گئے۔ یہاں ۱۸۹۷ء (اٹھارہ سو ستانوے) میں رام پرساد بسمل کی پیدائش ہوئی۔

طالب علمی کے زمانے سے ہی رام پرساد انقلابی ذہن رکھتے تھے۔ اس لئے تعلیم کی طرف پوری توجہ نہ دے سکے۔ انہوں نے اُردو کی تعلیم ایک مولوی صاحب سے حاصل کی اور ہندی سے ان کے والد نے روشناس کرایا۔ انہیں کے الفاظ ہیں "جب میں سات سال کا ہوا تو والد صاحب نے خود ہی مجھے ہندی الفاظ سے روشناس کرایا۔ اور ایک مولوی صاحب کے مدرسے میں اُردو پڑھنے کے لئے بھیج دیا جب میں نے اُردو کا چوتھا درجہ پاس کیا اور پانچویں میں میرا داخلہ ہوا تو اس وقت میری عمر لگ بھگ ۱۴ سال کی تھی"

رام پرساد نے نویں درجہ تک تعلیم پائی۔ اسی تعلیمی دور میں وہ چند بری عادتوں کے بھی شکار ہو گئے۔ وہ اپنے والد کے صندوق سے روپیہ چرانے لگے۔ اس پیسے سے وہ ناول خریدتے اور پڑھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ سگریٹ اور بھنگ کے بھی عادی ہو گئے۔ "میں سگریٹ پینے لگا تھا۔ کبھی کبھی بھانگ بھی چڑھا لیتا تھا۔ میں ایک روز بھانگ چڑھا کر والد صاحب کے صندوق سے روپیہ نکالنے گیا۔ نشے کی حالت میں ہوش نہ رہنے کی وجہ سے صندوق کھولنے کی آواز دب نہ سکی۔ ماں کو شبہہ ہو گیا اور انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔"

اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں رام پرساد بسمل آریہ سماج تحریک کے حامیوں میں سے تھے۔ اور اس کے جلسے اور جلوس میں پابندی کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔ "میں تھوڑے دنوں میں کٹر آریہ سماجی بن گیا۔ آریہ سماج کے جلوس میں جاتا اور آریہ سماج کے مہاتماؤں کی سیوا کرتا۔" انھیں مہاتماؤں میں اُن کے استاد شری ۱۰۸ سوامی رام دیو جی تھے۔ رام پرساد اُن سے بے حد متاثر تھے لکھتے ہیں "اپنی ماں کے علاوہ جو کچھ میں نے زندگی میں حاصل کیا یا تعلیم پائی وہ محترم شری ۱۰۸ سوامی رام دیو جی کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔ آپ کا نام شری برج لال چوپڑا ہے۔"

اپنے انقلابی ذہن کی بنا پر وہ ہر تحریک کو لبیک کہتے تھے مگر کوئی تحریک ایسی نہیں تھی۔ جو ان کے ذہن کو پوری طرح سے مطمئن کر سکتی۔ شاہجہاں پور میں شری رام باجپئی نے "نیو اسمیتی" کی بنیاد ڈالی۔ اس میں بھی انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مگر دراصل رام پرساد کی انقلابی زندگی کا آغاز کانگریس کے لکھنؤ اجلاس دسمبر ۱۹۱۶ء میں شرکت کے بعد ہوا۔ وہ اس وقت نویں درجے کے طالب علم تھے۔ لکھنؤ آ کر انہیں معلوم ہوا کہ ایک ایسی خفیہ تنظیم بھی کام کر رہی ہے جو مطالبات کے ذریعہ نہیں بلکہ بغاوت کے ذریعہ آزادی حاصل کرنا چاہتی ہے یہ راستہ پُرخطر تھا۔ مگر آزادی کی لگن نے انھیں خطرات سے بے نیاز کر دیا۔ اپنے ایک دوست کی مدد سے وہ اس خفیہ تنظیم کے رکن بننے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اس کی تنظیم میں دل و جان سے لگ گئے۔ یہ تنظیم اس وقت مالی مشکلات سے دوچار تھی۔ روپے کی کمی کی بنا پر بہت سے کام رُکے پڑے تھے۔ روپیہ اکٹھا کرنے کے لئے ان لوگوں نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا "امریکہ کو آزادی کیسے ملی

یہ کتاب بکنے بھی نہ پائی تھی کہ ضبط کر لی گئی۔ ساتھ ہی ایک کتابچہ بعنوان "دیس واسیوں کے نام سندیش" بھی چھپوایا گیا۔ یہ کتابچہ پنڈت گیندا لال جی کے گرفتار ہونے کا ردِ عمل تھا۔ گیندا لال جی کے ساتھ ہی گوالیار میں برہم چاری جی بھی گرفتار ہوئے۔ روپوں کی کمی کے باوجود یہ تنظیم کچھ اسلحہ جمع کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ "ہم نے تین رائفلیں ایک بارہ بور دونالی کارتوس بندوق، دو ٹوپی دار بندوق، تین ٹوپی دار ریوالور اور پانچ کارتوسی رائفل خریدی۔ مگر اس کے باوجود جو ہتھیار تنظیم اپنے لئے ضروری سمجھتی تھی وہ میسر نہ تھے۔ اسلحہ خریدنے کے لئے پیسوں کی ضرورت تھی اور پیسے تھے نہیں۔ کتاب بیچ کر روپیہ جمع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب سامنے ایک ہی راستہ بچ گیا تھا وہ تھا کسی بھی قیمت پر روپیہ کی فراہمی اور اسکا ایک ہی ذریعہ نظر آیا۔ ڈاکہ۔ اس وقت تنظیم کی حالت بہت خراب تھی روپیہ کا انتظام کرنا بہت ضروری تھا۔ لیکن وہ کیسے ہو۔ دان کوئی دیتا نہ تھا۔ قرض ملنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اور کوئی ذریعہ نظر نہ آیا۔ آخر ڈاکہ ڈالنا طے پایا۔ لیکن کسی کی ذاتی ملکیت پر ڈاکہ ڈالنا ہمیں پسند نہیں تھا سوچا اگر لوٹنا ہی ہے تو سرکاری مال کیوں نہ لوٹا جائے" انہوں نے ایک منصوبہ بنایا اور کاکوری میں ایک مسافر ٹرین سے سرکاری خزانہ لوٹ لیا۔ بسمل ہی کی زبانی اس ڈاکہ کی تفصیلات سنیئے۔ "ہم نے زنجیر کھینچ کر گاڑی روک لی اور ٹرین کو گھیر لیا۔ مسافروں سے یہ کہدیا گیا کہ سب گاڑی میں چڑھ جائیں۔ اس لئے کہ زیادہ تر مسافر گاڑی رکنے کی وجہ سے ٹرین کے باہر آ گئے تھے۔ گاڑی کا گارڈ بھی ڈبے میں چڑھنا چاہتا تھا۔ مگر ہم لوگوں نے اُسے زمین پر لیٹ جانے کا حکم دیا۔ تاکہ بغیر گارڈ کے گاڑی نہ جا سکے۔ دو آدمی کولائن کے نزدیک پگڈنڈی پر کھڑا کر دیا گیا کہ وہ گھاس اور جھاڑیوں میں کھڑے ہو کر گاڑی پر گولی چلاتے رہیں۔ ایک آدمی گاڑی سے اُترا۔ اس کے پاس بھی ایک پستول تھا۔ اور انہیں کے پستول سے ایک آدمی زخمی ہو گیا میں نے اس کا انتظام کر دیا تھا کہ اگر کوئی بندوق لیکر سامنے نہ آئے یا مقابلے میں گولی نہ چلے تب تک کسی آدمی پر فائر نہ ہونے پائے۔ میں کسی آدمی کے قتل کے بعد اس کو خطرناک ڈکیتی کیس بننے نہیں دینا چاہتا تھا" یہ یقیناً ایک کامیاب ڈاکہ تھا۔ اور اس طرح ان لوگوں کے ہاتھ بہت سا روپیہ آیا۔ اس کو دوسری جگہ منتقل کرنے کا انتظام اس طرح کیا گیا۔

صندوق کو توڑ کر تین تین تھیلیاں بنا لیں گئیں اور پھر راستے میں ان تھیلوں سے روپیہ نکال کر ایک جگہ باندھ لیا گیا۔ اور لکھنؤ پہنچے۔ کسی نے راستے میں پوچھا تک نہیں کہ تم لوگ کون ہو۔ اور کہاں سے آئے ہو۔ اور اس طرح سے دس آدمیوں نے ایک گاڑی کو لوٹ لیا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس گاڑی میں چودہ آدمی ایسے تھے جن کے پاس بندوق یا رائفلیں تھیں۔ کاکوری میں ٹرین سے سرکاری خزانہ لوٹے جانے کے بعد پولیس چوکنی ہو گئی۔ بڑے زوروں کے ساتھ جانچ پڑتال شروع ہو گئی۔ خفیہ پولیس کے افسران سرگرمِ عمل ہو گئے۔ اور آخر کار اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گئے۔ رام پرساد بسمل کی گرفتاری عمل میں آئی۔ صبح چار بجے میں جاگا۔ ضروری حوائج سے فارغ ہو ہی رہا تھا کہ باہر دروازے پر بندوق کے کندوں کی آواز سنائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ پولیس آ گئی۔ میں فوراً دروازہ کھول کر باہر آیا۔ ایک پولیس افسر نے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں گرفتار ہو گیا۔ ادھر ان کے خفیہ ساتھی بھی گرفتار ہو چکے تھے۔ جیل میں سب لوگوں کو الگ الگ رکھا گیا۔ اس دوران خفیہ پولیس اس بات کے لئے کوشاں رہی کہ بسمل کو سرکاری گواہ بنا لیں۔ بسمل کو سرکاری گواہ بنانے میں تو وہ ناکام رہے لیکن ان کے ایک ساتھی بنارسی داس کو سرکاری گواہ بنانے میں وہ کامیاب ہو گئے۔

سرکاری طور پر دکھاوے کے لئے شناختیں کرائی گئیں اور یہ سب کام ایک ہندوستانی مجسٹریٹ کی عدالت میں ہوتا رہا۔ مگر بعد میں یہ مقدمے سیشن کو سپرد کر دیا گیا۔ جب تک یہ معاملہ عدالت میں آئے اس وقت تک رائے بریلی میں بنواری لال بھی گرفتار ہو چکے تھے۔ بسمل نے ہرکرن ناتھ کو بلوایا اور کہا کہ یہ سب کام چھوڑ کر جائیں اور بنواری لال سے ملیں۔ کیونکہ بسمل یہ سمجھ چکے تھے کہ اگر ہم لوگوں نے کوئی قانونی قدم نہ اٹھایا تو دامودر سیٹھ کی طرح جیل میں سڑا دیئے جائیں گے۔

جیل میں بسمل اپنے آپ کو بالکل اکیلا محسوس کرنے لگے اور کبھی کبھی یہ اکیلا پن ان کو جیل میں یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا تھا کہ "ایک بار یہ خیال بھی آیا کہ سرکار سے سمجھوتہ کر لیا جائے خفیہ پولیس کے کپتان اور ہیرسٹر سے بات چیت شروع ہوئی مگر یہ سوچ کر کہ اس سے انقلابی تحریک کی عزت ختم ہو جائے گی۔ یہ خیال ترک کر دیا گیا" اور اس وقت تک ان لوگوں پر باقاعدہ مقدمہ تیار ہو چکا تھا۔ مسٹر ہارٹن کاکوری کیس کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ۲۶ ستمبر ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ تیس آدمیوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ خفیہ پولیس کے افسران نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے ایک طالب علم کے کمرے سے دو رائفلیں بھی برآمد کر لی تھیں۔ گرفتار ہونے والوں میں رام کرشن کھتری، پرومیش کمار چٹرجی، یوگیش چندر چٹرجی بھی شامل تھے۔ اور بعد میں اشفاق اللہ بھی گرفتار ہو گئے۔ ۳۰ سے زائد گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ مگر مقدمہ صرف ۲۸ آدمیوں پر چلایا گیا۔

رام پرساد اپنے دوستوں میں اگر کسی سے متاثر تھے تو وہ اشفاق اللہ تھے بسمل اشفاق اللہ کو اپنے چھوٹے بھائی کی طرح جانتے تھے۔ حالانکہ وہ بڑی حد تک آریہ سماجی تھے۔ "تھوڑے دنوں میں ہی تم میرے چھوٹے بھائی کی طرح ہو گئے۔ سبھوں کو تعجب ہوا کہ میں ایک کٹر آریہ سماجی اور تم ایک مسلمان دونوں کا کیا میل۔ میں مسلمانوں کی شدھی کرتا تھا۔ کچھ ہمارے ساتھی تم سے مسلمان ہونے کی وجہ سے نفرت بھی کرتے تھے۔ مگر تم میرے ساتھ آریہ سماج مندر میں آتے جاتے تھے۔ کیونکہ تمہارا دل بالکل صاف تھا۔ تمہاری صاف گوئی نے میرا دل جیت لیا تھا۔ کبھی کبھی دوستوں کی محفل میں بات چھڑتی کہ کہیں مسلمان پر اعتبار کر کے دھوکہ نہ کھا جائیں۔ مگر جیت تمہاری ہوئی۔ ہم لوگوں نے ایک ہی تھالی میں کھانا کھایا۔ میرے دل سے یہ خیال نکل گیا کہ میں ہندو ہوں اور تم مسلمان۔ مجھے تم پر اٹوٹ اعتبار تھا۔ تم بھی میری طرح کٹر انقلابی تھے تمہارا دن رات کا صرف یہی کام تھا کہ تم زیادہ سے زیادہ مسلمان نوجوانوں کو انقلابی تنظیم

میں بھرتی کرو۔ اور وہ انقلاب میں حصہ لیں۔ گرفتار ہو جانے کے بعد تمہارے خیالات میں کوئی فرق نہ آیا۔" اور اسی طرح کے خیالات سے بسمل کی سوانح عمری بھری پڑی ہے۔ پھانسی سے تین روز پہلے بسمل نے جو صفحات قلمبند کئے ان میں بھی وہ اشفاق اللہ کو نہیں بھولے۔

وہ صفحات جو پھانسی پانے کے تین دن پہلے لکھے گئے وہ ایک وستاویز کی ہی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ایک انقلابی ذہن کے آئینہ دار بھی ہیں۔ بسمل کے سامنے زندگی کے صرف تین دن تھے اور تین دن کے بعد پھانسی کا پھندہ منتظر تھا۔ بسمل پھانسی پانے کے تین دن پہلے لکھتے ہیں: "آج ۱۶ ستمبر ۱۹۲۷ء کو یہ آخری لائن لکھ رہا ہوں جب کہ ۱۹ ستمبر ۱۹۲۷ء کو سوا سات بجے صبح کو اس جسم کو پھانسی پر لٹکا دینے کی تاریخ طے ہو چکی ہے۔ ۶ اپریل ۱۹۲۷ء کو ششن جج نے فیصلہ سنایا تھا۔ اور ۱۸ جولائی کو اودھ چیف کورٹ میں ہم لوگوں نے اپیل کی مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ جتنے لوگوں کو سزائیں ہوئیں تھیں ان میں ایک آدھ آدمی کی سزائیں بڑھیں کہ نہیں مگر میں نے ایک خط جو گورنر کے نام تھا اس میں لکھا تھا کہ میں آئندہ کسی انقلابی تحریک یا کام میں حصہ نہیں لوں گا۔ مگر چیف کورٹ اس کو نہیں مانی۔ چیف کورٹ نے یہ درخواست رد کر دی تو پھر گورنر اور وائسرائے کے پاس رحم کی درخواست کی کہ۔ رام پرساد بسمل، راجندر ناتھ لاہری، روشن سنگھ اور اشفاق اللہ کو پھانسی کی سزا بدل کر اور دوسری سزا دینے کی سفارش کی گئی تھی۔ کونسل کے چنے ہوئے ممبروں نے دستخط کر کے ایک درخواست دی۔ میرے والد نے ڈھائی سو رئیس آنریری مجسٹریٹ اور زمینداروں کے دستخط کروانے کے بعد ایک الگ درخواست دی۔ مگر سر ولیم کی سرکار نے ایک نہ سنی۔ اس وقت لیجسلیٹو اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے ۸ ممبروں نے دستخط کر کے وائسرائے کے پاس رحم کی درخواست کی کہ "کاکوری کیس میں موت کی سزا کو بدل کر دوسری سزا دی جائے کیونکہ دوبارہ جج نے یہ سفارش کی تھی کہ اگر یہ لوگ افسوس کریں تو سرکار سزا کم کر دے۔ چاروں رحمن کی موت کی سزائیں تھیں ممبروں نے افسوس ظاہر کیا۔ مگر وائسرائے نے ایک نہ سنی۔ اسی وقت مدن موہن مالویہ جی اور اسمبلی کے کچھ ممبروں نے وائسرائے سے ملکر یہ کوشش کی کہ سزائیں کم ہو جائیں مگر کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ حالانکہ اشفاق اللہ تو انگریزی سرکار سے رحم کی درخواست کرنے پر راضی ہی نہیں تھے۔ ان کا تو یہ اعتبار تھا کہ خداوند کریم کے علاوہ کسی دوسرے سے کچھ نہیں مانگنا چاہتے۔ مگر میرے ضد کرنے پر وہ اس کے لئے تیار ہوئے۔ اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ کیونکہ ان کو اس فیصلے سے میں نے ڈگمگا دیا تھا۔ میں نے اس بھول کی معافی ایک خط میں (وہ دوسرے جیل میں تھے) اشفاق سے مانگی تھی۔ خدا جانے وہ ان تک پہنچا کہ نہیں۔ آخر میں میں نے سوچا کہ جیل سے نکل بھاگوں مگر باہر سے کوئی مدد نہیں ملی۔ مجھے باہر سے ایک ریوالور تک دستیاب نہ ہو سکا۔"

وہ آخر میں کہتے ہیں کہ "میں جان دینے میں ہچکوں گا نہیں۔ کیونکہ میں نے اپنا کام کر دیا ہے مگر یہ افسوس ضرور ہے کہ جس کے لئے کام کرو، بھلائی کرو وہی برے برے نام دیتے ہیں۔ اب میرے ہم وطنوں سے گذارش ہے کہ جو کچھ کریں سب ملکر کریں۔ اور سب دیش کے لئے کریں۔ اور اسی میں سب کا بھلا ہے۔" انھیں الفاظ پر ان کی سوانح عمر ختم ہو جاتی ہے۔ وہ ۱۹ ستمبر ۱۹۲۷ء کو صبح ساڑھے چھ بجے پھانسی کے تختے پر چڑھ گئے۔ ان کے پاؤں میں لغزش تک نہیں تھی۔ وہ اس اعتبار کے ساتھ جان دے رہے تھے کہ۔ یہ میرا اعتبار ہے کہ میں پھر ایک نئے جسم میں جنم لوں گا۔ اور بھارت کے کسی عزیز کے گھر میں جنم لوں گا کیونکہ یہ میرا مقصدِ حیات ہے کہ کوئی کسی پر حکومت نہ کرے۔ ساری دنیا میں جمہوری حکومت قائم ہو۔"

غزل

ذکیہ انجم
شعبۂ اردو، ماتا سندری کالج نئی دہلی

روش روش ہے جہانِ تازہ، قدم قدم موجِ زندگی ہے
مگر مسرت جو اجنبی تھی، ہجومِ گل میں بھی اجنبی ہے

قریب رہ کر ہے دور کوئی، ہم ایسی قربت کو کیا کریں گے
وہ چاند نکلا ہوا ہے لیکن، کبھی کبھی دل کی چاندنی ہے

ہر ایک جادے کے پیچ و خم سے، ہر ایک منزل کے بام و در سے
مجھے جنوں کی صبا خرامی جہان بھر میں لئے پھری ہے

ہزار جلوے ہیں، لاکھوں لیکن، ہے دل کی بستی اُداس پھر بھی
کوئی کرن تو کہیں سے پھوٹے کہ تیرگی مجھ کو ڈس رہی ہے

چمکتے تاروں سے پوچھتی ہے، پلک پلک جھلملاتی شبنم
یہ کس مقامِ سفر پہ انجم حیات آکر ٹھہر گئی ہے

قمر احسن
نیشنل آرکائیوز آف انڈیا
جن پتھ نئی دہلی

اقدامِ قتل

لیکن اگر نہ دیا تو ۔؟ میری پشت سے نکل کر اس نے سوالیہ انداز میں آنکھیں اٹھا کر پوچھا۔

نہ کیوں دیں گے ۔؟ کیا کوئی قرض لیے جا رہے ہیں۔ آج ۴۲ دن ہو گئے ہیں دوڑتے ہوئے اور وہ روز کل پر سوں کہہ دیتے ہیں۔ آج ساری بات صاف کر لوں گا۔

میرے ساتھ چلتا ہوا شخص عجیب مضحکہ خیز انداز میں مجھے دیکھنے لگا تو میں نے نظر انداز کر کے پھر کہا۔

تم بلاوجہ گھبراتے ہو۔ بس وہاں خاموش رہنا یعنی ان کو احساس ہی نہیں کہ کون کن حالات میں آپ کے پاس بھاگا ہوا آرہا ہے۔ ایک مضمون کا ۱۵ روپیہ دیں گے اور دو مہینے دوڑائیں گے۔ بے حس۔

میرا ساتھی میری بڑبڑاہٹ سے اکتا کر ہواؤں کو چیرتا ہوا جنگل میں بھٹکنے لگا اور مجھے ایسا لگا جیسے میرے سارے قدم زرد سوکھے ہوئے پتوں پر پڑ رہے ہوں اور چاروں طرف شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ یا بالکل سناٹا ہو۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں بہت وزنی ہوتا جا رہا ہوں پھیلتا جا رہا ہوں۔ اس کھنڈر کی طرح بھاری بھرکم۔ جس کا خاکہ ہی مسمار ہو چکا ہو۔ اور وہ مکڑیوں کے جالوں، اور چمگادڑوں کی بیٹ سے اپنے وزن کا احساس کر رہا ہو۔

پھر مجھے لگا جیسے میرے جسم سے بہت سی حسّہ بکھوری اینٹیں نکل نکل کر فضا میں بکھر رہی ہوں اور سڑی ہوئی شہتیروں میں آگ لگی ہو۔

میرا ساتھی راہ کی جھاڑیوں سے اُبھنے لگا تو میں نے اسے کھینچ لینا چاہا۔ لیکن اس کے انکار پر شرمندہ ہو کر سوچنے لگا۔

نہ جانے یہ کب کیسے میرے ساتھ ہوا تھا کہ میرے سارے گناہوں سے بھی واقف ہے۔ رات کو بور کرتا ہے۔ اس نے تو اکثر میری مرضی کے خلاف بھی عمل کیا ہے۔ لیکن میں اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا ہوں۔ شاید احساس کمتری کی وجہ سے کہ میں خود تو بوڑھے کا دانت ہوں نہ جانے کب گر پڑوں۔ اگر یہی شخص مجھے راکھ اور چونے سے سنبھال نہ لے تو ۔؟؟

میں شاید کسی بھرے پرے۔ ویران جنگل کا قفس ہوں میری چاروں طرف بہت سے دیمک لگے ہوئے پرچم ہیں اور درختوں کے آپسی سنگھرش سے لمحہ بہ لمحہ خستہ تر ہوتا رہتا ہوں (جیسے ملک کا فوری فتح دکن کے بعد بیٹھا دن رات اپنی آنکھوں سے گرد اندہ کنکریاں صاف کرتا رہتا تھا) میں نے پلٹ کر دیکھا میرا ساتھی کچھ سوچ رہا تھا۔ اس لئے میں بھی سوچنے لگا۔

تین مضمون کے ۴۵ روپے۔ پانچ روپے پہلے کے باقی۔ کل پچاس۔ پچاس۔ پچا۔ یہ پچاس میں کیا ہوگا ۔؟ اچھا بہت ضروری خرچ جوڑ لو۔ ۲۰ کمرے کا (آج تک کمرے کا کرایہ لیٹ نہیں کیا) ۲۷ قرض (قرض بھی وقت پر دیدیتا ہوں) ۴۵ کھانے کا بل۔ (کھانے کے بغیر کیا ہوگا ؟) اور چیزیں چھوڑو ۔! اس کا ٹوٹل ۔ ۲۰ اور ۲۰ چالیس۔ سات سینتالیس ۴۷ اور ۴۵ چالیس چالیس۔ اسّی اور سات پانچ بارہ۔ اسّی دس نوّے اور دو۔ بانوے۔ اب بتایئے۔ اور اگر اس کے خیال کے مطابق واقعی آج بھی وہاں سے نہ ملا تو ۔؟ ارے ایسے نہ دیں گے ؟ کوئی بھیک مانگ رہے ہیں۔ ہونہہ۔ نہ دیں گے۔ میری آنکھوں میں ہلکا ہلکا پانی سا آرہا تھا۔ کب۔

کہئے کب آئے ۔؟۔ جاؤں گا تو پہلے یہی کہیں گے۔

جی چلا آرہا ہوں۔ آپ نے اس وقت آنے کو کہا تھا نا ۔؟ میں بالکل خشک لہجہ میں کہوں گا۔ تیوریاں بھی چڑھا لوں گا۔

ہاں ۔ اچھا۔ جی آپ کا انتظام ہو رہا ہے۔ کچھ زبانی یاد ہے۔ کتنا ہے آپ کا ۔؟ وہ کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک طرف کو جھکتے ہوئے کہیں گے۔

جی ۔ ۴۵ اس بار کا ہے اور پانچ پہلے کا۔ میں بغیر بے چینی یا خوشی ظاہر کئے ہوئے کہوں گا۔

یعنی پچاس ۔ ؟ شکلا جی ذرا آپ سے پچاس روپے کا واؤچر بھروا لو۔

یکدم میرے ساتھی نے مجھے چونکا دیا۔ ذرا دیکھ کے۔ ابھی ٹکرا گئے ہوتے۔ کیا سوچ رہے ہو ۔؟ میرے ساتھی نے چونکا کر پوچھا۔

کچھ نہیں۔! سوچنا کیا ہے۔ اگر آج بھی انہوں نے ٹال دیا تو بہت برا ہوگا۔ کوئی بھیک تھوڑی مانگتا ہوں۔ ارے مضمون لکھا ہے۔ پیسہ دیجئے۔ ۴۲ دن سے دوڑا رہے ہیں ۔ میں نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

میرا خیال ہے کہ آپ وہاں صرف خاموش رہیے گا۔ اس نے منہ بنا کر کہا میں ہی ان سے تقاضے سے بات کروں گا۔ اگر انہوں نے کہہ دیا کہ جائیے دو مہینہ بعد آئیے گا تو آپ ان کا کیا کر لیں گے اور پھر بعد میں جب آپ مضمون لے کر پہونچیں گے تو کہہ دیں گے کہ جائیے یہ مضمون نہیں شائع ہو سکے گا۔ کوئی آپ کا قرض تو ہے انہوں نے جو آپ کا مضمون شائع کریں۔ یا ان کو مضمون لگا نہ ملیں گے۔ ذرا سوچ سمجھ کر بات کیا کرو۔ اس نے نرمی سے میرے ہاتھوں کو سہلایا۔

تم خود سوچو۔ اگر آج بھی انہوں نے پیسہ نہ دیا تو کیا ہوگا؟ میرا تو دماغ خراب ہوا جا رہا ہے۔ مجھے خود اپنے لہجہ میں بڑی بے چارگی محسوس ہوئی۔

اول تو آج انہوں نے وعدہ کیا ہے — دیں گے ہی۔ اور اگر نہ دیا تو کل پرسوں کبھی تو دیں گے۔؟ کہتا ہوا وہ مجھے لے کر آفس میں داخل ہو گیا۔

میں جب اپنے نزلی جسم کو کھینچتا ہوا چلمن ہٹا کر اندر داخل ہوا تو ایسا لگا جیسے کسی کوری صراحی میں آگیا ہوں بھیگی بھیگی سردسی صراحی۔

وہ مجھے لے کر ایک کرسی میں بیٹھ گیا۔

منیجر صاحب نے اس کے سلام کا جواب دے کر پھر سر جھکا لیا تھا۔ ابھی میں نے سلام نہیں کیا تھا اور اب اس کے فرمانبردارانہ سلام کے بعد میرا دل بھی نہیں چاہتا تھا کہ انہیں سلام کروں۔

خاموش بیٹھے بیٹھے مجھے غصہ آنے لگا تھا یعنی کوئی بات ہی نہیں کہ دو بجے دھوپ میں دوڑا چلا آرہا ہوں۔ دینا ہو تو دیجئے۔ یہ کیا کہ کچھ پتہ ہی نہیں کہ دیں گے یا نہیں دیں گے

میرا ساتھی چپ چاپ بیٹھا پان سے دانت کرید رہا تھا۔ اور منیجر صاحب شاید اخبار کے پتے درست کر رہے تھے۔

میں نے بدبدا کر اس سے بات کرنی چاہی تو اس نے آنکھ سے اشارہ کر کے ہونٹوں پہ انگلی رکھ لی اور آہستہ سے کہا "ابھی خود ہی متوجہ ہوں گے۔"

جب خاصی دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد میری آنکھوں میں پنکھے کی سرسراہٹ سے نیند آنے لگی تو میں نے بھاری سا سر اٹھا کر خشک لہجہ میں پوچھ ہی لیا۔

کیا ہوا صاحب۔ آج آپ نے بلایا تھا۔!

انہوں نے سر اٹھا کر چشمہ کے اوپر سے دیکھا۔ بیٹھئے تو سہی۔ بس ابھی بتاتا ہوں۔

کیا بتائے گا۔ ۴۲ دن سے تو دوڑ رہا ہوں آپ کو پرچہ میں لکھ بھی دیا تھا کہ بہت سخت ضرورت ہے۔ لیکن آپ۔ (میں نے محسوس کیا کہ میرے لہجہ میں بہت خشکی آگئی ہے اور ٹھہر گیا) اور اچانک میرا ساتھی بول اٹھا۔ لیکن آپ شاید اس خط کو بھول گئے منیجر صاحب۔ بہت سخت ضرورت ہے۔ ورنہ میں اس طرح دوڑ دوڑ کر آپ کو پریشان نہ کرتا۔

اس کے لہجہ کی گرانگڑاہٹ اور خوشامد سے میں غصہ میں کپکپانے لگا۔

اور کھول اٹھا۔ تم خود ذلیل ہو تو مجھے کیوں ذلیل کرتے ہو۔ انہوں نے ہمیں پریشان کیا ہے کہ ہم نے انہیں۔؟ کمینہ کہیں کا۔! میں نے اس کی طرف غصہ سے ہاتھ بڑھانا چاہا۔ لیکن منیجر صاحب اس سے کہہ رہے تھے۔

نہیں نہیں ایسے تو پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن کیا کریں کہ آج کل ہاتھ بالکل خالی ہو گیا ہے۔ نہ کہیں سے منی آرڈر آرہا ہے نہ چیک۔ اور اکاؤنٹنٹ صاحب بیمار پڑے ہیں۔

چہ چہ۔ ہونہہ۔!

میں تو کھول رہا تھا اور وہ چہرے پر غم طاری کئے ہوئے تاسف کر رہا تھا۔

اب پرسوں آپ کے جانے کے بعد میں نے ایک دکان سے قرض لینا چاہا تھا لیکن انہوں نے بھی انکار کر دیا۔ منیجر صاحب پیڈ پر کچھ لکھ رہے تھے اور بول بھی رہے تھے۔

اور میرے سارے جسم میں آگ لگ رہی تھی۔ کیا یہ بیوقوف بنا رہے ہیں۔ غصہ سے مجبور ہو کر میں نے کہنا چاہا۔

دیکھئے میں . . . .

لیکن اس نے درمیان سے ہی بات اچک لی۔

. . . . بہت پریشان ہوں منیجر صاحب، کہیں سے کچھ انتظام کیجئے۔ بس آپ کا ہی سہارا ہے ورنہ

— منیجر صاحب اٹھ کر تھوکنے چلے گئے۔

میں غصہ کی زیادتی سے رو ہانسا ہو گیا۔ جی چاہا کہ ابھی یہیں اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ذلیل شخص کا گلا گھونٹ دوں۔ لیکن منیجر صاحب کہنے لگے۔

دیکھئے میں ایک جگہ فون کر لوں تو بتاتا ہوں۔

ان کے جاتے ہی میں نے اپنے ساتھی کو کرسی پر سے اٹھا کر ڈانٹنا شروع کیا۔

کیا تم واقعی اتنے ذلیل ہو۔ آج اپنے سے نفرت ہونے لگی ہے کہ کیوں تمہیں اتنے دن ساتھی بنائے رہا۔ ذلیل، بے حس، سور۔ اب آپ ہرگز نہ بولئے گا۔

اسی وقت منیجر صاحب داخل ہو گئے اور کہنے لگے۔

بھئی ایک دکان پر فون کیا تھا۔

لیکن میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ مجھے ان سب سے کیا مطلب اس وقت آپ کہیں سے پچاس روپے کا انتظام کر دیجئے ورنہ۔

لیکن منیجر صاحب بولتے رہے۔ اس نے کہا کہ آج تو بینک بند ہو چکا ہے اور دکان کا سارا پیسہ بھی بینک جا چکا ہے اور کل اتوار ہے لہٰذا اب پرسوں ہی ہو سکے گا۔ اب آپ ایسا کیجئے کہ پرسوں اسی وقت آجائیے۔

میں نے زور سے دانت بھینچے تو آنکھوں میں درد ہونے لگا۔ میرا ساتھی بھی زرد خاموشی اور یاس سے منیجر صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ اور میں پوری طرح ابل پڑا۔

منیجر صاحب آپ کو احساس نہیں ہے۔ میں پرسوں تو۔ . . .

کہ اچانک ہی وہ میری پشت سے نکل کر بول پڑا۔

میں پرسوں پھر اسی وقت آجاؤں گا۔ منیجر صاحب لیکن دیکھئے کہیں سے ضرور انتظام کر لیجئے گا۔ نہیں تو . . .

اور میں جلبلا کر اسے کمرے سے باہر کھینچ لایا۔

میری آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ تمتما رہا تھا۔

میں نے تمہیں بولنے سے منع کیا تھا تو کیوں بولے۔ تم کو میرے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کا کون سا حق تھا۔ میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے پھپکار کے کہا۔ لہجہ کی درندگی سے اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور وہ پیچھے کی سمت سمٹتا جا رہا تھا۔

تم ہوتے کون ہو بولنے والے۔ کمینہ، ذلیل۔ غصہ سے میں لرزنے لگا۔

اور اس کی طرف لپکتے ہوئے میں نے کہا

آج۔ آج میں تیرا اگلا گھونٹ دوں گا۔

وہ خاموشی سے نظریں جھکائے میرے انگوٹھے کو دیکھ رہا تھا۔

اس کی خاموشی پر میرا غصہ اور تیز ہوا تو دونوں ہاتھوں کا پھندنا بنا کر میں نے اس کی گردن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پھر نہ معلوم کیا سوچ کر (شاید غصہ کی زیادتی میں) بغیر نتیجہ کی پروا کئے میں نے اپنی جیب سے چاقو نکال لیا اور جب اس کے سینہ میں عین دل کے مقام پر چاقو مارنا چاہا تو میرا ہاتھ اس کے سینے تک پہونچ کر جھکتا چلا گیا۔

میرے ساتھی کی بڑی بڑی چمکیلی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی بڑی حسرت سے میرے جھکتے ہوئے ہاتھ میں چمکتے ہوئے چاقو کو دیکھ رہی تھیں۔

میں کھڑا سنسنا رہا تھا۔

پھر نہ جانے کب ہوا کہ میں۔ خاموشی سے اس کا سر دبا تھ اپنی گرم بغل میں دبا کر۔ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ ●●

عزیز جاوید
۱۰۶۸ اے کمرہ نمبر ۱۲ مولانا آزاد روڈ بمبئی ۸۰

متاعِ یک عمر

نہ فکرِ فردا نہ رنجِ امروز . . .
شفیق ماں کی عظیم شفقت . . .
عزیز بہنوں کا پیار میری مسرتوں کا علم کشا تھا
چراغِ شب لوریاں سناتا
سحر محبت سے گدگداتی
مجھے ننھے کی ہر گلی پیار سے بلاتی . . .
حبیبِ جاں تھا وہ عہدِ طفلی
کریم تر تھا وہ عہدِ طفلی
اور اب مری عمر کی یہ چوتھی دھائی مجھ کو
سلگتے صحرا میں چھوڑ کر مجھ سے کہہ رہی ہے
"اگر کوئی تجھ سے یہ کہے اے سلگتے پیکر
حبیبِ جاں تھا جو عہد تیرا
کریم تر تھا جو عہد تیرا
اسے میں لوٹا رہا ہوں لیکن
عوض میں اس کے
تو اپنے یہ تجربوں کی زنبیل مجھ کو دیدے
تو اس سے کہتا
خدائے عصرِ رواں سلامت
متاعِ یک عمر بے بہا ہے"

(ہیزلٹ سے ماخوذ)

شانتی رنجن بھٹاچاریہ
۲ ای۔ اشوک نگر۔ ریجنٹ پارک کلکتہ ۴۰۔

راجا رام موہن رائے اور اُردو

راجا رام موہن رائے نہ صرف ایک عالم تھے۔ بلکہ وہ اپنے عہد کے لاثانی فنکار، عالم و مفکر تھے۔ آپ سنسکرت، عربی، فارسی، فرینچ، لاٹن، انگریزی، گریک، بنگلہ اور اُردو کے علاوہ ہیرو (عبرانی) زبان سے بھی واقف تھے جہاں تک ہمیں علم ہے انہوں نے سنسکرت، عربی، فارسی، انگریزی اور بنگلہ کے علاوہ اُردو میں بھی مضامین اور کتابیں لکھی ہیں۔ اُن کے قومی، سیاسی، مذہبی، سماجی اور معاشی خیالات و خدمات نیز انگریزی و بنگلہ زبان کی تخلیقات پر آج تک کئی حضرات نے روشنی ڈالی ہے لیکن اُن کی عربی، فارسی و اُردو خدمات کے سلسلہ میں زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ اور خاص کر اُردو خدمات پر تو کسی نے نظر ہی نہیں ڈالی ہے۔ لہٰذا اس مضمون میں ان کی عربی، فارسی و اُردو خدمات پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مرآۃ الاخبار

رام موہن رائے اپنے دور کے سب سے عظیم ہندوستانی ہونے کے علاوہ ہندوستانی صحافت کے پہلے رہنما رہے ہیں۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد جدید پریس و اخبارات نے جنم لیا۔ انگریزوں سے قبل قلمی اخبارات تھے جن میں مختلف مقامات کی خبریں ہوتی تھیں مغل دور میں شہنشاہ ہر صوبے اور بڑے شہروں یا دیگر اہم مقامات کی خبریں حاصل کرنے اور اُن خبروں کو دربار تک پہنچانے کے لئے چند ملازم رکھتے تھے جن کو "واقعہ نویس" کہا جاتا تھا۔ یہ واقعہ نویس خبروں کو تحریر کرکے دربار تک روانہ کرتے تھے صرف شاہِ دہلی ہی نہیں بلکہ دیگر کئی راجے اور بڑے زمیندار یا نواب بھی اپنے علاقوں میں واقعہ نویس رکھا کرتے تھے اور یہ واقعہ نویس ان دنوں کی سرکاری زبان یعنی فارسی میں خبریں لکھ کر ارسال کرتے تھے۔ وہ کاغذات جن میں یہ خبریں ہوتی تھیں، اخبار کہلاتے تھے۔

بہرحال انگریزی عہد میں جب جدید پریس قائم ہوئے تو اخبارات شائع ہونے لگے اور فارسی میں سب سے قبل اخبار نکالنے کا سہرا راجا رام موہن رائے کے سر ہے۔ اس اخبار کا نام "مراۃ الاخبار" تھا اور اس کا پہلا شمارہ ۱۲ اپریل ۱۸۲۲ء بروز جمعہ کلکتہ سے شائع ہوا۔ افسوس کے دُنیا کے کسی بھی کتب خانہ میں "مراۃ الاخبار" کا کوئی شمارہ محفوظ نہیں ہے جس کی وجہ سے ہم یہ جاننے سے قاصر ہیں کہ رام موہن کی فارسی کا معیار کیا تھا۔ وہ خبروں کو کیوں کر ترتیب دیتے تھے۔ ان کے مضامین اور اداریئے کیسے ہوتے تھے۔ انگریزی اخبار "کلکتہ جنرل" میں ہمیں اُس دور کے بعض دیسی زبانوں کے اخبارات کے مضامین ملتے ہیں جو کہ ترجمے ہیں۔ "کلکتہ جنرل" کے ایسے ہی مضامین سے ہمیں "مراۃ الاخبار" اور رام موہن رائے کی صحافت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ رام موہن رائے نے اپنے اخبار کے اغراض و مقاصد کے سلسلہ میں لکھا تھا۔[1]

> "میرا اخبار نکالنے کا مقصد یہ ہے کہ میں پبلک کے سامنے ایسے مضامین رکھوں جن سے اُن کی معلومات میں اضافہ ہو اور اُن میں علم کی روشنی پھیلے اور اس کی بہتر اصلاح جہاں تک میرے امکان میں ہو میں کروں۔"

۴ اپریل ۱۸۲۳ء کو اخبارات کی آزادی کے خلاف حکومتِ وقت نے قانون پاس کیا۔ رام موہن رائے پہلے صحافی تھے جنہوں نے پریس کی آزادی کے لئے آواز بلند کی۔ انہوں نے اس قانون کے خلاف پُرزور احتجاج کیا اور جب کمپنی کی حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی تو انہوں نے انگلستان کے دروازے تک کھٹکھٹائے۔ لیکن رام موہن اپنے مقصد میں اُن دنوں کامیاب نہیں ہوئے اس لئے انہوں نے لکھا کہ[2] "حق کی آواز بلند کرنے کے لئے جو باتیں اور جس زبان کو اختیار کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ وہ زبان، وہ اندازِ بیان، وہ الفاظ حکومت کو کھٹکے گی اور ظاہر ہے کہ وہ ناراض ہو کر لائسنس ضبط کر دے گی پھر لائسنس لینے کی محنت کیوں کی جائے۔ اس لئے میں کچھ کہنے سے بہتر خاموش رہنا ہی عقلمندی خیال کرتے ہوئے اخبار بند کرتا ہوں۔

رموزِ سلطنت خویش خسرواں دانند ؛ گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش"
(مصلحتِ ملک)

تحفۃ الموحدین

تحفۃ الموحدین رام موہن کی واحد تصنیف ہے جس سے اُن کی فارسی و عربی زبان دانی کا ہم قیاس کر سکتے ہیں یہ رسالہ فارسی میں ہے اور اس کا مقدمہ عربی میں۔ رام موہن نے یہ رسالہ مرشد آباد کے قیام ۱۸۰۳-۰۴ء کے دوران تحریر کیا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا آزاد کالج لائبریری کلکتہ کے کتب خانے میں محفوظ ہے اور مطبوعہ نسخے کئی نامور کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں کیونکہ اس کے کئی ایڈیشن رام موہن رائے کی زندگی میں اور موت کے بعد بھی شائع ہوئے نیشنل لائبریری کلکتہ میں ۱۸۵۹ء

---

[1] تاریخ صحافت اُردو۔ از امداد صابری جلد اوّل

[2] ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں از محمد عتیق صدیقی

کا ایک ایڈیشن ہے۔ اس ایڈیشن کے سرورق پر ان کے نام کے آگے "بیکنٹ باغی" یعنی مرحوم لکھا ہوا ہے اور ان کا پورا نام "راجہ رام موہن رائے بہادر" درج ہے۔ یہ ایڈیشن "مطبع نجم الصعادہ در محلہ مہدی باغ کوچہ ناظر نجیب اللہ" بمکان نمبر ۵ شہر کلکتہ سے تاریخ ۱۵ فروری ۱۸۵۹ء کو شائع ہوا۔

اردو خدمات رام موہن رائے کی اردو تصانیف کی نایابی کی وجہ سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے صرف عربی، فارسی، انگریزی اور بنگلہ زبان ہی میں لکھا ہے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں ہے۔ راجہ ٹوڈرمل کے عہد سے رام موہن رائے کے زمانے تک فارسی ہندوستان کی سرکاری زبان تھی۔ آخر کار ۱۸۳۷ء میں بنگالی زبان نے فارسی کو عدالت سے نکال باہر کیا۔

جب عدالت سے فارسی کو ختم کرنے کا سوال اٹھا تو بعض لوگوں نے آواز بلند کی تھی کہ فارسی کے بجائے اردو کو درباری زبان قرار دیا جائے۔ جس کی وجہ سے کہیں کہیں اردو کو مقام بھی ملا تھا۔ اس سلسلہ میں کئی خطوط اس دور کے بنگلہ اخبار سماچار درپن میں شائع ہوئے — جن میں لوگوں نے فارسی سے اردو کو بہتر قرار دیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عدالت کے لوگ اردو کو فارسی کا بدل سمجھتے تھے نہ صرف رسم خط کے لحاظ سے بلکہ چونکہ اردو ہی فارسی سے قریب ترین زبان تھی۔ لیکن وکلا کی عدالتی اردو عوام میں مقبول نہیں ہو سکی، چونکہ ان کی اردو برائے نام ہی اردو تھی اور وہ حقیقی معنوں میں فارسی ہی رہی ہے۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی کے انگریز عالموں نے بھی اردو کو ہندوستان کی قابل ترین زبان اور رابطے کی زبان تسلیم کیا ہے۔ پھر ایک ایسے دور میں جب کہ فارسی و عربی صرف عالموں کی زبان تھی اور عوام میں اردو کی مقبولیت فارسی سے بہت زیادہ تھی۔ راجا رام موہن رائے جیسا ایک سماجی کارکن، ایک مصلح جسکو اپنے خیالات کا عوام میں پرچار کرنا تھا کیونکر اردو سے دور رہتا۔

جس طرح سنسکرت صرف عالموں کی زبان ہونے کی وجہ سے رام موہن نے سنسکرت کے بجائے بنگلہ زبان کو اپنایا۔ بالکل اسی طرح عربی و فارسی محض عالموں کی زبان ہونے کی وجہ سے انہوں نے اردو کو اپنایا۔

اردو کے نامور غیر ملکی پروفیسر گارساں دتاسی سے رام موہن کی خط و کتابت تھی۔ دتاسی نے اپنی تصنیف "تاریخ شعرائے اردو" میں لکھا کہ "رام موہن نے اردو میں بہت ہی کم تصنیف کیا ہے"۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ چاہے کم ہی کیوں نہ ہو، رام موہن نے اردو میں مضامین لکھے ہیں۔ گارساں دتاسی یہ بھی لکھتے ہیں کہ رام موہن نے ویدانت کو اردو میں مختصر کیا ہے۔ نواب سید نصیر حسین خیال مرحوم نے بھی لکھا ہے کہ رام موہن رائے نے وید کے بارے میں کئی مضامین اردو میں شائع کئے تھے اور ویدانت کو مختصر کر کے آسے بھی اردو میں شائع کیا تھا۔ گارساں دتاسی کی ایک اور تصنیف "اردو زبان کے قواعد" ۱۸۳۵ء میں فرانس سے شائع ہوئی۔ اس کے دوسرے حصے میں اردو اور ہندی کے جملہ ۱۸ خطوط ہیں۔ یہ حصہ ضمیمہ کے طور پر ۱۸۳۳ء میں شائع ہوا۔ ان خطوط میں رام موہن رائے کا ایک اردو خط بھی شامل ہے۔ فرانس دیکھنے کی آرزو رام موہن کے دل میں ایک عرصے سے تھی۔ ۱۸۳۳ء کے آخر میں آپ فرانس گئے بھی تھے اردو خط سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے گارساں دتاسی سے ملاقات کی تھی۔ یہ خط انگلستان میں قیام کے دوران فرانس جانے سے قبل رام موہن رائے نے دتاسی کو لکھا تھا خط حسب ذیل ہے۔

"جناب فضیلت مآب زاد مجدھم وشرفہم"

رقعۂ مبارک پہنچا۔ بندہ کو مسرور و معزز کیا۔ قادر علی الاطلاق آپ کو اس یاد آوری کے ساتھ سلامت رکھے تین مہینے سے بندہ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ انشاء اللہ عنقریب پارس میں مشرف خدمت ہوگا۔ آپ کی توجہ سے جناب فرینس صاحب کی ملاقات حاصل کرے گا۔ آپ کے وعدہ مراحات سے بندہ کمتر ممنون ہوا۔ ادائے شکر تہہ دل سے کرتا ہوں۔ زیادہ حد ادب

محرر فی التاریخ یکم اگست ۱۸۳۱ء خادم کم و ممنونکم۔ رام موہن

غالب نے اردو میں کوئی افسانہ یا مضمون نہیں لکھا لیکن اس کے باوجود غالب کو اردو نثر نگاری میں بلند، باعزت اور خاص الخاص مقام حاصل ہے اور اس کی وجہ وہ خطوط ہیں جو انہوں نے اردو میں اپنے دوست احباب، شاگردوں اور معاصرین کے نام لکھے ہیں بے شک غالب کے خطوط نے اردو نثر نویسی کو سادگی عطا کی اور مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ ان کے خطوط کی اہمیت مسلم ہے لیکن راجہ رام موہن رائے کے اس خط کی جو اوپر نقل کیا گیا ہے، اہمیت بھی کم نہیں کیونکہ یہ خط گواہ ہے کہ رام موہن رائے اردو اردو کے اولین خطوط لکھنے والوں میں سے ہیں

۱۔ آج کل کے جون ۱۹۵۶ء کے شمارے میں جناب مختار الدین احمد صاحب کے مضمون "راجہ رام موہن رائے کا ایک اردو رقعہ" میں یہ خط پہلے بھی شائع ہو چکا ہے۔ (ادارہ)

۲۔ مختار الدین احمد صاحب کے مضمون میں "انشاء اللہ تعالیٰ" درج ہے۔ (ادارہ)

۳۔ مختار الدین احمد صاحب کے مضمون میں شیزی (M. Chezy) صاحب درج ہے۔ اور "حرر فی التاریخ یکم اگست ۱۸۳۱ء کے بعد یہ فقرہ ہے "جناب شفقت فرمائے گرامی قدر فارس صاحب کے حوالے کیا گیا" مختار الدین صاحب نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ اس خط کے قاصد فارس صاحب ایک انگریز مستشرق تھے جنہوں نے "قصہ حاتم طائی" کا ترجمہ شائع کیا تھا لیکن شیزی صاحب کے بارے میں مزید معلومات دستیاب نہیں خط کے لفافے پر پتا یوں درج تھا "جناب فضیلت مآب جامع علوم عربی و ہندی مولوی گارسین دتاسی زاد مجدہم۔ دار السلطنۃ پارس۔ فرانس"۔ (ادارہ)

کیا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ زیادہ بچّے ہوں تو مُستقبل میں آمدنی بھی زیادہ ہوگی ؟

اکثر کہا جاتا ہے کہ ہر بچّہ اپنے ساتھ دو ہاتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ آدمی کھاتا پیتا تو ساری عمر ہے لیکن خوراک پیدا کرنے کا کام زندگی کے کچھ حصّے میں ہی کر سکتا ہے۔ نئے طریقوں سے ہم پیداوار بڑھا سکتے ہیں لیکن ان طریقوں کے استعمال کے لئے بہتر تعلیم اور مہارت کی ضرورت ہے۔ ایک تعلیم یافتہ شخص زندگی میں بالآخر زیادہ کامیاب رہتا ہے۔

اگر آپ کے زیادہ بچّے ہوں گے تو آپ کو انھیں اچھی تعلیم اور بہتر خوراک دینے میں دقّت پیش آئے گی۔

محدود تعداد میں پڑھے لکھے اور صحت مند بچّے زیادہ تعداد میں اَن پڑھ اور کمزور بچّوں کی نسبت زیادہ کما سکیں گے۔

davp 72/283

غزلیات

پریم وار برٹنی

۶۴۰ سیکٹر ۸ بی چنڈی گڑھ پنجاب

نہ پوچھ دل کے خرابے سے اور کیا نکلا
بڑی تلاش کے بعد ایک نقشِ پا نکلا

رُکے تو چاند بہت دُور تھا تصوّر سے
چلے تو چار ہی قدموں کا فاصلہ نکلا

خرد کے پھول تو مرجھا گئے، بہاروں میں
جنوں کا زخم خزاں میں ہرا بھرا نکلا

سفرِ شباب کا حد درجہ مختصر تھا، مگر
بہت طویل سرابوں کا سلسلہ نکلا

رہِ شعور میں پلکوں سے خار کس نے چنے
مرا ہی شوقِ سفر تھا، جو رہ نما نکلا

وصالِ یار تو قسمت کی بات ہے بے شک
خیالِ یار بھی ہم سے بہت خفا نکلا

سیاہ رات میں لَو دے اُٹھے لہو کے چراغ
رباب عشق سے وہ شعلۂ نوا نکلا

جعفر عسکری

بوسکان پروفیسر احتشام حسین (مرحوم) نور اللہ روڈ۔ الہ آباد

فضا میں نقش بنا کر گیا تھا پچھلے پہر
ترا خیال ستارہ بنا تھا پچھلے پہر

پڑا ہوا تھا جو مقتول بے کفن اس پر
لباسِ مجرم کا پردہ پڑا تھا پچھلے پہر

کوئی تو خواب میں آ کر گیا تھا تم جیسا
مجھے گمان سایہ ہو رہا تھا پچھلے پہر

ہر ایک راستہ ویراں تھا دشت دل کی طرح
فسادِ خوف کا برپا ہوا تھا پچھلے پہر

نہ سن کیا تو سے جسم سے لگا لوں گا
تو چہرہ دل میں اُبھر کر اٹھا تھا پچھلے پہر

وشوا ناتھ درد

پوسٹ بکس ۲۵۶۸ نئی دہلی۔ ۵

اگر کچھ موڑ رستے میں نہ آتے
تو ممکن تھا تجھے ہم بھول جاتے

متاعِ ہوش کی بازی لگا کر
بساطِ عشق پر ہم ہار جاتے

کہاں ماضی کہاں امروز و فردا
کہاں سے داستاں اپنی سناتے

غرورِ ضبط سے پہلو بچا کر
تمہیں کو دوستو ہم آزماتے

اگر مانا نہ کچھ خود پر بھروسہ
تمہیں اے درد ہم محرم بناتے

مجیب بستوی

سرپاداں بازار بستی اُتر پردیش

میسر ہے مرنے کے جو کرتے رہے ساماں کتنے
آج وہ بھی نظر آتے ہیں پریشاں کتنے

آپ ہی کیجئے خود اپنے رویے پہ نظر
آپ نے ہم سے کئے وعدہ و پیماں کتنے

آہ گلچیں ترے دل میں ہے مروت کہ نہیں
تو نے تاراج کئے صحن گلستاں کتنے

ایک لمحے کے لئے جن کو نہیں ہے آرام
ایسے دنیا میں نظر آتے ہیں انساں کتنے

ڈوبنے والا سفینہ تھا مرا ڈوب گیا
دیکھتے تھے لبِ ساحل سے نگہباں کتنے

وادیٔ عشق میں رکھئے نہ قدم آپ مجیب
ہوئے گمراہ یہاں صاحبِ ایماں کتنے

نئی کتابیں

حرفِ نیم شب

۱۹۳۶ء میں جب ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو نوجوان شاعروں کا ایک پورا قافلہ تھا جو اس تحریک کے زیرِ اثر آگیا۔ ان میں ایسے شاعر کم تھے جنہوں نے اس تحریک کے بنیادی مقاصد کو تفصیلات کی حد تک جان کر اس کا ساتھ دیا ہو، مارکسزم پر عقیدہ رکھنے والے، گاندھی ازم کے پیرو، تحریکِ آزادی وطن کے سپاہی یا پھر صرف نئے رجحانات کو فروغ دینے اور فرسودگی اور رسمیت کے عناصر کو شعر و ادب سے خارج کرنے کے حامی شعراء، یہ سبھی ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے۔ شمیم کرہانی اس گروہ کے ان شاعروں میں ہیں جو تحریکِ آزادیِ وطن کی حمایت کی راہ سے اس پلیٹ فارم پر پہنچے تھے۔ چنانچہ ان کی چالیس سالہ شاعری کا توجہ سے جائزہ لیا جائے تو یہ جنگِ آزادی کے مختلف مراحل کی نشاندہی کرتی نظر آئے گی۔ اس ضمن میں ان کی نظمیں خصوصیت سے قابلِ توجہ ہیں لیکن ان کا یہ ذہنی پس منظر ان کی غزلوں میں بھی قدم قدم پر اپنی جھلکیاں دکھاتا ہے۔ "حرفِ نیم شب" ان کی تازہ غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ان کی غزلوں کے یہ شعر دیکھئے اور اس کسک کو محسوس کیجئے جو آزادیِ وطن کے ۲۵ سال بعد شاعر کے نہاں خانۂ دل کے کسی نامعلوم گوشے میں جگہ بنا رہی ہے:

اور بڑھے گا دردِ دل رات جو بھیگ جائے گی
دیکھ نہ وقت کی طرف، وقت بھی چارہ گر نہیں

ہم تو خزاں کی دھوپ میں خونِ جگر چھڑک چلے
موسمِ گل کی چاندنی کس کو ملے، خبر نہیں

رفوگرانِ چمن کی رفوگری دیکھو
کہ چاک چاک ہے پیراہنِ چمن سارا

کہتے ہو کہ انسان کی تقدیر بدل دی
تاریخ تو ماتھے پہ شکن لے کے چلی ہے

کتاب کے حرفِ آغاز میں شمیم صاحب نے اپنے نظریۂ فن پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے "ایسی داخلیت جو خارجی مشاہدات سے ہم آہنگ ہو کر خاص قسم کا انشراحِ قلب و نظر پیدا کرے، وہ سچی شاعری ہے۔ نظم ہو یا غزل دونوں میں داخلیت اور خارجیت کے امتزاجِ خاص کا ہونا ضروری ہے۔" ان کا یہ اندازِ نظر انہیں اپنے ان بہت سے ہم عصروں سے الگ کر دیتا ہے جو صرف خارجی مظاہر ہی کی ترجمانی کو شاعری کا اول و آخر مقصد قرار دیتے رہے ہیں۔ ان کی شاعری کو واقعات کا بے کیف بیان بننے سے جس چیز نے روکا وہ غالباً ان کا یہی اندازِ نظر ہے۔ ان کے ایسے اشعار بھی جو اپنا ایک واضح سیاسی پس منظر رکھتے ہیں، جذبے کی چاشنی سے خالی نہیں اور یہ ان کی شاعری کا ایک قابلِ قدر وصف ہے۔ اپنی داخلی کیفیات سے دستبردار نہ ہونے کی اس روش ہی نے انہیں یہ ذہنی حوصلہ مندی بھی بخشی ہے کہ خارجی حالات کی نامساعدت کے سامنے سپر نہ ڈالی جائے اور اپنی دنیا آپ تخلیق کرنے کے عقیدے کو ہاتھ سے نہ دیا جائے۔

ظلمتِ گہہِ دوراں میں صبحِ چمنِ دل ہوں
روکو نہ سفر میرا میں قسمتِ منزل ہوں

جگر کے داغ کوئی کم ہیں روشنی کے لئے
میں جاگتا ہوں ستاروں سے کہہ دو سو جائیں

ظلمتِ وقت سے کہو حسرتِ دل نکال لے
ظلمتِ وقت کے لئے آج کی رات اور ہے

دوائے دل کے لئے، اپنے پاس آیا ہوں
کہ میرے درد کا درماں ہے کون میرے سوا

شمیم صاحب کی غزلوں کا ایک اور وصف ان کا موضوعاتی تنوع ہے، حیاتِ انسانی کے مختلف پہلو، مختلف تصویریں ان کی غزل کے آئینے میں اپنی جھلکیاں دکھاتی نظر آتی ہیں۔ یہ پہلو، یہ تصویریں ایسی ہیں جو عام نگاہوں کے سامنے آکر بھی خود کو پوری طرح بے نقاب نہیں کرتیں۔ شمیم صاحب نے انہیں بے نقاب دیکھا ہے لیکن ان کی رونمائی کا فنی فریضہ ادا کرتے ہوئے ان کے خط و خال پر ابہام کا ایک ہلکا سا غازہ باقی رکھنا ضروری سمجھا ہے۔ غازے کی یہ ہلکی سی تہہ عبارت ہے۔ لہجے کی اس تہہ داری سے جس سے شمیم صاحب کی غزل مملو ہے اور جو ہمیشہ اچھی غزل کی خصوصیت سمجھا گیا ہے، شمیم صاحب کا رزارِ حیات کے محض

مشاہد یا متصر نہیں ہیں بلکہ وہ اس نبرد آزمائی میں خود بھی ذہنی اور روحانی طور پر شریک ہیں۔ اس لئے اس کے تمام مراحل پر ان کی واقف کارانہ نظر ہے، محرمانہ گرفت بھی ہے۔ وہ نقش و نگار پر دہ در کی دلکشی ہی میں کھو کر نہیں رہ جاتے بلکہ ان کی نظر پس پردہ کی حقیقتوں تک بھی رسا ہونے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

سبھی تھے محو نظارہ کہ عام تھا جلوہ
جھکی رہی سر محفل مری نظر تنہا
نگاہ آرزو سے چپکے چپکے گدگدائے جا
الٹ دیں گے نقاب اہل حرم آہستہ آہستہ
حسن سے بڑھتی گئی فکر و نظر کی پختگی
عشق سے جذبات کو گہرائیاں ملتی گئیں

حسن و عشق کے معاملات سے اردو کی غزلیہ شاعری کو خاص شغف رہا ہے۔ شمیم صاحب کی غزلیں گواہی دے رہی ہیں کہ وہ بھی اس وادی کے باخبر مسافر ہیں۔ حسن سے خواہ وہ کسی صورت میں جلوہ نما ہو، انہیں ایک والہانہ لگاؤ ہے اور حسن اور اس کے مختلف مظاہر سے اس لگاؤ ہی کا دوسرا نام عشق ہے۔ شمیم صاحب کی غزلوں میں عشقیہ جذبات کی ترجمانی بھی بڑے متنوع اور گوناگوں انداز میں ہوئی ہے کہیں ان جذبات کی بیداری کا سبب حسن کی دوری ہے تو کہیں اس کی قربت کبھی کسی کی بے رخی نے ان کے دل کے تاروں کو جھنجھنا دیا ہے تو کبھی کسی کی نگاہ لطف ان کے ساز احساس کی مضراب بن گئی ہے گویا شاعر کسی خاص کیفیت یا جذبے کا اسیر نہیں، غم ہو یا نشاط، امید کے لمحے ہوں یا مایوسی کی گھڑیاں، سبھی حالتوں میں اپنی فنکارانہ ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کا گر جانتا ہے۔

شمیم صاحب کے اسلوب میں روایت کا رچاؤ ہے لیکن اس کھردرے پن سے بھی وہ گریزاں نظر نہیں آتے جو جدت کی راہ سے شاعر کے کلام میں در آتا ہے۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ ان کے کلام میں زبان و بیان کی خامیاں کم ہی تلاش کی جا سکتی ہیں۔

"حرف نیم شب" ۲۰×۳۰/۱۶ سائز کے ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت، طباعت روشن ہے اور قیمت چھ روپے ہے۔ ملنے کا پتہ یہ ہے حلقہ ارباب فکر، ۲۴۳ کوچہ میر عاشق، چاوڑی بازار، دہلی ۶

نقوش جاوید

سہارنپور یوپی کا ایک مردم خیز مقام ہے۔ علما اور ادبا کے علاوہ یہاں وقتاً فوقتاً خوش فکر شعرا بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب یہاں کے ۶۴ زندہ شعرا کے تذکرہ اور انتخابات کلام پر مشتمل ہے۔ کتاب کے مرتب حافظ محمد ہارون صاحب سہارنپوری خود بھی ایک نوجوان شاعر ہیں جن کا تعارفی خاکہ کتاب کے شروع ہی میں خفیف [illegible] نظر یا کے خوبصورت قلم سے پیش کیا ہے۔ اور کتاب کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں ان کی محنت اور خوش سلیقگی کو سراہا ہے۔ تذکرے اور منتخب کلام کے علاوہ کتاب میں بہت سے شاعروں کی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔

کتاب کے پیش لفظ میں واصف ماہری، احسن جونپوری اور مرتب کے شریک کار بھی ہیں نے اس کی ہے کہ [illegible] وجوہ سے شعرا کے کلام پر اصلاح دینے سے عموماً اجتناب کیا گیا ہے۔ اس لئے کوئی تو اصلاح نہیں ہے البتہ خصوص جب کتاب کا مقصد محض شعرا کا تعارف نہیں بلکہ یہ واضح ہے کہ کتاب میں اس اصول کی پابندی کہیں کہیں کی گئی ہے۔ اور اکثر شعرا کے کلام کی مبالغہ آمیز ترقی قدم قدم پر نظر آتی ہے۔ ترتیب میں پہلا نام محمد سعید اللہ صاحب اسعد کا ہے جن کے تذکرے میں ہمنوا دیگر باتوں کے چوما بھی نظر آتا ہے۔ مختصر یوں کہہ لیجئے کہ آپ شعرا زاہد میدان میں اقبال، جگر، اور جوش و فراق کے مرتبے اور اسی سطح پر فائز ہیں۔ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ آرائے کتاب کے وقار اعتبار کو ضعف پہنچایا۔ تاہم اس کی یہ افادیت اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس شہر کے بہت سے معاصر شعرا کا منتخب کلام اور مختصر سوانحی حالات اس میں یکجا ہو گئے ہیں۔ کتاب کی قیمت ڈیڑھ روپے پچاس پیسے ہے۔ کئی پتوں سے طلب کی جا سکتی ہے جن میں سے پہلا یہ ہے۔

یوسفی کتب خانہ، بازار نخاسہ، سہارنپور (یوپی)

خون جگر

جناب عاقل لاہوری کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں غزلوں اور نظموں کے علاوہ قطعات اور رباعیات بھی شامل ہیں۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر منور سہسوانی، افقر موہانی مرحوم اور حیرت بدایونی صاحب کی آرا عاقل صاحب کے کلام کے بارے میں درج ہیں، اور آئینہ افکار کے عنوان سے خود عاقل صاحب نے بھی اپنی شاعری کے بارے میں کچھ امور کی وضاحت کی ہے جس میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ انہوں نے تین استادوں سے فیض حاصل کیا ہے۔ ابتدا میں انہوں نے افقر موہانی صاحب کی شاگردی اختیار کی، پھر کچھ مدت تک جناب منور لکھنوی کو اپنا کلام دکھاتے رہے اور آجکل ڈاکٹر منور سہسوانی سے اصلاح لے رہے ہیں حصول فن کے لئے عاقل صاحب کی یہ لگن قابل داد ہے اور ان کے کلام میں جا بجا زبان و بیان کی جو پختگی نظر آتی ہے اسے ان کی اسی لگن کا ثمرہ سمجھنا چاہئے۔ شاعری کے روایتی اسالیب پر ان کی نظر ہے۔ انھیں برتنے کا ڈھنگ بھی وہ جانتے ہیں اور یہ بڑی بات ہے لیکن ان اسالیب کی توسیع کی طرف ان کا دھیان نہیں جاتا اور یہ ایک جوان العمر شاعر کے لئے کوئی اچھا شگون نہیں۔ ذاتی احساس کی گرمی بھی

ان کے کلام میں کم سے کم ہے۔ ہر رنگ کے اشعار جن میں اچھے اشعار بھی ہیں ان کے ہاں مل جائیں گے لیکن خود ان کا اپنا کوئی رنگ ان اشعار میں مشکل ہی سے نظر آئے گا۔

کتاب کی قیمت چار روپے پچاس پیسے ہے۔ انڈین بکڈپو۔ مال روڈ شملہ کے علاوہ ملنے کے اور بھی کئی پتے درج ہیں۔

یہ ایک تبسم ۔۔۔۔

یہ جناب برق آشیانوی کے سترہ ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اپنے موضوعات کی کھوج میں مصنف کو دوڑ دھوپ کر کے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں پڑی ہے۔ اپنے گرد و پیش کے ماحول ہی میں انھیں ایسے عنوانات مل گئے ہیں جو ان کے مزاح نگار قلم کا ہدف بن سکیں۔ کتاب کے دیباچہ نگار جناب بھارت چند کھنہ نے اس پر زور دیا ہے کہ یہ مضامین مزاح کے ساتھ ساتھ گہرے سماجی طنز کے بھی حامل ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان مضامین کی خوبی ان کے ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز ہی میں مضمر ہے۔ طنزیہ تحریر میں دو دھاری تلوار کی سی جو کاٹ ہونی چاہیئے۔ وہ ان مضامین میں کم سے کم نظر آئے گی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان مضامین کی خوبی ان کے ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز میں مضمر ہے طنزیہ تحریر میں دو دھاری تلوار کی سی جو کاٹ ہونی چاہیئے وہ ان مضامین میں کم سے کم نظر آئے گی لیکن تشگفتگی خیال کے عنصر سے یہ مضامین مملو ہیں۔ اور انھیں ایک تبسم زیر لب کے ساتھ بڑی دلچسپی سے پڑھا جا سکتا ہے۔

کتاب کا نام جوش ملیح آبادی کی ایک مشہور رباعی سے مستعار ہے۔ یہ رباعی کتاب کے شروع میں درج کی گئی ہے لیکن اس کا دوسرا مصرعہ غلط لکھا گیا ہے۔ مصرعہ لفظ "کیوں" سے نہیں "بس" سے شروع ہونا چاہیئے۔

کتاب کا گیٹ اپ خوشنما ہے۔ تین روپے میں اس پتے سے طلب کی جا سکتی ہے۔

زندہ دلانِ حیدرآباد۔ ۳۷، مجرد گاہ۔
معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد ۱

سنگریزے

جناب حیرت کوکنی کا مجموعۂ کلام ہے۔ جیسا کہ کتاب کے دیباچہ نگاروں نے کہا ہے حیرت صاحب کا شمار اپنے علاقے کے کہنہ مشق شاعروں میں ہوتا ہے۔ اور ان کا کلام نگار جیسے معیاری جریدے میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگرچہ شاعری کے خارجی فنی لوازم کو ذہن میں رکھکر حیرت صاحب کے کلام کو دیکھا جائے تو وہ بہت سی خوبیوں کا حامل نظر آئے گا۔ زبان و بیان کی صحت و صفائی، بندش کی چستی اور لفظی مناسبات کا خیال یہ سب باتیں جنہیں اچھی شاعری کی خصوصیات میں گنا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں ملتی ہیں۔ لیکن شاعری بالخصوص غزلیہ شاعری، شاعر سے ان سب باتوں کے علاوہ اور بھی کئی چیزوں کی متقاضی ہوتی ہے۔ ذاتی تجربے کی راہ سے کلام میں در آنے والی تازگی خیال کی کیفیات کی گرمی سے نمو پانے والی ندرتِ احساس، ان عناصر سے [illegible] صاحب کا کلام بڑی حد تک خالی ہے۔ طے شدہ شعری مفروضوں کو بڑی کامیابی سے موزوں الفاظ کا جامہ پہنا سکتے ہیں اور یہ بھی ایک ایسی خوبی ہے جس کی قدر کی جانی چاہیئے۔ بالخصوص اس لئے کہ یہ قدرت انہوں نے ایک ایسے علاقے میں [illegible] ہے حاصل کی ہے جو اردو شعر و ادب کے مراکز سے بہت دور ہے۔ لیکن مر[illegible] سالب بیان پر اپنی اس قدرت کو اگر وہ اپنے انفرادی کردار کے [illegible] کا وسیلہ بنا سکتے تو شاید ان کا کلام اور بھی زیادہ قابل قدر ہوتا۔

کتاب کے ایک دیباچہ نگار عبدالستار دلوی صاحب نے سیاسی طور پر انھیں اشتراکیت کا موئید اور حامی بیان کیا ہے۔ اس کی جھلکیاں بھی ان کے کلام میں ملتی ہیں لیکن اس سلسلے کے اشعار پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اشتراکیت کی تائید و حمایت کا میلان بھی ان کے ہاں تقلیدی نوعیت ہی کا ہے۔ اور ان کی شخصیت کا حصہ نہیں بن سکا ہے۔

کتاب کی قیمت تین روپے پچاس پیسے ہے اور ملنے کے یہ دو پتے ہیں۔

۱۔ سکریٹری اردو ادبی کمیٹی پانگاری۔ تعلقہ گوہاگر، ضلع رتناگری۔
۲۔ سکریٹری اردو ادبی کمیٹی شاخ بمبئی۔ ۲۱ ٹینک اسٹریٹ۔ بمبئی ۸

شخصیتیں

دور آفریدی صاحب ایک شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اب انہوں نے خاکہ نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ خاکہ نگاری کا چلن اردو میں زیادہ پرانا نہیں لیکن پچاس ساٹھ سال کی مختصر مدت میں بھی اس زبان میں کئی ایسے خاکہ نگار پیدا ہوئے جنھوں نے اس فن کی بلندیوں کو چھو لیا مرزا فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق، اشرف صبوحی، رشید احمد صدیقی شاہد احمد دہلوی، سعادت حسن منٹو، شوکت تھانوی اور دوسرے کئی ادیبوں کے نام اس سلسلے میں لئے جا سکتے ہیں۔ ان ادیبوں کے ہاں خاکہ نگاری کا جو معیار نظر آتا ہے اسے ذہن میں رکھکر زیر نظر کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آفریدی صاحب نے اپنے پیشروؤں کے اکتسابات سے کچھ زیادہ فیض نہیں اٹھایا ہے۔ تاہم یہ چونکہ ان کی پہلی کوشش ہے اس لئے اسے اس معیار پر پرکھنا شاید زیادہ صحیح بھی نہ ہو۔ اس کتاب میں گیارہ ایسی شخصیتوں کے خاکے ملتے ہیں جو علم و ادب کے مختلف گوشوں میں ممتاز مقام کی مالک ہیں۔ دور آفریدی صاحب کا طریق کار یہ ہے کہ کسی

شخصیت کے خدوخال اجاگر کرتے ہوئے، پس منظر کے طور پر صاحب شخصیت خاندانی حالات اور اس کی ابتدائی زندگی کے ماحول پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ اس طرح ان خاکوں میں تذکرے کا عنصر بھی آمیز ہو گیا ہے۔ عندلیب دانی، امتیاز علی عرشی، شاد عارفی اور حیرت شملوی کے خاکوں میں اس طریق سے انہوں نے بہ طور خاص کام لیا ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ ہو کہ ان محترم شخصیتوں کا رامپور سے گہرا تعلق ہے۔ اور خود دور صاحب بھی رامپور رہنے والے ہیں اور اس طرح ان کے بارے میں ان کی معلومات کا دائرہ دور پھیلا ہوا ہے۔

کتاب کا بارھواں مضمون خود دور آفریدی صاحب کے بارے میں لیکن اسے خاکے سے زیادہ خود نوشت تذکرہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس مختصراً انہوں نے اپنے خاندانی حالات کا ذکر کیا ہے اور پھر اپنی زندگی کے تجربات بیان کئے ہیں جو مختلف مقامات سے وابستہ ہیں۔ کتابت و طباعت لحاظ سے کتاب معیاری ہے۔ قیمت تین روپے ہے۔ خود مصنف کے سے طلب کی جا سکتی ہے۔ جو یہ ہے دور آفریدی۔ اردو ریسرچ اکاڈمی میر عثمان خاں۔ رامپور۔ (یوپی)

بیسویں صدی میں مغربی بنگال کے اردو شعرا

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، یہ بنگال کے ان اردو شاعروں کا تذکرہ ہے جو موجودہ صدی کے آغاز سے اب تک سامنے آئے ہیں۔ کتاب کے مرتب مشتاق احمد صاحب ہیں جو کلکتہ کے ایک نوجوان صحافی اور افسانہ نگار ہیں اور تحقیقی مشاغل سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔

کتاب کا آغاز تقریظوں سے ہوتا ہے جن میں کتاب کی افادیت اور اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے جو کتاب کی ترتیب اور تدوین کے سلسلے میں مرتب کو پیش آئیں۔ ان مشکلات پر انہوں نے جس طرح قابو پایا اس کی بھی داد دی گئی ہے۔ کتاب کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے ایک دو جگہ یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اس طرح کے علاقائی نوعیت کے تذکرے اس ناانصافی کی تلافی کر سکتے ہیں جو اردو کے مراکز میں بیٹھے ہوئے تذکرہ نگار یا ناقدین دور افتادہ علاقوں کے شاعروں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ راقم الحروف اس قسم کے تذکروں کی افادیت کا منکر نہیں لیکن جہاں تک مبینہ ناانصافی کا تعلق ہے۔ یہ محض قیاسی ہے۔ اور حقیقت کی دنیا میں اس کا وجود نہیں۔ مثال کے طور پر پروفیسر شاہ مقبول احمد صاحب کی اس شکایت کو لیجئے کہ اردو کے بعض ادبی مورخین نے شاد عظیم آبادی اور رضا علی وحشت کلکتوی جیسے شاعروں کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا ہے۔ ان تاریخ نگاروں کے طرز عمل کی حد تک یہ شکوہ بجا ہے لیکن اسے ان کی انفرادی کوتاہی سمجھنا چاہئے۔ ایک ایسی کوتاہی جو قابل گرفت بھی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان کی طرف سے نظر انداز کئے جانے کے باوجود کیا اردو کا کوئی طالب علم ایسا ہے جو شاد اور وحشت کے نام، کام اور اردو شاعری میں ان کے مقام سے ناواقف ہو؟ اور اگر وحشت کا تذکرہ زیر تبصرہ کتاب میں بھی شامل نہ ہوتا تو کیا ان کے شاعرانہ مرتبے میں کوئی کمی آجاتی؟ البتہ اس سے اس کتاب کے درجۂ اعتبار کو ضرور ضعف پہنچتا۔ یہی حال ان دوسرے ادبی تذکروں کا ہے جو ایسے اہم شاعروں کے ذکر سے خالی ہیں۔ ایسا کر کے مرتبین نے ان شاعروں کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی، خود اپنے کار منصبی کے ساتھ انصاف برتنے میں ناکام رہے ہیں۔

زیر نظر کتاب میں وحشت کلکتوی سے نجومی بلیاوی تک ۱۸۲ شعراء اور شاعرات کے سوانحی حالات اور کلام کا انتخاب درج کیا گیا ہے۔ اور ان میں سے ۱۰۳ کی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ اس سے کتاب کی جامعیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ناموں کی فہرست شعراء کی تاریخ پیدائش کے اعتبار سے ترتیب دی گئی ہے۔ لیکن جیسا کہ مرتب نے اعتراف کیا ہے، یہ التزام برقرار نہیں رہ سکا ہے کیونکہ بہت سے شعراء کی تاریخ پیدائش انھیں معلوم نہ ہو سکی اور بعض کی بعد از وقت معلوم ہوئی جب کتاب کا بیشتر حصہ ترتیب پا چکا تھا۔ اگر ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے رکھی جاتی تو اس دشواری پر قابو پایا جا سکتا تھا۔ اب صورت یہ ہے کہ ترتیب میں کسی اصول کی کارفرمائی نظر نہیں آتی۔ شعراء کے حالات میں بھی عدم توازن نظر آتا ہے۔ بعض شاعروں کے حالات بہت تفصیل سے قلم بند کئے گئے ہیں۔ بعض کے سرسری انداز میں اختصار کے ساتھ۔ "عرض مصنف" میں اس طریق کار کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ سب سے تفصیلی تعارف خود مرتب کا ہے جو کتاب کے تعارف کے ذیل میں حرمت الاکرام صاحب نے لکھا ہے۔ کتاب کے ابتدائی صفحات میں مرتب کی تصویر بھی بہت نمایاں طور پر شائع کی گئی ہے۔ کتاب کا ایک کمزور پہلو وہ تنقیدی آرا ہیں۔ جو بعض شاعروں کے کلام پر ان کے تذکرے کے ذیل ہی میں ظاہر کر دی گئی ہیں۔ یہ آرا کس قسم کی ہیں۔ اس کا اندازہ مندرجۂ ذیل ایک رائے سے ہو سکتا ہے جو رضا علی وحشت کے بارے میں ظاہر کی گئی ہے۔

"اگر وحشت صاحب اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتے، اپنی اور دوسروں کی سسکتی بلکتی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو نظموں کا جامہ پہناتے، تحریک آزادی، فسادات، دنیا کے انقلاب اور قدرتی مناظر پر اشعار کہتے تو آج وہ جتنے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں اس سے کئی گنا بڑے شاعر ہوتے۔"

کتاب کا نثری حصہ کتابت کی غلطیوں سے پاک ہے مگر اشعار میں اکثر غلطیاں راہ پا گئی ہیں اور شعر ناموزوں ہو گئے ہیں۔ چھپائی صاف اور روشن ہے کتاب ۲۰×۳۰ سائز کے ۳۸۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ تصویروں کے صفحات اس کے علاوہ ہیں۔ جلد ریکسین کی ہے اور قیمت بیس روپے جو زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

ملنے کا پتہ

اقبال احمد اینڈ برادرس ۱۴ سید صالح لین۔ کلکتہ۔ ۷

(مخمور سعیدی)

اگلا بچہ ہونے سے پہلے

ذرا سوچیے

کیا آپ اس بچے
کی صحیح دیکھ بھال
نہیں کرنا چاہیں گے ؟

اس کے روشن مستقبل کیلئے اعلیٰ تعلیم کی شروعات اور باقی سبھی ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام... لیکن اگر بچہ جلد ہو گیا تو یہ سب کچھ کرنا آپ کے لئے مشکل ہوگا۔ آپ اس پریشانی سے ضرور بچنا چاہیں گے۔

نِرودھ کی مدد سے اب آپ اگلے بچے کی پیدائش کو تب تک ٹال سکتے ہیں، جب تک آپ اسکی پوری دیکھ ریکھ کرنے لائق نہیں ہو جاتے۔

نِرودھ مردوں کیلئے ہے۔ ربڑ سے بنا حمل روکنے کا یہ آسان ذریعہ برسوں سے ساری دنیا میں مقبول ہے۔ آپ بھی نِرودھ استعمال کیجئے۔

نِرودھ ہر جگہ ملتا ہے۔ سرکاری رعایتی دام، 15 پیسے میں 3

جب تک نہ چاہیں تب تک نہ پائیں سنتان

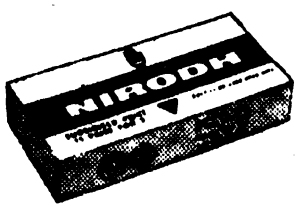

نِرودھ

لاکھوں میں مقبول، بے ضرر اور آسان

کریانہ فروشوں، دوا فروشوں، پنساریوں، پان و سگریٹ کی دکانوں وغیرہ کے یہاں بکتا ہے۔

davp 71/460

صدرِ بنگلہ دیش کا ہند میں دورہ

بنگلہ دیش کی عوامی جمہوریہ کے صدر ہز ایکسی لینسی جسٹس ابوسعید چودھری اپنی بیگم صاحبہ ۲۷ نومبر ۱۹۷۲ء کو ہند کے دس دن کے دورے پر تشریف لائے۔ نئی دھلی کے ہوائی اڈے پر راشٹر پتی شری وی۔ وی۔ گری اور وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔

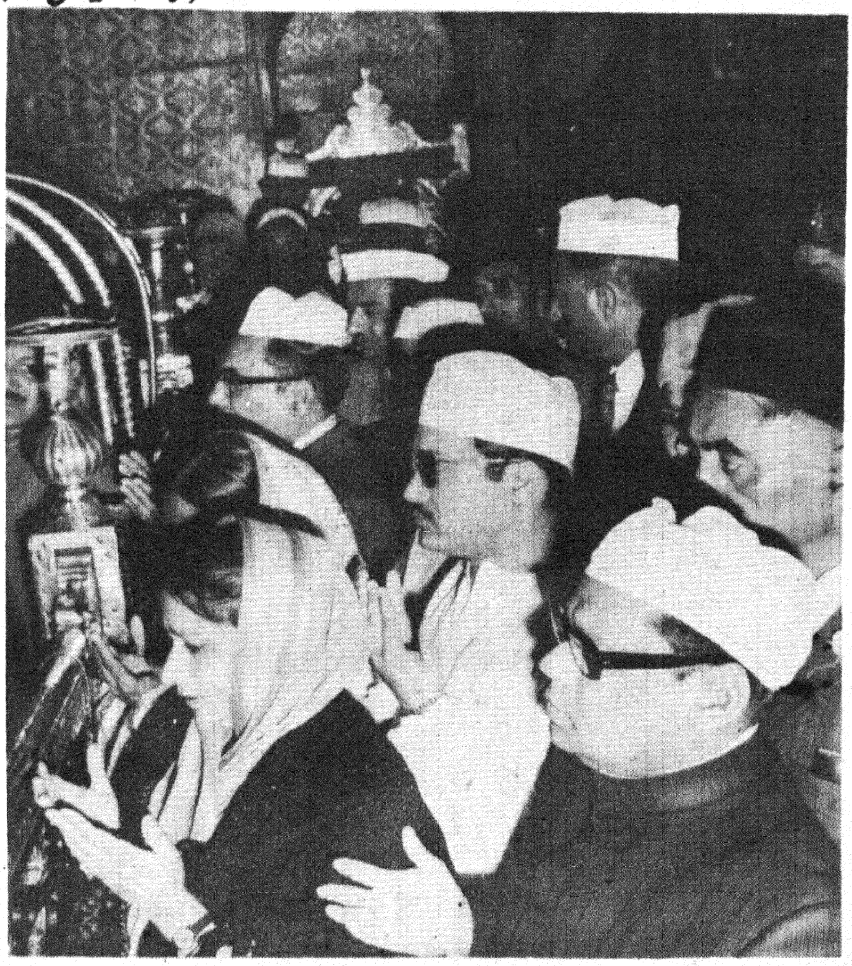

یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کو صدر بنگلہ دیش و بیگم صاحبہ نے اجمیر میں درگاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی زیارت کی اور مزار شریف پر فاتحہ پڑھا۔

بنگلہ دیش کی عوامی جمہوریہ کے صدر ہز ایکسی لینسی جسٹس ابو سعید چودھری اور ہند کی وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی ۔

۶ دسمبر ۱۹۷۲ کو شریمتی اندرا گاندھی نے وشوا بھارتی یونیورسٹی کے چانسلر کی حیثیت سے صدر بنگلہ دیش کو وشوا بھارتی کا سب سے بڑا اعزاز "دیش کوشمہ" پیش کیا ۔

ہند کی افواج کے چیف آف اسٹاف جنرل ایس۔ ایچ ایف جے مانکشا (دائیں) اور پاکستانی افواج کے چیف جنرل ٹکا خان نے رزم کے مسائل کو رزم میں سلجھانے کے لئے ۲۸ نومبر اور ۷ دسمبر ۱۹۷۲ کو لاہور میں بات چیت کی ۔

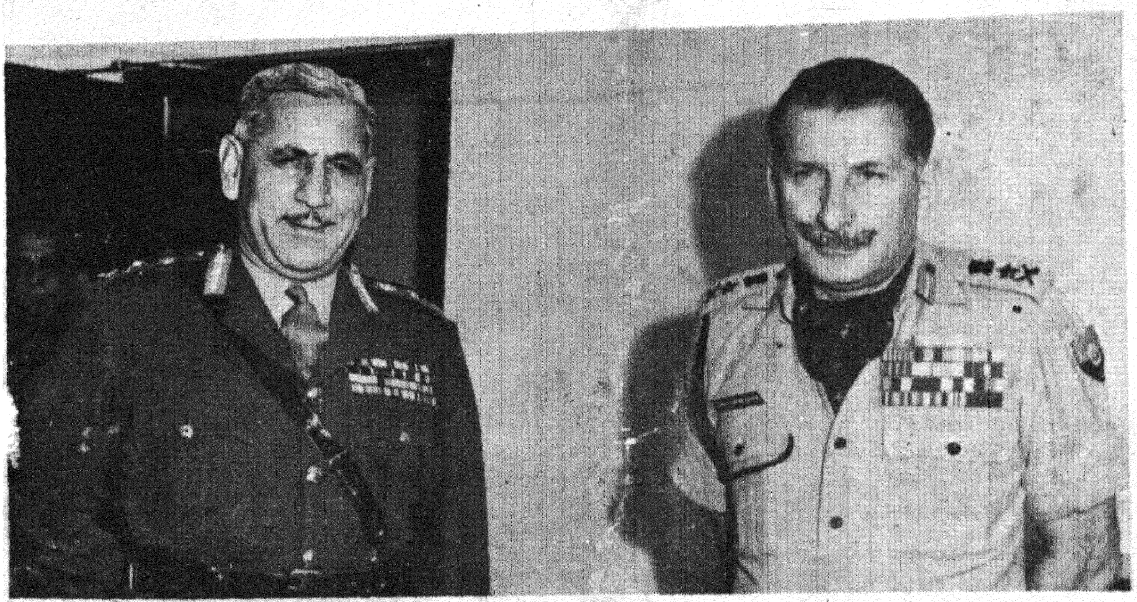

1 NO. 6 AJKAL (MONTHLY) JANUARY 1

UBLISHED BY THE DIRECTOR, PUBLICATIONS DIVISION, PATIALA HOUSE, NEW DELHI-1

PRINTED BY INDIAN PRINTING WORKS, RANI JHANSI ROAD NEW DELHI-55.

REGD. NO. D 50